قصصِ قرآنی اور انبیاء علیہم السّلام کے سوانح حیات
اور اُنکی دعوتِ حق کی مُستند ترین تاریخ

قصص القرآن

جلد سوم و چہارم

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

دارُالاشاعت
اُردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

قصص القرآن

سوم و چہارم

جس میں انبیاء علیہم السّلام کے سوانح حیات کے علاوہ باقی قصصِ قرآنی، اصحاب القریہ، اصحابُ الجنہ، حضرت لقمان ؒ، اصحاب سبت، اصحابِ الرّس، بیت المقدس اور یہود، ذوالقرنین، سدِّ سکندری، اصحاب الکہف والرقیم، سبا اور سَیل عرم، اصحاب الاُخدود، اور اصحابُ الفیل وغیرہ کی مکمل اور محقِقانہ تفسیر وتشریح کی گئی ہے۔ آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے واقعات وحالات کا مبصرانہ و محقِقانہ بیان۔

تالیف
مولانا محمد حِفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

دارُالاشاعَت
اُردُو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

نام کتاب قصص القرآن
مصنف مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی
کمپیوٹرائزڈ،ایڈیشن ۲۰۰۲
ناشر دارالاشاعت،اردو بازار، کراچی،فون ۲۲۱۳۷۶۸
E MAIL: ishaat@digicom.net.pk
باہتمام خلیل اشرف عثمانی
کمپوزنگ منظور احمد

ملنے کے پتے

- دارالاشاعت،اردو بازار، کراچی،فون ۲۲۱۳۷۶۸
- ادارۃ المعارف دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
- مکتبہ دارالعلوم،ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴
- بیت القرآن،اردو بازار، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، ۱۹۰انار کلی، لاہور
- ادارۂ اسلامیات، موھن چوک اردو بازار کراچی

فہرست مضامین حصہ سوم و چہارم

پیش لفظ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ العَلِیِّ الاَکبَرِ، وَالصَّلوٰۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدِنِ المَبعُوثِ اِلَی الاَسوَدِ وَ الاَحمَرِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصحَابِہِ الَّذِینَ ھُم ھُدَاۃُ الدِّینِ الاَزھَرِ

قصص القرآن کی تالیف کے وقت یہ خیال تھا کہ اس موضوع سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چند سو صفحات کا ایک جز کافی ہوگا لیکن اس وادی میں قدم رکھنے کے بعد میدان کی وسعت نے اس خیال میں انقلاب پیدا کر دیا اور رہوار قلم جس قدر آگے بڑھتا گیا میدان موضوع وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، تاہم تیسرے جزء پر اس موضوع کو مکمل کر دینے کا حتمی ارادہ تھا۔ مگر سعی بلیغ کے باوجود ناکام رہا اور اس تیسری جلد پر بھی حد تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور چوتھی جلد کے اضافہ پر مجبور ہونا پڑا جو عنقریب ان شاء اللہ ہدیہ ناظرین ہوگی۔

قصص القرآن کا یہ تیسرا حصہ ہدیہ ناظرین ہے پہلے اور دوسرے حصہ کی افادیت اور قدیم و جدید علمی طبقوں میں ان کی مقبولیت خدائے برتر کا وہ فضل و کرم ہے جس کے اظہار شکر کے لیے میرے قلب و زبان دونوں قاصر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قصص القرآن کی اس جدید ترتیب و تدوین کے ساتھ اہل علم کا شغف مصنف کی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ قرآن عزیز کی برکت و عظمت کا ثمرہ ہے۔ مسلمانوں کا کلام الٰہی کے ساتھ والہانہ ذوق اگر اس محنت کو مفید اور پسندیدہ سمجھتا اور اس کاوش کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے تو فَالحَمدُ للّٰہ عَلٰی ذٰلکَ و ذٰلکَ فَضلُ اللّٰہِ یُؤتِیہِ مَن یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الفَضلِ العَظِیم۔

قصص القرآن کے اس تیسرے جزء میں وہ تمام تاریخی واقعات سپرد قلم ہوئے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی سیرت طیبہ اور ان کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں قرآن عزیز نے عبرت و بصیرت اور پند و موعظت کے لیے بیان کئے ہیں۔

ان میں بعض وہ واقعات ہیں جن کے متعلق حریف اہل قلم خصوصاً متعصب مستشرقین یورپ اِن ھُوَ اِلَّا اَسَاطِیرُ الاَوَّلِینَ کہہ کر ان کو بے سر و پا داستان اور غیر تاریخی قصے ظاہر کرتے ہیں۔

اس لیے ان کے علی الرغم صحیح اور مستند اسلامی و غیرہ اسلامی تاریخی نقول کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن عزیز کے بیان کردہ یہ وقائع تاریخی حقائق ہیں اور ان کا انکار علمی حقائق کا انکار ہے اس سلسلہ میں ذوالقرنین، اصحاب الکھف والرقیم، اصحاب الرس اور اصحاب الفیل کے واقعات خصوصی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن عزیز تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت ثقلین کے لیے معاد و معاش کا مکمل نظام اور دین و دنیا کی رشد و ہدایت کا قانون کامل ہے اس لیے اس نے قوموں کے عروج و زوال اور مبدء و انجام سے متعلق اسی قدر حصہ بیان کیا ہے جو اس مقصد تذکیر و موعظت کے لیے مناسب تھا لیکن جب ایک تاریخ عالم کا طالب علم ان

قوموں کی تاریخ کا مکمل مطالعہ کرتا یا صفحات عالم پر ان کے آثار و نشانات کو دیکھتا اور پڑھتا ہے تو اس کو بے ساختہ یہ اقرار کرنا ہوتا ہے کہ قرآن نے ان اقوام کے متعلق جو کچھ بھی کہا ہے سر تا سر حقیقت اور ان کی حیات ماضی کا صحیح مرقع ہے۔

اور ان میں بعض واقعات وہ بھی ہیں جو در حقیقت ایک "مثال" کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی قرآن نے ان کو صرف اس لیے بیان کیا ہے کہ موعظت و نصیحت کی جس نوع کا ذکر کیا جارہا ہے اس کے قبول کرنے اور نہ کرنے والوں کی یہ مثال ہے اور ظاہر ہے کہ مثال کے لئے واقعہ کا پیش آنا ضروری نہیں ہے، اگرچہ وہ واقعہ کی شکل میں ہی کیوں نہ پیش کی جائے اور یہ حقیقت کسی بھی زبان کے فصیح و بلیغ ادیب سے مستور نہیں ہے اور وہ جانتا ہے کہ مثال کا یہ طریقہ موعظت و نصیحت کے لیے کس درجہ مفید اور دل نشین ہوتا ہے؟ مگر بعض مفسرین نے ان واقعات کو بھی ماضی میں ہو گزرے واقعات کے سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ لہٰذا ہم نے ایسے مواقع پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اس واقعہ کی حقیقت ایک مثال سے زیادہ نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اس کو واقعات ماضی کی ہی ایک کڑی سمجھتا ہے تب بھی ان واقعات کو واقعات تسلیم کر لینے میں نہ کسی اچنبھی بات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور نہ ایسے واقعات کا غیر تاریخی ہونا ان کے مثال بننے میں حارج ہو سکتا ہے مثلاً مومن و کافر یا اصحاب الجنہ باغ والوں کا واقعہ۔ کہ قرآن کا مقصد ان کے بیان کرنے سے صرف حسب حال ایک مثال دینا ہے خواہ وہ ماضی میں گزرا واقعہ ہو یا نہ ہو۔

قصص القرآن کے دوسرے اجزاء کی طرح اس جزء میں بھی واقعات کے تاریخی حقائق مطالب کو روشنی میں لانے کے علاوہ ان سے متعلق تفسیری و حدیثی مباحث اور "تحقیقی مباحث" پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان سے حاصل شدہ نتائج و ثمرات کو بصائر و عبر اور مواعظ و بصائر کے مختلف عنوانات سے بیان کیا گیا ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کا حقیقی مقصد قرآنی عبرت و بصیرت رہی ہے۔

موضوع کتاب سے متعلق واقعات کو اس طرح زیر بحث لانے سے آپ کو یہ حقیقت جگہ جگہ ابھری ہوئی نظر آئے گی کہ مستشرقین یورپ نے "کہ جن کی ریسرچ اور فلسفۂ تاریخ کی موشگافیوں سے ہم بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں۔ کس طرح فلسفۂ تاریخ کے نام پر اپنے مخالف واقعات اکو غیر تاریخی ظاہر کرنے اور اپنے موافق واقعات کو غیر تاریخی حیثیت دینے کی سعی کی ہے اور پھر اس زہر ہلاہل کو کس خوبصورتی سے تریاق کی شکل میں پیش کیا ہے؟

ان اہم خصوصیات کے علاوہ اپنے دوسرے اجزاء و مجلدات کی طرح یہ جلد بھی حسب ذیل خصوصیات کی حامل ہے:

۱) کتاب میں واقعات کی اساس و بنیاد قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور صحیح احادیث و مستند تاریخی واقعات سے ان کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

۲) کتب عہد قدیم اور قرآن عزیز کے یقین محکم کے درمیان جس جگہ تعارض نظر آتا ہے، تو یا روشن دلائل و براہین کے ذریعہ دونوں کے درمیان تطبیق دے دی گئی ہے اور یا پھر قرآن عزیز کی صداقت کو واضح

براہین اور مسکت دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

۳) اسرائیلی روایات کی خرافت اور معاندین کے اعتراضات کی بطالت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔

۴) تفسیری، حدیثی اور تاریخی مسائل اور ان سے متعلق مباحث واشکالات پر بحث و نظر کے بعد سلف صالحین کے مسلک قدیم کے مطابق ان کی تحقیق اور ان کا حل پیش کیا گیا ہے۔

۵) واقعہ کا ذکر قرآن میں کتنی جگہ ہوا ہے اس کو دوران بحث میں بیان کر دیا گیا ہے۔

مصنف کو ان خصوصیات کے متعلق کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی اس کا فیصلہ اصحاب نظر اور اہل ذوق کی صوابدید پر ہے۔

"وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل"

خادم ملت
محمد حفظ الرحمٰن صدیقی سیوہاروی

شعبان ۱۳۶۳ھ
ڈسٹرکٹ جیل مراد آباد

دیباچہ طبع دوم

جلد سوم کا پہلا ایڈیشن جس وقت نکلا تو کتاب کی جلد اول اور جلد دوم تقریباً ختم ہو گئی تھیں، بڑی جدوجہد کے بعد ۴۶-۱۹۴۵ء میں یہ دونوں جلدیں تیار ہوئیں کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جلد سوم ناپید ہو گئی اس جلد کی کتابت آخری مرحلوں سے گزر رہی تھی کہ ملک میں ایک ہولناک اور خونخوار انقلاب رونما ہو گیا، دہلی میں قیامت برپا ہوئی اور "ندوۃ المصنّفین" تباہ ہو گیا ادارے کی دیگر مطبوعات کے لاکھوں روپے کے ذخیرے کے ساتھ قصص القرآن کی ہزاروں جلدیں بھی برباد ہو گئیں، اب کہ جلد سوم کا یہ دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے حصہ اول، دوم، اور چہارم برائے نام باقی رہ گئی ہیں۔

ناظرین کو معلوم ہے "قصص القرآن" کا شمار "ندوۃ المصنّفین" کی مقبول عام اور مفید ترین کتابوں میں ہے اور اس لیے میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اس عظیم الشان کتاب کے تمام حصے ہر وقت موجود رہیں اور ارباب ذوق کو زحمت انتظار اٹھانی نہ پڑے لیکن تجری الریاح بما لا تشتھی السفن۔

گرامی قدر مؤلف دہلی کی مقامی الجھنوں اور دیگر اہم ترسیاسی مشاغل میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ ارادے کے باوجود اب تک تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہیں نکال سکے چنانچہ یہ ایڈیشن نظر ثانی کے بغیر بعینہٖ پہلی ہی ترتیب پر نکل رہا ہے فرق صرف یہ ہے کہ پہلا ایڈیشن ۲۰×۲۶-۲۱ سطر پر تھا اور یہ ۲۰×۲۶-۱۹ سطر پر ہے اس

طرح کتابت نسبتاً کھل گئی ہے اور حجم بھی بڑھ گیا ہے۔

عتیق الرحمن عثمانی
ناظم ندوۃ المصنفین۔ دہلی
۱۸ ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ
م ۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء

طبع سوم

یقین تھا تیسرا ایڈیشن مؤلف گرامی کی نظر ثانی کے بعد نکلے گا، لیکن حالات نے اسکی اجازت نہ دی، کتاب بالکل ختم ہو چکی تھی اور نظر ثانی کے انتظار میں اسکی اشاعت ملتوی نہیں کی جا سکتی تھی۔ بنا بریں یہ ایڈیشن بھی پہلے دو ایڈیشنوں کے مطابق نکل رہا ہے البتہ اس دفعہ کتابت اور تصحیح کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے جس کو ناظرین نمایاں طور پر محسوس کریں گے۔

عتیق الرحمن عثمانی
یکم ذیقعدہ ۱۳۷۱ھ

دیباچہ طباعت عکسی

قصص القرآن جلد اول اور جلد دوم کی عکسی طباعت کے بعد برابر یہ کوشش رہی کہ جلد سوم اور جلد چہارم بھی اسی انداز پر آجائیں۔ معیاری کتابت کا مرحلہ بھی آسان نہیں ہوتا، ہمارے یہاں اس وقت عکسی کتابت کا مدار مشہور اور بہترین خطاط منشی محمد حلیق صاحب ٹونکی پر ہے منشی صاحب کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اور ان پر کام کی یورش بھی زیادہ رہتی ہے، اس لیے وقت گزرتا گیا اور کام پورا نہ ہو سکا، شکر ہے اب کئی سال کے بعد جلد ثالث طبع آفسٹ قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے اور جلد چہارم بھی زیر کتابت ہے جس کا بڑا حصہ لکھا جا چکا ہے۔

قصص القرآن ندوۃ المصنفین کی نہایت اہم اور مقبول کتاب ہے جی چاہتا تھا کہ کتاب کی کتابت و طباعت بھی اسکی شان کے مطابق ہو خوشی کی بات ہے کہ یہ خیال عمل میں آگیا اور اس مشکل وقت میں بھی حسب منشاء کام ہو گیا کتاب کے مضامین و مباحث کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے ہزاروں کی تعداد میں اسکی اشاعت ہو چکی ہے اور خواص و عوام سب ہی کے یہاں سے اسکو سند اعتبار و استناد مل چکی ہے، اس سلسلے میں بعض عجیب و غریب خواب بھی دیکھے گئے ہیں جن سے کتاب کے تقدس، اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ لگانے میں بصیرت افروز مدد ملتی ہے۔

دیگر خصوصیات کے علاوہ اس جلد کی ایک تاریخی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف مرحوم نے اسکی تالیف کا بڑا حصہ جیل خانے میں تیار کیا تھا، مرحوم ۱۹۴۲ء کے **QUIT INDIA** کے ہنگامہ خیز معرکے میں محبوس کر دیے گئے تھے اور ڈسٹرکٹ جیل مراد آباد میں قیام پذیر تھے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسی زمانے میں یہ اہم ترین خدمت انجام پائی، کتاب کا جتنا مسودہ تیار ہو جاتا تھا کسی نہ کسی تدبیر سے باہر آجاتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی کتابت کا بھی انتظام کیا جاتا تھا، اب ہم آزاد ہیں لیکن غلامی کے اسوقت کی یاد تازہ رہتی ہے اب نہ مصنف مرحوم دنیا میں ہیں۔[۱] اور نہ ڈسٹرکٹ جیل مراد آباد کی وہ ایمان افروز فضا باقی ہے قصص القرآن کا فیض البتہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

عتیق الرحمٰن عثمانی
ندوۃ المصنفین دہلی
۴ شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ
۲۲ جولائی ۱۹۷۷ء

۱: افسوس ہے کہ اب اس اشاعت کے وقت حضرت مفتی عتیق الرحمٰن بھی وفات پا چکے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی اس خدمت کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین، فقط ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصحاب الجنۃ

- سورۃ القلم اور اصحاب الجنۃ
- واقعہ سے متعلق اقوال
- تشریح
- موعظت

سورۃ القلم اور اصحاب الجنۃ

سورۃ القلم میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے حسب حال ایک مثال بیان فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح باغ والوں نے خدا کی نعمت کو ٹھکرایا اور اس کا حق ادا کرنے کیلئے شکر نعمت نہ کیا اسی طرح مکہ کے مشرکین کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین ﷺ کو مبعوث فرما کر ان پر اپنی نعمت کاملہ کا اظہار فرمایا اور ان کے ارشاد وہدایت کیلئے ہادی اعظم ﷺ بھیج کر عظیم الشان احسان کیا لیکن انھوں نے اس کی کوئی قدر نہ کی اور انکار و مخالفت کے ساتھ اس نعمت کو رد کرنے لگے، تو اب ان کا بھی وہی نتیجہ ہونے والا ہے جو باغ والوں کا ہوا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ○ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ○ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ○ فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ○ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ○ أَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ ○ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ○ أَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ○ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قَادِرِيْنَ ○ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوْآ إِنَّا لَضَآلُّوْنَ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ○ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِيْنَ ○ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ○ قَالُوْا يَاوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا طَاغِيْنَ ○ عَسٰى رَبُّنَآ أَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ ○ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ط وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ (القلم پ ۲۹ ع ۱)

بے شبہ ہم نے ان (کفار مکہ) کو اسی طرح آزمایا ہے جس طرح باغ والوں کو آزمایا جو کہ انھوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح ہوتے ان (کے پھلوں) کو کاٹ لیں گے' اور وہ انشاء اللہ بھی نہ کہتے تھے۔ پس ابھی وہ سو ہی رہے تھے کہ (ان کے باغ پر) تیرے پروردگار کی جانب سے پھرنے والا پھر گیا (یعنی عذاب الٰہی سے وہ باغ برباد ہو گیا) پس صبح کو ایسا ہو گیا گویا جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا گیا ہے۔ (صبح ہوئی) تو انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا

کہ اگر کھیتی کا ٹنا چاہتے ہو تو سویرے چلے چلو اور وہ چلتے چلتے آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے (کہ جلدی کرو) ایسا نہ ہو کہ کاٹتے وقت تم کو فقیر آگھیریں' اور اپنے بخل کی وجہ سے بہت سویرے (باغ کھیت پر) پہنچے اندازہ لگا کر' (کہ اس وقت تک فقیر نہ پہنچ سکیں گے) پس جب اس کو (اس حال میں) دیکھا تو کہنے لگے: یقیناً ہم راہ بھول گئے ہیں (یہ وہ مقام نہیں ہے، مگر جب غور سے دیکھا تو کہنے لگے) بلکہ ہم (باغ کے نفع سے) محروم رہ گئے۔ ان میں سے ایک بھلے آدمی نے کہا: کیا میں نے تم سے پہلے نہیں کہا تھا کہ (اس نعمت الٰہی پر) کیوں خدا کی پاکی بیان نہیں کرتے (اب انجام بد کے بعد) کہنے لگے ہمارے پروردگار کیلئے پاکی ہے بیشک ہم نے خود ہی اپنے نفس پر ظلم کیا' اور آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے (یہ کہ تو نے ہی ہم کو پہلے سے کیوں نہ سمجھایا) اور کہنے لگے: بد قسمتی' بلاشبہ ہم شرکش تھے۔ جلد توقع ہے کہ ہمارا پروردگار ہم کو اس سے بہتر بدل عطا فرمائے۔ بے شبہ (اب) ہم اپنے پروردگار ہی کی جانب متوجہ ہیں (اے مکہ والو) خدا کا عذاب اسی طرح (اچانک) آجاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی ہولناک ہے کاش کہ وہ جان لیتے۔

واقعہ سے متعلق اقوال

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ کفارِ مکہ کے حالات کے مناسب قرآن نے ایک مثال دی ہے کوئی واقعہ نہیں ہے[1]۔ اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے جو یمن کی ایک بستی ضروان میں پیش آیا جو کہ صنعاء سے چھ میل پر واقع تھی۔[2] چنانچہ مفسرین نے اس واقعہ کی تفصیل یہ بیان فرمائی ہے:۔

اہل کتاب میں سے ایک شخص بہت مالدار، صاحبِ زمین واَملاک اور مردِ نیک تھا، اپنی پیداوار میں سے فقراء و مساکین پر کافی خرچ کرتا رہتا تھا، اسکا جب انتقال ہو گیا تو اس نے چند لڑکے وارث چھوڑے' جب پھلوں اور کھیتوں کے کاٹنے کا وقت آیا تو اُن لڑکوں نے آپس میں کہا" ہمارا باپ تو بہت ہی بیوقوف تھا کہ اپنی یہ کثیر دولت فقراء و مساکین میں لُٹا دیتا تھا، ہم ایسے پاگل نہیں ہیں کہ اپنی محنت کو اسطرح رائیگاں کر دیں اور صلاح یہ ٹھہری کہ پھل اُتارنے اور کھیتی کاٹنے کیلئے مُنہ اندھیرے چلو اور اتنی عجلت کرو کہ فقراء اور مساکین کو معلوم ہی نہ ہو سکے کہ کھیتوں پر آکر ہم کو تنگ کریں۔

یہاں تو یہ خدا ناترس' بخیل یہ مشورہ کر رہے تھے کہ ساری دولت کو ذخیرہ کر کے "کنز" بنالیں اور اس میں سے نہ خدا کا حق ادا کریں اور نہ خدا کے بندوں کا' اور دوسری جانب خدا کے حکم سے رات ہی میں ان کی تمام سرسبز و شاداب کھیتی اور باغ تیز اور گرم ہوا سے جل کر خاک ہو گئے، اب جو مشورہ کے مطابق یہ مُنہ اندھیرے وہاں پہنچے تو معاملہ دگرگوں پایا اور کچھ نہ سمجھے اور آگے نکل گئے کہ شاید یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے مگر دوسرے نشانات دیکھ کر چونکے اور اب سمجھے کہ یہ ہمارے بخل اور مشورہ کا نتیجہ ہے جو ہم نے شب گذشتہ میں حکم الٰہی کے خلاف غریبوں اور مسکینوں کا حق تلف کرنے کیلئے کیا تھا۔ اب حسرت سے بد قسمتی کا شکوہ کرنے اور خدا کو پکارنے لگے، مگر وقت نکل جانے اور پاداشِ عمل پالینے کے بعد یہ پُکار بے سُود ثابت ہوئی۔

تشریح

یہ مثال ہو' یا واقعہ ' قرآنِ عزیز نے اس کے بیان میں تذکیر و تنذیر کا جو پہلو رکھا ہے وہ بہر حال اپنی جگہ ہے'

١: تفسیر ابن کثیر سورۃ القلم۔ ٢: ایضاً

اسلئے کہ اِن آیات سے قبل قریشِ مکہ کی نافرمانیوں اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے انکار اور کفران کا ذکر کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ان کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کی بداعمالیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اب ان کو ایک مثال دے کر یا واقعہ سنا کر یہ بتایا جا رہا ہے کہ پیغمبر ﷺ اور خدا کی نعمت (قرآن) کے خلاف باہم سرگوشیاں کرنے' قرآن کی عطا کردہ تعلیم متعلق حقوق اللہ و حقوق العباد سے گریز کر کے اپنی قوت و شوکت پر اِتراتے اور گھمنڈ کرتے ہوئے پیغمبر معصوم ﷺ اور مسلمانوں کی تحقیر کرنے کا انجام وہی ہونے والا ہے جو "باغ والوں" کا ہوا اور یہ اسلئے کہ اوّل خدا کی جانب سے قانونِ امہال (مہلت دینے کا قانون) متکبّروں کو ڈھیل دیتا اور اصلاحِ حال کیلئے موقع عطا کرتا ہے مگر جب کوئی قوم اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتی بلکہ خدا کی اس مہلت کو اپنی باطل پرستی کیلئے صداقت کی دلیل ٹھہرا کر صادقین اور اُن کی صداقت کی تحقیر و تذلیل پر آمادہ ہو جاتی ہے تو پھر اچانک قانونِ گرفت اپنا سخت پنجہ ان پر جما دیتا اور ان کو ہلاک و برباد کر کے کائنات کی عبرت و بصیرت کا سامان مہیّا کر دیتا ہے' پھر اس وقت نہ حسرت کام آتی ہے نہ ندامت' اور اس گھڑی نہ ایمان لانا مفید ہے اور نہ خدا کی اِنقیاد و اطاعت کا اعلان۔

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ○ (بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۲)

اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (یعنی وحی کے ذریعہ پیغامِ حق پہنچا دیتے ہیں پھر وہ بجائے اس کے کہ اس کی تعمیل کریں نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں' پس ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے اور (پاداشِ عمل میں) ہم انھیں برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

موعظت

اللہ تعالیٰ نے اس کائناتِ ہست و بود میں انسان کو اجتماعی حیات کیلئے پیدا کیا ہے اور حاجات انسانی کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ یہ کارخانہ باہمی اشتراک و اعانت کے بغیر نہیں چل سکتا اور چونکہ اجتماعی زندگی افراد ہی سے بنتی اور سنورتی ہے اس لئے از بس ضروری ہے کہ ان کی نشو و نما اور بقاءِ حیات کا ایسا قانون مقرر کیا جائے جس کی بدولت افرادِ انسانی کے درمیان رشتۂ اُخوت او مودت قائم ہو سکے اور کسی وقت بھی رقابت اور تنافس پیدا نہ ہونے پائے لہٰذا حق تعالیٰ نے اس نظام کی تکمیل کے لئے معاشی زندگی سے متعلق دو حقوق مقرر فرمائے، ایک حق معیشت اور درجاتِ معیشت۔ حق معیشت کا قانون یہ ہے کہ اس عالم میں ایک جاندار بھی ایسا نہیں رہنا چاہیے جو حق معیشت سے محروم ہو' یہ ہر شخص کا انفرادی حق ہے کہ وہ زندہ رہے اس لئے حقِ معیشت میں یہاں سب مساوی ہیں اور کسی کو کسی پر تفوق و برتری حاصل نہیں ہے۔

دوسرا درجاتِ معیشت کا مسئلہ ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ معاشی زندگی کے لئے سب کو ملے مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو برابر ملے وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ لیکن درجاتِ معیشت کی اس کمی و بیشی اور تفاضل کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے جو کچھ کمایا ہے وہ سب اس کا انفرادی حق ہے' نہیں بلکہ جو جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اس کی دولت میں اجتماعی حق زیادہ ہو گا اور پھر یہ اجتماعی حق دو قسم پر تقسیم ہو جاتا ہے' ایک حق

اللہ اور دوسرا حق العباد۔ پس جو شخص اپنی دولت وثروت کو صرف انفرادی مِلک سمجھتا اور اس میں حق اللہ اور حق العباد دونوں کا انکار کرتے ہوئے اس کے نشہ میں مست ہو کر احکامِ الٰہی سے بے پرواہو جاتا ہے اس کا انجام کبھی بخیر نہیں ہوتا اور وہ خدا کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ ○ (سورۃ توبہ)

اور جو لوگ چاندی سونا اپنے ذخیروں میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنادو۔

ولید بن مغیرہ اور قریشی سرداروں کو خدا نے ہمہ قسم کی نعمتیں عطا فرمائی تھیں اور پھر ان مادّی ترقیات کے ساتھ ساتھ خاتم الانبیاء کی بعثت فرما کر ان کی روحانی نعمت کو بھی کامل ومکمل کر دیا تھا، لیکن ان بد بختوں نے شکر ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کیا، آخر نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح باغ والے اپنے باغ کی نعمتوں سے محروم ہو گئے اسی طرح کفار مکہ بھی مادّی اور رُوحانی نعمتوں سے محروم ہو کر ابدی ذلت وخسران کے ماسوا اور کچھ نہ پا سکے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

مومن وکافر

- سورۂ کہف اور مومن وکافر کا مذاکرہ
- واقعہ کی تشریح
- بصائر

سورۂ کہف اور مومن وکافر کا واقعہ

اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں اصحابِ کہف کے واقعہ کے بعد ایک اور واقعہ کا ذکر فرمایا ہے' یہ واقعہ دو انسانوں کے درمیان مناظرانہ گفتگو کی شکل میں ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی اس کا نتیجہ اور ثمرہ بھی مذکور ہے۔ یعنی ایک کا طریقہ زندگی مآل کے اعتبار سے کامیاب رہا اور دوسرے کو ندامت وحسرت کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو مثال کے طور پر کفارِ مکہ اور مسلمانوں کی جماعت کے حالات کو سامنے رکھ کر تذکیر اور نصیحت کے لئے بیان کیا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس طرح واقعہ درحقیقت دو آدمیوں (مومن وکافر) کے درمیان زمانہ ماضی میں پیش آیا تھا۔

اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ جس طرح اصحابِ کہف کا واقعہ پیش آیا ہے اسی طرح نزولِ قرآن سے قبل دو انسانوں کے درمیان یہ واقعہ بھی پیش آیا ہے اور قرآن نے ان دونوں واقعات کو مشرکین مکہ کی تذکیر وتنذیر کے لئے بیان کیا ہے:۔

قرآن عزیز نے جس انداز میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کتب احادیث وسیر اور تاریخ میں اس سے زیادہ کچھ اور موجود نہیں ہے لہٰذا وہی قابل مراجعت ہے:۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ○ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا لا وَّفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا ○ وَّكَانَ لَهُ ثَمَرٌ ج فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا ○ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ج قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ○ وَّمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ إِلَى رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ○ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ○ لَكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ○ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ○ فَعَسَى رَبِّي أَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا

حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ أَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝ وَأُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ أَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ أَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝

اور (اے پیغمبر)لوگوں کو ایک مثال سنادو۔ دو آدمی تھے ان میں سے ایک کیلئے ہم نے انگور کے دو باغ مہیا کر دیئے گرداگرد کھجور کے درختوں کا احاطہ تھا بیچ کی زمین میں کھیتی تھی، پس ایسا ہوا کہ دونوں باغ پھلوں سے لد گئے اور پیداوار میں کسی طرح کی بھی کمی نہ ہوئی ہم نے ان کے درمیان (آب پاشی کے لئے) ایک ندی جاری کردی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ آدمی دولتمند ہو گیا۔ تب ایک دن (گھمنڈ میں آکر) اپنے دوست سے (جسے خوش حالیاں میسر نہ تھیں) باتیں کرتے کرتے بول اٹھا دیکھوں میں تم سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی بڑا طاقتور جتھا ہے پھر وہ (یہ باتیں کرتے ہوئے) اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ ایسا شاداب باغ کبھی ویران ہو سکتا ہے مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی برپا ہو گی اور اگر ایسا ہوا بھی کہ میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا گیا تو (میرے لئے کیا کھٹکا ہے) مجھے ضرور (وہاں بھی) اس سے بہتر ٹھکانا ملے گا" یہ سن کر اس کے دوست نے کہا اور باہم گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ "کیا تم اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے تمہیں پہلے مٹی سے اور پھر نطفہ سے پیدا کیا اور پھر آدمی بنا کر نمودار کر دیا لیکن میں تو یقین رکھتا ہوں کہ وہی اللہ میرا پروردگار ہے اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا اور پھر جب تم اپنے باغ میں آئے (اور اس کی شادابیاں دیکھیں) تو کیوں تم نے یہ نہ کہا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اس کی مدد بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا؟ اور یہ جو تمہیں دکھائی دے رہا ہے کہ میں تم سے مال اور اولاد کم تر رکھتا ہوں تو (اس پر مغرور نہ ہو) کیا عجب ہے میرا پروردگار مجھے تمہارے اس باغ سے بھی بہتر باغ جنت) دیدے اور تمہارے باغ پر آسمان سے ایسی اندازہ کی ہوئی بات اتار دے کہ وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا پھر بربادی کی کوئی اور صورت نکل آئے مثلاً اس کی نہر کا پانی بلکل نیچے اتر جائے اور تم کسی طرح بھی اس تک نہ پہنچ سکو اور پھر (دیکھو) ایسا ہی ہوا کہ اس کی دولت (بربادی کے) گھیرے میں آگئی وہ ہاتھ مل مل کر افسوس کرنے لگا کہ ان باغوں کی درستگی پر میں نے کیا کچھ خرچ کیا تھا (وہ سب برباد ہو گیا) اور باغوں کا حال ہوا کہ ٹٹیاں گر کے زمین کے برابر ہو گئیں اب وہ کہتا ہے اے کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا اور دیکھو کوئی جتھا نہ ہوا کہ اللہ کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ خود اس نے یہ طاقت پائی کہ بربادی سے جیت سکتا۔ یہاں سے معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت سارا اختیار اللہ ہی کیلئے ہے وہی ہے جو بہتر ثواب دینے والا ہے اور اسی کے ہاتھ بہتر انجام ہے۔

تشریح

ان آیات سے قبل یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جو لوگ منکر ہیں ان کیلئے جہنم کی آگ ہے اور جو مومنین ہیں ان کیلئے

ہمہ قسم کی خوش عیشیاں اور ابدی باغ (جنت) ہے اس کے بعد آیات زیر بحث میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو منکرین ہیں ان کے لئے صرف آخرت ہی کی محرومیاں نہیں ہیں بلکہ وہ اس دنیا میں بھی عنقریب ناکامیوں اور بد بختیوں سے دوچار ہونے والے ہیں ان کا یہ گھمنڈ کہ ان کو ہر قسم کی رفاہت اور خوش عیشی حاصل ہے اور وہ مال و دولت کے مالک ہیں اور ان کا جتھا بھی بہت طاقتور ہے بہت جلد خاک میں مل جانے والا ہے اور مومن اپنی موجودہ تنگ حالی پر دل گیر اور بد دل نہ ہوں کہ وقت آپہنچا ہے کہ ان کی یہ بے چارگی و بے بسی ہمہ قسم کی عزت و طاقت سے بدل جائے گی، نیز یہ کہ دنیا کی خوش عیشی چلتی پھرتی چھاؤں ہے اس پر بھروسہ بیکار ہے وہ جب مٹنے پر آتی ہے تو لمحوں کی بھی دیر نہیں لگتی اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو نہیں بچا سکتی۔

چنانچہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآن نے یہ مثال دی کہ یوں سمجھو کسی جگہ دو آدمی تھے ایک کو خدائے تعالیٰ نے دنیوی عیش و عشرت کے کل سامان دے رکھے تھے اور دوسرا تنگ دست اور پریشان حال تھا۔ وہ خدا کا منکر اور دولت کے نشہ میں چور اپنے نادار دوست سے غرور و نخوت کے ساتھ یہ کہتا رہتا ہے کہ میری یہ دولت و حشمت پائدار ہے کوئی طاقت نہیں کہ اس کو مجھ سے چھین لے اور ایک تو ہے کہ افلاس اور تنگی میں بسر کر رہا ہے مفلس دوست اگرچہ تنگ دست تھا مگر خدائے برتر کا سچا پرستار تھا اس نے جواب میں کہا ''اپنی دولت کے نشہ میں اس درجہ مغرور نہ ہو کون جانتا ہے کہ لمحوں میں کیا سے کیا ہو جائے اور کس کو خبر ہے کہ وہ مجھ کو ان بخشائشوں سے نواز دے جس پر آج تو غرور کر رہا ہے آخر کار یہی ہوا کہ اس کے وہ تمام باغ جن کی شادابیوں اور عطر بیزیوں پر اس کو گھمنڈ تھا اچانک جل بھن کر خاک ہو گئے اور کل جہاں چمن زار تھا آج وہاں ویرانی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔''

اس مثال میں حق تعالیٰ نے مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی جماعت سے متعلق وہی نقشہ کھینچا ہے جو عرب کے ماحول کے ٹھیک ٹھیک مطابق تھا کیونکہ ان کے یہاں اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہ تھی کہ تاکستان کے بہتر سے بہتر باغ ہوں ان کے چاروں طرف کھجور کے گنجان درخت لگے ہوں درمیان میں نہر کے ارد گرد سرسبز شاداب کھیتیاں ہوں اور یہ سب کچھ مشرکین مکہ کو میسر تھا اور مسلمان اس وقت ان ظاہری نعمتوں سے محروم تھے۔

بہر حال یہ واقعہ ہو یا مثال تذکیر و تنذیر کے جس مقصد کی خاطر بیان کی گئی ہے اس کے پیش نظر مشرکین مکہ مسلمانوں کے باہمی تقابل کا نہایت ہی جامع اور کامل نقشہ ہے قریش مکہ کے غرور و نخوت کا یہ حال تھا کہ اول تو پیغام ہدایت پر کان ہی نہ دھرتے تھے اور اگر کبھی سننے پر آمادگی ظاہر بھی کرتے تو یہ شرط لگاتے کہ جب تک ہم محمد ﷺ کے پاس بیٹھیں۔ اس وقت تک ان خستہ حال مسلمانوں میں سے کوئی ہمارے برابر آکر نہ بیٹھے کیونکہ ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری سخت توہین ہے وہ سمجھتے تھے کہ ہماری یہ دولت و حشمت غیر فانی اور ہمارا یہ کروفر ابدی ہے اس لئے مسلمانوں کو کمزور اور تنگ دست دیکھ کر ان کا مضحکہ کرتے اور حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

پس قرآن عزیز نے لطیف اور معجزانہ اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کے حق میں ایسے ناسازگار حالات کے وقت ان کی کامرانی اور مشرکین کی ناکامی کے اس انجام کی خبر دی ہے جو کچھ عرصہ بعد ہونے والا تھا چنانچہ جو سعید روحیں تھیں انھوں نے سمجھا اور حق کی آغوش میں خود کو سپرد کر دیا اور جن کی شقاوت و بد بختی پر مہر لگ

چکی تھی ان کا تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ حسرتناک انجام ہوا جس کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے:

خسر الدنیا والا خرۃ ذالک ھو الخسران المبین۔

اور شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"پہلے وقت میں ایک شخص مالدار مر گیا، دو بیٹے رہے، برابر مال بانٹ لیا، ایک نے زمین خرید کی، دو طرف میووں کے باغ لگائے بیچ میں کھیتی اور ندی کاٹ کر ان پر لاڈالی کہ مینہ نہ ہو تو بھی نقصان نہ آوے اور عمدہ جگہ بیاہ کیا، اولاد ہوئی اور نوکر رکھے، تدبیر دنیا درست کر کر آسودہ گذران کرنے لگا دوسرے نے سب مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا، آپ قناعت سے بیٹھ رہا۔" (موضح القرآن)

معلوم نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے واقعہ کی یہ تفصیل کہاں سے اخذ فرمائی ہے کتب سیر و روایات..... اور تاریخ کے اوراق تو اس بارہ میں خاموش ہیں اور "چھوٹا منہ بڑی بات" حضرت شاہ صاحب نے اس واقعہ میں جس طرح دونوں کا تقابل ظاہر فرمایا ہے قرآن کا ظاہر سیاق اس کی تائید نہیں کرتا، اس لئے کہ مرد مومن نے کافر کے غرور کا جو جواب دیا اور کافر نے جو اس کے افلاس پر طعنہ دیا وہ ہرگز اس صورت حال کے مناسب نہیں ہیں کہ مومن حقیقۃ مال دار تھا مگر اس نے اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دیا تھا اگر ایسا ہوتا تو مومن و کافر کے سوال و جواب کا اسلوب دوسرا ہی ہوتا...... واللہ علم بالصواب۔

بصائر

۱) دنیوی نعمتیں دو گھڑی کی دھوپ اور چار دن کی چاندنی ہیں ناپائدار اور فانی، پس عقلمند وہ ہے جو ان پر گھمنڈ نہ کرے اور ان کے بل بوتہ پر خدا کی نافرمانی پر آمادہ نہ ہو جائے اور تاریخ کے ان اوراق کو پیش نظر رکھے جن کی آغوش میں فرعون، نمرود، ثمود اور عاد کی قاہرانہ طاقتوں کا انجام آج تک محفوظ ہے:۔

سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ○

زمین کی سیر کرو اور پھر دیکھو کہ نافرمانوں کا انجام کیا ہوا؟

۲) حقیقی عزت ایمان باللہ اور عمل صالح سے بنتی ہے دولت اور ثروت اور سطوت و حشمت دنیوی سے حاصل نہیں ہوتی، قریش مکہ کو ثروت و سطوت دونوں حاصل تھیں مگر بدر کے میدان میں ان کا انجام بد اور دین و دنیا کی رسوائی کو کوئی روک نہ سکا، مسلمان دنیا کے ہر قسم کے سامان عیش سے محروم تھے مگر ایمان باللہ اور عمل صالح نے جب ان کو دینی و دنیوی عزت و حشمت عطا کی تو اس میں کوئی حائل نہ ہو سکا۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

حقیقی عزت اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہی ہے مگر منافقین اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔

۳) مومن کی شان یہ ہے کہ اگر اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نعمتوں سے نوازا ہے تو غرور اور تکبر کی بجائے درگاہ الٰہی میں جبین نیاز جھکا کر اعتراف نعمت کرے اور دل و زبان دونوں سے یہ اقرار کرے کہ خدایا اگر تو یہ عطا نہ فرماتا تو ان کا حصول میری اپنی قوت و طاقت سے باہر تھا یہ سب تیرے ہی عطا و نوال کا

صدقہ ہے۔

وَلَوْلَآ إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ

صحیح حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الکنز من کنوز الجنة لاحول ولا قوۃالا باالله

جنت کے پوشیدہ خزانوں میں سے ایک خزانہ یہ ہے کہ بندہ اعتراف کرے کہ بھلائی کرنے کی طاقت اور برائی سے بچنے کی قوت اللہ کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔

یعنی جس شخص نے زبان سے اس کا اقرار کیا اور دل میں اس حقیقت کو جاگزیں کر لیا اس نے گویا جنت کے مستور خزانوں کی کنجی حاصل کر لی۔

اس کے برعکس کافر کی حالت یہ ہے کہ اس کو جب دولت وثروت اور جاہ وجلال میسر آجاتے ہیں تو خودی میں آکر مغرور ہو جاتا ہے اور جب کوئی خدا کا نیک بندہ اس کو سمجھاتا ہے کہ یہ سب خدا کا فضل ہے اس کا شکر ادا کر تو وہ اکڑ کر کہتا ہے:

أُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ

یہ خدا کا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ میری اپنی دانائی اور علم کا نتیجہ ہے

پس مومن اور کافر کے لئے خدا کی جانب سے بھی الگ الگ جواب ملتا ہے، جن کو سورۂ مومنون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

أَيَحْسَبُوْنَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ○ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○ إِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ آتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ ○ أُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ ○ (المومنون پ ۱۸ ع ٤)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم مال اور اولاد سے اس لئے ان کی امداد کر رہے ہیں کہ بھلائی پہنچانے میں سرگرمی دکھائیں؟ نہیں مگر وہ شعور نہیں رکھتے (کہ ان کے بارے میں حقیقت حال دوسری ہے یعنی قانونِ امہال کام کر رہا ہے) اور جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں جو اپنے پروردگار کی نشانیوں پر یقین رکھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھہراتے جو اسکی راہ میں جتنا کچھ دے سکتے ہیں بلا تامل دیتے ہیں اور (پھر بھی) ان کے دل ترساں رہتے ہیں، کہ اپنے پروردگار کے حضور لوٹنا ہے تو بلا شبہ یہ لوگ ہیں جو بھلائیوں کیلئے تیز گام ہیں اور یہی ہیں جو اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں۔

۴) سعید وہ ہے جو انجام سے قبل حقیقت انجام کو سوچ لے اور انجام کار سعادت ابدی و سرمدی پائے اور شقی و بد بخت وہ ہے جو انجام پر غور کئے بغیر اول غرور و نخوت کا اظہار کرے اور اس کے انجام بد کو دیکھنے کے بعد ندامت و حسرت کا اظہار کرے۔ یہ ندامت و حسرت اس وقت کچھ کام نہ آئے چنانچہ اس واقعہ یا مثال میں بھی منکر کو وہی شقاوت پیش آئی۔

وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَآ أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَالَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّيٓ أَحَدًا ○ (کہف پ ۱۵ ع ۵)

اور اس کی دولت (ثمرات) گھیرے میں آ گئی اور جب کہ اس کے باغ کی ٹٹیاں زمین پر گر کے برابر ہو گئیں تو ہاتھ مل مل کر کہتا رہ گیا افسوس میں نے ان پر کتنی کثیر دولت صرف کی تھی وہ سب برباد ہو گئی اور حسرت کے ساتھ کہتا تھا کاش کہ میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا۔

اور یہی روز بد فرعون کو دیکھنا پڑا کہ وقت گزرنے پر اس نے وہی کہا کہ اگر عذاب کے مشاہدے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت مان لیتا تو اس دردناک عذاب کی نذر نہ ہوتا۔

حَتَّىٰٓ إِذَآ أَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنتُ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا الَّذِيٓ آمَنَتْ بِهِۦ بَنُوٓ إِسْرَآئِيلَ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○ آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ○

(یونس پ ۱۱ ع ۹)

یہاں تک کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو اس نے اب کہا میں اقرار کرتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں ہے سوا اس ایک ذات کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوتا ہوں۔ (اللہ نے جواب دیا) اور اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا اور تو فسادیوں میں سے تھا۔

اصحاب القریہ یا اصحاب یٰسین

- اصحاب قریہ اور قرآن عزیز
- واقعہ
- واقعہ سے متعلق اقوال
- نقد و تبصرہ
- موعظت

اصحاب قریہ اور قرآن عزیز

قرآن عزیز (سورۂ یٰسین) میں ایک بہت ہی مختصر واقعہ مذکور ہے جو آیت اَصْحٰبَ الْقَرْیَۃِ پر ختم ہوتا ہے اور سورۃ کی نسبت سے اسکو "واقعۂ اصحاب یٰسین" اور آیات کے اسلوب بیان کے مطابق "واقعۂ اصحاب قریہ" کہتے ہیں۔

واقعہ

قرآن عزیز نے اس واقعہ کے متعلق صرف اس قدر بتایا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں ایک بستی میں کفر و شرک اور شر و فساد کو دور کرنے اور رشد و ہدایت کا سبق دینے کیلئے اللہ تعالیٰ نے دو پیغمبروں کو مامور کیا انھوں نے اہل قریہ کو حق کی تلقین کی اور صراط مستقیم کی جانب دعوت دی لیکن بستی والوں نے ان دونوں کو جھٹلایا تب ہم نے ایک ہادی کا اور اضافہ کر دیا اور وہ تین ملکر ایک جماعت ہو گئے اب ان تینوں نے ان کو یقین دلایا کہ بے شبہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے ہیں مگر انھوں نے نہ مانا اور ان کا مذاق اڑایا کہ تم بھی آدمی اور ہم بھی آدمی پھر تمہارے اندر وہ کون سی عجیب بات ہے کہ تم پیغمبر بنا دیئے گئے یہ سب تمہارا جھوٹ اور تمہاری سازش ہے، انھوں نے کہا کہ خدا اسکا شاہد ہے کہ ہم جھوٹے نہیں وہ دانا و بینا اس کو خوب جانتا ہے مگر تم پھر بھی نہیں مانتے تو ہمارا کام اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیں اور راہ حق دکھا دیں بستی والے کہنے لگے کہ ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں کہ تم نے خواہ مخواہ ہمارے یہاں آکر گڑبڑ پیدا کر دی اور اگر تم اس سے باز نہ آئے تو ہم تم تینوں کو مار ڈالیں گے یا سخت قسم کی تکالیف میں بتلا کر دیں گے انھوں نے جواب دیا خدا کی نافرمانی کر کے نحوست تو تم خود اپنے اوپر لا چکے ہو، اس سے زیادہ نحوست اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم نصیحت اور خیر خواہی تک کو قبول نہیں کرتے بلکہ اور زیادہ حد سے گزرتے جاتے ہو؟

بستی کے آخری کنارے پر ایک نیک مرد رہتا تھا اس نے جب سنا کہ بستی والے خدا کے رسولوں کو جھٹلا رہے اور طرح طرح کی دھمکیاں دے رہے ہیں تو عجلت کے ساتھ وہاں آپہنچا جس جگہ یہ گفتگو ہو رہی تھی اور کہنے لگا اے قوم خدائے تعالیٰ کے پیغمبروں کی پیروی کر، ان مقدس لوگوں کی پیروی سے کیوں منہ موڑتی ہے جو تجھ سے اس خدمت حق کا کوئی معاوضہ تک نہیں طلب کرتے اور جو خدا رسیدہ اور ہدایت مآب انسان ہیں بتاؤ میں کیوں

اس ایک خدا کی ہی پرستش نہ کروں جس نے مجھ کو نیست سے ہست کیا ہے اور مرنے کے بعد میں اور تم سب اسی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں تم جو ان برگزیدہ انسانوں کی تکذیب کر رہے ہو تو میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا مجھ کو خدائے واحد کے سوائے معبودان باطل کو اپنا خدا مان لینا چاہیے کہ اگر وہ ذات واحد جو نہایت ہی مہربان اور رحم والا ہے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ارادہ کر لے تو ان معبودان باطل کی نہ سفارش کارگر ہو سکے اور نہ وہ اس نقصان سے مجھ کو بچا سکیں اگر تمہارا مقصد یہ ہے تو ایسی صورت میں بلا شبہ میں تو سخت گمراہی میں پھنس جاؤں گا لہٰذا کان کھول کر سن لو کہ تم ان مقدس انسانوں کی بات مانو میں تو اس ذات پر ایمان لے آیا جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔

قوم نے اپنی تکذیب اور مقدس رسولوں کی تصدیق میں نیک مرد کی یہ پر از ہدایت گفتگو سنی تو غیظ و غضب میں آگئی اور اس کو شہید کر ڈالا۔

واقعہ کا اس حد تک ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے جرات حق کی جزا میں اس کو جنت عطا کی اور جب اس نے اپنا پاک مقام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو وجد آفریں انداز میں کہنے لگا کاش کہ میری قوم کے لوگ یہ جان سکتے کہ میرے پروردگار نے مجھ کو مغفرت کا کیسا بیش بہا تحفہ عطا فرمایا اور میرا کس درجہ اعزاز واکرام کیا" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس مرد نیک کی قوم کی بد کرداری پر ان کو ہلاک کرنے اور سزا دینے کے لئے ہمیں آسمان سے کسی لشکر بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی فقط ایک ہولناک چیخ نے ان سب کا کام تمام کر دیا اور وہ جہاں کے تہاں بجھ کر رہ گئے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شاید ان بد بختوں نے خدا کے رسولوں کو بھی شہید کر ڈالا تھا، جیسا کہ انھوں نے ان کو دھمکی دی تھی اور اگرچہ قرآن عزیز میں یہ مذکور نہیں ہے مگر اس مرد شہید کے ذکر کے بعد چونکہ ان رسولوں کا کوئی ذکر نہیں ہے اس لئے قرینہ یہی شہادت دیتا ہے:"

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا أَصْحَابَ الْقَرْيَةِ إِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ○ إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا إِنَّآ إِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ○ قَالُوْا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَمَآ أَنْزَلَ الرَّحْمَانُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُوْنَ ○ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّآ إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ○ وَمَا عَلَيْنَآ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ○ قَالُوْٓا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيْمٌ ○ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ أَئِنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ○ وَجَآءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يَاقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ○ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَمَا لِيَ لَآ أَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ أَأَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖ آلِهَةً إِنْ يُّرِدْنِي الرَّحْمَانُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ○ إِنِّيْٓ إِذًا لَّفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ ○ إِنِّيْٓ آمَنْتُ

بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ○ قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ○ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ○ وَمَآ أَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ○ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ ○

(اے پیغمبر) ان (مشرکین مکہ) سے بستی والوں کا واقعہ بیان کر جب کہ ان کے پاس خدا کے رسول آئے۔ جب صورت ہوئی کہ ہم نے اول ان کے پاس دو بھیجے تھے تو انھوں نے ان کو جھٹلایا تب ہم نے ان دونوں کو تیسرے کے ذریعہ سے قوت و عزت عطا کی، اب ان تینوں نے بستی والوں سے کہا "ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو خدا نے تمہارے پاس بھیجا ہے" بستی والوں نے کہا "بجز اس بات کے کہ تم بھی ہماری طرح ایک انسان ہو کون سی ایسی خوبی ہے کہ تم خدا کے رسول ہو اور رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا اسلئے تم صاف جھوٹے ہو، ان تینوں نے کہا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم یقیناً خدا کے فرستادہ ہیں اور ہمارے ذمہ صرف واضح اور صاف طور پر خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے زبردستی قبول کرا دینا ہمارا کام نہیں ہے بستی والے کہنے لگے ہم تو تم کو منحوس سمجھتے ہیں پس اگر تم اس (تبلیغ) سے باز نہ آئے تو ہم تم کو سنگسار کر دیں گے اور سخت قسم کا عذاب چکھائیں گے" انھوں نے کہا تمہاری نحوست تو خود تمہارے ساتھ وابستہ ہے کہ تم کو جو نصیحت کی جاتی ہے اسکو نحوست کہتے ہو بلکہ تم تو حد سے گزر رہے ہو اور شہر کے آخری کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کہا "اے قوم تم خدا کے رسولوں کی پیروی کرو، ان کی پیروی کرو جو تم سے اپنی نیک ہدایت پر کوئی اجرت طلب نہیں کرتے اور مجھے کیا بات مانع ہے کہ میں صرف اپنے پیدا کرنے والے ہی کی پرستش نہ کروں اس کی پرستش جسکی جانب ہم تم کو لوٹ جانا ہے کیا میں اس ذات واحد کے سوائے باطل معبودوں کو خدا بنالوں کہ اگر رحمٰن مجھ کو کچھ نقصان پہنچانا چاہے تو ان باطل معبودوں کی نہ کچھ سفارش چل سکے اور نہ وہ اس مضرت سے بچا سکیں میں اگر ایسا کروں تو کھلا گمراہ ہوں۔ بیشک میں تو اپنے اور تمہارے پروردگار پر ایمان لے آیا۔ تم خوب کان لگا کر سن لو تب اسکو ہماری جانب سے کہا گیا جنت میں بے سزا داخل ہو جا اس نے کہا کاش کہ میری قوم جان لیتی کہ میرے پروردگار نے مجھے مغفرت کا کیسا اچھا تحفہ دیا اور مجھ کو ان لوگوں میں شامل کر لیا جن کو اس نے اعزاز و اکرام سے نوازا ہے اور ہم نے اسکی موت کے بعد اسکی قوم پر ایمان سے کوئی لشکر سزا دینے کیلئے نہیں اتارا اور ہم کو ایسا کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی، (انکی سزا کیلئے) اور کچھ نہیں تھا مگر ایک ہولناک چیخ، پس وہ وہیں بجھ کر رہ گئے۔ (یعنی ہلاک ہو گئے)۔

مفسرین اور ارباب سیرت اس واقعہ کے زمانہ اور تفصیلات میں اس درجہ مشکوک اور متردد نظر آتے ہیں کہ ان کے بیانات روایات سے واقعہ کی تعیین ناممکن ہو جاتی ہے اس لئے ہم یہی کہہ سکتے ہیں قرآن عزیز نے اپنے مقصد عظمیٰ "موعظت و عبرت" کے پیش نظر جس قدر بیان کیا ہے وہ ایک صاحب بصیرت کے لئے کافی و شافی ہے خدا کی اس سرزمین پر حق و باطل کے جہاں بہت سے واقعات ہو گزرے ہیں اور اس پیر فلک نے اس سلسلہ میں جتنے ورق بھی الٹے ہیں ان میں ایک یہ واقعہ بھی اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ہو گزرا ہے، بستی، نیک مرد اور مقدس رسولوں کے نام معلوم ہوئے تب اور نہ ہوئے تب نفس واقعہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑتا،

کیونکہ تاریخ کے جن اوراق نے نوح اور قوم نوح علیہ السلام ہود علیہ السلام اور عاد، صالح علیہ السلام اور ثمود، ابراہیم علیہ السلام، لوط علیہ السلام اور قوم لوط علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور فرعون، عیسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے معرکہ حق و باطل کے تفصیلی حالات و واقعات کو اپنے سینہ میں آج تک محفوظ رکھا ہے اس میں اگر اس واقعہ کا بھی اضافہ ہو جائے جس کا مختصر و مجمل ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے تو کون سی حیرت کی بات اور تعجب کا مقام ہے۔

واقعہ کا حاصل یہی تو ہے کہ چند مقدس پیغمبروں نے ایک بے راہ رو مخلوق کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اس نے از راہ عناد و گمراہی ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا حتی کہ خدا رسیدہ ہادیوں کو قتل کر دینے سے بھی باز نہ رہے تو اس قسم کے واقعات کو تاریخ نے صرف بنی اسرائیل ہی میں اتنی بار دہرایا ہے کہ تاریخ اقوام و ملل کا حق آگاہ ایک لمحہ کیلئے بھی اسکے متعلق تردد نہیں کر سکتا۔

واقعہ سے متعلق اقوال

ابن اسحٰق بروایت کعب احبار، وہب بن منبہ و عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ شہر انطاکیہ (شام) کا ہے، اس شہر کے لوگ بت پرست تھے اور ان کے بادشاہ کا نام انطخیس بن انطخیس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے تین پیغمبروں صادق، صدوق اور شلوم کو بھیجا اور شہر کی آخری سمت سے جو نیک مردان کی تائید کیلئے آیا اس کا نام حبیب تھا پھر کوئی کہتا ہے کہ یہ عابد و زاہد اور مرتاض تھا، اور شہر کے کنارے عبادت میں مصروف رہتا تھا اور کسی کا قول ہے کہ وہ ریشمی یا سوتی کپڑا بننے کا کام کرتا تھا اور اور صاحب صدقات و خیرات تھا۔[1] غرض ان کے نزدیک یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت قدیم زمانہ کا ہے اور قتادہؒ کہتے ہیں یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ کا ہے اور شہر انطاکیہ ہی کا واقعہ ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے تین حواری شمعون، یوحنا اور پولس کو وہاں بھیجا تھا کہ جا کر ان کو حق کی دعوت دیں اور پیغام الٰہی سنائیں مگر اہل شہر نے قبول نہ کیا اور ان کی ہی بستی کے ایک نیک مرد نے جب ان کو قبول حق کی ترغیب دی تو انھوں نے اس کو قتل کر ڈالا اور پاؤں سے کچل کر اس کی نعش کی توہین کی اس شخص کا نام حبیب تھا اور یہ نجاری (بڑھئی) کا پیشہ کرتا تھا، تب اللہ تعالیٰ نے اس بستی پر چیخ کا عذاب مسلط کر دیا کہتے ہیں کہ جبریل فرشتہ نے ایسی ہولناک چیخ کی کہ اہل بستی اس کو سن کر جس حالت میں بھی تھے اسی حالت میں مر کر رہ گئے۔ (ایضاح ۳و تاریخ ابن کثیر ج اص ۲۳۰،۲۲۹)

تبصرہ

یہ روایت یا اقوال کعب احبار اور وہب بن منبہ کی اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں حتی کہ ابن اسحٰق کے پاس ان کیلئے مکمل و مسلسل سند بھی نہیں ہے اس لئے "بلغنی" کہہ کر بیان کرتا ہے اور اس قسم کی روایات میں خواہ مخواہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا نام آجانا اور تفسیری قصص و حکایات کو بغیر سند ان کی جانب منسوب کر دینا تو ایک عام بات ہو گئی ہے۔

یہ ہم نے اسلئے کہا کہ ہر دو واقعات اپنے تفصیلی جزئیات کے لحاظ سے غیر تاریخی ہیں بلکہ بعض تاریخی مسلمات کی تردید کرتے ہیں اور قرآن عزیز کے ظاہر سیاق کے بھی خلاف ہیں۔ چنانچہ مشہور محدث و مؤرخ

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲و تاریخ ابن کثیر ج اص ۲۲۹۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے اور دوسرے واقعہ پر تو یہ مشترک اعتراض واقع ہوتا ہے کہ شہر انطاکیہ ان چار مسیحی شہروں میں سے ہے جن کے متعلق باتفاق علماء سیر و تاریخ یہ ثابت ہے کہ وہ دعوت مسیح کے مرکز شمار کیے جاتے ہیں اسلئے کہ باختلاف زمانہ ان شہروں میں جس وقت دعوت مسیح علیہ السلام پہنچی ہے انھوں نے برضا و رغبت اس پر لبیک کہا ہے اور وہ مسیحی پیغام کیلئے مدد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ مسیحیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ چار مقامات مقدس مقامات ہیں اور بطریق (پاپائے اعظم) کا دارالخلافہ القدس (بیت المقدس) انطاکیہ، اسکندریہ اور روما (اٹلی) بیت المقدس اسلئے کہ وہ مسیح علیہ السلام کا وطن ہے اور انطاکیہ اسلئے کہ یہ پہلا شہر ہے جس کی کل آبادی ایک ہی وقت میں حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لائی اور اسکندریہ اسلئے کہ یہ پہلا شہر ہے۔ جس کے باشندوں نے صلح و آشتی کے ساتھ یہ منظور کیا کہ مسیحی مقدسین بطریق (پوپ) مطران، اسقف، قسیس، شماس، اور راہب[1] یہاں اپنے اختیارات کے ساتھ قیام کریں گے اور روما اسلئے کہ قسطنطین اعظم کا دارالسلطنت تھا کہ جس نے عیسائی مذہب کو نئے سانچے میں ڈھال کر فروغ دیا اور دعوت مسیح علیہ السلام سے قبل بھی کسی تاریخی شہادت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انطاکیہ کسی زمانہ میں غضب الٰہی سے برباد و تباہ کر دیا گیا تھا اور بعد میں پھر بارونق شہر بن گیا۔ لہٰذا ہر دو اقوال کے مطابق اس واقعہ کو انطاکیہ سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

اور قتادہؒ کی روایت پر مسطورۂ بالا اعتراض یہ ہے کہ قرآن کا ظاہر سیاق یہ بتا رہا ہے کہ معذب بستی کی ہدایت کے لئے جو برگزیدہ انسان بھیجے گئے تھے وہ حضرت مسیح علیہ السلام یا کسی دوسرے نبی کے فرستادہ یعنی رسول خدا کے قاصد و ایلچی نہ تھے بلکہ براہ راست خدا کے پیغمبر اور نبی تھے اس لئے کہ اگر وہ حضرت مسیح علیہ السلام کے فرستادہ ہوئے تو قرآن عزیز ضرور اس جانب کوئی اشارہ کرتا مگر ایسا نہیں ہے بلکہ تمام آیات میں ان کے متعلق لفظ ارسلنا (ہم نے ان کو بھیجا) استعمال کیا گیا ہے بلکہ رسولوں اور شہر کے باشندوں کے مکالمے کے جملے تو جب ہی بغیر کسی تاویل کے واضح مطلب ادا کرتے ہیں جب کہ ان کو براہ راست خدا کا رسول مانا جائے۔

وہ یہ کہ ان برگزیدہ انسانوں نے جب خود کو رسول ظاہر کیا تو اہل شہر ان پر وہی پرانا اعتراض وارد کرنے لگے جو ہمیشہ منکرین رسول کہتے چلے آئے ہیں انھوں نے کہا تم تو ہم ہی جیسے انسان ہو پھر رسول کیسے ہو سکتے ہو اور رحمٰن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں کیا تم جھوٹ کہتے ہو کہ تم پر خدا کا پیغام نازل ہوتا ہے پس اگر وہ خود خدا کے رسول نہیں تھے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواری تھے تو بلاغت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ جواب میں یہ نہ کہتے اللہ خوب جانتا ہے کہ ہم تمہاری جانب رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بلکہ جواب یہ دیتے کہ ہم تو خدا کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد ہیں اور تم کو دعوت حق دینے آئے ہیں۔ رہا انسان ہونے کا معاملہ تو اللہ کے پیغمبر انسان ہی ہوتے ہیں۔ فرشتے یا کسی اور مخلوق میں سے نہیں ہوتے۔" (تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ یٰسین و فتح الباری ج ٦)

ابن کثیر نے اس موقع پر ایک تیسرا اعتراض بھی کیا ہے مگر وہ چونکہ ہمارے نزدیک خود محل نظر ہے اس لئے نظر انداز کر دیا گیا۔

طبرانی نے معجم میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

۱: پادریوں کے مناسب اور عہدے ہیں۔

کہ تین ہستیاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی نقیب کہلاتی ہیں ایک موسیٰ علیہ السلام کے نقیب یوشع علیہ السلام دوسرے اصحاب یٰسین حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نقیب اور تیسرے نبی اکرم ﷺ کے نقیب علی رضی اللہ عنہ۔

تو اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے ہی وابستہ ہے مگر محدثین کے نزدیک یہ حدیث ضعیف بلکہ ناقابل اعتماد ہے۔ اس لئے اس کی سند میں ایک راوی حسین الاشقر ہے اور یہ کذاب اور متروک الحدیث ہے۔ (فتح الباری ج ٦)

امام بخاریؒ نے اگرچہ اس واقعہ سے متعلق کوئی روایت نہیں بیان فرمائی مگر انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ میں اس واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مقدم رکھا ہے اور آیت کو نقل کر کے صرف حل لغات کر دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیر اور امام بخاری کا رجحان یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل کا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے۔

الحاصل واقعہ کی جزئی تفصیلات کچھ بھی ہوں قرآن نے اس سلسلے میں جو حصہ نقل کیا ہے وہ اس کے مقصد عظمیٰ کو پورا کرتا اور اہل مکہ اور ارباب بصیرت کو عبرت و بصیرت کی دعوت دیتا ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور خاتم الانبیاء ﷺ کے پیغام رشد و ہدایت سے اصحاب قریہ کی طرح منہ موڑ کر خسر الدنیا والآخرۃ کا سبب نہ بنیں۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ

رحمٰن

اصحاب قریہ اگرچہ مشرک اور بت پرست تھے۔ مگر ان میں مذہب حق کی کچھ جھلک موجود تھی اور ان کے یہاں رحمٰن کا تصور پایا جاتا تھا کیا عجب ہے کہ بمصداق آیت وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡہَا نَذِیۡرٌ۔

کوئی قوم ایسی نہیں کہ جہاں ہمارا انذیرنہ پہنچا ہو وہ اس دعوت سے قبل عرصہ تک کسی پیغمبر صادق کے پیرو رہے اور آہستہ آہستہ زمانۂ دراز کے بعد شرک میں مبتلا ہو گئے ہوں۔

موعظت

۱) ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں ہمیشہ سے اہل باطل کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ خدا کا پیغمبر انسان نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی مافوق الفطرۃ ہستی کو "رسول اللہ" ہونا چاہیے اسی لئے قوم نوح علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ کی امت دعوت تک ہر ایک گروہ نے سب سے پہلے اسی پر تعجب یا نفرت کا اظہار کیا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری ہی طرح کا انسان اور لوازمات بشری کا محتاج انسان خدا کا پیغمبر ہو۔ چنانچہ اصحاب قریہ کی طرح محمد ﷺ سے مشرکین مکہ نے بھی یہی کہا:

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ ط

یہی کیسا رسول ہے کہ ہماری ہی طرح کھاتا پیتا اور ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

: فتح الباری ج ٦ و تفسیر ابن کثیر ج ۳۔

أَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا

کیا انسان ہماری ہدایت کریں گے

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُّؤْمِنُوْٓا إِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى إِلَّآ أَنْ قَالُوْٓا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ متعجب ہو کر کہنے لگے کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے۔

مگر ان کے اس جاہلانہ سوال کا قرآن عزیز نے یہ فیصلہ کن جواب دے کر ہمیشہ کیلئے اس بحث کا خاتمہ کر دیا:

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○

اے پیغمبر کہہ دے کہ اگر ایسا ہوتا کہ زمین میں انسانوں کی جگہ فرشتے بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے۔

یعنی اس سوال کی بنیاد ہی بے وقوفی پر مبنی ہے اس لئے کہ جب دنیا میں انسان بس رہے ہیں اور فرشتوں کی آبادیاں نہیں ہیں تو پھر ان کی ہدایت کے لئے رسول اور پیغمبر بھی انسان ہی ہونا چاہیے نہ کہ فرشتہ۔

۲) جہاں شر و فساد اور فتنہ و گمراہی کے جراثیم بہ کثرت موجود ہوتے ہیں وہاں خیر و سعادت کی بھی کوئی روح ضرور نکل آتی ہے اور وہ کلمۂ حق کی تائید میں جان کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتی چنانچہ جس طرح اصحاب یٰسین کی حمایت میں شہر کے آخری حصہ سے ایک نیک مرد نکل آیا اور اس نے اپنی قوم کو نصیحت کی اور اس صلہ میں جان دی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قیام مصر کے زمانہ میں بھی شہر کے دور دراز سے ایک نیک مرد بھاگ کر آیا تھا اور اس نے موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت جان کے لئے نیک صلاح دے کر اپنا فرض ادا کیا تھا۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○

۳) حق و باطل کے معرکہ میں حق کی حقانیت اور باطل کی بطالت کا ایک کھلا ہوا مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ حق جوں جوں دلائل و براہین کی روشنی میں اپنی صداقت کو جلوہ گر کرتا جاتا ہے باطل اسی درجہ زیادہ مشتعل ہو کر اور حق کی روشنی سے خیرہ ہو کر دلائل کی جگہ جنگ و جدل پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر حق کے پرستار اس کی مطلق پروا نہیں کرتے بلکہ وفور جوش اور والہانہ شوق کے ساتھ حق پر جان قربان کر دیتے ہیں، چنانچہ اصحاب قریہ کا واقعہ اس کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔

حضرت لقمان (رضی اللہ عنہ)

(۳۰۰۰ ق۔م۔)

- لقمان
- قرآن عزیز اور حضرت لقمانؓ
- نبوت یا حکمت، چند تفسیری مطالب
- حکمت لقمان
- مواعظ

لقمان

لقمان یا حکیم لقمان، اہل عرب کے یہاں ایک مشہور شخصیت ہے لیکن اس کے باوجود ان کے حالت اور خاندان و نسب سے متعلق مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور اس اتفاق کے علاوہ کہ وہ ایک بہت بڑے دانا (حکیم) تھے اور ان کے حکیمانہ اقوال صحیفہ لقمان کے نام سے ان کے درمیان معروف و مشہور تھے ان سے متعلق باقی امور میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں۔

اور یہ اس لئے کہ تاریخ قدیم میں لقمان نام کی ایک اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جو عادِ ثانیہ (قوم ہود علیہ السلام) میں ایک نیک بادشاہ ہو گزرا ہے اور خالص عرب نژاد ہے ابن جریر ابن کثیر، سہیلی جیسے مؤرخین کی رائے یہ ہے: مشہور لقمان حکیم (افریقی النسل تھا اور عرب میں ایک غلام کی حیثیت میں آیا تھا چنانچہ یہ حضرات اس کا نسب نامہ اور حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

هو لقمان بن عنقا بن سندون او لقمان بن ثار بن سندون......

(روض الالف، ج۱ ۔ ابن کثیر، ج ۲ و تفسیر ابن کثیر، ج۳)

وہ لقمان بن عنقا یا ثار بن سندون ہے اور کہتے ہیں کہ وہ سوڈان کے نوبی قبیلہ سے تھا اور پستہ قد بھاری بدن سیاہ رنگ تھا ہونٹ موٹے حکمت سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور بعض یہ بھی کہتے کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں عہدۂ قضا پر مامور ہو گیا تھا۔

عن ابن عباس قال كان عبدا حبشيا نجارا۔ وعن جابر بن عبد الله قال كان لقمان قصيرا افطش من النوبة ۔ (روض الانف ج۱، ابن کثیر ج۲، تفسیر ابن کثیر، ج۳)

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے فرماتے تھے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور نجاری کا پیشہ کرتے تھے اور جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ لقمان پستہ قد موٹے ہونٹ والے نوبہ کے قبیلے سے تھے۔

وعن سعيد بن المسيب كان لقمان من سودان مصر ذا شافر اعطاه الله الحكمة ومنعه النبوة ۔ (روض الانف ج۱، ابن کثیر ج۲، تفسیر ابن کثیر، ج۳)

اور سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ لقمان مصری سوڈانی تھے اور ان کے ہونٹ بہت موٹے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو اگرچہ نبوت نہیں عطا کی مگر حکمت و دانائی سے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا۔

عن عبد الرحمن بن حرملة قال جاء اسود الى سعيد بن المسيب يسأله فقال له سعيد لا تحزن من اجل انك اسود فانه كان من اخير الناس ثلثة من السودان بلال و مهجع مولى عمر رضى الله عنه ولقمان الحكيم كان اسود نوبيا ذا شافر۔ (تاریخ ابن کثیر، ج ۲)

عبدالرحمٰن بن حرملہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حبشی سعید بن مسیبؒ کے پاس آنکلا اور کچھ سوال کیا انھوں نے فرمایا تو اس بات سے دل گیر نہ ہو کہ کالا حبشی ہے اسلئے کہ سوڈانیوں میں تین آدمی دنیا کے بہترین انسان ہوئے ہیں بلالؓ، حضرت عمرؓ کا غلام مجع اور لقمان حکیم جو سوڈانی نوبی تھے اور ان کے لب بہت موٹے اور بھدے تھے۔

اور مشہور مؤرخ اور صاحب مغازی محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ لقمان حکیم عرب کے مشہور قبیلہ عاد سے یعنی عرب بائدہ کی نسل سے تھے اور غلام نہ تھے بلکہ بادشاہ تھے۔

قال وهب فلما مات شداد بن عاد صار الملك الى اخيه لقمان بن عاد و كان اعطى الله لقمان مالم يعط غيره من الناس فى زمانه اعطاه حاسة مائة رجل و كان طويلا لا يقارب اهل زمانه۔

وہب بن منبہ کہتے ہیں جب شداد بن عاد کا انتقال ہو گیا تو حکومت اس کے بھائی لقمان بن عاد کو ملی اور اللہ تعالیٰ نے لقمان کو وہ چیز عطا فرمائی تھی جو اس زمانے کے انسانوں میں کسی کو نہیں عطا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کو سو انسانوں کی برابر ادراک و حاسہ عطا فرمایا تھا اور وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ طویل قامت تھے۔

قال وهب قال ابن عباس كان لقمان بن عاد بن الملطاط بن السلك بن وائل بن حمير نبيا غير مرسل ۔ (كتاب التيجان ص ۷۰)

وہب کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے تھے کہ لقمان بن عاد کا نسب نامہ یہ ہے: "ملطاط بن سلک بن وائل بن حمیر" اور وہ نبی تھے مگر رسول نہیں تھے۔

اور لطف یہ ہے کہ ابن جریر اور ابن کثیر بھی اپنی تائید میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ہی کا قول نقل کرتے ہیں اور ابن اسحٰق بھی ان ہی کے قول کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں اور معاصر مؤرخین میں سے مصنف ارض القرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ لقمان حکیم اور لقمان بادشاہ ایک ہی شخصیت ہے اور وہ بلا شبہ عاد ثانیہ کے نیک بادشاہوں میں اور بہت بڑے حکیم و دانا تھے اور عرب لقمان کے نام سے جو "صحیفہ" منسوب تھا وہ ان ہی لقمان عاد کا ہے۔ اور وہ اپنے اس دعوی کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ دیتے ہیں کہ شاعر جاہلی سلمٰی بن ربیعہ کے یہ اشعار اس حقیقت کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔

اهلكن طسما و بعده ... غذى بهم و ذا جدون
و اهل جاش و مارب ... و "حى لقمان" والتقون

"حوادث زمانہ نے قبیلۂ طسم کو اور اسکے بعد ذاجدون شاہ یمن کو اہل جاش ومارب کو اور قبیلہ لقمان کو مٹادیا۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں:

اس دوسرے شعر سے نہ صرف لقمان کا عرب ہونا ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک قبلہ کا مالک یمن کا باشندہ اور عظمت و شوکت میں سبا کا مقابل اور یہ تمام باتیں لقمان عاد پر صادق آتی ہیں۔

عاد کا یک کتبہ جو ۱۸ھ میں ملا تھا اس میں چند حسب ذیل فقرے ہیں:

ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے اور ہود کی شریعت کے مطابق ہمارے واسطے پیدا ہوتے تھے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔"

کیا ہم ان آخری الفاظ سے جو کاغذ پر نہیں پتھر پر لکھے پائے گئے ہیں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے ہیں کہ صحیفۂ لقمان کے اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے ہوئے تھے۔ (ارض القرآن ج ۱ ص ۱۸۱، ۱۸۲)

قرآن عزیز اور حضرت لقمان

حضرت لقمان کا ذکر قرآن عزیز نے بھی کیا ہے اور قرآن کی ایک سورۃ کا نام اسی تقریب سے سورۂ لقمان ہے اور اگرچہ اس نے اپنے پیش نظر مقصد کی خاطر ان کے نسب و خاندان کی بحث میں جانا پسند نہیں کیا تاہم ان کے حکیمانہ مقولات کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس سے لقمان کی شخصیت پر ایک حد تک روشنی ضرور پڑتی ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کو بیان کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ مسطورۂ بالا ہر دو رایوں میں سے کون سی رائے صحیح یا قرین قیاس ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ أَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ط وَمَنْ يَّشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○ وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يَابُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ط إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ط إِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى أَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ يَابُنَيَّ إِنَّهَآ إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللّٰهُ ط إِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ○ يَابُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ أَصَابَكَ ط إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ○ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ط إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ○ وَاقْصِدْ فِيْ

مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ط إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ

اور بلاشبہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی (اور کہا کہ) اللہ کا شکر ادا کرو پس شخص اس کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے نفس کے فائدہ کیلئے کرتا ہے اور جو کفر کرتا ہے تو اللہ بے پرواہ ہے مالک حمد ہے اور جس وقت لقمان نے اپنے بیٹے سے نصیحت کرتے ہوئے کہا اے میرے بیٹے اللہ کا شریک نہ ٹھہرا بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور ہم نے حکم کیا انسان کو اس کے ماں باپ کے بارے میں کہ اٹھاتی ہے اس کو اس کی ماں تکلیف در تکلیف جھیل کر اور دو برس کے اندر دودھ پلاتے رہنا یہ کہ میرا شکر گزار بن اور اپنے والدین کا شکر گزار ہو، آخر میری ہی جانب لوٹنا ہے اور اگر تیرے ماں باپ تجھ پر سختی کریں اس بارے میں کہ میرا شریک ٹھہرا کہ جس کے متعلق وہ نادانی اور جہالت میں ہیں تو اس میں ان دونوں کی پیروی نہ کر اور دنیوی زندگی میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کر اور پیروی اس شخص کی کر کہ جو صرف میری ہی جانب رجوع کرتا ہے پھر میری ہی جانب تم سب کو لوٹنا ہے۔ پس میں اس وقت تم کو تمہارے کیے کی خبر دوں گا اے میرے بیٹے بلاشبہ اگر رائی کے دانہ کی برابر بھی کوئی چیز چھوٹی ہوتی ہے اور وہ پتھر کے اندر یا آسمانوں یا زمینوں میں کہیں بھی ہو اللہ اس کو لے آتا ہے۔ بے شک اللہ دقیق مشاہدہ کرنے والا خبردار ہے۔ اے میرے بیٹے قائم کر نماز کو اور حکم کر بھلائی کا اور برائی سے منع کر اور جو تجھ پر پڑے اس پر صبر کر، بلاشبہ یہ عزائم امور میں سے ہے اور تو اپنے رخساروں کو لوگوں سے (از راہ تکبر) نہ پھیر اور زمین پر اترا کر نہ چل بے شبہ اللہ تعالیٰ کسی تکبر اور شیخی کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر و اور اپنی آواز کو نرم و پست کر۔ بے شبہ گدھے کی آواز بہت ہی ناپسندیدہ آواز ہے۔ (لقمان پ۲۱ ع۱)

ان آیات میں لقمان نے اپنے بیٹے کو نصائح کی ہیں حکمت و دانائی کی باتیں بتائی ہیں ان میں ان باتوں پر بھی زور دیا ہے کہ:

۱) لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کے ساتھ پیش آنا چاہیے یہ نہ ہو کہ از راہ غرور منہ موڑ لیا جائے۔

۲) اور نہ خدا کی زمین پر اکڑ کر چلو، یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ خدائے تعالیٰ مغرور اور اکڑنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

۳) ہمیشہ رفتار میں متواضعانہ میانہ روی قائم رہنی چاہیے۔

۴) اور آواز کو گفتگو میں نرم رکھو اس لئے کہ چیخنا چلانا انسانوں کا کام نہیں ہے اگر کرخت اور بے وجہ بلند آواز پسندیدہ چیز ہوتی تو گدھے کی آواز قابل ستائش سمجھی جاتی حالانکہ اس کی آواز بدترین آواز شمار ہوتی ہے۔

حکیم لقمان اگر غلام ہوتے تو اپنے بیٹے غلام زادہ کو یہ نصائح نہ کرتے اس لئے کہ غرور و نخوت، خود بینی و شیخی، کرختگی و خشونت ایسے اوصاف ہیں جو بادشاہوں، شاہزادوں، متمول صاحب اقتدار انسانوں کے اندر ہی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ ناخداترس اور نشۂ دولت میں چور دولت مندوں ہی کا شیوہ ہو سکتا ہے اور یہ وہ تمام اوصاف وعادات ہیں جو عموماً متکبرین اور جبابرہ کے لئے مخصوص ہیں غلام اور غلام زادہ کے لئے نہ ان کا موقع ہے نہ فرصت کیوں کہ ان کا وقت عزیز تو دوسروں کی نیاز مندی اور خدمت گزاری ہی کے لئے وقف ہوتا ہے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اسی لئے یہ فرمایا ہے:

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

اس تفصیل کے بعد جو کہ قرآن عزیز سے ماخوذ ہے اب ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ لقمان حکیم اور لقمان عاد ایک ہی شخصیت ہے وہ عاد ثانیہ کے نیک نفس بادشاہ اور حضرت ہود علیہ السلام کے پیرو تھے اور حبشی الاصل نہیں بلکہ عربی الاصل تھے اور صاحب سیرت محمد بن اسحاق کی نقل اور شاعر جاہلی سلمیٰ بن ربیعہ کی شہادت اس مسئلہ میں صحیح اور راجح ہیں اور عاد ثانیہ کے زمانہ کے حجری کتبہ میں جو کہا گیا ہے اس سے مراد وہی صحیفۂ لقمان ہے جو عرب میں مشہور و معروف تھا۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر ان مرفوعہ روایات کو پیش کر کے ہمارے دعویٰ کی تردید کی جائے جن میں نبی اکرم ﷺ سے یہ منقول ہے کہ لقمان حکیم حبشی الاصل تھے مگر واضح رہے کہ صاحب جرح و تعدیل محدثین نے ان روایات کے رفع کو صحیح تسلیم نہیں کیا اور ان میں سے بعض کو ضعیف اور منکر قرار دیا ہے یعنی محدثین کے نزدیک نبی اکرم ﷺ سے یہ منقول نہیں ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے۔

نبوت یا حکمت؟

اگرچہ محمد بن اسحاق کی روایت "عن ابن عباس" میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت لقمان نبی تھے لیکن قرآن عزیز کا اسلوب بیان اس کی موافقت نہیں کرتا اس لئے کہ سورۂ لقمان میں باوجود اس امر کے کہ ان کی بعض حکیمانہ نصائح اور بلیغانہ وصایا کا ذکر بصراحت مذکور ہے لیکن کسی ایک جملہ میں بھی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا کہ جو ان کی نبوت پر دلالت کرتا ہو اسی لئے جمہور کی رائے اس کے خلاف ہے بلکہ خود حضرت ابن عباسؓ سے بھی دوسرا قول اس قول کے خلاف مذکور ہے چنانچہ ابن کثیر اپنی تاریخ میں فرماتے ہیں:

والمشهور عن الجمهور انه كان حكيما وليا ولم يكن نبيا وقد ذكره الله تعالىٰ فى القرآن فأثنى عليه وحكى من كلامه فيما وعظ به ولده الذى هو احب الخلق اليه۔ (تاریخ ابن کثیر، ج۲، ص۱۲۵)

اور جمہور کا مشہور قول یہ ہے کہ لقمان خدا کے ولی اور حکیم دانا تھے نبی نہیں تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کا قرآن میں ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی اور ان کے اس کلام کو بیان کیا جس میں انھوں نے اپنے بیٹے کو جو کہ خدا کی مخلوق میں ان کے لئے سب سے زیادہ محبوب تھا۔ نصیحت کی ہے۔

ولقد اتينا لقمن الحكمة قال يعنى الفقه والاسلام ولم يكن نبيا ولم يوح اليه وهكذا نص على هذا غير واحد من السلف منهم مجاهد وسعيد بن المسيب وابن عباس والله اعلم۔ (تاریخ ابن کثیر، ج۲، ص۱۲۵)

یعنی دانائی اور اسلام اور وہ نبی نہیں تھے اور نہ ان پر وحی نازل ہوئی اور بہت سے سلف سے یہی ثابت ہے مثلاً مجاہد و سعید بن مسیّب اور ابن عباس وغیرہ۔

چند تفسیری مطالب

۱) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے جو اہم نصیحت کی وہ شرک باللہ سے اجتناب اور توحید کا التزام ہے کیونکہ "دین حق" میں یہی وہ حقیقت ہے جو حنیف کو مشرک سے ممتاز کرتی ہے اور شرک ہی ایسا گناہ ہے جو کسی حالت میں بھی قابل بخشش نہیں مگر یہ کہ اس سے تائب ہو جائے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ ط

بیشک جو خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے اس کو خدائے تعالیٰ نہیں بخشے گا اور کفر و شرک کے علاوہ گناہ جس کیلئے چاہے گا بخش دے گا۔

۲) حضرت لقمان نے شرک کو "ظلم عظیم" فرمایا ہے اس سلسلہ میں بخاری کی ایک روایت ہے وہ یہ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ

خدا کی مغفرت ان لوگوں کیلئے ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر یہ بات بہت شاق گزری اور انھوں خدمت اقدس ﷺ میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایسا تو کوئی شخص بھی نہ ہو گا جس نے خدائے تعالیٰ کے احکام کے پیش نظر کچھ نہ کچھ ظلم نہ کیا ہو تب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

انه ليس بذلك الم تسمع الى قول لقمٰن يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

(بخاری، کتاب التفسیر)

آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کیا تم نے لقمان کا یہ قول نہیں سنا اے میرے بیٹے اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا بلا شبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آیت لَمْ يَلْبِسُوْا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ میں ظلم سے مراد "شرک" ہے نہ کہ معصیت صغائر و کبائر۔

۳) سورۂ لقمان میں وَإِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهِ سے لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ تک اور پھر يٰبُنَيَّ سے لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ تک حضرت لقمان کے مقولات بیان کیے گئے ہیں اور درمیان میں وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ سے أُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ تک بطور جملہ معترضہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے تو اس کے لئے وجہ مناسبت یہ ہے کہ جب قرآن نے ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا جس میں باپ نے بیٹے کو پند و نصائح کیے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے امت مرحومہ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھا کہ جب کہ باپ اور ماں کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیوی اور اخروی کسی معاملہ میں بھی اولاد کو بے راہ دیکھنا نہیں چاہتے تاکہ انجام کار اولاد کو دکھ جھیلنا نہ پڑے تو اولاد کے لئے از بس ضروری ہے کہ وہ خدا کی صحیح اور حقیقی معرفت کے بعد سب سے زیادہ والدین کی خدمت اور ان کی رضاجوئی کو مقدم سمجھے حتیٰ کہ اگر والدین کافر و مشرک ہوں تب بھی اس کا فرض ہے کہ ان کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک تواضع اور نیاز مندی کو ہاتھ سے نہ دے۔ البتہ اگر وہ دین

حق سے اعراض اور شرک کے اختیار پر اصرار کریں تو اس کو قبول نہ کرے۔ اس لئے کہ خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی ہے:

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق

لیکن اس مکالمہ میں بھی اپنے انکار کے وقت نرمی اور حسن خطابت کو نہ چھوڑے اور درشت کلامی اختیار نہ کرے۔

۴) سورۂ لقمان میں جو نصائح مذکور ہیں ان میں حسن خلق اور تواضع کی ترغیب اور کبر، شیخی اور بد خلقی کی مذمت کی گئی ہے حضرت لقمان نے امر و نہی میں ان باتوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے انتخاب فرمایا ہے کہ کائنات میں جس قدر بھی بھلائی اور برائی پیش آتی ہے ان سب کی جڑ اور بنیاد یہی امور ہیں چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے بھی امت مرحومہ کو ان امور کی اہمیت پر بہت زیادہ توجہ دلائی ہے۔

حسن خلق

قال رسول اللّٰه ﷺ بعثت لاتمم حسن الاخلاق ۔ (مؤطا امام مالك)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بے شبہ میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ محاسن اخلاق کو درجۂ کمال تک پہونچاؤں۔

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ ·قیل یا رسول اللّٰه ای المؤمن افضل قال احسنهم خلقا (بیهقی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کونسا مسلمان سب سے زیادہ صاحب فضیلت ہے؟ آپ نے فرمایا جو ان میں سب سے زیادہ حسن اخلاق رکھتا ہے وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔

عن انس قال رسول اللّٰه ﷺ ان العبد ليبلغ بحسن خلقه درجات الاخرة و شرف المنازل و انه لضعيف العبادة و انه ليبلغ بسوء خلقه درك جهنم و هو عابد ۔

(معجم طبرانی (مجمع الزوائد، ج۸، ص ۲۵)

حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے حسن اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات اور منازل علیا کو حاصل کر لیتا ہے اور عابد ہونے کے باوجود بد خلقی کی وجہ سے جہنم پاتا ہے۔

وقال ميمون بن مهران عن رسول اللّٰه ﷺ ما من ذنب اعظم عندا للّٰه من سوء الخلق ۔ (تفسیر ابن کثیر ج۳)

میمون بن مہران نبی اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے نزدیک بد خلقی سے زیادہ بڑا کوئی گناہ نہیں ہے۔

تواضع

قال رسول اللّٰه ﷺ طوبى للاتقياء الاثرياء الذين اذا حضر و الم يعرفوا و اذا غابوا لم

يتفقدوا و اولئك مصابيح مجردون من كل فتنة غبرآء مشتبه۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بشارت ہے نکوکار بے نفس لوگوں کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ مجلس میں موجود ہوں تو کوئی تعارف نہ کرے اور جب غائب ہو جائیں تو کوئی تلاش نہ کرے۔ یہی ہیں روشن چراغ اور ہر تاریک و پراگندہ فتنہ سے محفوظ۔

کبر و غرور

لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر۔ (اصحاب السنن)

عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں وہ شخص ہرگز داخل نہ ہوگا جس کے قلب میں ذرہ کی مقدار بھی غرور و کبر ہوگا۔

عن عبد الله بن عمرو قا رسول الله ﷺ من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر اكبه الله على وجهه في النار۔ (اصحاب السنن)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہے اس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اوندھے منہ گرادے گا۔

عن بريدة قال قال رسول الله ﷺ من جرثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه۔ (ـــ)

حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے لباس کو از راہ غرور زمین پر کھینچتا ہوا چلتا ہے اللہ قیامت کے روز اس کی جانب نظر رحمت سے نہ دیکھے گا۔

۵) حضرت لقمان نے درشت اور کرخت آواز سے بات چیت کرنے کو بھی منع فرمایا ہے اور یہ بہت واضح بات ہے اسلئے کہ نرم گفتاری حسن خلق کا شعبہ اور درشت و کرخت لہجہ بد خلقی کا جزء ہے اور اسی بناء پر اس طرز گفتگو کو "صوت حمار" سے مشابہ بتایا گیا اور نہیق حمار کے متعلق یہ حدیث بہت معروف و مشہور ہے:

عن ابي هريرة رضى الله عنه عن النبي ﷺ قل اذا سمعتم صياح الديكة فاسئلوا الله من فضله و اذا سمعتم نهيق الحمير فتعوذوا بالله من الشيطان فانها رأت شيطانا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۱۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جب تم مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے فضل طلب کرو اور گدھے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ مانگو اس لئے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز کرتا ہے۔

یعنی مرغ کی آواز ملائکۃ اللہ کے نزول کی دلیل ہے کیونکہ وہ سحر میں تسبیح کا عادی ہے اور حمار کی آواز نزول شیاطین کا پتہ دیتی ہے اس لئے کہ ہر مکروہ اور فطرت سلیم کو ناگوار شے شیطان کے لئے محبوب ہے۔

۶) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کی ہیں ان میں یہ بھی کہا ہے کہ "زمین پر اکڑ کر نہ چلو" اس مضمون کو قرآن عزیز نے دوسری جگہ عجیب انداز سے بیان کیا ہے:

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝

اور زمین پر اتراتا ہوا نہ چل تو اپنے اس انداز رفتار سے نہ زمین کو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک طویل ہو جائے گا۔ (بنی اسرائیل)

مغرور انسان کے انداز رفتار کو کس معجزانہ بلاغت کے ساتھ ادا کیا ہے گویا وہ اس طرح چلتا ہے کہ اپنی اکڑی ہوئی بلند گردن کے ذریعہ پہاڑوں کی بلندی سے بھی اونچا ہو جانا چاہتا ہے اور قدم کو اس طرح زمین پر رکھتا ہے کہ گویا اس کو پھاڑ ڈالے گا مگر یہ نہیں سمجھتا کہ وہ ان میں سے کوئی بات بھی نہ کر سکے گا پھر بلا وجہ اکڑ کر چلنے کے کیا معنی؟

اور اس کے برعکس متواضع اور بااخلاق انسانوں کی یہ کیفیت ہے کہ:

وَعِبَادُ الرَّحْمَانِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَّإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا ○

اور جو رحمٰن کے بندے (یعنی حکم بردار بندے) ہیں وہ زمین پر وقار اور تواضع کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ مخاطب ہوتے ہیں تو وہ (جہالت سے بچنے کیلئے) سلام کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔
(فرقان پ ۱۹ ع ۶)

حکمت لقمان

گذشتہ سطور میں یہ ذکر آچکا ہے کہ عرب میں حکمت لقمان کا کافی چرچا تھا اور وہ اکثر مجالس میں ان کے حکیمانہ اقوال کو نقل کرتے رہتے تھے چنانچہ تابعین صحابہ بلکہ نبی اکرم ﷺ سے بھی اس سلسلہ کے بعض اقوال منقول ہیں اور ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

۱) حکمت و دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔

۲) جب کسی مجلس میں داخل ہو تو اول سلام کرو پھر ایک جانب بیٹھ جاؤ اور جب تک اہل مجلس کی گفتگو نہ سن لو خود گفتگو شروع نہ کرو پس اگر وہ خدا کے ذکر میں مشغول ہوں تو تم بھی اس میں سے اپنا حصہ لے لو اور اگر وہ فضولیات میں مشغول ہوں تو وہاں سے علیحدہ ہو جاؤ اور دوسری کسی عمدہ مجلس کو حاصل کرو۔

۳) اللہ تعالیٰ جب کسی کو امانتدار بنائے تو امین کا فرض ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرے۔

۴) اے بیٹے خدائے تعالیٰ سے ڈر اور ریاکاری سے خدا کے ڈر کا مظاہرہ نہ کر کہ لوگ اس وجہ سے تیری عزت کریں اور تیرا دل حقیقتاً گنہ گار ہے۔

۵) اے بیٹے جاہل سے دوستی نہ کر کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ تجھ کو اس کی جاہلانہ باتیں پسند ہیں اور دانا کے غصہ کو بے پرواہی میں نہ ٹال کہ کہیں وہ تجھ سے جدائی نہ اختیار کر لے۔

۶) واضح رہے کہ داناؤں کی زبان میں خدا کی طاقت ہوتی ہے ان میں سے کوئی کچھ نہیں بولتا مگر یہ کہ اس بات کو اللہ تعالیٰ اسی طرح کرنا چاہتا ہو۔

۷) اے بیٹے خاموشی میں کبھی ندامت اٹھانی نہیں پڑتی اور اگر کلام چاندی ہے تو سکوت سونا ہے۔

۸) بیٹا ہمیشہ شر سے دور رہو تو شر تم سے دور رہے گا اس لئے کہ شر سے ہی شر پیدا ہوتا ہے۔

۹) بیٹا غیظ و غضب سے بچو اس لئے کہ شدت غضب دانا کے قلب کو مردہ بنادیتی ہے۔
۱۰) بیٹا خوش کلام بنو، طلاقت وجہ اختیار کرو تب تم لوگوں کی نظروں میں اس شخص سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤ گے جو ہر وقت ان کو داد و دہش کرتا رہتا ہے۔
۱۱) نرم خوئی دانائی کی جڑ ہے۔
۱۲) جو بوؤ گے وہی کاٹو گے۔
۱۳) اپنے والد کے دوست کو محبوب رکھو۔
۱۴) کسی نے لقمان سے دریافت کیا سب سے زیادہ صابر کون شخص ہے؟ کہا جس کے صبر کے پیچھے ایذا نہ ہو، پھر دریافت کیا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ جواب دیا جو دوسروں کے علم کے ذریعہ اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے پھر سوال کیا سب سے بہتر آدمی کون سا ہے فرمایا "غنی" سائل نے پھر کہا غنی سے مالدار مراد ہے؟ جواب میں کہا نہیں بلکہ غنی وہ ہے جو اپنے اندر خیر کو تلاش کرے تو موجود پائے ورنہ خود کو دوسروں سے مستغنی رکھے۔
۱۵) کسی نے دریافت کیا بدترین انسان کون سا ہے فرمایا جو اس کی پرواہ نہ کرے کہ لوگ اس کو برائی کرتا دیکھ کر برا سمجھیں گے۔
۱۶) بیٹا تیرے دستر خوان پر ہمیشہ نکوکاروں کا اجتماع رہے تو بہتر ہے مشورہ صرف علماء حق ہی سے لینا۔

مواعظ

۱) انسان اگر نبی معصوم اور پیغمبر بھی نہ ہو مگر حکمت و دانائی سے مشرف ہو تب بھی خدا کے نزدیک اس کا مرتبہ عظیم الشان ہے، اسی لئے حضرت لقمان کو یہ عزت ملی کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن عزیز میں ان کی ثناو توصیف فرمائی اور امت مرحومہ کے لئے ان کی بعض ان نصائح اور وصایا کو نقل فرمایا جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں حتیٰ کہ قرآن کی ایک سورۃ ان کے نام سے منسوب ہوئی۔
۲) شرک باللہ تمام بھلائیوں کو مٹا کر انسان کو خدا کے سامنے خالی ہاتھ لے جاتا ہے اس لئے ہمیشہ اس سے پرہیز لازم ہے۔
شرک جلی کی طرح شرک خفی بھی اعمال انسانی کو اس طرح کھالیتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھالیتی ہے اور شرک خفی میں ریاء نمائش اور شہرت پسندی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔
۳) والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی عظمت کو اسلام میں اس درجہ اہمیت حاصل ہے کہ قرآن عزیز نے ان کو رب مجازی کہا ہے اور انکی خدمت اور انکے سامنے سرنیاز جھکا دینے کو والدین کے اسلام کفر دونوں حالتوں میں ضروری قرار دیا ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر جگہ جگہ اپنے حق یعنی توحید باللہ کے ساتھ ساتھ حقوق والدین کا ذکر کیا اور ان کو تمام حقوق پر مقدم رکھا۔ چنانچہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا ○

اور حکم کر چکا تیرا رب کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اگر پہنچ جائے تیرے سامنے بڑھاپے کو ان میں سے ایک یا دونوں تو ان کو "اف" بھی نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو اور ان کے سامنے عاجزی کے ساتھ کاندھے جھکا دو نیاز مندانہ طریقہ پر اور کہو اے رب ان پر رحم کر جس طرح پالا انھوں نے مجھ کو چھوٹا سا تمہارا رب خوب جانتا ہے جو تمہارے جی میں ہے اگر تم نیک نفس ہو گے تو وہ رجوع ہونے والوں کو بخشتا ہے۔ (بنی اسرائیل پ ۱۵)

اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق احادیث تو بہت کثرت سے ذخیرۂ حدیث میں پائی جاتی ہیں حتیٰ کہ یہ کہا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔ (نسائی)

اصحابِ سبت

۱۰۰۰ق۔م۔(تخمیناً)

- قرآن عزیز اور اصحاب سبت
- سبت اور اس کی حرمت
- واقعہ کی تفصیلات تعیین مقام
- زمانہ
- حادثہ چند تفسیری حقائق
- حقیقت مسخ
- مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی
- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عکرمہ کا مکالمہ
- بصائر

قرآن عزیز اور اصحاب سبت

قرآن عزیز میں اصحاب سبت کا ذکر سورۂ بقرہ، نساء، مائدہ، اور اعراف میں کیا گیا ہے جس کی تفصیل ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔:

شمار	سورۃ	آیات	عدد
۱	بقرہ	۶۵-۶۶	۲
۲	نساء	۴۷	۱
۳	مائدہ	۶۰	۱
۴	اعراف	۱۶۳-۱۶۶	۴/۸

سبت اور اس کی حرمت

قصص القرآن کے گذشتہ مباحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے دین حنیف یعنی خدا کے سچے دین کی تعلیم کا سلسلہ ان کی دو شاخوں بنو اسمٰعیل اور بنو اسحٰق کے ذریعہ قوموں اور ملکوں میں پھیلا ہے اسلئے ان دونوں سلسلوں میں "شعائر اللہ" کے متعلق یکساں اصول پائے جاتے ہیں۔ مگر حضرت اسحٰق علیہ السلام کے صاحبزادہ اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کی اولاد نے جو کہ بنی اسرائیل کہلاتی ہے اپنے زمانہ کے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف اور جھگڑے کر کے بعض معاملات میں تشدد اور سختی کے احکام اور بعض معاملات میں ملت ابراہیمی سے جدا احکام کا بار اپنے کاندھوں پر ڈال لیا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت میں عبادت الٰہی کیلئے ہفتہ کے سات دنوں میں سے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ یہود بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کج روی کی بناء پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ اصرار کیا کہ ان کیلئے ہفتہ (سنیچر) کا دن عبادت و برکت کا دن مقرر کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آجائیں اور ملت ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو خدائے برتر کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے "ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں لیکن جب ان کا اصرار حد سے متجاوز ہو گیا تو وحی الٰہی نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ اطلاع دی کہ خدائے تعالیٰ ان کے اصرار بیجا کے نتیجہ میں جمعہ کی سعادت و برکت کو ان سے واپس لے لیتا اور ان کے مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے ان کے لئے ہفتہ (سنیچر) کو جمعہ کا قائم مقام بنائے دیتا ہے لہٰذا اب آپ ان کو مطلع کر دیں کہ وہ اپنے اس مطلوبہ دن کی عظمت کا پاس و لحاظ کریں اور اس کی حرمت کو قائم رکھیں، ہم اس دن میں ان کے لئے خرید و فروخت، زراعت و تجارت اور شکار کو حرام کرتے اور اس کو صرف عبادت کے لئے مخصوص کیے دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے بھی مختصر الفاظ میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ہفتہ میں عبادت کے لئے ایک دن مخصوص کرنے کے متعلق اپنے پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) کے ساتھ کیا تھا۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ (نحل:۱۲۴)

بیشک سبت کا دن ان لوگوں کیلئے (عبادت کا دن) مقرر کیا گیا جو اس کے متعلق جھگڑا کرتے تھے اور یقیناً تیرا رب ضرور قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا جس کے متعلق وہ اختلاف کرتے تھے اس میں حق کیا تھا اور باطل کیا؟

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے تقرر سبت (سنیچر) کے بعد بنی اسرائیل سے عہد میثاق لیا کہ وہ اسکی حرمت کو برقرار رکھیں گے اور عبادت الٰہی کے سوا ان باتوں کو اس دن میں اختیار نہیں کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام کر دیا ہے:

وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○ (النساء:۱۵۴)

اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) سے کہا: سبت (ہفتہ) کے بارہ میں حد سے نہ گزرنا (خلاف ورزی نہ کرنا) اور ہم نے ان سے اس کے متعلق بہت سخت قسم کا عہد و پیمان لیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "ہم دنیا میں سب سے آخر آنے والے آخرت میں سب سے مقدم ہوں گے خصوصاً اہلِ کتاب سے جو کہ ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور یہ (جمعہ کا دن) ہم سب سے پہلے ان اہلِ کتاب پر فرض کیا گیا تھا مگر انھوں نے اس کے متعلق اختلاف ظاہر کیا اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے اس (جمعہ کے دن) کو قبول کر لینے کی ہدایت و توفیق دی سو دنیا میں بھی وہ اس معاملہ میں ہم سے پیچھے رہ گئے اسلئے یہود کا روزِ عبادت جمعہ سے ایک دن بعد (سنیچر) ہے اور نصاریٰ کا اسکے بعد (اتوار) کا دن ہے۔[1]

عن ابی هريرة و حذيفة رضى الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ :

۱: بخاری۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس حدیث کے معنی میں یہ بیان کئے ہیں کہ منجانب اللہ تو یہ حکم ہوا تھا کہ ہفتہ میں سے ایک روز عبادت کیلئے مقرر کر لو اور تعیین امم کی فطرت پر چھوڑ دی گئی تھی۔ چنانچہ تمام امم کے مقابلہ میں صرف ہم نے ہی جمعہ کا انتخاب کیا۔

اضل الله عن الجمعة من كان قبلنا فكان لليهود يوم السبت و كان للنصاری يوم الاحد فجاء الله بنا فهدانا الله ليوم الجمعة و السبت و الاحد و كذلك هم تبع لنا يوم القيمة نحن الاخرون من اهل الدنيا و الاولون يوم القيٰمة و المقضی بينهم قبل الخلائق۔ (مسلم)

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت خدیفہ رضی اللہ تعا عنہما نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعا نے ان لوگوں کو جو ہم سے پہلے گزر چکے جمعہ کے دن سے محروم کر دیا۔ سو یہود کیلئے سبت (سینچر) کا دن ٹھہرا اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا' پھر اللہ تعا نے ہم کو دنیا میں بھیجا اور جمعہ کے دن کے متعلق ہماری رہنمائی فرمائی اور اس طرح جمعہ سینچر اور اتوار علیحدہ علیحدہ امتوں کے لیے مقرر ہو گئے لہٰذا اسی طرح یہ سب امتیں قیامت کے دن ہماری تابع ہونگی اور ہم جو دنیا میں آخر میں ہیں قیامت میں پاداش عمل کے اعتبار سے مقدم ہوں گے اور تمام مخلوق سے قبل ہمارا ہی فیصلہ ہو گا۔

سبت کی حرمت کے متعلق موسوی قانون میں بنی اسرائیل کو کیا ہدایات تھیں وہ تورات کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

"پھر خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہو کے کہا تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لئے کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان تمہارے قرنوں میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ میں خداوند تمہارا پاک کرنے والا ہوں پس تم سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمہارے لئے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے چھ دن کام کرنا لیکن ساتویں دن آرام کے لئے سبت ہی وہ خداوند کے لئے مقدس ہے پس بنی اسرائیل سبت کو مانیں اور اسے اپنی پشت در پشت عہد ابدی جان کے اس میں آرام کریں میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے۔ (خروج باب ۳۱ آیات ۱۲۔۱۷)

واقعہ کی تفصیلات

غرض ایک طویل مدت تک یہود بنی اسرائیل اپنے مطلوبہ روز عبادت (سبت) کی عزت و حرمت میں خدا کیلئے ہوئے عہد و پیمان پر قائم رہے اور جن باتوں کو اس دن میں حرام کر دیا گیا تھا ان سے بچتے رہے مگر آہستہ آہستہ ان کی کج روی اور متمردانہ سرکشی بروئے کار آتی گئی اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی "جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت سبت سے متعلق ان پر لازم کیے گئے تھے" خلاف ورزی شروع کر دی اور اگرچہ شروع میں خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر شدہ شدہ اس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کر لی اور بیخوفی اور بیباکی کے ساتھ اس کو کیا جانے لگا بلکہ بہانے حیلے تراش کر اپنی اس بد عملی پر فخر کیا جانے لگا، تب خدا کے عذاب نے ان کو آ پکڑا اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصۂ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لئے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے یہ لوگ ہفتہ

کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادت الٰہی میں صرف کرتے اس لئے قدرتی طور پر مچھلیاں چھٹے روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساتھ ہی خدائے تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوت ایمانی کا امتحان لیا حتی کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا اور چھٹے دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام و نشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے پانی پر تیرتی نظر آئیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے باسانی گرفت میں آسکتی تھیں۔

کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے، آخر نہ رہ سکے اور ان میں سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کر لئے کہ جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرتِ آمد سے بھی فائدہ اٹھالیں۔

چنانچہ بعض تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے ان میں چلی جائیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو یک شنبہ (اتوار) کی صبح کو ان مچھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال کر کام میں لاتے۔

اور بعض یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے چنانچہ جب ان کے علماءِ حق اور مخلصین امت نے ان کو اس حرکت سے روکا تو انھوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ سبت کے دن شکار نہ کرو لہٰذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ اتوار کے روز کرتے ہیں باقی یہ ترکیبیں منع نہیں ہیں اور اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کج روی یہ جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتی تھی کو ہمارا یہ حیلہ خدا کے یہاں ضرور چل جائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ وہ دین کے احکام پر صداقت و سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے اور اسی لئے شرعی حیلے نکال کر ان کے امتثال سے بچنا چاہتے تھے، گویا خود فریبی میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ ان چند حیلہ جو انسانوں کی ان حرکات کا علم دوسرے حیلہ ساز افراد کو بھی ہوا اور انھوں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی اور آخر کار بستی کی ایک بہت بڑی جماعت بانگ دہل ان حیلوں کی آڑ میں سبت کی حرمت کی خلاف ورزی کرنے لگی۔

اس جماعت کی یہ ذلیل حرکات دیکھ کر بستی ہی میں سے ایک سعادت مند جماعت نے کمر ہمت چست کی اور ان کے مقابل آکر ان کو اس بد عملی سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا مگر انھوں نے کچھ پرواہ نہیں کی اور اپنی حرکت پر قائم رہے تب سعادت مند جماعت کے دو حصے ہو گئے ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان لوگوں کو نصیحت کرنا اور سمجھانا بے کار ہے یہ باز آنے والے نہیں کیونکہ یہ اس کام کو اگر گناہ سمجھ کر کرتے تب تو یہ توقع تھی کہ شاید کسی وقت باز آکر تائب ہو جائیں۔ لیکن جب کہ یہ شرعی حیلے تراش کر اپنی بد عملی پر نیکی کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تو ہم کو یقین ہو تا جاتا ہے کہ اس جماعت پر بہت

جلد خدا کا عذاب آنے والا ہے یا یہ ہلاک کر دیے جائیں گے اور یا کسی سخت عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے لہٰذا اب ان سے کوئی تعرض نہ کرو۔

یہ سن کر سعادت مند جماعت کے دوسرے حصہ نے کہا کہ ہم اس لئے ان کو برابر نصیحت کرتے رہنا چاہتے ہیں کہ فردائے قیامت میں اپنے پروردگار کے سامنے یہ عذر پیش کر سکیں کہ ہم نے آخر وقت تک ان کو سمجھایا اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کیا، لیکن انھوں نے کسی طرح نہیں مانا نیز ہم مایوس نہیں ہیں بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ عجب نہیں کہ ان کو توفیق نصیب ہو جائے اور یہ اپنی بد عملی سے باز آجائیں۔

بہر حال حیلہ جو جماعت اپنے حیلوں پر قائم رہی اور سبت کی حرمت اور اس دن میں شکار کی ممانعت کے احکام سے قطعاً غافل اور بے پرواہو کر نڈر اور بے باک ہو گئی تب اچانک غیرت حق کو حرکت ہوئی اور مہلت کے قانون نے گرفت کے قانون کی صورت اختیار کر لی یعنی خدائے تعالیٰ کا حکم ہو گیا کہ جس طرح تم نے میرے قانون کی اصل صورت و شکل کو حیلوں کے ذریعہ مسخ کر دیا قانون پاداش عمل کے مطابق اسی طرح تمہاری صورت و شکل بھی مسخ کر دی جاتی ہے تاکہ "پاداش عمل اور از جنس عمل" کے مظاہرے سے دوسرے لوگ بھی عبرت و بصیرت حاصل کریں چنانچہ حضرت حق جل مجدہ نے "کن" کے اشارہ سے ان کو بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کر دیا اور وہ انسانی شرف سے محروم ہر کر ذلیل و خوار حیوانوں میں تبدیل ہو گئے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ سعادت مند جماعت کا جو حصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر تا رہا اس نے جب دیکھا کہ متمرد اور سرکش جماعت کسی طرح حق پر کان نہیں دھرتی تو مجبور ہو کر اس نے ان سے ترک تعاون کر لیا اور کھانا پینا اور خرید و فروخت غرض ہر قسم کا اشتراک باقی نہ رہے چنانچہ جس دن بد کرداروں پر عذاب الٰہی نازل ہوا تو ان کے معاملہ کی اس جماعت کو گھنٹوں خبر نہ ہوئی لیکن جب کافی وقت گزر گیا اور اس جانب سے کسی انسان کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی تب ان کو خیال ہوا کہ معاملہ دگرگوں ہے لہٰذا وہاں جا کر دیکھا تو صورت حال اس درجہ عجیب تھی کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے یعنی وہاں انسانوں کی جگہ بندر اور خنزیر تھے جو اپنے ان عزیزوں کو دیکھ کر قدموں میں لوٹتے اور اپنی حالت زار کا اشاروں سے اظہار کرتے تھے۔ سعادت مند جماعت نے باحسرت و یاس ان سے کہا کہ کیا ہم تم کو بار بار اس خوفناک عذاب سے نہیں ڈراتے تھے انھوں نے یہ سنا تو حیوانوں کی طرح سر ہلا کر اقرار کیا اور آنکھوں سے آنسو بہاتے ہوئے اپنی ذلت و رسوائی کا دردناک نظارہ پیش کیا:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ (سورہ بقرہ:٦٥۔٦٦)

اور (اے گروہ یہود) تم بلا شبہ (اپنے پیش رووں میں سے) ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو جو سبت کے بارہ میں احکام الٰہی کی حدود سے متجاوز ہو گئے تھے اور ہم نے ان کیلئے کہہ دیا تم ذلیل بندر ہو جاؤ پس ہم نے اس بستی کے ان بد بخت لوگوں کو گردو پیش کے لوگوں کیلئے عبرت اور خدا سے ڈرنے والوں کیلئے نصیحت اور

موعظت بنادیا۔

وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ط قَالُوْا مَعْذِرَةً إِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ أَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَأَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○ (سورہ اعراف ۱۶۶-۱۶۳)

اور (اے پیغمبر) بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارہ میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے سبت کے دن ان کی (مطلوبہ) مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آجاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں اس طرح ہم انھیں آزمائش میں ڈالتے تھے بہ سبب اس نافرمانی کے جو وہ کیا کرتے تھے اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے (ان لوگوں سے جو نافرمانوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے) کہا تم ایسے لوگوں کو (بیکار) نصیحت کیوں کرتے ہو جنھیں (ان کی شقاوت کی وجہ سے) یا تو خدا ہلاک کر دے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا انھوں نے کہا "اسلئے کرتے ہیں تا کہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور اس لئے بھی کہ شاید یہ لوگ باز آجائیں پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انھیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا ہم نے ان لوگوں کو تو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی و نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا بہ سبب ان نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انھیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا" بندر ہو جاؤ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوئے۔"

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ط مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ط أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ○ (سورئہ مائدہ: ۶۰)

(اے پیغمبر) کہہ دیجئے کیا میں تم کو بتاؤں کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک جزاء کے اعتبار سے کون سب سے بدترین ہوگا وہ شخص ہوگا جس پر خدا نے لعنت کی اور اس پر غضبناک ہوا اور وہ جس میں سے اس نے بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیئے اور جس نے ان میں سے شیطان (یا بت) کی پوجا کی یہی ہیں بدترین مرتبہ والے اور سیدھے راستہ سے بہت دور بھٹکے ہوئے (یعنی اے بنی اسرائیل ہم بدترین جزاء کے مستحق نہیں ہیں بلکہ تم ہو جن کے یہ کچھ اعمال واطوار ہیں۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ آمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰٓ أَدْبَارِهَآ أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ط وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ○ (سورہ نساء۔۴۷)

اے اہل کتاب تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے تم پر اتاری ہے جو اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے (یعنی توراۃ) اس سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہروں کو مٹاڈالیں اور ان کی پیٹھ پر ان کو لگادیں یا ہم ان پر لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہنے والا ہے۔

تعیین مقام

جس بستی پر حادثہ گزرا اس کا نام کیا ہے؟ قرآن عزیز سورۂ اعراف میں صرف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ساحل بحر پر واقع تھی الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ مگر مفسرین نے اس کی تعیین میں متعدد نام لئے ہیں، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یہ نقل کی جاتی ہے کہ یہ مدین کا واقعہ ہے اور ابن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کا نام متنا تھا اور یہ مدین اور عینونا کے درمیان واقع تھا۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف و تاریخ ابن کثیر ج ۲)

اور عکرمہ مجاہد قتادہ سدی، کبیر اور ایک روایت میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ منقول ہے کہ اس بستی کا نام ایلہ تھا اور یہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع تھی عرب جغرافیہ دان کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص طور سینا سے گذر کر مصر کو روانہ ہو تو طور سینا کی جانب ساحل بحر پر یہ بستی ملتی تھی یا یوں کہہ لیجئے کہ مصر کا باشندہ اگر مکہ کا سفر کرے تو راہ میں یہ شہر پڑتا تھا یہی قول راجح ہے۔ (ایضاً و فتح الباری ج ۶)

زمانہ حادثہ

شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہ) اور ان کے اتباع میں بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا ہے لیکن ابن جریر، ابن کثیر، ابو حیان اور امام رازی (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر مفسرین کے طرز بیان اور خود قرآن عزیز کے اسلوب سے یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اسلئے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ اعراف میں قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہاں یہ بتایا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو اہل بستی تین جماعتوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ان میں سے ایک جماعت سرکش اور حیلہ نافرمانوں کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے کی سعی کر رہی تھی پس اگر یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا تو یہ بات بعید از قیاس اور بعید از اسلوب قرآن تھی کہ وہ ایسے موقع پر جب کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت پر مسخ کا عذاب مسلط ہونے کا ذکر کر رہا ہو اس زمانہ کے پیغمبر کا اس سلسلہ میں قطعاً کوئی ذکر نہ کرے اور یہ نہ بتائے کہ نافرمان قوم کے اور ان کے درمیان کیا معاملہ پیش آیا نیز سلف صالحین سے بھی کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے کہ جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا اور نہ تاریخ ہی اس کے لئے کوئی مواد بہم پہونچاتی ہے۔ اس لئے مذکورۃ الصدر جلیل المرتبت مفسرین نے بھی اس واقعہ سے متعلق چاروں مقامات میں سے کسی ایک مقام کی تفسیر میں بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام

کے زمانہ میں پیش آیا پھر نہیں معلوم کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے یہ کس جگہ سے اخذ فرمایا کہ یہ واقعہ داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے ممکن ہے کہ انھوں نے سورۂ مائدہ کی اس آیت سے یہ اندازہ لگایا ہو۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ (سورئہ مائدہ:۷۸)

داؤد عیسیٰ بن مریم کی زبانی بنی اسرائیل میں سے وہ لوگ لعنت کیے گئے جنھوں نے کفر کیا اس لئے کہ وہ نافرمانی کے خوگر تھے اور حد سے گزرے ہوئے تھے۔

مگر اس آیت سے استدلال صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اول تو اس مقام پر بنی اسرائیل کی عام گمراہی کا تذکرہ ہے۔ خاص سبت کا واقعہ زیر بحث نہیں ہے دوسرے اس میں صرف داؤد علیہ السلام ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی تذکرہ ہے۔ چنانچہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

يخبر تعالى (جل جلاله) انه لعن الكافرين من بنى اسرائيل من دهر طويل فيما انزله على داود نبيه عليه السلام وعلى لسان عيسى ابن مريم بسبب عصيانهم لله واعتدائهم على خلقه قال العوفى عن ابن عباس لعنوا فى التوراة والانجيل وفى الزبور وفى الفرقان۔ (تفسیر ابن کثیر جلد۱)

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر داؤد علیہ السلام کی زبانی زبور میں عرصۂ دراز کے بعد لعنت کی گئی اور عیسیٰ ابن مریم کی زبانی بھی انجیل میں اس لئے کہ خدا کی نافرمانیوں، مسلسل سرکشیوں اور مخلوق خدا پر ظلم کرنے کی وجہ سے اسی قابل تھے کہ ان پر لعنت ہوتی رہے (تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑیں) عوفیؒ کہتے ہیں کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے وہ آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ بنی اسرائیل میں سے کفر کرنے والوں پر توراۃ انجیل زبور اور قرآن سب ہی کتابوں میں لعنت کی گئی ہے۔

الحاصل قرآن کے اسلوب بیان اور جلیل القدر مفسرین کی شرح و تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب سبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیانی زمانہ میں کسی ایسے وقت پیش آیا جب کہ ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علماء حق ہی کے سپرد تھا اس لئے قرآن عزیز نے صرف ان ہی کا تذکرہ کیا اور کسی نبی یا پیغمبر کا ذکر نہیں کیا۔

چند تفسیری حقائق

۱) سورۂ بقرہ میں اصحاب سبت کے تذکرہ میں ہے نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا تو مَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا سے کیا مراد ہے اس کے جواب میں مفسرین کے متعدد اقوال میں سے بہتر قول حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے یعنی اس سے وہ بستیاں مراد ہیں جو ایلہ کے گرد و پیش آباد تھیں اور مشہور تابعی سعید بن جبیر کے قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے:

عن ابن عباس لما بين يديها من القرىٰ وما خلفها من القرىٰ۔ (تفسیر ابن کثیر جلد۱)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ ایلہ کے سامنے اور پیچھے جو بستیاں ہیں ان کیلئے ہم نے اس کو عبرت بنادیا۔

وقال سعید بن جبیر ای من یحضر ھا من الناس یومئذ۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱)

اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ تھے ایلہ کو ہم نے ان کیلئے سامان عبرت بنادیا۔

۲) اسی واقعہ سے متعلق سورۂ اعراف میں ہے

كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

یعنی ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہم نے ان کو امتحان و آزمائش میں مبتلا کر دیا

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے جمعہ کو یوم عبادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور سبت (سنیچر) کے یوم عبادت بنائے جانے پر موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑا کیا تو ہم نے اگرچہ ان کی بات مان لی لیکن سبت کے معاملہ ہم نے ان کو کڑی آزمائش میں ڈال دیا اور آزمائش کا یہ معاملہ مچھلی کے شکار سے متعلق تھا جس کی تفاصیل تم سن چکے ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

ان اللّٰہ انما افترض علی بنی اسرائیل الیوم الذی افترض علیکم فی عیدکم الیوم الجمعة فخالفواالی السبت فعظموہ وترکوا ما امروا بہ کلما ابو الالزوم السبت ابتلاھم اللّٰہ فیہ۔ (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں بنی اسرائیل کی عبادت کے لئے اسی طرح جمعہ کو فرض کیا تھا جس طرح ہم پر فرض کیا ہے مگر انھوں نے مخالفت کر کے اس کو سنیچر کے دن سے بدل لیا اور اس کی عظمت کرنے لگے اور جمعہ کے بارہ میں جو حکم ان کو ملا تھا اس کو نہ مانا پس جب وہ سبت پر اڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سلسلہ میں آزمائش میں ڈال دیا۔

۳) اسی سورۂ میں ہے بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ اسی آیت کی تفسیر میں دو احتمال بیان کیے جاتے ہیں ایک یہ کہ یہ اجمال ہے اس تفصیلی عذاب کا جو اگلی آیت

كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○

میں بیان ہوا ہے اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اول اہل بستی پر ایک نوع کا عذاب آیا تاکہ ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ یہ سمجھیں کہ وہ ان حیلوں سے خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کر رہے بلکہ اس کے حکم کو منسوخ کر رہے ہیں مگر انھوں نے اس عذاب سے کوئی عبرت حاصل نہیں کی تب ان پر "مسخ" کا عذاب آگیا جمہور پہلے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

۴) سورۂ مائدہ میں ہے وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ معذب گروہ کے نوجوان ..... "بندر" کی شکل میں مسخ کیے گئے اور بوڑھے "خنزیر" کی صورت میں مسخ ہوئے۔ (ابن کثیر ج ۱)

حقیقت مسخ

۵) سورۂ بقرہ مائدہ اور اعراف میں ہے كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ تو انسان کے بندر یا خنزیر ہو جانے کے کیا معنی ہیں؟ جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے مسخ حقیقی (صوری) مراد ہے اور مشہور تابعی مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے مسخ معنوی مراد ہے یعنی وہ حقیقۃً بندر کی شکل میں تبدیل نہیں ہو گئے تھے بلکہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے۔

قال مسخت قلوبهم ولم يمسخوا قردة وانما هو مثل ضربه الله "كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا" وهذا سند جيد من مجاهد وقول غريب خلاف الظاهر من السياق في هذا المقام وفي غيره۔ (ابن کثیر، ج ۱، سورۂ بقرہ)

مجاہد کہتے ہیں کہ ان کے قلوب مسخ ہو گئے تھے اور وہ واقعی بندر نہیں بن گئے تھے اور دراصل یہ ایک مثل ہے جیسا کہ قرآن میں یہ مثل ہے مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا یعنی اہل کتاب کے توراۃ و انجیل پڑھنے اور پھر اس کے مطابق عمل نہ کرنے کی مثال ایسی ہے کہ گویا گدھے پر کتابیں لدی ہوئی ہیں مجاہد کا یہ قول ان کی جانب صحیح سند سے ثابت ہے مگر یہ غریب انوکھا اور اوپرا قول ہے اور قرآن کے ان تمام مقامات کے ظاہر کے خلاف ہے جو مختلف سورتوں میں اس سلسلہ میں بیان کیے گئے ہیں۔

جمہور کے خلاف مجاہد اپنے اس قول میں منفرد ہیں اور یہ قول ظاہر قرآن کے بھی خلاف ہے اس لئے کہ سورۂ بقرہ میں واقعۂ مسخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ عذاب جس طرح سرکش اور نافرمان لوگوں کی پاداش عمل کیلئے ضروری تھا اسی طرح اس میں یہ بھی حکمت و مصلحت تھی کہ یہ لرزہ براندام کر دینے والا واقعہ گرد و پیش کے رہنے والوں کیلئے بھی سامان عبرت بن جائے چنانچہ ارشاد فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا پس اگر مسخ کا یہ عذاب صرف مسخ قلوب تک محدود تھا تو گرد و پیش کے بسنے والے کیلئے یہ کس طرح سامان عبرت و خوف بن سکتا تھا کیونکہ قلب کے مسخ ہو جانے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ وہ رشد و ہدایت کے قبول سے محروم ہو جائے اور یہ بات دوسروں کی نگاہ میں مشاہد اور محسوس نہیں ہوا کرتی بلکہ ایک معنوی شے ہے جس کو دوسرا انسان ثمرہ یا نتیجہ اور یا کافی تجربہ کے بعد ہی معلوم کر سکتا ہے نیز عدم قبولِ ہدایت اور انکار ہدایت کا معاملہ تو کچھ ان ہی لوگوں کے لئے مخصوص نہیں ہے یہ تو ہر پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کے وقت پیش آتا رہتا ہے، لہٰذا اگر اصحاب سبت کی پیہم سرکشی کی وجہ سے ان کے قلوب مسخ کر دیئے گئے یعنی ان سے قبول ہدایت سلب کر لی گئی تو ان میں وہ کیا خاص بات پیدا ہو گئی تھی کہ جس کی وجہ سے مسخ قلوب کیلئے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ۔

علاوہ ازیں اگر اس تعبیر سے صرف مسخ قلوب ہی مراد ہوتا تو بلحاظ بلاغت یہ کہہ دینا کافی تھا کہ کونو قردۃ تم بندر کی طرح ہو جاؤ یعنی جس طرح "بندر" انسان نما شریر و خبیث حیوان ہے اسی طرح تم بھی ہو کہ صورت انسانوں کی مگر قلب میں شرارت و خباثت بندر کی سی ہے اور قردۃ کی صفت خاسئین۔ ذلیل و رسوا بندر کے اضافہ کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اسلئے کہ جب ان کی صورتیں بندر کی شکل میں مسخ ہو کر تبدیل نہیں ہو گئی تھیں تو

پھر یہ حکمت صحیح نہیں ہو سکتی کہ اگر فقط قردۃ (بندر) کہا جاتا تو ممکن تھا کہ کسی کے دل میں یہ شبہ باقی رہ جاتا کہ جب کہ بعض پالتو بندر پالنے والوں کی نظروں میں پیارے لگتے ہیں تو کسی انسان کے لئے صرف یہ کہہ دینا کہ وہ بندر کا سا لگتا ہے مذمت کے موقع پر کافی نہیں ہے اسلئے ضروری ہوا کہ خاسئین کہہ کر یہ بتا دیا جائے کہ وہ محبوب بندر نہیں بلکہ ذلیل ورسوا بندر بنا دیے گئے۔

یہ حکمت تو جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ ان انسانوں کو حقیقی طور پر بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہو اور چونکہ بعض لوگ بندر کی حرکات سے خوش ہو کر ان کو پالتے اور محبوب رکھتے ہیں لہٰذا ان معذب انسانوں کو بندر کی شکل میں بھی اس طرح مسخ کیا گیا کہ دیکھنے والا ان سے گھن کھائے اور ان کا اپنے قریب آنا بھی گوارا نہ کرے۔

مجاہدؒ کا یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ اسی طرح ایک مثل ہے جس طرح كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا عالم بے عمل کیلئے مثل ہے یہ قول اسلئے درست نہیں ہے کہ قرآن عزیز نے بعض مواقع میں جو مثالیں بیان کی ہیں یا تو وہ "مثل" کہہ کر ہی بیان ہوئی ہیں مثلاً مسطورۂ بالا مثال یا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا منافقین کی مثال یا مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا جیسی مثال اور یا وہاں ایسا صاف اور واضح قرینہ موجود ہوتا ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اس جگہ حقیقت حال کو "مثل" کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے مثلاً آیت خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو شخص ہدایت کو ہدایت سمجھنے کے باوجود قبول نہیں کرتا وہ کانوں سے سنتا ہے مگر اس پر توجہ نہیں کرتا وہ حق کو آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر اس سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور اپنی زندگی کو مسلسل ایسی کجروی اور بغاوت پر قائم رکھتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے گویا اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے پس یہاں یہ واضح قرینہ موجود ہے کہ مشرکین مکہ کے نہ کانوں پر مہر لگی ہوئی تھی اور نہ دلوں پر اور نہ ان کی آنکھوں پر پردے لٹکے ہوئے تھے لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ عادت اللہ یہ جاری ہے کہ جو سمجھ رکھنے کے باوجود نا سمجھ بنتا، شنوا ہونے کے باوجود ناشنوا ہو جاتا اور بینا ہونے کے باوجود حق سے نابینا بنتا ہے اور اس حالت پر مصر رہتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی پاداش عمل کا قانون اس کے قلب سمع اور بصر کی اس استعداد کو سلب کر لیتا ہے جو قبول حق کے لئے اس کو خلقت و پیدائش کے وقت عطا ہوئی تھی۔

لیکن زیر بحث مقام پر "کونوا قردۃ" کو نہ صاف الفاظ میں "مثل" کہا گیا ہے اور نہ یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جو "مسخ معنوی" پر دلالت کرتا ہو۔ بلکہ "خاسئین" کو قردۃ کیلئے صفت لانا اس کا قرینہ ہے کہ یہاں بلا شبہ "مسخ حقیقی" مراد ہے۔

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر اصحاب سبت کا معاملہ محض مسخ معنوی کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سے متعلق مثل بیان کرنے کے لئے قردہ (بندر) اور خنزیر (خوک) میں سے کسی ایک حیوان کا ذکر کافی تھا اور ان دونوں میں سے شرارت اور خباثت میں جو زیادہ سمجھا جاتا ہو مثال کے طور پر صرف اسی کو بیان کر دینا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ سورۂ مائدہ میں یہ بتایا کہ اصحاب سبت میں سے کچھ تو بندر بنا دیئے گئے اور کچھ خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ ۔

یہ ہیں وہ جن کی بناء پر ابن کثیر ابن جریر ابن حیان، ابن تیمیہ، رازی آلوسی (رحمہم اللہ) جیسے متقدمین و

متاخرین جلیل القدر مفسرین مجاہد کے انفرادی قول کو قرآن عزیز کے سیاق و سباق کے خلاف قرار دیتے ہوئے جمہور کے قول کی تائید کرتے اور اصحاب سبت سے متعلق آیات میں مسخ حقیقی مراد لیتے ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر (رحمہ اللہ) حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) قتادہؒ ربیع بن انسؒ ابوالبقاضحاک اور جمہور کے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں۔

(قلت) والغرض من هذا السياق عن هؤلاء الائمة بيان خلاف ما ذهب اليه مجاهد رحمه الله من ان مسخهم انما كان معنويا لاصوريا بل الصحيح انه معنوی صوری۔ (واللہ اعلم)

میں کہتا ہوں ان ائمہ تفسیر کے بیانات کو ذکر کرنے سے یہ مقصد ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تمام بالاتفاق مجاہد کے اس قول کے مخالف ہیں "کہ بنی اسرائیل کی زیر بحث جماعت کا مسخ صرف معنوی تھا حقیقی نہ تھا" کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مسخ معنوی اور حقیقی دونوں حیثیت سے تھا۔

مسئلہ کا یہ پہلو نقل سے تعلق رکھتا ہے رہا عقلی نقطۂ نظر سو اس کے پیش نظر بھی بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہو جانا عقلاً ناممکن اور محال نہیں ہے اس لئے کہ اس مسئلہ میں اگر عقلی استعجاب ہو سکتا تو صرف یہی کہ ایک حقیقت کس طرح دوسری حقیقت میں تبدیل ہو سکتی ہے؟ لیکن تبدیل حقائق کا یہ مسئلہ قدیم و جدید فلسفہ کے مسلمات میں سے شمار کیا گیا ہے اور جدید فلسفہ کے نظریۂ ارتقاء (THE THEORY OF REVOLUTION) کی اساس و بناء تو صرف اسی پر موقوف ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں تبدیل ہو جانا نہ صرف ممکن بلکہ کائنات ہست و بود میں واقع اور درجات ارتقاء کے لحاظ سے ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے پس اگر نظریۂ ارتقاء کے اصول پر ایک گوریلا یا شمپازی قسم کا بندر اپنی حقیقت سے منتقل ہو کر انسانی حقیقت میں بدل جا سکتا ہے تو انسان کا بندر کی حقیت میں بسل جانا کیوں محال نظر آتا ہے۔

کیا وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہر شے کا رد عمل (REACTION) ممکن بھی ہے اور واقع و مشاہد بھی تو تو اس اصول پر اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ جس طرح ایک ادنیٰ حقیقت اعلیٰ حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح کبھی خصوصی حالات و ناموافق اثرات کی بناء پر اعلیٰ حقیقت ادنیٰ حقیقت میں منقلب ہو جاتی ہے تو عقلاء جدید کے پاس اس نظریہ کے انکار کے کون سے دلائل ہیں اور یہاں رد عمل (ری ایکشن) کیوں اپنا اثر نہیں کر سکتا؟

آج کی دنیا میں ایک حقیقت کا دوسری حقیقت میں بدل جانا نہ صرف نظریہ اور تھیوری تک محدود ہے بلکہ روزمرہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتا رہتا اور مشاہدوں میں آتا رہتا ہے اور یہ اس طرح کہ یہ مسئلہ صدیوں تک پیچیدہ رہا ہے کہ انسان کی پیدائش کا ابتدائی تخم (نقطہ) کن کن مدارج سے گزر کر انسان کی شکل اختیار کرتا ہے اور قرآن عزیز نے اس سلسلہ میں جن مدارج کا ذکر کیا ہے مفسرین قدیم ان مدارج کے حقائق بیان کرنے میں یا اجمال سے کام لیتے رہے اور یا وقت کی تحقیقات علمی جہاں تک قرآن کا ساتھ دیتی رہی ہیں اس کے مطابق کچھ تفصیلات دیتے رہے ہیں لیکن چونکہ یہ سب کچھ نظری و عملی حدود میں محدود تھا اس لئے قرآن عزیز کے بیان کردہ حقائق کی پوری تشریح سامنے نہیں آئی تھی لیکن اب مسئلہ میں نظریات سے آگے بڑھ کر علمی تحقیقات نے مشاہدہ تک ترقی کر لی ہے اور رحم مادر میں انسانی تخم پر انسان بننے تک جو تطورات و تحولات گزرتے ہیں ان کو

سائنس اور علم طب کے جدید آلات کے ذریعہ مشاہدہ کرکے صحیح طور پر معلوم کیا گیا ہے اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ قرآن عزیز نے اس سلسلہ میں نطفہ، علقہ، مضغہ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ کی جو تعبیرات ایک نبی امی ﷺ کی معرفت سنائی تھیں حرف بحرف وہی صحیح اور حقیقت نفس الامر کے مطابق ہیں گویا علمی تحقیقات کو صدیوں تک اپنی جگہ سے حرکت کرتے کرتے مشاہدہ کی حد میں پہونچ کر آخر اسی جگہ ٹھہرنا پڑا جو قرآن واضح کر چکا تھا اور اس طرح علمی تحقیق کو اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا اور جب تک قرآن کے دیئے ہوئے علم الیقین کے ساتھ مطابقت نہ کر لی اپنی جگہ قائم نہ رہ سکی۔

"پیدائش جنین" کا یہ مسئلہ نشوو ارتقاء کے جن نظریات پر قائم اور عالم مشاہدہ میں آچکا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ نطفہ جب علقہ، مضغہ اور اسی طرح درجات طے کرتا ہے تو یہ اپنے ہر درجہ ادنیٰ میں ایک خاص حقیقت ہوتا ہے اور درجہ عالی میں منتقل ہو کر بالکل دوسری حقیقت بن جاتا ہے اور اسی طرح حقائق کا تحول وانقلاب ہوتا رہتا ہے لیکن یہ تمام انقلابات ایک مہینہ کے اندر اندر اس طرح ہوتے ہیں کہ گویا اس ابتدائی دور میں ایک انسان کا جنین بھی درجات کے لحاظ سے ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ نباتات کا جنین ایک مچھلی کا ایک چارپائے کا ایک بندر کا اور اس دور کے آخر میں وہ بندر کی اعلیٰ قسم گوریلا اور شمپازی کے جنین کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد دوسرے مہینے کے شروع میں ان تمام درجات نباتاتی وحیوانی میں ایک ایسا عظیم الشان انقلاب پیدا ہو جاتا ہے کہ کل تک جو جنین حیوانات کی اعلیٰ قسم کے جنین کے مشابہ تھا یک بیک انسانی حقیقت میں تبدیل ہونے لگتا اور ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ کا مظاہرہ کر کے اعلان کرتا فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ اور پھر پورے سات مہینے تک اس جنین میں قدرت مختلف قسم کی نقاشیا کرتی رہتی اور اس انسانی ڈھانچہ کو مکمل انسان بناتی رہتی ہے اور "جنین انسانی" میں جو انقلاب حقائق ہوتا رہتا ہے اور وہ ادنیٰ حقیقت چھوڑ کر اعلیٰ حقیقت اختیار کرتا رہتا ہے اگر بعض مرتبہ قدرت الٰہی اپنے مصالح کی بنا پر خَلْقًا آخَرَ کا پورا مظاہرہ نہیں کرتی تو آپ سنتے ہیں کہ فلاں شخص کے ایسا بچہ پیدا ہوا ہے جو بیل یا بندر یا بن مانس کی شکل ہے بلکہ بعض مرتبہ بعینہٖ ان حیوانات کی ہی شکل کا بچہ عالم وجود میں آجاتا ہے تو یہ دلیل ہے اس امر کی کہ قدرت کی صناعی نے اس کو اس لئے ادھورا چھوڑ دیا اور مکمل انسانوں کی شکل میں اس حقیقت کو تبدیل نہیں کیا کہ چشم عبرت اس سے عبرت حاصل کرے اور خدا کا شکر ادا کرے کہ اس نے ہم کو انسان بنایا اور عقل و خرد عطا فرما کر کائنات سے ممتاز ومشرف فرمایا ورنہ خدا چاہتا تو ہم بھی رحم مادر میں اس طرح ہو کر رہ جاتے نیز اس حقیقت کی جانب بھی توجہ ہو سکے کہ خود انسان کا جنین بھی کن کن جامہائے حقائق کو ترک کر کے انسانی جامہ پہنتا اور تب انسان کہلانے کے قابل بنتا ہے۔

پس اگر تبدیلی حقائق کا یہ مظاہرہ روز و شب کائنات بحر و بر میں ہوتا رہتا ہے تو اگر ایک انسان کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ خاص حالات و تاثرات نے اس میں یہ رد عمل (ری ایکشن) پیدا کر دیا کہ وہ انسانی شکل و صورت کو چھوڑ کر جو کہ اس کی تخلیق کا سب سے بلند اور آخری انقلاب تھا اپنی خلقت کے اس پچھلے درجہ منقلب ہو گیا جو کہ حیوانی شکل سے متعلق ہے تو عقل و فلسفہ کا کونسا نظریہ اس کی تردید کر سکتا ہے؟

بہر حال ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا عقلاً کوئی مستبعد بات نہیں ہے جو مسئلہ مسخ پر وارد ہو یہ امر کہ یہ واقعہ درحقیقت پیش آیا یا نہیں سو اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ علم تاریخ اور نقل

صحیح سے متعلق ہے اور... کہ قرآن کے علم یقین نے اس واقعہ کا بصراحت اظہار کیا اور جمہور سلف و خلف اس واقعہ کی تفسیر میں مسخ حقیقی کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں تو محض اس لئے کہ عام طور پر ہم ایسے واقعات کا مشاہدہ نہیں کرتے اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کسی شیء کے مشاہدہ نہ کرنے یا اس کے زیر نظر نہ آنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعہ میں وہ شئی موجود نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں مشہور طبیب اور ماہر فن زکریا رازی نے جذام (LEDROSY) پر بحث کرتے ہوئے اس کی مختلف اقسام میں سب سے ردی اور خراب قسم یہ بتائی ہے کہ جسم میں زہر پھیل کر خون اس درجہ فاسد ہو جاتا ہے کہ وہ اعصاب اور شرائین میں تشنج پیدا کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے مریض کا جسم ایک گھنونے اور مکروہ صورت بندر کی طرح نظر آنے لگتا ہے اور اس درجہ پر پہنچ کر مرض لاعلاج ہو جاتا ہے۔ زکریا نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مرض جذام کے متعلق ان کی یہ تحقیق ذاتی کاوش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اطبائے یونان اور قدیم اہل فن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

لہٰذا کیا عجب ہے کہ بنی اسرائیل کی اس جماعت پر خدائے تعالیٰ کا عذاب اس طرح نازل ہوا کہ ایک جانب تو ان کے قلوب مسخ ہو کر قلوب انسانی کے خواص سے محروم کر دیئے گئے اور دوسری جانب ان کے جسم بد ترین جذام کے ذریعہ اس درجہ خراب کر دیے گئے کہ وہ بندر اور خنزیر کی شکل میں تبدیل نظر آنے لگے کُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ۔

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صحیح احادیث میں یہ آتا ہے کہ جو قومیں حیوانات کی شکل میں مسخ ہوئی ہیں وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہیں۔[1] یعنی مسخ کا عذاب ان کے اندر و ظاہر کو اس درجہ فاسد اور گندہ کر دیتا ہے کہ وہ پھر جانبر نہیں ہو سکتیں اور جلد ہی موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔

اس مقام پر یہ شبہ پیدا نہیں کرنا چاہیے کہ اگر مسخ کو معنیً اور صورتاً دونوں حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو اس سے تناسخ (آواگون) لازم آجاتا ہے حالانکہ یہ باطل اور فاسد عقیدہ ہے یہ شبہ اسلئے صحیح نہیں ہے کہ تناسخ میں روح (جیو) ایک قالب (کالبد) کو چھوڑ کر دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے اور انسانی اعمال نیک و بد کی باداش میں جون بدلنے کا یہ سلسلہ ازل سے ابد تک یونہی قائم ہے اور رہیگا لیکن مسخ کی صورت میں نہ روح بدلتی ہے اور نہ قالب بدلتا ہے بلکہ وہی قالب (جسم) ایک خاص ہیئت اور حقیقت سے دوسری حقیقت و ہیئت میں تبدیل ہو کر موت کی نذر ہو جاتا اور دوسرے مردہ انسانوں کی طرح مالک حقیقی کے سامنے اپنے اعمال کے جوابدہ ہونے کیلئے عالم برزخ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور عکرمہ رضی اللہ عنہ کا مکالمہ

عکرمہ رضی اللہ عنہ جو حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے شاگرد رشید ذکی و فہیم اور جلیل القدر تابعی ہیں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ ان کی گود میں قرآن عزیز کھلا ہوا رکھا ہے اور ان پر گریہ طاری ہے یہ دیکھ کر کچھ دیر تو میں ان کی عظمت کی وجہ سے دور بیٹھا رہا مگر

1: مسند احمد۔

جب اس حالت میں ان پر کافی وقت گزر گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قریب جا کر بعد سلام عرض کیا: اللہ تعالیٰ مجھ کو آپ پر قربان کرے یہ تو فرمایئے کہ آپ کسلئے اسطرح رو رہے ہیں؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمانے لگے میرے ہاتھ میں جو یہ ورق ہیں مجھ کو رلا رہے ہیں میں نے دیکھا تو سورۂ اعراف کے ورق تھے پھر مجھ سے فرمایا تم ایلہ کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کیا جانتا ہوں اسکے بعد ارشاد فرمایا کہ اس بستی میں بنی اسرائیل رہتے تھے ان کے یہاں سبت کے دن مچھلیاں پانی کی سطح پر آ جاتی تھیں اور سبت کے بعد پانی کی تہ میں بیٹھ جاتی تھیں اور بمشکل ایک دو ہاتھ آتی تھیں کچھ دن گزرنے پر شیطان نے ان میں سے بعض کو یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ نے سبت میں مچھلی کھانے کو منع فرمایا ہے مچھلی کے شکار کو نہیں منع فرمایا اسلئے انھوں نے یہ کیا کہ سبت کے دن خاموشی کے ساتھ مچھلیاں پکڑ لیتے اور دوسرے دن کھا لیتے[1] جب یہ حیلہ عام ہو گیا تو اہل حق نے انکو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ سبت کے دن مچھلی پکڑنا شکار کرنا اور کھانا سب منع ہے لہٰذا تم اس حیلہ جوئی کو چھوڑ دو ورنہ خدا کا عذاب تم کو برباد کر ڈالے گا۔ مگر جب انھوں نے نہ مانا تو اس دوسری جماعت میں سے ایک جماعت اگلے ہفتہ ان سے جدا ہو گئی اور وہ مع اپنے اہل و عیال ان سے دور جا بسے اور ایک جماعت نے سبت کی خلاف ورزی کو برا تو جانا مگر مخالفین کے ساتھ ہی رہے سہے اور ان سے ترک تعلق نہیں کیا چنانچہ داہنے بازو (ایمنون) یعنی ترک تعلق کرنے والوں نے جب نافرمانوں کو ڈانٹا اور عذاب الٰہی سے ڈرایا تو بایاں بازو (ایسرون) کہنے لگا لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا دِاللّٰہُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ تب (ایمنون) نے جواب دیا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ بالآخر ایک روز امر بالمعروف کرنے والی جماعت نے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا کہ یا تو تم باز آ جاؤ ورنہ ہم یقین کرتے ہیں کہ کل تم پر ضرور کوئی عذاب نازل ہو کر رہے گا۔

اس کے بعد سرکشوں پر عذاب نازل ہونے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ میں وہ جماعتوں کے مآل انجام کا ذکر فرمایا ہے ایک سرکش اور متمرد انسانوں کی جماعت جو ہلاک اور مسخ کر دی گئی اور دوسری (ایمنون) امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والی جماعت کہ اس نے نجات پائی اور عذاب سے محفوظ رہی لیکن تیسری جماعت یعنی ساکتین (ایسرون) کا کوئی ذکر نہیں فرمایا اور میرے دل میں ان کے متعلق ایسے خیالات آتے ہیں کہ میں ان کو زبان سے کہنا پسند نہیں کرتا یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے چونکہ باز رہے اگرچہ خود خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے لہٰذا وہ بھی کہیں عذاب کے تو مستحق نہیں قرار دیئے گئے اور سرکشوں کے زمرہ میں تو داخل نہیں کر لئے گئے) تب میں نے عرض کیا: میں آپ پر فدا ہو جاؤں آپ اس بارہ میں اس قدر پریشان نہ ہوں بلا شبہ یہ تیسری جماعت بھی نجات پانے والوں میں ہی رہی اسلئے کہ خود قرآن عزیز ان کے متعلق یہ کہتا ہے کہ انھوں نے نصیحت کرنے والوں سے یہ کہا کہ تم ایسی جماعت کو کسلئے نصیحت کرتے ہو جس کی بداعمالیوں کی بناء پر خدائے تعالیٰ یا ان کو ہلاک کرنے والا ہے اور یا کسی سخت عذاب میں ڈالنے والا ہے تو ان کے متعلق قرآن عزیز کی یہ تعبیر صاف صاف بتا رہی ہے کہ وہ ہلاک نہیں کیے گئے ورنہ تو ان کا ذکر بھی ہلاک ہونے والوں ہی کے ساتھ کیا جاتا نجات پانے والوں کے ساتھ نہ ہوتا۔ نیز یہ جماعت اس عمل بد کے بدکرداروں کی حرکات سے مایوس ہو کر ایسا کہتی تھی اسلئے بھی

۱: تفسیر ابن کثیر سورۂ اعراف۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ حیل کے مختلف حیلوں میں سے ایک حیلہ یہ بھی تھا۔ مؤلف

مستحق عذاب نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو بیحد مسرور ہوئے اور آیات کی اس تفسیر پر مجھ کو خلعت بخشا۔

مسخ شدہ اقوام کا انجام دنیوی

جو قومیں خدائے تعالیٰ کے عذاب سے مسخ کر دی جاتی ہیں وہ زندہ باقی نہیں رکھی جاتیں بلکہ تین دن کے اندر اندر ان کو فنا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی نسل کا سلسلہ جاری نہ ہو اور دنیا میں ان کا وجود خود ان کے لئے بھی عرصہ تک باعث ذلت وخواری نہ رہے چنانچہ صحیح روایات میں یہ بصراحت موجود ہے:

عن ابن مسعود قال سألنا رسول اللّٰہ ﷺ عن القردة والخنازير من نسل اليهود فقال لا ان اللّٰه لم يلعن قوما قط فيمسخهم فكان لهم نسل ولكن هذا خلق كان فلما غضب اللّٰه على اليهود فمسخهم جعلهم مثلهم۔ (مسند احمد، ابو داؤد طیالسی، مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ہم نے دریافت کیا کہ یہ بندر و خوک مسخ شدہ یہود کی نسل میں سے ہیں آپ نے فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر مسخ کی لعنت مسلط کرتا ہے تو اس کی نسل نہیں چلاتا لیکن یہ جانور خدا کی مستقل مخلوق ہیں۔ لہذا جب خدا کا غضب یہود پر نازل ہوا تو ان کو ان جانوروں کی شکل میں مسخ کر دیا گیا۔

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

لم يمسخ قوما فيجعل لهم نسلا ولا عقباً وان القردة والخنازير كانت قبل ذلك۔

(مسند احمد، ابو داؤد طیالسی، مسلم)

اللہ تعالیٰ جب جسی کسی قوم کو مسخ کرتا ہے تو نہ ان کو باقی چھوڑتا ہے اور نہ ان کی نسل چلتی ہے اور بندر اور خوک تو مسخ کے واقعہ سے قبل بھی موجود تھے۔

عن ابن عباس قال ولم يعش مسخ قط فوق ثلاثة ايام ولم ياكل ولم يشرب ولم ينسل۔ (ابن کثیر، ج ۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مسخ شدہ انسان تین دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے اور نہ انھوں نے اس درمیان میں کھایا پیا اور نہ ان کی نسل کا سلسلہ چلا۔

بصائر

۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر عظیم الشان فریضہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد عظیم بھی اسی فرض کو پورا کرنا ہے اور جب کسی قوم اور امت میں کوئی نبی یا رسول موجود نہ ہو تو پھر علماء امت کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اس فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ قرآن عزیز اور صحیح احادیث نے بھی امت مرحومہ کو اس فرض کی جانب بہت زیادہ اہمیت کے ساتھ توجہ دلائی ہے اور تعمیل کرنے والے کو اجر و ثواب کی بشارت اور ترک کرنے والے کو مستحق عقاب وعید قرار دیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم دنیا کی بہترین امت ہو جو کائنات انسانی کے لئے پیدا کی گئی ہے تاکہ ان کو بھلی باتوں کا حکم کرو اور بری باتوں سے باز رکھو۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوُوْدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ○ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ○

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کی زبانی لعنت کی گئی اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے اور خدا کی حدود سے تجاوز کرتے تھے وہ بری باتوں سے لوگوں کو نہیں روکتے تھے اور ان کے یہ کردار بہت ہی برے تھے۔

عن عدی بن عمیرة یقول سمعت رسول اللّٰہ ﷺ ان اللّٰہ لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتی یروا المنکر بین ظهرا نیهم وهم قادرون علی ان ینکروه فلا ینکرونه فاذا فعلوا ذلك عذب اللّٰہ الخاصة و العامة۔

عدی بن عمیرہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے بلا شبہ اللہ تعالیٰ خاص خاص لوگوں کی بد اعمالیوں پر عام لوگوں پر عذاب نازل نہیں کرتا البتہ جب ان لوگوں کے سامنے کہ جو ان برائیوں کو روکنے پر قدرت رکھتے ہوں علی الاعلان معاصی ہونے لگیں اور وہ نہ روکیں تو بے شک اس وقت خدا اپنا عذاب عام و خاص سب پر نازل کر دیتا ہے۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللّٰہ ﷺ قال من رأی منکم المنکر فلیغیره بیده ومن لم یستطع فبلسانه ومن لم یستطع فبقلبه وذلك اضعف الایمان۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی کو برا عمل کرتا دیکھے تو اس کو چاہیے کہ ہاتھ سے روک دے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ زبان سے روکے اور جو اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دل ہی میں اس کو برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ تعالیٰ) کی حدیث اس جانب بھی توجہ دلاتی ہے کہ مسلمانوں میں اتنی قوت اور حاکمانہ اقتدار ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اگر کسی کو برے عمل اور بد کرداری میں مبتلا دیکھیں تو طاقت و قوت سے اسکو روک دیں اور اگر انھوں نے یہ درجہ اپنی کوتاہیوں کی بدولت کھو دیا ہے تو اس درجہ قوت ایمانی ضروری ہے کہ وہ زبان سے اس عمل بد کے خلاف جہاد کر سکے اور اگر اس درجہ سے بھی محروم ہے تو اسکے بعد سوائے اسکے ایمان کا کوئی اور درجہ نہیں ہے کہ وہ کم از کم اس عمل بد کو برا سمجھے اور اس پر اظہار رضا نہ کرے۔ لہٰذا اس حدیث کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ جب ایک شخص کو پہلا یا دوسرا درجہ حاصل ہی نہیں تو پھر دوسرا یا تیسرا جو درجہ بھی حاصل ہے اس کے اختیار کر لینے پر وہ ضعیف یا اضعف

الایمان کیوں قرار پاتا ہے۔

۲) انسان کی مختلف گمراہیوں میں سے بہت بڑی گمراہی یہ بھی ہے کہ احکام الٰہی سے بچنے کے لئے حیلے اور بہانے تراش کر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی سعی کرے کیوں کہ اس طرح وہ شریعت حقہ کے اوامر نواہی کو مسخ کرنے کا مرتکب ہوتا ہے قرآن اور توراۃ دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود اس گمراہی میں بھی پیش پیش اور اس اقدام پر بہت جری تھے اور اسی لئے ان پر مسخ کا عذاب نازل ہوا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کے بیان کردہ اس واقعہ کی روشنی میں امت مرحومہ کو سخت تاکید فرمائی ہے کہ وہ ایسی گمراہی پر ہرگز اقدام نہ کریں اور اپنا دامن عمل اس سے بچائے رکھیں۔

عن ابی هریرة ان رسول اللّٰه ﷺ قال لا ترتکبوا ما ارتکبت الیهود فتستحلوا محارم اللّٰه بادنی الحِیَلِ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسی گمراہی کا ہرگز ارتکاب نہ کرنا جس کا یہود نے ارتکاب کیا کہ اللہ کی حرام کی ہوئی باتوں کو معمولی حیلوں کے ذریعہ حلال کر لیتے تھے (حالانکہ وہ حالانکہ وہ حلال نہیں ہو جاتی تھیں)

مگر افسوس کہ ہم نے آج اس کو بھی اپنا لیا اور یہود کی طرح ہم نے بھی اللہ کے فرائض سے بچنے کے لئے حیلے تراش لئے مثلاً ایسے تمول اور سرمایہ داری کے باوجود کہ جس پر خدا کا حکم وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وارد ہوتا صرف زکوۃ سے بچنے کیلئے یہ حیلہ نکال لیا کہ اس سرمایہ پر پورا ایک سال اپنی ملکیت نہ ہونے دیا جائے تا کہ حولان حول کی شرط پوری نہ ہونے پائے ہر چھ ماہ بعد اس کو اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیا اور اس سلسلہ کو برابر جاری رکھا اور اس طرح وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ کا لطف اٹھا رہے (اعاذنا اللہ من ذلک)

البتہ فقہائے امت نے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کی غرض سے نہیں بلکہ امت کو کسی ضیق اور تنگی سے نکالنے کیلئے استنباط اور اجتہاد صحیح کے ذریعہ جو بعض آسانیاں بہم پہنچائیں اور جو دراصل صاحب شریعت کے اوامر و نواہی کے کے مقاصد کو فوت نہیں ہونے دیتیں تو وہ اس وعید کا مصداق نہیں ہیں مگر ان مسائل کے لئے کتاب الحیل کی تعبیر صحیح نہیں ہے بلکہ ان کا عنوان ... ''کتاب التسہیل'' ہونا چاہیے تھا۔

۳) قرآن عزیز کے مطالعہ سے یہ بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیشہ پاداش عمل از جنس عمل ہو جیسا کہ مسئلہ زیر بحث میں بھی موجود ہے کہ اصحاب سبت نے حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ سبت کے قانون کو مسخ اور محرف کر دیا تھا لہٰذا ان کے لئے سزا بھی ''مسخ'' ہی تجویز کی گئی، حافظ ابن کثیر اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں۔

فلما فعلوا ذلك مسخهم اللّٰه الی صورة القردة وهی اشبه شیءٍ بالاناسی فی شکل الظاهر ولیست بانسان حقیقة فلذلك اعمال هؤلاء وحیلتهم لما کانت مشابهة للحق فی الظاهر ومخالفة فی الباطل کان جزائهم من جنس العمل۔ (تفسیر ابن کثیر)

پس جب یہود نے یہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا اور یہ اس لئے کہ ظاہر شکل میں بندر انسان سے زیادہ مشابہ ہے اگرچہ حقیقت میں وہ انسان نہیں ہے پس جب کہ ان یہود کے یہ اعمال بد اور

حیلے ظاہر میں حق کے مشابہ اور باطن میں اس کے مخالف ہیں تو ان کو سزا بھی جنس عمل ہی سے دی گئی ہے۔

۴) ادا فرض میں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ جن کے مقابلہ میں فریضہ ادا کیا جا رہا ہے وہ اس کو قبول کرتے ہیں یا نہیں اس لئے کہ اس کا ادا فرض کی جزاء میں یہ کیا کم سعادت ہے کہ وہ شخص بہر حال اجر ثواب اور رضاءالٰہی سے معزز و مفتخر ہوتا ہے

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○

اصحاب الرس

تقریباً ۶۳۰ ق۔م (یامدت نامعلوم)

- رس
- قرآن عزیزاوراصحاب الرس
- اصحاب الرس؟
- قول راجح
- موعظت

رسّ

لغت میں ''رس'' کے معنی پرانے کنوئیں کے ہیں اسلئے اصحاب الرس کے معنی ہوئے ''کنوئیں والے'' قرآنی عزیز نے اس نسبت کے ساتھ ایک قوم کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں اس کی ہلاکت و بربادی کا ذکر کیا ہے۔

قرآن عزیزاوراصحاب الرس

قرآن عزیز نے سورۂ فرقان اور ''ق'' میں ان کا ذکر کیا ہے اور جن قوموں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب واستہزاء کے سبب ہلاکت و تباہی مول لی ان کی فہرست میں صرف ان کا نام بیان کر دیا ہے اور حالات و واقعات سے کوئی تعرض نہیں کیا:

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا وَأَصْحَابَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ○ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ○

اور عاد اور ثمود اور اصحاب الرس کو اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی (قوموں) کو (ہم نے ہلاک کر دیا) اور ہم نے ہر ایک کے واسطے مثالیں بیان کیں اور ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ○ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوْطٍ ○ وَّأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ط كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ○

ان سے پہلے بھی نوح کی قوم نے اور کنوئیں والوں نے اور ثمود، عاد، فرعون، برادران لوط علیہ السلام، اصحاب ایکہ اور تبع کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا پس ان پر عذاب لازم ہوا۔

اصحاب الرس

ان کو اصحاب الرس کیوں کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں علمائے تفسیر کے اقوال اس درجہ مختلف ہیں کہ

حقیقت حال بجائے منکشف ہونے کے اور زیادہ مستور ہو گئی ہے۔

۱) ابن جریرؒ کی رائے یہ ہے کہ چونکہ رس کے معنی (غار) کے بھی آتے ہیں اس لئے اصحاب اخدود (گڑھوں والے) ہی کو اصحاب الرس بھی کہتے ہیں۔

لیکن یہ اسلئے صحیح نہیں ہے کہ سورۂ ق میں اصحاب الرس کا ذکر ان قوموں کے ساتھ کیا گیا ہے جو حضرت عیسیٰ سے قبل ہو گزری ہیں اور سورۂ فرقان میں عاد ثمود اور اصحاب الرس کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے اور ان کے درمیانی زمانہ کی بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا اس کا تقاضا یہ ہے کہ اصحاب الرس کا زمانہ کم از کم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ہونا چاہیے اور اصحاب الاخدود کا زمانہ عیسیٰ سے صدیوں بعد ہے علاوہ ازیں قرآن کے ان بیانات میں تصریح ہے کہ اصحاب الرس ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور اصحاب الاخدود کے متعلق قول صحیح یہ ہے کہ وہ اپنے مشہور ظلم کے بعد فوراً ہلاک نہیں کیے گئے اور ان کو مہلت اور ڈھیل دی گئی کہ وہ باز آجائیں ورنہ پاداش عمل کیلئے تیار رہیں جیسا کہ عنقریب واقعہ کی تفصیل سے ظاہر ہو جائے گا۔

۲) ابن عساکر نے تاریخ میں اپنا رجحان اس روایت کی جانب ظاہر کیا ہے کہ اصحاب الرس عاد سے بھی صدیوں پہلے ایک قوم کا نام ہے یہ جس جگہ آباد تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک پیغمبر حنظلہ بن صفوان کو مبعوث کیا تھا انھوں نے ان میں رہ کر تبلیغ اسلام کی مگر اصحاب الرس نے کسی طرح حق کو قبول نہیں کیا اور پیغمبر خدا کو قتل کر دیا اس پاداش میں وہ سب ہلاک کر دیے گئے۔

(تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان و تاریخ ابن کثیر۔ ج ۱)

لیکن اس روایت سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ ان کو ”کنوئیں والے“ کیوں کہا گیا اور یہ ”نسبت“ واقعہ کے ساتھ کیا تعلق رکھتی ہے؟

۳) ابن ابی حاتم بروایت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نقل کرتے ہیں کہ آذربیجان کے قریب ایک کنواں تھا یہ قصہ چونکہ اس سے تعلق رکھتا ہے اس لئے وہاں کے بسنے والوں کو اصحاب الرس کہتے ہیں عکرمہؒ کہتے ہیں کہ اس کنوئیں کے قریب آباد قوم نے اپنے نبی کو چونکہ مسطورۂ بالا کنوئیں میں ڈال کر زندہ دفن کر دیا تھا اس لئے ان کو اصحاب الرس کہا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان، تاریخ ابن کثیر ج ۱)

۴) اور قتادہ کہتے ہیں کہ یمامہ کے علاقہ میں فلج نام کی ایک بستی تھی اصحاب الرس وہیں آباد تھے اور یہ اور اصحاب یٰسین (اصحاب القریہ) ایک ہی ہیں اور یہ مختلف نسبتوں سے پکارے جاتے ہیں۔ (ایضاً)

ایک روایت عکرمہؒ سے بھی اس کی تائید میں موجود ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ابن ابی حاتم اور عکرمہ دونوں کی روایت کا ایک ہی مطلب ہے مگر دونوں رائیں بھی مشکوک ہیں اس لئے کہ قرآن عزیز نے اصحاب القریہ (اصحاب یاسین) اور اصحاب الرس کا تذکرہ جدا جدا کیا ہے اور دونوں تذکروں میں کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں ہے کہ یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ یہ طرز بیان اصول بلاغت کے خلاف ہے کہ ایک ہی معاملہ کو جدا جدا نسبتوں اور کیفیتوں کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ اشارہ موجود نہ ہو کہ یہ مختلف نسبتیں اور تعبیریں ایک ہی معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ نبی معصوم ﷺ کی جانب سے ایسی کوئی تفسیر مذکور ہے جو

دونوں کو ایک ظاہر کرتی ہو، خصوصاً جب کہ قرآن یہ بتا رہے ہیں کہ اصحاب الرس کا معاملہ قبل مسیح علیہ السلام ہے اور تاریخ اور تحقیق یہ ثابت کر چکی ہے کہ اصحاب القریہ کا معاملہ مسیح علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے۔[1]

۵) ابو بکر عمر بن حسن نقاش اور سہیلی کہتے ہیں کہ اصحاب الرس کی آبادی میں ایک بہت بڑا کنواں تھا جس کے پانی سے وہ پینے اور کھیتی سیراب کرنے دونوں کا کام لیتے تھے اس بستی کا بادشاہ بہت عادل تھا اور لوگ اس سے بے حد محبت کرتے تھے اس کا جب انتقال ہو گیا تو اہل شہر اس کی موت سے سخت غمگین اور حزین تھے کہ ایک دن شیطان بادشاہ عادل کی شکل بنا کر پہنچا اور اہل شہر کو جمع کر کے تقریر کی کہ میں تم سے کچھ دنوں کیلئے جدا ہو گیا تھا، مرا نہیں تھا اب آگیا ہوں اور ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ لوگوں نے انتہاءِ محبت میں یقین کر لیا اور اس کی آمد پر جشن منایا۔ شیطان نے ان کو حکم دیا کہ وہ ہمیشہ مجھ سے پس پردہ باتیں کیا کریں۔ چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور وہ پس پردہ بیٹھ کر گمراہی پھیلانے لگا۔ اس وقت بقول سہیلی صاحب ''روض الانف'' ایک شخص حنظلہ بن صفوان کو خواب میں یہ بتایا گیا کہ ان کو اس آبادی میں راہِ ہدایت دکھانے کیلئے پیغمبر بنا دیا گیا۔ صفوان نے ان کے پاس جا کر توحید کی تعلیم اور شرک سے اجتناب کی تلقین کی اور بتایا کہ یہ تمہارا بادشاہ نہیں ہے بلکہ پس پردہ شیطان ہے، لوگوں کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور قبولِ حق کی بجائے پیغمبرِ خدا پر حملہ کر کے ان کو قتل کر دیا۔ اس پاداش میں ان کو خدا کے عذاب نے تباہ و برباد کر دیا اور کل جس بستی میں چہل پہل تھی اور باغات اور نہروں سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ آج وہ جل بھن کر چٹیل میدان نظر آنے لگا۔ جس میں کتوں بھیڑیوں اور شیروں کے مسکن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

یہ روایت اصولِ روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار ہے اور من گھڑت داستان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ (تفسیر ابن کثیر سورۂ فرقان، البدایہ والنہایہ ج ۱)

۶) محمد بن کعب قرظیؒ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان اول الناس یدخل الجنة یوم القیمة العبد الاسود'' (جنت میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہو گا وہ ایک سیاہ غلام ہو گا) اور یہ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی میں اپنا پیغمبر بھیجا مگر اس کالے کلوٹے غلام کے علاوہ کسی نے اس کو قبول نہیں کیا اور کوئی ایمان نہیں لایا۔ پھر اہل شہر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نبی کو ایک کنوئیں میں بند کر دیا اور کنوئیں کے منہ پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا تاکہ کوئی کھول نہ سکے۔ مگر یہ سیاہ فام غلام جنگل سے لکڑیاں لاتا، بازار میں فروخت کرتا اور ان کی قیمت سے کھانا خرید کر روزانہ کنوئیں پر پہنچ کر پتھر کو ہٹاتا اور خدا کے پیغمبر کی خدمت میں کھانا پیش کرتا تھا، کچھ دنوں بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر جنگل میں نیند طاری کر دی اور یہ چودہ سال تک اسی میں پڑا رہا۔ یہاں تک تو یہ ہوا اور ادھر قوم کو اپنی نازیبا حرکت پر افسوس آیا اور انہوں نے پیغمبر خدا کو کنوئیں سے نکال لیا اور توبہ کے بعد ایمان قبول کر لیا اور اسی مدت کے اندر پیغمبر کا انتقال ہو گیا۔ چودہ سال کے بعد جب غلام کی آنکھ کھلی تو اس نے سمجھا کہ میں چند گھنٹے سویا ہوں۔ جلدی سے لکڑیاں چن کر شہر پہنچا دیکھا تو حالات بدلے ہوئے ہیں۔ دریافت کیا تو سارا قصہ معلوم ہوا۔ اسی غلام

---

[1] یہ بحث عنقریب آنے والی ہے۔

کے متعلق نبی اکرم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے ایک سیاہ فام غلام جائے گا۔
(مروج الذہب ص ۹۶ حاشیہ ۱۱ کامل ج ۱)

یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے بھی قابلِ جرح ہے اور درایت کے اعتبار سے بھی، چنانچہ محدثین کہتے ہیں کہ یہ طویل داستان خود محمد بن کعب کی جانب سے ہے جس کو انہوں نے اسرائیلیات سے اخذ کر کے بیان کیا ہے۔ نبی معصوم کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ (ارض القرآن ج ۲ ص ۵۶)

علاوہ ازیں قرآن عزیز میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اصحاب الرس بھی ہلاک شدہ قوموں میں سے ہیں اور یہ روایت اس کے خلاف ان کو نجات یافتہ بیان کرتی ہے۔ اسلئے قطعاً غلط ہے اور روایت کا وہ جملہ جو قوسین میں "عبد اسود" سے متعلق ہے۔ اگر بسند صحیح نبی اکرم سے ثابت بھی ہو جائے تو بھی اسکا اصحاب الرس کے واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ابن جریر نے بھی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اس پر اسی قسم کی جرح وارد کی ہے۔

۷) مشہور مؤرخ مسعودی کہتا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہیں اور یہ دو قبیلے تھے۔ ایک قیدماں (قیدماہ) اور دوسرا یامین یا رعویل اور یہ یمن میں آباد تھے۔

لیکن مسعودی نے صرف اسی قدر تعارف پر اکتفا کیا ہے اور تاریخی حیثیت سے نہیں بتایا کہ وہ کن وجوہ کی بناء پر قیدماہ اور رعویل کو اصحاب الرس کہتا ہے اور ان کو "رس" کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹوں میں سے ایک کا نام قیدماہ بھی ہے۔ لیکن توراۃ اور تاریخ دونوں اس بات سے خاموش ہیں کہ اس کو اولاد کو اصحاب الرس بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مسعودی کا قول دلیل کا محتاج ہے۔

مگر صاحب ارض القرآن نے صرف اس بناء پر کہ مسعودی نے اپنی رائے تذبذب اور تردد کے ساتھ بیان نہیں کی، اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ (ارض القرآن ج ۲ ص ۵۶)

۸) مصر کے ایک مشہور معاصر عالم فرج اللہ زکی کردی کہتے ہیں کہ لفظ رس "ارس" کی تخفیف ہے اور یہ اس مشہور شہر کا نام ہے جو قفقاز کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس وادی ارس میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو مبعوث فرمایا جس کا نام ابراہیم زردشت تھا۔ انہوں نے اپنی قوم کو دین حق کی دعوت دی۔ مگر قوم نے انکار کیا اور ان کی دعوت وارشاد کے مقابلہ میں اور زیادہ سرکشی اور بغاوت اختیار کرلی۔ چنانچہ قوم نے اس کی سزا پائی اور ہلاک کر دی گئی۔ اس کے بعد ان کی دعوت کا میدانِ عمل اس مخصوص علاقہ قفقاز (آزر بائیجان وغیرہ) سے نکل کر ایران تک وسیع ہو گیا۔ زردشت کا صحیفہ اگرچہ محرف ہو چکا ہے۔ مگر اس کا ایک حصہ اب بھی قدیم فارسی میں مکتوب موجود ہے[1] اور اس صحیفہ میں اب بھی نبی اکرم کی بعثت اور دینِ اسلام کی بشارت کا ذکر پایا جاتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے:

عنقریب عرب میں ایک "نبی عظیم" مبعوث ہو گا اور جب اس کی شریعت پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جائے گا اور دوسرا ہزار شروع ہو گا تو اس دین میں ایسی باتیں پیدا ہو جائیں گی کہ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا یہ کیا یہ دین وہی دین ہے جو اپنے قرنِ اول میں تھا (یعنی بدعات وہوا اور

۱: اوستا کی جانب اشارہ ہے۔

رسومِ قبیحہ پیدا ہو جائیں گی)۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زردشت کی اصل اور حقیقی تعلیم "حق" تھی اور اسی لیئے انہوں نے بعثتِ محمد ﷺ کی بشارت دی اور بعض ایسی تفصیلات کا بھی ذکر کیا۔ جو آج حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ مگر دوسرے ادیان و ملل کی طرح ان کے متبعین نے بھی اس تعلیم حق کو مسخ و محرف کر ڈالا، ان کے متبعین مجوس (پارسی) اب بھی ایران و ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ (حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ص ۳۰۳، ۴۰۴ مختصراً)

علامہ زکی کے اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ تب تفسیر میں ایک قول ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ اصحاب الرس آذر بائیجان کے قریب ایک کنوئیں کی نسبت سے مشہور تھے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ یہ "نہر ارس" ہی سے مراد ہو اور ابن کثیر میں ہے۔

و اصحاب الرس قال بیر باذر بیجان

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آذربیجان میں ایک پرانان کنواں "رس" تھا اس وادی میں رہنے والے اسی وجہ سے اصحاب الرس کہلاتے تھے۔

بلکہ خود ابن کثیر (رحمہ اللہ) نے اپنی تفسیر میں اس آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ (نساء) کے تحت میں زردشت کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے:

والمجوس بقال انھم کانوا یومنون بنبی لھم یقال لہٗ زرداشت ثم کفروا بشرعه فرفع من بین اظھرھم واللّٰہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۵۵۲)

اور مجوس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر مبعوث پیغمبر زردشت پر اول ایمان لے آئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پیغمبر کو ان کے درمیان سے اٹھالیا۔ واللہ اعلم۔

ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم زردشت کی اصل تعلیم انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم حق ہی کے مطابق تھی اور وہ یرمیاہ علیہ السلام یا دانیال (اکبر) علیہ السلام کے تلمیذ اور رفیض یافتہ تھے۔ ذوالقرنین کے واقعہ میں انشاءاللہ تعالیٰ قدرے تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

قولِ فیصل

اس مسئلہ میں قرآن کا ظاہر یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل ہو گزرا ہے۔ اب رہا یہ امر کہ یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کے کی کسی قوم کا تذکرہ ہے یا کسی قدیم العہد قوم کا تو قرآن نے اس سے تعرض نہیں کیا اور مسطورہ بالا تفسیری روایات سے اس کا قطعی فیصلہ ناممکن ہے۔ البتہ میرا وجدان آخری قول کو راجح سمجھتا ہے۔

بہر حال قرآن کا جو مقصدِ موعظت و عبرت ہے۔ وہ اپنی جگہ صاف او رواضح ہے اور یہ تاریخی تعینات و مباحث اس کیلئے موقوف علیہ نہیں ہیں بلکہ ایک عبرت نگاہ وار گوشِ حق نیوش کیلئے یہ کافی و شافی ہے کہ جو قومیں اس دنیا میں خدائے برتر کے پیغامِ حق کو ٹھکراتی اور اسکے خلاف بغاوت و سرکشی کا علم بلند کرتی ہیں اور مسلسل مہلت اور ڈھیل دینے کے باوجود وہ اپنی متکبرانہ اور مفسدانہ زندگی کو ترک کرے صالح اور پاک زندگی بسر کرنے کیلئے آمادہ

نہیں ہوتیں تو پھر ان پر خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت "بطش شدید" آجاتی ہے اور وہ بے یارومددگار ہلاک و برباد کر دی جاتی ہیں۔

موعظت

کائناتِ انسانی کے پاس جس وقت سے اپنی تاریخ کا ذخیرہ موجود ہے وہ اس حقیقت سے بخوشی آشنا ہے کہ دنیا کی جس قوم نے بھی خدا کے پیغامِ حق کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کیا اور خدا کے پیغمبروں اور ہادیوں کے ساتھ سرکشی اور شرارت کو جائز رکھا، ان کی زبردست طاقت و شوکت اور عظیم الشان تمدن کے باوجود قدرت کے ہاتھوں نے ہلاک و برباد کر کے ان کا نام و نشان تک مٹادیا اور آسمانی یا زمینی عبرتناک عذاب نے صفحۂ عالم سے ان کو حرفِ غلط کی طرح محو کر دیا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اپنے پیشرووں کے ہیبت ناک انجام کو دیکھنے اور سننے کے باوجود ان کی وارث قوموں نے پھر تاریخ کو دہرایا اور اسی قسم کی حرکات کو اختیار کیا جن کے انجام میں ان کے پیشرووں کو روزِ بد دیکھنا پڑا تھا۔ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۔

۲) ایک حساس دل و دماغ کیلئے یہ تازیانۂ عبرت کافی ہے کہ اس دنیا میں جب کہ کسی شے کو بقا نہیں ہے اور ہر شے کیلئے فنا لازم تو پھر کبر و نخوت اور انانیت کے کیا معنی؟ اور جو مقدس ہستیاں اپنے اوصاف کریمانہ اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ خدمت خلق اور ہدایت و رشد کے بغیر کسی دنیوی لالچ و توقع کے انجام دیتی ہیں۔ ان کے ساتھ تحقیر و تضحیک کا برتاؤ عقل کے کس فیصلہ کے مطابق ہے؟

اگر انسان اس زندگی میں دو حقیقتوں کی معرفت حاصل کرے تو حیاتِ ابدی و سرمدی میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا اور یہی وہ رموز زندگی ہیں جن پر گامزن ہو کر قومیں "اصحاب الجنہ" کہلائیں اور ان سے غافل رہ کر "اصحاب النار" کہلانے کی سزاوار ہوئیں۔

بیت المقدس اور یہود

۶۰۴ ق م تا ۵۶۱ ق م ۷۰ء تا ۱۸ھ

- تمہید
- بیت المقدس (یروشلم)
- قرآن عزیز اور شرارت یہود کے دو اہم معاملے
- شرارت یہود کا پہلا دور
- غلامی کے بعد نجات
- شرارت یہود کا دوسرا دور
- حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل
- پاداش عمل
- تیسرا زرین موقعہ اور یہود کی روگردانی
- ابدی ذلت و خسران
- بصائر

تمہید

جن اصحابِ ذوق نے قصص القرآن جلد اوّل و دوم کا مطالعہ فرمایا ہے اُن کی نظر سے یہ پوشیدہ نہ رہا ہوگا کہ قرآنِ عزیز اقوامِ ماضیہ کے تاریخی واقعات یعنی ان کے رشد و ہدایات کے قبول و انکار اور اس کے نیک و بد نتائج و ثمرات کے حالات پیشِ نظر لانے اور ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی جگہ جگہ ترغیب دیتا ہے اور خود بھی اسی لئے گزشتہ قوموں کے ان واقعات کو بکثرت بیان کرتا ہے جو اس مقصدِ عظمیٰ کے لئے مفید اور عبرت آموز ہیں اور اگر ان وقائع میں حقائق کے ساتھ غلط اور دور از کار داستانیں شامل ہو گئی ہیں تو ان کی اصلاح بھی کر تا جاتا ہے چنانچہ بہت سی وہ پیچیدگیاں جو گزشتہ اقوام و امم ’ان کے مواطن و مساکن‘ اور ان سے متعلق حالات میں صحیح اور غلط واقعات کے خلط ملط سے پیدا ہو چکی تھیں قرآنِ عزیز نے ان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ تمام پیچیدگیاں دور ہو کر حقیقت حال روشن سے روشن تر نظر آنے لگی‘ چنانچہ ان واقعات سے متعلق اصل حقائق کا اظہار ہو جانے کے صدیوں بعد جب علم الآثار (ARCHAEOLOGY) علم طبقات الارض (GEOLOGY) اور تاریخی مشاہدات و تجربات کے ذریعہ ان اقوام و امم کے حالات ناقابلِ انکار درجہ تک روشنی میں آئے تو دنیا دیکھ کر حیرت زدہ ہوئی کہ قرآنِ عزیز نے ان سے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف صحیح نکلا اور اس کے بیان میں حقیقت سے سر مو تجاوز ثابت نہیں ہوا۔ رقیم (پیٹرا) کی تاریخِ ماضی اصحابُ الحجر کے واقعات‘ عاد و ثمود کا تمدن اور مقامِ تاریخ، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل اور فرعونِ مصر کی آویزش کے واقعات اور سدِ عرم کے حالات‘ غرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے تاریخی وقائع ہیں جو مسطورہ بالا حقیقت کے لئے زندہ جاوید شہادت ہیں۔

پس کیا یہ قرآنِ عزیز کے کلام الٰہی ہونے کی ایک ناقابلِ تردید شہادت نہیں ہے کہ ایک ”امی“ انسان ایک ایسے ملک میں جہاں ہر قسم کے علمی ذرائع مفقود و معدوم ہیں دنیا کی قوم کو رشد و ہدایت کے سلسلہ میں اقوامِ

ماضیہ اور امم سابقہ کے ایسے تاریخی واقعات سُناتا ہے جن کے ایک حرف کی بھی تردید نہیں ہو سکی اور صدیوں تک علماء تحقیق نے کروڑوں اور اربوں روپے اور اپنے قیمتی وقت اور عمر کو صرف کر کے جب ان حالات کو جدید ''علوم اکتشاف'' کے ذریعہ مشاہدہ کی حد تک حاصل کیا تو ان کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ قرآن نے ان سے متعلق جو کچھ کہا اور جس قدر کہا بلاشبہ علم تحقیق اسکے آگے ایک شوشہ بھی اضافہ نہیں کر سکا چہ جائیکہ اسکے خلاف ثابت کر سکتا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے پیغمبر ﷺ پر گذشتہ اقوام کے حالات ظاہر کر کے عبرت آموز قلب اور بصیرت افروز نگاہ کے لئے بہت کچھ سامان رشد و ہدایت عطا فرمایا تا کہ موجودہ امم و اقوام' سرکش اور مفسد قوموں کے نتائج بد اور ہولناک پاداشِ عمل سے عبرت حاصل کریں اور نکوکار و خیر اندیشہ قوموں کے حالات و واقعات اور انکے ثمراتِ خیر کو اختیار کر کے دین و دنیا کی فوز و فلاح کو اپنا سرمایہ بنائیں اور چونکہ قرآنِ عزیز کا مقصد صرف موعظت و تذکیر ہے نہ کہ اقوام و امم کی مکمل تاریخ اسلئے اس نے نہ دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ بیان کی ہے اور نہ جن قوموں کی تاریخ سے تعرض کیا ہے ان کی پوری تاریخ کو پیش کیا ہے کیونکہ یہ اسکے موضوع اور مقصد سے خارج ہے' وہ رشد و ہدایتِ اقوام کیلئے بلاشبہ ایک مکمل صحیفۂ قانون ہے مگر تاریخ و جغرافیہ یا فلسفہ و سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں وہ سب کچھ بھی موجود ہو جس کا فلسفہ و تاریخ کی کتابوں میں ہونا ضروری ہے۔

الحاصل امم ماضیہ کے ان حالات و واقعات میں سے جو بد کردار اور نیک کردار انسان کے درمیان امتیاز پیدا کرتے اور قوموں کی انفرادیت و اجتماعی اصلاح و انقلاب کے لئے سرمائیہ عبرت و بصیرت ثابت ہوتے ہیں ایک اہم واقعہ وہ بھی ہے جو یہود بنی اسرائیل کی پیہم شرارتوں اور فساد انگیزیوں کی بناء پر دو مرتبہ مقدس ہیکل اور یروشلم و بیت المقدس کی تباہی اور بربادی اور خود اُن کی غلامی و رسوائی کی شکل میں ظاہر ہوا اور جس نے اُن کی قومی ذلّت اور اجتماعی ہلاکت پر ہمیشہ کے لئے مہر لگادی۔

بیت المقدس

بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ حضرت سلمان علیہ السلام کے واقعات کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے' یہ پاک جگہ اپنے ہیکل (مسجد) کی وجہ سے بنی اسرائیل کا قبلہ رہی ہے اور یہ مقدس مقام بے شمار انبیاء بنی اسرائیل کا مہبط و مدفن ہے اور اس کی عظمت نہ صرف یہود و نصاریٰ ہی کی نگاہ میں ہے بلکہ اسکو مسلمان بھی مقامِ مقدس مانتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے واقعۂ اسراء (معراج) نے اس کے تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں اور جب بھی کوئی مسلمان سورۂ اسراء کو تلاوت کرتا ہے اس کے قلب میں اس مقام کا تقدس و جلال اثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

سُبْحَانَ الَّذِيْٓ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○

پاکی ہے اس ذات کے لئے جس نے اپنے بندہ (محمد ﷺ) کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر

کرائی وہ مسجد اقصیٰ جس کے اطراف کو ہم نے بڑی برکت دی ہے اور اس لئے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں دکھائے بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے۔ (الاسراء)

بیت المقدس کی اس مسجد کو ''مسجد اقصیٰ'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ مکہ (حجاز) سے بہت دُور فاصلہ پر واقع ہے۔

معراج کے واقعہ میں جب قرآن نے ''بیت المقدس'' کا ذکر کیا تو ساتھ ہی اس جانب بھی توجہ دلائی کی بنی اسرائیل کو دعوت و تبلیغ کا یہ مقام اور بنی اسرائیل کا قبلہ صلوۃ جو تمھارے نزدیک بھی عظمت و تقدیس سے معمور ہے یہود کی مفسدانہ سرگرمیوں اور احکام الٰہی کے خلاف مسلسل بغاوتوں اور شرارتوں کی وجہ سے دو مرتبہ تباہی و بربادی اور اہانت سے دوچار ہو چکا ہے اور نہ صرف یہ مقام بلکہ خود یہ بھی مشرکوں عیسائیوں کے ہاتھوں حد درجہ ذلیل ورسوا ہو چکے ہیں مگر ان کو پھر بھی عبرت و بصیرت حاصل نہیں ہوئی اور آج جبکہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت عامہ ان کو رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی عزت و عظمت کا پیغام سنا رہی ہے یہ اس کے ساتھ نفرت و حقارت ہی کا معاملہ کر رہے ہیں اور پہلے سانحوں کی طرح اب بھی غفلت اور سرکشی اختیار کر کے ابدی ذلت و خسران کو دعوت دے رہے ہیں۔

قرآن عزیز کہتا ہے کہ ہم نے کتاب (صحف انبیاء علیہم السلام) میں پہلے سے بنی اسرائیل کو آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ سخت فتنہ و فساد اور سرکشی و بغاوت کرو گے اور خدا کے اس مقدس مقام میں فتنہ ساماں بنو گے اور اس کی پاداش میں دونوں مرتبہ تم کو ذلت و ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑے گا اور جس سرزمین کو تم بہت زیادہ محبوب رکھتے ہو یہ بھی دو مرتبہ ظالموں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گی۔

اس کے بعد ہم پھر یک مرتبہ تم پر رحم کریں گے اور سعادت و فلاح کی طرف دعوت دیں گے پس اگر تم نے گذشتہ واقعات سے عبرت و موعظت حاصل کر کے اس دعوت حق پر لبیک کہا اور اس کو بطیب خاطر قبول کیا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہاری اس سعادت کو نہیں سلب کر سکتی اور اگر تمہاری تاریخی کجروی اور سرکشی اور حق کے ساتھ بغاوت اور مخالفت نے تمہارا ساتھ نہ چھوڑا اور گزرے ہوئے واقعات کی طرح اس مرتبہ بھی تم نے فساد و گمراہی کو اپنایا تو ہماری جانب سے بھی پاداش عمل کا قانون اسی طرح پھر دہرایا جائے گا اور اسکے بعد تم پر ابدی ذلت و رسوائی کی مہر لگادی جائے گی اور یہ سب کچھ تو دنیا کا معاملہ ہے اور ایسے سرکشوں کیلئے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ''جہنم'' ہے۔

وَقَضَيْنَا إِلَى بَنِيٓ إِسْرَآئِيْلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُوْلٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِيْ بَأْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلَالَ الدِّيَارِ ط وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ط فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوْءُوْا وُجُوْهَكُمْ

وَلِیَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ کَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِیۡرًا ○ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا ○

اور ہم نے کتاب (صحف انبیاء) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں شر و فساد پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے پھر جب دو وقتوں میں سے پہلا وقت آگیا تو اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے بھیج دیے جو بڑے ہی خوفناک تھے۔ پس وہ تمہاری آبادیوں کے اندر پھیل گئے اور اللہ کا وعدہ تو اس لئے تھا کہ پورا ہو کر رہے پھر (دیکھو) ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے موافق کر دی، اور مال و دولت اور اولاد کی کثرت سے تمہاری مدد کی، اور تمہیں پھر ایسا بنا دیا کہ بڑے جتھے والے ہو گئے اگر تم نے بھلائی کے کام کیے تو اپنے ہی لئے کیں اور اگر برائیاں کیں تو بھی اپنے ہی لئے کیں۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو بھیج دیا تھا کہ تمہارے چہروں پر رسوائی کی کالک پھیر دیں اور اسی طرح ہیکل مسجد میں داخل ہو جائیں جس طرح پہلی مرتبہ حملہ آور گھسے تھے اور جو کچھ پائیں توڑ پھوڑ کر برباد کر ڈالیں کچھ عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے (اگر اب بھی باز آجاؤ) لیکن اگر تم پھر سرکشی فساد کی طرف لوٹ آؤ گے تو ہماری طرف سے پاداش عمل لوٹ آئے گی اور ہم نے منکرین حق کے لئے جہنم کا قید خانہ تیار کر رکھا ہے۔

اس مقام پر ''الکتاب'' سے مراد انبیاء بنی اسرائیل کے وہ صحیفے ہیں جن میں یہود کے دو مرتبہ سخت فساد اور سرکشی کرنے اور اس کی بدولت بیت المقدس کی بربادی اور ان کے ہلاک اور غلام بن کر ذلیل و رسوا ہونے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کی گئی تھیں جو بذریعہ الہام و وحی ان کو خدا کی جانب سے معلوم ہوئی تھیں چنانچہ موجودہ توراۃ میں یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل[1] اور زکریا علیہم السلام کے صحیفوں میں وہ اب بھی مذکور ہیں اور ان صحیفوں کا بیشتر حصہ اسی قسم کی پیشین گوئیوں پر مشتمل ہے اور ان تینوں صحیفوں میں دو مرتبہ کے ان فسادات اور فسادات سے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے سخت سزا کا جس تفصیل کے ساتھ ذکر ہے اس سے حرف بحرف قرآن عزیز کے ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے یسعیاہ کی کتاب میں یہود کی پہلی شرارت و فساد کا ذکر اس طرح شروع ہوتا ہے۔

> رویا یسعیاہ بن اموص کی جو اس نے یہوداہ اور یروشلم کی بابت یہوداہ کے بادشاہوں عزیاہ اور یوتام اور آخز اور حزقیا کے دنوں میں دیکھی سنو! اے آسمانو اور کان لگا دے اے زمین کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا اور پوسا پر انھوں نے مجھ سے سرکشی کی بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے مالک کی چراگاہ کو مگر بنی اسرائیل نہیں جانتے میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطا کار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکاروں کی نسل خراب اولاد کہ انھوں نے خداوند کو ترک کیا اسرائیل کے قدوس کو ہلاک جانا اور اس سے بالکل پھر گئے تھے۔
>
> (باب آیت ۲-۱)

اور پھر ان کی بدکاریوں کی وجہ سے جو سزا ان کو ملنے والی تھی اس کا ذکر اسی مکاشفہ میں اس طرح ہے:

[1] یہ یحییٰ علیہ السلام کے والد نہیں ہیں، دوسرے نبی ہیں۔

تمہارا ملک اجاڑ ہے تمہاری بستیاں جل گئیں، پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے اجاڑا ہے اور صیہون[1] کی بیٹی چھوڑ دی گئی ہے۔

اور یرمیاہ کی کتاب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ سے شروع کی گئی ہے:

کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ دیکھ میں اتر کے بادشاہوں کے سارے خاندانوں کو بلا آؤں گا اور وہ آئیں گے اور ہر ایک اپنا اپنا تخت یروشلم کے پھاٹکوں میں داخل ہونے کی راہ پر اور اس کی سب دیواروں کے گرداگرد اور یہوداہ کے تمام شہروں کے مقابل قائم کرے گا اور میں ان (یہود) کی ساری شرارت کی بابت کہ انھوں نے مجھے چھوڑا ہے اور بیگانے خداؤں کے سامنے لوبان جلایا اور اپنے ہی ہاتھوں کے کاموں کو سجدہ کیا اپنی عدالت ظاہر کر کے ان پر حکم کروں گا۔ (باب ا آیات ۱۶-۱۵)

زناکاری کرو گے، جھوٹی قسمیں کھاؤ گے اور بعل (بت) کے آگے لوبان جلاؤ گے اور غیر معبودوں کی جنہیں تم نہیں جانتے پیروی کرو گے؟ اور میرے حضور اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے۔ آ کے کھڑے ہو گے اور کہو گے کہ ہم نے خلاصی پائی تاکہ نفرت کے کام کرو۔

(باب ۷ آیات ۱۱)

اے یروشلم (بیت المقدس) اپنے بال منڈا اور پھینک دے اور اونچی جگہوں پر جا کے نوحہ کر کیونکہ خداوند نے اس نسل کو جس پر اس کا قہر پڑا تھا مردود کیا اور ترک کر دیا ہے کہ بنی یہوداہ نے میری نظر میں برائی کی خداوند کہتا ہے اس گھر میں جو میرے نام کا کہلاتا ہے انھوں نے اپنی مکروہات رکھیں کہ اسے ناپاک کریں۔ (باب ۷ آیات ۱۱۔۱ باب ۲۵ آیت ۹۔۸)

اسلئے رب الافواج یوں کہتا ہے لہٰذا تم نے میری باتیں نہ سنیں دیکھ میں اتر کے سارے گھرانوں کو اور شاہ بابل بنوکدنذر کو بلا بھیجوں گا۔

اور حزقیل کی کتاب میں واقعہ اس طرح مذکور ہے:

خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے یہی یروشلم ہے میں نے اسے قوموں اور مملکتوں کے درمیان جو اس کے آس پاس ہیں رکھا ہے لیکن اس نے میری عدالتوں کو شرارت کر کے قوموں کی بہ نسبت زیادہ عدول کیا کہ انھوں نے میری عدالتوں کو حقیر جانا اور میری شریعتوں پر عمل نہیں کیا سو خداوند یہوداہ یہ کہتا ہے از بس کہ تم نے ان قوموں کی نسبت سے جو تمہارے گردو پیش ہیں زیادہ بغاوت کی اور میری شریعتوں پر نہ چلے ..... سو خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ میں ہاں میں ہی تیرا مخالف ہوں اور تیرے درمیان سب قوموں کی آنکھ کے سامنے تجھے سزا دوں گا۔

(باب ۵ آیات ۹۔۵)

اور زکریاہ نبی کی کتاب میں یہود کے دوسرے فساد اور بیت المقدس کی دوبارہ تباہی کے متعلق یہ پیشین گوئی درج ہے۔

دیکھو خداوند کا دن آتا ہے اور تیری لوٹ کا مال تیرے درمیان بانٹا جائے گا اور میں ساری قوموں کو فراہم کروں گا کہ یروشلم پر آ چڑھیں اور لڑیں اور شہر لے لیا جائے گا اور گھر کے گھر لوٹے

---

[1] صیہون شام کے ملک میں مشہور پہاڑ ہے باب ا آیات ۸۔۷

جائیں گے۔ اور عورتیں بے حرمت کی جائیں گی اور آدھا شہر اسیر ہو کے جائے گا پھر وہ جو باقی رہ جائیں گے شہر میں کاٹے نہ جائیں گے، تب خداوند خروج کرے گا اور ان قوموں کے ساتھ جنگ کرے گا۔ جس طرح سابق یہ جنگ کے دن لڑا تھا۔ (باب ۱۴۔ آیات ۳-۱)

یہ ہے خلاصہ ان مکاشفات یا پیشین گوئیوں کا جو انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں بڑی تفصیلات کے ساتھ مذکور ہیں اور جن کا اجمالی تذکرہ قرآن عزیز (سورۂ بنی اسرائیل) میں بھی بصورت تصدیق موجود ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان مکاشفات اور پیشین گوئیوں کا ظہور کس کس زمانے میں ہوا اور کس طرح ہوا تو مفسرین میں سے ابن کثیر کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہود کی ان دو شرانگیزیوں میں سے ایک کو بعثت محمد ﷺ سے قبل زمانہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور دوسری کو زمانۂ بعثت ﷺ پر محمول فرماتے ہیں اور پھر پہلے واقعہ کے متعلق اپنی جانب سے فیصلہ دیتے ہوئے مفسرین کے تین قول نقل کرتے ہیں۔

۱) قتادہ کہتے ہیں کہ یہود کی پہلی شرارت کی سزا میں جالوت کا حملہ ہوا جس نے یہود کو بہت مصیبت میں ڈال دیا تھا مگر داؤد علیہ السلام کی بدولت اس کے فتنہ سے ان کو نجات ملی یہ واقعہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکا۔

۲) سعید بن جبیرؒ کی رائے ہے کہ پہلا وعدۂ الٰہی جو پاداشِ عمل میں یہود پر نافذ ہوا موصل و نینویٰ کے مشہور قاہر بادشاہ سنجاریب کے حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے فلسطین کے اکثر شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور بیت المقدس کا محاصرہ کیے ہوا تھا مگر جب یہود اور شاہ یہود حزقیاہ نے اپنے زمانہ کے نبی یسعیاہ علیہ السلام کے ہاتھ پر توبہ و انابت کی اور وہ سچائی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں اور بدکاریوں سے باز آگئے تب خدائے تعالیٰ نے ان پر سے اس بلا کو ٹال دیا اور محاصرہ ترک کر کے واپس ہوا۔

۳) سعید بن جبیرؒ ہی سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے مراد بخت نصر (بنوکد نذر) شاہ بابل کا وہ مشہور حملہ ہے جس نے نہ صرف فلسطین اور شام کے تمام علاقے کو تاراج کر دیا تھا اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی بلکہ یہود کی قومیت و نسل کو بھی برباد کر ڈالا اور ہزاروں بچوں بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تھا مگر یرمیاہ علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق ستر برس کے بعد یہود کو خورس شاہ فارس نے بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور ان کو دوبارہ آزادی شادمانی اور خوش عیشی نصیب ہوئی اور خورس کے حکم سے بیت المقدس بھی دوبارہ تعمیر ہوا اور اس نے حضرت دانیال علیہ السلام کو ان کا سردار بنا کر یروشلم واپس کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ و تاریخ ابن کثیر ج ۲)

اور قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے پہلی مرتبہ کے معاملہ کو سنجاریب یا بخت نصر سے متعلق کیا ہے اور دوسرے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ فارس کے ملوک الطوائف میں سے ہردوس بادشاہ کے زمانہ میں پیش آیا جب کہ اس نے بیت المقدس پر سخت حملہ کیا اور یہود اس کی مقاومت سے عاجز رہے مگر جب انھوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر کے سامنے سچی توبہ کی اور نیک کردارانہ زندگی اختیار کرنے کا پختہ عہد و پیمان کیا تو ان سے یہ مصیبت ٹال دی گئی اور یہود کی شرانگیزیوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان پر یہ تباہیاں اس وقت لائی گئیں جب کہ وہ اپنی شرارت میں اس درجہ بڑھ گئے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کے قتل سے بھی باز نہیں

رہتے تھے چنانچہ پہلی مرتبہ میں یسعیاہ یا یرمیاہ[1] کو قتل کیا تھا اور دوسری مرتبہ زکریا یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر بھی آمادہ تھے اور وَ إِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا میں اس تیسرے واقعہ کا تذکرہ ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ پیش آیا یعنی یہود نے اپنی الہامی کتابوں میں آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کے حالات و علامات جان لینے کے باوجود آپ ﷺ کا انکار کیا اور بد عہدیاں کر کے آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذائیں پہنچائیں نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ جب ٹھکرائے گئے تو پھر کبھی نہ ابھرے اور نہ قیامت تک کبھی صاحب حکومت ہو سکیں گے۔ (بیضاوی سورۂ اسرىٰ)

دوسری رائے یہ ہے کہ یہود کی پہلی شرارت اور اس کی پاداش کا معاملہ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری مرتبہ کا معاملہ طیطوس (ٹیٹس) رومی کے حملہ سے متعلق ہے اور یہی رائے صحیح اور قرآن عزیز کی آیات اور تاریخی نقول کے مطابق ہے اور یہ اس لئے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے حسب ذیل باتیں خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔

۱) الکتاب میں یہ خبر دیدی گئی تھی کہ یہود دو مرتبہ سخت شر انگیزی اور فساد کریں گے۔

وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَآئِيْلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ○

۲) جب انھوں نے پہلی مرتبہ شر و فساد کیا تو ہم نے ان پر ایسی قاہرانہ طاقت مسلط کر دی کہ اس نے ان کی بستیوں میں گھس کر ان کو اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُوْلَاهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلَالَ الدِّيَارِ ط وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ○

۳) اس تباہی کے بعد (ان کی توبہ و انابت پر) ہم نے ان کو سابق کی طرح پھر حکومت و طاقت بھی بخشی اور مال و متاع کی بہتات سے بھی مستفیض کیا

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيْرًا ○

۴) اور ان کو یہ بھی بتا دیا کہ سرکشی اور فساد سے پرہیز اور امن و آشتی اور خدائے تعالیٰ کی فرمانبرداری کے قبول کا باز اثر ہم کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہونچاتا بلکہ اس کی خلاف ورزی میں تمہارا اپنا ہی نقصان ہے اور اس کی اطاعت و انقیاد سے تم ہی کو فائدہ پہنچتا ہے

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا

۵) مگر انھوں نے دوسری مرتبہ پھر بد عہدی کی اور خدا کی نافرمانی اور فساد فی الارض میں دوبارہ بے باک ہو گئے تو ہم نے بھی پہلے کی طرح ان پر ایک ظالم طاقت کو مسلط کر دیا جس نے سابق ظالم حکمراں کی طرح دوبارہ بیت المقدس اور اس کے ہیکل (مسجد) کو بھی برباد کیا اور ان کو بھی ذلیل و رسوا کر کے ان

---

[1] ان ہر دو انبیاء میں سے کوئی بھی قتل نہیں کیئے گئے۔

کی سرکشی کا سر کچل دیا

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ط فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوْٓءُوْا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ○

اور اگرچہ یہود کی یہ تباہی بظاہر حال ابدی معلوم ہو لیکن خدائے تعالیٰ کی رحمت تیسری مرتبہ اور موقع دے گی کہ وہ عزت و سربلندی حاصل کریں اور ان کی مایوسی مبدل بہ کامرانی ہو جائے لیکن اگر انھوں نے اس کو بھی ٹھکرا دیا تو بے شک پھر اس کا قانون پاداش عمل بھی ان کو ضرور سزا دے گا۔ اور وہ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے اور پھر یقیناً رہتی دنیا تک ذلیل و خوار ہی رہیں گے اور دارِ آخرت میں تو جہنم ایسے ہی متکبروں کیلئے تیار کی گئی ہے

عَسٰى رَبُّكُمْ أَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِيْنَ حَصِيْرًا ○

ان تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہود کی شرانگیزیوں پر بصورت سزا و عذاب جن جابر و قاہر بادشاہوں کو مسلط کیا گیا انھوں نے دونوں مرتبہ بیت المقدس (یروشلم) کو ضرور تباہ و برباد کیا۔

وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ○

اسلئے جن اقوال میں پہلے واقعہ کا مصداق آشوری حکمران سنجاریب یا جالوت کو بتایا گیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی بیت المقدس میں داخل نہیں ہو سکا چہ جائیکہ وہ اس کو تباہ و برباد کرتا چنانچہ جالوت کے متعلق تو قرآن کی تصریحات بھی اسکی تائید کرتی ہیں اور سیر و تاریخ کی نقول بھی جیسا کہ ہم حضرت سموئیل علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں بیان کر چکے ہیں اسی طرح سنجاریب کے متعلق یسعیاہ کی کتاب میں یہ موجود ہے۔

> پس شاہ حزقیاہ کے ملازم یسعیاہ کے پاس آئے تب یسعیاہ نے انھیں فرمایا تم اپنے آقا سے کہو خداوند یوں فرماتا ہے کہ تو ان باتوں سے جنھیں شاہ آشور (سنجاریب) کے جوانوں نے کہہ کے میری تکفیر کی ہراساں مت ہو دیکھ میں اس میں روح ڈالوں گا اور وہ ایک افواہ سن کے اپنی مملکت کو پھر جائے گا اور میں اسے اس ہی کی سرزمین میں تلوار مروا ڈالوں گا.... سو خداوند شاہ آشور (سنجاریب) کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ وہ اس شہر (یروشلم) میں نہ آئے گا نہ اس کے اندر تیر چلائے گا نہ پھر پکڑ کے اس کے سامنے ظاہر ہو گا اور نہ اس کے مقابل ومدمہ باندھے گا بلکہ جس راہ سے وہ آیا اسی راہ سے پھر جائے گا اور اس شہر میں نہ آ سکے گا۔ تب سنجریب (سنجاریب) شاہ آشور نے کوچ کیا اور چلا گیا اور پھر گیا اور نینوی میں آ رہا۔ (باب ۳۷ آیات ۷-۵، آیات ۳۶-۳۳)

اور قاضی بیضاوی کا یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کہ یہود سے متعلق دوسرے حادثہ کا مصداق فارس کے ملوک الطوائف میں سے شاہ ہردوس ہے اس لئے کہ تاریخ و سیر میں ملوک الطوائف کے عہد میں کسی ایسے بادشاہ کا ذکر

نہیں پایا جاتا جس نے بیت المقدس پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور اس کو تباہ و برباد کر ڈالا ہو۔

ان اقوال کے برعکس توراۃ (صحائف انبیاء) اور سیر و تفریح کی نقول سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین اور سرزمین یہوداہ کی تباہی اور ہیکل کی بربادی صرف دو بادشاہوں کے ہاتھوں ہوئی ہے اور نہ صرف شہروں کی بربادی بلکہ یہودی قومیت کی وہ تباہی و بربادی جو دنیا کے انقلابات کی تاریخ میں اہم جگہ رکھتی ہے ایک بابل کے قاہر بادشاہ بنوکدنذر (بخت نصر) کے ہاتھ سے اور یہ تقریباً ۶۰۴ ق۔م کا واقعہ ہے اور دوسری طیطوس رومی کے ہاتھوں سے اور یہ واقعہ رفع مسیح ؑ سے تقریباً ستر سال بعد پیش آیا اور ان ہی دو حادثوں میں یہود، یہودی قومیت اور یہودی مذہب پر وہ سب کچھ ہو گزرا جس کی اطلاع پہلے سے توراۃ (صحف انبیاء) میں دیدی گئی تھی اور جس کی تصدیق کیلئے قرآن عزیز بھی شہادت دے رہا ہے۔

اسلئے بلاخوف تردید یہ کہنا صحیح ہے کہ یہود کی بدکرداریوں کے نتیجہ میں جابر و قاہر بادشاہوں کے ہاتھوں ان کی تباہی و بربادی کے جو دو سانحے پیش آئے اور جن کا ذکر سورۂ اسراء (بنی اسرائیل) میں ہے وہ بلاشبہ بخت نصر اور طیطوس (ٹیٹس) ہی سے تعلق رکھتے ہیں تو اب از بس ضروری ہے کہ ان ہر دو واقعات کی تفصیلات بیان کر کے یہ دکھادیا جائے کہ اس زمانہ میں یہود کی شر انگیزیاں اور مفسدانہ کارگزاریاں اس حد تک بڑھ گئی تھیں کہ ان دونوں تباہ کن حوادث میں ان پر جو کچھ گزرا وہ ان کی بداعمالیوں ہی کا ثمرہ اور نتیجہ تھا اور پاداش عمل ہی نے ان دو طاقتوں کی شکل میں نمود و ظہور کیا تھا.....

شرارت یہود کا پہلا دور

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کا ہمیشہ سے یہ اٹل فیصلہ رہا ہے کہ جب بداخلاقی، فتنہ و فساد خون ریزی جبر و ظلم اور حق کے مقابلہ میں بغض و حسد کسی جماعت کا قومی مزاج بن جاتے ہیں اور چند افراد میں نہیں بلکہ پوری قوم کے اندر یہ امور نشو و نما پاجاتے ہیں... تو پھر قبول حق کی صحیح استعداد ان سے سلب کر لی جاتی ہے اور وہ اس درجہ بے خوف اور بیباک ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس خدا کے سچے پیغمبر دعوت حق اور پیغام الٰہی سنانے آتے ہیں تو وہ صرف اس دعوت سے منہ ہی نہیں موڑ لیتے بلکہ ان انبیاء و رسل کو قتل تک کر دینے سے گریز نہیں کرتے اور شرک و طغیان کو راہ عمل بنا کر اولیاء الرحمٰن کی جگہ اولیاء الشیطان بن جاتے ہیں جب ان کی حالت اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اب خدائے برتر کا قانون پاداش عمل بروئے کار آتا ہے اور آخرت کے عذاب الیم کے علاوہ دنیا میں ہی انکو ایسی ہلاکت و بربادی سے دوچار کر دیتا ہے کہ اس قوم کا تمام کبر و غرور اور شر و فساد کی شعلہ سامانیاں ذلت و خواری کیساتھ خاک کر دی جاتی ہیں اور ان کی قومی زندگی کو قعر مذلت میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ انکی آنکھیں مشاہدہ کر لیں اور عبرت آموز قلب بھی یہ سمجھ لیں کہ حقیقی عزت و سربلندی کے مالک تم نہیں ہو اور ذلت و عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ اس قادر مطلق ہستی کے قبضہ میں ہے جو کائنات ہست و بود کا خالق و مالک ہے اور جس کا یہ اعلان ہے کہ بدکاروں کیلئے انجام کار ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور حقیقی عزت نکوکاروں ہی کیلئے ہے اور وہی اس حقیقت کے پیش نظر جس کو چاہتا ہے عزت بخشتا اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

پس جب ہم اس قانون فطرت کو پیش نظر رکھ کر یہودی بنی اسرائیل کے اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں جو زیر بحث واقعات سے متعلق ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح نمایاں نظر آتی ہے کہ ان کی قومی زندگی کا قوام مسطورہ بالا بداخلاقیوں سے ہی بنا تھا اور وہ اپنی اس زندگی پر فخر و مباہات کرتے تھے چنانچہ حضرت داؤد سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کی مذہبی اور اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ جھوٹ فریب ظلم و سرکشی اور فساد و فتنہ انگیزی ان کا شعار بن گئے تھے حتی کہ شرک وبت پرستی تک ان میں رچ گئی تھی لیکن اس کے باوجود عرصہ دراز تک خدائے تعالیٰ کے قانون مہلت نے ان کو مہلت دی کہ وہ اپنی حالت کی اصلاح کریں اور اس کی صفت رحمت نے ان سے منہ نہیں موڑا بلکہ ان کی رشد و ہدایت اور اصلاح و اخلاق و اعمال کے لئے نبیوں اور پیغمبروں کا سلسلہ قائم رکھا جو برابر ان کو نکوکاری کی ترغیب دیتے اور بدکاری سے اجتناب کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ تاکہ ان کو دین و دنیا کی سربلندی حاصل ہو اور وہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے دوسروں کے لئے اسوۂ حسنہ بن سکیں مگر یہود پر ان کے ارشاد و تبلیغ کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا اور ان کی سرکشی اور نافرمانی ترقی پذیر ہوتی گئی اور ان کے علماء و احبار نے سیم و زر کی خاطر خدائے برتر کے احکام میں تلبیس شروع کر دی اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے میں بے خوف ہو گئے اور عوام نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر گمراہی کو اپنا امام بنالیا اور بے باکی کے ساتھ ہر قسم کی بداخلاقی کو اپنالیا اور آخر کار ان کے خواص و عوام اس انتہائی شقاوت و بدبختی پر اتر آئے کہ خدا کے معصوم پیغمبروں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور ان کی تکذیب کر کے ان کے خون ناحق پر فخر و مباہات کرنے لگے چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں جگہ جگہ ان کی بدکرداریوں اور نافرمانیوں کا اس طرح ذکر موجود ہے:

بنی اسرائیل نہیں جانتے، میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے آہ خطاکار گروہ ایک قوم جو گناہوں سے لدی ہوئی ہے بدکرداروں کی نسل خراب اولاد کہ انھوں نے خدا کو ترک کیا اسرائیل کے قدوس کو حقیر جانا اس سے بالکل پھر گئے۔ (باب آیات ۳-۴)

اے میری امت تیرے پیشوا تجھ کو گمراہ کرتے ہیں اور تیرے راہ گیروں کی راہ مارتے ہیں خداوند کھڑا ہے کہ مقدمہ پیش کرے اور وہ لوگوں کی عدالت کرنے پر مستعد ہے۔ (باب ۳ آیات ۱۳-۱۲)

کیونکہ وہ جوان کے پیشوا ہیں ان سے خطاکاری کراتے ہیں اور وہ جوان کی پیروی کرتے ہیں نگلے جائیں گے سو خداوند ان کے جوانوں سے خوشنود نہیں اور وہ ان کے یتیموں اور ان کی بیواؤں پر رحم نہ کرے گا کہ ان میں ہر ایک بے دین ہے اور بدکردار ہے۔ (باب ۹ آیات ۱۷-۱۶)

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں اس طرح مذکور ہے:

اور خداوند نے اپنے سارے خدمت گذار نبیوں کو تمہارے پاس بھیجا صبح سویرے اٹھا کے بھیجا، پر تم نے نہ سنا نہ سننے کو اپنا کان لگایا، انھوں نے کہا کہ ہر ایک اپنی بری راہ سے اور اپنے کاموں کی برائی سے باز آؤ اور اس سرزمین میں جسے خدا نے تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو ہمیشہ کے لئے دیا بستے رہو اور تم بیگانے باطل معبودوں کا پیچھا نہ کرو کہ ان کی بندگی اور ان کو سجدہ کرنے لگو اور اپنے ہاتھوں کے کاموں سے مجھے غصہ دلاؤ۔ (باب ۲۵ آیات ۴-۷)

اور ایسا ہوا کہ جب یرمیاہ ساری باتیں کہہ چکا جو خداوند نے اسے حکم دیا تھا کہ ساری قوم سے کہے تب کاہنوں اور نبیوں (جھوٹے مدعیانِ نبوت) اور ساری قوم نے اس کو پکڑا اور کہا کہ تو یقیناً قتل کیا جائے گا۔ تو نے خداوند کا نام لے کر کس لئے نبوت کی ہے اور یہ کہا کہ یہ گھر (یروشلم) سیلا کی مانند ہو جائے گا اور یہ شہر ویران کیا جائے گا۔ (باب ۲۶ آیات ۱)

کیونکہ اے یہوداہ جتنے تیرے شہر ہیں اتنے ہی تیرے معبود ہیں تم کاہے کو مجھ سے حجت کرو گے تم سب مجھ سے پھر گئے ہو خداوند کہتا ہے میں نے تمہارے لڑکوں کو عبث مارا پیٹا ہے وہ تربیت پذیر نہیں ہوئے، تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمہارے نبیوں کو کھا گئی ہے (یعنی تم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے سچے پیغمبروں کو قتل کیا ہے)

یہود کی سرکشی اور خدا سے بغاوت کے یہ افسوسناک حالات تھے جن پر خدا کی جانب سے بار بار ان کو تنبیہ کی جاتی اور مہلت سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی جاتی رہی لیکن ان پر اُلٹا ہی اثر ہوتا رہا اور ان کی بے حیائی اور بیجا جسارت بڑھتی ہی رہی تب یکایک غیرت حق نے قہر اور بطشِ شدید کی شکل اختیار کر لی اور اس کا زبردست ہاتھ اُن کی جانب پاداشِ عمل کے لئے بڑھا۔

ساتویں صدی قبلِ مسیح کے آخری دور میں بابل (عراق) کی حکومت پر ایک زبردست جری اور ظالم و جابر بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کا نام بنوکذ نذر یا بنوکدزار تھا اور عرب اس کو بخت نصّر کہتے تھے اگرچہ اس زمانہ میں بابل کی حکومت بذاتِ خود ایک متمدن اور زبردست حکومت شمار ہوتی تھی مگر اس سے قریب نینوی کی مشہور طاقت کی تباہی کے بعد تو اس کو اور زیادہ قوت و شوکت حاصل ہو گئی اور وہ ایک عظیم الشان شہنشاہیت تسلیم کر لی گئی۔ حتی کہ ایران کی مختلف قبائل حکومتیں بھی اس کی باج گزار اور ماتحت حکومتیں سمجھی جانے لگیں۔

بنوکذ نذر کی شمشیر کشورستان نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور اس کی نظریں شام و فلسطین کے علاقوں پر بھی پڑنے لگیں جو یہودیا کا علاقہ کہلاتا اور بنی اسرائیل کے مذہب اور قومیت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا چنانچہ وہ اس کی جانب بڑھا۔ جب یہوداہ کی سرزمین کے باشندوں نے یہ سنا تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب کو موت کا نقشہ نظر آنے لگا اور اب وہ سمجھے کہ یسعیاہ اور یرمیاہ علیہ السلام نے ہماری بدکاریوں پر متنبہ کرتے ہوئے جس سزا اور عذاب الٰہی کا ذکر کیا تھا اور جس سے ناراض ہو کر ہم نے یرمیاہ علیہ السلام کو قید خانہ میں ڈال رکھا ہے وہ وقت آپہنچا مگر شومی قسمت دیکھئے کہ انھوں نے اس حالت کو دیکھ کر اپنی بداعمالیوں اور بدکرداریوں پر اظہار ندامت اور درگاہ الٰہی میں توبہ وانابت کی جانب پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مادی طاقت کے اسباب و وسائل پر بھروسہ کیا اور شاہ بابل کی مقاومت کے لئے آمادہ ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ وہ فلسطین و شام کے شہروں اور آبادیوں کو ویران اور مسمار کرتا ہوا بیت المقدس (یروشلم) کے دروازے پر آکھڑا ہوا۔ اب شاہ یہود ایکونیاہ بن یہویقیم کو بجز اطاعت کوئی چارہ نہ رہا۔ بنوکذ نذر، یروشلم میں لشکر سمیت داخل ہوا اور بادشاہ سردار اور تمام امراء کو قید کر لیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لشکریوں نے تمام مال و متاع اور ہیکل کی تمام اشیاء کو

۱: باب ۲۴ آیات ۱۔

لوٹ لیا اور توراۃ کے تمام نسخوں کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا اور ہزار ہا انسانوں کو قتل اور باختلاف روایت ایک لاکھ سے زاید یہودیوں کو (جن میں بوڑھے، بچے عورتیں اور مرد سب ہی تھے) بھیڑ بکری کی طرح ہنکاتا ہوا پیادہ پا بابل لے گیا اور ان سب کو غلام و باندی بنالیا، علاقہ فلسطین و شام کے لاکھوں انسانوں کو قتل و غارت کرنے کے علاوہ صرف دمشق میں اس نے بے تعداد یہودیوں کے تہ تیغ کیا، حتیٰ کہ خود یہودیوں کی زبان پر یہ تھا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے کی سزا ہے جو ہم کو شاہ بابل کی شمشیر براں کے ذریعہ دی جارہی ہے۔

غرض شاہ بابل اس حملہ نے یہوداہ کا ملک ہی ویران نہیں کیا بلکہ ان کے مذہب اور قوم کو بھی پارہ پارہ کر دیا چنانچہ یہود کے ان قیدیوں میں حضرت دانیال (اصغر) حضرت عزیر اور بعض دوسرے وہ بزرگ بھی تھے جن کو خدائے تعالیٰ کی جانب سے قیام بابل کے زمانہ میں یہود کی اصلاح کے لئے نبوت سے سرفراز کیا گیا تاکہ وہ اس بت پرست شاہنشاہی کی غلامی میں طاقت و آزادی سے محرومی کے ساتھ ساتھ دین و مذہب سے بھی محروم نہ ہو جائیں۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲)

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں یہ نقل کیا ہے کہ جب بنوکدنذر (بخت نصر) بیت المقدس میں داخل ہو کر سب کچھ برباد کر چکا تو اس کو اطلاع دی گئی کہ یہود نے اپنے ایک نبی یرمیاہ علیہ السلام کو اس بنیاد پر قید کر رکھا ہے کہ انھوں نے تیری آمد اور حملہ سے قبل اپنی قوم کو ان تمام باتوں کی خبر دیدی تھی جو آج پیش آئیں یہ سن کر شاہ بابل نے ان کو زندان سے نکالا اور ان سے بات چیت کر کے بیحد متاثر ہوا اور اصرار کیا کہ اگر وہ بابل چلنے پر آمادہ ہوں تو ان کو حکومت میں منصب جلیل دیا جائے گا اور ان کی کیاست و فراست سے فائدہ اٹھایا جائے گا مگر حضرت یرمیاہ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ تیرے ہاتھوں میری بد قسمت قوم کا جو حال ہوا ہے اس کے بعد میرے لئے بابل جانا میری زندگی کا سب سے بدترین سانحہ ہوگا میں تو اب ان ہی کھنڈرات پر زندگی گزاروں گا پس اے بادشاہ تو مجھ سے اس بارہ میں اصرار نہ کر شاہ بابل یہ سن کر خاموش رہا اور بابل کو روانہ ہو گیا۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲)

بابل کی غلامی کا یہ زمانہ یہود کیلئے کس درجہ یاس انگیز حسرت زا اور عبرتناک رہا ہوگا اس کا حقیقی اندازہ ہمارے اور آپ کیلئے بہت مشکل ہے بظاہر کوئی سہارا نہیں تھا کہ جسکے بل بوتہ پر وہ اپنی اس حالت میں انقلاب پیدا کر سکتے البتہ جب کہ وہ یسعیاہ اور یرمیاہ علیہما السلام کے مکاشفوں اور پیشین گوئیوں کی ابتدائی صداقت[1] کا تجربہ

[1] شاہ بابل نے یہود اور یروشلم کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی خبر یہود کو پہلے سے دے دی گئی تھی اور بتا دیا گیا تھا کہ تمہاری بدکاریوں کا اگر یہی حال رہا تو تم ایک بت پرست بادشاہ بنوکدنذر کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کیئے جاؤ گے، یہ پیشین گوئی بھی یسعیاہ اور یرمیاہ کے صحیفوں میں آج تک موجود ہے۔ تب یسعیاہ نبی نے حزقیاہ بادشاہ کے پاس آکر اسے کہا کہ ان شخصوں نے کیا کہا اور وہ کہاں سے تیرے پاس آئے؟ حزقیاہ نے جواب دیا کہ ایک دور (ملک بابل ہی سے میرے پاس آئے تب اس نے کہا کہ انہوں نے تیرے گھر میں کیا کیا دیکھا؟ حزقیاہ نے جواب دیا سب کچھ کہ جو میرے گھر میں ہے، انہوں نے دیکھا تب یسعیاہ نے حزقیاہ کو کہا کہ رب الافواج کا کلام سن۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ وہ سب کچھ جو کہ تیرے گھر (یروشلم) میں ہے اور جو کچھ تیرے باپ دادوں نے آج کے دن تک ذخیرہ کر رکھا ہے اٹھا کے بابل کو لے جائیں گے۔ خداوند فرماتا ہے کوئی چیز باقی نہ چھوٹے گی اور وہ تیرے بیٹوں میں سے جو تیری نسل سے ہوں گے اور تجھ سے پیدا ہوں گے لے جائیں گے

(جاری ہے)

کر چکے بلکہ اپنی زندگی پر انکو گزرتا ہوا دیکھ چکے تو ان کے لئے امید کی ایک یہ جھلک ضرور باقی تھی کہ ان مکاشفوں اور پیشین گوئیوں میں ساتھ ہی یہ بھی خبر دی گئی تھی کہ یہود بابل میں ستر برس غلام رہیں گے اور ستر برس گزرنے پر فارس سے ایک بادشاہ کا ظہور ہوگا جو خدا کا مسیح اور اسکا چرواہا کہلائیگا اور وہ یہود اور یروشلم کا نجات دہندہ ہوگا۔

یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے واقعہ سے تقریباً ایک سو ساٹھ برس اور حضرت یرمیاہ نے ساٹھ برس قبل یہوداہ کو ان کی تباہی و بربادی کی پیشین گوئی کے ساتھ سنادی تھی حتی کہ قیام بابل کے دوران میں پیشین گوئی کے ظہور سے تھوڑے زمانہ قبل دانیال علیہ السلام نے اپنے مکاشفہ میں اس شاہ فارس کو ایک ایسے مینڈھے کی شکل میں دیکھا تھا جس کے دو سینگ (قرنین) ہیں اور جبریل علیہ السلام نے اس کی یہ تعبیر دی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بادشاہ مادہ (میڈیا) اور فارس دو بادشاہتوں کو ملا کر بادشاہی کرے گا اور اسی مکاشفہ میں انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک اور بکرا ہے جس کی پیشانی پر صرف ایک سینگ ہے اور اس نے دو سینگ والے مینڈے کو مغلوب کرلیا اور پھر جبرئیل علیہ السلام نے اس کی تعبیر یہ دی کہ یہ ایک ایسا زبردست بادشاہ ہوگا جو ایران کی اس شاہنشاہی کا خاتمہ کر کے اس پر قابض ہو جائے گا (یعنی سکندر یونانی)۔

چنانچہ یرمیاہ کی کتاب میں بصراحت یہ مدت مذکور ہے:

اور یہ ساری سرزمین ویرانہ اور حیرانی کا باعث ہو جائے گی اور یہ قومیں ستر برس تک بابل کے بادشاہ کی غلامی کریں گی۔ (باب ۲۵ آیات ۱۱)

اور ایسا ہوگا "خداوند کہتا ہے "کہ جب ستر برس ہوں گے میں بابل کے بادشاہ کو اور اس کی قوم کو اور کسدیوں ربابلیوں کی سرزمین کو ان کی بدکردار کے سبب سزا دوں گا اور میں اسے ایسا اجاڑوں گا کہ ہمیشہ تک ویرانہ رہے۔ (باب ۲۵ آیات ۱۳۔۱۲)

خداوند یوں کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گزر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔ (باب ۲۹ آیات ۱۱۔۱۰)

اور ان ہی پیشین گوئیوں میں یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ یہود کو بابل کی غلامی سے نجات دینے والی ہستی کا ایران سے ظہور ہوگا اور اسکا نام خورس ہوگا اسکی حکومت اور شاہنشاہیت کا فروغ خداوند اسرائیل کی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوگا اور جو بات ان کے گذشتہ بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوئی اسکو نصیب ہوگی کیونکہ وہ خدا کا چرواہا، مسیح (مبارک) اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ ہوگا چنانچہ یسعیاہ کی کتاب میں اسکے ظہور کی خبر صاف الفاظ میں اس

(گذشتہ سے پیوستہ)

اور وہ شاہِ بابل کے قصر میں خواجہ سرا ہوں گے۔ (باب ۳۹ آیات ۷۔۳)

یہ پیشین گوئی حضرت یسعیاہ نے اس وقت کی تھی جب کہ بنو کدنذر سے بہت پہلے بابل کے بادشاہ مردوک نے یہوداہ کے بادشاہ حزقیاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے تھے اسی طرح حضرت یرمیاہ کی کتاب میں ہے۔

اسلئے رب الافواج یوں کہتا ہے تم نے میری باتیں نہیں سنیں تو دیکھو میں شمال کے سارے گھرانوں کو اور بنو کدنزر کو جو کہ میرا غلام ہے بلا بھیجوں گا، خداوند کہتا ہے اور میں انہیں اس سرزمین اور اس کے باشندوں پر اور ان ساری قوموں پر جو چہار جانب ہیں چڑھائی کرالاؤں گا۔

طرح دی گئی ہے:۔

(میں خداوند بنی اسرائیل کا خدا) یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سوکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ یہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں وا اور بادشاہوں کی کمریں کھلواڈالوں اور دہرائے ہوئے دروازے اس کے لئے دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے..... میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سوا کوئی خدا نہیں میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہ پہچانا تاکہ لوگ سورج نکلنے کی اطراف سے اور سورج کے غروب ہونے کی اطراف تک جانیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں.... میں نے اس کو صداقت کیلئے برپا کیا ہے اور میں اس کی ساری راہیں آراستہ کروں گا وہ میرا شہر بنائے گا اور میرے اسیروں کو بغیر قیمت اور عوض لئے چھڑائے گا..... اے اسرائیل کے خدا نے نجات دینے والے وہ سب کے سب پشیمان اور سراسیمہ بھی ہوں گے وہ جو بت تراش (اہل بابل) ہیں سب کے سب گھبرا جائیں گے پھر اسرائیل خداوند میں ہو کے ابدی نجات کے ساتھ رہائی پائے گا۔ (یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۸۔۲۶ و باب ۴۱ آیات ۱۲)

گزرو، ستانہ پر سے گزرو، لوگوں کے لئے راہ راست کرو اور شاہراہ اونچی کرو، پتھر سر کا دو قوموں کے لئے جھنڈا کھڑا کرو دیکھو خداوند دنیا کی سرحدوں تک منادی کرتا ہے کہ صیہون کی بیٹی کو کہو دیکھو تیرا نجات دینے والا آتا ہے دیکھ اس کا اجر اس کے ساتھ اور اس کا کام اس کے آگے ہے۔
(باب ۱۲ آیات ۱۱۔۱۰)

بابل کی بات وہ الہامی بات جسے اموص کے بیٹے یسعیاہ نے رؤیا میں دیکھا...... میں نے اپنے مخصوص کیے ہوؤں کو حکم کیا۔ میں نے اپنے بہادروں کو جو میری خداوندی سے مسرور ہیں کہ وہ میرے قہر کو انجام دیں..... رب الافواج جنگی لشکر کی موجودات لیتا ہے وہ دور ملک سے آسمان کی انتہاء کی طرف سے آتے ہیں.... دیکھو میں مادیون (میڈیا والوں کو) ان پر چڑھاؤنگا جو کہ روپیہ کو خاطر میں نہیں لاتے اور سوتے سے خوش نہیں ہوتے۔ (باب ۵۱)

اور یرمیاہ کی کتاب میں مذکور ہے:۔

دیکھ میں اتر کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا.. کسدستان (بابل) لوٹا جائے گا سب جو اسے لوٹیں گے آسودہ ہوں گے "خداوند کہتا ہے"[1] اسلئے خداوند یوں کہتا ہے دیکھ میں تیری حجت ثابت کروں گا اور تیرا انتقام لوں گا اور اس (بابل) کے دریا سکھا دوں گا اور اس کے سوتے خشک کر دوں گا اور بابل کھنڈر ہو جائے گا اور گیدڑوں کا مقام اور حیرانی

باب ۱۲ آیات ۱۱۔۱۰۔

کا باعث ہوگا اور اس میں کوئی نہ بسے گا.... کیونکہ حملہ آور اتر سے اس پر چڑھے ہیں.... بابل سے رونے کی آواز اور بڑی ہلاکت کی صدا کسدیوں کی سرزمین سے آتی ہے کیونکہ خداوند بابل کو غارت کرتا ہے... بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھائی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلادیے جائیں گے۔ (باب ۵۱)

توراۃ کے ان بیان کردہ واقعات کی تصدیق تاریخ کے روشن صفحات اس طرح کرتے ہیں کہ:

تقریباً ۶۳۵ قبل مسیح ایران میں قبائلی طرز حکومت رائج تھا اور ایران دو حصوں پر تقسیم تھا جہاں دو چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں ان میں سے شمال مغربی حصہ میڈیا (مادہ یا، مات) کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ پارس کے نام سے موسوم تھا مگر اس دور میں چونکہ بابل و نینوی کی حکومتیں زبردست اور قاہر حکومتیں تھیں اس لئے یہ دونوں ریاستیں نینوی کی حکومت کے زیر اثر اور ماتحت سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن جب ۶۱۲ ق م نینوی تباہ ہو گیا اور آشوری حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو اگرچہ میڈیا کو آزادی نصیب ہوگئی اور وہاں قومی حکومت کے جذبات ابھرنے لگے اور ایک حکمراں شاہی خاندان بھی پیدا ہو گیا تاہم پارس اور میڈیا دونوں ریاستوں کو آزاد سلطنت قائم کر لینے کی جرات نہ ہو سکی اور بابلی حکومت کو بیحد فروغ ہو گیا گویا نینوی کی تباہی نے بابل کی طاقت کو بہت بڑی شاہنشاہیت میں تبدیل کر دیا جس کے سامنے یہ ریاستیں بے اثر ہی رہیں یہ کیفیت ۵۶۰ تک رہی لیکن ۵۵۹ ق م میں اچانک میڈیا کے رئیس کمبوچہ (کیقباد) کے جانشین کے ارش (خورس) نے غیر معمولی حالات کے ساتھ ظہور کیا اور چند ہی روز میں میڈیا اور فارس کی ریاستوں نے برضا و رغبت اس کو اپنا واحد شاہنشاہ تسلیم کر لیا اور وہ بغیر کسی خونریزی کے ایشیاء کوچک کے تمام علاقوں کا زبردست اور خود مختار شاہنشاہ بن گیا۔

اہل فارس اس کو کے ارش اور گورش کہتے ہیں لیکن یہ یونانی میں سائرس اور عبرانی میں خورس اور عربی میں کیخسرو کے ناموں سے مشہور ہے۔ کے ارش کے ظہور سے یونانی اور یہودی دو قومیں خصوصیت کے ساتھ متعارف ہیں اس لئے کہ ان دونوں قوموں پر اس کی حکومت کا موافق اور مخالف حیثیت سے نمایاں اثر پڑا اور یہود کیلئے تو اس کا عروج و ظہور خوش حالی، آزادی اور امن و اطمینان کا بہت بڑا سبب بنا اسی لئے وہ اس کی شخصیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان کے انبیاء کے صحیفوں میں اس کو خدا کا چرواہا مسیح اور بنی اسرائیل کا نجات دہندہ کہا گیا ہے۔ مگر اہل عرب قبل از اسلام اس کی شخصیت سے زیادہ متعارف نہیں تھے اور بعد از اسلام جب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تب بھی ان کو اس کی شخصیت کے تعارف سے اس لئے واسطہ نہیں پڑا کہ یہ ایران کے دور اول کا ہیرو ہے اور مسلمانوں کی فتوحات کا تعلق تمام تر ایران کے تیسرے دور سے متعلق ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اس کے نام اور شخصیت کے تعین میں بھی اختلاف نظر آتا ہے چنانچہ بعض مؤرخین عرب نے اس کو بہمن بن اسفندیار کہا ہے اور بعض نے ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرتے ہوئے اس کا نام کیقباد بیان کیا ہے حالانکہ ایران و یونان کے وہ مؤرخین جو کے ارش کے معاصر ہیں کیقباد (کمبوچہ) اس کے باپ اور اس کے بیٹے کا نام بتاتے ہیں اور بعض عرب مؤرخین نے اس کو مہراسب بن کشتاسپ بتایا ہے۔[1]

۱: یہ مسئلہ ذوالقرنین کی بحث میں زیادہ واضح کیا جائے گا۔

غرض جب گورش یا خورس میڈیا (مابات) اور پارس دونوں ریاستوں کو ملا کر ایک زبردست اور خود مختار بادشاہ ہو گیا تو یہ وہ وقت ہے کہ بابل کے تخت سلطنت پر بنوکدنذر (بخت نصر) کا ایک جانشین بیل شازار سریر آرائے سلطنت تھا۔

یہ بادشاہ بخت نصر کی طرح اگرچہ جری اور بہادر نہیں تھا مگر ظلم اور عیاشی میں اس سے بھی آگے تھا حتی کہ خود اس کی اپنی رعایا اس کے اعمال بد سے سخت پریشان اور اس کے ظلم سے عاجز اور ہر وقت انقلاب کی خواہاں رہتی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت دانیال اپنی الہامی پیشین گوئیوں، کریمانہ اخلاق عالی صفات اور غیر معمولی فہم و فراست کی وجہ سے پبلک میں اس درجہ مقبول تھے کہ حکومت کے نظام کار میں دخیل اور مشیر بن گئے تھے انھوں نے بیل شازار کو ہر چند سمجھایا اور بداعمالیوں سے روکا اور ڈرایا مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا اور ایک دن اس نے یہ نوبت پہنچادی کہ اپنی محبوبہ کے اصرار پر یروشلم کے مقدس ظروف کو جو "بخت نصر لوٹ کر لایا تھا" مجلس نشاط میں منگوا کر ان میں شراب پی اور ان کی توہین کی مگر ابھی وہ شراب نوشی میں مشغول ہی تھا کہ اس نے شمع کافوری کی روشنی میں یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا کہ بغیر کسی شکل وصورت کے سامنے آئے ہوئے ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا اور اس نے محل کی دیوار پر چند جملے لکھ دیے یہ دیکھ کر بادشاہ پر بہت ہیبت طاری ہو گئی اور اس نے فوراً نجومیوں، کاہنوں، جوتشیوں بڑے بڑے عقلاء و حکماء کو جمع کیا اور ان سے اس واقعہ کو نقل کر کے تحریر کا مفہوم معلوم کرنا چاہا لیکن کوئی اس عقدہ کو حل نہ کر سکا اور وہ بھی بادشاہ کی طرح حیران رہ گئے تب ملکہ نے کہا کہ آپ اس برگزیدہ انسان دانیال کو بلائیں جس کی باتیں ہمیشہ سچی ہوتی ہیں اور جو اپنے اعمال و کردار میں بے نظیر انسان ہے وہی اس کو حل کر سکتا ہے۔

حضرت دانیال دربار میں پہنچے تو بادشاہ نے واقعہ نقل کیا اور کہا کہ اگر تم اس کو حل کر دو تو میں تم کو دولت و ثروت سے مالا مال کر دوں گا۔ دانیال ﷺ نے ہنس کر جواب دیا کہ مجھے بادشاہ کی دولت درکار نہیں ہے میں بغیر کسی عوض بادشاہ کے اس عقدہ کو حل کر دوں گا اے بادشاہ گوش و ہوش سے سن! خدا نے تجھ کو قوت اور دولت دونوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا اور نبیوں کی اولاد تیرے حوالے کر دی مگر تو نے خدا کا شکر ادا نہ کیا اور جس نیک کرداری کی تجھ سے توقع ہو سکتی تھی وہ تو نے پوری نہ کی اور حد یہ ہے کہ تو نے مجلس نشاط میں یروشلم کے ظروف کی توہین کر کے تو گویا یروشلم کے خدا کو چیلنج کیا چنانچہ اس کی جانب سے تجھ کو وہ جواب ملا جو تو نے نوشتہ میں دیکھا، نوشتہ کہتا ہے کہ ہم نے تجھ کو وزن کیا مگر تو پورا نہ اترا اور کم نکلا ہم نے تیری حکومت کا حساب کیا اور اس کو تمام کر ڈالا اور ہم نے تیری حکومت پارہ پارہ کر کے فارس اور میڈیا کے بادشاہ کو بخش دی۔[1]

چنانچہ اس واقعہ کو چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ بابل کی رعایا نے چند افسروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خورس کے پاس جائیں اور اس سے عرض کریں کہ آپ کی ایمانداری، عدل و انصاف اور رعایا پروری کی شہرت نے ہم کو مجبور کیا ہے کہ ہم آپ کو دعوت دیں کہ آپ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلا کر اپنی رعایا بنا لیجیے۔ خورس کے پاس یہ وفد اس وقت پہنچا جبکہ وہ مشرق کی مہم سر کرنے میں مشغول تھا اس نے وفد کی درخواست کو سنا اور قبول کیا اور مشرقی مہم سے فارغ ہو کر بابل پہنچا اور اس کی مستحکم اور نا قابل تسخیر ہونے والی

[1] نوشتہ کے الفاظ یہ ہیں "منی منی تقیل او فیریسین" دانی ایل کی کتاب باب ۵ آیات ۲۸-۲۵۔

دوہری شہر پناہ کو منہدم کر کے حکومت بابل کا خاتمہ کر دیا اور تمام رعایا کو امن دے کر ان کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائی جس کا بابل کی رعایا نے بیحد شکریہ ادا کیا اور بخوشی اس کی اطاعت قبول کر لی۔[1]

جب خورس بابل کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوا تو دانیال ﷺ نے اس کو توراۃ (صحف انبیاء) کی وہ پیشین گوئیاں دکھائیں جو حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ نے یہود کو غلامی سے نجات دلانے والی ہستی کے متعلق کی تھیں، خورس ان کو دیکھ کر بیحد متاثر ہوا اور اس نے اعلان کر دیا کہ تمام یہود آزاد ہیں کہ وہ ملک شام و فلسطین کو واپس چلے جائیں اور وہاں جا کر خدا کے مقدس گھر یروشلم (بیت المقدس) اور اس کے ہیکل (مسجد) کو دوبارہ تعمیر کریں اور اس سلسلہ کے تمام اخراجات سرکاری خزانہ سے ادا کیے جائیں اور یہ بھی اعلان کیا کہ یہی دین، دین حق ہے اور یروشلم کا خدا ہی سچا خدا ہے۔

"عزرا کی کتاب" میں ہے کہ اگرچہ خورس کی بدولت یہود کو دوبارہ آزادی اور خوش حالی نصیب ہوئی اور ہیکل کی تعمیر بھی شاہی خزانہ سے شروع ہو گئی مگر ابھی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ خورس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا کیقباد (کمبوجیہ) بھی جلد مر گیا تب آٹھ سال کے اندر ہی دارا جو خورس کا چچازاد بھائی تھا اس کا جانشین ہوا اس درمیان میں بعض مخالف افسروں نے یروشلم کی تعمیر کو حکماً روک دیا تب حجی نبی اور زکریا[2] نبی نے دارا کے دربار میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں تعمیر بیت المقدس کے متعلق لکھتے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ سرکاری دفتر میں خورس کا وہ حکم نامہ ضرور موجود ہو گا جس میں بیت المقدس کی تعمیر کا حکم اور خزانہ شاہی سے اخراجات کا ذکر کیا گیا ہے آپ اس کو نکلوائیں اور اپنے متعلقہ افسروں کو حکم دیں کہ جو بھی اس کی تعمیر میں حائل ہو رہے ہیں ان کو روک دیں تاکہ ہم باطمینان اس کی تعمیر کر سکیں چنانچہ دارا نے جب خورس کا حکم نامہ دفتر سے طلب کیا تو اس میں یہ تحریر تھا:

> خورس بادشاہ کی سلطنت کے پہلے سال مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے یہ حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور اس کی بنیادیں مضبوطی سے ڈالی جائیں، اور خرچ بادشاہ کے خزانہ سے دیا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے روپہلے برتن بھی جنہیں بنوکدنزر (یروشلم) کی ہیکل سے نکال لایا اور بابل میں لا رکھا سو پھیر دیے جائیں اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ رکھ دیئے جائیں یعنی خدا کے گھر میں رکھ دیے جائیں۔
>
> (عزرا باب ۶ آیات ۵۔۱)

پس اس حکم کے مطابق دارا نے یروشلم کی تکمیل کا حکم دیا اور افسروں کو سختی کے ساتھ روک دیا کہ کوئی اس میں ہرگز مزاحم نہ ہو اور یروشلم اور خدائے یروشلم کے ساتھ اپنی اور اپنے پیشرو کی عقیدت کا ان الفاظ میں اظہار کیا:

> میں ایک اور حکم کرتا ہوں کہ جو شخص اس فرمان کو ٹال دے اسکے گھر پر سے کوئی لٹھا کھینچ کر نکالا جائے اور وہ کھڑا کیا جائے اور وہ اس پر پھانسی دیا جائے اس بات کیلئے اس کا گھر کوڑے کا ڈھیر کر دیا جائے پھر وہ خدا جس نے اپنا نام دہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے

۱: تاریخ کے یہ واقعات مع حوالجات ذوالقرنین کی بحث میں مفصل بیان ہوں گے۔

۲: یہ زکریا، یحییٰ علیہ السلام کے والد نہیں ہیں بلکہ دوسرے نبی ہیں۔

خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے میں (دارا) حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے۔ (باب ۶ آیت ۱۲-۱۱)

چنانچہ جلد ہی حجی اور زکریا (علیہما السلام) انبیاء بنی اسرائیل کی نگرانی میں دارا کے نہرپار کے صوبہ دار تتنی اور شتر بوزنی اور ان کے رفقاء نے اس تعمیر کو مکمل کرا دیا۔ عزرا کی کتاب میں ہے:

چنانچہ انہوں نے اسرائیل کے خدا کے حکم کے مطابق فارس کے بادشاہ خورس اور دارا اور تخششتا کے حکم کے مطابق تعمیر کی اور کام کو انجام تک پہونچایا۔ (باب ۶ آیات ۱۴-۱۳)

یہود بنی اسرائیل کو اب پھر ایک بار امن و اطمینان نصیب ہوا اور انھوں نے ارض یہودا میں دوبارہ اپنی حکومت کو استوار کیا اور چونکہ شاہ بابل نے توراۃ کے تمام نسخوں کو بھی جلا کر خاک کر دیا تھا اور ستر برس تک وہ خدا کی اس کتاب سے محروم رہے تھے اس لئے ان کے اصرار پر حضرت عزیز (عزرا) علیہ السلام نے اپنی یادداشت سے از سر نو اس کو تحریر کیا۔

شرارت یہود کا دوسرا دور

یہود کی قومی خصائل و عادات سے متعلق کافی معلومات کے بعد آپ کے لئے یہ بات حیرت انگیز نہیں ہو سکتی کہ اتنی سخت ٹھوکر کھانے اور ذلت و رسوائی کی اس عبرت ناک سزا کو برداشت کرنے کے باوجود جن کی تفصیلات ابھی سپرد قلم ہو چکی ہیں ان کی چشم عبرت اور گوش حق نیوش میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی اور ان کی حالت اس آیت کا مصداق ثابت ہوئی لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا یعنی آہستہ آہستہ انھوں نے پھر ظلم و فساد اور بغاوت و سرکشی پر کمر باندھ لی اور گذشتہ بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

کچھ یہ بھی نہیں تھا کہ کوئی ان کو سمجھانے اور تنبیہ کرنے والا نہیں تھا کیونکہ خدائے تعالیٰ کے سچے پیغمبروں کا سلسلہ ان میں جاری تھا اور وہ ان کو سیدھی راہ پر لگانے اور بری راہ سے بچانے کے لئے برابر پند و نصیحت اور موعظت و بصیرت کا حق ادا کرتے رہتے تھے مگر ان کے قومی مزاج کا توازن اس درجہ خراب ہو چکا تھا کہ ان پر کسی اچھی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا اور بادشاہ سے لے کر رعایا تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے وہ پیغمبران حق کا مذاق اڑاتے، باطل کوشی کو شیر مادر سمجھتے اور اپنی حرکات بد پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر کرتے رہتے تھے پھر صورت حال اس حد پر جا کر بھی ختم نہیں ہوئی بلکہ اسی درمیان میں ایک ایسا ہوش ربا حادثہ پیش آگیا جس نے یہود کی دنائت اور باطل کوشی کو دوست دشمن دونوں کی نگاہ میں بخوبی روشن کر دیا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل

اس ہوش ربا حادثہ کی تفصیل یہ ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے یہ عہد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تبلیغ و دعوت کا عہد تھا اور ارض یہودیہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مواعظ کا یہ اثر ہو رہا تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب مسخر ہوتے جاتے تھے اور وہ جس جانب بھی نکل جاتے تھے جماعت کثیر ان پر پروانہ وار نثار ہونے لگتی تھی ادھر تو یہ حالت تھی اور دوسری جانب یہود کا بادشاہ ہیرودیس نہایت ہی بدکار اور ظالم تھا وہ حضرت یحییٰ کی مقبولیت

دیکھ دیکھ کر لرزہ براندام تھااور خوف کھاتا تھا کہ کہیں یہودیہ کی بادشاہت میرے ہاتھ سے نکل کر اس مرد بادی کے پاس نہ چلی جائے سوءاتفاق کہ ہیرودیس کے سوتیلے بھائی کا انتقال ہو گیا اس کی بیوی بیحد حسین تھی اور ہیرودیس بھاوج ہونے کے علاوہ اس کی علاتی بھتیجی بھی تھی، ہیرودیس اس پر عاشق ہو گیا اور اس سے عقد کر لیا چونکہ یہ عقد اسرائیلی ملت کے خلاف تھا اس لئے حضرت یحیٰی علیہ السلام نے سر دربار اس کو اس حرکت پر ملامت کی اور خدا کے خوف سے ڈرایا۔ ہیرودیس کی محبوبہ نے یہ سنا تو غم و غصہ سے بے تاب ہو گئی اور ہیرودیس کو آمادہ کیا کہ وہ یحیٰی علیہ السلام کو قتل کر دے ہیرودیس اگر اس نصیحت سے خود بھی بہت برافروختہ تھا مگر اس ارادہ میں متامل تھا لیکن محبوبہ کے اصرار پر اس نے حضرت یحیٰی علیہ السلام کا سر قلم کر کے اور طشت میں رکھ کر اس کے پاس بھیجوادیا سخت حیرت کا مقام ہے کہ حضرت یحیٰی علیہ السلام کی محبوبیت عام کے باوجود کسی اسرائیلی کو یہ جرات نہیں ہوئی کہ ہیرودیس کی اس ملعون حرکت پر اس کو روکے یا ملامت کرے۔ بلکہ ایک جماعت نے اس کے اس ملعون عمل کو بنظر استحسان دیکھا۔ اب حضرت یحیٰی علیہ السلام کی شہادت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عوت تبلیغ کا وقت آگیا اور انھوں نے علی الاعلان یہود کی بدعات مشرکانہ رسوم ظالمانہ خصائل اور بد دینی کے خلاف جہاد لسانی شروع کر دیا۔ یہود میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ وہ امر حق پر لبیک کہتے چنانچہ مختصر سی تعداد کے ماسوا بھاری اکثریت نے ان کی مخالفت شروع کر دی اسی درمیان میں نبطی بادشاہ حارث نے جو ہیرودیس کی پہلی بیوی کے رشتہ سے اس کا خسر تھا اس پر چڑھائی کر دی اور سخت کشت و خون کر کے ہیرودیس کو ہزیمت فاش دی جس نے ہیرودیس کی قوت کا خاتمہ کر دیا تاہم یہودیہ کی ریاست رومیوں کے بل بوتے پر قائم رہی اس وقت اگر چہ عام طور پر یہود یہ کہتے تھے کہ ہیرودیس اور اسرائیلیوں کو یہ ذلت و ہزیمت حضرت یحیٰی علیہ السلام کے خون ناحق کی پاداش میں پیش آئی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس حادثہ سے کوئی سبق نہیں لیا اور وہ اپنے ظالمانہ مقاصد سے باز نہ آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں بغض و عناد کے ساتھ سرگرم رہے تا آنکہ شاہ یہودیہ پلاٹس سے ان کے قتل کی اجازت حاصل کر کے ان کا محاصرہ کر لیا مگر خدائے تعالیٰ نے ان کے ارادوں کو ناکام بنا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ (تاریخ طبری ج ۲ ص ۵۴۴ تا ۱۷)

پاداش عمل

آخر پاداش عمل سامنے آئی اور اب خود یہودیوں کے باہم خانہ جنگی شروع ہو گئی وجہ یہ پیش آئی کہ اس دور میں یہود کے تین فرقے ہو گئے تھے ایک فقہاء کی تھی اور ان کو "فریسی" کہتے تھے اور دوسری جماعت اصحاب ظاہر کی تھی جو الہامی الفاظ کے ظاہر پر جمود کرتے تھے ان کو "صدوقی" کہتے تھے اور تیسری جماعت مرتاض راہبوں کی تھی ان میں سے فریسی اور صدوقی کا اختلاف اس درجہ ترقی کر گیا تھا کہ ان میں سخت خونریزیاں ہونے لگیں، شاہ یہود یہودیہ جس گروہ کا طرفدار ہو جاتا تھا وہ دوسرے گروہ کو بے دریغ قتل کرتا تھا آخر یہ جنگ اس قدر بڑھی کہ شاہ یہود کو باغیوں کے خلاف رومیوں سے مدد لینی پڑتی تھی اور بت پرستوں کے ہاتھوں یہودیوں کو قتل کرایا جاتا تھا چنانچہ اس کشمکش میں رفع عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ستر سال بعد یہود کے دو مدعان حق یوحنان اور شمعون کے درمیان سخت معرکہ جنگ و جدل برپا ہوا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تخت روم پر

اس کا ایک بہادر جرنیل اسپانوس، قیصری کر رہا تھا اور ارض یہودیہ میں یوحنان کو کامیابی ہو گئی تھی جو نہایت سفاک اور بدکار تھا اور اس کے ظالم ساتھیوں کے ہاتھوں ارض قدس کی تمام گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اس حالت میں یہود نے اسپانوس سے مدد چاہی اور اس نے اپنے بیٹے طیطوس (ٹیٹس) کو ارض مقدس کی فتح پر مامور کیا وہ آگے بڑھا اور ارض یہودیہ کے قریب جا کر اپنے ایک قاصد نیقانوس کو صلح کے لئے بھیجا۔ یہود کا پارۂ ظلم و ستم بہت چڑھا ہوا تھا انھوں نے اس کو بھی قتل کر دیا اب طیطوس غضب ناک ہو گیا اور اس نے کہا کہ بلا لحاظ کسی وقفہ کے تمام یہود کا استیصال کر کے جاؤں گا تاکہ ہمیشہ کے لئے اس سرزمین سے یہ جھگڑا پاک ہو جائے چنانچہ بقول مؤرخین اس نے بیت المقدس پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ شہر پناہ منہدم ہو گئی ہیکل کی دیواریں شکستہ ہو گئیں، محاصرہ کی طوالت سے ہزاروں یہود بھوکے مر گئے اور ہزاروں فرار ہو کر بے وطن ہو گئے اور جو بچے تھے وہ تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے رومیوں نے ہیکل کی بے حرمتی کی اور جہاں خدائے واحد کی عبادت ہوتی تھی وہاں بت لے جا کر رکھ دیے۔ (ابن خلدون ج ۲)

غرض یہ وہ شکست تھی کہ پھر یہود کبھی نہ ابھرے اور اپنی کمینہ اور ظالمانہ حرکات، علانیہ فسق و فجور اور نبیوں کے قتل کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار ہو رہ گئے۔

تیسرا زرین موقعہ اور یہود کی روگردانی

کچھ عرصہ بعد رومیوں نے بت پرستی ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی اور اس طرح ان کے عروج و ترقی نے یہودی قومیت اور مذہب دونوں کو مغلوب و مقہور بنا دیا۔

آپ ابھی مطالعہ کر چکے ہیں کہ جب طیطوس رومی نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تو یہودیوں کی ایک کافی تعداد وہاں سے بھاگ کر اطراف و جوانب میں جا بسی تھی ان ہی میں سے بعض وہ قبائل بھی ہیں جو یثرب (حجاز) اور اس کے قرب و جوار میں ساکن ہو گئے تھے یہ اور ان سے قبل و بعد جو قبائل یہود یہاں آ کر سکونت پذیر ہوئے ان کے اس انتخاب سکونت کے متعلق مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہود کو توراۃ اور قدیم صحیفوں سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ سرزمین نبی آخر الزماں کا دار الہجرۃ بنے گی اور یہود نبی آخر الزماں کے اس درجہ منتظر تھے اور ان کے یہاں ان کی آمد کی اس قدر شہرت تھی کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام نے تبلیغ و دعوت کے ذریعہ پیغام الٰہی سنانا شروع کیا تو یہود نے جمع ہو کر ان سے صاف کہا کہ ہم تین نبیوں کا انتظار کر رہے ہیں ایک مسیح علیہ السلام کا دوسرے الیاس علیہ السلام کا اور تیسرے اس مشہور معروف نبی آخر الزماں ﷺ کا جس کی آمد کی شہرت ہمارے درمیان اس قدر ہے کہ ہم اس کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور صرف اس کی جانب اشارہ کر دینے سے ہر ایک یہودی اس کو پہچان لیتا ہے چنانچہ انجیل یوحنا میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:

> یوحنا (یحییٰ) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن[1] اور لیوی[2] یہ پوچھنے کو بھیجے کہ تو کون ہے تو اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انھوں نے اس سے پوچھا

[1، 2] یہ یہود کے مذہبی مناصب ہیں۔

پھر تو کون ہے ؟ کیا تو ایلیا (الیاس) ہے اس نے کہا میں نہیں ہوں کیا تو وہ نبی ہے ؟[1] اس نے جواب دیا کہ نہیں، پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون ؟ تا کہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں ؟
(باب ا آیات ۲۱-۱۹)

توراۃ، انجیل، صحائف انبیاء ار تاریخ یہود میں بھی اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں کہ جن سے یہ تحقیق ہوتا ہے کہ یہود کو ایسے پیغمبر کا انتظار تھا جو نبی آخر الزماں ﷺ ہوگا اور حجاز میں مبعوث ہوگا اسی وجہ سے جب بھی وہ اپنے مرکز سے منتشر ہوئے ہیں تو ان کی ایک معقول تعداد اسی کے انتظار میں یثرب میں جا بسی۔[2]

ابدی ذلت و خسران

پس کس درجہ بد بخت و بد قسمت ہے وہ جماعت جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے تقریباً پانچ سو ستر سال تو اس انتظار میں گزارے کہ یثرب کی اس سر زمین میں جب خدائے تعالیٰ کا وہ پیغمبر (محمد ﷺ) ہجرت کر کے آئے گا تو ہم اس کی پیروی کر کے اپنی قومی اور مذہبی عظمت و وقار کو پھر ایک بار حاصل کریں گے حتیٰ کہ یثرب کے قبائل اوس و خزرج کے مقابلہ میں بھی اسی کی نصرت و مدد کے منتظر رہتے تھے مگر جب وہ نبی برحق آیا اور اس نے موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) اور توراۃ و انجیل کی تصدیق کرتے ہوئے ان کو پیغام حق سنایا تو سب سے پہلے انھوں (یہود) نے ہی ان کے خلاف بغض و عناد کا مظاہرہ کیا اور اس کی آواز پر کان نہ دھرتے ہوئے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور نتیجہ میں ابدی ذلت و حرماں نصیبی کو مول لیا۔

اللہ تعالیٰ نے تو شروع ہی میں ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ دو مرتبہ کی سرکشی اور اس کے انجام کے بعد ہم تم کو ایک موقع اور عنایت کریں گے پس اگر تم اس وقت سنبھل گئے اور تم نے خدا کی فرماں برداری کا ثبوت دیا اور خدا کے پیغمبر کی صداقت کا اقرار کر کے دین حق کو قبول کر لیا تو ہم بھی تمہاری عظمت رفتہ کو واپس لے آئیں گے اور دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ اندوز کریں گے لیکن اگر تم نے اس موقع کو بھی گنوا دیا اور پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے ساتھ بھی قدیم شرارتوں کا مظاہرہ کیا تو ہم بھی پاداش عمل کا قانون نافذ کر دیں گے وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا

غرض جب یہود نے اس مرتبہ بھی اپنی قومی سرشت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا تو خدائے تعالیٰ نے بھی ان کے حق میں یہ آخری فیصلہ سنا دیا وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

اور یہی ہوا بھی کہ قوم یہود کو نہ پھر کبھی عزت نصیب ہوئی اور نہ حکومت اور آج بھی وہ امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہونے کے باوجود قومی عزت و حکومت سے محروم ہیں اور قیامت تک محروم رہیں گے اور دنیا کی جو حکومت و طاقت بھی اپنے ناپاک مقاصد کی خاطر سطورۂ بالا فیصلہ کو چیلنج کر کے ان کو برسر حکومت و اقتدار لانا چاہے گی وہ کبھی اپنے اس مذموم مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی اور بہت ممکن ہے کہ خود بھی قہر الٰہی کا شکار ہو کر یہود ہی کی طرح ذلت و خسران میں مبتلا ہو جائے اور دوسروں کے لئے عبرت و

ا: توراۃ میں اس کا لقب فارقلیط (احمد) ہے۔
۲: یہ بحث اپنے موقع پر تفصیل سے آئے گی۔

بصیرت بنے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

بہر حال اہل ذوق ان حقائق کے بعد بآسانی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآن عزیز کی زیر بحث آیات کا مصداق جو کہ بیت المقدس کی تباہی اور یہود کی بربادی سے تعلق رکھتا ہے تاریخی اعتبار سے بخت نصر اور طیطیس رومی سے ہی متعلق ہے اور باقی اقوال بلحاظ تاریخ آیات کا صحیح مصداق نہیں بنتے فَاعْتَبِرُوْا يَاُولِي الْاَبْصَارِ۔

بصائر

۱) اگرچہ دنیا "دار العمل" ہے "دار الجزاء" نہیں ہے تاہم خدائے تعالیٰ کبھی کبھی دنیا میں بھی مجرمون کو ان کی پاداش عمل میں اس طرح سزا دیا کرتے ہیں کہ خود ان کو اور ان کے معاصرین کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ ان کے جرائم کی سزا ہے اور ان کی تاریخی زندگی بعد میں آنے والوں کیلئے سامان عبرت و بصیرت بن جاتی ہے خصوصاً غرور اور ظلم یہ دو ایسے سخت جرائم اور ام الخبائث ہیں کہ مغرور اور ظالم کو آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ضرور اپنی بد عملیوں کا کچھ نہ کچھ خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ انفرادی کبر و ظلم کی پاداش شخص و فرد کی زندگی سے متعلق ہوتی ہے اور قومی و اجتماعی کبر و ظلم کی پاداش قومی اور اجتماعی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے اس لئے اول الذکر کی مدت میں زیادہ عرصہ نہیں ہوتا مگر ثانی الذکر کی مدت کبھی ایسی طویل نظر آتی ہے کہ مظلوم قوم اور جماعت مایوسی کی حد تک پہونچ جاتی ہے اور اس کی نظر سے یہ نکتہ اوجھل ہو جاتا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت اور کامرانی و ناکامی کی عمر افراد و اشخاص کی عمر کی طرح نہیں ہوتی بلکہ طویل ہوتی ہے تاہم بعض حالات میں عبرت و بصیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کیلئے اس مدت کو کبھی مختصر بھی کر دیا جاتا ہے چنانچہ یہود کی زیر بحث تاریخ کے واقعات و حالات اس کی زندۂ جاوید شہادت ہیں اور قابل صد ہزار عبرت و بصیرت۔

۲) منکرین حق اور باطل پرست قوموں کو اگر عبرت و بصیرت کے پیش نظر دنیا میں کسی قسم کی سزا دی جاتی یا ان کو عذاب الٰہی میں پکڑا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان پر سے آخرت کا عذاب (عذاب جہنم) ٹل جاتا اور معاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ اسی طرح قائم رہتا ہے جو اپنے وقت پر ہو کر رہے گا:

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

۳) اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو اس کی بد کرداریوں اور اس کے مظالم و مفاسد کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرتا اور اپنے پاداش عمل کے قانون ان پر نازل کرنا چاہتا ہے تو سنت اللہ یہ جاری ہے کہ وہ بد اعمالیوں کے بعد فوراً ہی ایسا نہیں کرتا بلکہ ایک عرصہ تک اس کو مہلت دیتا اور ہادیوں اور پیغمبروں کی معرفت ان کو ترغیب و ترہیب کی راہ سے ہدایت پر لانے کے تمام مواقع بہم پہنچاتا ہے تاکہ خدا کی حجت ہر طرح تمام ہو جائے پس اگر اس کے بعد بھی ان کی سرکشی اور بغاوت اور ظلم و عدوان کا تسلسل اسی طرح قائم رہتا ہے تو اس کی بَطْشٌ شَدِيْدٌ اچانک مجرم قوم کو اس طرح دبوچ لیتی ہے کہ پھر کیفر کردار پر پہونچے بغیر رستگاری ناممکن ہو جاتی ہے اور ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مشاہدہ کی

صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔

فَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ○

عنقریب ظالم جان لیں گے کہ کس طریقۂ انقلاب کے ذریعہ وہ الٹ دیے جائیں گے۔

ذوالقرنین

۵۶۱ ق م س

تمہید

یہ واقعہ اپنی دلچسپ تاریخی روایت کے لحاظ سے تین اہم حصوں پر منقسم ہے، ذوالقرنین کی شخصیت؟ سد ذوالقرنین؟ یاجوج وماجوج؟ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ہر سہ (۳) مسائل کو جدا جدا بیان کر کے اس واقعہ کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے۔

زیر بحث مسائل اور علماء اسلام

سلف میں اگرچہ مسائل زیر بحث کے متعلق ایسے اقوال بہ کثرت ملتے ہیں جو ان مسائل کی تفسیر و تفصیل کی غرض سے بیان کیے گئے ہیں لیکن علماء متاخرین نے اس سلسلہ میں دو جدا جدا راہیں اختیار کر لی ہیں، ایک جماعت سلف کے بعض اقوال کو نقل کرنے کے بعد یہ کہہ دینے پر اکتفا کرتی ہے کہ زیر بحث مسائل سے متعلق منقول اقوال چونکہ قرآن کی بیان کردہ شخصیت ذوالقرنین کے ساتھ پوری طرح مطابقت نہیں کرتے اس لیے ہمارے لیے یہ کافی ہے کہ ایک جانب یہ یقین و اعتقاد رکھیں کہ قرآن عزیز نے جس حد تک ذوالقرنین کی شخصیت سد، اور یاجوج وماجوج پر روشنی ڈالی دی ہے وہ بلا شبہ حق ہے اور باقی تفصیلات یعنی اس کی شخصیت کا تاریخی مصداق سد کا جائے وقوع اور قوم یاجوج وماجوج کا تعین، سوان کے علم کو سپرد بخدا کر دینا

چاہیے کیونکہ ''تفویض''کا طریقہ ہے لیکن جب ایک تحقیق طلب طبیعت اس پر قانع نظر نہیں آتی اور وہ اضطراب وتردد میں پڑ جاتی ہے تو یہ جماعت اس کو مطمئن کرنے کے لیے اس طرح سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ جب کہ دنیوی اسباب علم اور وسائل معلومات کے اس حیرت زادور میں بھی محققین علم الآثار (ARCHAEALOGY) کو یہ اعتراف ہے کہ ابھی وہ اس دنیا کے مستور تاریخی خزانوں اور نظروں سے اوجھل تاریخی حقائق کے معلوم کرنے میں سمندر میں سے قطرہ کی مقدار حاصل کرپائے ہیں اور جب کہ ہم چند صدی قبل تک دنیا کے چوتھے براعظم امریکہ کی دریافت سے بھی قاصر رہے تھے تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر ابھی تک دنیا اور موجودہ علوم تحقیق سد ذوالقرنین کی شخصیت کا تعین نہ کرسکے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ پہلے دو امور دقت موعود تک یعنی قریب بہ قیامت منکشف ہو کر ہمارے سامنے آجائیں اور ان دونوں کے انکشاف سے ذوالقرنین کی شخصیت کا بھی باآسانی تاریخی تعین ہو جائے پھر کون سی وجہ ہے کہ اگر ہم ان امور کی تاریخی تفصیلات کو آج نہ بیان کرسکیں تو اس بناء پر ان امور کو محض افسانوی داستان سمجھ لیا جائے۔ خصوصاً جب کہ قرآن عزیز وحی الٰہی کے علم ویقین کے ذریعہ ان کے وجود کی اطلاع دیتا ہے اور جب کہ اہل علم کا یہ مسلمہ نظریہ ہے کہ ہمارا کسی شے کو نہ جاننا اس کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ شے حقیقتاً بھی وجود نہیں رکھتی پس ایک مسلمان کیلئے تو اسی قدر کافی ہے کہ نفس مسئلہ پر یقین کرتے ہوئے تفصیلات کو سپرد بخدا کر دے اور منکرین وحی الٰہی کیلئے زیادہ سے زیادہ توقف کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ کہ انکار پر اصرار کی۔

اس کے برعکس علماء اسلام میں سے دوسری جماعت ان مسائل کی تحقیق کے درپے ہے اور وہ قرآن عزیز کی عطا کردہ روشنی میں ان کے حقائق کی تفصیلات کو واضح کرنا نہایت ضروری جانتی اور قرآن حکیم کی اہم تفسیری خدمت یقین کرتی ہے اس کا خیال ہے کہ مسائل زیر بحث میں تفویض کے طریقہ کو اختیار کر کے ہم اپنی ذمہ داری سے کسی طرح سبک دوش نہیں ہو سکتے اور یہ اس لیے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے معاملہ کو یہود کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور اسی بناء پر وہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس سے سوال کرنے والی جماعت اس اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے کہ ''نبی امی'' نے وحی الٰہی کے ذریعہ ان ہر سہ مسائل کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں بلاشبہ وہ صحیح ہیں اور سورۂ بنی اسرائیل میں ''روح'' کے سوال پر قرآن کا جواب اس کے برعکس اسلوب پر مذکور ہے اور دریافت کرنے والوں کو صرف اس قدر بتا کر کہ ''روح'' خدا کے حکم وامر میں سے ایک ایسی شے ہے جو اس کے حکم سے جسم میں داخل ہو جاتی ہے مزید تفصیلات کو ان کی عقول کے لحاظ سے غیر ضروری قرار دے دیا ہے لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن عزیز ذوالقرنین سے متعلق تفصیلات کے درپے ہے اور یہود کو یا مشرکین اور یہود دونوں کو ان کی معلومات کے مطابق مطمئن کرنا چاہتا بلکہ اس سلسلہ میں ان کے یہاں بعض تفصیلات نے جو افسانوی شکل اختیار کر لی تھی اس کے خلاف حقائق واقعیہ کو کھول دینا چاہتا ہے۔

نیز اس لیے بھی یہ مسائل محتاج تحقیق ہیں کہ قرآن حکیم کے اسلوب بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہود اس تاریخی حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی قومی اور مذہبی زندگی کا اس کے ساتھ گہرا تعلق تھا تب ہی انھوں نے اس مسئلہ کو مشرکین کی اعانت کیلئے اسلئے انتخاب کیا کہ اس سے نبی اکرم ﷺ کی صداقت کا باآسانی امتحان ہو جائے گا، پس جو معاملہ آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے تک لوگوں کی معلومات میں تھا اور جس کی تفصیلات وہ

تو ہمیں بخوبی جانتی تھیں اس کے متعلق یہ کہہ کر سبکدوش اور قرآن کے بیان کردہ اس اہم واقعہ کی تفسیر سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا کہ جب کہ ہم خدا کی زمین کے بہت سے حصوں سے ابھی تک ناواقف ہیں تو ممکن ہے کہ اس واقعہ سے متعلق شخصیتیں اور مقامات بھی اسی طرح غیر معلوم ہوں اور ہم ابھی تک ان کا پتہ لگانے سے قاصر رہے ہوں۔

شیخ بدرالدین عینی، ابن ہشام اور سہیلی رحمہم اللہ ان مسائل کی تحقیق و تدقیق کے درپے نظر آتے اور اس بارہ میں اپنے رجحان کے مطابق فیصلہ دینا چاہتے ہیں۔

مسائل زیر بحث سے متعلق ہمارا خیال ان ہی علماء تحقیق کی پیروی پر آمادہ ہے بلکہ ہم ان مسائل کے متعلق اسلئے اور بھی زیادہ تحقیق و تدقیق کے خواہش مند ہیں کہ جن مستشرقین یورپ نے قرآن عزیز کے الہامی کتاب ہونے کے خلاف زہر چکانی کی ہے اور اپنے مزعومہ دلائل سے جہاں اس کو نبی اکرم ﷺ کا کلام ثابت کیا ہے وہیں یہ بھی ہرزہ سرائی کی ہے کہ قرآن کے بعض بیان کردہ واقعات حقائق نہیں ہیں بلکہ اہل عرب کے مشہور افسانوں کو حقیقت کے نام سے بیان کر دیا گیا ہے۔

اسلامی مسائل میں مستشرقین یورپ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اکثر تاریخی حقائق کو نظرانداز کر کے اپنے اندازے اور قیاس سے چند ایسے مقدمات وضع کر لیتے ہیں جن سے ان کو اپنے مزعومات اور خیالات میں مدد ملے اور اسلام بلکہ قرآن عزیز کے بیان کردہ حقائق کی تردید کی جا سکے چنانچہ اصحاب رقیم (پیڑا) کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور جسارت بیجا کے ساتھ یہ کہہ دیا کہ محمد ﷺ نے عرب کے سنے سنائے جھوٹے قصے کو وحی الٰہی کہہ کر بیان کر دیا ہے مگر جب قدرت کے ہاتھوں نے قرآن کے اعلان حق کے تیرہ سو سال کے بعد پیڑا کو ٹھیک اسی مقام پر ظاہر کر دیا اور اس کے عظیم الشان کھنڈر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگے تو ان کو حقیقت کے سامنے سر جھکانا پڑا اور ندامت و شرمساری کے ساتھ قرآن عزیز کے اعلان حق کو تسلیم کیے بغیر ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔

اسی طرح جب قرآن عزیز نے تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصہ تک مصر میں فراعنۂ مصر اور قبطیوں کے غلام رہے ہیں اور موسیٰ علیہ السلام نے صدیوں کے بعد ان کو خدا کے بخشے ہوئے اعجاز کے ذریعہ نجات دلائی اور اس مسئلہ میں توراۃ نے بھی ایک حد تک قرآن عزیز اور وحی الٰہی کے علم یقین کا ساتھ دیا تو اس کے باوجود ان مدعیان علم نے ایک عرصہ تک مصر میں بنی اسرائیل کی غلامی کا انکار کیا اور علم حقیقی کی تکذیب کے درپے رہ کر اس کا مذاق اڑایا مگر مصری خفریات نے جب فرعون کے مشہور سنگی کتبہ کا انکشاف کرایا اور کتبہ کی کندہ عبارت نے بنی اسرائیل کی غلامی کا پر ایک حد تک روشنی ڈالی تو آہستہ آہستہ جہل نے علم کے سامنے شکست قبول کر لی اور اب ان نظریات میں بھی تبدیل ہونے لگی جو فلسفہ تاریخ کے نام پر محض ظن و تخمین سے قائم کیے گئے تھے اور جن کو علم کا درجہ دیا جاتا تھا یہاں تک کہ اب انکار اقرار کی شکل میں تبدیل ہونے لگا ہے۔

ٹھیک اسی طرح ذوالقرنین یاجوج و ماجوج اور سد کا معاملہ ہے قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں ایک ایسے بادشاہ کا ذکر کیا ہے جس کا لقب ذوالقرنین ہے اور جس نے مشرق و مغرب تک فتوحات کیں اور دور تک فتوحات

میں ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کے بسنے والوں نے اس سے یہ شکایت کی کہ یاجوج و ماجوج ہم کو ستاتے اور وحشیانہ حملے کر کے فساد مچاتے اور بربادی لاتے ہیں آپ ہم کو ان سے نجات دلایئے ذوالقرنین نے یہ سن کر ان کو تسلی و تشفی دی اور لوہے اور تانبے کو پگھلا کر دو پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی سد قائم کر دی کہ شکایت کرنے والے یاجوج ماجوج کے فتنہ سے محفوظ ہو گئے۔

مستشرقین یورپ نے جب اس واقعہ کا مطالعہ کیا تو حسب عادت اپنے پیشرو مشرکین مکہ اور کفار عرب کی طرح فوراً یہ کہہ دیا:

إِنْ هٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○

یہ (قرآن) کچھ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی من گھڑت کہانیاں۔

اور بڑے زور و شور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ ذوالقرنین کا یہ قصہ اخبار قرآنی کے اعجاز اور عبرت و موعظت کیلئے حقیقی واقعہ نہیں ہے بلکہ عرب کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی کو وحی الٰہی کی حیثیت دیدی گئی ہے ورنہ تاریخی دنیا میں ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کی شخصیتیں اور سد ذوالقرنین کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

پس ایسی صورت ایک مسلمان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ذاتی اعتقاد کی بناء پر بلکہ تاریخی نقطۂ نگاہ کے مطابق یہ واضح کرے کہ دوسرے تاریخی مسائل کی طرح قرآن عزیز کا عطا کیا ہوا علم و یقین اس مسئلہ میں بھی اپنی جگہ اٹل اور علم و یقین کے درجہ کی حقیقت ہے اور معترضین کا انکار بلا شبہ جہل ظن و تخمین اور باطل مزعومات کا طومار ہے اور ان تاریخی حقائق کا انکار صرف بے جا تعصب پر مبنی ہے نہ کہ اظہار حقیقت کے پیش نظر۔

ذوالقرنین

ذوالقرنین کی شخصیت پر بحث کرنے سے قبل حل طلب اہم سوال یہ ہے کہ قرآن عزیز نے اس معاملہ کی جانب کس لیے توجہ کی اور اگر از خود نہیں بلکہ کسی سوال کے جواب پر توجہ مبذول کی تو مسائل کون ہیں اور کس بنیاد پر انھوں نے اس سوال کا انتخاب کیا؟ یہی وہ سوال ہے جو دراصل اس معاملہ کی کلید ہے اور اگرچہ بہ سلسلۂ شان نزول مفسرین اور ارباب سیر نے اس کی جانب توجہ فرمائی ہے مگر تحقیق شخصیت کے وقت ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ذوالقرنین کی شخصیت سد کا تعین اور یاجوج و ماجوج کی تحقیق اگرچہ تین مستقل مسائل ہیں تاہم یہ یوں اس طرح باہم مربوط ہیں کہ اگر کسی ایک کے متعلق واضح تحقیق سامنے آجائے تو قرآن عزیز کی تفصیلات کی روشنی میں باقی دو مسائل کے حل میں بہت زیادہ سہولت ہو جاتی ہے۔

ذوالقرنین سے متعلق سوال کی نوعیت

محمد بن اسحاق نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کیا ہے کہ قریش مکہ نے نصر بن حارث اور عقبہ بن معیط کو علماء یہود کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ چونکہ تم خود کو اہل کتاب کہتے ہو اور تمہارا دعویٰ ہے کہ تمہارے پاس زمانۂ سابق کے پیغمبروں کا وہ علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے لہٰذا محمد ﷺ کے متعلق ہم کو یہ بتائیں کہ ان کے دعویٰ پیغمبری کی صداقت کے متعلق آپ حضرات کی الہامی کتابوں میں کوئی تذکرہ یا علامات موجود ہیں یا

نہیں ؟ چنانچہ قریش کے وفد نے یثرب پہنچ کر علماء یہود سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ احبار یہود نے ان سے کہا تم اور باتوں کو چھوڑ دو ہم تم کو تین سوالات بتائے دیتے ہیں اگر وہ ان کا صحیح جواب دیدیں تو سمجھ لینا کہ وہ ضرور اپنے دعویٰ میں سچے ہیں اور نبی مرسل ہیں اور تم پر ان کی پیروی واجب ہے اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکیں تو وہ کاذب ہیں پھر تم کو اختیار ہے کہ جو معاملہ ان کے ساتھ چاہو کرو، وہ سوالات یہ ہیں:

۱) اس شخص کا حال بیان کیجیے جو مشرق و مغرب تک فتوحات کرتا چلا گیا؟

۲) ان چند نوجوانوں پر کیا گزرا جو کافر بادشاہ کے خوف سے پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپے تھے ؟

۳) روح کے متعلق بیان کیجئے؟

وفد مکہ واپس آیا اور اس نے قریش کو یہودی علماء کی گفتگو سنائی قریش نے سن کر کہا: اب ہمارے لیے محمد ﷺ کے بارہ میں فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ یہود کے ان ہی سوالات کے جوابات کیلئے ایک امی انسان جب ہی دے سکتا ہے کہ در حقیقت اس پر "خدا کی جانب سے وحی آتی ہو" چنانچہ قریش مکہ نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر تینوں سوالات پیش کر دیئے، ان ہی سوالات کے جوابات کیلئے آپ پر سورۂ کہف کا نزول ہوا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۷۲۔۱۷ و در منثور ج ۳)

محدثین نے اس روایت کے مختلف طریقوں کو بیان کر کے اس کی تحسین فرمائی ہے اور سدی کے طریق روایت میں اس قدر اور اضافہ ہے۔

قال قالت اليهود اخبرنا عن نبى لم يذكره الله فى التوراة الا فى مكان واحد قال "ومن" قالوا "ذو القرنين"۔ (قرطبی قلمی سورۂ کہف)

یہود نے کہا "ہم کو اس نبی کا حال بتایئے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں صرف ایک ہی جگہ کیا ہے نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا وہ "کون"؟ یہود نے کہا "ذوالقرنین"۔

یہود کے اس بلاواسطہ سوال کے متعلق محدثین یہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ راوی نے اختصار سے کام لیا ہے صحیح تفصیل یہ ہے کہ ان سوالات کا انتخاب یہود نے کیا تھا مگر قریش کی زبان سے ادا کرائے گئے اور ہو سکتا ہے کہ سوال میں لفظ توراۃ دیکھ کر نیچے کے کسی راوی نے اپنے وہم سے ان سوالات کو بلاواسطہ یہود کی جانب سے سمجھ لیا ہو۔

غرض اس روایت سے تین اہم باتوں پر روشنی پڑتی ہے (الف) یہ کہ ذوالقرنین سے متعلق سوال اگرچہ قریش کی زبان سے ادا ہوا لیکن اصل میں یہ یہود کی جانب سے تھا۔ (ب) یہ ایسے شخص سے متعلق سوال تھا جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ "ذوالقرنین" کہا گیا ہے (ج) اس شخص کو قرآن نے اپنی جانب سے ذوالقرنین کا لقب نہیں دیا بلکہ سوال کرنے والوں کے سوال کے پیش نظر اس کو دہرایا ہے، چنانچہ قرآن کا یہ اسلوب بیان بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ط

وہ تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین کا حال بتاؤ

ذوالقرنین اور سکندر مقدونی

ذوالقرنین کس شخصیت کا لقب ہے اس بحث سے قبل یہ معلوم رہنا از بس ضروری ہے کہ بعض حضرات کو یہ سخت مغالطہ ہوگیا ہے کہ سکندر مقدونی ہی وہ ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن سورۂ کہف میں کیا گیا ہے یہ قول باتفاق جمہور علماء سلف وخلف قطعاً باطل اور جہالت پر مبنی ہے اس لیے کہ قرآن کی تصریحات کے مطابق ذوالقرنین صاحب ایمان اور مرد صالح پادشاہ تھا اور سکندر مقدونی مشرک اور جابر بادشاہ گزرا ہے جس کے شرک وظلم کی صحیح تاریخ خود اس کے بعض امرائے دربار نے بھی مرتب کی ہے اور تمام معاصرانہ شہادتیں بھی اس کی بت پرست اور جابر وظالم ہونے پر متفق ہیں۔

امام بخاریؒ نے کتاب احادیث الانبیاء میں ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ سے قبل نقل کیا ہے اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:

وفی ایراده المصنف ترجمة ذی القرنین قبل ابراهیم اشارة الی توهین قول من زعم انه الاسکندر الیونانی۔ (فتح الباری ج ٦ ص ٢٩٤)

مصنف نے ذوالقرنین کے واقعہ کو حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ سے قبل اس لیے بیان کیا ہے کہ وہ اس شخص کے قول کی اہانت کرنا چاہتے ہیں جو سکندر یونانی کو ذوالقرنین کہتا ہے۔

اور پھر اپنی جانب سے تین وجوہ فرق بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ سکندر یونانی کسی طرح بھی قرآن میں مذکور ذوالقرنین نہیں ہوسکتا انھوں نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جن حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کہا ہے غالباً ان کو اس روایت سے مغالطہ ہوا ہے جو طبری نے اپنی تفسیر میں اور محمد بن ربیع جیزی نے کتاب الصحابہ میں نقل کی ہے اور جس میں اس کو رومی اور بانی اسکندریہ کہا گیا ہے مگر یہ روایت ضعیف اور ناقابل اعتماد ہے۔

(فتح الباری ج ٦ ص ٢٩٥)

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر ذوالقرنین کے نام کی تعیین سے متعلق اقوال نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

اور اسحٰق بن بشر نے بروایت سعید بن بشیر قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین کا نام سکندر تھا اور یہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا لیکن اسکندر بن فیلپس (مقدونی) کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے ہیں جو رومی اور بانی اسکندریہ ہے مگر واضح رہے کہ یہ دوسرا ذوالقرنین پہلے سے بہت زمانہ بعد پیدا ہوا ہے کیونکہ سکندر مقدونی حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال قبل ہوا ہے اور مشہور فلسفی ارسطاطالیس اس کا وزیر تھا اور یہی وہ بادشاہ جس نے دارا ابن دار کو قتل کیا اور فارس کے بادشاہ کو ذلیل کر کے ان کے ملک پر قبضہ کرلیا ہم نے یہ تنبیہ اسلئے کردی کہ بہت سے آدمی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی شخصیت ہیں اور یہ اعتقاد کر بیٹھے ہیں کہ قرآن میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ یہی سکندر مقدونی ہے جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی تھا اور اس اعتقاد کی بدولت بہت بڑی غلطی اور بہت زیادہ خرابی پیدا ہوجاتی ہے اسلئے کہ ذوالقرنین اول مسلمان اور عادل بادشاہ تھا اور اسکے وزیر خضر علیہ السلام تھے جن کے متعلق ہم ثابت کر آئے ہیں کہ وہ نبی تھے اور

دوسرا (مقدونی) مشرک تھااور اسکاوزیر فلسفی تھااور ان دونوں کے درمیان تقریباً دوہزار سال سے بھی زیادہ کا فصل ہے پس کہاں یہ (مقدونی) اور کہاں وہ (عربی سامی) اور ان دونوں کے درمیان اس درجہ امتیازات ہیں کہ ماسوا غبی اور حقائق سے ناآشنا شخص کے دوسرا کوئی شخص ان دونوں کو ایک کہنے کی جرت نہیں کرسکتا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲ ے)

اور امام رازی نے اگرچہ سکندر مقدونی کوذوالقرنین کالقب دیاہے باایں ہمہ ان کو بھی یہ اقرار ہے

كان ذو القرنين نبياً و كان الاسكندر كافراً و كان معلمه ارسطاطا ليس و كان يا تمر بامره وهو من الكفار بلاشك۔ (قرطبی علمی سورہ یوسف)

ذوالقرنین نبی تھے اور سکندر مقدونی کافر تھااور اس کا معلم اورو زیر بلاشبہ کافر تھا۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس مغالطہ کی وجہ یہ نقل کی ہے کہ چونکہ قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین مقتدا ہے اور وہ وسیع حکومت کامالک رہاہے اور سکندر یونانی بھی وسیع حکومت کا حکمراں رہاہے اس لیے اس کو بھی ذوالقرنین کہنے لگے یااس لیے کہ وہ دوپادشاہتوں روم اور فارس کاپادشاہ ہوگیاتھااور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے محمد بن اسحٰق نے اپنی سیرت میں ذوالقرنین کانام سکندر نقل کردیاہے اور چونکہ اس کی سیرت بہت مشہور مقبول ہے اس لیے یہ نام بھی شہرت پاگیااور حافظ عمادالدین کاخیال یہ ہے کہ چونکہ اسحٰق بن بشر کی روایت میں قرآن میں مذکور ذوالقرنین کانام بھی سکندر بتایاگیاہے اس لیے غلطی اور نادانی سے لوگوں نے یہ سمجھ لیاکہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔

غرض حافظ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہ ،ابن عبدالبر ،زہیر بن بکار ،ابن حجر ابن کثیر عینی (رحمہم اللہ) جیسے محققین نے اس مغالطہ کی پوری طرح تردید کردی اور حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کے جو محاسن و مناقب بیان کیے ہیں ان کے پیش نظر ایک بت پرست اور جابر و ظالم شخص کاانکا مصداق بنانا فاش غلطی ہے۔[1]

۱: استدراک

کیاذوالقرنین سکندر مقدونی ہے؟

جولائی ۱۹۴۱ء کے برہان میں میرا ایک مضمون "ذوالقرنین اور سد سکندری" کے عنوان سے سے شائع ہوا تھا یہ مسلسل مضمون کی پہلی قسط تھی اور اگست کے برھان میں ابھی تک وہ سلسلہ ناتمام ہی تھا کہ محترم مدیر صاحب صدق نے پہلی قسط پر ایک "استدراک" لکھ کر برہان کی عزت افزائی فرمائی اور مجھ کواس سلسلہ میں مزید لکھنے کاموقعہ مرحمت فرمایاجس کیلئے میں صاحب موصوف کاممنون ہوں۔

یہ "استدراک" برہان کی اشاعت سے قبل ہی ۴؍اگست کے 'صدق' میں قدرے اضافہ کے ساتھ طبع ہوگیا، اور اب ۸؍اگست کے 'صدق' میں بھی "سد سکندری" کے عنوان سے اسی کاایک تکملہ یاذیل شائع ہواہے:-

بہر حال اگست کے برہان میں جو "استدراک" شائع ہواہے چونکہ وہی اصل ہے اور صاحب استدراک کے دلائل کاحامل ہے اس لیے "تنقید براستدراک" کی بنیاد بھی اسی پر قائم کی گئی ہے صدق کے ہر دو مضامین کے اضافات کو ضمنی طور پر پیش نظر رکھا گیاہے۔ (محمد حفظ الرحمن)

ذوالقرنین کی تحقیق سے متعلق میرا مضمون تحلیل و تجزیہ کے بعد دو حصوں پر تقسیم ہو سکتاہے ایک مسئلہ کا "اثباتی پہلو" اور دوسرا "منفی پہلو" "اثباتی پہلو میں مضبوط دلائل کے ساتھ یہ واضح کیاگیاہے کہ سائرس (کیخسرو یاخورس) ہی وہ شخصیت

(جاری ہے)

ذوالقرنین اور اذواءِ یمن

ایک جویائے حق کو یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ وسعت حکومت اور زبردست سطوت وصولت کے لحاظ سے جس طرح بعض حضرات نے سکندر مقدونی کو ذوالقرنین کا لقب دیدیا ہے۔

اسی طرح یمن کے بعض تبابعہ کو بھی اہل عرب وسعت حکومت کی بنیاد پر ذوالقرنین کہتے آئے ہیں مثلاً ابو کرب تبع نے اپنے دادا کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

(گذشتہ سے پیوستہ) ہے جس کو قرآن عزیز نے "ذوالقرنین" کہہ کر یاد کیا ہے اور منفی پہلو میں ان اقوال کو مرجوح قرار دے کر جو سائرس کے علاوہ ذوالقرنین کا مصداق متعین کرتے ہیں اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ مسئلہ چونکہ قرآن عزیز میں منصوص اور مصرح مذکور نہیں ہے اس لیے دوسرے ہستیوں کے متعلق بھی مجال گفتن باقی رہتی ہے لیکن ذوالقرنین سے متعلق قرآنی صفات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ امر قطعی ہے کہ سکندر مقدونی کسی حالت میں بھی قرآن کا ذوالقرنین نہیں کہلایا جا سکتا اور بعض علمائے حق نے اگر اس کو ذوالقرنین بتایا ہے، وسلف صالحین اور خلف صادقین کی اکثریت نے ان کے اس قول کی سختی سے تردید کی ہے نا قابل انکار دلائل کے ساتھ تردید کی ہے۔

علمائے اسلام نے جن دلائل کی روشنی میں اس انکار پر اصرار کیا ہے اس کو تفصیل کے ساتھ زیر بحث مضمون میں نقل کیا گیا ہے لیکن محترم صاحب استدراک نے ان میں سے صرف تین باتوں کو منتخب فرما کر ان پر استدراک سپرد قلم فرمایا ہے، اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ترتیب وار تنقیدی نظر ڈالی جائے تاکہ مسئلہ زیر بحث بخوبی منقح ہو سکے۔ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں:-

مقالہ مذکورہ مندرجہ برہان بابت جولائی ۱۹۴۱ء میں ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار دلائل ذیل کی بناء پر کیا گیا:

سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا۔

: سکندر باتفاق اصحاب تاریخ جابر و قاہر تھا نہ کہ نیک سیرت و نیک نفس۔

۳: یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ اس کی فتوحات اور سیاحت کا سلسلہ مغرب کی جانب نہیں بڑھا۔ (رسالہ مذکورہ)

"عرض کرنے دیجیے کہ یہ تینوں دعوے مسلمات نہیں، بجائے خود مخدوش و مجروح ہیں"۔

اس کے بعد صاحب موصوف نے ان تینوں یا دعاوی کو مخدوش اور مجروح ثابت کرنے کے لیے بالترتیب دلائل پیش فرمائے ہیں چنانچہ مضمون نگار کی پہلی دلیل کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

: نزول قرآن سے قبل والا ذوالقرنین ظاہر ہے کہ اصطلاحی معنی میں مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے مومن ہونے سے مراد صرف یہی ہو سکتی ہے کہ موحد (مسلم) اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا۔ (برہان بابت اگست)

مسلم؟

مجھے یہ عرض کرنے دیجیے کہ صاحب استدراک کا سکندر کے مسلمان ہونے کی بحث میں یہ فرمانا کہ اصطلاحی معنی میں تو وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتا تھا کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر مراد یہ ہے اصطلاحی معنی میں صرف وہی شخص مسلمان کہلایا جا سکتا ہے جو نبی اکرم ﷺ کی امت میں سے ہو اور دوسرے کسی نبی کی امت کو مسلم نہیں کہہ سکتے تو ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح قرآن کی اصطلاح نہیں ہے کیونکہ وہ صاف اعلان کرتا ہے کہ آدم سے لیکر محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانہ تک خدا کے ہر نبی و رسول کا دین اسلام اور اس کی امت اجابت امت مسلمہ ہے اور اس کا سچا مطیع مسلمان ہے۔

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (بقرہ پ ۱ ع ۱۶)

(جاری ہے)

قد كان ذو القرنين جدى مسلماً
ملكاً تدين له الملوك وتسجد

''میرا دادا ذوالقرنین مسلمان تھا اور ایسا پر شوکت بادشاہ تھا کہ بہت سے بادشاہ اس کے تابع فرمان اور اس کے سامنے پست تھے۔''

اور عرب کے مشہور شعراء امراءالقیس، اوس بن حجر اور طرفہ بن عبدہ وغیرہ کے کلام میں بھی حمیری

(گذشتہ سے پیوستہ)

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آ پہنچا اس نے اپنی اولاد سے کہا میرے بعد تم کس کی پرستش کرو گے انہوں نے جواب دیا ہم تیرے اور تیرے باپ ابراہیمؑ اسمعیلؑ اور اسحٰقؑ کے ایک خدا کی پرستش کریں گے اور ہم تو اس کے فرمانبردار ہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ اس کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

والاسلام هو ملة الانبياء قاطبة وان تنوعت شرائعهم واختلفت مناهجهم (تفسیر ج ۱ ص ۳۲۴)

اور اسلام یہی تمام انبیاء علیہم السلام کی ملت ہے بلا تخصیص اگرچہ ان کی شریعتیں اور ان کے طریقے مختلف ہیں۔

اور اگر صاحب استدراک کی مراد اصطلاحی معنی سے یہ ہے کہ سکندر اگرچہ موحد اور مسلم تو تھا مگر چونکہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ سے بہت پہلے تھا اس لیے عرف عام میں مسلمان نہیں ہو سکتا تھا تو گستاخی معاف پھر اس کے لیے اصطلاحی معنی کی تعبیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس ارشاد کی یہاں کوئی ضرورت تھی جب کہ متکلم اور مخاطب دونوں پر یہ عیاں ہے کہ یہ اس سکندر کا ذکر ہے جو تقریباً تین سو سال قبل مسیح تھا۔

آگے چل کر صاحب استدراک ارشاد فرماتے ہیں:

سو روایات یہود میں سکندر کو اسی حیثیت سے (یعنی موحد اور اپنے زمانہ کے نبی کا مطیع تھا) پیش کیا گیا ہے چنانچہ جوزیفس (یہ حواریان مسیح کا ہم عصر ہے) کی قدیم تاریخ یہود میں بہ صراحت موجود ہے کہ سکندر نے ہیکل یروشلم میں آ کر وہاں عبادت کی وہاں کے پیشواؤں کی تعظیم و تکریم کی اور جب دانیال کی یہ پیشین گوئی اسے دکھائی گئی کہ ایک رومی فاتح ایران کی شہنشاہیت کو برباد کر دے گا وہ اس پیشین گوئی کا مصداق اپنے ہی کو سمجھا۔ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں تصریح لکھی چلی آتی ہے کہ اس وقت کے یہود اسے مسیح موعود ماننے کو تیار تھے (ج ۸ ص ۵۰۷) ظاہر ہے کہ یہ معاملہ کسی مشرک کے ساتھ روا نہیں رکھا جا سکتا اور نہ کوئی مشرک فرمانروا خود یہ معاملہ مرکز توحید کے ساتھ روا رکھتا۔ (برہان، ماہ اگست)

''موحد'' اور ''مسلم'' کی غلط تشریح کے علاوہ صاحب استدراک نے سکندر کو اس کا مصداق ثابت کرنے میں جو سند اور دلیل پیش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ''صاحب استدراک'' کے اس ارشاد میں ایک دعویٰ ہے اور دوسری اس کی دلیل، ''دعویٰ'' یہ ہے کہ ''روایت یہود'' میں سکندر کو موحد اور اسرائیلی نبی کے مطیع کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور دلیل یہ ہے کہ قدیم تاریخ یہود کے مصنف جوزیفس (جو کہ حواریان مسیح کا ہم عصر ہے) نے سکندر کے متعلق وہ سب کچھ لکھا ہے جو صاحب استدراک کی عبارت سے ابھی نقل ہو چکا اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ سکندر کے مسلمان (موحد) ہونے کا زبردست شاہد جوزیفس ہے۔ مگر جوزیفس کا یہ حال ہے کہ وہ خود یہود کے نزدیک قابل تسلیم نہیں۔

زیفس!؟

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے جوزیفس ''یہود کے نزدیک'' غیر معتبر اور ناقابل احتجاج وناقابل اعتماد ہے اور اس کی کتاب ''قدیم تاریخ یہود'' ان میں غیر مقبول ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جوزیفس میں دو خرابیاں ہیں جو کسی طرح یہود کی روایات کی صحت باقی نہیں رہنے دیتیں۔ ایک یہ کہ وہ ''مورخ'' نہیں ہے، بلکہ داستان سرا اور قصہ گو ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس

(جاری ہے)

بادشاہوں کو ذوالقرنین کہا گیا ہے۔ (فتح الباری ج ۶)

اسی طرح ایرانی بادشاہوں میں سے اہل عرب کیقباد اور فریدوں کو بھی ان کی قاہرانہ فتوحات کی وجہ سے ذوالقرنین کہتے تھے۔ (تاریخ ابن اثیر ج ۲)

مگر یہ سب مسطورہ بالا وجہ کی بنیاد پر ہی ذوالقرنین کہلاتے رہے ہیں اور قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین ان میں سے کوئی نہیں ہے چنانچہ حضرت استاذ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہؒ نے اس حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا

(گذشتہ سے پیوستہ)

درجہ جھوٹا ہے کہ واقعات کو طبع زاد گھڑ کر بیان کر دینے اور اصل واقعہ میں اپنی جانب سے من گھڑت اضافے کرنے کا عادی ہے۔ دوسرا عیب یہ ہے کہ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ یہودیوں، یونانیوں اور رومیوں کے درمیان جو نفرت قائم تھی اس کو کسی طرح مٹائے اور دونوں قوموں کے درمیان رابطہ، اتحاد پیدا کرے اسلئے وہ یونانی و رومی روایات میں خصوصیت کے ساتھ ایسی داستانیں اختراع اور ایجاد کرتا رہتا اور ان کو تاریخی حیثیت میں پیش کیا کرتا تھا۔ جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مسطورہ بالا مقصد کو پورا کرے۔ اسلئے یونانیوں سے متعلق جس قدر روایات وہ بیان کرتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ وہ قطعاً قابل اعتماد ہیں اور کسی طرح لائق احتجاج نہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتکس میں ہے:

یہ بات یقینی ہے کہ جوزیفس نہ تو اعلیٰ درجہ کا مؤرخ ہے اور نہ ایک ایمان دار اور بے تعصب محقق جسے صرف حقیقت کی تلاش ہو، بلکہ وہ ایسا مصنف ہے جس کی غرض و غایت صرف ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہے۔ (ج ۷ ص ۵۷۷)

جوزیفس کا مقصد اور منتہائے نظر کیا ہے؟ آگے چل کر اسی کتاب میں اس کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

"اس کی منتہائے تمنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جو تعصب پھیلا ہوا ہے۔ اسے دور کرے اور ان پر جو الزامات عاید کیئے جاتے ہیں ان سے ان کو بری ثابت کرے اور یہودیوں اور یونانیوں کے درمیان پیدا شدہ دشمنی کو مٹادے"۔ (ج ۷، ص ۵۷۷)

جوزیفس کا یہ مقصد برا نہیں تھا اگر تاریخی حقائق پر مبنی ہوتا اور صحیح واقعات کی روشنی میں اس کو کامیاب بناتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس یہ کیا:

اس کا یہ حمایتی مقصد اس مار سے بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے ماخذوں کا انتخاب کرتا ہے اور ایسے ٹکڑوں کا حوالہ دیتا ہے، جن میں یہودیوں کے ساتھ قدیم بادشاہوں اور رومیوں کے الطاف و اکرام کا تذکرہ ہے وہ صداقت کو اپنے میلان اور رجحان کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھاتا ہے اگرچہ وہ اس بات کا مدعی ہے کہ حقیقت اور مکمل حقیقت کے سوا کچھ نہیں لکھے گا لیکن وہ ایفاء عہد نہ کر سکا۔ اسلئے کہ (وہ اپنی طرف سے اضافہ کر دیتا ہے اور جگہ جگہ نہایت بے پرواہی اور بے ضابطگی کے ساتھ ماخذوں کے حوالے دیتا ہے۔ (ج ۷، ص ۵۷۷)

جوزیفس کی تاریخی بددیانتی کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ مقصد کی تکمیل کیلئے اپنی مقدس کا بائبل کے واقعات کو بھی توڑ مروڑ کیئے بغیر نہیں چھوڑتا:

اور یہی وجہ ہے کہ بائبل کے واقعات بھی کبھی کبھی اس کے قلم سے بالکل نئے معنی اور نئے پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔

(انسائیکلو پیڈیا ریلیجین، ج ۷ ص ۵۷۷)

یروشلم اور سکندر

اور یہ واضح رہے کہ "جیوش انسائیکلو پیڈیا" کا مضمون بھی اسی کی تاریخ سے ماخوذ ہے۔ جوزیفس کے متعلق یہ حوالجات تو اس کی عام مورخانہ حیثیت اور اس کی تاریخی کتابوں کی قدر و قیمت سے متعلق تھے۔ اب ریلیجین انسائیکلو پیڈیا کی زبانی ان واقعات خصوصی کی حقیقت کو بھی سن لیجئے جن کو صاحب استدراک نے سکندر کے موحد اور (مسلمان) ہونے کی دلیل میں

(جاری ہے)

ہے فرماتے ہیں: ذوالقرنین کے معاملہ میں ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اہل مشرق میں سے تھا جیسا کہ بعض کا خیال جغفور چین کی جانب ہے اس لیے کہ اگر وہ مشرقی ہوتا تو قرآن عزیز اس کے سفر مغرب کے بعد یہ کہتا کہ وہ پھر مشرق کو لوٹ گیا یعنی اپنے وطن کی جانب واپس ہو گیا یہ کہتا اذا بلغ مطلع الشمس اور نہ وہ اہل مغرب میں سے تھا مشرق و مغرب کے درمیانی علاقہ کا باشندہ تھا۔

والراجح انه ليس من اذواء اليمن ولا كيقبا دبن ملوك العجم ولا هو اسكندر بن

(گذشتہ سے پیوستہ)

یہ ذکر فرمایا ہے۔ یعنی اس کا یروشلم جانا، جا کر عبادت کرنا اور یہودی پیشواؤں کی تعظیم کرنا وغیرہ۔

ایسز (ESTHAR) کی کتاب اور عہد ارتاسر زز (ARTAZERXES) کے تذکرہ کے بعد جوزیفس جب قصص تورات کے آخری حصہ پر پہنچتا ہے تو اسی جگہ سے اس کی کتاب انٹی کوئیٹس جوڈائیو (ANTIGAITETAS SUDACIO) کے دوسرے باب کا آغاز ہوتا ہے اس باب کے شروع ہی میں روایات کا تسلسل جاتا رہتا اور ان میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جو "مکابیسن بغاوت" (MAGEABSN REVOLT) کے دور تک برابر قائم رہتا ہے اور تین صدی تک چلا جاتا ہے اور اسی کے اندر سکندر مقدونی، ٹولمی اور سلیولیسائڈ (SELEUEIDAT) وغیرہ کے عہد حکومت بھی آ جاتے ہیں۔ ان دور ہائے حکومت کے متعلق جوزیفس صرف بے ربط قصے بیان کرتا ہے جو سکندر کے آخری دور کے مآخذ سے لیئے گئے ہیں۔ اس غیر مسلسل اور بے ربط سلسلہ کی سب سے پہلی چیز اسکندریہ کا یروشلم جانا ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام واقعات بھی ہیں، جو اس کے وہاں جانے سے پہلے اور جانے کے بعد سے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ واقعہ جوزیفس نے ایک ایسے ماخذ سے لیا ہے۔ جو غیر معتبر اور غیر موثق ہے اور دانیال نبی کی کتاب کے بعد کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس ج ۷ ص ۴۷۵)

یہ حقیقت ہے اس حوالہ جو جیوش انسائیکلوپیڈیا سے نقل کر کے صاحب استدراک نیا سیس اہم تاریخی مسئلہ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہاں یہ من گھڑت اور بے دلیل قصہ جس کا ماخذ تک غیر معتبر اور غیر مستند ہے اور کہاں سائرس کے یروشلم بنانے اور خدا کے مسیح ہونے کے وہ ناقابل تردید تاریخی واقعات جو کتاب مقدس اور صحیح تاریخی حوالوں سے ثابت ہیں۔

بہر حال جوزیفس، اس کی کتب تاریخ اور اس کے تاریخی ماخذوں کے متعلق مسطورہ بالا محققانہ حوالجات کے بعد آپ خود کتاب مقدس کی طرف رجوع کیجیے اور معلوم کیجئے کہ داستان سرا اور قصہ گو جوزیفس کی یروشلم والی داستان اور یہود کا سکندر کو مسیح موعود مان لینے کا قصہ یہ دونوں کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

خدا کا مسیح

ابھی بابل کے بادشاہ بخت نصر (بنوکدرزار) نے بیت المقدس پر چڑھائی نہیں کی تھی کہ حضرت یسعیاہ نبی نے وحی الٰہی سے خبر پا کر یہود کو مطلع کیا کہ وقت آنے والا ہے کہ بابل کی حکومت کے ہاتھوں یروشلم کا ہیکل برباد ہو گا اور اس کی توہین کی جائے گی اور اس کے بعد یہ بشارت سنائی کہ وہ پھر خورس (سائرس) کے ہاتھوں بنایا جائے گا اور اس کی عزت و حرمت برقرار کی جائے گی اور یہود بابل کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے چنانچہ پیشین گوئی کے الفاظ یہ ہیں:

خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم بناڈالا یوں فرماتا ہے..... یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائے گی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھاڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

(یسعیاہ باب ۴۴ آیت ۲۳۔۲۸)

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلواڈالوں.... اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تا کہ تو جانے کہ میں

(جاری ہے)

فیلفوس بل ملك اخر من الصالحين ينتهى نسبه الى العرب الساميين الاولين ذكره صاحب الناسخ۔[1]

اور راجح یہ ہے کہ ذوالقرنین (مذکور فی القرآن) یہ یمن کے بادشاہوں میں سے تھا اور نہ شاہان عجم میں سے کیقباد ذوالقرنین تھا بلکہ وہ ان سب سے جدا ایک نیک بادشاہوں میں سے تھا جن کا نسب قدیم سامی عرب تک پہنچتا ہے نسخ التواریخ نے ایسا ہی کہا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱: عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۵۔

آیت من آیات اللہ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ (نور اللہ مرقدہ) نے ذوالقرنین کے مسئلہ کو ضمنی طور پر بیان فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر ان کا مطمح نظر ذوالقرنین کی شخصیت کی تحقیق نہیں ہے بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ان ہفوات کی تردید مقصود ہے جو یاجوج و ماجوج، سد، دجال کے خروج اور مسیح اور بن مریم (علیہما السلام) کے نزول سے متعلق ہیں اور جن پر قادیانی نے اپنی نبوت اور یسوع مسیح ہونے کے دعوے کی بنیاد قائم کی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ یورپ کی موجودہ متمدن اقوام ہی وہ یاجوج و ماجوج ہیں جن کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور یہ کہ دجال ان کے پادری ہیں اور میں ہی وہ یسوع مسیح ہوں، احادیث میں جس کے نزول کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ قریب قیامت میں آکر ان سب کا استیصال کرے گا۔

حالانکہ قادیانی مشن کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے اقوام یورپ کے الحاد و زندقہ، فساد فی الارض، اور دجل و مکر کی زبردست وبا کو روکنے یا ختم کر دینے کی بجائے ممالک اسلامیہ کو یورپ کی بعض حکومتوں کے استعمال عزائم کے حوالہ کرنے اور غلام بنانے، جہاد جیسے فریضۂ اسلامی کی منسوخی کا اعلان کر کے اپنے مزعومہ یاجوج و ماجوج کو خوش کرنے اور اپنے منکرین پر کفر کا عام فتویٰ دے کر کروڑوں پرستاران توحید کو کافر اور خارج از اسلام قرار دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا اور نام نہاد تبلیغ اسلام کے پردہ میں بھی اپنے مشن کی کامیابی کے علاوہ اور اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

خداوند اسرائیل کا خدا ہوں جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے۔ (باب ۴۴ آیت ۳۱)

حضرت یسعیاہ نبی کی یہ پیشین گوئی خورس (سائرس) کے فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے یہود کو سنائی گئی اور فتح بابل کے صرف ساٹھ برس پہلے اسی کی تائید میں حضرت یرمیاہ نبی نے یہود کو یہ پیشین گوئی سنائی تھی:

"وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو۔ منادی کرو مت چھپاؤ۔ لکھو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا مردوک سراسیمہ کیا گیا ہے اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں کیوں کہ اتر سے قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی...... الخ (یرمیاہ باب ۵ آیت ا-۳)

اور عزرا نبی کی کتاب میں بصراحت موجود ہے کہ خورس (سائرس) نے یروشلم کی ہیکل کو تعمیر کیا اور اس نے اس کی تعمیر اور عزت و حرمت کا اپنی قوم میں اعلان کرایا اور اس طرح یرمیاہ نبی کی بشارت نبی کی بشارت پوری ہوئی:۔

اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہوا۔ خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا۔ شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں۔ پس اس کی ساری قوم میں سے کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہوا اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے۔ جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو

(جاری ہے)

اور سید محمد آلوسی نے بھی اذواء یمن میں سے کسی کو ذوالقرنین تسلیم نہیں کیا اور اس قول کو غلط قرار دیا ہے۔

ان تفصیلات کے بعد اب بسہولت یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے متعلق یہ سب اقوال نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں اور صرف دو قول ہی قابل توجہ ہیں جن میں سے ایک قول سلف کی جانب منسوب ہے اور دوسرا متاخرین میں سے ایک معاصر محقق کی تحقیق ہے۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

یروشلم میں ہے۔............ الخ (عزرا باب آیت ا۔۳)

یسعیاہ نبی اور یرمیاہ نبی کی پیشین گوئیوں سے اور عزرا نبی کی کتاب میں اس بیان کردہ منادی سے جو خورس (سائرس) کی جانب سے کی گئی ہیں تین باتیں صاف اور صریح طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔

۱) توراۃ کی پیش گوئیاں خورس کو خدا کا چرواہا اور خدا کا مسیح بتا رہی ہیں نہ کہ سکندر کو۔

۲) یروشلم (بیت المقدس) کے ہیکل کی تعمیر، اس کی عزت و حرمت کا اعلان، اس کے خدا کے گھر ہونے کا اقرار اور یہود کی آزادی، خورس (سائرس) کے ہاتھوں ہوئی نہ سکندر کے۔

۳) یرمیاہ نبی کی پیشین گوئی میں اگرچہ نام نہیں ہے لیکن یہ تصریح ہے کہ بابل کا تباہ کرنے والا اور یرشلم کو آباد کرنے والا اتر شمال) سے اٹھے گا۔ سو یہ فارس و میڈیا کا بادشاہ خورس ہی ہو سکتا ہے نہ کہ سکندر جو یونان سے (بابل کی جانب مغرب سے) اٹھا اور عزرا نبی کی تصدیق بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

۴) یہ تمام پیشین گوئیاں متفق ہیں کہ خورس کی فتوحات جابرانہ و قاہرانہ انداز کی نہیں تھیں بلکہ ایک صالح اور باخدا انسان کی حیثیت سے تھیں اور کتاب مقدس کے ان صاف اور صریح بیانات کے علاوہ وہ تاریخی حقائق بھی ان نتائج کی زبردست تائید کرتے ہیں چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں سائرس کے متعلق یہ تصریحات موجود ہیں۔

بابل پر جب سائرس حملہ آور ہوا تو وہاں کے یہودیوں نے ایرانیوں کو نجات دہندگان اور موحدین کہہ کر پکارا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہود کی مدد کے صلہ میں سائرس نے یہودیوں کو یروشلم اور ان کا معبد (ہیکل واپس کر دیا اور انھیں فلسطین لوٹنے کی اجازت دیدی۔ (ج ۶ ص ۵۲ے ۷ ایڈیشن)

اب کتاب مقدس اور اس کے ان روشن تاریخی حوالوں پر نظر کیجیے اور پھر جوزیفس کی اس بددیانتی کی داد دیجیے کہ اس نے یروشلم کی تعمیر علماء یہود کی تعظیم و تکریم اور خدا کے مسیح کے ہاتھوں یہود کی بابل سے نجات کے تمام ان معاملات کو جو کتاب مقدس نے خورس (سائرس) کے لیے مخصوص کیے تھے کس جرأت کے ساتھ سکندر مقدونی پر اس غرض سے چسپاں کر دیے کہ کسی طرح اس کا یہ مقصد یہودیوں اور یونانیوں اور رومیوں کے درمیان منافرت کی خلیج کو پاٹ دیا جائے پورا ہو جائے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور یہودیوں نے ان تحریفات کی بناء پر (جیسا کہ ابھی حوالہ گزر چکا ہے) اس کو خائن اور غدار کہہ کر اس کی تاریخی کتابوں کو بھی غیر مقبول قرار دیدیا اور اگر ہم بالفرض سکندر کے معاملہ زیر بحث میں جوزیفس کی روایت کو صحیح مان لیں تو اس کی حقیقت زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتی ہے (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے) کہ سکندر کی یہ عادت تھی کہ جس ملک کو فتح کرتا وہاں کی پبلک کو اپنا بنانے کے لیے ملکی رسم و رواج کے مطابق عبادت کر کے یہ ثابت کرتا کہ مجھ کو بھی ان عقائد و عبادات سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ اس ملک کے رہنے والوں کو پھر کیا عجب ہے کہ یہودیوں کو متاثر کرنے کی خاطر اس نے یروشلم میں بھی ڈھونگ رچایا ہو یا سائرس کی نقل اتار کر یہودیوں میں ذوالقرنین بننے کی کوشش کی ہو اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

چنانچہ بستانی کی انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ سکندر جب مصر پہنچا تو لیبیا کے کاہنوں اور باشندوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے معبود (مشتری) کی پرستش کی (ملاحظہ ہو ج ۳ ص ۵۴۹)

(جاری ہے)

علماء سلف کی رائے

علماء سلف کی رائے یہ ہے کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین عربی الاصل تھا، سامیہ اولی میں سے تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر بادشاہ تھا اور حج کے سفر میں دونوں کا ساتھ رہا ہے اور ایک معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی عدالت میں مرافعہ کیا تھا اور اس نے ان کے حق میں فیصلہ دیا اور خضر علیہ السلام اس کے وزیر باتدبیر تھے لیکن علماء سلف کی اس تحقیق میں کئی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں جو اس تحقیق کو ایک متردد اور

(گذشتہ سے پیوستہ)

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:

بابل میں سکندر نے وہاں کے مقامی دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائی جیسا کہ اس نے دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح کیا تھا (یعنی مقامی دیوتاؤں کی پرستش کی تھی) اور یہ تمام ملکوں کے مذاہب کی آمیزش آگے چل کر یونانی الحاد و بے دینی پر بڑی حد تک اثر اندازی ہوئی۔ (ج ۵ ص ۱۴۱ ایڈیشن ۹)

ہاں یہ صحیح ہے کہ کتاب مقدس کی مسطورۂ بالا پیشین گوئیوں کی صحت پر بعض عیسائی مؤرخوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ پیشین گوئیاں جن میں خورس کا نام تک مذکور ہے واقعات کے وجود پذیر ہونے کے بعد بنائی گئی ہوں لیکن اول تو اپنے اس دعویٰ یا شبہ پر انھوں نے قیاس و تخمین کے سوائے کوئی دلیل نہیں دی دوسرے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بابل کی غلامی کے دور اور بخت نصر کے توراۃ جلا ڈالنے کے واقعہ ہائلہ کے بعد کے اس قسم کے تمام ذخیرے کے متعلق علماء یہود و نصاریٰ کا اس پر کلی اتفاق ہے کہ یہ اضافات و تحریفات سے محفوظ ہیں اور ان میں ردوبدل کے لیے کوئی سبب وجود پذیر نہیں ہوا یعنی توراۃ کے قدیم حصہ اس پر کوئی حادثہ نہیں گزرا اگر علماء یہود نصاریٰ کے اس جواب کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ان پیشین گوئیوں میں خورس کے نام کی تصریح بعد کو داخل کر دی گئی یا ان پیشین گوئیوں کو واقعات بنالیا گیا تب بھی ہمارا مطلب حاصل ہے اس لیے کہ ان پیشین گوئیوں سے یہ بات تو بغیر کسی خدشہ کے ثابت ہو گئی کہ یہودیوں میں خورس کے یروشلم تعمیر کرنے یہود کو آزاد کرانے اور مذہب یہود کی عظمت کرنے اور یہود کا اس کو خدا کا مسیح سمجھنے کی روایات کو اس درجہ تواتر حاصل تھا کہ شبہ کرنے والوں کے بقول یہود نے سائرس کے ساتھ خوش اعتقادی کی وجہ سے ان ثابت شدہ حقائق کو کتاب مقدس میں وحی الٰہی کی بشارت بنا ڈالا۔ لیکن اس کے برعکس سکندر مقدونی کو کسی طرح یہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

بہر حال کس قدر حیرت کی بات ہے کہ یروشلم سے متعلق جن واقعات کو صدیوں تک کتاب مقدس اور یہودیوں کی متواتر روایات میں خورس (سائرس) سے وابستہ ظاہر کیا گیا وہ چار سو برس کے بعد یک بیک جوزیفس کی زبانی سکندر کے حق میں ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ

سکندر مشرک تھا

سکندر کے مذہب کا ذکر اگرچہ پہلے گزر چکا ہے مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ صرف دیوتاؤں کی پوجا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اس درجہ مغرور و متکبر تھا کہ یونان اور ایشیا کے لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا اور اپنے تئیں معبود کہلاتا تھا۔ (دائرۃ المعارف للبستانی ج ۴ ص ۵۴)

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:

جب سکندر باختر (BACTRA) لوٹ آیا اور او کریانس کی بیٹی رواکزانا (ROXANA) سے شادی کی تو شادی کی دعوت کے موقعہ کو غنیمت جان کر اس نے اپنے یونانی اور مقدونی پیروؤں سے اپنی خدائی کا اعتراف کرانا چاہا۔ .... (ج ۱ ص ۴۸۴)

اور مشہور محدث حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ میں بروایت قتادہؒ سکندر ذوالقرنین اور سکندر بن فلپس میں فرق کرتے ہوئے سکندر مقدونی کو مشرک کہا ہے۔ (ج ۲ ص ۱۰۶)

(جاری ہے)

مضطرب رائے میں تبدیل کر دیتے ہیں مثلاً قرآن نے ذوالقرنین کے اوصاف میں سے ایک وصف یہ بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں تین تاریخی مہم سر کی ہیں..... ایک میں وہ مطلع الشمس تک پہنچا ہے یعنی مشرق کی جانب اس حد تک پہنچا جہاں آبادیوں کا سلسلہ ختم ہو کر سورج سامنے سے طلوع ہوتا نظر آتا تھا اور دوسرے میں وہ مغرب الشمس تک گیا ہے یعنی اس حد تک پہنچا ہے جہاں حصۂ زمین ختم ہو کر سمندر کا کوئی ایسا حصہ سامنے تھا جس میں غروب کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا گویا سورج گدلے چشمہ میں ڈوب رہا ہے اور تیسری مہم ایسے سفر

(گذشتہ سے پیوستہ)

اسی طرح حافظ ابن حجر نے امام رازی کے قول کو بہ طور سند پیش کرتے ہوئے سکندر مقدونی اور اس کے وزیر اسطاطالیس دونوں کو کافر کہا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری جدید ایڈیشن ج ۶ ص ۲۹۴)

اور اسلام کے ان جلیل القدر ائمۂ دین کی مزید تائید انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا سے بھی ہوتی ہے چنانچہ مقالہ نگار لکھتا ہے:

''جب سکندر دریاء ستلج کے کنارہ پہنچا تو اس نے اپنی فوج کو دریا کے عبور کرنے کا حکم دیا لیکن فوج نے عبور کرنے سے انکار کر دیا اس پر سکندر نے اپنے افسروں کے سامنے مزید فتوحات کی اسکیم پیش کی لیکن یہ بے سود ثابت ہوئی۔ تب سکندر نے حسب دستور دریا کے سامنے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی اور (اپنے عقیدہ کے مطابق) دیوتاؤں کی اجازت نہ سمجھتے ہوئے پیش قدمی سے باز آیا اور واپس لوٹ گیا۔ (ج ا ص ۴۸۴)

اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین میں ہے کہ جوزیفس کی زبانی اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید سکندر یروشلم گیا تھا اور اس نے یہود کے ساتھ خصوصی مراعات بھی کیں اور محکمۂ خبر رسانی میں ممتاز درجے بھی دیے اور اس طرح یونانیوں اور یہودیوں میں ایک علاقہ قائم ہو گیا تاہم یہ محقق ہے کہ یہودیوں نے ان کے کلچر اور ان کے عقائد و رسوم کو اپنے اندر داخل نہ ہونے دیا اور وہ ہمیشہ ان کو اس حیثیت سے نفرت و حقارت ہی سے دیکھتے رہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ یہودی قوم سختی کے ساتھ توحید کی قائل تھی اور اپنے مذہبی عقائد میں بہت پختہ اور یہی وجہ ہے کہ یونانیت اور یہودیت میں کبھی اتصال نہ ہو سکا۔ (ج ا ص ۳۰۹)

اور بستانی لکھتا ہے کہ سکندر مقدونی نے وفات کے وقت جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ اس کو بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔

ثم لما رأى ان الا رجائه بالشفاء وان ساعته دنت نزع خاتمه من اصبعه وسلمه الى الامير برديكاس واوصاه ان ينقل جثته الى هيكل المشترى بواحات سيره ليدفن هناك بين الاصنام۔ (جلد ۳، ص ۵۴۸)

پھر جب سکندر نے دیکھا کہ اب زیست کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور اس کی موت کا وقت قریب آ لگا تو اس نے اپنی انگلی سے شاہی مہر نکال کر اپنے امیر بردیکاس کو دی اور اس کو وصیت کی کہ مجھ کو سیوہ کے اطراف میں مشتری دیوتا کے ہیکل میں بتوں کے درمیان دفن کیا جائے۔

اب ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ ''مضمون نگار'' کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ''سکندر مقدونی کی تاریخ کا یہ مسلمہ باب ہے کہ وہ یونانیوں کے قدیم مذہب اور دیوتاؤں کی پرستش کا مقلد تھا اور یہ کہ وہ ہرگز مسلمان نہ تھا یا محترم صاحب استدراک کا یہ ارشاد کہ دعویٰ (کہ سکندر مشرک تھا) بجائے خود مخدوش و مجروح ہے۔''

اور یہ بھی انصاف طلب بات ہے کہ صاحب استدراک کے اس حوالہ کی جو کہ جوزیفس کی قدیم تاریخ یہود سے دیا گیا ہے'' محققین مؤرخین بلکہ کتاب مقدس کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت ہے؟ کہاں مدلل اور واقعات و حقائق اور کہاں محض ظن و تخمین۔

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا

سکندر کا ظلم وجبر

محترم صاحب استدراک مضمون نگار کے دوسرے دعویٰ کی تردید فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

(جاری ہے)

سے متعلق تھی جس میں اسکوایک ایسی قوم سے واسطہ پڑاجو اسکی زبان سے نا آشنا تھی اور جس نے یاجوج وماجوج قبائل کی تاخت و تاراج کے متعلق اس سے شکایت کی اور اس نے ان کی فرمائش پر دو پہاڑوں کی پھانکوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ایک مضبوط سد قائم کر کے حملہ آوریاجوج وماجوج قبائل سے ان کو محفوظ کر دیا لیکن علماء سلف یہ بتانے سے قاصر رہے ہیں کہ جس شخص کو ذوالقرنین فرمارہے ہیں کیا واقعی اسکو یہ تینوں مہم اس تفصیل کے ساتھ پیش آئیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے بلکہ وہ اس کا بھی فیصلہ نہیں فرماسکے کہ اسکا اصل

(گذشتہ سے پیوستہ)

سکندر کا جابر و قاہر ہونا مسلم نہیں بہت کچھ مختلف فیہ ہے۔ تاریخ میں دونوں قسم کے اقوال ملتے ہیں کم از کم شک کا فائدہ تو اسے ملتا ہی ہے۔ (برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض کرنے دیجیے کہ قدیم و جدید مسلم عیسائی مؤرخین نے سکندر کی جو سیرت پیش کی ہے بحیثیت مجموعی ان سب کا حاصل یہ ہے کہ وہ جابر و قاہر تھا اور اس کو نیک سیرت اور صالح بادشاہ نہیں کہا جا سکتا لہٰذا کم از کم ایک قول تو ایسا تحریر کیا جاتا جس میں اس کو نیک عادل اور صالح تسلیم کیا گیا ہو۔

رہی یہ بات کہ اس کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی عدل یا رحم کا موجود نہیں ہے تو اس کا انکار تو کوئی بھی نہیں کر سکتا مگر ان چند گنتی کے واقعات سے کسی کی سیرت عادل رحیم اور صالح نہیں کہی جا سکتی ورنہ تو پھر چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور حجاج بن یوسف کو بھی یہی مقام دیا جانا چاہیے۔ سکندر کی جابرانہ حیثیت کا اندازہ ان چند حوالوں سے کیا جا سکتا ہے

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

در حقیقت اس کے دماغ کا توازن شروع ہی سے بگڑ گیا تھا، یہ ظالم اور جابر انسان جو اپنے کو خدا سمجھتا تھا جو اپنے دوست کے سینہ میں برچھی گھونپ کر مسرور ہوتا تھا جو ایک دوسرے دوست کو سخت ترین جسمانی ایذا پہنچا کر اس کی چیخ پر حقارت آمیز انداز میں متبسم ہوتا تھا وہ ایک عادل و دماغ فرمانروا اور مدبر ہونے سے بہت دور تھا۔ (ج اص ۴۸۵)

ہر شخص اس سے حد درجہ خوشامدانہ انداز میں بات کرنے پر مجبور تھا۔ پلوٹارک (PLOTAROK) لکھتا ہے کہ اس کو اپنی پرانی عادت یعنی انسانوں کا شکار کرنے میں بڑی تسلی و تشفی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔ (ج)

آخر کار وہ پسر گیڈا (PASARGAGAE) پہنچا اور سائرس کی قبر کا پتہ لگا کر اسے کھدوایا اور لوٹا اور اس کی توہین کی۔ (ج اص ۴۸۴)

"(قابض ہو جانے کے بعد) پسر گیڈا میں اس کو بے شمار دولت مال و اسباب ہاتھ آیا جس کی قیمت کا اندازہ ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ کے قریب کیا جاتا ہے، اس دولت کو لوٹنے کے بعد اسنے شہر کے تمام مردوں اور اولاد ذکور کو تہ تیغ کیا اور عورتوں اور اولاد اناث کو باندیاں بنالیا۔" (ج اص ۴۸۳)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے علاوہ بستانی اور وہ تمام مسلمان مؤرخین جو اس کو زبردستی "ذوالقرنین" بنانے پر آمادہ نہیں ہیں سکندر سے متعلق اسی قسم کی روایات جبر و قہر بیان کر رہے ہیں پس ضرورت تھی کہ ان روایات کے مقابلہ میں کسی محقق مؤرخ کی ایک روایت ایسی بھی سامنے آجاتی جو تخمین و قیاس سے جدا تاریخی روشنی میں اس کو نیک صالح اور عادل بادشاہ ثابت کر سکتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور تمام ذخیرۂ تاریخ اس سے یکسر خالی ہے۔

رہا "شبہ کا فائدہ" تو اول تاریخی حقائق کے بعد شبہ کے فائدہ کا سوال ہی کیا ہے اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے کہ سکندر کو جابر و قاہر کہنے میں سکوت اختیار کر لیا جائے نہ کہ یہ فائدہ کہ ایسی ہستی کو جس کا نیک، صالح اور عادل ہونا تک مشتبہ ہو، قرآن عزیز کا ذوالقرنین بنادیا جائے کہ جس کی منقبت میں قرآن عزیز رطب اللسان ہے اس کو تو بلا شبہ تاریخی صحائف میں روز روشن کی طرح صالح و عادل ثابت ہونا چاہیے۔

سکندر کا مغرب کی طرف اقدام

تیسری بات "مضمون نگار" نے یہ کہی تھی کہ سکندر کی تاریخی مہمات کے متعلق یہ مسلمات میں سے ہے کہ وہ مغرب کی

(جاری ہے)

نام کیا ہے؟ اس کا مرکز حکومت کہاں تھا؟ اور اس کو ذوالقرنین کیوں کہتے ہیں؟ غرض سلف رحمہم اللہ کے یہاں ان سوالات کے جواب میں اس درجہ مختلف اور مضطرب اقوال پائے جاتے ہیں کہ قرآن کے بیان کردہ اوصاف و علامات کے پیش نظر ان کے ذریعہ کسی قدیم العہد بادشاہ کی شخصیت کا تعین ناممکن ہو جاتا اور معاملہ اپنی جگہ منفصل ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً نام کے متعلق زبیر بن بکار اور ابن مردویہ (عن ابن عباسؓ) کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن ضحاک بن معد بن عدنان ہے مگر اسکے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ روایت بہت ضعیف ہے اسلئے کہ

(گذشتہ سے پیوستہ)

جانب نہیں بڑھا" چنانچہ "صاحب استدراک" اس کو بھی مخدوش و مجروح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"سکندر کی ابتدائی فتوحات تاریخ کو مسلم ہے کہ شمال و مغرب ہی کی جانب حاصل ہوئی تھیں"۔ (برہان ماہ اگست ۱۹۴۱ء)

اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ سکندر کی شمالی جانب میں فتوحات کا انکار تو "مضمون نگار" نے بھی نہیں کیا۔ البتہ مغربی جانب میں سلسلۂ فتوحات و سیاحت کے بڑھنے کا ضرور انکار کیا ہے "صاحب استدراک" اس کی تردید میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اور مقدونیہ کے کنارے مغرب میں ہی وہ جھیل ہے جسکا پانی اتنا گندہ ہے کہ سیاہی مائل ہو گیا ہے اور وہیں سورج ڈوبتا نظر آتا ہے: وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ کا پورا مصداق۔ (برہان، اگست ۱۹۴۱ء)

مگر یہ دلیل "کوہ کندن وکاہ بر آوردن" سے زیادہ وقیع نہیں ہے۔ اسلئے کہ "مضمون نگار کا یہ مقصد تو ہرگز نہ تھا کہ سکندر جس نے شمال اور مشرق میں ہزارہا میل تک زبردست فتوحات حاصل کیں اور ملکوں اور شہروں کو مسخر کیا وہ مغرب کی جانب اپنے دارالسلطنت مقدونیہ کے کنارہ تک بھی نہیں گیا۔

پس اس جھیل تک سکندر کا پہنچنا جو مقدونیہ کے کنارہ ہی پر ہے، ایسی کونسی عظیم الشان مہم تھی جس کا ذکر قرآن عزیز نے اس اہمیت کے ساتھ کیا ہے اور جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مغربی مہم کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ذوالقرنین کے مرکزی دارالسلطنت سے سینکڑوں یا ہزاروں میل دور اس حد پر پہنچ گئی تھی جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مقدونیہ کے کنارہ کی جھیل او کریڈا جس جگہ واقع ہے وہاں تو صبح و شام خدا کی ہزاروں مخلوق کا شب و روز ہی گزر ہوتا رہتا تھا اور وہ مغرب کے کسی آخری حصہ میں بھی واقع نہیں ہے بلکہ اطراف و جوانب کے شہروں اور ملکوں کے درمیان واقع ہے تو یہ کونسی ایسی جگہ تھی جس کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے: حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ پس جھیل کے پانی کے گندہ اور سیاہی مائل ہونے کی وجہ سے یہ جھیل کسی طرح بھی قرآن عزیز کی اس آیت کا مصداق نہیں بن سکتی۔

چنانچہ مفسرین قرآن بالاتفاق اس آیت کی تفسیر وہی کرتے ہیں جو ہم نے بیان کی ہے یعنی ذوالقرنین مغرب کی جانب دور تک بڑھتا ہوا ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں صحراؤں اور پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے۔ البتہ سمندر کا وہ حصہ ایسا تھا جہاں پانی گدلا اور سیاہ ہو گیا تھا اور سورج غروب ہوتے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ سیاہ گدلے چشمۂ پانی میں ڈوب رہا ہے۔

چنانچہ سید محمود آلوسی بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ای منتھی الارض من جھۃ الغرب

یعنی مغرب کی جانب میں زمین کے آخری حصہ تک جب پہنچا

اور محدث ابن کثیر، ابن جریر، امام رازی اور قدیم و جدید تمام مفسرین یہی تفسیر بیان فرما رہے ہیں پس "صاحب استدراک" کی یہ تفسیر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآن عزیز کے بیان کردہ مقصد کے منافی ہے۔

در حقیقت اس آیت کا مصداق یہ ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا جب تمام ایشیاء کو چک کو بحر شام سے بحر اسود تک قبضہ میں کر چکا تو وہ آگے بڑھتا ہوا مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ نقشہ میں دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایشیائے

(جاری ہے)

اس صورت میں وہ حضرت ابراہیم کا معاصر نہیں ہو سکتا جبکہ حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان چالیس واسطے ہیں[1] ابن ہشام کعب احبار اور جعفر بن حبیب کہتے ہیں کہ اس کا نام مصعب بن عبد اللہ مصعب حمیری ہے[2] حافظ ابن حجر کا رحجان بھی اسی جانب ہے لیکن ابن عبد البر کہتے ہیں کہ مصعب سے قحطان تک چودہ پشت ہوتی ہیں اور ابراہیم سے فلج تک سات پشت ہیں حالانکہ فلج اور قحطان دونوں بھائی عبر کے بیٹے ہیں لہٰذا اس حساب سے یہ شخص بھی حضرت ابراہیم کا معاصر نہیں ہو سکتا اور جعفر حبیب کی دوسری روایت یہ ہے کہ منذر بن ابی القیس (شاہ حیرہ)[3]

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱: فتح الباری ج۶۔
۲: مصعب یا مصعب بن عبد اللہ بن قرین بن منصور بن عبد اللہ بن ازد فتح الباری ج۶، تاریخ ابن کثیر ج ۲، توراۃ پیدائش باب ۱۱۔ الانباہ لابن عبد البر۔
۳: کتاب المعمر۔
۴: الانباہ لابن عبد البر و تاریخ ابن کثیر ج ۲۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

کو چک کے مغربی ساحل میں چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور بحر اسکین کے ساحلی مقام پر جا کر یہ گہرے سیاہ رنگ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور ساحل پر کھڑے ہونیوالے کو سورج اسکے اندر ڈوبتا نظر آتا ہے اور مغربی ساحل کی یہ مہم سائرس ہی کو نصیب ہوئی ہے۔ سکندر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب صاحب استدراک چاہتے ہیں کہ اسے گھر بیٹھے ہی مقدونیہ کے کنارہ اس خوش قسمتی کا مصداق بنادیں مگر یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا۔
نیز "صاحب استدراک" "آرکیڈا جھیل کا جاء وقوع مناستر سے پچاس میل مغرب میں (یوگوسلاویہ) میں بتا کر اگرچہ اس کا بعد مسافت ظاہر فرمانا چاہتے ہیں، مگر بہر حال ہے وہ سکندر کے دار السلطنت مقدونیہ کے کنارہ ہے۔
یہ ہیں وہ خدشات اور اسباب جرح جو "صاحب استدراک" نے تکلیف گوارا فرما کر "مضمون نگار کے تین مسلمات پر عائد فرمائے ہیں، اب قارئین کرام بنظر انصاف خود غور فرمائیں کہ تاریخ کی روشنی میں "مضمون نگار" کے "مسلمات ثلثہ" صحیح ہیں یا "صاحب استدراک" کے "خدشات وجرح" بہت ہیں۔ اعدلوا هو اقرب للتقوى۔
اس کے بعد صاحب استدراک یہ تحریر فرماتے ہیں "جزم کے ساتھ کسی کی بھی تعیین کرنا دشوار ہے اسلئے کہ قرآن مجید کی بتائی ہوئی علامات کا مصداق تمام تر ابھی تک کوئی نہیں ملا ہے۔ (برہان ماہ اگست)
مضمون نگار نے بھی ذوالقرنین کی تعیین پر بحث کرتے ہوئے یہی لکھا ہے کہ اس سب کچھ لکھنے کے بعد بھی بحث و تمحیص کا دروازہ بند نہیں ہے، مگر پھر تعجب یہ ہے کہ ایسی صورت میں صاحب استدراک کو مضمون نگار کے مضمون کی فوری تردید کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید صاحب استدراک کے نزدیک وہ اہم ضرورت یہ تھی، فرماتے ہیں، لیکن جہاں تک ارجحیت کا تعلق ہے سکندر مقدونی کا نمبر، جس کی طرف ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں کہ کسی سے پیچھے نہیں"۔
گویا صاحب استدراک اس غلط فہمی میں ہیں کہ علماء متقدمین کی اکثریت اس جانب ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے جس کو جلد رفع ہونا چاہئے۔
اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے متعلق مختلف اقوال میں سے علماء سلف (متقدمین کی اکثریت کا دعویٰ کسی جانب بھی نہیں کیا جا سکتا اور اگر ان کے تمام اقوال کو جمع کر کے خلاصہ نکالا بھی جائے تو دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ ان کے نزدیک شاید راجح یہ ہے کہ وہ ایک قدیم بادشاہ تھا اور اس کا نسب سامیین اولیٰ سے ملتا ہے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاصر تھا۔ دوسری یہ کہ جن بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ ذوالقرنین سکندر کہے ان کی مراد سکندر مقدونی سے نہیں ہے بلکہ وہ حضرت مسیح سے دو ہزار برس پہلے سکندر رومی کو اس کا مصداق تسلیم کرتے اور رومی اور مقدونی کو دو جدا جدا ہستیاں مانتے ہیں اور ان دونوں باتوں کی تصدیق کیلئے تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۱۶۷ فتح الباری (ج ۶ ص ۲۹۴ و ۲۹۵) بخاری کتاب

(جاری ہے)

ذوالقرنین ہے لیکن یہ بادشاہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بھی بعد پیدا ہوا ہے اور ہمدانی نے کتاب الانساب میں اس کا نام ہمیسع (ابوالصعب) بن عمرو بن عرب بن زید بن کہلان بن سبا بن قحطان یا ابن یشجب بن یعرب بن قحطان بتایا ہے۔ اگرچہ اس نام کا بادشاہ سبا کے خاندان سے ضرور ہو گزرا ہے۔[1] لیکن حمیری (سبا) بادشاہوں کے طبقہ اولیٰ کی تاریخ بھی ۱۲۰۰ ق م ہونا چاہیے اور ابن ہشام نے سیرت میں دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ ذوالقرنین کا نام زبان بن مرد ود یہ ہے اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق کی روایت کی وجہ سے اسی کو سکندر اول بھی کہتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے یہ نام مجہول ہے اور اس نام کا کوئی بادشاہ تاریخوں میں مذکور نہیں ہے۔ علاوہ ازیں علماء سلف یہ صراحت کرتے ہیں کہ ذوالقرنین عربی الاصل ہے اور مرزبان اور مردویہ عربی نام نہیں ہیں بلکہ عجمی نام ہیں اس لیے اگر اس نام کا کوئی بادشاہ ہوگا تو وہ عجمی ہوگا نہ عربی اور وہب بن منبہ سے منقول ہے کہ اس کا نام صعب بن مرائد (تبع اول) ہے[2] لیکن یہ اس لیے صحیح نہیں کہ اول تو کوئی تبع اول کا یہ نام ہی نہیں ہے بلکہ اس کا نام حارث الرائش یا زید ہے دوسرے کوئی (حمیری) تبع حضرت ابراہیمؑ کا معاصر نہیں ہے اور دار قطنی اور ابن ماکولا سے منقول ہے کہ اس کا نام ہرمس یا ہروس بن قیطون بن لنطی ہے[3] مگر یہ سخت مغالطہ

(حاشیہ صفحہ ہذا)

۱: قلقشندی۔

۲: کتاب التیجان لابن ہشام۔

۳: تاریخ ابن کثیر ج ۲۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

احادیث الانبیاء، البدایہ والنہایہ یعنی تاریخ ابن کثیر (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) اور کتاب التیجان قابل مراجعت ہیں اور حافظ عماد الدین ابن کثیر نے تو البدایہ والنہایہ (ج ۲ ص ۱۰۵ و ۱۰۶) میں متقدمین کی اس دوسری بات کو واضح کرتے ہوئے صاف صاف تحریر فرمایا ہے:

''حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین سکندر رہی ہے اور اس کا باپ پہلا قیصر گزرا ہے اور وہ سام بن نوحؑ کی اولاد سے تھا۔ لیکن دوسرا ذوالقرنین، پس وہ سکندر بن فلپس مقدونی یونانی مصری ہے جس نے اسکندریہ آباد کیا اور جو روم کی تاریخ بناتا ہے اور یہ دوسرا اسکندر پہلے سکندر سے بہت طویل زمانہ کے بعد ہوا ہے اور ہم نے اس پر اسلئے تنبیہ کی کہ بہت سے لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ دونوں سکندر ایک ہی ہیں اور یہ گمان کر بیٹھے کہ قرآن میں جس سکندر کا ذکر ہے وہ اسکندر ہے جس کا وزیر ارسطو ہے اور اس غلط سمجھ کی وجہ سے بہت بڑی خطا اور عریض و طویل فساد برپا ہو جاتا ہے۔ پس بلا شبہ، پہلا سکندر مومن، صالح اور عادل بادشاہ تھا اور اس کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے اور دوسرا اسکندر مشرک تھا اور اس کا وزیر ارسطو فلسفی تھا اور ان کے درمیان دو ہزار سال سے زائد کا زمانہ ہے اور ان دونوں کا فرق صرف ایسے غبی پر ہی مشتبہ رہ سکتا ہے جو حقائق امور سے ناواقف ہو''۔

اب صاحب استدراک غور فرمائیں کہ ان کا یہ کہنا ''سکندر یونانی کی جانب ہمارے متقدمین اس کثرت سے گئے ہیں'' کہاں تک درست ہے؟ ہاں ہمیں یہ تسلیم ہے کہ اس سخت مغالطہ میں کہ ''سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے صرف صاحب استدراک ہی تنہا نہیں ہیں بلکہ مؤرخین اسلام میں سے بعض اچھے اچھے مؤرخوں کو یہ دھوکا ہو گیا اور انہوں نے اس سکندر قدیم کو جو دراصل سکندر نہیں بلکہ حمیری سامی بادشاہ تھا سکندر مقدونی سمجھ لیا اور ذوالقرنین والا تمام قصہ اس کے ساتھ چسپاں کر دیا اور جب اس کے جسم حکومت اور شخصیت پر قباء ذوالقرنین راست نہ آ سکی تو دور از کار تاویلات کے ذریعہ اس پر موزوں کرنے کی سعی ناکام کی اور زیادہ تعجب یہ ہے کہ امام رازی جیسا بزرگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور غالباً اس کی ابتداء مشہور مفسر و مؤرخ ابن جریر سے ہوئی۔

(جاری ہے)

ہے اسلیئے کہ یہ سکندر مقدونی کے دادا کا نام ہے اور سکندر کے مغالطہ ہی میں ذکر میں آ گیا ہے۔

اس تفصیل سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس امر پر اتفاق کے باوجود کہ قرآن میں مذکور ذوالقرنین حضرت ابراہیم کا معاصر ہے اور نہ سامیہ اولیٰ میں سے بلکہ یا یمنی حمیری سلاطین کے نام ہیں اور یا عجمی بادشاہوں کے نام اور ان میں اس درجہ اختلاف ہے کہ چند علماء سلف کا کسی ایک پر اتفاق نہیں اور اسی بناء پر حافظ ابن حجر صرف یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ چند اشعار عرب اور بعض اقوال سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کا نام صعب تھا لیکن خود صعب کی شخصیت کے متعلق جو اختلاف اقوال ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر نہ ہونے کا جو اشکال ہے اس کا کوئی حل انھوں نے نہیں کیا۔

پھر نام کی طرح اس کے لقب "ذوالقرنین" کے متعلق بھی یہی اضطراب موجود ہے اور اس لقب کی وجہ میں جس قدر بھی احتمالات ہو سکتے تھے وہ سب ہی منقول و مذکور ہیں۔ فہرست ملاحظہ ہو:

۱) ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ روم و فارس دو مملکتوں کا مالک تھا اور "قرن" جس کے معنی "سینگ" کے ہیں بطور استعارہ کے طاقت و حکومت کے معنی ہیں استعمال ہوا ہے یعنی دو حکومتوں کا والی اور مالک یہ رائے اہل کتاب کی جانب منسوب ہے اور بعض مفسرین کا رجحان بھی اسی جانب ہے۔

۲) وہ فتوحات کرتا ہوا اقصائے مشرق و مغرب تک پہنچا اور دونوں جہات میں بہت سے ممالک پر قابض و مسلط ہوا۔ یہ زہری کا قول ہے۔

۳) اس کے سر میں دونوں جانب سینگ کے مشابہ تانبے کے سے غدود ابھرے ہوئے تھے یہ وہب بن منبہ کی رائے ہے۔

۴) اس کی زلفیں دراز تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بالوں کو دو حصے کرتا اور ان کی پٹیاں گوندھ کر دونوں کاندھوں پر ڈالے رکھتا تھا ان دونوں کو "قرن" سے تشبیہ دے کر اس کو یہ لقب دیا گیا یہ قول حسن بصری کی جانب منسوب ہے۔

۵) اس نے ایک جابر بادشاہ کو یا اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی بادشاہ یا قوم نے غضبناک ہو کر اس کے سر کے

(گذشتہ سے پیوستہ)

علماء سلف اور متقدمین کی اکثریت کے مسلک کی توضیح کے بعد لایق صاحب استدراک خود غور فرمائیں کہ کیا اس کے بعد بھی ان کا ازراہِ طعن یہ فرمانا کہ جب سے تحقیق اور روشن خیالی کا معیار ہی یہ قرار پا گیا ہے کہ اگلے ماہرین فن کے ساتھ رشتۂ اتحاد و توافق کا نہیں بلکہ انکار و تردید کا قائم رکھا جائے ذوالقرنین کے اسکندر ہونے سے مسلسل انکار ہونے لگا ہے"۔ صدق ۴ اگست ۴۱ء) کسی حد تک بھی درست ہو سکتا ہے، ہم اس کے جواب میں انہیں صرف آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی "ایاك والظن فان بعض الظن اثم" یاد دلانا چاہتے ہیں۔

صاحبِ استدراک فرماتے ہیں کہ ہم نے ذوالقرنین کے سکندر مقدونی ہونے سے انکار کر کے اکابرِ سلف کے ساتھ انکار و تردید کا رشتہ قائم کیا ہے، حالانکہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سکندر مقدونی کے انکار میں اکابرِ تفسیر و حدیث حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد شعبی، حافظ ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حبان، حافظ ابن حجر، شیخ بدر الدین عینی، امام نووی، قرطبی وغیرہ سب ہی غریب مضمون نگار کے ہم نوا اور صاحب استدراک کی رائے کے مخالف ہیں، البتہ صرف ابن جریر طبری اور امام رازی ضرور مقدونی کو ذوالقرنین بتا رہے ہیں مگر ساتھ ہی امام صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول پر بہت قوی اعتراضات وارد ہوتے ہیں، لیکن صاحبِ استدراک کی نگاہ میں وہ خود تو اکابرِ سلف کے موید ہیں اور غریب مضمون نگار اکابر کا مخالف ہے، والی اللہ المشتکی

ایک جانب ایسی سخت چوٹ لگائی کہ وہ مر گیا، اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر پھر تبلیغ کا فرض انجام دیا، اس مرتبہ دوسری جانب چوٹ مار کر قوم نے اس کو شہید کر دیا۔ اس ضرب سے اس کے سر پر جو دو نشان پڑ گئے تھے اس وجہ سے اس کو یہ لقب دیا گیا یہ توجیہ حضرت علیؓ کی جانب سے منسوب ہے۔

۶) وہ نجیب الطرفین تھا اسلئے والدین کی نجابت کو قرنین کے ساتھ تشبیہ دی گئی اور ''ذوالقرنین'' لقب ہوا۔

۷) اس نے اس قدر طویل عمر پائی کہ انسانی دنیا کے دو قرن (صدیوں) تک زندہ رہا۔

۸) وہ جب جنگ کرتا تھا تو بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ہتھیار چلاتا بلکہ دونوں رکابوں سے بھی ٹھوکر لگاتا تھا۔

۹) اس نے زمین کی تاریکی اور روشنی دونوں حصوں کی سیاحت کی۔

۱۰) وہ ظاہر و باطن دونوں علوم کا حامل تھا۔ (فتح الباری ج ۶ و تاریخ ابن کثیر ج ۲ و دائرۃ المعارف بستانی ج ۸ ص ۴۱۱)

لیکن پہلی توجیہ تو اس قیاس پر مبنی ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین ہے اور دوسری توجیہ کی بنیاد ایک نا قابل اعتماد روایت پر ہے جو سفیان ثوری اور مجاہد سے منقول ہے اس میں ہے کہ چار بادشاہ وہ ہیں جنھوں نے تمام عالم پر حکومت کی ہے ان میں سے دو مسلمان ہیں اور دو کافر، حضرت سلیمان علیہ السلام ذوالقرنین اور نمرود و بخت نصر۔[1] یہ روایت اس لیے معلول ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین دونوں کی حکومت تمام عالم پر رہی ہے ''اگرچہ تاریخی حیثیت سے یہ صحیح نہیں ہے'' تب بھی نمرود اور بخت نصر کے جو مفصل حالات کتب تواریخ میں محفوظ ہیں وہ اس روایت کے مضمون کا انکار کرتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں بادشاہوں کی حکومت شام، عراق، مصر حجاز اور فارس کے علاوہ باواسطہ یا بلاواسطہ دنیا کے کسی حصہ پر بھی ثابت نہیں ہے اور آخر الذکر بادشاہ کا زمانہ تو بلحاظ عہد تاریخ اتنا قریب ہے کہ اس کی حکومت اور رقبہ حکومت کی تفاصیل تو معاصرانہ شہادتوں اور تاریخی روایتوں اور حضریات کے انکشافات کی بنا پر بہت مشہور اور واضح ہیں اس لیے یہ روایت بھی قابل حجت نہیں ہے اور تیسری توجیہ سے متعلق جو روایت ہے اس کو حافظ ابن حجر نے منکر اور ابن کثیر نے ضعیف اور نا قابل اعتماد کہا ہے[2] اور چوتھی توجیہ جو حسن بصری کی جانب منسوب ہے محض قیاسی ہے اور پانچویں توجیہ جو حضرت علیؓ سے منقول ہے اس کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے دو طریق روایت میں سے ایک ضعیف اور نا قابل اعتبار ہے دوسرا طریقہ اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے متن پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ اس میں یہ الفاظ ہیں لم یکن نبیا ولا ملکا ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ حالانکہ اسی روایت کی ابتداء میں ہے بعثہ اللہ الی قومہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی جانب مبعوث کیا تھا یہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ نبی تھے البتہ حافظ نے اس اشکال کے جواب میں ایک کمزور سا جواب یہ کہہ کر دے دیا۔ ''الا ان یحمل البعث علی غیر رسالۃ النبوۃ مگر یہ کہ یوں کہہ دیا جائے کہ اس کی بعث نبوۃ کے طور پر نہیں تھی۔'' (فتح الباری ج ۲)

ہمارے نزدیک اس پر یہ اہم اشکال بھی وارد ہوتا ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے حاکمانہ اقتدار کے

۱: تاریخ ابن کثیر ج ۲ و فتح الباری ج ۶۔
۲: تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳ و فتح الباری ج ۶۔

متعلق جو تفصیلات دی ہیں یہ روایت ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی وہ کہتا ہے کہ ذوالقرنین وسیع مملکت اور کامیاب بادشاہ ہو گزرا ہے مگر یہ روایت اس کو صرف ایک مبلغ ثابت کرتی ہے جس کی قوم تک نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور اس کے درپے آزار رہے علاوہ ازیں حضرت علیؓ کی روایت میں اس کے متعلق جو معجزانہ واقعہ مذکور ہے اگر یہ صحیح تھا تو قرآن عزیز کس طرح اس کو فروگذاشت کر سکتا تھا جب کہ یہ ذوالقرنین کی عظمت کو چند در چند بلند کرتا ہے؟ اس لیے یہ توجیہ بھی جرح اور ضعف سے محفوظ نہیں ہے اور ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ قول قرآن میں مذکور ذوالقرنین کے سوا کسی دوسری شخصیت سے متعلق ہو اور نیچے کے راویوں نے اپنے فہم سے اس واقعہ کے ساتھ چسپاں کر دیا ہو اور ساتویں اور نویں ہر دو توجیہات کو ابن کثیر نے "منکر" یعنی ناقابل اعتماد[1] کہا ہے اور چھٹی، آٹھویں اور نویں توجیہات محض اٹکل کے تیر اور بے سند ہیں۔ (فتح الباری ج ۶ والبدایہ والنہایہ ج ۲)

یہ ہیں وہ اقوال جو یا بلحاظ نقل ضعیف اور منکر ہیں اور یا بے سند محض اٹکل کے تیر ہیں اسی بناء پر حافظ ابن حجر تو ان کو فقط نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان اقوال میں سے بھی کسی ایک قول کو ترجیح نہیں دیتے جو ان کے نزدیک بلحاظ روایت و نقل سقم سے پاک ہیں۔ البتہ حافظ ابن کثیر نے زہری کے قول کو راجح کہا ہے یعنی وہ چونکہ مشرق اور مغرب دونوں حدوں تک پہنچا اور ان کے درمیان کا مالک رہا ہے اس لیے ذوالقرنین کہلایا" یہ بات اگرچہ کسی حد تک صحیح ہو سکتی ہے لیکن مشارق الارض و مغاربها کے مفہوم میں وہی کلام ہے جو ہم ابھی بیان کر آئے ہیں اور آئندہ تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کریں گے۔

علماء سلف سے ذوالقرنین کے نام اور لقب سے متعلق جو اقوال منقول ہیں اور جن سے اس کی شخصیت کے تعین میں مدد لی جاتی ہے ان کا حال تو آپ تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکے، اب ذوالقرنین کے بعض حالات کا جو تذکرہ اس ضمن میں پایا جاتا ہے وہ بھی تعارض و اضطراب سے خالی نہیں ہے مثلاً ازرقی کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان قبول کیا اور پھر ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ہمراہ کعبہ کا طواف کیا۔[2] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا اور علی بن احمد کی روایت میں ہے کہ ذوالقرنین جب حج کے ارادہ سے نکلا تو پیادہ پا روانہ ہوا اس کی اطلاع حضرت ابراہیمؑ کو ہوئی تو وہ اس کے استقبال کیلئے نکلے[3] اور اس کے لیے دعاء خیر کی یہ روایت ذوالقرنین کو قدیم الاسلام ثابت کرتی ہے۔

اسی طرح تعیین شخصیت میں کوئی اس کو سامی اولیٰ میں سے بیان کرتا ہے اور کوئی حمیری بادشاہوں میں سے اور کوئی خضر علیہ السلام کو اس کا وزیر کہہ کر خضر کی عمر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے عہد تک دراز ثابت کرتا ہے حالانکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حالات میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تمام روایات غیر مستند اور اہل کتاب سے ماخوذ ہیں۔

غرض ذوالقرنین کے نام، اس کے لقب کی وجہ تسمیہ اور تعیین شخصیت کے متعلق علماء سلف کے یہاں اس قدر مختلف اور مضطرب روایات پائی جاتی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ذوالقرنین کی تاریخی شخصیت کا پتہ لگانا ممکن ہو جاتا ہے اور حافظ ابن حجر کے اس ارشاد کے باوجود:

۱، ۲: البدایہ والنہایہ ج ۲۔
۳: فتح الباری ج ۶۔

فهذه الاثار یشد بعضه بعضاً و یدل علی قدم عهد ذی القرنین۔
پس یہ آثار ایک دوسرے کو مضبوط بناتے اور قوت پہونچاتے ہیں اور ذوالقرنین کے قدیم العہد ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

یہ اشکال حل نہیں ہوتا کہ جبکہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے عہد کے کافر بادشاہ نمرود کے حالات وواقعات قرآن کے علاوہ سیر و تاریخ کی کتابوں کے ذریعہ بھی جب زیادہ روشنی میں آچکے ہیں اور بائبل بھی اکثر حالات کو روشنی میں لاتی ہے تو اگر ذوالقرنین عہد ابراہیمی کی ایسی عظیم الشان ہستی تھی تو ان چند مختصر اور منتشر آثار کے علاوہ اس کے حالات وواقعات کیوں تاریخی حیثیت سے اس طرح سامنے نہیں آئے جس سے اس کی شخصیت صاف طور پر نمایاں نظر آتی نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلہ میں نہیں کیا اور سورۂ کہف میں اس جانب کیوں اشارہ تک نہیں کیا گیا۔ کیا یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مخالف کافر بادشاہ کی مخالفت اور حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کا تو قرآن شدومد کے ساتھ ذکر کرے مگر مشارق و مغارب ارض پر حکمراں ایسے بادشاہ کا اس سلسلہ میں کوئی ذکر نہ کیا جائے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان لایا ان کی اطاعت و فرماں برداری کا اظہار کر کے ان کا موئید ثابت ہوا اس لیے یہ کہنا شاید بیجانہ ہوگا کہ قرآن، مرفوع احادیث توراۃ اور تاریخ میں عہد ابراہیمی کے اندر یا اس کے قریب کسی ایسے بادشاہ کا ثبوت نہیں ملتا جس کا ذکر سورۂ کہف میں "ذوالقرنین" کہہ کر کیا گیا ہے اور جو اقوال و آثار اس سلسلہ میں مذکور ہیں وہ اس شخصیت کی تاریخی حیثیت ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔

متاخرین کی رائے

علماء و متاخرین میں سے بعض علماء نے تو اسی غلط بات کو اختیار کر لیا کہ سکندر (مقدونی) ہی قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہے اور بعض علماء نے فقط علماء سلف کے قول کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور اس کے خطاء وصواب پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور بعض نے بغیر کسی دلیل کے یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو زیر بحث ذوالقرنین فرمادیا۔

مگر ان سب اقوال سے جدا مولانا ابوالکلام نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمائی ہے البتہ وہ ضرور قابل توجہ ہے بلکہ دلائل و براہین کی قوت کے لحاظ سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحقیق بلاشبہ صحیح اور قرآن کے بیان کردہ اوصاف اور تاریخی حقائق کی مطابقت کے پیش نظر ہر طرح لائق ترجیح ہے۔

تفسیری مطالب کے سلسلہ میں ہم کو موصوف کے ساتھ شدید اختلاف بھی رہتا ہے اور اتفاق بھی لیکن اس خاص مسئلہ میں چونکہ ان کی رائے علماء سلف سے بالکل مخالف تھی اس لیے کڑی تنقیدی نظر کی محتاج تھی چنانچہ کافی غور و خوض اور گہری نظر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور جب کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ علماء سلف کی جلالت قدر اور علمی عظمت و برتری کے باوجود علمی تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں علماء متاخرین نے علماء متقدین سے سینکڑوں مسائل علمی میں اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے خصوصاً تاریخی مباحث میں اور جدید ذرائع معلومات نے ایسے اکتشافات کیے ہیں جن کے ذریعہ ہم بہت سے

ایسے مسائل کو بآسانی حل کر لیتے ہیں۔ جو علماء سلف کے زمانہ میں لاینحل رہے ہیں تو ہم کو مولانا آزاد کی اس تحقیق کا خواہ تاریخی حقائق کے لحاظ سے وہ کتنی ہی وقیع کیوں نہ ہو" محض اس لیے انکار نہیں کر دینا چاہیے کہ وہ ان کی اپنی تحقیق ہے۔

مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں جو تحقیق فرمایا ہے وہ اپنی جگہ قابل مراجعت ہے اور اس طویل مضمون کا یہاں نقل کرنا قطعاً غیر مناسب ہے البتہ ہم اپنی کاوش و تحقیق سے جس حد تک اس کے ساتھ مطابقت کر سکتے ہیں اس ہی کو سپرد قلم کرنا موزوں خیال کرتے ہیں۔[1]

یہود قریش اور انتخاب سوالات

ایک مرتبہ پھر اس روایت پر غور فرمایئے جو محمد بن اسحاق اور شیخ جلال الدین سیوطی نے نقل فرمائی ہے اور جس کا حاصل یہ ہے کہ اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق مشرکین مکہ نے جو سوالات نبی اکرم ﷺ سے کیے وہ دراصل یہود مدینہ کی تلقین پر کیے گئے تو اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہود کو ان واقعات سے ایسی کیا دلچسپی تھی کہ جس کی بنیاد پر انھوں نے ان کا انتخاب کیا اور ان کے صحیح جوابات کو پیغمبر خدا ﷺ کے دعویٰ نبوت و رسالت کی صداقت کا معیار ٹھہرایا۔ اصحاب کہف سے متعلق تو تفصیل کے ساتھ گذشتہ صفحات میں بحث آچکی ہے لیکن ذوالقرنین کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ یہود نے اس سوال میں در حقیقت ایک ایسی شخصیت کا انتخاب کیا ہے جو ان کی مذہبی زندگی کے سلسلہ میں بہت ہی زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور جس کو وہ اپنی ملی و اجتماعی حیات میں کسی وقت بھی فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ اس شخصیت کی بدولت بنی اسرائیل نے بابل کی غلامی سے نجات پائی اور ان کے قومی مرکز قبلۂ صلوٰۃ اور مقدس مقام یروشلم (بیت المقدس) ہر قسم کی تباہی اور بربادی کے بعد اسی کے ہاتھوں دوبارہ آباد ہوا چنانچہ ان اہم امور کی بناء پر یہود کے نزدیک وہ نجات دہندہ خدا کا مسیح اور خدا کا چرواہا کہلایا کیونکہ ان کے نبیوں کے مقدس صحیفوں میں اس کے متعلق یہی القاب درج تھے اور اس کی عظمت کا اظہار کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے سوالات میں اس شخصیت کے مسئلہ کو بھی منتخب کیا بلکہ اسی کو زیادہ اہمیت دی جیسا کہ قرآن کے اسلوب بیان يَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ سے واضح ہوتا ہے وہ سمجھتے تھے کہ جب کہ محمد ﷺ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور اس کے تمام سچے پیغمبروں کے دین کو اور اپنے دین کو ایک ہی دین سمجھتے ہیں خصوصاً انبیاء بنی اسرائیل کی عظمت و عزت اور ان کی صداقت و حقانیت کا اظہار فرماتے ہیں پس اگر وہ حقیقتاً خدا کے سچے پیغمبر ہیں تو امی ہونے کے باوجود ضرور وحی الٰہی کے ذریعہ اس شخص کے واقعات پر روشنی ڈال سکیں گے جس کی وجہ سے مہبط انبیاء بنی اسرائیل (یروشلم) انبیاء بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کو ایک بت پرست بادشاہ کی غلامی اور تباہ کاریوں سے نجات ملی اور جو خدا کے کلمہ کو بلند کرنے میں انبیاء بنی اسرائیل کا معاون و مددگار ثابت ہوا۔

۱: اس مسئلہ کی پوری تحقیق میں ہم کو مولانا آزاد کے اس حصہ بیان سے سخت اختلاف ہے جو انہوں نے علماء سلف کے خلاف یاجوج و ماجوج کے آخری خروج کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ اسلئے کہ یہ حصہ تحقیقی بلاشبہ باطل ہے، یہ بحث عنقریب ذکر میں آئے گی۔

تفصیل اجمال کی یہ ہے ۶۰۰ ق م میں عراق میں دو عظیم الشان حکومتیں اپنے قاہرانہ وجابرانہ تسلط کے ساتھ قائم تھیں ایک آشوری حکومت اور اس کا دار الحکومت نینویٰ تھا اور دوسری بابلی حکومت اور اس کا دار الحکومت بابل تھا لیکن ۶۱۲ ق م میں نینویٰ کی حکومت کو زوال آگیا اور اب بابلی حکومت بلاشرکت غیرے دونوں حکومتوں کے مقبوضات کی مالک اور وقت کی بہت بڑی طاقت بن گئی یہی زمانہ تھا جب کہ بابل کے تخت پر بخت نصر (بنوکدنذر)[1] سریر آرائے سلطنت ہوا، یہ بادشاہ ذاتی طور پر بہادر اور صاحب تدبیر تھا مگر ساتھ ہی سخت جابر و ظالم بھی تھا کتب تاریخ میں مشہور ہے کہ یہ صرف ملکوں کو فتح ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو غلام بنا کر بھیڑوں کی طرح بابل لے جاتا اور بڑے بڑے متمدن اور بے نظیر شہروں کو برباد کر کے کھنڈر چھوڑ جاتا تھا۔

ادھر ایک عرصہ سے بنی اسرائیل کی روحانی، اخلاقی اور اجتماعی زندگی کو گھن لگ چکا تھا اور بداعمالیوں اور بدکرداریوں نے اس درجہ ان کو ذلیل وخوار کر دیا تھا جو انبیاء علیہم السلام ان کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے اور ان کی بدکرداریوں پر ان کو وعظ و نصیحت اور تنبیہ کرتے تو یہ ان کو قتل کر دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بخت نصر خدا کا عذاب بن کر ان پر چڑھ آیا اور ایک لاکھ سے زیادہ بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بکریوں کے گلہ کی طرح ہنکا لے گیا اور بیت المقدس جیسے خوب صورت اور مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، یہ حادثہ بنی اسرائیل کے لیے ایسا ہوش ربا تھا کہ اس نے ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو تباہ و برباد کر ڈالا اور وہ انتہائی مایوسی کی حالت میں بابل کے اندر غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔[2]

بنی اسرائیل پر گذرے ہوئے واقعات کی خبر اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے حضرت یسعیاہ (شعیا) اور حضرت یرمیاہ (علیہما السلام) نے وحی والہام کے ذریعہ پیش آنے سے قبل ہی سنادی تھی مگر اس زمانہ میں وہ اپنی نافرمانیوں میں اس درجہ سرشار و سرمست تھے کہ انھوں نے ان پیشین گوئیوں کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ اب جب کہ یہ ہولناک واقعات سر پر سے گذرنے لگے تو ان کی آنکھیں کھلیں مگر ایسے وقت کھلیں کہ رنج و افسوس اور حزن وملال سب بیکار تھا اور کوئی ترکیب نہیں تھی کہ وہ اس عذاب سے نجات پاسکیں۔

لیکن ان تمام مایوسیوں کی سخت اور ہولناک تاریکی میں ان کے لیے اگر کوئی شعاع امید باقی تھی تو وہ ان ہی انبیا علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کا وہ حصہ تھا جس میں حضرت یسعیاہ نبی نے تقریباً ایک سو ساٹھ سال قبل اور حضرت یرمیاہ نبی نے ساٹھ سال قبل یہ بشارت بھی دی تھی کہ بیت المقدس کی تباہی سے ستر سال کے بعد بنی اسرائیل دوبارہ اپنے وطن میں آزاد ہو کر واپس آجائیں گے اور خدا کا ایک مسیح (مبارک) خدا کا چرواہا (نگہبان) کہ جس کا نام خورس ہو گا وہ بنی اسرائیل کی نجات اور یروشلم کی دوبارہ آبادی کا باعث بنے گا اور اس کے ہاتھوں یہود کی اجتماعی زندگی کا نیا دور شروع ہو گا۔

بخت نصر جب بیت المقدس کے تمام اسرائیلیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا تو ان میں بعض انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو بابل جا کر اپنے حکیمانہ اقوال اور کریمانہ اخلاق کی وجہ سے اس درجہ ہر دلعزیز بنے کہ دشمن بھی ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوا چنانچہ حضرت دانیال علیہ السلام بابلی حکومت کے آخری دور میں مشیر خاص تھے۔

۱: اس نام کا املا دو طرح منقول ہے (بن کدزار) (بنوکدنذر)

۲: واقعہ کی تفصیلات بیت المقدس کے عنوان میں زیر بحث آچکی ہے۔

اب جبکہ وہ وقت قریب آیا کہ بنی اسرائیل غلامی سے نجات پائیں تو ان ہی برگزیدہ نبی (دانیال ؑ) کو الہام و مکاشفہ کے ذریعہ اس نجات دہندہ کو ایک تمثیل کی شکل میں دکھایا گیا اور ساتھ ہی جبرئیل ؑ (ناموس اکبر) نے دانیال نبی ؑ کو اس کی تعبیر بھی بتائی جو اسی خورس کے حق میں تھی جس کا ذکر یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں آچکا تھا۔

ذوالقرنین اور انبیاء بنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں

یہود کے نجات دہندہ خدا کے مسیح اور اس کے چرواہے کے متعلق وہ پیشین گوئیاں کیا ہیں جن کو دیکھ کر یہود بابل کی سر زمین میں انتہائی مایوسیوں کے باوجود اس وقت کے لیے چشم براہ تھے؟ پہلے ان کو نقل کر دیا جائے تاکہ زیر بحث مسئلہ کے لیے تحقیق کی جانب قدم اٹھایا جا سکے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں حضرت یسعیاہ ؑ کی پیشین گوئی سامنے آتی ہے جو یہودیوں کے یوم نجات سے ایک سو ساٹھ سال قبل سنائی گئی تھی:

”اے اسرائیل تجھ کو مجھے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تیری خطاؤں کو بادل کی مانند اور تیرے گناہوں کو گھٹا کی مانند مٹا ڈالا میری طرف پھر آ کہ میں نے تیرا فدیہ دیا ہے ارے اے آسمانو گاؤ کہ خداوند نے یہ کیا...... خداوند تیرا نجات دینے والا جس نے تجھے رحم میں بنا ڈالا یوں فرماتا ہے کہ میں خداوند سب کا بنانے والا ہوں میں نے ہی اکیلا آسمانوں کو تانا اور آپ تنہا زمین کو فرش کیا ہے۔ دروغ گوؤں کے نشانوں کو باطل ٹھیراتا اور فال گیروں کو دیوانہ بناتا ہوں اور حکمت والوں کو رد کر دیتا اور ان کی حکمت کو حماقت ٹھیراتا ہوں جو اپنے بندہ کے کلام کو ثابت کرتا اور اپنے رسولوں کی مصلحت کو پورا کرتا ہوں جو یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ آباد کی جائیگی اور یہوداہ کے شہروں کی بابت کہ وہ بنائے جائیں گے اور میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا جو سمندر کو کہتا ہوں کہ سوکھ جا اور میں تیری ندیاں سکھا ڈالوں گا جو خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میرا چرواہا ہے اور وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا اور یروشلم کی بابت کہتا ہوں کہ وہ بنائی جائے گی اور ہیکل کی بابت کہ اس کی بنیاد ڈالی جائے گی۔

خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا ہاتھ پکڑا کہ امتوں کو اس کے قابو میں کروں اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا ڈالوں اور دہرائے ہوئے دروازے اس کے لیے کھول دوں اور وہ دروازے بند نہ کیے جائیں گے۔ میں تیرے آگے چلوں گا اور ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا میں پیتل کے دروازوں کے جدا جدا پٹوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا اور لوہے کے بینڈوں کو کاٹ ڈالوں گا اور میں گاڑے ہوئے خزانے اور پوشیدہ مکانوں کے گنج تجھے دوں گا تاکہ تو جانے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں۔ جس نے تیرا نام لے کے بلایا ہے میں نے اپنے یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا۔ میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھ کو نہیں جانتا۔ (یسعیاہ نبی کا صحیفہ باب ۴۵ آیات ۱-۴)

اور دوسری پیشین گوئی حضرت یرمیاہ ؑ کی ہے جو بشارت کے وقوع سے تقریباً ساٹھ سال پہلے کی

گئی تھی۔

وہ کلام جو خداوند نے بابل کی بابت اور کسدیوں کی سرزمین کی بابت یرمیاہ نبی کی معرفت فرمایا تم قوموں کے درمیان بیان کرو اور اشتہار دو اور جھنڈا کھڑا کرو منادی کرو۔ مت چھپاؤ کہو کہ بابل لے لیا گیا بعل رسوا ہوا۔ مردوک سراسیمہ کیا گیا اس کے بت خجل ہوئے اس کی مورتیں پریشان کی گئیں۔ کیوں کہ اتر سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہے جو اس کی سرزمین کو اجاڑ کرے گی یہاں تک کہ کوئی اس میں نہ رہے گا وہ بھاگے ہیں وہ روانہ ہوئے کیا انسان کیا حیوان ان دونوں میں اور اسی وقت خدا کہتا ہے بنی اسرائیل آئیں گے وہ اور بنی یہوداہ ایک ساتھ وہ روتے ہوئے چلے جائیں گے اور خداوند اپنے خدا کو ڈھونڈیں گے وہ اس طرف متوجہ ہو کے صیہون کی راہ پوچھیں گے کہ آؤ ہم آپ ہی خداوند سے مل کے اس کے ساتھ ایک ابدی عہد کریں جو کبھی فراموش نہ ہو۔۔۔۔

(یسعیاہ نبی کا صحیفہ باب ۴۵ آیات ۴۔۱۔ باب ۵۰ آیات ۲۔۱)

بابل میں سے بھاگو اور کسدیوں ابابلیوں کی سرزمین سے نکلو اور ان بکریوں کے مانند ہو جو گلوں کے آگے آگے جاتی ہیں کہ دیکھو میں اتر (شمال) کی سرزمین سے بڑی قوموں کے ایک گروہ کو برپا کروں گا اور بابل پر لے آؤں گا۔ (باب ۵۰ آیات ۹۔۸)

قوموں کو مادیون (میڈیا) کے بادشاہوں کو اور اس کے عالموں کو اس کے حاکموں کو اور اس کی سلطنت کی ساری سرزمین کو مخصوص کرو کہ اس پر چڑھیں۔ (باب ۵۱ آیات ۵۰)

رب الافواج یوں کہتا ہے کہ بابل کے بھاری شہر کی دیواریں سراسر ڈھادی جائیں گی اور اس کے بلند پھاٹک آگ سے جلا دیے جائیں گے۔ (باب ۵۱ آیت ۲۸)

اور دانیال علیہ السلام کا خواب یا مکاشفہ یہ تھا:

''بیل شازار (بخت نصر کا جانشین) بادشاہ کی سلطنت کے تیسرے سال میں مجھے مجھ دانی ایل کو ایک رویا نظر آئی تھی اور میں نے عالم روایت میں دیکھا اور جس وقت میں نے دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن کے قصر میں تھا جو صوبہ عیلام میں ہے پھر میں نے رویت کے عالم میں دیکھا کہ میں اولائی کی ندی کے کنارہ پر ہوں تب میں نے اپنی آنکھیں اٹھا کے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے آگے ایک مینڈھا کھڑا ہے جسکے دو سینگ تھے اور وہ دو سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے اٹھا ہوا، میں نے اس مینڈھے کو دیکھا کہ پچھّم اتر دکھن کی طرف سینگ مارتا تھا یہاں تک کہ کوئی جانور اسکے سامنے کھڑا نہ ہو سکا نہ کوئی اسکے ہاتھ سے چھڑا سکا پھر وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا اور میں اس سوچ میں تھا کہ دیکھا کہ ایک بکرا پچھّم کی سمت سے آکر تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ زمین کو بھی نہ چھوا اور اس بکرے کے دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ ایک عجیب طرح کا سینگ تھا اور وہ اس دو سینگ والے مینڈھے کے پاس جسے میں نے ندی کے سامنے کھڑا دیکھا آیا اور اپنے قہر سے اس پر دوڑ گیا اور میں نے اسے دیکھا کہ وہ مینڈھے کے قریب پہنچا اور اسکا غضب اس پر بھڑکا اور مینڈھے کو مارا اور اسکے دونوں

سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اکا سامنا کرے۔ (دانی ایل باب ۸ آیات ۸۔۱)

اور دانیال (علیہ السلام) کے مکاشفہ اور رویا کی تعبیر یہ ہے:

اور ایسا ہوا کہ جب مجھ دانی ایل نے یہ رویت دیکھی تھی اور اس کی تعبیر کی تلاش کرتا تھا تو دیکھا کہ میرے سامنے کوئی کھڑا تھا جس کی صورت آدمی کی سی تھی اور میں نے ایک آدمی کی آواز سنی کہ اولائی کے درمیان پکار کے کہا کہ اے جبریل اس شخص کو اس رویت کے معنی سمجھا چنانچہ وہ ادھر جہاں میں کھڑا تھا نزدیک آیا اور جب پہنچا تو میں ڈر گیا اور اوندھے منہ گرا پھر اس نے مجھے کہ اے آدم زاد سمجھ کیونکہ یہ رویت آخری زمانہ میں انجام ہوگی...... اور کہا کہ دیکھ میں تجھے سمجھاؤں گا کہ قہر کے آخر میں کیا ہوگا کیونکہ مقررہ وقت پر ہی کام کا انجام ہوگا وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو مادہ (میڈیا) اور فارس کا بادشاہ ہے اور وہ بالوں والا بکرا یونان کا بادشاہ اور وہ بڑا سینگ جو اس کی آنکھوں کے درمیان ہے سو اس کا پہلا بادشاہ ہے۔

(دانی ایل باب ۸ آیات ۲۱۔۱۵)

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:

کیونکہ خداوند یہ کہتا ہے کہ جب بابل میں ستر برس گذر چکیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا اور تمہیں اس مکان میں پھر لانے سے اپنی اچھی بات تم پر قائم کروں گا۔

خداوند کہتا ہے اور میں تمہاری اسیری کو موقوف کراؤں گا اور تمہیں ساری قوموں میں سے اور سب جگہوں میں سے جن میں میں نے تم کو ہانک دیا ہے جمع کروں گا۔ خداوند کہتا ہے اور میں تمہیں اس مکان میں جہاں سے میں نے تمہیں اسیر کرا کے بھیجا پھر لے آؤں گا۔

(یرمیاہ باب ۲۹ آیات ۱۴۔۱۰)

اور عزرا کی کتاب میں ہے:

اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو خداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں منادی کرائی اور اسے قلمبند بھی کر کے یوں فرمایا شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدا نے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی ساری قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو کہ شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ (عزرا کی کتاب باب ا آیات ۴۔۱)

اور خورس بادشاہ ہی خداوند کے گھر کے ان برتنوں کو جنھیں بنوکدنذر یروشلم میں سے لے گیا اور اپنے دیوتاؤں کے گھر میں رکھا تھا نکال لایا اور شاہ فارس خورس نے انھیں خزانچی متروات کے ہاتھ سے نکلوایا اور اس نے انھیں یہوداہ کے امیر شیشبضر کو گن دیا۔ (ایضا باب ا آیات ۸۔۷)

اور زکریا نبی کی کتاب میں ہے:

رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ دیکھ وہ شخص جس کا نام شاخ ہے اور وہ اپنی جگہ سے اگے گا اور وہ

خداوند کی ہیکل کو بنائے گا ہاں وہی خداوند کی ہیکل کو بنائے گا اور وہ صاحب شوکت ہوگا۔
(زکریا نبی کی کتاب باب ۶۔ آیت ۱۲)

ان واضح اور صاف پیشین گوئیوں کی اگر تحلیل کی جائے تو ان سے حسب ذیل اہم امور ثابت ہوتے ہیں:

۱) جس ہستی نے بنی اسرائیل کو بابل کی غلامی سے نجات دی اس کا نام خورس تھا اور وہ فارس اور میڈیا دو ملکوں کا متفقہ بادشاہ تھا۔

۲) دانیال نبی کے مکاشفہ اور جبریل علیہ السلام کی تعبیر نے ان دو حکومتوں کے اتحاد کی بناء پر ہی خورس کو دو سینگوں والا (ذوالقرنین) بادشاہ کہا اور اسی تخیل کی بناء پر بنی اسرائیل میں اس کا لقب ذوالقرنین مشہور ہوا۔

۳) انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں میں اس بادشاہ کو خدا کا مسیح بنی اسرائیل کا نجات دہندہ اور خدا کا چرواہا کہا گیا ہے۔

۴) یہودیوں میں قومی عصبیت اور نسلی تعصب کے شدید سے شدید تر ہونے کے باوجود ان ہی واقعات کی بنیاد پر وہ غیر اسرائیلی شخص کو ایسے اوصاف سے یاد کرتے ہیں جو صرف اپنے انبیاء کے حق میں ہی کہنے کے عادی ہیں۔

۵) واقعات تاریخی نے یہ ثابت کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق خورس ہی نے یہودیوں کو بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور بیت المقدس دوبارہ آباد کیا۔

۶) یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں اس کو اتر سے آنا بتایا گیا ہے خورس بابل سے اتر (شمال) ہی کی جانب (فارس و میڈیا) سے آیا تھا اس لیے وہی اس پیشین گوئی کا مصداق ہے۔

۷) زکریا نبی کی پیشین گوئی میں اس کو ''اگنے والی شاخ'' بتایا گیا ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ اس کی نمود اور اس کا ظہور غیر معمولی صورت حالات میں ہوگا جیسا کہ عموماً ایسی شخصیتوں کے متعلق خدائے تعالیٰ کی جانب سے ہوتا رہا ہے کہ جن سے اس کو کوئی خاص کام لینا ہوتا ہے۔

خورس اور تاریخی شواہد

ان اجزاء پر بحث کرنے سے قبل چند تاریخی شواہد بھی پیش نظر رکھنے ضروری ہیں جن کا اس معاملہ سے خاص تعلق ہے۔

محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین عہدوں میں تقسیم کیا ہے ایک حملہ اسکندر سے پہلے کا عہد دوسرا طوائف الملوکی کا عہد اور تیسرا ساسانی سلاطین کا عہد اور یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان تینوں عہدوں میں سے فارس کی عظمت اور اس کے عروج کا عہد خورس (سائرس) کے عہد حکومت سے شروع ہوتا ہے اور اس عہد کے حالات فارس کے رقیب یونان کے مؤرخین کے ذریعہ سے ہی روشنی میں آسکے ہیں جن میں سے بعض سائرس کے معاصر بھی ہیں اس بادشاہ کو یہودی خورس، یونانی سائرس فارسی گورش اور کے ارش اور عرب کی خسرو کہتے ہیں۔

عرب مؤرخین کے یہاں بھی حکومت فارس کے یہ تین عہد جدا جدا نظر آتے ہیں چنانچہ ابن کثیر نے اپنی

تاریخ میں ان تینوں عہدوں کے متعلق جو اشارات کئے ہیں وہ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں کیونکہ وہ طواف الملوک سے قبل کے حالات میں کسریٰ فارس کے درباری عظمت و شوکت کا جس طرح ذکر کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاشبہ یہ دور حکومت فارس کے عروج و عظمت کا دور تھا وہ فرماتے ہیں کہ طوائف الملوک کا وسطی عہد فارس کیلئے بہت خراب اور زوال کا عہد تھا۔

لیکن اردشیر بن بابک ساسانی نے اس کو ختم کر کے فارس کو اسی عروج پر دوبارہ پہنچادیا جس عروج پر پہلے عہد (عہد خورس) میں تھا۔

فاستمر الامر كذالك قريباً من خمس مائة سنة حتى كان ارد شير بن بابك من بني ساسان فاعاد ملكهم الى ما كان عليه و رجعت الممالك برمتها اليه۔

(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۸۴۔ ۱۸۳)

اور ملوک الطّوائف کا یہ عہد تقریباً پانچ سو سال تک رہا تا آنکہ اردشیر بن بابک ساسانی نے ظہور کیا تب اس نے کھوئے ہوئے ملکوں کو واپس لیا اور پہلے عہد کی حالت پید کردی اور تمام تقسیم شدہ حصۂ ملک پھر ایک مستقل حکومت کا جز ہو گئے۔

اسی طرح ابن عبد البر نے "القصد والامم" میں ان ہر سہ عہدوں کا ذکر کرتے ہوئے افریدون اور منوچہر کے تذکرہ میں یہ فرمایا ہے:

وهذه الطبقة الا ولى الى ان غلب الاسكندر دارا ورتب ملوك الطوائف ثم ملكت الا كاسرة اولهم ارد شير بن بابك۔ (ص ۳۱)

فارس کے بادشاہوں کا یہ پہلا طبقہ ہے جو دارا پر سکندر کے حملہ تک شمار ہوتا ہے درمیان میں ملوک الطّوائف کا دور رہا اور اس کے بعد شاہان کسریٰ کا زمانہ ہے جو اردشیر سے شروع ہوتا ہے۔

۶۲۲ء ق م بابل و نینویٰ کی حکومتیں بہت عروج واقبال پر تھیں اور خورس سے قبل اسی دور میں ایران کی حکومت دو جدا جدا حصوں پر تقسیم تھی۔ شمال مغربی حصہ کو میڈیا (ماہات) کہتے تھے اور مغربی حصہ کو فارس اور دونوں حصوں میں قبائلی سردار حکومت کرتے تھے اور یہ قبائلی حکومتیں ان کے زیر اثر اور تابع تھیں لیکن ۶۱۲ ق م جب نینویٰ کی آشوری حکومت تباہ ہو گئی تو اگرچہ میڈیا آزاد ہو گیا اور قبائلی حکومت کی جگہ آہستہ آہستہ شاہی حکمرانی کی داغ بیل پڑنے لگی تھی تاہم بابل کے بادشاہ بخت نصر کے قاہرانہ اقتدار کے سامنے ایران کے ابھرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا مگر ان ہی حالات کے اندر ۵۵۹ ق م میں قدرت نے ایکے می نیز یا ہخامش خاندان کی ایک غیر معمولی ہستی کو نمایاں کیا کہ جو ابتداء میں اگرچہ ایک چھوٹی سی ریاست الشان کا رئیس تھا مگر ۵۵۹ ق م حیرت زا طور پر اس کے عدل و انصاف سیاست و تدبر خدارسی و حلم نے فارس اور ماہات دونوں حکومتوں کو بغیر جنگ و جدل کے اس کے قبضہ میں دیدیا اور دونوں حکومتوں کے قبائلی حکمرانوں نے برضاء و رغبت اس کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا یہی وہ ہستی ہے جس کو اہل فارس گورش یا کے ارش اور یہود خورس کہتے ہیں۔

مغربی مہم

خورس نے جب فارس اور میڈیا کی حکومتوں کو متحد کر کے جرماں روانی کا اعلان کیا تو اس سے قریب ہی زمانہ میں اس کو ایک ''مغربی مہم'' پیش آئی اور اس وجہ سے پیش آئی کہ خورس سے بہت پہلے میڈیا اور ایران کے مغرب میں واقع حکومت لیڈیا ایشیاء کوچک کے درمیان رقیبانہ جنگ رہتی تھی مگر خورس کے معاصر لیڈیا کے بادشاہ کرڈیس کے باپ نے خورس (گورش) کے نانا اسٹیاگس کے باپ سے صلح کر لی تھی اور باہم ازدواجی رشتہ قائم کر کے مستقل طور سے جنگ کا خاتمہ کر دیا تھا لیکن اب جب کہ خورس نے فارس اور میڈیا دونوں کو متحد کر کے ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی تو ایشیاء کوچک کا بادشاہ کرڈیس اس کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے باپ کے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان کو توڑ کر میڈیا پر حملہ کر دیا تب گورش بھی مجبوراً اپنے دارالحکومت ہمدان سے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور وہ ہی جنگوں کے بعد تمام ایشیاء کوچک پر قبضہ کر لیا چنانچہ مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ گورش کی یہ مہم ایسی عجیب اور معجزانہ تھی کہ پٹیریا کے معرکہ سے صرف چودہ دن کے اندر اس نے لیڈیا کے مستحکم اور مضبوط دارالحکومت کو مسخر کر لیا اور کرڈیس قید ہو کر مجرم کی حیثیت میں اس کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ اب اگرچہ بحر اسود تک تمام ایشیاء کوچک اس کے زیر نگیں تھا مگر پھر بھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ مغربی ساحل پر جا پہنچا یعنی دارالحکومت سے چودہ سو میل فاصلہ طے کر کے مغربی جانب جا کھڑا ہوا۔

اہل جغرافیہ کہتے ہیں کہ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور ایشیاء کوچک کے مغربی ساحل کی حالت یہ ہے کہ یہاں سمرنا کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیرے نکل آنے کی وجہ سے تمام ساحل جھیل کی طرح بن گیا ہے اور بحر ایجین کے اس ساحل کا پانی خلیج کی وجہ سے بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت سورج غروب ہوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ خورس نے اگرچہ ''ایشیاء کوچک'' کو مردانہ وار فتح کر لیا لیکن وقت کے دوسرے بادشاہوں کی طرح اس نے ممالک مفتوحہ پر ظلم روا نہیں رکھا اور نہ ان کو وطن سے بے وطن کیا حتیٰ کہ سارڈیس کی پبلک کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ یہاں کوئی انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ انقلاب ہوا مگر فقط شخصیت کا یعنی ان کو کرڈیس کی جگہ خورس جیسا عادل بادشاہ مل گیا چنانچہ ہیروڈوٹس لکھتا ہے:۔

> سائرس (خورس) نے اپنی فوج کو حکم دیدیا کہ دشمن کی فوج کے سوا اور کسی انسان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور دشمن کی فوج میں سے جو کوئی نیزہ جھکادے اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے ور کرڈیس اگر تلوار چلائے تب بھی اس کو کرئیو گزند نہ پہنچائی جائے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون ''سائرس'')

نیز حکومت کے متعلق اس کا عقیدہ وہی تھا جو ایک صالح اور نیک بادشاہ کا ہونا چاہیے چنانچہ یونانی مؤرخ کی سیاز لکھتا ہے:

> اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ رفاہ عالم کے کاموں میں صرف کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون ''سائرس'')

مشرقی مہم

یہی مؤرخ ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ گورش نے ابھی بابل کو فتح نہیں کیا تھا کہ اس کو ایران کے مشرق میں ایک اہم معرکہ آرائی پیش آئی کیونکہ مشرق بعید کے بعض وحشی اور صحرا نشین قبائل نے سرکشی اور بغاوت کی تھی اور یہ باختر (بکٹیریا) کے قبائل تھے اور بعض تاریخی حوالجات سے یہ تصریح بھی ملتی ہے جس مقام کو آج کل مکران کہتے ہیں اس جگہ کے خانہ بدوش قبائل نے یہ سرکشی کی تھی یہ مقام بلاشبہ ایران کے لیے مشرق بعید کا حکم رکھتا ہے اسلئے کہ اس کے بعد پہاڑ ہیں جنھوں نے آگے بڑھنے کے لیے راہ روک دی ہے۔

تیسری (شمالی) مہم

بابل کی فتح کے علاوہ تاریخ گورش کی ایک اور مہم کا ذکر کرتی ہے اور یہ ایران سے شمال کی جانب پیش آئی اس مہم میں وہ بحر کاسپین (خزر) کو داہنی جانب چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک پہنچا ہے ان ہی پہاڑوں میں اس کو ایک درہ ملا ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان پھاٹک کی طرح نظر آتا ہے اس مقام پر جب وہ پہنچا ہے تو ایک قوم نے اس سے یاجوج و ماجوج قبائل کے تاراج کی شکایت کی ہے کہ وہ اس درہ میں سے نکل کر حملہ آور ہوتے اور تاخت و تاراج کر کے ہم کو برباد و تباہ کر ڈالتے ہیں چنانچہ اس نے لوہا اور تانبا استعمال کر کے اس پھاٹک کو بند کر دیا اور دھات کی ایک سد قائم کر دی جس کے آثار و نشان اس وقت بھی موجود ہیں چنانچہ ہیروڈوٹس اور زنیوفن دونوں یونانی مؤرخ تصریح کرتے ہیں کہ گورش نے فتح لیڈیا کے بعد سیتھین قوم کے سرحدی حملوں کی روک تھام کے لیے خاص انتظامات کیے۔

اور یہ حقیقت عنقریب واضح ہو جائے گی کہ گورش کے زمانہ میں یاجوج و ماجوج قبائل میں سے یہی سیتھین تھے جو حملہ آور ہو کر قریب کی آبادیوں کو تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے۔

فتح بابل

اب جب کہ گورش یا خورس کی فتوحات اس درجہ وسیع ہو چکی تھیں کہ ایران کے مغرب اقصیٰ میں وہ بحر شمال سے لے کر بحیرۂ اسود (بحر الجین) کے آخری ساحل تک قابض تھا اور مشرق اقصیٰ میں مکران کے پہاڑوں تک بلکہ دارا کے رقبۂ حکومت کی تفاصیل کو مستند مان لیا جائے تو دریاء سندھ تک فتح کر چکا تھا۔[۱] اور شمال میں کاکیشیا کے پہاڑی سلسلہ تک حکمراں تھا تو اس کو عراق کی مشہور اور متمدن مگر قاہر و جابر حکومت بابل کی جانب متوجہ ہونا پڑا چنانچہ اس کی تفصیل بھی تاریخ ہی کی زبانی سنیے۔

خورس سے تقریباً پچاس برس پہلے بابل کی حکومت پر بنوکدنذر (بخت نصر) نظر آتا ہے اور اس زمانہ کے ضمنی عقائد کے مطابق وہ نہ صرف بادشاہ تھا بلکہ بابلی اصنام میں سے سب سے بڑے صنم کا مظہر اور دیوتا بھی سمجھا جاتا تھا اور اس لیے اس کا حق تھا کہ وہ جس حکومت کو چاہے اپنے قہر و غضب کا شکار بنا کر اس کے باشندوں کو ہولناک اور سخت عذاب میں مبتلا کرے ان کو ہلاک کرے یا غلام بنا کر ان پر وحشیانہ مظالم کو روا رکھے اس لیے اس

۱: دائرۃ المعارف بستانی ج ۴ (ایران)

بادشاہ کے مظالم بے پناہ اور اس کے تسخیر ممالک کا طریقہ سخت وحشیانہ تھا جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان ہو چکا ہے اس نے اپنے دور حکومت میں یروشلم (بیت المقدس) پر تین مرتبہ حملے کیے اور فلسطین تباہ و برباد کر کے تمام باشندوں کو مویشیوں کی طرح ہنکا کر بابل لے گیا ایک یہودی مؤرخ جوزیفس کہتا ہے کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خونخواری کے ساتھ بھیڑوں کو مذبح میں نہیں لے جاتا جس طرح بنوکدنذر بنی اسرائیل کو بابل میں ہنکا کر لے گیا۔ (دائرۃ المعارف للبستانی (بابل))

بابل کی حکومت اشوری حکومت کی تباہی کے بعد اور بھی زیادہ مضبوط اور قاہر سلطنت ہو گئی تھی اور اس زمانہ میں قرب و جوار کی طاقتوں میں کسی کو بھی یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اس جابر حکومت کے قہر و ظلم کا استیصال کر سکیں لیکن فتح بیت المقدس کے کچھ عرصہ بعد بخت نصر مر گیا اور اس کا جانشین نایونی دس مقرر ہوا مگر اس نے حکومت کا تمام بار شاہی خاندان کے ایک شخص بیل شازار پر ڈال دیا یہ شخص اگرچہ بہت عیاش اور ظالم تھا مگر بخت نصر کی طرح بہادر اور جری نہیں تھا اس کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے قیدیوں میں سے حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنی حکیمانہ فراست سے بابلی دربار کو اس درجہ مسخر کر لیا تھا کہ وہ حکومت کے مشیر خاص سمجھے جاتے تھے حضرت دانیال نے بیل شازار کو بار بار اس کے مظالم اور عیاشیانہ زندگی کے خلاف تہدید و تنبیہ کی مگر اس نے کچھ شنوائی نہیں کی حتی کہ انھوں نے حکومت کے معاملات سے کنارہ کشی کر لی۔

توراۃ کے بیان کے مطابق اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بیل شازار نے اپنی ملکہ کے اکسانے پر ایک شب یہ حکم دیا کہ یروشلم سے جو ہیکل کے مقدس ظروف بنوکدزار لوٹ کر لایا تھا وہ لائے جائیں اور ان میں شراب پلائی جائے یہ جشن ہو ہی رہا تھا کہ کسی غیبی ہاتھ نے بادشاہ کے سامنے دیوار پر ایک نوشتہ لکھ دیا توراۃ میں ہے:

> اسی گھڑی میں کسی آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں ظاہر ہوئیں اور انھوں نے شمعدان کے مقابل بادشاہی محل کی دیوار کے گچ پر لکھا اور بادشاہ نے ہاتھ کا وہ سرا جو لکھا تھا دیکھا تب بادشاہ کا چہرہ متغیر ہوا اور اس کے اندیشوں نے اسے گھبرا دیا . . . اور نوشہ جو لکھا گیا سو یہ ہے "منے منے تقیل اوفیر سین"۔ (دانیال کا صحیفہ باب ۵ ب آیات ۲۵-۵)

تب شاہ نے گھبرا کر نجومیوں اور فال گیروں کو بلایا مگر کوئی اس کا مطلب نہ بتا سکا آخر ملکہ کے مشورہ سے دانیال کو بلایا انھوں نے اول اس کے مظالم اور اس کی عیاشی کے خلاف پند و نصیحت فرمائی پھر بتایا کہ تو نے چونکہ بیت المقدس کے ظروف کی توہین کر کے اس ظلم کی تکمیل کر دی اس لیے نوشتہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اسے تمام کر ڈالا تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا تیری مملکت پارہ پارہ ہوئی اور مادیوں اور فارسیوں کو دیدی گئی۔[1]

ادھر یہ واقعہ پیش آیا کہ اہل بابل عرصہ سے بیل شازار کے مظالم سے چھٹکارا پانے کی تجویزیں سوچ رہے تھے کہ ان کے بعض سرداروں نے مشورہ کیا کہ قریب کی زبردست طاقت ایران سے مدد حاصل کی جائے اور

۱: اس مقام پر توارۃ نے دارا کو فاتح بابل کہا ہے یہ سخت التباس ہے جو توراۃ کے بیان میں پیدا ہو گیا ہے اور جگہ جگہ خورس کی جگہ دارا اور دارا کی جگہ خورس کا ذکر کر کے معاملہ کو خلط ملط کر دیا ہے دراصل بابل کو پہلے خورس ہی نے فتح کیا ہے اس کے بعد جب اہل بابل نے بغاوت کر دی تو دارا نے دوبارہ حملہ کر کے اس بغاوت کو فرو کیا۔

اس کے عادل فرماں رواسے یہ عرض کیا جائے کہ وہ ہم کو بیل شازار کے مظالم سے نجات دلائے اور اس کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ اہل بابل ہر طرح اس کی مدد کرنے کو آمادہ ہیں چنانچہ ۵۴۰ ق م بابلی سرداروں کا ایک وفد خورس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ وہ اپنی مشرقی مہم میں مصروف تھا خورس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اطمینان دلایا کہ وہ اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر ضرور بابل پر حملہ کرے گا اور ان کو بیل شازار جیسے ظالم و عیاش بادشاہ سے نجات دلائیگا۔

خورس جب اپنی مہم سے فارغ ہو گیا تو حسب وعدہ اس نے بابل پر حملہ کر دیا۔

تمام مؤرخین باتفاق رائے کہتے ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ ناقابل تسخیر کوئی مقام نہیں تھا اس لیے کہ اس کی شہر پناہ اس درجہ تہ در تہ موٹی اور مستحکم تھی کہ کوئی فاتح اس کی تسخیر کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن خورس کی عدل گستری اور رحم کے حالات دیکھ کر بابل کی رعایا خود اس درجہ اس کی گرویدہ تھی کہ حکومت بابل کا ایک گورنر گوب ریاس کو داس کے ہمراہ تھا اور بقول ہیروڈوٹس اس ہی نے خورس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی شہر فتح ہو گیا اور بیل شازار مارا گیا۔[1]

خورس کا مذہب

خورس کے مذہب کے متعلق توراۃ اور تاریخ دونوں متفق ہیں کہ جس طرح اس نے ایران کے منقسم حصوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو متحد کر کے ایک بڑی شاہنشاہیت قائم کی اور دوسروں کی سطوت و حکومت کے تابع ہونے کی بجائے بابل و نینوی کی زبردست طاقتوں کو اپنا تابع فرمان بنایا اور جس طرح وقت کے جابر و قاہر شاہنشاہوں کے برعکس اس نے عدل و رحم پر اپنی حکومت کو مستحکم اور استوار کیا اسی طرح وہ دین و مذہب کے بارے میں بھی ایران کے مروجہ مذہب کے خلاف دین حق کا تابع اور ایمان باللہ اور توحید الٰہی کا داعی تھا۔

چنانچہ عزرا (عزیرؑ) کی کتاب میں تعمیر بیت المقدس سے متعلق اس کا یہ واضح اور صاف اعلان مذکور ہے:

> اور شاہ فارس خورس کی سلطنت کے پہلے برس میں اس خاطر کہ خداوند کا کلام جو یرمیاہ کے منہ سے نکلا تھا پورا ہو اخداوند نے شاہ فارس خورس کا دل ابھارا کہ اس نے اپنی تمام مملکت میں یہ منادی کرائی کہ اور اسے قلم بند بھی کرایا فرمایا شاہ فارسؔ خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند آسمان کے خدانے زمین کی ساری مملکتیں مجھے بخشیں اور مجھے حکم کیا ہے کہ یروشلم کے بیچ جو یہوداہ میں ہے اس کے لیے ایک مسکن بناؤں پس اس کی قوم میں سے تمہارے درمیان کون کون ہے؟ اس کا خدا اس کے ساتھ ہو اور وہ یروشلم کو جو شہر یہوداہ ہے جائے اور خداوند اسرائیل کے خدا کا گھر بنائے کہ وہی خدا ہے جو یروشلم میں ہے۔ (باب آیات ۴-۱)
>
> مجھ خورس بادشاہ نے خدا کے گھر کی بابت جو یروشلم میں ہے حکم کیا کہ وہ گھر اور وہ مکان جہاں

---

[1] اس مقام پر توارۃ نے دارا کو فاتح بابل کہا ہے یہ سخت التباس ہے جو توراۃ کے بیان میں پیدا ہو گیا ہے اور جگہ جگہ خورس کی جگہ دارا اور دارا کی جگہ خورس کا ذکر کر کے معاملہ کو خلط ملط کر دیا ہے دراصل بابل کو پہلے خورس ہی نے فتح کیا ہے اس کے بعد جب اہل بابل نے بغاوت کر دی تو دارا نے دوبارہ حملہ کر کے اس بغاوت کو فرو کیا۔

قربانیاں کرتے ہیں بنایا جائے اور خدا کے گھر کے سنہرے اور روپہلے برتن بھی جنھیں بنوکد نذر یروشلم کی ہیکل میں سے نکال لایا اور یروشلم کی ہیکل میں اپنی اپنی جگہ میں پہنچائے جائیں اور خدا کے گھر میں رکھے جائیں۔ (باب ۶ آیات ۵-۱)

خورس کی منادی اور نوشتہ کے نشان زدہ جملوں کو پڑھیے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ان مضامین میں صرف یہ اعلان نہیں ہے کہ یہود کو نجات دلا کر بیت المقدس کی تعمیر کی بھی اجازت دی جاتی ہے بلکہ اس سے زیادہ یہ بھی ہے کہ مجھ کو خدا نے یہ حکم کیا ہے کہ میں اس کا گھر دوبارہ تعمیر کروں اور یہ کہ خدا اسی ہستی کا نام ہے جو یروشلم کا خدا ہے اور بیت المقدس خدا کا مقدس گھر ہے۔

اب اسی کے ساتھ اس کے جانشین دارائے اول کا وہ فرمان بھی ملاحظہ ہو جو "جو یہودیوں کی اس عرضی کے جواب میں دیا گیا ہے جس میں بعض صوبہ داروں کی شکایت کی کہ وہ بیت المقدس کی تعمیر میں آڑے آتے ہیں" دارا لکھتا ہے:

"پس نہرپار کے صوبہ دار تتنی اور شتربوزنی اور ان کے افارسکی رفیق جو نہرپار ہوں۔ تم وہاں سے دور ہو جاؤ تم اس بیت اللہ کے کام میں دست اندازی مت کرو یہودیوں کا ناظم اور یہودیوں کے بزرگ لوگ خدا کے گھر کو اس کی جگہ تعمیر کریں......... پر ہو خدا جس نے اپنا نام وہاں رکھا ہے سب بادشاہوں اور لوگوں کو جو اس حکم کو بدل کے خدا کا وہ گھر جو یروشلم میں ہے بگاڑنے کو ہاتھ بڑھاتے ہوں غارت کرے۔ میں دارا حکم دے چکا اس پر جلد عمل کرنا چاہیے"۔ (عزرا باب ۶)

اس فرمان دارا نے بلند آہنگی کے ساتھ یہ ظاہر کیا ہے کہ بیت المقدس بلا شبہ بیت اللہ ہے اور وہ بددعا کرتا ہے کہ بادشاہ ہو یا معمولی شخص جو بھی اس بیت اللہ کو خراب کرنے کا ارادہ کرے خدا اس کو غارت کر دے۔

توراۃ کی ان صاف اور واضح شہادتوں کے بعد "جو خورس کا مسلمان ہونا ظاہر کرتی ہیں" اب چند تاریخی شہادتیں بھی قابل مطالعہ ہیں:

دارا نے اپنے زمانۂ حکومت میں ایک اہم تاریخی کام یہ کیا ہے کہ پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں پر کتبے نقش کر دیے ہیں جو اس کے اور خورس کے عہد زریں کو روشنی میں لاتے ہیں ان مختلف کتبات میں سے ایک کتبہ ایران کے مشہور شہر اصطخر میں دریافت ہوا ہے، یہ کتبہ قدیم تاریخ کا نادر ذخیرہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس میں دارا نے اپنے تمام مفتوحہ ممالک اور صوبوں کے نام تک گنا دیے ہیں اور ایسی تفصیلات دی ہیں جن سے ان کے مذہب و عقیدہ اور طریق حکومت تک پر روشنی پڑتی ہے چنانچہ اسی کتبہ میں دارا کا یہ عقیدہ مذکور ہے:

"خدائے برتر اہورموزدہ ہے اسی نے زمین پیدا کی اسی نے آسمان بنایا اسی نے انسان کی سعادت بنائی اور وہی ہے جس نے دارا کو بہتوں کا تنہا حکمراں اور آئین ساز بنایا۔"

"اہورموزدہ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے بادشاہت دی اور اسی کے فضل سے میں نے زمین میں امن و اماں قائم کیا میں اہورموزدہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے میرے خاندان کو اور ان تمام ملکوں کو محفوظ رکھے اے اہورموزدہ میری دعا قبول کر!"

"اے انسان! اور موزدہ کا تیرے لیئے حکم ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر، صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑ گناہ

سے بچتا رہ“۔ (ترجمان القرآن ماخوذ از مجار البتن سن ”فالو گریٹ منار یز آف دی انشینٹ ایسٹرن)

دارا کے کتبات میں اصطخر کے کتبہ سے بھی زیادہ اہمیت اس کے کتبہ بے ستون کو حاصل ہے اس میں اس کے گوماتہ مجوسی کی بغاوت اور اپنے سر پر آرائے سلطنت ہونے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

دارا نے اس کتبہ میں گوماتہ کو موگوش (مجوسی) اور اس کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہونے کو اہورموزدہ کے فضل کی جانب منسوب کیا ہے اور ہیروڈوٹس اور دوسرے یونانی مؤرخ یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ دارا کے خلاف یہ بغاوت میڈیا (ایران) کے قدیم مذہب کے پیرووں (مجوسیوں) کی جانب سے ہوئی تھی دارا کے زمانہ میں گوماتہ کے علاوہ پرا ور تیش اور چترت خمہ اور مجوسیوں (موگوشوں) نے علم بغاوت بلند کیا اور دارا کے ہاتھ سے پہلا ہمدان میں اور دوسرا اردبیل میں قتل ہوا۔ (دائرۃ المعارف بستانی (ایران))

پھر خورس اور دارا کے ”مومن“ ہونے اور ایران کے قدیم مذہب ”مجوسی“ سے بیزار رہنے پر سب سے بڑی شہادت دارا کا وہ تبلیغی اعلان ہے جو اس نے دانیالؑ کے دشمنوں کے خلاف اس وقت شائع کیا تھا جب کہ دانیال نبی کو ان کے دشمنوں نے شیر ببر کے سامنے ڈال دیا تھا اور دانیال معجزانہ طور پر صحیح و سالم بچ گئے تھے:

تب دارا بادشاہ نے ساری قوموں اور گروہوں اور اہل لغت کو جو روئے زمین پر بستے تھے نامہ لکھا تمہاری سلامتی ترقی پائے میں یہ حکم کرتا ہوں کہ میری مملکت کے ہر ایک صوبے کے لوگ دانی ایل کے خدا کے آگے ترساں لرزاں ہوں کیونکہ یہ وہی زندہ خدا ہے جو ہمیشہ قائم ہے اور اس کی سلطنت لازوال ہے اور آخر تک رہے گی وہی چھڑاتا اور بچاتا ہے اور آسمان اور زمین میں وہی نشانیاں دکھلاتا اور عجائب و غرائب کرتا ہے اسی نے دانی ایل شیر ببروں کے چنگل سے چھڑایا ہے پس یہ دانی ایل دارا کی سلطنت اور خورس فارسی کی سلطنت میں کامیاب رہا“۔

(دانیال کی کتاب باب ۶ آیات ۲۶-۲۵)

ان تاریخی مصادر سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دارا اور اس کے پیشرو خورس کا مذہب ایران کے قدیم مذہب ”موگوش“[1] (مجوسی مذہب) سے جدا اور مخالف تھا اور یہ کہ دارا جس ہستی کو اہورموزدہ کہہ کر پکارتا ہے اور اس کے جو اوصاف بیان کرتا ہے اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور اس کا پیشرو ”دین حق“ پر تھے اور عربی کا ”ایل“ اور ایران کا ”اہورموزدہ“ ایک ہی مقدس ہستی کے نام ہیں کیونکہ دارا کہتا ہے کہ وہی یکتا اور بے ہمتا ہے اور وہی خالق کائنات ہے اور خیر و شر تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے نیز وہ توحید خالص پر ایمان کیساتھ ساتھ آخرت پر ایمان رکھتا اور صراط مستقیم کی تلقین اور گناہوں سے اجتناب کی تعلیم کا اظہار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ عقائد کی یہ تفصیلات مجوسی مذہب کے بالکل خلاف ہیں اور اسی لیے دارا مجوسیوں پر کامیابی حاصل کرنے کو اہورموزدہ کا فضل و کرم قرار دیتا ہے۔

رہا یہ امر کہ خورس اور دارا وقت کے کس مذہب حق کے پیرو تھے تو اس کا جواب مختصر سی تمہید کے بعد بآسانی دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] موگوش فارسی لفظ ہے اور مجوش اس کا معرب ہے۔

ایران قدیم کا مذہب

ادیان و مذاہب کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کی آرین قوموں کا مذہبی تخیل بنیادی طور پر ہمیشہ سے مشترک رہا ہے اور یہ سب مظاہر قدرت کے پرستار اور اصنام پرستی کے ذریعہ اس عقیدہ کے علم بردار نظر آتے ہیں پھر آہستہ آہستہ آسمان پر سورج کو اور زمین پر آگ کو تقدیس کا درجہ دیا جاتا ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں یہی دونوں روشنی اور حرارت کے مبداء ہیں اور روشنی اور حرارت ہی عالم کے تمام نظام میں کارفرما ہیں چنانچہ قدیم یونان ہندوستان اور ایران وغیرہ کے مذاہب میں یہ چیز مشترک نظر آتی ہے البتہ جزئیات میں یہ فرق رہا ہے کہ مثلاً یونان اور ہندوستان کے ضمنی عقائد میں دیوتاؤں کو اچھائی اور برائی دونوں پر قدرت حاصل ہے لیکن ایران کے اصنامی عقائد کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ کائنات کا تمام نظام دو مخالف قوتوں کی کارفرمائی میں ہے ایک خیر اور نیکی کے دیوتا ہیں جو خیر اور تمام بھلائی کے مالک و متصرف ہیں اور دوسرے شر اور بدی کے دیوتا ہیں جن سے صرف بدی اور برائی کا دور ہوتا ہے یعنی خالق خیر ایک جدا قوت ہے اور خالق شر دوسری قوت اور تمام عالم پر ان ہی دو متضاد قوتوں کی حکومت ہے اور ان ہی کے تصادم پر نظام کائنات میں خیر و شر کا غلبہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ان کے یہاں خدائے واحد کا کوئی تصور ہی نہیں ہے چونکہ وہ خیر کو روشنی اور شر کو تاریکی خیال کرتے ہیں اس لیے آگ کو روشنی کا مبدأ قرار دے کر یزداں (خیر کا دیوتا) کی قربت حاصل کرنے کے لیے قابل پرستش سمجھا گیا اور آتش پرستی کو مذہب کا جزاعظم بنایا گیا۔ چنانچہ فارس اور میڈیا یعنی ایران کا یہی قدیم مذہب تھا جس کے پیرو موگوش (مجوس) کہے جاتے تھے۔

ایران اور مذہب زردشت

تقریباً ۶۶۰ ق م اور ۵۸۳ ق م کے درمیان شمال مغربی ایران یعنی قفقاز اور آذربیجان کے اس نواح میں جو وادی ارس کے نام سے مشہور ہے ایک ملہم من اللہ ہستی کا ظہور ہوا یہ ابراہیم زردشت کی شخصیت تھی انھوں نے ایران کے مجوسیوں میں دین الٰہی کا اعلان کیا اور رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا۔

انھوں نے بتایا کہ کائنات میں خیر و شر کے دیوتاؤں کا تصور باطل ہے بلکہ سارے عالم پر صرف ایک ہی ہستی بلاشرکت غیرے مالک اور متصرف ہے وہ یکتا اور بے ہمتا ہے قدیر و حلیم ہے، نور و قدوس ہے۔ اور یہ اہورموزدہ کی پاک ہستی ہے یہی تمام کائنات کی خالق ہے تم جن کو خیر کے دیوتا سمجھتے ہو وہ دیوتا نہیں بلکہ اہورموزدہ کی مخلوق اور اس کے حکم سے امور خیر کے کارپرداز امق اسپند (فرشتے) ہیں اور تم نے جن کو شر کا دیوتا سمجھ لیا ہے وہ سرتاسر باطل کے سوا کچھ نہیں بلکہ یہاں شر کا مرکز اسی اہورموزدہ کی مخلوق ''اہرمن'' (شیطان) کی ہستی ہے، یہی انسانوں کے دلوں میں شر کو بھڑکا کر تاریکی کی جانب لے جاتی ہے 'انسان'' ان دو متضاد اثرات میں گھرا ہوا ہے اور اہورموزدہ نے اس کو اپنے سچے نبیوں کے ذریعہ روشنی اور تاریکی دونوں کے اثرات سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے پس آگ کی پرستش محض گمراہی ہے اور انسانی شقاوت و سعادت کا معاملہ صرف اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس عالم کے علاوہ ایک دوسرا عالم (آخرت) ہے اور وہاں دو جدا جدا مقامات ایک نیکوکاروں کے لیے اور دوسرا بدکاروں کے لیے ہے اس لیے ہم کو گناہوں سے پرہیز کرنا اور نیکی

کو اختیار کرنا چاہیے اور اپنے اخلاق کو بہتر بنانا چاہیے۔

یہ تھی ابراہیم زردشت کی وہ تعلیم جس کے متعلق آج عرب اور یورپ کے محقق مورخین کا اتفاق ہے کہ اواخر چھٹی صدی المسیح میں یہ آواز ازردشت کی زبانی میڈیا اور فارس کے قدیم مذہب کے خلاف ایران میں سنی گئی۔ (حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸ و یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ مقالہ پروفیسر گرنڈی ج ۲ ص ۱۱۳)

یہی مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ ابراہیم زردشت دانیال اکبر یا یرمیاہ کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے اور ایران کے قدیم مذہب کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے گئے۔

ابراہیم زردشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ ان پر نازل شدہ الہامی کتاب اوستا کے مضامین کی ابتدا ایسے ہی جملوں سے ہوتی ہے جن کا مفہوم سچی الہامی کتابوں میں مشترک پایا جاتا ہے یعنی شیطانی وساوس سے پناہ اور خدائے رحمان ورحیم کی مدح و ثناء چنانچہ قرآن سے قبل کی الہامی کتابوں کی طرح اوستا بھی محرف ہو چکی ہے تاہم اس میں یہ جملے اب بھی محفوظ ہیں جن سے مضامین کی ابتداء ہوتی ہے اور دساتیر آسمانی میں ان کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

۱) ہوزامیم فہ مزدان ہزہر ماس ہر شیو ہر دیور پناہیم بہ یزداں (اہور موزدہ) از منش زشت وخوئے بد گمراہ کنندہ براہ ناخوب برندہ رنج دہندہ' آزار رسائندہ (یعنی شیطان)"

۲) ذیشد شمتای ہر شندہ ہر ششگر زمریان فراہیدور۔ "بنام ایزد بخشایندہ بخشائش گر مہربان دادگر"

اب اگر اسی کے ساتھ خورس (کیخسرو) اور دارایوش (دارا) کے ان بیانات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو توراۃ میں بیت المقدس کی تعمیر سے متعلق ہیں اور ان کتبات کی عبارت کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے جو دارا کی جانب سے منقوش کیے گئے ہیں اور جن میں مجوسی عقائد کے خلاف خدائے واحد کی حمد و ثنا بیان کی گئی ہے تو پھر یہ دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ خورس اس کے بیٹے کیقباد دوم[1] (کم بی سنز) اور دارا کا مذہب بلا شبہ ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف دین حق کا مذہب تھا اور جب کہ تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ابراہیم زردشت اور خورس (کے ارش) کا زمانہ ایک رہا ہے اور خورس اور دارا کے عقائد زردوشت کی تعلیم کے عین مطابق ہیں تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خورس پہلا بادشاہ ہے جس نے ایران کے قدیم مذہب (مجوسی مذہب) کے خلاف دین حق کو قبول کیا اور کچھ تعجب نہیں کہ یہود کو خورس کے ساتھ اس درجہ شغف کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ خورس ایسے مذہب کا پیرو تھا جو ان کے نبی دانیال اکبر یا یرمیاہ کے شاگرد اور فیض یافتہ ہادی (زردشت) کی جانب منسوب ہے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ زردشت کی تعلیم حق کو ایران زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکا اور دارا پر حملہ اسکندر کے بعد یعنی ایران کے پہلے عہد تاریخی کے ختم پر وہ بھی مسخ اور محرف کر دیا گیا چنانچہ مؤرخین کا بیان ہے کہ ۵۰۰ء ق م کے بعد زرردشتی مذہب کا انحطاط شروع ہو گیا اور ایک جانب روم و یونان کے خارجی اثرات نے اس کو متاثر کیا اور دوسری جانب ایران کے قدیم مذہب مجوس نے دوبارہ سر اٹھایا اور نتیجہ نکلا کہ دارا کے قتل کے بعد ہی اس کے اصل خدوخال بگڑنے لگے اور اس میں تحریف و مسخ کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ

[1]: کم بی سیز (کیقباد) خورس کے باپ کا نام بھی ہے اور بیٹے کا بھی۔

قدیم مجوسی مذہب کے امتزاج کے ساتھ اس نے ایک نئی شکل اختیار کر لی اور اب یہی مجوسی مذہب کے نام سے موسوم ہے۔

ایرانیوں (پارسیوں) کا اپنا بیان ہے کہ جب سکندر مقدونی نے اصطخر پر حملہ کیا تو اس نے شہر کو آگ لگا دی اور اس میں زردشت کا مقدس صحیفہ ''ادستا'' جل کر راکھ ہو گیا گویا بیت المقدس پر حملہ کے وقت جو معاملہ بخت نصر نے یہود کی مقدس کتاب توراۃ کے ساتھ کیا وہی سکندر نے اوستا کے ساتھ کیا اور اس طرح دونوں مذاہب کے مقدس صحیفے دنیا سے مفقود ہو گئے۔

پھر تقریباً پانچ سو سال کے بعد ایران کے تیسرے تاریخی عہد میں ساسانی حکومت کے بانی اردشیر بابکانی نے از سر نو اوستا کو مرتب کرایا پس ظاہر ہے کہ اب یہ صحیفہ اصل اوستا نہیں ہے بلکہ قدیم ایرانی مذہب یونانی مذہب اور زردشتی مذہب کا ایک معجون مرکب ہے بلکہ اس کے نمایاں عقائد و اعمال بیشتر قدیم مجوسیت ہی سے ماخوذ نظر آتے ہیں تاہم اس صحیفہ کا جو ناقص اور منحرف حصہ آج پارسیوں کے ہاتھ میں ہے اس میں اصل مذہب کی جھلک اب بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے جس کے بعض حوالجات ہم اصحاب الرس کے واقعہ میں نقل کر چکے ہیں۔

مسلمانوں نے جب خیر القرون میں ایران کو فتح کیا تو ان کو ان ہی پیرو ن زردشت سے واسطہ پڑا جو صحیح دین زردشتی چھوڑ کر قدیم مجوسی مذہب پر واپس ہو چکے تھے اور ان میں ایک نبی اور اس کی کتاب کے تصور کے علاوہ کوئی بات زردشتی مذہب کی باقی نہیں رہی تھی اور اسی بنا پر قرآن نے بھی ان کو مجوس ہی کہہ کر ذکر کیا ہے اس لیے متقدم عرب مؤرخین نے سمجھ لیا کہ مجوسی مذہب اور زردشتی مذہب ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس کے باوجود بعض متقدم محقق اور اصحاب سیرۃ اس قدر پتہ دے سکے ہیں کہ ایران میں دو مذاہب نے یکے بعد دیگرے اپنا اثر قائم کیا ہے۔[1] ایران اول صابی مذہب رکھتا تھا اور اس کے بعد اس نے زردشتی مذہب قبول کر لیا۔ لغت عرب میں صابی کے معنی بد دین کے ہیں چنانچہ قریش مکہ اسی بناء پر اپنے خیال میں مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے اس لیے صابی سے ان حضرات کی مراد غالباً اسی مذہب قدیم سے ہے جو آتش پرستی بت پرستی اور دیوتا پرستی پر قائم تھا۔

متاخرین علماء میں سے شاہ عبد القادر نور اللہ مرقدہ بھی تردد کے ساتھ ''المجوس'' کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں ''مجوس آگ پوجتے ہیں اور ایک نبی کا نام بھی لیتے ہیں معلوم نہیں پیچھے بگڑے یا سرے سے غلط ہیں مگر آج عرب اور یورپ کے محققین اہل تاریخ بغیر کسی تردد کے دلائل و براہین کی روشنی میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ زردشت کا مذہب ایران کے قدیم مذہب سے جدا دین حق تھا جس میں مظاہر پرستی، اصنام پرستی آتش پرستی سب ممنوع تھی اور خدائے واحد کی پرستش کے سوا کسی کی پرستش جائز نہیں تھی۔

چنانچہ مصر کے مشہور عالم فرج اللہ زکی نے اس قول کی پر زور تردید کی ہے[2] جس میں یہ کہا گیا ہے کہ زردشت نے اول یرمیاہ کی شاگردی کی مگر جب کسی بات پر یرمیاہ نبی اس سے خفا ہو گئے تو وہ ان سے جدا ہو گیا اور

ا: کیونکہ اس جدید مرکب مذہب میں بھی آتش پرستی مذہب کی بنیاد تھی اور اس کا پجاری اور مہنت اب بھی مع ہی کہلاتا تھا اور مع موگوش اور جوش ایک ہی شے ہے۔

۲: حاشیہ تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۴۸۔

آتش پرستی کا ایک نیا مذہب ایجاد کر لیا ابن کثیر نے بھی اس قول کو قیل کہہ کر نقل کیا ہے یعنی وہ بھی اس کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے۔

ذوالقرنین اور قرآن عزیز

ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں اگرچہ دو اہم مباحث یعنی "ذوالقرنین سے متعلق توراۃ کی پیشین گوئیاں اور تاریخی شہادتیں "سپرد قلم ہو چکیں لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ یہ باقی ہے کہ کیا وہ شخصیت جس کے لیے توراۃ اور تاریخ سے روایات و شہادات پیش کی گئی ہیں درحقیقت قرآن میں مذکور ذوالقرنین ہی کی شخصیت ہے تو اس کے جواب سے قبل قرآن عزیز کی ان آیات کو پیش کر دینا ضروری ہے جو سورۂ کہف میں اس واقعہ سے متعلق بیان کی گئی ہیں تاکہ بعد میں تطبیق کا مسئلہ بخوبی واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز (سورۂ کہف) میں ذوالقرنین کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:

وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ط قُلْ سَأَتْلُوْ عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ○ إِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ○ فَأَتْبَعَ سَبَبًا ○ حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ط قُلْنَا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّآ أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّآ أَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ○ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ إِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ○ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ الْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ○ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ○ حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ○ كَذٰلِكَ ط وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ○ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ○ حَتّٰى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ○ قَالُوْا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى أَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ○ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَأَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ○ آتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ حَتّٰى إِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰى إِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ آتُوْنِيْٓ أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ○ فَمَا اسْطَاعُوْٓا أَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ○ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ○ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ○

اے پیغمبر! تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سنادیتا ہوں ہم نے اسے زمین میں حکمرانی دی تھی نیز اس کیلئے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔ تو (دیکھو) اس نے (پہلے) ایک مہم کے لیے ساز و سامان کیا (اور پچھم کی طرف نکل کھڑا ہوا) یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہونچ گیا وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل کی جھیل میں ڈوب جاتا ہے اور اس کے قریب ایک گروہ کو بھی آباد پایا ہم نے کہا اے ذوالقرنین (اب یہ لوگ تیرے اختیار میں ہیں) تو چاہے انھیں عذاب میں ڈالے چاہے اچھا سلوک کرے اپنا بنالے۔ ذوالقرنین نے کہا" ہم ناانصافی کرنے والے نہیں جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزادیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلے اسے بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کیلئے راحت و آسانی ہو" اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور (پورب) کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا سورج ایک گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔ معاملہ یونہی تھا اور جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اس کی ہمیں پوری خبر ہے اس نے پھر ساز و سامان تیار کیا اور تیسری مہم میں نکلا یہاں تک کہ (دو پہاڑوں کی) دیواروں کے درمیان پہنچ گیا وہاں اس نے دیکھا پہاڑوں کے اس طرف ایک قوم آباد ہے جس سے بات کہی جائے تو کچھ نہیں سمجھتی۔ اس قوم نے بھی (اپنی زبان میں) کہا اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج اس ملک میں آکر لوٹ مار کرتے ہیں کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنادیں اور اس غرض سے ہم آپ کے لیے کچھ خراج مقرر کر دیں ذوالقرنین نے کہا میرے پروردگار نے کچھ میرے قبضہ میں دے رکھا ہے وہی میرے لیے بہتر ہے (تمہارے خراج کا محتاج نہیں) مگر تم اپنی قوت سے (اس کام میں) میری مدد کرو میں تمہارے اور یاجوج و ماجوج کے درمیان ایک مضبوط دیوار کھڑی کر دوں گا (اس کے بعد اس نے حکم دیا لوہے کی سلیں میرے لیے مہیا کر دو پھر جب (تمام سامان مہیا ہو گیا اور دونوں پہاڑوں کے درمیان دیوار اٹھا کر ان کے برابر بلند کر دی تو حکم دیا (بھٹیاں سلگاؤ اور) اسے دھونکو پھر جب (اس قدر دھونکا گیا کہ) بالکل آگ کی طرح لال ہو گئی نہ تو (یاجوج وماجوج) اس پر چڑھ سکتے تھے نہ اس میں سرنگ لگا سکتے تھے ذوالقرنین نے (تکمیل کار کے بعد) کہا یہ جو کچھ ہوا تو (فی الحقیقت) میرے پروردگار کی مہربانی ہے جب میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات ظہور میں آئے گی تو وہ اسے ڈھا کر ریزہ ریزہ کر دیگا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے ٹلنے والی نہیں، اور اس دن ہم ایسا کریں گے کہ ان میں سے ایک قوم دوسری قوم پر موجوں کی طرح آپڑیں گی اور پھونکا جائے نرسنگھا (صور) پس اکٹھا کریں گے ہم ان کو۔ (سورہ کہف پ ۱۶ ع ۱۱)

قرآن عزیز کی ان آیات میں ذوالقرنین کا جو واقعہ مذکور ہے اگر اس کو ان واقعات کے ساتھ تطبیق دیجئے جو گذشتہ صفحات میں توراۃ اور تاریخ قدیم کے حوالجات سے نقل کیے گئے ہیں تو آپ خود یہ فیصلہ دیں گے کہ تاویلات تخمینی قیاس آرائیوں اور غیر معلوم احتمالات سے محفوظ رہ کر ذوالقرنین کا اطلاق خورس کے سوا اور کسی شخصیت پر نہیں ہوتا۔

مگر اس فیصلہ کی حقیقت پر عبور حاصل کرنے کیلئے از بس ضروری ہے کہ سورۂ کہف کی زیر مطالعہ آیات کے مطالب کا تجزیہ کر کے ان کے ساتھ خورس سے متعلق تاریخی واقعات کی مطابقت کو واضح اور روشن کر

دیا جائے۔

پس ذوالقرنین کے متعلق قرآن عزیز نے کن حقائق کا اظہار کیا ہے اور خورس سے متعلق واقعات کس طرح ان حقایق کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں سطور ذیل میں ترتیب وار قابل مطالعہ ہیں:

۱) قرآن عزیز کا اسلوب بیان کہتا ہے کہ اس نے ذوالقرنین کا واقعہ دوسروں کے سوال کرنے پر بیان کیا ہے اور سوال کرنے والوں نے اسی لقب کے ساتھ اس کو یاد کیا ہے قرآن نے اپنی جانب سے یہ لقب تجویز نہیں کیا:

وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوْ عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ○

(اے پیغمبر!) تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو! میں اس کا کچھ حال تمہیں (کلام الٰہی میں) پڑھ کر سناتا ہوں۔"

تطبیق۔ ۱

۲) صحیح روایات سے یہ ثابت ہو چکا کہ یہ سوال یہودیوں کی تلقین سے قریش مکہ نے کیا تھا اور سوال میں یہ مذکور تھا کہ ایسے بادشاہ کا حال بتاؤ جو مشرق و مغرب میں پھر گیا اور جس کو توراۃ میں صرف ایک جگہ اس لقب سے یاد کیا گیا ہے اور توراۃ یہ کہتی ہے کہ دانیالؑ کے مکاشفہ میں ایران کے ایک بادشاہ کو ایسے مینڈھے کی شکل میں دکھایا گیا جس کے دو سینگ نمایاں تھے اور جبریل فرشتہ نے اس دو سینگوں والے مینڈھے (ذوالقرنین) کی تعبیر یہ دی کہ اس سے وہ بادشاہ مراد ہے جو فارس اور میڈیا دو بادشاہتوں کا مالک ہو گا اور یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی اور تاریخ دونوں اس پر متفق ہیں کہ ایران کا یہ بادشاہ خورس تھا جس نے فارس اور میڈیا دونوں کو ملا کر شاہنشاہی کی یہودیوں کو اس سے اس لیے دل چسپی تھی کہ ان کے انبیاءؑ کے الہامات کے مطابق وہ ان کا نجات دہندہ تھا چنانچہ یہودیوں کا دیا ہوا یہ لقب ذوالقرنین خود ایران کے شاہی خاندان میں اس درجہ مشہور مقبول ہوا کہ انھوں نے خورس کے مرنے کے بعد اس کا مجسمہ بنایا تو اس میں بھی تاریخی یادگار کے طور پر دانیالؑ کے خواب کو مصور کر کے دکھایا اور چونکہ یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں ایک جگہ اس کو عقاب بھی کہا گیا ہے:

> "میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں جو ابتدا سے انتہا تک احوال اور قدیم وقتوں کی باتیں جواب تک پوری نہیں ہوئیں، بتاتا ہوں اور جو کہتا ہوں میری مصلحت قائم رہے گی اور میں اپنی ساری مرضی پوری کروں گا جو عقاب کو پورب سے لاؤں گا اس شخص کو جو میرے ارادوں کو پورا کریگا۔"
>
> (باب ۴۶ آیات ۱۱-۹)

اس لیے اصطخر کے قریب خورس کا جو سنگی مجسمہ نکلا ہے اس کو اس مجموعی تخیل ہی پر بنایا گیا ہے کہ اس کے سر کے دونوں جانب دو سینگ ہیں اور سر پر ایک عقاب ہے اور خورس کے سوا دنیا کے کسی بادشاہ کے متعلق یہ تخیل موجود نہیں ہے۔

پس یہ دلیل ہے اس امر کی کہ یہود کو اپنے نجات دہندہ خدا کے مسیح اور خدا کے چرواہے کے ساتھ اس درجہ دلچسپی تھی کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کی صداقت کا معیار اس بادشاہ کے واقعات کے علم کو قرار دیا اور اسی کے

پیش نظر قرآن نے اس بادشاہ (خورس) کا مناسب حال ذکر کیا ہے۔

۲) قرآن کہتا ہے کہ وہ بہت صاحب شوکت بادشاہ تھا اور خدا نے اس کو ہر قسم کے ساز و سامان حکومت سے نوازا تھا۔

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ○

ہم نے اس کو حکمرانی عطا کی اور اس کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔

تطبیق - ۲

خورس (گورش) کے متعلق توراۃ اور قدیم و جدید تاریخی حوالوں سے یہ ثابت ہو کہ اس نے نہ صرف ایران کی مختلف قبائلی حکومتوں کو ہی ایک شاہنشاہی میں منسلک کر دیا تھا بلکہ بابل و نینوی کی عظیم الشان حکومتوں پر بھی قابض ہو کر اپنی جغرافیائی معیشیت میں ایسی وسیع مملکت کا مالک ہو گیا تھا کہ خدائے تعالیٰ نے اس کو تمام ساز و سامان زندگی و حکومت سے مالا مال کر دیا۔

۳) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے تین قابل ذکر مہم سر کی ہیں۔

تطبیق - ۳

معتبر تاریخی شہادتیں ثابت کرتی ہیں کہ خورس نے تین قابل ذکر مہم سر کیں۔

۴) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے پہلے پچھم (مغرب) کی جانب ایک مہم سر کی،

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ○ حَتّٰى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ

پس اس نے (ایک مہم کے لیے) ساز و سامان کیا" اور پچھم کی جانب نکل کھڑا ہوا "یہاں تک کہ (چلتے چلتے) سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچا وہاں اسے سورج ایسا دکھائی دیا جیسے ایک سیاہ دلدل میں ڈوب جاتا ہے۔"

تطبیق - ۴

یونانی مؤرخ ہیرو ڈوٹس اور بعض دوسرے مؤرخین کے حوالے سے ثابت ہو چکا ہے کہ خورس کو سب سے پہلی اور اہم مہم پچھم کی جانب پیش آئی جب کہ لیڈیا (ایشیاء کوچک) کے بادشاہ کرڈلیس کے غدارانہ طرز عمل کے خلاف اس کو لیڈیا پر حملہ کرنا پڑا یہ مقام ایران سے جانب مغرب واقع ہے اور اس کا دارالحکومت "سارڈیس" ایشیاء کوچک کے آخری مغربی ساحل کے قریب تھا بقل ہیرو ڈوٹس خورس کی یہ مہم ایسی معجزانہ انداز میں تھی کہ وہ مغرب کی جانب فتوحات کرتا ہوا چودہ روز کے اندر ایشیاء کوچک کے آخری ساحل پر جا کھڑا ہوا اور سارڈیس جیسے محکم و مضبوط شہر کو تسخیر کر لیا، اب اس کے سامنے سمندر کے سوا اور کچھ نہ تھا سمرنا کے قریب بحر اتیجین (AEGANSEA) کا یہی وہ ساحل ہے جو اپنے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے رکھنے کی وجہ سے جھیل بن گیا ہے اور اسکا پانی بہت گدلا رہتا ہے اور شام کے وقت جب سورج ڈوبتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہے۔"

فی عین حمئۃ "۔

۵) قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں کی قوم پر ذوالقرنین کو ایسا غلبہ دے دیا تھا کہ وہ جس طرح چاہے ان کے ساتھ معاملہ کرے چاہے ان کی بغاوت کی پاداش میں ان کو سزا دے اور چاہے تو ان کے ساتھ حسن سلوک کر کے ان کو معاف کر دے،

وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ط قُلْنَا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّآ أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّآ أَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا

تطبیق -۵

تاریخی حوالوں اور ہیروڈوٹس اور زینوفن کے تاریخی اقوال سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ خورس (کے ارش) نے لیڈیا کو فتح کر کے عام بادشاہوں کی طرح اس کو برباد نہیں کیا بلکہ عدل نیک اور صالح بادشاہ کی طرح عفو کا اذن عام کر دیا اور ان کو بے وطن نہیں ہونے دیا۔ بلکہ کرڈیس کی جرأت مردانہ کے امتحان کے لیے اول اس کو چتا میں جلانے کا حکم دیا مگر جب وہ مردانہ وار چتا کے اندر بیٹھ گیا تو اس کو بھی معاف کر دیا اور اس کے ساتھ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا۔

۶) قرآن عزیز نے ذوالقرنین کا جو مقولہ نقل کیا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "مومن" بھی تھا اور عادل و صالح بھی وہ کہتا ہے،

قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ إِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ○ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ الْحُسْنٰى وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ○

ذوالقرنین نے کہا ہم ناانصافی کرنے والے نہیں ہیں۔ جو سرکشی کرے گا اسے ضرور سزا دیں گے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف لوٹنا ہے وہ (بداعمالوں کو) سخت عذاب میں مبتلا کرے گا۔ اور جو ایمان لائے گا اور اچھے کام کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کو بھلائی ملے گی اور ہم اسے ایسی ہی باتوں کا حکم دیں گے جس میں اس کے لیے آسانی و راحت ہو۔

تطبیق -۶

توراۃ میں خورس کا یروشلم سے متعلق فرمان اور دارا کے کتبات و اعلانات مذکورۂ توراۃ، "اوستا" کی اندرونی شہادات اور تاریخی بیانات یہ سب شہادتیں ناقابل انکار حد تک یہ ثابت کرتی ہیں کہ خورس اور دارا مومن تھے اور وقت کے سچے دین کے پیرو بلکہ اس کے مبلغ و مناد تھے وہ ابراہیم زردوشت کے متبع خدائے واحد کے پرستار اور آخرت کے قائل تھے اور ان کا دین انبیاء بنی اسرائیل ہی کی تعلیم کی ایک شاخ کی حیثیت رکھتا تھا جو دارا کے بعد بہت ہی جلد محرف و مسخ ہو کر رہ گیا۔

۷) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین نے دوسری مہم مشرق (پورب) کی جانب سرکی اور وہ چلتے چلتے جب سورج

نکلنے کی آخری حد پر پہنچا تو اس کو وہاں خانہ بدوش قبائل سے واسطہ پڑا،

ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ○ حَتّٰىٓ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ○

اس کے بعد اس نے پھر تیاری کی اور پورب کی طرف نکلا یہاں تک کہ سورج نکلنے کی آخری حد تک پہنچ گیا اس نے دیکھا سورج ایک ایسے گروہ پر نکلتا ہے جس سے ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی ہے۔

تطبیق-۷

تاریخ کہتی ہے کہ خورس کو دوسری قابل ذکر مہم مشرق (پورب) کی جانب پیش آئی جبکہ مکران کے خانہ بدوش قبائل نے سرکشی کی جو کہ اس کے دارالحکومت سے اقصائے مشرق میں پہاڑی علاقہ تک آباد تھے اور جن سے متعلق مہم کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں بیان کی جا چکیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن عزیز نے ذوالقرنین کی مغربی اور مشرقی قابل ذکر مہمات کے لیے مَغْرِبَ الشَّمْسِ اور مَطْلِعَ الشَّمْسِ کی تعبیر اختیار کی ہے اس سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ذوالقرنین ساری دنیا کا بلا شرکت غیرے حکمراں بن گیا تھا اور اس نے دنیا کے دونوں جانب کے آخری ربع مسکوں تک اپنے قبضہ میں کر لیا تھا حالانکہ یہ تاریخی واقعات کے لحاظ سے کسی بھی بادشاہ کے لیے ثابت نہیں ہے اور نہ قرآن نے اس مقصد کے لیے یہ تعبیر اختیار کی ہے بلکہ اس کی صاف اور واضح مراد یہ ہے کہ ذوالقرنین اپنے مرکز حکومت کے لحاظ سے اقصاء مغرب اور اقصاء مشرق تک پہنچا ہے اور مغرب میں وہ اس حد تک پہنچ گیا تھا جہاں خشکی کا سلسلہ ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے اور مشرق میں اس حد تک پہنچا کہ وہاں خانہ بدوش قبائل کے سوا کوئی شہری آبادی نہیں تھی۔ یہ مطلب اس درجہ واضح ہے کہ اگر بے دلیل غلط فہمی کی وجہ سے مسطورہ بالا قول منقول نہ ہوتا تو ہر شخص زبان کے محاورہ کے لحاظ سے یہی سمجھتا جو ہم نے سمجھا ہے چنانچہ آج بھی ہم ہندوستان میں رہتے ہوئے اقصاء مشرق اور اقصاء مغرب سے دور دراز ملک مراد لیتے ہیں جو ہمارے مشرق و مغرب میں واقع ہیں اور ان الفاظ کو اس بات میں منحصر نہیں کر دیتے کہ مشرق و مغرب کے وہ کنارے مراد ہوں جن کے بعد معمورۂ عالم کا کوئی حصہ بھی باقی نہ رہا ہو البتہ دلائل یا قرائن کے ذریعہ کبھی کبھی یہ معنی بھی مراد ہو جاتے ہیں۔

اقصائے مغرب و مشرق کی اس اصطلاح کو جو قرآن نے ذوالقرنین کے سلسلہ میں بیان کی ہے اگر اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین (خورس) سے متعلق توراۃ نے چونکہ یہی تعبیر کی تھی اسلئے بہت ممکن ہے کہ قرآن نے سائلین کو اس کا واقعہ سنانے کے وقت اسی اصطلاح کو اختیار کرنا پسند کیا ہو۔ دیکھئے یسعیاہ نبی کے صحیفہ میں خورس کے حق میں بعینہ یہی تعبیر موجود ہے۔ خداوند اپنے خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے:

میں نے اپنے بندے یعقوب اور اپنے برگزیدہ اسرائیل کے لیے تجھے تیرا نام صاف صاف لے کے بلایا میں نے تجھے مہربانی سے پکارا گو کہ تو مجھے نہیں جانتا میں ہی خداوند ہوں اور کوئی نہیں میرے سوا کوئی خدا نہیں

میں نے تیری کمر باندھی اگرچہ تو نے مجھے نہیں پہچانا تاکہ لوگ سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کی اطراف سے سورج غروب ہونے (مغرب الشمس) کی اطراف تک جانیں کہ میرے سوا کوئی نہیں میں ہی خداوند ہوں اور میرے سوا کوئی نہیں۔ (باب ۴۵ آیات ۱۰۲)

اور زکریا نبی کے صحیفہ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا ہے:

رب الافواج فرماتا ہے کہ دیکھ میں اپنے لوگوں کو سورج کے نکلنے (مطلع الشمس) کے ملک سے اور سورج کے غروب ہونے (مغرب الشمس) کے ملک سے چھڑالوں گا اور میں انھیں لاؤں گا اور وہ (بنی اسرائیل) یروشلم کے درمیان سکونت کریں گے۔ (باب ۸ آیت ۸)

ظاہر ہے کہ ان دونوں مقامات میں مطلع الشمس اور مغرب الشمس سے معمورۂ عالم کے دونوں جانب کے آخری کونے مراد نہیں ہیں بلکہ جن کا ذکر ہے ان کی حکومت یا مقام سکونت سے مشرقی اور مغربی جہات مراد ہیں۔

۸) قرآن کہتا ہے کہ ذوالقرنین کو تیسری قابل ذکر مہم پیش آئی اور جب وہ ایسے مقام پر پہنچا جہاں دو پہاڑوں کی پھانکیں ایک درہ بناتی تھیں تو ان کے ورے اس کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا جو اس کی زبان اور بولی سے ناواقف تھی انھوں نے ذوالقرنین پر کسی طرح یہ واضح کیا کہ ان پہاڑوں کے درمیان سے نکل کر ہم کو یاجوج وماجوج ستاتے اور زمین میں فساد انگیزی کرتے ہیں کیا آپ ہماری اتنی مدد کریں گے کہ ہم سے مالی ٹیکس لے کر ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک سد بنادیں، تاکہ ان کے اور ہمارے درمیان وہ حد فاصل ہو جائے اور روک بنجائے۔ ذوالقرنین نے کہا میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے اس کی مجھے اجرت کی ضرورت نہیں البتہ اس کے بنانے میں میری مدد کرو۔ ان لوگوں نے ذوالقرنین کے حکم سے لوہے کے ٹکڑے جمع کیے اور ان سے ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان سد بنادی اور پھر تانبا پگھلا کر اس آہنی دیوار کو مستحکم کردیا۔

تطبیق-۸

تاریخ کی ناقابل انکار شہادتوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ خورس کو جانب شمال میں ایک قابل ذکر مہم پیش آئی جس میں کاکیشیا (جبل قوقایا کوہ قاف) کے پہاڑی سلسلے میں ایسے دو پہاڑوں کے قریب ایک قوم ملی جن کی پھانکوں کے درمیان قدرتی درہ تھا اور پہاڑ کی دوسری جانب سے سنتھینین قبائل کے جنگلی اور غیر مہذب لٹیرے دَل کے دَل آکر اس قوم پر حملہ کرتے اور لوٹ مار کر کے درہ کے راستہ واپس ہو جایا کرتے تھے خورس جب اس جگہ پہنچا تو اس آبادی کے لوگوں نے حملہ آور لٹیروں کی شکایت کرتے ہوئے اس سے پہاڑوں کے درمیان سد (دیوار) بنادینے کی درخواست کی خورس نے ان کی درخواست کو منظور کرلیا اور تانبے سے ملا کر ایک سد قائم کردی جس کو وقت کے گاگ اور میگاگ غیر مہذب سنتھینین قبائل اپنی درندگی اور خونخواری کے باوجود نہ توڑ پھوڑ سکے اور نہ اس کے اوپر سے اتر کر حملہ آور ہو سکے اور اس طرح پہاڑوں کے درے کی آبادی ان کے حملوں سے محفوظ ہوگئی۔

اگرچہ غیر مہذب قبائل کے حملوں کے تحفظ کی خاطر دنیا کے مختلف حصوں میں ایسی متعدد چھوٹی اور بڑی

سد (دیواریں) بنائی گئی ہیں لیکن ایسی سد جو لوہے اور تانبے سے مخلوط دو پہاڑوں کی پھانکوں کے درمیان بنائی گئی ہوتی اس سد کے سواجو کاکیشیا (جبل قوقا) میں پائی جاتی ہے کوئی سد دنیا میں اب تک دریافت نہیں ہوئی اسلئے دلائل کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن نے ذوالقرنین کی سد کے متعلق جو تفصیلات دی ہیں اس کے پیش نظر خورس ہی ذوالقرنین ہے اور درۂ داریال ہی کی سد قرآن کی تفصیلات کے مطابق ہے۔

یاجوج ماجوج کون ہیں اور سد کی حقیقت کیا ہے چونکہ یہ دوزیر تحقیق مسائل ابھی بحث میں نہیں آئے اس لیے ذوالقرنین سے متعلق مطابقت قرآن کا یہ پہلو ہنوز تشنۂ دلیل ہے۔ لہٰذا سطور ذیل میں ان دونوں مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے تاکہ اصل حقیقت اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

یاجوج وماجوج

ذوالقرنین کی شخصیت کو زیر بحث لانے کے بعد دوسرا مسئلہ یاجوج و ماجوج کی تعیین کا ہے۔ مفسرین اور مؤرخین اسلام نے وطب ویابس روایات کا وہ تمام ذخیرہ نقل کر دیا ہے جو اس سلسلہ میں بیان کی گئی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ چند روایات کے علاوہ اس سلسلہ کی تمام روایات خرافات و ہفوات کا مجموعہ ہیں جو عقلاً ونقلاً کسی طرح لایق اعتماد نہیں ہیں اور اسرائیلیات کا لا یعنی طومار ہیں۔

ان تمام روایات میں قدر مشترک یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسے قبائل کا مجموعہ ہیں جو جسمانی و معاشرتی اعتبار سے عجیب و غریب زندگی کے حامل ہیں مثلاً وہ بالشت ڈیڑھ بالشت یا زیادہ سے زیادہ ایک دراع کا قدر رکھتے ہیں اور بعض غیر معمولی طویل القامت ہیں اور ان کے دونوں کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور دوسرا بچھانے کے کام میں آتا ہے چہرے چوڑے چپکے اور قد کے ساتھ غیر متناسب ہیں ان کی غذا کے لیے قدرت سال بھر میں دو مرتبہ سمندر سے ایسی مچھلیاں نکال کر پھینک دیتی ہے جن کے سر اور دم کا فاصلہ اس قدر طویل ہوتا ہے کہ دس روز شب اگر کوئی شخص اس پر چلتا رہے تب اس فاصلہ کو قطع کر سکتا ہے یا ایک ایسا سانپ ان کی خوراک ہے جو پہلے قرب جوار کے تمام بری جانورں کو ہضم کر جاتا ہے اور پھر قدرت اس کو سمندر میں پھینک دیتی ہے اور وہ وہاں میلوں تک بحری جانوروں کو چٹ کر لیتا ہے اور پھر ایک بادل آتا ہے اور فرشتہ اس عظیم الجثہ اژدہے کو اٹھا کر اس پر رکھ دیتا ہے اور بادل اس کو ان قبائل میں لے جا کر ڈال دیتا ہے اور یہ کہ یاجوج و ماجوج ایک ایسی برزخی مخلوق ہیں جو آدم علیہ السلام کے صلب سے تو ہیں مگر حوا علیہا السلام کے بطن سے نہیں ہیں۔

ان روایات کو نقل کرتے ہوئے یاقوت نے معجم البلدان میں یہ رائے ظاہر کی ہے:

ولست اقطع بصحة ما اوردته لا ختلاف الروايات فيه والله سبحانه اعلم بصحته وعلى كل حال فليس فى صحة امر السدريب يخ ۔ (ج۵ص ۵۳)

اور میں نے جو کچھ روایات نقل کی ہیں ان کے اختلافات کے پیش نظر میں کسی طرح ان کی صحت کو باور نہیں کر سکتا اور اس معاملہ کی اصل حقیقت کا حال خدا ہی خوب جانتا ہے اور بہر حال اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ جہاں تک سد کا معاملہ ہے اس کے صحیح ہونے میں مطلق شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں یہ ارشاد فرماتے ہیں:

ومن زعم ان یاجوج وماجوج خلقوا من نطفة ادم حین احتلم فاختلط بتراب فخلقوا من ذلك و انهم لیسوا من حواء فهو قول حکاه الشیخ ابو زکریا النووی فی شرح مسلم وغیره ضعفوه وهو جدیر بذلك اذلا دلیل علیه بل هو مخالف لما ذکرناه من ان جمیع الناس الیوم من ذریة نوح بنص القرآن هکذا من زعم ان هم علی اشکال مخلتفة و اطوال متباینة جدا فمنهم من هو کالنخلة السحرف ومنهم عن هو غایة فی القصر ومنهم من یفترش اذناً من اذنیه یتغطی بالآخرة فکل هذه بلا دلیل ورجم بالغیب بغیر برهان والضحیح انهم من بنی ادم وعلی اشکالهم وصفاتهم ۔

اور جس شخص نے یہ گمان کرر کھا ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کے ایسے نطفہ سے پیدا ہوئے ہیں جو احتلام کی حالت میں نکلا اور مٹی میں رل مل گیا اور یہ مخلوق وجود میں آ گئی اور یہ حضرت حوا علیہا السلام کے بطن سے نہیں ہیں تو یہ ایک قول ہے جس کو شیخ ابوز کریانووی نے شرح مسلم میں حکایت کیا ہے اور ان کے علاوہ علماء نے اس کی تغلیط کی ہے اور بلا شبہ یہ قول اس قابل ہے کہ اس کو صحیح نہ سمجھا جائے، اس لیے کہ قطعاً بے دلیل بات ہے بلکہ اس قول کے بالکل خلاف ہے جو ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ نص قرآن سے یہ ثابت ہے کہ کائنات کی موجودہ انسانی مخلوق کا ہر فرد حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہے اس طرح یہ قول بھی غلط اور بے دلیل ہے کہ یاجوج وماجوج عجیب عجیب مختلف شکلوں اور متضاد قد و قامت کی مخلوق ہیں بعض ان میں سے اتنے لانبے ہیں کہ گویا کھجور کا بہت طویل درخت ہے اور بعض بہت ہی کوتاہ قامت اور بعض کے کان ایسے ہیں کہ ایک کو وہ بچھا لیتے اور دوسرے کو اوڑھ لیتے ہیں سو یہ تمام اقوال قطعاً بے دلیل اور محض انکل کے تیر ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ وہ عام بنی آدم کی طرح ہیں اور ان ہی کی طرح شکل وصورت اور جسمانی اوصاف رکھتے ہیں۔ (ج ۲ ص ۱۱۰)

اور اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

وهذا قول غریب جداً لا دلیل علیه لا من عقل ولا من نقل ولا یجوز الاعتماد منها علی ما یحکیه بعض اهل الکتاب لما عندهم من الاحادیث المفتعلة ۔

اور یہ قول بلا شبہ ایک اچنبا قول ہے کہ جس کے لیے نہ عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی اور بعض اہل کتاب نے جو اس سلسلہ میں حکایات بیان کی ہیں اس مقام پر کسی طرح ان پر بھروسہ کرنا درست نہیں ہے اس لیے کہ ان کے پاس تو اس قسم کے من گھڑت قصوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ (ج ۶ ص ۱۷۲ سورۂ کہف)

اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وقد ذکر ابن جریر منهما عن وهب بن منبه اثرا طویلا عجیبا فی سیرذی القرنین وبناء ہ السد و کیفیة ما جری له وفیه طول و غرابة ونکارة فی اشکالهم وصفاتهم وطولهم وقصربعضهم و اذانهم ۔ (ج ۶ ص ۱۷۲)

اور ابن جریر نے اس مقام پر وہب بن منبہ سے ذوالقرنین کی سیاحت اور سد کی تعمیر اور اس سے متعلق کیفیات کے بارہ میں ایک طویل و عجیب اثر نقل کیا ہے دراصل وہ ایک طویل اور اچنبھی داستان ہے اور اس میں ان (یاجوج وماجوج) کی شکلوں صورتوں ان کے طویل و کوتاہ ہونے اور انکے کانوں کے متعلق اچنبھی اور غیر معقول باتیں ہیں۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی اس عجیب و غریب قول کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

ووقع فی فتاوی الشیخ محی الدین یاجوج وماجوج من اولاد ادم لا من حواء عند جماهیر العلماء فیکون احوانا لاب کذا قال ولم نر هذا احد من السلف الا عن کعب الاحبار ویرده الحدیث المرفوع انهم من ذریة نوح ونوح من ذریة حواء قطعاً۔ (فتح الباری ج ۱۲ ص ۹۱)

اور شیخ محی الدین (نووی) کے فتاویٰ میں مذکور ہے کہ یاجوج اور ماجوج حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے تو ہیں مگر حضرت حوا کے بطن سے نہیں ہے۔ جمہور علماء کا یہی خیال ہے اس طرح وہ بنی آدم کے علاتی بھائی ہیں مگر ہم نے کعب احبار کے علاوہ سلف میں سے کسی ایک شخص کو بھی اس کا قائل نہیں پایا اور اس قول کو وہ حدیث مرفوع قطعاً رد کرتی ہے جس میں یاجوج اور ماجوج کو نوح علیہ السلام کی نسل سے بتایا گیا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام بلاشبہ حضرت حواء کے بطن سے ہیں۔

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وقد اشار النووی وغیره الی حکایة من زعم ان ادم نام فاحتلم فاختلط منیه بتراب فتولد منه ولد یاجوج وماجوج من نسله وهو قول منکرا جدا لا اصل له الا عن بعض اهل الکتاب ۔ (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۵)

اور نووی اور بعض دوسروں نے ایک ایسے شخص کی بیان کردہ حکایت کی جانب اشارہ کیا ہے جو یہ کہتا ہے کہ آدم خواب میں تھے کہ ایک مرتبہ ان کو احتلام ہو گیا اور ان کے قطرات منی مٹی میں رل مل گئے بس اس سے یاجوج اور ماجوج کی نسل مخلوق ہو گئی تو یہ قول ہے جو سر تا سر بے ہودہ اور بے اصل ہے اور بعض اہل کتاب کی حکایت کے سوائے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اور حافظ ابن کثیر اپنی تاریخ میں تحریر فرماتے ہیں:

ثم هم من ذریة نوح لان الله تعالیٰ اخبر انه استجاب بعبده نوح فی دعاء ه علی اهل الارض بقوله رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّاراً و قال تعالیٰ فَأَنجَيْنَاهُ وَأَصْحَابَ السَّفِينَةِ وقال وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ الْبَاقِينَ ۔ (البدایه والنهایه ج ۲ ص ۱۱۰)

پھر وہ (یاجوج وماجوج) نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ اس نے اہل زمین کے متعلق نوح کی یہ دعا قبول کر لی (اے رب تو زمین پر کسی کافر کو باقی نہ چھوڑ) اور پھر حق تعالیٰ نے فرمایا (پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی) اور پھر فرمایا اور ہم نے اس کی ذریت ہی کو باقی رہنے والوں میں چھوڑا)۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ جب قرآن عزیزان آیات میں یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بددعا کے بعد بنی آدم میں سے حضرت نوح علیہ السلام اور اصحاب کشتی یا دوسرے الفاظ میں حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت اور چند مسلمانوں کے علاوہ کسی کو زندہ اور باقی نہیں چھوڑا اور اب دنیائے انسانی حضرت نوح علیہ السلام ہی کی اولاد ہے تو پھر یہ کہنا کہ یاجوج اور ماجوج بنی آدم میں سے ایک مستقل مخلوق ہے اور ذریت نوح میں سے نہیں ہے قطعاً بے بنیاد اور بے اصل ہے اور اس کی تائید میں حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اگر یہ حوا علیہا السلام کے بطن سے نہ تھے اور اس لیے ذریت نوح علیہ السلام میں سے بھی نہیں تھے تو طوفان نوح علیہ السلام میں یہ مخلوق کہاں تھی اور نص قرآنی کے خلاف یہ کیسے محفوظ رہی؟

اور حضرت قتادہ سے جو منقول ہے وہ بھی اس قول کو رد کرتا ہے:

ویاجوج وماجوج قبیلتان من ولد یافث بن نوح۔ (الحدیث)[1]

(اور عبدالرزاق نے کتاب التفسیر میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ) یاجوج اور ماجوج دو قبیلے ہیں جو یافث بن نوح کی نسل سے ہیں۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوع روایات ہے کہ یاجوج وماجوج حضرت نوح کی نسل سے ہیں اور اگرچہ اس کی سند میں فی الجملہ ضعف ہے مگر اس کے مطاوع اور مؤید بعض دوسری صحیح روایات ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر نے بخاری کی اس مرفوع روایت کے متعلق جو حضرت ابوسعید خدریؓ سے منقول ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے:

والغرض منه هنا ذكر ياجوج و ماجوج والاشارة الى كثرتهم و ان هذه الامة بالنسبة اليهم نحو عشر عشر العشر و انهم من ذرية ادم ردا على من قال خلاف ذلك۔

(فتح الباری ج۶ ص۲۹۸)

امام بخاری کی اس روایت بیان کرنے کی غرض یہ ہے کہ یاجوج وماجوج کا حال بیان کیا جائے اور ان کی کثرت تعداد کی جانب اشارہ ہے اور یہ کہ امت محمدیہ ﷺ کے مقابلہ میں وہ ہزاروں گنا زیادہ ہیں اور یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح نسل آدم میں شامل ہیں اس سے ان لوگوں کا رد کرنا مقصود ہے جو اس کے خلاف ان کو عام انسانی مخلوق سے جدا مانتے ہیں۔

یہ چند نقول ہیں ان محققین کے ذخیرۂ اقوال سے جو حدیث تفسیر اور علم تاریخ کی ماہر ہستیاں ہیں۔ ان اقوال سے یہ بات قطعاً واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ یاجوج وماجوج عام دنیاء انسانی کی طرح ربع مسکوں کے باشندے اور ان کی نسل بنی آدم کی عام نسل کی طرح ہے اور وہ کوئی عجوبہ روزگار مخلوق نہیں ہیں اور نہ برزخی مخلوق اور اس قسم کی جو روایات پائی جاتی ہیں ان کا اسلامی روایات کا سلسلہ کعب احبار پر جا کر ختم ہوتا ہے جو یہودی النسل ہونے کی وجہ سے ان قصوں کے بہت بڑے عالم تھے اور اسلام لانے کے بعد یا تو تفریح کے طور پر ان کو سنایا کرتے اور یہ اس رطب ویابس میں سے جو دور از کار باتیں ہوں وہ رد کر دی جائیں اور جن سے قرآن اور احادیث نبوی ﷺ کی تائید ہوتی ہو ان کو ایک تاریخی حیثیت میں لے لیا جائے مگر نقل کرنے والوں نے اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے اس پورے طومار کو جو غرق مئے ناب اولیٰ کا مصداق تھا۔ اسی طرح نقل کرنا شروع کر

۱: فتح الباری ج۶ ص۲۹۷۔ یہ دعویٰ کہ موجودہ کل کائنات صرف نوح کی ذریت ہے قابل غور ہے۔

دیا جس طرح حدیثی روایات کو نقل کیا جاتا تھا اور اگر سلف صالحین اور متاخرین میں وہ بے نظیر ہستیاں نہ پیدا ہوتیں جنھوں نے روایات واحادیث کے تمام ذخیرے کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھ کر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا تو نہ معلوم آج اسلام کو کس قدر بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔

پس اس وضاحت کے بعد اب یہ دیکھنا چاہیے کہ یاجوج و ماجوج کا مصداق کون سے قبائل میں اور ان قبائل کا کائنات انسانی کے ساتھ کیا تعلق رہا ہے؟ یہ مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اور اقوام عالم کی بہت سی قوموں پر اثرانداز ہے نیز سورۂ انبیاء کی آیت،

حَتّٰٓى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ○

سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

بہر حال اس سے پہلے کہ ہم اس مسئلہ پر کچھ لکھیں مقدمہ اور تمہید کے طور پر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانی آبادی کے تمام گوشوں میں جو چہل پہل اور رونق نظر آتی ہے اور ربع مسکوں جس طرح بنی آدم سے آباد ہے اور تمدن و حضارت کی نیرنگیوں سے گل زار بنا ہوا ہے ان کی ابتداء بدوی اور صحرائی قبائل سے ہوئی ہے اور یہی قبائل صدیاں گزر جانے اور اپنے اصل مرکز سے جدا ہو جانے کے بعد تمدن و حضارت کے بانی بنتے اور متمدن قومیں شمار ہوتے رہے ہیں۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کی قوموں کے سب سے بڑے سرچشمے کہ جہاں سیلاب کی طرح امنڈ امنڈ کر انسانی آبادی پھیلی اور پھلی پھولی ہے اور مختلف ملکوں اور زمین کے مختلف خطوں میں جا کر بسی ہے صرف دو ہیں ایک حجاز اور دوسرا چینی ترکستان یا ایشیا کا وہ علاقہ جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا مرتفع اور بلند حصہ شمار ہوتا ہے۔

حجاز ان تمام اقوام و قبائل کا سرچشمہ ہے جو سامی النسل یا سمیٹک (SEMETIC) کہلاتی ہیں یہ قبائل ہزاروں سال سے اس بے آب و گیاہ سرزمین سے طوفان کی طرح اٹھتے اور بگولہ کی طرح دنیا کے مختلف حصوں پر پھیلتے رہے ہیں اور بدوی اور صحرائی زندگی کے گہورہ سے نکل کر زبردست تمدن اور عظیم الشان حضارت و شہرت کے بانی قرار پائے۔

عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ (ثمود) اسی سرزمین سے اٹھے اور اپنی عظیم الشان صناعی اور پر سطوت حکومت و صولت کے ذریعہ صدیوں تک تمدن و حضارت کے علم بردار رہے جدیس طسم اور اسی قسم کے دوسرے قبائل بھی جو آج امم بائدہ (ہلاک شدہ) کہلاتے ہیں اسی خاک کے پروردہ تھے۔ اذواء یمن (شاہان حمیر) اور عمالقہ مصر و شام و عراق کے جلال و جبروت اور وسعت سلطنت کا یہ عالم تھا کہ ایک عرصہ تک فارس اور روم بلکہ ہندوستان کے بعض حصے بھی ان کے احکام کے محکوم اور ان کی حکومت کے باج گذار رہ چکے ہیں۔ غرض سامی النسل اقوام و قبائل خواہ بدوی اور صحرائی ہوں یا حضری اور متمدن شہری سب اسی خاک حجاز (عرب) کے ذرات تھے جو اپنی وسعت کے بعد آپس میں اس قدر اجنبی ہو گئے تھے کہ بدوی اور شہری بلکہ فراعنۂ مصر (عمالقہ) اور اذواء یمن (سلاطین حمیری) اور عرب مستعربہ اسمٰعیلی عربوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنی بھی مشکل ہو گئی تھی اور اگر

نسلی امتیازات وخصوصیات اور زبان کی بناد کی یک رنگی ان کے باہم پیوند نہ لگاتی تو تاریخ کے کسی گوشہ کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ ابھر کر ان کی اخوت باہمی کا درس دے سکتا۔

اسی طرح قبائل واقوام عالم کا دوسرا سمندر اور بحر ناپیدا کنار چینی ترکستان اور منگولیا کا وہ علاقہ رہا ہے جو شمال مشرق میں واقع ہے اور سطح زمین کا بلند اور مرتفع حصہ ہے۔

اس مقام سے بھی ہزاروں سال کے عرصہ میں سینکڑوں قبائل اٹھے اور دنیا کے مختلف کونوں تک پہونچے اور وہاں جا کر بس گئے یہیں سے انسانوں کی موجیں اٹھیں اور وسط ایشیا میں جاگریں۔ یہیں سے یورپ پہنچیں اور یہیں سے ہندوستان اور شمال مغرب تک پھیلتی چلی گئیں۔ ہندوستان میں بس جانے والوں نے پنا تعارف آرین کے ساتھ کرایا۔ وسط ایشیا میں بسنے والوں نے ''ایریانہ'' کہلا کر اپنے علاقہ کا نام ایران مشہور کیا۔ یورپ میں جرمن گاتھ ڈانڈیال وغیرہ ان ہی قبائل کے نام پڑے اور بحر اسود سے دریاء ڈینوب تک بسنے والے سنتھینین کہلائے اور یورپ اور ایشیا کے ایک بڑے حصہ پر چھا جانے والے رشئین کے نام سے مشہور ہوئے۔

یہ قبائل جب اپنے مرکز سے چلے تھے تو صحرائی وحشی اور بدوی تھے لیکن اپنے مرکز سے ہٹ کر جب دوسرے مقامات پر پہنچے اور حضارت وتمدن سے آشنا ہوئے یا ضرورت نے آشنا کرایا تو نئے نئے ناموں سے پکارے گئے۔ حتیٰ کہ اپنے مرکز کی ابتدائی حالت سے اس قدر بعد ہو گیا کہ مرکز میں بسنے والے وحشی قبائل اور ان کے درمیان کوئی یکسانیت باقی نہ رہی بلکہ ایک ہی اصل کی دونوں شاخیں ایک دوسرے کی حریف بن گئیں اور شہری اقوام کے لیے ان کے ہم نسل وحشی قبائل مستقل خطرہ ثابت ہونے لگے جو آئے دن شہریوں پر تاخت وتاراج کرتے اور لوٹ مار کر کے پھر اپنے مرکز کی جانب واپس ہو جاتے تھے۔

بہر حال تاریخ کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عہد تاریخی کے قبل سے پانچویں صدی مسیح تک اس علاقہ سے جو آج کل منگولیا تاتار کہلاتا ہے اسی قسم کے انسانی طوفان اٹھتے رہے ہیں اور ان سے قریب اور ہمسایہ قوم چینی ان کے بڑے دو قبائل کو موگ اور یوچی کہتے رہے ہیں۔ پس یہی ''موگ'' ہے جو تقریباً چھ سو برس قبل مسیح یونان میں میک اور میگاگ بنا اور عربی میں ماجوج ہوا اور غالباً یہی ''یواجی'' یونانی میں یوگاگ اور عبرانی اور عربی میں جوج اور یاجوج کہلایا۔ لیکن جب یہ قبائل دنیا کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہوئے اور بہت سے قبائل پہلے کی طرح اپنے مرکز ہی میں وحشی اور صحرائی بنے رہے تو اس اختلاف تمدن ومعیشت نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ ان قبائل کے وحشی اور صحرائی جنگجو تو اسی طرح یاجوج (گاگ GOG) اور ماجوج (میگاگ MAGOG) کے نام سے موسوم رہے مگر متمدن اور شہری قبائل نے مقامی خصوصیات وامتیازات کے ساتھ ساتھ اپنے ناموں کو بھی بھلا دیا اور نئے نئے ناموں سے شہرت پائی اور پھر یہ تقسیم اس طرح قائم ہو گئی کہ تاریخ کے عہد میں بھی اس کو باقی رکھا گیا اور وسط ایشیا کے ایرانی ایشیائی اور یورپین روسی اور دیگر یورپین قومیں اور ہندوستان کے آرین اصل کے اعتبار سے منگولین (یعنی موگ ماجوج اور یواگ یاجوج) نسل ہونے کے باوجود تاریخ میں ان ناموں سے یاد نہیں کیے جاتے اور یاجوج وماجوج کا نام صرف ان ہی قبائل کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے جو اپنی گذشتہ حالت وحشت وبربریت اور غیر متمدن زندگی میں اپنے مرکز کے اندر موجود ہیں اور مختلف صدیوں میں قتل وغارت اور لوٹ مار کرنے کیلئے اپنی ہم نسل متمدن اقوام پر حملے کرتے رہے ہیں اور ان ہی کے وحشیانہ حملوں کی حفاظت

کے لیے اور مشرقی تاخت و تاراج سے بچنے کے لیے مختلف اقوام نے مختلف دیواریں اور سد قائم کیں اور ان ہی میں سے ایک وہ سد ہے جو ذوالقرنین نے ایک قوم کے کہنے پر دو پہاڑوں کے درمیان لوہے اور تانبے سے ملا کر تیار کی تا کہ وہ یاجوج اور ماجوج کے مشرقی حملوں سے محفوظ ہو جائے۔

یاجوج وماجوج کا ذکر توراۃ میں بھی ہے چنانچہ حزقیل علیہ السلام کے صحیفہ میں یوں کہا گیا ہے:

> اور خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد توجوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے سزا دوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں دیکھ میں تیرا مخالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار اور میں تجھے پلٹ دوں گا۔ (ماروں گا) (حزقیل باب ۳۸ آیت ۱-۳)
>
> اور میں یاجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا[۱] اور اس دن یوں ہوگا کہ میں وہاں اسرائیل میں جوج کو ایک گورستان دوں گا یعنی رہ گذروں کی وادی جو سمندر کے پورب ہے اور اس کے رہ گذروں کی راہ بند ہو گی اور وہ وہاں جوج کو اور اس کی جماعت کو گاڑ دیں گے اور اسے ہامون جوج کی وادی نام رکھیں گے۔ (حزقیل باب ۳۹ آیت ۱۱)

ان حوالوں میں جوج ماجوج روش مسک اور توبال کا ذکر ہے اور ان کو خدا کا مخالف بتایا گیا ہے۔ اور مظالموں کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو پھرا دے گا اور ان کے جبڑوں میں بنسیاں مارے گا تا کہ وہ پلٹ جائیں اور یہ کہ قیامت کے قریب ان وحشی اور ظالم قبائل کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا اور ان کی موت سے عرصہ تک رہ گذروں کے لیے راہیں بند ہو جائیں گی۔

ان ناموں کی تفصیل میں توراۃ کے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ جوج سے مراد گاگ (GOG) ہے اور ماجوج سے میگاگ (MAGOG) اور روش سے روس (RUSOSIA) اور مسک سے مراد ماسکو (MOSCOW) اور توبال سے بحر اسود کا بالائی علاقہ مراد ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ توراۃ کی شہادت بھی اس سے اتفاق کرتی ہے کہ لفظ یاجوج اور ماجوج ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہو گیا تھا جو منگولیا اور کیشیا سے لے کر دور تک مشرق میں پھیلتے چلے گئے تھے اور یہ کہ حزقیل علیہ السلام کے زمانہ تک روس (RUSSIA) کا علاقہ تہذیب و تمدن اور حضارت سے عاری اور وحشی قبائل کا موطن اور مسکن تھا اور قتل و غارت گری کا پیشہ کرتا تھا اور ظلم و ستم ان کا روزمرہ کا مشغلہ تھا لہٰذا حضرت حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئیوں میں یہ بشارت دی گئی کہ وہ وقت قریب ہے جب کہ ان قبائل کی تاخت و تاراج کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک کے لیے بند ہو جائے گا اس پیشین گوئی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جوج شمال کی جانب سے آئے گی تا کہ لوٹ مار کرے اور یہ کہ ماجوج اور جزیروں میں بسنے والوں پر سخت تباہی آئیگی اور یہ کہ اسرائیلی بھی ماجوج کے مقابلہ میں حصہ لیں گے۔

اب اگر تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو آپ پر یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح سے بحر خزر اور بحر اسود کا علاقہ وحشی اور خونخوار قبائل کا مرکز بنا ہوا ہے جو مختلف ناموں کے ساتھ موسوم ہوتے رہے ہیں یا

۱: حزقیل باب ۳۹ آیت ۶

لا آخران میں سے ایک زبردست قبیلہ نمودار ہوتا ہے جو تاریخ میں سنتھینین کے نام سے مشہور ہے یہ وسط ایشیا سے بحر اسود کے شمالی کناروں تک پھیلا ہوا ہے اور اطراف میں مسلسل حملے کرتا رہتا اور متمدن اقوام پر تباہی لاتا رہتا ہے یہ زمانہ بابل و نینویٰ کے عروج اور آشوریوں کے تمدن کے آغاز کا زمانہ تھا پھر تقریباً ساڑھے چھ سو قبل مسیح میں ان کے ایک بڑے زبردست گروہ نے اپنی بلندیوں سے اتر کر ایران کا تمام مغربی حصہ تہ وبالا کر دالا۔

اب ۵۲۹ قبل مسیح میں سائرس (کیخسرو) کا ظہور ہوتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اس کے ہاتھوں بابل کی تباہی بنی اسرائیل کی آزادی اور میڈیا و فارس کی دو سلطنتوں کی ایک جا طاقت اک نظارہ سامنے آتا ہے اور ٹھیک حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے خصوصی امتیازات اس کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور سنتھینین قبائل کے مغربی حملوں سے حفاظت کے لیے اس کے ہاتھوں وہ سد قائم ہوتی ہے جس کا ذکر بار بار آرہا ہے۔

بہر حال ان تمام تاریخی مصادر سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ حزقیل علیہ السلام کی پیشین گوئی کے مطابق وہ یاجوج و ماجوج جن کی حفاظت کے لیے سائرس (ذوالقرنین) نے سد تیار کی ہی سنتھینین قبائل تھے جو ابھی تک اپنی وحشیانہ خصائص و خصائل کے اسی طرح حامل تھے جس طرح ان کے پیشرو اپنے مرکز میں رہتے ہوئے ان امتیازات کے ساتھ یاجوج و ماجوج کہلاتے رہے تھے اور یہ دراصل ایک مزید ثبوت ہے اس دعویٰ کے لیے کہ ذوالقرنین "سائرس" (کیخسرو) ہی تھے۔

یاجوج و ماجوج کے متعلق جس قدر بحث اس وقت تک کی جاچکی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق نہیں ہیں بلکہ دنیاءانسانی کی عام آبادی کی طرح وہ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں سے ہیں اور یہ کہ یاجوج و ماجوج منگولیا (تارتار) کے ان وحشی قبائل کو کہا جاتا رہا ہے جو یورپ اور روس کی اقوام کے منبع و منشاء ہیں اور چونکہ ان کی ہمسایہ قوم ان قبائل میں سے دو بڑے قبیلوں کو موگ اور یوچی کہتی تھی اس لیے یونانیوں نے ان کی تقلید میں ان کو میک یا میگاگ اور یوگاگ کہا اور عبرانی اور عربی میں تصرف کر کے ان کو یاجوج و ماجوج سے یاد کیا گیا۔

اب ان تاریخی حقائق کی تائید میں عرب مؤرخین اور محقق مفسرین و محدثین کی تحقیق بھی قابل مطالعہ ہے تاکہ گذشتہ سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس کی تصویب ہو سکے۔

حافظ عمادالدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں تصریح فرماتے ہیں۔

ویافث ابو الترك فیاجوج و ماجوج طائفة من الترك وهم مغلول المغلول وهم اشد بأسا و اکثر فساداً من هؤلاء (البدایه النهایه ج ۲ ص ۱۱۰)

اور یافث تاتاریوں کا نسلی باپ ہے پس یاجوج و ماجوج تاتاریوں ہی کی ایک شاخ ہیں اور منگولیا کے قبائل کے منگولی ہیں اور دوسرے تاتاریوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور اور بہت زیادہ فسادی اور لوٹ مار مچانے والے ہیں۔

اور اپنی تفسیر میں بھی اسی کی تائید فرماتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ قبائل یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور ان کا مولد و وطن منگولیا کا وہی علاقہ ہے جہاں سے قوموں کے طوفان اٹھے اور اٹھ کر یورپ

وغیرہ میں جا کر بسے ہیں۔

اور ابن اثیر نے کامل میں یہ تحریر فرمایا ہے:

وقد اختلف الاقوال فیهم والصحیح انهم نوح من الترك لهم شوكة وفيهم شروهم كثيرون و كانوا يفسدون فيما يحاورهم من الارض ويخربون ما قدروا عليه من البلاد يؤذون من يقرب منهم ۔ (ج۱ ص۶۸)

یاجوج و ماجوج کے متعلق مختلف اقوال ہیں اور صحیح قول یہ ہے کہ وہ تاتاریوں ہی میں سے ایک قسم کے تاتاری ہیں۔ وہ بہت طاقتور ہیں اور ان میں شر و فساد کا مادہ بہت ہے اور وہ بہت بڑی تعداد رکھتے ہیں اور قرب و جوار کی زمین میں فساد پھیلاتے اور جس بستی پر قابو پا جاتے اس کو برباد کر ڈالتے تھے پڑوسیوں کو ایذا پہنچاتے رہتے تھے۔

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:

ان ياجوج و ماجوج قبيلتان من ولد يافث بن نوح عليه السلام وبه جزم وهب بن منبه وغيره واعتمده كثير من المتأخرين ۔ (ج۱۶ ص۳۶)

یاجوج و ماجوج یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے ہیں اور وہب بن منبہ اسی پر یقین رکھتے ہیں اور متاخرین میں سے اکثر کی یہی رائے ہے۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

وفي كلام بعضهم ان الترك منهم لما اخرجه ابن جرير وابن مردويه من طريق السدي من اثر قوى الترك سرية من سرايا ياجوج و ماجوج۔

اور بعض کہتے ہیں کہ ترک (تاتاری) ان ہی میں سے ہیں جیسا کہ ابن جریر اور ابن مردویہ نے سدی سے ایک قوی اثر نقل کیا ہے کہ ترک (تاتاری) یاجوج و ماجوج کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہیں۔

وفي رواية عن عبدالرزاق عن قتادة ان ياجوج و ماجوج ثنتان و عشرون قبيلة ۔ (ج۱۳ ص۵۰)

اور عبدالرزاق نے حضرت قتادہ سے روایت کی ہے کہ یاجوج اور ماجوج بائیس قبائل کا مجموعہ ہیں۔

اس کے علاوہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں یاجوج و ماجوج سے متعلق جو کچھ نقل فرمایا ہے وہ بھی نقل بالا کی ہی تائید کرتا ہے[1] اور علامہ طنطاوی اپنی تفسیر جواہر القرآن میں لکھتے ہیں:

"یاجوج و ماجوج اپنی اصل کے اعتبار سے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں اور یہ نام لفظ "اجیج النار" سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگ کے شعلہ اور شرارہ کے ہیں گویا ان کی شدت اور کثرت کی طرف اشارہ ہے اور بعض اہل تحقیق نے ان کی اصل پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ مغلوں (منگولیوں) اور تار تاریوں کا سلسلۂ نسب ایک شخص "ترک" نامی پار پہونچتا ہے اور یہی شخص ہے جس کو ابوالفداء ماجوج کہتا ہے۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاجوج و ماجوج سے مراد منگولین

۱: جلد ۱۳ صفحہ ۹۰

اور تار تاری قبائل ہی ہیں ان قبائل کا سلسلہ ایشیا، کے شمالی کنارہ سے شروع ہو کر تبت اور چین سے ہوتا ہوا محیط منجمد شمالی تک چلا گیا ہے اور غربی جانب ترکستان کے علاقہ تک پھیلا ہوا ہے فاکہۃ الخفاء اور ابن مسکویہ کی تہذیب الاخلاق اور رسائل اخوان الصفا ان سب نے یہی کہا ہے کہ یہی قبائل یاجوج و ماجوج کہلاتے ہیں۔ (جلد۹ ص۱۹۹)

اور ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں یاجوج و ماجوج کے مستقر اور اس کی جغرافیائی حیثیت کو اس طرح واضح کیا ہے:

ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں مغرب کی جانب ترکوں کے وہ قبائل آباد ہیں جن کو قفچاق اور چرکس کہا جاتا ہے اور مشرق کی جانب یاجوج کی آبادیاں اور ان دونوں کے درمیان کوہ قاف حد فاصل ہے جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے کہ وہ بحر محیط سے شروع ہوتا ہے جو چوتھی اقلیم کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب اقلیم کے آخر تک چلا گیا ہے اور پھر بحر محیط (ATLANTIC) سے جدا ہو کر شمال مغرب میں ہوتا ہوا یعنی مغرب کی جانب جھکتا ہوا پانچویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے یہاں سے وہ پھر اپنی پہلی سمت کو مڑ جاتا ہے حتیٰ کہ ساتویں اقلیم کے نویں حصہ میں داخل ہو جاتا ہے اور یہاں پہونچ کر جنوب سے شمال مغرب کو ہوتا ہوا گیا ہے اور اسی سلسلۂ کوہ کے درمیان ''سد سکندری'' ہے۔ جس کی اطلاع قرآن نے بھی دی ہے۔ اور عبد اللہ بن خرداد بہ نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں واثق باللہ (خلیفہ عباسی) کا وہ خواب نقل کیا ہے جس میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ سد کھل گئی ہے چنانچہ وہ گھبرا کر اٹھا اور دریافت حال کے لیے ''سلام ترجمان'' کو روانہ کیا اور اس نے واپس آکر اسی سد کے حالات و اوصاف بیان کیے۔

اور ساتویں اقلیم کے دسویں حصہ میں ماجوج کی بستیاں ہیں جو مسلسل آخر تک چلی گئی ہیں یہ حصہ بحر محیط کے ساحل پر واقع ہے جو اس کے مشرقی شمالی حصہ کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے شمال میں تو طول میں چلا گیا ہے اور بعض مشرقی حصہ میں عرض میں گیا ہے۔[۱]

ابن خلدون نے یاجوج و ماجوج اور سد کے متعلق اسی طرح اقلیم رابع، اقلیم خامس اور اقلیم سابع کی بحث میں بھی ضمناً بیان کیا ہے بلکہ اقلیم رابع میں یہ بھی تصریح ہے:

وعلى قطعه من البحر المحيط هنالك هو جبل ياجوج وما جوج وهذه الامم كلها من شعوب الترك۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۷۹ بحث الاقلیم السادس)

اور اقلیم رابع کے جزء عاشر کا ایک حصہ بحر محیط کے اوپر واقع ہے اور یہ جبل یاجوج و ماجوج ہے اور یاجوج و ماجوج تمام قبائل ترک ہیں۔

گذشتہ بحث میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ منگولیا یا کاکیشیا کے یہ قبائل جب تک اپنے مرکز میں رہتے ہیں یاجوج و

۱: مقدمہ ابن خلدون ص ۹۷ بحث الاقلیم السادس۔ یہ واضح رہے کہ جبل قوقایا کوہ قاف اور جبال کاکیشیا ایک ہی چیز ہیں۔ (مؤلف)

ماجوج کہلاتے ہیں اور جب وہاں سے نکل کر کہیں بس جاتے اور صدیوں بعد متمدن ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس نام کو بھلا دیتے ہیں اور دوسرے بھی ان کو اس وحشیانہ امتیاز سے یاد نہیں کرتے کیونکہ پھر یہ اپنے مرکز سے اس قدر اجنبی ہو جاتے ہیں کہ مرکز کے وحشی قبائل ان کو بھی اپنا حریف بنا لیتے اور ان پر غارت گری کرتے رہتے ہیں اور یہ بھی اپنے ہی ہم نسل مرکزی وحشی قبائل سے اسی طرح خوف کھانے لگتے ہیں جس طرح دوسرے قبائل۔ چنانچہ اس مسئلہ کی تائید حافظ عماد الدین ابن کثیر کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے تحریر فرماتے ہیں۔

حتی اذا بلغ بین السدین وهما جبلان متنا وحان بینهما ثغرة یخرج منهما یاجوج وما جوج علی بلاد الترك فیعیشون فیها فساداً ویهلکون الحرث والنسل۔

(تفسیر جلد ۲ صفحہ ۱۰۳ جدید ایڈیشن)

سدین سے مراد وہ دو پہاڑ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں اور ان کے درمیان شگاف ہے۔ اسی شگاف سے یاجوج وماجوج ترکوں کے شہروں پر آپڑتے اور ان میں فساد مچا دیتے اور کھیتوں اور نسلوں کو ہلاک اور برباد کر ڈالتے تھے۔

یعنی یاجوج وماجوج بھی اگرچہ منگولی (تاتاری) ہیں مگر پہاڑوں کے درے جو تاتاری قبائل اپنے مرکز سے ہٹ کر آباد ہو گئے تھے اور متمدن بن گئے تھے ہم نسل ہونے کے باوجود دونوں میں اس قدر تفاوت ہو گیا کہ ایک دوسرے سے ناآشنا بلکہ حریف بن گئے اور ایک ظالم کہلائے اور دوسرے مظلوم اور ان ہی قبائل نے ذوالقرنین سے سد بنانے کی فرمائش کی۔

اور بعض عرب مؤرخین نے تو ترک کی وجہ تسمیہ ہی یہ بیان کر دی کہ یہ وہ قبائل ہیں جو یاجوج وماجوج کے ہم نسل ہونے کے باوجود سد سے ورے آباد تھے اور اس لئے جب ذوالقرنین نے سد قائم کی اور ان کو اس میں شامل نہیں کیا تو اس چھوڑ دیئے جانے کی وجہ سے ترک کہلائے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲)

یہ وجہ تسمیہ اگرچہ ایک لطیفہ ہے تاہم اس امر کا ثبوت ضرور بہم پہنچاتی ہے کہ متمدن قبائل تمدن و حضارت کے بعد اپنے ہم نسل سے اجنبی ہو جاتے تھے اور وہ یاجوج وماجوج نہیں کہلاتے تھے اور لفظ یاجوج وماجوج ان ہی قبائل کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں جو اپنے مرکز میں سابق کی طرح ہنوز وحشت و بربریت اور درندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

سد

یاجوج وماجوج کے اس تعین کے بعد دوسرا مسئلہ "سد" کا سامنے آتا ہے یعنی وہ "سد" کس جگہ واقع ہے جو ذوالقرنین نے یاجوج وماجوج کے فتنہ وفساد کو روکنے کیلئے بنائی اور جس کا ذکر قرآن عزیز میں بھی کیا گیا ہے۔

تعین سد سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ یاجوج وماجوج کی تاخت و تاراج اور شر وفساد کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ ایک طرف کاکیشیا کے نیچے بسنے والے ان کے ظلم وستم سے نالاں تھے تو دوسری جانب تبت اور چین کے باشندے بھی ان کی شمالی دستبرد سے محفوظ نہ تھے اس لیے صرف ایک ہی غرض کے لیے یعنی قبائل یاجوج وماجوج کے شر وفساد اور لوٹ مار سے بچنے کے لیے مختلف تاریخی زمانوں میں متعدد "سد" تعمیر کی گئیں۔

ان میں سے ایک ''سد'' وہ ہے جو دیوار چین کے نام سے مشہور ہے یہ دیوار تقریباً ایک ہزار میل طویل ہے اس دیوار کو منگولی اتکودہ کہتے ہیں اور ترکی میں اس کا نام بوقورقہ ہے۔

دوسری سد وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے اور اسکے محل وقوع کا نام دربند ہے یہ سد مشہور مغل بادشاہ تیمور لنگ کے زمانہ میں موجود تھی اور شاہ روم کے ندیم خاص سیلا برجر جرمنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور اندلس کے بادشاہ کسٹیل کے قاصد کلاچو نے بھی اپنے سفر نامہ میں کیا ہے، یہ ۱۴۰۳ء میں اپنے بادشاہ کا سفیر ہو کر جب تیمور صاحبقران کی خدمت میں حاضر ہوا ہے تو اس جگہ سے گذرا ہے وہ لکھتا ہے کہ باب الحدید کی سد موصل کے اس راستے پر ہے جو سمرقند اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے۔

(جواہر القرآن جلد ۹ ص ۱۹۸)

تیسری ''سد'' روسی علاقہ داغستان میں واقع ہے یہ بھی دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے اور بعض مؤرخین اس کو ''الباب'' بھی لکھ دیتے ہیں، یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ادریسی نے جغرافیہ میں اور بستانی نے دائرۃ المعارف میں اس کے حالات کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے:

''داغستان میں دربند ایک روسی شہر ہے، یہ شہر بحر خزر (کاسپین) غربی کے کنارہ واقع ہے، اس کا عرض البلد ۳-۴۳ شمالاً اور طول البلد ۱۵-۴۸ شرقاً ہے اور اس کو دربند انوشیرواں بھی کہتے ہیں اور باب الابواب کے نام سے بہت مشہور ہے اور اس کے اطراف وجوانب کو قدیم زمانہ سے چہار دیوار گھیرے ہوئے ہیں جن کو قدیم مؤرخین ابواب البانیہ کہتے آئے ہیں اور اب یہ خستہ حالت میں ہے اور اسکو باب الحدید اسلئے کہتے ہیں کہ اسکی سد کی دیواروں میں لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک لگے ہوئے تھے۔

(دائرۃ المعارف جلد ۷ ص ۶۵۱، معجم البلدان ج ۸ ص ۹)

اور جب اسی باب الابواب سے مغرب کی جانب کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں بڑھتے ہیں تو ایک درہ ملتا ہے جو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور یہ کاکیشیا کے بہت بلند حصوں سے گزرا ہے، یہاں ایک چوتھی سد ہے جو قفقاز یا جبل قوقایا جبل قاف کی سد کہلاتی ہے اور یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان بنائی گئی ہے۔ بستانی اسکے متعلق لکھتا ہے:

اور اسی کے قریب ایک اور ''سد'' ہے جو غربی جانب بڑھتی چلی گئی ہے غالباً اس کو اہل فارس نے شمالی بربروں سے حفاظت کی خاطر بنایا ہوگا کیونکہ اس کے بانی کا صحیح حال نہیں معلوم ہو سکا۔ بعض نے اس کی نسبت سکندر کی جانب کر دی اور بعض نے کسریٰ ونوشیرواں کی جانب اور یاقوت کہتا ہے کہ یہ تانبا پگھلا کر اس سے تیار کی گئی ہے۔ (دائرۃ المعارف جلد ۷ ص ۶۵۲)

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی ''دربند'' کے مقالہ میں اس آہنی دیوار کا حال قریب قریب اسی کے بیان کیا گیا ہے۔ (نواں ایڈیشن جلد ۷ لفظ دربند ص ۱۰۶)

چونکہ یہ سب دیواریں شمال ہی میں بنائی گئی ہیں اور ایک ہی ضرورت کے لیے بنائی گئی ہیں اس لیے ذوالقرنین کی بنائی ہوئی سد کے تعین میں سخت اشکال پیدا ہو گیا ہے اور اسی لیے ہم مؤرخین میں اس مقام پر سخت اختلاف پاتے ہیں اور اس اختلاف نے ایک دلچسپ صورت اختیار کر لی ہے اسلئے کہ دربند کے نام سے دو مقامات کا ذکر آتا ہے اور دونوں مقامات میں سد یا دیوار بھی موجود ہے اور غرض بنا بھی ایک ہی نظر آتی ہے۔

تو اب دیوار چین کو چھوڑ کر باقی تین دیواروں کے متعلق قابل بحث یہ بات ہے کہ ذوالقرنین کی سد ان

تینوں میں سے کون سی ہے اور اس سلسلہ میں جس دربند کا ذکر آتا ہے وہ کون سا ہے۔

مؤرخین عرب میں سے مسعودی، قزوینی، اصطخری، حموی سب اسی دربند کا ذکر کر رہے ہیں جو بحر خزر پر واقع ہے وہ کہتے ہیں کہ اس شہر میں داخل ہونے سے پہلے بھی دیوار ملتی ہے اور شہر کے بعد بھی دیوار ہے اگرچہ ایک دیوار چھوٹی ہے اور دوسری بڑی، مگر شہر سد یا دیواروں سے گھرا ہوا ہے اور ایران کے لیے یہ مقام خاص اہمیت رکھتا ہے اور دیوار سے پرے بسنے والے قبائل کی زد سے بچاتا ہے البتہ ابوالضیاء اور بعض اس سے ناقل مؤرخین کو یہ غلطی ہوگئی کہ انھوں نے بخارا اور ترمذ کے قریب دربند کو اور بحر خزر کے قریب دربند کو ایک سمجھ کر ایک کے حالات کو دوسرے کے ساتھ خلط کر دیا ہے۔

مگر ادریسی نے دونوں کی جغرافیائی حالت کو مفصل اور جدا جدا بیان کر کے اس خلط کو دور کیا اور اصل حقیقت کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔

اس کے باوجود حال کے بعض اہل قلم کو اس غلطی پر اصرار کہ سد ذوالقرنین یا سد سکندری کے سلسلہ میں جس سد کا ذکر آتا ہے اس سے بحر خزر یا بحر قزوین کا دربند مراد نہیں ہے بلکہ بخارا اور ترمذ کے قریب قریب جو دربند حصار کے علاقہ میں واقع ہے وہ مراد ہے۔ (صدق ۱۸/ اگست ۱۹۴۱ء، مضمون سد سکندری)

بہرحال یہ مؤرخین بحر خزر اور کاکیشیا کے علاقہ دربند (باب الابواب) کی دیوار کے متعلق یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآن عزیز میں جس سد کا ذکر ہے وہ یہی ہے مگر یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ کوئی اس کو سد سکندری کہتا ہے اور کوئی سد نوشیروانی غرض دربند کے متعلق جب بھی مؤرخین کو خلط ہو جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی محقق اس کو دور کر کے یہ ضرور واضح کر دیتا ہے کہ سد ذوالقرنین کا تعلق اس دربند سے ہے جو کاکیشیا میں بحر خزر کے کنارہ واقع ہے اس دربند سے نہیں ہے جو بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے چنانچہ وہب بن منبہ فرماتے ہیں:

> قرآن عزیز میں جو بین السدین آیا ہے تو سدین سے مراد جبلین ہے یعنی دو پہاڑ کہ جن کے درمیان سد قائم کی گئی ہے پہاڑ کی یہ دونوں چوٹیاں بہت بلند ہیں اور ان کے پیچھے بھی آبادیاں ہیں اور ان کے سامنے بھی اور یہ دونوں منگولین سرزمین کے اس آخری کنارہ پر واقع ہیں جو آرمینہ اور آذربیجان کے متصل ہے۔
> (تفسیر البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۶ ص ۱۶۳)

اور علامہ ہروی فرماتے ہیں:

> یہ دو پہاڑ کہ جن کے درمیان ذوالقرنین کی سد قائم ہے تاتاری قبائل کے ورے واقع ہیں۔ (یعنی سد ان کو اس جانب آنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی ہے) (تفسیر البحر المحیط ابوحیان اندلسی ج ۶ ص ۱۶۳)

اور امام رازی تحریر فرماتے ہیں:

> زیادہ صاف بات یہ ہے کہ ان دو پہاڑوں کا جاءِ وقوع جانب شمال میں ہے اور (تعین میں) بعض نے کہا ہے کہ وہ دو پہاڑ آرمینہ اور آذربیجان کے درمیان واقع ہیں اور بعض نے کہا کہ تاتاری قبائل کی سرزمین کا جو آخری کنارہ ہے وہاں واقع ہیں۔

اور طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ:

> شاہ آذربیجان کو بالمشافہ سد کے حالات سنائے، اس نے بتایا کہ وہ پہاڑوں کے درمیان ایک بلند سد ہے اور اس کے اس جانب بہت بڑی خندق ہے جو نہایت گہری ہے۔

اور ابن خردادنے کتاب المسالک والممالک میں بیان کیا ہے کہ:

واثق باللہ نے ایک خواب دیکھا تھا کہ گویا اس نے اس سد کو کھول ڈالا ہے اس خواب کی بناء پر اس نے اپنے بعض عمال کو اس کی تحقیق کے لیے بھیجا تاکہ وہ اس کا معائنہ کریں سو یہ لوگ باب الابوب سے آگے بڑے اور ٹھیک سد کے مقام پر پہنچ گئے انھوں نے واثق باللہ سے آکر بیان کیا کہ یہ سد لوہے کے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہے جس میں پگھلا ہوا تانبا شامل کیا گیا ہے اور اس کا آہنی دروازہ مقفل ہے پھر جب انسان وہاں سے واپس ہوتا ہے تو راہنما اس کو ایسے چٹیل میدانوں میں پہنچاتے ہیں جو سمر قند کے محاذات میں واقع ہیں۔ (تفسیر بیر جلد ۵ ص ۵۱۳، جواہر ج ص ۲۵۶)

ابو ریحان بیرونی کہتے ہیں کہ اس تعارف کا مقتضایہ ہوا کہ وہ زمین کے ربع شمال مغربی میں واقع ہے۔

اور سید محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:

یہ دو پہاڑ ارض متعین جہت شمالی میں واقع ہیں اور کتاب حزقیل علیہ السلام میں حرج کے متعلق جو یہ لکھا ہے کہ وہ شمال کی جانب سے آخری دنوں میں آئیں گے اس سے بھی یہی مراد ہے اور کاتب چلپی کا میلان بھی اسی جانب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے آرمینہ اور آذربیجان کے پہاڑ مراد ہیں اور قاضی بیضاوی کی رائے بھی یہی ہے اور بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی روایت ہے اگرچہ اس قول کا تعاقب کیا گیا ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے ان اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک اس کا مصداق باب الابواب (اور بند بحر قزوین) ہے حالانکہ ان ہی مؤرخین کے نزدیک اس کا بانی کسریٰ نوشیرواں ہے۔

(خلاصہ روح المعانی ج ۱۶ ص ۳۵)

اور ابن ہشام "ترک" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

ان میں سے ایک جماعت مسلمان ہوگئی تھی اسلئے جب ذوالقرنین نے آرمینہ میں (یعنی ان پہاڑوں میں جو آرمینہ سے آگے دور تک چلے گئے ہیں) سد بنانی شروع کی تو ان کو سد کے اس جانب چھوڑ دیا پس اس ترک کرنے پر وہ "ترک" کہلائے، وترکھم فسموا الترك لذلك۔ (کتاب التیجان)

اور حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری (نور اللہ مرقدہ) عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:

"قرآن عزیز نے ذوالقرنین کے تیسرے سفر کی جہت کا ذکر نہیں کیا اور قرینہ یہ بتاتا ہے کہ وہ شمال کی جانب تھا اور اسی جانب اس کی سد ہے جو قفقاز کے پہاڑوں کے درمیان واقع ہے اور جس غرض کیلئے ذوالقرنین نے سد بنائی تھی اسی غرض کیلئے اور بادشاہوں نے بھی سد تعمیر کی ہیں مثلاً چینیوں نے دیوار چین بنائی جسکو منگولین انکورہ اور ترک بوقورقہ کہتے ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ نے اسکا مفصل ذکر کیا ہے اور اسی طرح بعض عجمی بادشاہوں نے دربند (باب الابواب) کی سد کی تعمیر کی اور اسی طرح اور سد بھی ہیں جو شمال ہی کی جانب ہیں۔

(ملخص عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۱۹۸)

اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں کاکیشیا کے علاقہ یا بحر قزوین کے کنارہ واقع دربند (باب الابواب) کے متعلق جو مقالہ ہے اس میں تحریر ہے:

یہاں جو دربند ہے یزدگرد اول نے دوبارہ صاف کرایا اور اس کی مرمت کرائی، اس دیوار کو سکندر اعظم کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ (جلد ۱ ص ۱۴۰)

اور دوسری جگہ بحر خزر کے متعلق تحریر ہے:

رسالہ اخوان الصفا میں جو بحر یاجوج وماجوج کا ذکر آیا ہے تو اس سے مراد بحر کاسپین یعنی بحر خزر ہے۔ (ص ۱۱۴۲ بحث یاجوج، ماجوج)

پس عرب مؤرخین، محدثین، مفسرین اور محققین تاریخ کے ان حوالجات سے چند امور ثابت ہوتے ہیں:-

۱) کوئی ایک مؤرخ بھی یہ صراحت نہیں کرتا کہ دربند ضلع حصار کی سد "سد سکندری" ہے۔

۲) ابوالفداء اور بعض مؤرخین کو دربند کے متعلق یہ خلط ہو گیا ہے کہ وہ بحر قزوین والے دربند کا ذکر شروع کرتے ہیں اور پھر ترمذ و بخارا والے دربند (حصار) کے ساتھ اس کو ملا دیتے ہیں اور دونوں کے درمیان امتیاز کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

۳) باقی تمام محققین مؤرخین ہوں یا محدثین و مفسرین امتیاز کے ساتھ یہ تصریح کر رہے ہیں کہ جو سد سد سکندری کے نام سے مشہور ہے وہ وہی ہے جو بحر قزوین کے قریب دربند (باب الابواب) میں واقع ہے۔

چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور دائرۃ المعارف بستانی میں بھی (جو کہ جدید و قدیم تحقیق کا ذخیرہ ہیں) یہی ہے۔ حتیٰ کہ برٹانیکا جلد ۱۳ ص ۵۲۶ طبع یازدہم میں جو دربدن بحر قزوین والے دربند کی سد کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کی نسبت سکندر کی جانب کی جاتی ہے اور اس لئے سد سکندری کے نام سے مشہور ہے۔

۴) وہب بن منبہ ابوحیان اندلسی صاحب ناسخ التواریخ (جو ایران کے درباری مؤرخ ہے) بستانی اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہؒ نے دربند "بحر قزوین" کے متعلق یہ توجہ دلائی ہے کہ سد ذوالقرنین اس دربند بحر قزدین میں نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اوپر قفقاز کے آخری کنارہ پر پہاڑوں کے درمیان واقع ہے چنانچہ مولانا ابوالکلام نے اپنی تفسیر میں اس کا درہ داریال کے نام سے ذکر کیا ہے۔

اب ان چاروں باتوں سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لیجئے اور اس مسئلہ میں بھی سابق کی طرح قرآن عزیز ہی کو حکم بنائیے تاکہ معاملہ واضح سے واضح تر ہو جائے۔

سد ذوالقرنین کے متعلق قرآن عزیز نے دو باتیں صاف صاف بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ سد دو پہاڑوں کے درمیان تعمیر کی گئی ہے اور اس نے پہاڑوں کے درمیان اس درہ کو بند کر دیا ہے جہاں سے ہو کر یاجوج و ماجوج اس جانب کے بسنے والوں کو تنگ کرتے تھے،

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ (ای بین الجبلین [۱]) وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُوْنَ

۱: سدین کی تفسیر میں امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں روایت کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے اس میں ہے "ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ کو اطلاع دی یا رسول اللہ ﷺ میں نے سد کو دیکھا ہی نہیں ہے جیسے یمنی چادر "مثل الحبر والمحر" آپ ﷺ نے فرمایا تو نے ضرور اس کو دیکھا ہے قال قد رائیتہ۔

یہ روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس شخص نے لوہے تانبے سے مخلوط بنی ہوئی دیوار کو دیکھا کیونکہ "حمرہ" کے معنی اس زردی کے آتے ہیں جو دانتوں پر جمی ہوئی نظر آتی ہے اور یمنی چادریں سیاہ اور زرد یا سیاہ اور سرخ مخلوط دھاری دار ہوتی ہیں، اس روایت کے موصول ہونے نہ ہونے میں کلام ہے جو فتح الباری میں قابل مراجعت ہے۔

يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يَاذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ۔

یہاں تک کہ جب ذوالقرنین دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو ان دونوں کے اس طرف ایک ایسی قوم کو پایا جن کی بات وہ پوری طرح نہیں سمجھتا تھا، کہنے لگے 'اے ذوالقرنین بلا شبہ یاجوج و ماجوج اس سرزمین میں فساد مچاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ سد چونے یا اینٹ گارے سے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ لوہے کے ٹکڑوں سے تیار کی گئی ہے جس میں تانبا پگھلا ہوا شامل کیا گیا تھا،

أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ آتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ط حَتّٰى إِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰى إِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ آتُوْنِيْ أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝

میں تمہارے اور اس کے (یاجوج و ماجوج کے) درمیان ایک موٹی دیوار قائم کر دوں گا تم میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لا کر دو یہاں تک کہ پہاڑ کی دونوں پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان جب دیوار کو برابر کر دیا تو اس نے کہا کہ دھونکو یہیں تک کہ جب دھونک کر اس کو آگ کر دیا کہا لاؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبہ کہ اس پر ڈالوں۔ (الجواہر طنطاوی ج ا ص ۱۹۸)

قرآن عزیز کی بتائی ہوئی ان دونوں صفات کو سامنے رکھ کر اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ بغیر کسی تاویل کے ان کا مصداق کون سی سد ہو سکتی ہے اور کس سد پر یہ صفات ٹھیک صادق آتی ہیں۔

سب سے پہلے ہم اس سد پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دربند (حصار) میں واقع ہے۔ اس سد کے حالات ساتویں صدی کے کا چینی سیاح نے ہی نہیں بیان کیے بلکہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، شاہ رخ کے جرمنی مصاحب سیلد بر جر اور ہسپانوی سفیر کلافچو نے بھی پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس کا مشاہدہ کیا ہے اور انھوں نے بھی یہ کہا ہے کہ یہاں آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں، مگر مؤرخین یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ یہ سد (دیوار) پتھر اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے اور آہنی دروازوں کے علاوہ دیوار کسی جگہ بھی لوہے اور تانبے سے بنی ہوئی نہیں ہے اور لوہے کے پھاٹکوں کی وجہ سے اس کو بھی اسی طرح درہ آہنی کہتے ہیں جس طرح درہ بند (بحر قزوین) کو درہ آہنی کہا جاتا ہے۔

نیز یہ دیوار جس طرح پہاڑوں کے درمیان چلی گئی ہے اسی طرح اس کا ایک حصہ سطح زمین پر بھی بنایا گیا ہے ،ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف دو پہاڑوں کی پھانکوں (چوٹیوں) کے درمیان ہی میں قائم کی گئی ہو۔

پس اس دیوار کو سد ذوالقرنین کہنا قرآنی تصریحات کے قطعاً خلاف ہے اور غالباً اسی وجہ سے کسی ایک مؤرخ نے بھی (جو کہ دربند) حصار اور دربند (بحر قزوین) کے درمیان امتیاز کر سکے ہیں) اس دیوار (سد) کو سد ذوالقرنین یا سد سکندری نہیں کہا۔

مگر تعجب ہے محترم مدیر صاحب صدق سے کہ انھوں نے قرآنی تصریحات کو سامنے رکھے بغیر تمام مؤرخین کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ دربند (حصار) کی دیوار (سد) ہی "سد سکندری" یعنی سد ذوالقرنین ہے۔ شاید وہ اس جدت کے لیے اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ ایک تو ان کا مسلک یہ ہے کہ سکندر مقدونی ہی ذوالقرنین

ہے اور دوسرے اس جانب میں سکندر کی فتوحات کی آخری حد اسی علاقہ تک ہے جیسا کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۱ء کے صدق کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

"سکندر اعظم اپنی تیسری فوج کشی میں اسی علاقہ تک گیا تھا۔"

ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کی صراحت کے بعد وہ مجبور ہیں کہ دربندر (حصار) کی سد ہی سد ذوالقرنین تسلیم کریں۔ مگر اس سے زیادہ یہ ظاہر ہے کہ اس سد پر نہ قرآن عزیز کی بیان کردہ صفات ہی کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ کوئی مؤرخ ہی اس کو سد سکندری یا سد ذوالقرنین کہتا ہے اور بالفرض اگر اس کو سکندری کی تعمیر تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی وہ سد ذوالقرنین کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ قرآنی صفات کے مطابق نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسرا نمبر دربند (بحر قزوین) کی دیوار (سد) کو زیر بحث لانے کا ہے اس کے متعلق یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس کو عرب باب الابواب اور الباب کہتے ہیں اور اہل فارس دربند اور وہ آہنی نام رکھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی کثرت سے مؤرخین اس دربند کی دیوار (سد) کو "سد سکندری" کہتے چلے آئے ہیں مگر محققین یہ بھی کہتے چلے آئے ہیں کہ بانی کا صحیح حال معلوم نہیں ہے، البتہ اس کو سد سکندری بھی کہہ دیتے ہیں اور کا کیشین دال (کاکیشیا کی دیوار) اور دیوار نوشیرواں بھی۔

لیکن ہم اس بحث کو مؤخر کرتے ہوئے کہ اس کے متعلق یہ اضطراب بیانی کیوں ہے اس سد کو سد ذوالقرنین جب ہی مان سکتے ہیں کہ یہ قرآن عزیز کے بیان کردہ ہر دو صفات کے مطابق پوری اترے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اس لیے کہ اس دیوار کے عرض و طول اور اس کے حجم کی تفصیلات دیتے ہوئے تمام مؤرخین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس دیوار کا بھی بہت بڑا حصہ سطح زمین تعمیر کیا گیا ہے اور آگے بڑھ کر پہاڑ پر بھی بنایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مانتے ہیں کہ اگرچہ دیوار بعض جگہ دوہری بھی ہے اور اس میں متعدد لوہے کے پھاٹک بھی ہیں جن میں سے بعض بعض پہاڑوں کے درمیان قائم ہیں اور پہاڑوں پر اس کے استحکامات بھی بہت ہیں تاہم یہ دیوار لوہے کے ٹکڑوں اور تانبے سے نہیں بنائی گئی بلکہ عام دیواروں کی طرح پتھر اور چونہ ہی سے بنائی گئی ہے پس اس کا بانی کوئی شخص بھی ہو اس دیوار کو سد ذوالقرنین کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، اب اس کو "سد سکندری" کہنا سو ہمیں اس سے انکار کی کوئی ضرورت نہ ہوتی اگر تاریخی حقائق اس دعویٰ کا ساتھ دیتے مگر حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہی مؤرخین جب سکندر مقدونی کا ذکر کرتے اور اس کی وسعت فتوحات کو زیر بحث لاتے ہیں تو ان میں سے کوئی ایک بھی یہ نہیں کہتا کہ سکندر اعظم کاکیشیا تک پہنچا ہے اور بقول مولانا ابوالکلام:

> لیکن جب سکندر کے تمام فوجی اعمال خود اس کے عہد میں اور خود اس کے ساتھیوں نے قلمبند کر دیئے ہیں اور ان میں کہیں بھی کاکیشیا کے استحکامات کی تعمیر کا اشارہ نہیں ملتا تو پھر کیوں کر ممکن ہے کہ اس طرح کی توجیہات قابل اطمینان تسلیم کر لی جائیں۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۲۸)

یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سکندر اعظم کی جانب یہ انتساب صحیح ہے۔

امریکہ کے ایک مشہور جغرافیہ داں کریم (CRAM) نے اپنے جغرافیہ کریمس یونیورسل اٹلیس (CRAMES UNIVERSAL AITLAS) میں سکندر اعظم کی سلطنت ۳۸۱ ۔ ۳۳۱ ق م کا جو مکمل نقشہ تیار کیا

ہے اس میں بھی کا کیشیا کا علاقہ اس کی فتوحات سے سینکڑوں میل دور نظر آتا ہے۔

بہر حال اکثر مؤرخین تو اس کا بانی نوشیرواں کو بتاتے ہیں اور جوزیفس سکندر کو اس کا بانی قرار دیتا ہے مگر بیان کردہ تاریخی حقائق کے پیش نظر نہ تو نوشیرواں کی نسبت صحیح ہے اور نہ اسکندر اعظم کی اور اگر ان دونوں میں سے کسی کی نسبت کو بالفرض صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی اس کو سد ذوالقرنین کہنا حقائق قرآنی سے آنکھیں بند کر لینا ہوگا، پس دربند (حصار ہو یا دربند (بحر خزر) دونوں کی "سد" سد ذوالقرنین نہیں ہے۔

تیسری قابل ذکر وہ سد ہے جو دربند (قزوین) یا کاسپین دال کے مغرب جانب میں ایک درہ کو بند کرتی ہے، یہ درہ بند سے مغرب کی جانب کا کیشیا کے اندرونی حصوں میں آگے بڑھتے ہوئے ملتا ہے اور درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع ہے، یہ درہ کا کیشیا کے بہت حصوں سے ہو کر گذرا ہے اور قدرتی طور پر پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے اس کو فارسی میں درۂ آہنی اور ترکی میں دامر کپو کہتے ہیں۔

اس درہ کے متعلق گذشتہ صفحات میں امام رازی کی تفسیر سے اس تشریح کے بعد یہ دو پہاڑ جن کے درمیان سد واقع ہے "قفقاز میں ہے" ہم ابن خرداد کی کتاب المسالک کا یہ حوالہ نقل کر چکے ہیں کہ واثق باللہ نے جب اپنے خواب کی تعبیر کے پیش نظر سد ذوالقرنین کی تحقیق کے لیے تحقیقاتی وفد (ریسرچ کمیشن) مقرر کیا اور اس نے باب الابواب (دربند) سے آگے چل کر جب اس کا مشاہدہ کیا ہے تو یہ تصریح کی ہے کہ یہ دیوار تمام لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے بنائی گئی ہے، اصل الفاظ یہ ہیں:

ان الواثق بالله رائ فی المنام کانه فتح هذا الروم فبعث بعض الخدم الیه لیعا ینوه فخرجوا من باب الابواب حتی وصلوا الیه وشاهد وه فوصفوا انه بناء من لبن من حدید مشدود بالنحاس المذاب وعیله باب مقفل۔[1]

---

[1] دربند نامہ کاظم بک ص ۲۱- یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض معاصر بزرگ زیر بحث سد ظاہر کرتے ہیں کہ یاقوت نے واثق باللہ کے تحقیقاتی وفد کی تفصیلات دیتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ اس سفر کی آمد و رفت میں چھ ماہ صرف ہوئے پس اگر ذوالقرنین کی سد درہ داریال کی سد ہوتی تو بغداد سے کاکیشین (کوہ قاف) کی راہ ایسی طویل نہیں ہے کہ یہ وفد اتنی مدت میں واپس آتا۔

مگر یہ "شک" صرف ایک قیاسی مغالطہ ہے اس لیے کہ اول تو یاقوت حموی نے اس واقعہ کی تفصیلات کو خود ہی اہمیت نہیں دی اور ایک داستان کی طرح اس کا ذکر کر دیا ہے جیسا کہ سلام ترجمان سے منقول اس داستان کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:

قد کتبت من خبر السد ما وجدته فی الکتاب ولست اقطع بصحة ما اوردته لاختلاف الروایات فیه والله اعلم بصحته۔ (معجم البلدان ج ۵)

میں نے سد کے حالات میں ان واقعات کو لکھ دیا ہے جن کو میں نے کتابوں میں لکھا پایا اور میں نے یہ جو کچھ بھی نقل کیا ہے میں ہرگز اس پر یقین نہیں کرتا کیونکہ اس سلسلہ میں مختلف روایات ہیں جن کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرے اس مدت سفر کی اس تصریح پر جب کچھ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ساتھ یہ تفصیلات بھی بیان کی جاتیں کہ ذرائع رسل و رسائل کیا تھے، درمیانی مقامات میں آمد و رفت کے موقعوں پر کس قدر قیام رہا اور مقام مطلوب میں مدت قیام کیا رہی جب کہ عراق سے کاکیشش (جبل قوقایا) کی پہاڑیوں تک تقریباً آٹھ سو نو سو میل کی ایک طرفہ مسافت ہے۔

علاوہ ازیں اس واقعہ کا ذکر ابن خلدون، ابن خرداذبہ، ابن کثیر رحمہم اللہ جیسے محققین مؤرخین و جغرافیہ داں بھی کرتے ہیں اور اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ واثق باللہ کا یہ وفد اسی زیر بحث سد تک گیا ہے اور واپس ہو کر اسی کے حالات اس نے خلیفہ کو سنائے ہیں۔

پس جب کہ آج کے مشاہدے سے بھی یہ ثابت ہے کہ داریال کا یہ درہ پہاڑوں کی دو چوٹیوں کے درمیان گھرا ہوا ہے اور تاریخی حقائق بھی اس کو تسلیم کرتے اور واضح کرتے ہیں نیز واثق باللہ کے کمیشن نے اپنا یہ مشاہدہ بیان کیا ہے کہ یہ دیوار لوہے اور پگھلے تانبے سے تیار کی گئی ہے بلا شبہ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ یہی دیوار وہ سد ذوالقرنین ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے بتائے ہوئے دونوں وصف صرف اسی دیوار پر منطبق ہوتے ہیں اسی لیے وہب، ابوحیان، ابن خرداد، علامہ انور شاہ اور مولانا آزاد جیسے محققین کی یہی رائے ہے، کہ سد ذوالقرنین قفقاز کے اسی درہ کی سد کا نام ہے۔

ان تصریحات کے بعد اب ہم کو کہنے دیجیے کہ درۂ داریال کی یہ سد سائرس (گورش یا کیخسرو) کی تعمیر کردہ ہے اور جیسا کہ ہم یاجوج و ماجوج کی بحث میں بیان کر چکے ہیں یہ ان وحشی قبائل کے لئے اس نے بنائی تھی جو کاکیشیا کے انتہائی علاقوں سے آکر اس ذرہ میں سے گذر کر قفقاز کے پہاڑوں کے اس طرف بسنے والوں پر لوٹ مار مچاتے تھے اور یہ وہی سنتھینین قبائل تھے جو سائرس کے زمانہ میں حملہ آور ہو رہے تھے اور اس وقت کے یاجوج و ماجوج کا مصداق یہی قبائل تھے اور ان ہی کی روک تھام کی ضرورت سے سائرس نے ایک قوم کی شکایت پر یہ سد تیار کی اور ارمنی نوشتوں میں اس سد کا جو قدیم نام بھاگ کورائی (کور کا درہ) لکھا چلا آتا ہے، اس کور سے مراد غالباً گورش ہے جو سائرس ہی کا فارسی نام ہے۔

اور اس کے قریب دربند (بحر خزر) کی دیوار اس کے بعد اسی غرض سے کسی دوسرے بادشاہ نے بنوائی ہے اور انوشیرواں نے اپنے زمانہ میں اس کو دوبارہ صاف اور درست کرایا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے حوالہ سے ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور ان تینوں دیواروں (سد) میں سے سکندر کی بنائی ہوئی کوئی ایک سد بھی نہیں ہے اس لئے کہ سکندر کی فتوحات کی تاریخ جو کہ سامنے ہے اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سکندر کو اس غرض کے لیے کسی سد قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو کیونکہ اس کی حکومت کے سارے دور میں یاجوج و ماجوج قبائل کا کوئی حملہ تاریخ میں موجود نہیں ہے اور نہ دربند (حصار) تک پہنچنے پر کسی قوم کا اس قسم کے وحشی قبائل سے دوچار ہونا سکندر سے اس کی شکایت کرنا تاریخی حقائق میں کہیں نظر آتا ہے۔

البتہ یہ بات ضرور قابل غور ہے کہ آخر دربند (بحر قزوین یا بحر خزر) کی دیوار کے متعلق سد سکندری کیوں مشہور ہوا۔ سو اس مسئلہ کے تمام حقائق کو پیش نظر رکھنے کے بعد بآسانی اس کا یہ حل سمجھ میں آجاتا ہے کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق یہود کی مذہبی روایات سے بہت زیادہ وابستہ ہے اور اسی لیئے یہود کے سوال پر قرآن عزیز نے بھی اس کا ذکر کیا ہے تو اس بدعت اور غلط انتساب کی ابتداء بھی وہیں سے ہوئی ہے اور سب سے پہلے جوزیفس نے اس کے متعلق یہ بلا دلیل بیان کیا کہ یہ سد سد سکندری ہے اور وہیں سے یہ روایت چل گئی اور مؤرخین اسلام میں سے محمد بن اسحاق نے بھی چونکہ سکندر یونانی کو ذوالقرنین بتایا اسلئے مسلمانوں نے بھی اس سد کو سد سکندری کہنا شروع کر دیا اور آخر کار اس انتساب نے شہرت حاصل کر لی۔

مذکورہ بالا سد کے متعلق اگرچہ اکثر عرب مؤرخین یہی کہتے جاتے ہیں کہ وہ انوشیرواں کی بنائی ہوئی ہے۔ مگر محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کے بانی کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکا۔ البتہ تاریخی قیاسات سے یہ کہا جا سکتا

ہے کہ شاید اس کی مرمت اور درستی انوشیرواں نے اپنے زمانہ میں کرائی ہو اور اسی وجہ سے وہ نوشیرواں کی جانب منسوب کردی گئی ہو۔ بہرحال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سد کو سدِ سکندری کہنا ایک افواہی انتساب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ نیز سکندر مقدونی جو انگریزی تاریخوں میں "گریٹ الیگزنڈر" کہا جاتا ہے کسی طرح "ذوالقرنین" نہیں ہو سکتا اور نہ "سد ذوالقرنین" سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

یاجوج وماجوج کا خروج

ذوالقرنین یاجوج وماجوج اور سد کی بحث کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ یاجوج وماجوج کے اس خروج کا ہے جس کا ذکر قرآن عزیز نے کیا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت اسلئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق علاماتِ قیامت سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خروجِ یاجوج وماجوج کا مسئلہ کہ جس کی خبر قرآن عزیز نے بطور پیشین گوئی کے دی ہے ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ جس کو محض ظنی قیاسات سے حل کر لیا جائے اور جب کہ اس مسئلہ کا تعلق قرآنِ عزیز کے "اخبارِ مغیبات" سے ہے تو پھر اس کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق بھی قرآنِ عزیز ہی کو پہنچتا ہے نہ کہ ظن و تخمین کو۔ قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء میں بیان کیا ہے اور اس مسئلہ سے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ صرف ان دو سورتوں میں مذکور ہے۔

سورۂ کہف میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے:۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا أَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ○ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ○

پس نہیں طاقت رکھتے وہ (یاجوج وماجوج) اس سر پر چڑھنے کی اور نہ وہ اس میں سوراخ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں (ذوالقرنین) نے کہا یہ میرے پروردگار کی رحمت ہے، پھر جب میرے رب کا وعدہ آئے گا تو اس کو گرا کر ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے پروردگار کی فرمائی ہوئی بات سچ ہے۔ (سورہ کہف)

اور سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

حَتّٰٓى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ○ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ط يَاوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِيْنَ ○

یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں گے یاجوج وماجوج اور وہ زمین کی بلندیوں سے دوڑتے ہوئے اتر آئیں گے اور خدا کا سچا وعدہ قریب آجائے تو اس وقت اچانک ایسا ہوگا کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے، ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور پکار اٹھیں گے۔ ہائے کم بختی ہماری کہ ہم بے خبر رہے۔ (انبیاء)

ان دونوں مقامات میں قرآنِ عزیز نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ جس زمانہ میں "ذوالقرنین" نے یاجوج وماجوج پر سد قائم کی تو اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ یہ قومیں نہ اس کو پھاند کر اس جانب آسکتی تھیں اور نہ اس میں سوراخ پیدا کر کے اس کو عبور کر سکتی تھیں اور سد کی اس مضبوطی اور پائیداری کو دیکھ کر ذوالقرنین نے خدائے

تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ یہ سب کچھ خدائی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اس نے مجھ سے یہ نیک خدمت کرادی۔
اور دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ جب قیامت کا زمانہ قریب ہوگا تو یاجوج و ماجوج بے شمار فوج در فوج نکل کر دنیا میں پھیل جائیں گے اور لوٹ مار اور تباہی و بربادی مچادیں گے۔
ان دونوں باتوں سے عام طور پر مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ یاجوج و ماجوج ''سد ذوالقرنین'' میں اس طرح محصور ہو گئے ہیں کہ یہ ''سد'' قیامت تک اسی طرح صحیح و سالم کھڑی رہے گی اور جب یاجوج و ماجوج کے خروج کا وقت آئے گا اور وہ قیامت کے قریب اور علاماتِ قیامت میں سے ہوگا تو اس وقت یکبارگی ''سد'' گر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور اسی لئے انہوں نے دونوں مقامات میں اسی کے مطابق آیات کی تفسیر کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے سورۂ انبیاء کی اس آیت کا حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ کا یہ ترجمہ کر کے ''یہاں تک کہ جب یاجوج و ماجوج سد توڑ کر کھول دیئے جائیں گے''۔ اس ارشادِ الٰہی کو ذوالقرنین کے اس مقولہ کے ساتھ جوڑ دیا جو کہف میں مذکور ہے فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ پھر میرے رب کا وعدہ آئے گا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔
مگر آیات کے سیاق و سباق اور ان کے مفہوم پر غائر نظر ڈالنے سے یہ تفسیر آیات قرآنی کا حق ادا نہیں کرتی۔
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن عزیز نے سورۂ کہف میں تو صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج پر جب ذوالقرنین نے سد تعمیر کر دی تو اس کے استحکام کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ جب میرے خدا کا وعدہ آجائے گا تو یہ سد ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور خدا کا وعدہ برحق ہے اور اس کے خلاف ہونا محال و ممتنع ....
مگر اس جگہ یاجوج و ماجوج کے اس خروج کا کوئی ذکر نہیں ہے جو قیامت کے قریب وقوع میں آئے گا اور ہونا بھی کیسے کیونکہ یہ تو ذوالقرنین کا اپنا مقولہ ہے جو سد کے مستحکم اور مضبوط ہونے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے اور خروج یاجوج و ماجوج ان اخبارِ مغیبات میں سے ہے جو علاماتِ ساعت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان کیا گیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ سے اقوامِ عالم کیلئے ایک تنبیہ ہے کہ خدا کی یہ زمین اپنے آخری لمحات میں ایک سخت اور ہولناک عالم گیر حادثہ سے دوچار ہونے والی ہے۔
اور سورۂ انبیاء میں صرف یہ مذکور ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج و ماجوج کا خروج ہوگا اور وہ بہت سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب فساد بپا کرنے کیلئے امنڈ پڑیں گے اور اس جگہ سد کا اور سد کے ریزہ ریزہ ہو کر اس سے یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا قطعاً کوئی تذکرہ نہیں ہے اور لفظ فُتِحَتْ سے ایسا سمجھنا محض قیاسی و تخمینی ہے جیسا کہ عنقریب واضح ہوگا۔
پس سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء دونوں میں اس واقعہ سے متعلق آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ سورۂ کہف میں تو پہلے اس واقعہ کی تفصیلات سنائی گئی ہیں جن کے متعلق یہود نے نبی اکرم ﷺ سے براہ راست خود یا مشرکین مکہ کے واسطہ سے سوال کیا تھا کہ ذوالقرنین کی شخصیت کے متعلق اگر کوئی علم رکھتے ہو تو اس کو ظاہر کرو۔
قرآن عزیز یعنی وحی الٰہی نے ان کو بتایا کہ ذوالقرنین ایک نیک اور صالح بادشاہ تھا، اس نے تین مہمیں قابل ذکر سر کیں۔ ایک مشرقِ اقصیٰ کی اور دوسری مغربِ اقصیٰ کی اور تیسری شمال کی جانب اور اس تیسری مہم میں اس کو ایک

ایسی قوم سے سابقہ ہوا جس نے یاجوج وماجوج کی تباہ کاریوں کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے اور ان کے درمیان سد قائم کر دینے کا مطالبہ کیا، ذوالقرنین نے ان کے مطالبہ کو اس طرح پورا کیا کہ اس جانب وہ جس درہ سے نکل کر حملہ آور ہوا کرتے تھے اس کو لوہے کی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے سے بند کر دیا اور دو پہاڑوں کے درمیان درہ پر ایک بہترین سد قائم کر دی اور ساتھ ہی شکر خدا بجالاتے ہوئے اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ یہ سد اس قدر مستحکم اور مضبوط ہے کہ اب یاجوج وماجوج نہ اس میں سوراخ کر سکیں گے اور نہ اس پر چڑھ کر ادھر آ سکیں گے۔ لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ سد ہمیشہ کیلئے اسی طرح رہے گی بلکہ خدا کو جب تک منظور ہے یہ اسی طرح قائم ہے اور وہ چاہے گا کہ یہ روک باقی نہ رہے تو یہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور خدا کا وعدہ "یعنی ہر شے کی طرح سد کا بھی فنا ہو جانا" پورا ہو کر رہے گا۔

یہود نے چونکہ صرف ذوالقرنین کے متعلق سوال کیا تھا۔ اسلئے سورۂ کہف میں اسی کے متعلق تفصیل سے بتایا گیا اور یاجوج وماجوج کا محض ضمنی تذکرہ آ گیا اور سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ مشرکین کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو بستیاں ہلاک کر دی گئیں، اب ان کے باشندے دنیا میں زندہ نہیں واپس آئیں گے، جب قیامت آ جائے گی "اور وہ جب آئے گی کہ اس سے پہلے یاجوج وماجوج کا فتنہ پیش آئے گا"۔ تب البتہ میدان حشر میں سب دوبارہ زندہ کر کے رب العالمین کے سامنے جواب دہ ہونے کیلئے جمع کیئے جائیں گے۔

پھر چونکہ اس جگہ یاجوج وماجوج کے خروج کو قیامت کی علامت بیان کر کے اہمیت دی گئی ہے۔ اسلئے اس کے نکلنے کو سد کے ٹوٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے کے ساتھ مقید نہیں کیا بلکہ سرے سے سد کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ کہا ہے کہ جب ان کے خروجِ موعود کا وقت آ جائے گا تو سرعت کے ساتھ بلندیوں سے پستی کی جانب امنڈ پڑیں گے اور تمام اقطاع وامصار میں پھیل جائیں گے۔

پس ان مجموعۂ آیات سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ "سد ذوالقرنین" یاجوج وماجوج کے خروج سے پہلے ضرور ٹوٹ پھوٹ چکی ہو گی۔ دوسرے یہ کہ یاجوج وماجوج کے موعود خروج کا وہ وقت ہو گا کہ قیامت کا وقت بالکل قریب ہو جائے اور اس کے بعد "نفخ صور" ہی کا مرحلہ باقی رہ جائے۔ اس وقت یاجوج وماجوج کے تمام قبائل بے پناہ سیلاب کی طرح امنڈ پڑیں گے اور تمام کائنات میں فسادِ عظیم برپا کریں گے۔

بہر حال ذوالقرنین کے مقولہ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ میں "وعدہ" سے یاجوج وماجوج کا خروج موعود مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ بلاشبہ سد کا اندکاک ہو جائے گا اور وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور سورۂ انبیاء میں خدائے تعالیٰ کے ارشاد فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ میں فتح سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سد توڑ کر نکل آئیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کثرت سے فوج در فوج نکل پڑیں گے گویا کہیں بند تھے اور آج کھول دیئے گئے ہیں۔

چنانچہ اہل عرب لفظ "فتح" کو جب جاندار اشیاء کیلئے استعمال کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ یہ کسی گوشہ میں الگ تھلگ پڑی ہوئی تھی اور اب اچانک نکل پڑی اسلئے جب کوئی شخص کہتا ہے "فتح الجراد" تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ٹڈیاں کسی جگہ بند تھیں اور اب ان کو کھول دیا گیا بلکہ یہ معنی مراد ہوتے ہیں کہ ٹڈی دل کسی پہاڑی گوشہ میں الگ پڑا تھا کہ اب اچانک فوج در فوج باہر نکل پڑا۔

پس یہاں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ یاجوج وماجوج جیسے عظیم الشان قبائل جو عرصہ سے باایں کثرت واژدہام دنیا کے ایک الگ گوشہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اس دن اس طرح امنڈ آئیں گے گویا بند تھے اور اب اچانک کھول دیئے گئے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی تفسیر راس المحدثین حضرت استاذ علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ نے بھی عقیدۃ الاسلام میں یہی فرمائی ہے اور بلا شبہ یہ تفسیر بغیر کسی تاویل کے صحیح اور درست ہے اور اس سلسلہ کے بہت سے خدشات کو دور کرنے کیلئے مفید۔

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

وینبغی ان یعلم ان قول ذی القرنین:

هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا

قول من جانبه لا قرینة علی جعله منه من اشراط الساعة ولعله لا علم له بذالك وانما ارادو عدًا انه کاله.................. فان قوله تعالیٰ بعد ذلك:

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ

للاستمرار التجددی نعم قوله تعالیٰ:

حَتّٰىٓ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ

هو من اشراط الساعة لکن لیس فیه للردم ذکر فاعلم الفرق۔

اور یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ ذوالقرنین کا یہ قول هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ......الآیۃ اس کا اپنا قول ہے اور کوئی قرینہ سیاق وسباق میں ایسا موجود نہیں ہے جس سے سد کے ریزہ ریزہ ہونے کے واقعہ کو علاماتِ قیامت میں سے شمار کیا جائے اور شاید ذوالقرنین کو یہ علم بھی نہ ہو کہ اشراط ساعت میں سے خروجِ یاجوج وماجوج بھی ہے اور اس نے "وعد ربی" سے صرف اس کا کسی وقت میں ٹوٹ پھوٹ جانا مراد لیا ہو پس اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد "ہم نے کر چھوڑا ان کو اس دن سے اس حالت میں کہ بعض بعض پر امنڈ رہے ہیں" استمرار تجددی پر دلالت کرتا ہے یعنی برابر ایسا ہوتا رہے گا کہ ان میں سے بعض قبائل بعض پر حملہ آور ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ خروج موعود کا وقت آجائے ہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد جو کہ سورۂ انبیاء میں ہے حَتّٰىٓ اِذَا فُتِحَتْ تو البتہ یہ بلا شبہ علاماتِ قیامت میں سے ہے لیکن اس میں سد کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ پس اس فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ (ص۲۰۱)

اور پھر اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

واعلم ان ماذکرته لیس تاویلا فی القران بل زیادة شیء من التاریخ والتجربة بدون اخراج لفظه من موضوعه۔ (۲۰۳)

اور یہ یاد رہے کہ میں نے ان آیات کی تفسیر میں جو کچھ کہا، وہ قرآن میں تاویل نہیں ہے بلکہ قرآنِ عزیز کے کسی لفظ کو اس کے اپنے موضوع سے نکالے بغیر تاریخ اور تجربہ کے پیش نظر مزید اظہارِ حال ہے۔

عام مفسرین نے بیان کردہ تفسیر سے الگ سورۂ کہف اور انبیاء دونوں کی آیات متعلقہ کے واقعات کو اشراط ساعت میں شمار کرتے ہوئے جو تفسیر فرمائی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے ترمذی اور مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے :

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یاجوج وماجوج روزانہ ذوالقرنین کی سد کھودتے رہتے ہیں اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہو جاتا ہے تو آپس میں کہتے ہیں کہ اب کام ختم کردو اب وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ کل تم اس کو کھود کر گرا سکو گے، مگر وہ اگلے روز پھر اس کام پر واپس آتے ہیں تو سد کو اصلی حالت سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم پاتے ہیں، یہ اسی طرح ہوتا رہتا ہے مگر جب ان کی معین مدت کا وقت پورا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہو گا کہ اب وہ انسانی دنیا پر چھا جائیں تو اس روز بھی سابق کی طرح اس کو کھودیں گے اور جب سورج نکلنے کا وقت قریب ہو گا تو کام لینے والے کام کرنے والوں سے کہیں گے۔ اب واپس جاؤ کل انشاء اللہ اس کو کھود کر برابر کر سکو گے اور آج چونکہ انشاء اللہ کہہ دیا اسلئے جب واپس آئیں گے تو اپنی محنت درست پائیں گے اور اس وقت وہ باقی محنت کر کے سد کو گرادیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے اور تمام روئے زمین کا پانی پی جائیں گے اور لوگ ان کے خوف سے قلعوں اور پناہ گاہوں میں چھپ جائیں گے پھر وہ دنیا کو مغلوب سمجھ کر آسمان پر تیر پھینکیں گے کہ خدا اور عالم بالا سے جنگ کر کے اس کو بھی مغلوب کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے واپس کرے گا تو وہ سمجھیں گے کہ ہم عالم بالا پر بھی غالب آ گئے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی گردن میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جس سے وہ خود بخود مر جائیں گے۔ (ترمذی سورۂ کہف)

مگر ترمذی نے اس حدیث کو بیان کر کے حدیث کی حیثیت پر یہ حکم لگایا ہے کہ :

هذا حديث حسن غريب انما نعرف من هذا الوجه مثل هذا

یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسی طریقہ سند سے ایسی ہی اچنبھی باتیں جانا کرتے ہیں۔

یعنی ان کے نزدیک یہ روایت اپنے اعتبار سے منکر اور اچنبھی روایت ہے اور حافظ عماد الدین ابن کثیر اس روایت کو نقل کر کے اس پر یہ حکم لگاتے ہیں :

اس حدیث میں مضمون کے لحاظ سے نکارت (اچنبھا) ہے اور اس کو مرفوع کہنا یعنی رسول اللہ ﷺ سے نقل کرنا غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ٹھیک اسی قسم کی ایک اسرائیلی کہانی کعب احبار سے منقول ہے اور اس میں بھی یہ سب باتیں اسی طرح مذکور ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ جو کہ اکثر کعب الاحبار سے اسرائیلی قصے سنا کرتے تھے۔ اس کو ایک اسرائیلی کہانی کے طور پر سنا ہو گا جس کو راوی نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے، درحقیقت یہ راوی کا وہم ہے اور کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق میں نے یہ جو کچھ کہا ہے میرا اپنا خیال ہی نہیں ہے بلکہ امام حدیث احمد بن حنبل بھی یہی فرماتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۰۵)

ترمذی، ابن کثیر اور امام احمد کی ان تصریحات کے بعد اس روایت کی حیثیت ایک اسرائیلی قصہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ لہٰذا مفسرین کا محض اس روایت کی بناء پر سورۂ کہف کی زیر بحث آیات کی یہ تفسیر کرنا کہ سد ذوالقرنین ٹھیک اس وقت ریزہ ریزہ ہو گی جب کہ اشراط ساعت میں سے موعود خروج یاجوج و ماجوج پیش آئے گا، صحیح نہیں ہے۔

اور اگر ان کی تفسیر کا یہ حصہ صحیح مان لیا جائے تو پھر بھی وہ مذکورہ بالا روایت کے تسلیم کر لینے کے بعد قرآن عزیز کی آیت کے تعارض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ اسلئے کہ قرآن عزیز (کہف) میں سد کے متعلق ذوالقرنین کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے فما اسطاعوا ان یظھروہ و ما استطاعوا لہٗ نقبا اور اس کا مطلب تمام مفسرین نے بالاتفاق یہ بیان کیا ہے کہ یاجوج و ماجوج اس سد میں کسی قسم کے ردوبدل پر قادر نہیں ہیں۔ چنانچہ امام احمد اور ابن کثیر اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

انھم لم یتمکنوا من نقبہ و لا نقب شیء منہ۔

بلاشبہ اب یعنی بناء سد کے وقت یاجوج و ماجوج اس میں سوراخ کرنے یا کسی حصہ کو بھی کھودنے پر قادر نہیں رہے۔

تو اب مفسرین اس روایت کے ان جملوں کے تعارض کو کس طرح دور فرمائیں گے۔ جن میں یہ صراحت ہے کہ وہ اس کو کھود کا یا چاٹ کر گرنے کے قریب کر دیتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح حدیث کے تعارض کو کس طرح دور کر دیں گے۔ جس کو امام بخاری نے بسند صحیح روایت کیا ہے:

ایک مرتبہ نبی ﷺ خوابِ راحت سے بیدار ہوئے تو یہ حالت تھی کہ چہرۂ مبارک سرخ تھا اور یہ ارشاد فرما رہے تھے:

لا الہ الا اللّٰہ و یل للعرب من شر قد اقترب فتح الیوم من ردم یاجوج و ماجوج مثل ھذا و حلق قلت یا رسول اللّٰہ انھلك و فینا الصالحون قال نعم اذا اکثر الخبث۔

لا الہ الا اللہ عرب کیلئے ہلاکت ہے۔ اس شر سے جو قریب آ رہا ہے، آج یاجوج و ماجوج پر قائم شدہ سد اس طرح کھول دی گئی ہے اور انگوٹھے پر انگلی رکھ کر اور گول حلقہ بنا کر دکھایا۔ حضرت زینب بنت جحش فرماتی ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم ایسی حالت میں ہلاک ہو جائیں گے جبکہ ہم میں صالحین امت بھی موجود ہوں گے۔ ارشاد فرمایا بے شک ایسا ہو گا اگر امت میں خباثت کی کثرت ہو جائے گی"۔

(بخاری و مسلم عن الزہری باب الفتن)

اس روایت میں یہ تصریح ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "سد میں حلقہ انگشت کی مقدار سوراخ ہو گیا ہے اور مفسرین کی اس تفسیر کے مطابق قیامت کے موعود وقت سے قبل یہ ناممکن ہے۔

پس اگر یہ کہا جائے کہ اس صحیح بلکہ اصح روایت حدیث میں "فتح" سے مراد شر اور فتنوں کا شیوع ہے اور اس کو استعارہ کے طور پر "فتح روم" کہہ دیا گیا تو سورۂ انبیاء کی آیت میں فُتِحَتْ کے معنی میں یہ اصرار کیوں ہے کہ اس سے سد ٹوٹ کر کھلنا مراد ہے۔ حالانکہ اس جگہ روم یا سد کا تذکرہ تک نہیں اور کیوں نہ اس سے بھی استعارہ مراد لیا جائے اور کیوں وہ تفسیر نہ کی جائے جو ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔

اور اگر حدیث میں حقیقی نقب کا ذکر ہے تو یہ سورۂ کہف کی اس تفسیر کے خلاف اور معارض ہے جو مفسرین نے عام طور پر بیان کی ہے کہ سد کا یہ استحکام قیامت کے موعود وقت تک یوں ہی رہے گا اور سد کا اس سے قبل ٹوٹنا پھوٹنا ناممکن ہے۔

لیکن عام تفسیر کے برعکس اگر حضرت شاہ صاحب کی تفسیر کے مطابق ان دونوں مقامات کی تفسیر کی جائے

کہ جس کی فی الجملہ تائید امام احمد اور محدث ابن کثیر کے اقوال سے بھی ہوتی ہے تو یہ سب مشکلات خود بخود دور ہو جاتی ہیں اور آیات کا مطلب اور حدیث کا مقصد بآسانی سمجھ میں جاتا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر آیت "وما استطاعوا لہ نقبا" کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ای فی ذٰلک الزمان لان هذه صیغة خبر ماض فلا ینفی و قوعه فیما یتقبل باذن اللّٰه لهم فی ذٰلک قداراً و تسلیطهم علیه بالتدریج قلیلاً قلیلاً حتی یتم الاجل و ینقضی الامر المقدور فیخرجون کما قال اللّٰه تعالی وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔

(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۱۲)

یعنی وہ (یاجوج و ماجوج) اس زمانہ میں سد کے متعلق ہر قسم کے ردوبدل سے بے بس ہو گئے ہیں۔ اسلئے کہ استطاعو کا صیغہ زمانہ ماضی کی اطلاع کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ بس اس آیت میں اس بات کی ہرگز نفی نہیں نکلتی کہ زمانۂ مستقبل میں اللہ تعالیٰ ان کو اس پر قدرت دے دے کہ وہ آہستہ آہستہ اور تدریجی طور پر اس سد کو توڑ پھوڑ ڈالیں تاکہ وہ وقت موعود آپہنچے جس کی خبر سورۂ انبیاء میں دی گئی ہے اور امر مقدر پورا ہو جائے اور تب وہ یک لخت یلغار کر کے اس طرح نکل پڑیں گے۔ جس طرح سورۂ انبیاء اس آیت میں خبر دی گئی ہے۔ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔

غرض اس عبارت کا مفہوم بھی وہی ہے جو حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے منقول ہو چکا ہے اور بغیر کسی تاویل کے آیت وَمَا اسْتَطَاعُوْا الآیۃ کا صاف طور پر یہ مطلب متعین ہو جاتا ہے کہ یہ ذوالقرنین کے زمانہ کی کیفیت خود ان ہی کی زبانی بیان ہو رہی ہے یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں ہے کہ ذوالقرنین کی سد یاجوج و ماجوج کے خروج موعود سے پہلے ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔

اور یہ مطلب ہو بھی کیسے سکتا ہے جب کہ یاجوج و ماجوج صرف ایک اس درہ سے ہی نکل کر غارت گری نہیں کرتے تھے بلکہ کاکیشیا کے اس کونہ سے چین کے علاقہ منچوریا تک ان کے خروج کے بہت سے مقامات تھے پس اگر ان کیلئے سد ذوالقرنین نے درۂ داریال کی راہ ہمیشہ کیلئے مسدود کر دی تھی تو دوسرے مقامات سے ان کا خروج کیوں نہیں ہو سکتا تھا؟

اسی لیئے حضرت شاہ صاحب نے آیت وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ کی تفسیر یہ کی ہے کہ ذوالقرنین کے اس واقعہ میں چونکہ یاجوج وماجوج پر اس جانب سے روک قائم ہو جانے کا تذکرہ ہے۔ اسلئے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے مقولہ کے بعد اپنی جانب سے اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اے مخاطبین تم جن یاجوج وماجوج قبائل کے متعلق یہ باتیں سن رہے ہو یہ بھی سن لو کہ ہم نے ان قبائل کیلئے یہ مقدر کر دیا ہے کہ وہ آپس میں الجھتے رہیں گے اور موج در موج باہم دست و گریباں ہوتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آجائے کہ جب قیامت بپا ہونے میں نفخ صور کے علاوہ اور کوئی مرحلہ باقی نہ رہے اور سورۂ انبیاء میں یہ ارشاد فرمایا کہ "نفخ صور" سے پہلے قیامت کی اشراط و علامات میں سے ایک شرط یا علامت یہ پیش آئے گی کہ یاجوج وماجوج کے تمام قبائل اپنے نکلنے کے ہر مقام سے ایک ساتھ امنڈ آئیں گے اور دنیا کی عام غارت گری کیلئے اپنی مقامی بلندیوں سے تیزی کے ساتھ اترتے ہوئے کائنات کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ

"الحدب" لغت میں اوپر سے نیچے جھکنے کو کہتے ہیں اسلئے حدب کے معنی اونچے مقام سے نیچے اترنے کے ہوتے ہیں اور "نسلان" عربی لغت میں پھسلنے کو کہتے ہیں۔ اسلئے ینسلون کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس سرعت کے ساتھ امنڈ آئیں گے کہ یہ معلوم ہوگا گویا وہ کسی ٹیلے سے پھسل رہے ہیں، چنانچہ مفردات امام راغب اور نہایہ ابن اثیر میں "حدب" اور "نسل و نسلان" کی بحث میں ہی لغوی تفصیل مذکور ہے۔

لہٰذا اس تفسیر سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز نے یاجوج و ماجوج کے خروجِ موعود کی جو کیفیت بیان فرمائی ہے۔ وہ ان ہی قبائل پر منطبق ہوتی ہے جو بحر کاسپین سے لے کر منچوریا تک پھیلے ہوئے ہیں اور جو دنیا کی بہت بڑی آبادی کے محور ہیں اور جائے وقوع کے اعتبار سے عام سطح آبادی سے اس قدر بلند حصہ زمین پر مقیم ہیں کہ جب کبھی نکل کر متمدن اقوام پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اوپر سے نیچے کو پھسل رہے ہیں۔ پس آئندہ بھی جب اشراطِ ساعت کی شکل میں ان کا آخری خروج ہوگا تو ان کے تمام قبائل کا سیلاب ایک ہی دفعہ امنڈ آئے گا اور ایسا معلوم ہوگا کہ انسانوں کے سمندر کا بند ٹوٹ گیا ہے اور وہ اپنے مقامات کی ہ ربلندی سے نیچے کی جانب بہہ پڑا ہے۔

قرآن عزیز کی آیاتِ زیر بحث کی یہ تفسیر، الفاظ اور جملوں کو ان کے لغوی معنی سے ادھر ادھر ہٹائے اور ان میں تاویل کیئے بغیر، اس قدر لطیف ہے کہ جس سے وہ بہت سے شکوک و شبہات یک قلم دفع ہو جاتے ہیں جو اس سلسلہ میں مفسرین کو پیش آئے ہیں اور ان کو حل کرنے کیلئے غیر جاذب تاویلات کرنی پڑی ہیں۔ نیز مدعیانِ نبوت کو ان تاویلات سے فائدہ اٹھا کر الحاد و زندقہ پھیلانے کا موقعہ میسر آگیا ہے۔

سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی آیات کی اس تفسیر کے بعد اب حدیث بخاری کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس کی کیا مراد ہے؟ تو حدیث "ویل للعرب من شر قد اقترب" اس بات پر تو صاف دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو رویا میں "جو نبی کیلئے وحی کی طرح صحیح اور حجت ہوتا ہے"۔ یہ دکھایا گیا کہ سدیاجوج و ماجوج میں رخنہ پڑ جانے سے ایسا سخت حادثہ پیش آنے والا ہے جو عرب کیلئے ہولناک ثابت ہوگا لیکن یہ بات پوری طرح وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آسکی کہ "فتح ردم یاجوج و ماجوج" میں لفظ "فتح" سے حقیقی معنی مراد ہیں کہ واقعی یاجوج و ماجوج دکی سد میں سے انگوٹھے اور انگلی کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار میں شگاف ہو گیا ہے یا پیشین گوئیوں کی طرح اس پیشین گوئی میں بھی "فتح" اور "حلق تسعین" کو استعارہ کی شکل میں بیان کیا گیا ہے، نیز یہ کہ اس جملہ کا پہلے جملہ "ویل للعرب" سے کوئی ربط ہے یا یہ الگ الگ دو مستقل باتیں ہیں۔

ان دونوں مسئلوں کے متعلق اہل تحقیق کی رائے مختلف ہے اور چونکہ اس رویاء صادقہ کی تعبیر خود ذاتِ اقدس ﷺ سے یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے آثار سے بسندِ صحیح منقول نہیں ہے۔ اسلئے محدثین اور اربابِ سیر نے یہ کوشش فرمائی ہے کہ وہ اس حدیث کے مصداق کو تقریبی طور پر متعین فرمائیں۔

شیخ بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ "ویل للعرب" کے جملہ میں ان شرور و فتن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے جو آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہی امت میں رونما ہونے شروع ہوگئے اور جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت میں سب سے پہلے عرب (قریشی حکومت) کا خاتمہ ہو گیا اور جن ہلاکتوں کا پہلا شکار اہل عرب ہی ہوئے اور بعد میں ان کا اثر تمام امت مرحومہ پر پڑا۔

اور ردم (سد) میں انگلی اور انگوٹھے کے بنائے ہوئے حلقہ کی مقدار رخنہ پیدا ہو جانے کا ذکر تقریبی ہے یعنی یہ مقصد نہیں ہے کہ واقعۃً اتنا چھوٹا سا رخنہ پڑ گیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ سد ذوالقرنین کے استحکامات کی مدت ختم ہو گئی اور اب اس میں رخنہ پڑنے کی ابتداء ہو چلی ہے۔ گویا اب وہ آہستہ آہستہ شکست وریخت ہو جائے گی۔

(عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۲۳۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی بھی قریب قریب یہی فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی جانب اشارہ یہ جو رویاء صادقہ کے بعد قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر متواتر فتن اور شرور کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب (قریشی حکومت) تمام اقوام کیلئے ایسے ہو گئے جیسا کہ کھانے کے پیالہ پر کھانے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس تشبیہ کا ذکر بھی موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا

وہ زمانہ قریب ہے کہ تم پر قومیں اس طرح ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جس طرح کھانے کے بڑے پیالہ پر کھانے والے ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں۔ (فتح الباری۔ ج ۱۳ ص ۹۱)

قرطبی کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کے مخاطب عرب ہی ہیں اور رخنۂ سد کے متعلق دونوں محدثین کا رجحان اسی جانب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حقیقی رخنہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ ایک تشبیہ ہے۔

ان ہر دو محدثین کی تفصیلات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک 'ویل للعرب'' والا جملہ جو شرور و فتن سے متعلق ہے اور ''فتح ردم'' کے جملہ میں ایک ہی بات بیان کی گئی ہے اور یہ دونوں جملے اس طرح آپس میں مرطوط ہیں کہ دونوں کو ایک ہی حادثہ سے متعلق سمجھا جائے۔

اور حافظ عمادالدین بن کثیر اس بارہ میں کوئی فیصلہ کن رائے نہیں رکھتے اور متردد ہیں کہ زیر بحث حدیث ''فتح من ردم یاجوج وماجوج'' میں فتح سے حقیقی فتح (کھل جانا) مراد ہے یا استعارہ ہے کسی آئندہ ایسے حادثہ سے جو یاجوج وماجوج کے ہاتھوں پیش آنے والا ہے اور جس کا اثر براہ راست عرب (حکومت قریش) پر پڑے گا۔ لیکن کرمانی شارح بخاری بعض علماء سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اس پوری حدیث کو ایک ہی معاملہ سے متعلق سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں یاجوج وماجوج کے ایسے حادثہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کا ظہور قیامت کی علامت سے جدا درمیانی وقفہ میں پیش آنے والا ہے اور جو باعث ہو گا عرب کے زوال کا اور ''فتح ردم'' استعارہ ہے اس بات سے کہ جو حادثہ آئندہ رونما ہونے والا ہے اس کی ابتداء ہو گئی ہے اور یہ وہ حادثہ تھا جو مستعصم باللہ خلیفہ عباسی کے زمانہ میں ''فتنۂ تاتار'' کے نام سے برپا ہوا اور جس نے عرب طاقت کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یاجوج وماجوج قبائل کی اس تاخت وتاراج کے بعد جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ کے ضمن میں آیا ہے۔ تاریخ میں ان قبائل کا پھر کوئی یادگار حملہ مذکور نہیں ہے۔

البتہ ساتویں صدی عیسوی میں ان کیلئے ذوالقرنین کی یہ روک بیکار ہو گئی اور انہوں نے بحر خزر اور بحر اسود کے اس درہ کے علاوہ جو ان پر بند کر دیا گیا تھا۔ بحیرۂ یورال اور بحر خزر کا درمیانی راستہ پالیا، نیز ادھر سد ذوالقرنین کے استحکامات میں بھی فرق آنا شروع ہو گیا تھا اور اس طرح ذوالقرنین کے بعد اب یاجوج وماجوج کے ایک نئے فتنہ کا آغاز ہو چلا تھا اور صدیوں سے ان خاموش قبائل فتنہ جو میں پھر حرکت شروع ہو گئی تھی۔

لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو رویاء صادقہ میں یہ دکھایا گیا کہ اگرچہ ابھی وقت دور ہے جبکہ قیامت کے قریب تمام

قبائل یاجوج وماجوج عالم انسانیت پر چھا جائیں گے لیکن وہ وقت قریب ہے جبکہ ذوالقرنین کے بعد ان کا ایک اہم خروج پھر ہوگا اور وہ عرب کی طاقت اور فرمانروائی کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور اسی خروج کو اس طرح حسی طور پر دکھایا گیا کہ گویا (سد) دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہو گیا ہے اور آہستہ آہستہ وہ دیوار گر کر منہدم ہو جانے والی ہے۔

چنانچہ زمانۂ نبوی میں یہ وہ وقت تھا کہ ان قبائل میں سے چند منگولین قبائل نے اپنے مرکز سے نکل کر قرب وجوار میں پھیلنا اور چھوٹے چھوٹے حملے کرنا شروع کر دیا تھا اور آخر کار چھٹی صدی ہجری میں چنگیز خان ان کا قائد بن گیا اور اس نے منتشر قبائل کو ایک جگہ جمع کرنا شروع کیا اور پھر اس کے بیٹے اوکتائی خاں نے ایک بے پناہ طاقت کے ساتھ اٹھ کر مغرب و جنوب پر حملہ کر دیا اور ۶۸۶ء میں آخر ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی عرب خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور اس نے "خلافت عربیہ" کو تہ و بالا کر ڈالا۔

تو یوں سمجھئے کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس خود علامات قیامت میں سے سب سے بڑی علامت ہے یعنی آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں اور پھر بھی قیامت کے وقت میں اور ذات اقدس میں کافی غیر متعین فاصلہ ہے۔ اسی طرح یہ فتنہ تاتار بھی علامتِ قیامت "خروجِ یاجوج وماجوج" کا ایک ابتدائی نشان ہے اور جس طرح خروجِ دجال و قتل دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی قریبی علامات ہیں۔ اسی طرح سورۂ انبیاء میں ذکر کردہ خروج یاجوج وماجوج بھی علامات قیامت میں سے قریبی اور آخری علامت یا آخری شرط ہے پس "فتح ردم" میں ان کی ابتدائی حرکت کی جانب اشارہ ہے جو رویائے صادقہ کے وقت شروع ہو چکی تھی اور "ویل للعرب" سے اس نتیجہ کا اظہار ہے جو عرب حکومت کے خاتمہ پر منتج ہوا ہے۔

لیکن شیخ بدر الدین عینی نے بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں کرمانی کے بیان کردہ اس قول کی تردید کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تاتاری فتنہ کا بانی چنگیز خان اور اس کا بیٹا ہلاکو خان تھا اور ان کو یاجوج وماجوج سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا مصداق اس فتنہ کو قرار دینا بھی غلط ہے۔ بہر حال حدیث "ویل للعرب" کی ان مختلف توجیہات سے جب کہ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس روایت کے مصداق کا تعین خود حدیث سے نہیں ہوتا۔ بلکہ محدثین نے قرائن اور الفاظِ حدیث کی نشست کو پیش نظر رکھ کر اپنی جانب سے مصداق متعین کرنے کی سعی فرمائی ہے اور پھر اس میں بھی اختلاف رائے رہا ہے تو اب ان ہی کے بتائے ہوئے اصول کو سامنے رکھ کر ہم بھی کچھ کہنے اور حدیث زیر بحث کے مقصد کو متعین کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگرچہ دوسرے اقوال کی طرح وہ بھی غیر منصوص اور قابل ردو قبول ہوگا۔

حدیث زیر بحث میں مستقبل میں پیش آنے والے جس فتنہ اور شر کی خبر دی گئی ہے۔ اس کے دو جملے بہت اہم ہیں ایک "ویل للعرب من شر قد اقترب" "عرب کیلئے ہلاکت ہے اس شر سے جو بلا شبہ قریب آ لگا ہے" اور دوسرا "فتح الیوم من ردم یاجوج و ماجوج و حلق تسعین" "آج کے دن یاجوج وماجوج کی سد سے انگوٹھے اور انگلی کے گول دائرہ کی مقدار میں کھول دیا گیا ہے، اور ان ہر دو جملوں کے درمیان واؤ عطف بھی نہیں ہے۔

لہٰذا الفاظِ حدیث پر کافی غور و خوض کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مسطور بالا ہر دو اقوال کی گنجائش ہے۔ یعنی حدیث کا پہلا جملہ یہ بتا دیتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک ایسے اہم شر کی اطلاع دے رہے ہیں جس

کا اثر یہ ہوگا کہ عرب کیلئے سخت ہلاکت کا سامنا ہوگا اور "خلافت قریش" زوال پذیر ہو جائے گی۔

اور دوسرا جملہ یا پہلے جملہ کی تائید میں پیش کیا گیا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امت میں جو اہم فتنے بپا ہونے والے ہیں اور جن کا ابتدائی اثر عرب کی ہلاکت کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ان فتنوں کے رونما ہونے کیلئے حسی علامت اس طرح سامنے آگئی ہے کہ یاجوج و ماجوج پر بنائی ہوئی مستحکم سد ذوالقرنین میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا اور اس کی شکست و ریخت ہونے لگی۔ گویا یہ رخنہ آئندہ اسلامی طاقت یا عرب طاقت میں جلد رخنہ پڑ جانے کیلئے ایک علامت ہے۔ چنانچہ یہ فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے شروع ہو کر مختلف فتنوں کے بعد چند صدیوں میں قریشی حکومت کی ہلاکت و تباہی پر جا کر ٹھہرا اور اس طرح حدیث کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پس اس شکل میں "فتح ردم" آئندہ فتنوں اور شروں کے پیش آنے کی ایک علامت ہے جو امت اسلامیہ میں بپا ہو کر قریب قیامت میں موعود خروج یاجوج و ماجوج پر جا کر ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد دنیا کے درہم و برہم ہو جانے سے قیامت ہو جائے گی۔

یا یوں کہیے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ کی صرف تائید ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تفسیر ہے اور پہلا جملہ در حقیقت نتیجہ اور ثمرہ ہے دوسرے جملہ کا، اور مطلب یہ ہے کہ عرب (قریشی حکومت) کی ہلاکت کا وقت آ پہنچا۔ گویا یاجوج و ماجوج کا وہ بند، جو ذوالقرنین نے بہت مستحکم باندھا تھا۔ اس میں اب رخنہ پڑ گیا اور معنی اس میں شکست و ریخت شروع ہو گئی ور یہ تمہید ہے اس فتنہ کی جو اسی جانب سے اٹھے گا اور قریشی حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔

پس اس تعبیر کے لحاظ سے تاتاری فتنہ کی وہ تاریخ سامنے لائی جائے گی جو گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے اور جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حدیث کی بیان کردہ پیشین گوئی کے مطابق اس فتنہ کی ابتداء، دورِ رسالت سے شروع ہو گئی تھی اور پھر کس طرح وہ خلیفۂ عباسی مستعصم باللہ کے دورِ حکومت میں قریشی حکومت کے استیصال کا باعث ہوئی۔

پس اگر ان دوون جملوں کے درمیان جو ربط اور تعلق ہے اس میں اس قدر وسعت تسلیم کر لی جائے کہ محدثین کی بتائی ہوئی توجیہ "یعنی اہم شرور و فتن کا شیوع اور کرمانی کا بیان کردہ ایک قول کے مطابق توجیہ "یعنی "فتنۂ تاتار کا وجود" ان دونون توجیہات کو حاوی ہو سکے تو ایسا تسلیم کر لینے میں نہ شرعی قباحت لازم آتی ہے اور نہ تاریخی اور زیر بحث حدیث کا مصداق بہت زیادہ فہم کے قریب آجاتا ہے۔

رہا شیخ بدر الدین نور اللہ مرقدہ کا یہ ارشاد کہ چنگیز خانی تاتاری یاجوج و ماجوج نہیں کہلائے جا سکتے تو یہ شیخ کا تسامح ہے۔ اسلئے کہ یاجوج و ماجوج کا تعین کی بحث میں محققین، محدثین اور مؤرخین نے جن قبائل اور ان کے مواطن کو محقق قرار دیا ہے اور خود شیخ موصوف نے بھی جن کو بڑی حد تک تسلیم فرمایا ہے۔ ان ہی قبائل میں سے ایک شاخ ان تاتاریوں کی بھی ہے جو چنگیز خانی کہلائے اور یہ اپنے دورِ بربریت و وحشت میں ان ہی جگہوں میں آباد رہے ہیں اور وہیں سے ان کا خروج ہوا ہے جن پر سد ذوالقرنین قائم کی گئی تھی۔

بہر حال سورۂ کہف اور سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کی اس تفسیر کے درمیان جو ہم نے حضرت علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہ اور حافظ حدیث عماد الدین ابن کثیر کے حوالجات سے بیان کی ہے اور اس حدیث کی پیشین گوئی

کے مصداق متعین کرنے والی مسطورہ بالا توجیہات کے درمیان کسی قسم کا بھی تعارض پیدا نہیں ہوتا اور زیر بحث آیات و روایات کے مصداق اپنی اپنی جگہ صاف اور واضح ہو جاتے ہیں اور ایسا کرنے میں نہ رکیک تاویلات کا سہارا لینے کی ضرور پیش آتی ہے اور نہ ایک لمحہ کیلئے بھی اس کو تفسیر بالرائے یا قابلِ اعتراض جدت کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ جو کچھ بھی ہے سلفِ صالحین اور محدثین وارباب سیر کے مختلف اقوال میں ترجیح راجح کے اصول کو کار فرما بنا کر ایک ایسی معتدل راہ ہے جو نصوصِ قرآنی اور صحیح روایاتِ حدیث کے درمیان تطبیق کی راہ کہلائی جاتی اور سلفاً عن خلف مقبول و محمود رہی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ حدیثِ مسطورہ بالا میں حلقہ کی مقدار پڑ جانے کا جو تذکرہ ہے اس کے متعلق محدثین کی یہ رائے ہے کہ استعارہ و تشبیہ مراد ہو یا حسی رخنہ، بہر دو صورت حلقہ کی مقدارِ رخنہ کا ذکر تقریبی ہے نہ کہ تحدیدی یعنی یہی مطلب ہے کہ سد میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا، یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی ایک حلقہ کی مقدار ہی رخنہ پڑا ہے، چنانچہ گزشتہ صفحات میں ہم ابن کثیر سے اس سلسلہ میں نقول پیش کر چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں اور بعض دوسرے علماء نے کتب سیرت میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ سورۂ انبیاء کی ان آیات کا مصداق جن میں یاجوج وماجوج کے موعود خروج کا ذکر کیا گیا ہے حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ فتنۂ تاتار کو بنا کر یہیں قصہ ختم کر دیں اور اس کا امارتِ ساعت و علامتِ قیامت سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے دیں۔

مگر ہمارے نزدیک قرآن عزیز کا سیاق و سباق ان کی اس تفسیر یا توجیہ کا قطعاً اباء اور انکار کرتا ہے اور یہ اسلئے کہ سورۂ انبیاء میں اس واقعہ کو جس ترتیب سے بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء:۹۵-۹۷)

اور مقرر ہو چکا ہے ہر ایک ایسی بستی پر کہ جس کو ہم نے ہلاک کر دیا ہے کہ اس کے بسنے والے واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ کھول دیئے جائیں یاجوج و ماجوج اور وہ ہر بلندی سے دوڑتے ہوئے امنڈ پڑیں اور قریب آ جائے سچا وعدہ پھر اس وقت حیرانی سے کھلی کی کھلی رہ جائیں آنکھیں منکروں کی اور کہیں ہائے ہماری بدبختی کہ ہم بے خبر رہے اس (قیامت) سے بلکہ ہم ظلم و شرارت میں سرشار رہے۔

ان آیات میں آیت زیر بحث حتی اذا فتحت (الآیۃ) سے پہلی آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ مرنے والوں کی موت کے بعد اب ان کیلئے اس دنیا میں دوبارہ ہی زندگی نہیں ہے اور آیت زیر بحث میں یہ کہا گیا ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی کا وقت جن علامت و آیات کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یا جن پر معلق کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یاجوج و ماجوج کے تمام قبائل اپنی پوری طاقت کے ساتھ بیک وقت اپنے مراکز سے نکل کر تیزی سے تمام دنیا پر چھا

جائیں اور اس سے متصل آیت میں مزید یہ کہا گیا کہ پھر اس کے بعد قیامت بپا ہو جائے گی اور تمام شخص اپنی زندگی کے نیک و بدانجام دیکھنے کیلئے میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے اور ناکام اپنی ناکامی پر حسرت و یاس کرتے رہ جائیں گے۔

پس آیت زیر بحث کے سیاق و سباق نے یہ بات بخوبی واضح کر دی کہ اس مقام پر یاجوج و ماجوج کے ایک ایسے خراج کی اطلاع دی گئی ہے جس کے بعد شر و فتن کا کوئی سلسلہ بلکہ دنیا کی ہستی کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہ جائے گا اور صرف قیامت بپا ہو جانے یعنی نفخ صور کی دیر باقی رہ جائیگی جو اس واقعہ کی تکمیل کے بعد عمل میں آ جائے گی۔

لہٰذا آیت کے سیاق و سباق سے قطع نظر کرتے ہوئے اور حدیث ''ویل للعرب من شر قد اقترب'' کا مصداق ''فتنہ تاتار'' کو متعین کرتے ہوئے سورۂ انبیاء کی اس آیت کو آخری علامت ساعت سے نکال کر فتنۂ تاتار پر محمول کر لینا ہرگز ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ نیز جمہور سلف صالحین کی مسلمہ توجیہ کے قطعاً خلاف ہے۔

ممکن ہے کہ اس میں توجیہ کے ناقلین و قائلین ہمارے اس اعتراض کو ہم پر ہی پلٹ دیں اور یہ فرمائیں کہ اسی طرح سورۂ کہف میں بھی آیت اِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ میں ''وعد'' سے کیوں قیامت مراد لی جائے جبکہ اس کے بعد آیت وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ موجود ہے جو بلاشبہ قیامت کی آخری علامت ہے اور کیوں نہ کہا جائے کہ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ یاجوج و ماجوج نفخ صور تک سد کے اندر محصور اور بند رہیں گے اور نفخ صور کے قریب یک بیک سد گر جائے گی اور وہ نکل پڑیں گے۔

تو اس کے متعلق ہماری یہ گذارش ہے کہ یہ اعتراض اپنی اس تقریر کے ساتھ ہرگز ہم پر وارد نہیں ہوتا اسلئے کہ سورۂ کہف کی ان آیات میں سب سے پہلے یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنۡ ذِی الۡقَرۡنَیۡنِ سے شروع کر کے وَ كَانَ وَعۡدُ رَبِّیۡ حَقًّا تک ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یعنی آیت فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ رَبِّیۡ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ میں ذوالقرنین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد نہیں ہے۔ اسلئے یہاں ''وعد'' سے ''وعدۂ قیامت'' مراد نہیں ہے بلکہ کسی تعمیر کی تخریب کا مقدور معین وقت مراد ہے جس کی تعیین کو ذوالقرنین نے اپنی جانب سے تخمینی طور پر متعین کرنے کی بجائے مرد مومن اور مرد صالح کی طرح خدا کی مرضی کے حوالہ کر دیا ہے۔

اور چونکہ ذوالقرنین کے واقعہ میں ضمنی طور سے یاجوج و ماجوج کا بھی ذکر آ گیا تھا۔ اسلئے اس کے خاتمہ پر اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بھی یاجوج و ماجوج کا مختصر ذکر فرمایا اور آیت وَتَرَكۡنَا بَعۡضَهُمۡ یَوۡمَئِذٍ یَّمُوۡجُ فِیۡ بَعۡضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ میں یہ بیان کیا کہ جن یاجوج و ماجوج کا ذکر تم نے ابھی ذوالقرنین کے واقعہ میں سنا ان کو ہم نے شر اور فتنہ کی اس زندگی میں اس طرح کر چھوڑا ہے کہ وہ برابر فساد اور چپقلش باہمی میں مصروف رہیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا۔ اس دن وہ سب جمع کئے جائیں گے اور اس دن جہنم کافروں پر پیش کی جائے گی۔

گویا سورۂ انبیاء میں تو یاجوج و ماجوج کا ذکر مستقل حیثیت رکھتا ہے اور وہاں بتانا ہی یہ منظور ہے کہ ان کا اجتماعی خروج قیامت کی آخری علامات میں سے ایک نمایاں علامت ہے اور سورۂ کہف میں ان کا تذکرہ صرف ضمنی ہے اور ان کے فساد اور شر انگیزی کے خصوصی واقعہ کی مناسبت سے ان کی باہمی فساد انگیزیوں اور مختلف اوقات میں

موج در موج چپقلشوں کی وارداتوں کا ذکر اس انداز میں کر دیا گیا کہ ان کے موعود خروج کی جانب بھی اشارہ ہو جائے۔

غرض سورۂ کہف کی زیر بحث آیات کا سیاق و سباق یعنی ان سے پہلی اور بعد کی آیات کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ذوالقرنین کے مقولہ إِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ میں ''وعد'' سے مراد وعدۂ قیامت لیا جائے اور وہ معنی بیان کئے جائیں جو معترض نے ہماری بیان کردہ سورۂ انبیاء کی تفسیر کے مقابلہ میں پیش کیئے ہیں۔

الحاصل جن معاصر مفسرین نے سورۂ انبیاء کی زیر بحث آیات کا مصداق فتنۂ تاتار کو بتایا ہے اور اس کی تائید میں بخاری کی مشہور حدیث ''ویل للعرب من شر قد اقترب'' الخ کو پیش کیا ہے ان کی یہ تفسیر غلط اور حدیث سے اس کی تائید قطعاً بے محل ہے بلکہ بخاری و مسلم کی دوسری صحیح احادیث جو کتاب الفتن میں مذکور ہیں۔ اس تفسیر کے خلاف صاف صاف یہ بیان کرتی ہیں کہ علاماتِ قیامت میں جب آخری علامات رونما ہوں گی تو پہلے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا آسمان سے نزول ہوگا اور دجال کا سخت فتنہ برپا ہوگا اور آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں وہ مارا جائے گا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد یاجوج و ماجوج کا موعود خروج ہو گا جو تمام دنیا پر شر و فساد کی صورت میں چھا جائے گا اور پھر کچھ وقفہ کے بعد نفخ صور ہوگا اور یہ کارخانۂ دنیا درہم برہم ہو جائے گا۔ (بخاری کتاب الفتن ج ۲)

یہ بھی واضح رہے کہ یہ اور اسی قسم کی دوسری صحیح اور اصح روایات سے ان تینوں (جھوٹے مدعیانِ نبوت) کے دعووں کا بھی ابطال ہو جاتا ہے اور انکے کذب صریح کی رسوائی آشکارا ہو جاتی ہے جو اپنی نبوت کی صداقت کی تعبیر یہ کہہ کر تیار کرتے ہیں کہ انگریز اور روس یاجوج و ماجوج ہیں اور جب کہ ان کا خروج ہو چکا اور وہ عالم کے اکثر حصوں پر قابض ہو چکے تو اب ''یسوع مسیح'' کی آمد ضروری ہو گئی۔ لہٰذا وہ موعود مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) ہم ہیں کیونکہ جب شرط موجود ہے تو مشروط کیوں موجود نہ ہو۔

کسی جھوٹے مدعی نبوت کی یہ دلیل اگرچہ خود تار عنکبوت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اسلئے درخور اعتناء بھی نہیں ہے۔ تاہم عوام کو غلط فہمی سے محفوظ رکھنے کیلئے یہ بتادینا ضروری ہے کہ اس مدعی کے بیان کردہ یہ دونوں دعوے جو دلیل کے دو مقدموں کے طور پر بیان کئے گئے ہیں غلط اور ناقابلِ قبول ہیں اور اسلئے ان سے پیدا شدہ نتیجہ بھی بلاشبہ باطل اور مردود ہے۔

پہلا دعویٰ یا مقدمہ تو اسلئے غلط ہے کہ ہم نے یاجوج و ماجوج کی بحث میں تفصیل کے ساتھ حدیث و تاریخ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یاجوج و ماجوج کا اطلاق صرف ان ہی قبائل پر ہو تا رہا ہے جو اپنے اصل مرکز میں بہمہ طریق وحشت و بربریت مقیم ہیں اور ان میں سے جو افراد یا قبائل مرکز چھوڑ کر دنیا کے مختلف حصوں میں بس گئے اور آہستہ آہستہ متمدن بن گئے ہیں وہ تاریخ کی نظر میں یاجوج و ماجوج نہیں کہلاتے بلکہ اپنے بعض امتیازاتِ خصوصی کے پیش نظر نئے نئے ناموں سے موسوم ہو گئے اور اپنے اصلی اور نسلی مرکز سے اس قدر اجنبی ہو گئے ہیں کہ وہ اور یہ دو مستقل جدا جدا قومیں بن گئے ہیں اور ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اسی طرح قرآن اور حدیث کے مطالعہ سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ ان ہی قبائل کو یاجوج و ماجوج کہتا ہے جو اپنی بربریت اور وحشت کے ساتھ عام دنیا سے الگ اپنے مرکز میں گوشہ گیر ہیں۔

اور اسی اصول پر دوسرا دعویٰ یا مقدمہ بھی باطل ہے کہ انگریز اور روس بلکہ یورپین حکومتوں کا تسلط اور قبضہ یاجوج وماجوج کا خروج ہے اور یہ اسلئے کہ ایک تو ابھی ذکر ہو چکا کہ متمدن اقوام کو یاجوج وماجوج کہنا ہی غلط ہے دوسرے اسلئے کہ یاجوج وماجوج کے اس فتنہ وفساد کے پیش نظر جس کا ذکر ذوالقرنین کے واقعہ میں سورۂ کہف میں مذکور ہے اور صحیح احادیث کی تصریحات کے مطابق ان کا وہ خروج بھی جس کا ذکر سورۂ انبیاء میں کیا گیا ہے اور جس کو علامت قیامت میں سے ٹھہرایا ہے۔ ایسے ہی فساد وشر کے ساتھ ہوگا جس کا تعلق تمدن وحضارت سے دور کا بھی نہ ہو اور جو خالص وحشیانہ طرز وطریقہ پر برپا کیا جائے، کہاں سائنس کی ایجادات وآلات کا طریقۂ جنگ اور کہاں غیر متمدن وحشیانہ جنگ وپیکار؟ شتان بینهما۔

اور یہ بات اسلئے بھی واضح ہے کہ متمدن اقوام کی جنگ وپیکار کتنی ہی وحشیانہ طرز وطریقہ اختیار کیے ہوئے کیوں نہ ہو، بہرحال سائنس اور حرب وضرب کے اصول کے مطابق ہوتی ہیں اور یہ سلسلہ اقوام وامم میں ہمیشہ سے جاری ہے۔ اسلئے اگر اس قسم کے جابرانہ وقاہرانہ تسلط اور قبضہ کے متعلق قرآن کو پیشین گوئی کرنی تھی تو اس کی تعبیر کیلئے ہرگز یہ طریقہ اختیار نہ کیا جاتا جو یاجوج وماجوج کے خروج موعود کے سلسلہ میں سورۂ انبیاء میں اختیار کیا گیا ہے بلکہ ان کی ترقی نما بربریت کی جانب ضروری اشارات یا تصریحات کا ہونا لازم تھا۔[1]

الحاصل احادیث صحیح اور آیات قرآنی کی مطابقت کے ساتھ ساتھ جب مسئلہ زیر بحث پر غور وفکر کیا جاتا ہے تو بصراحت یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس علامت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول از آسمان ضروری ہے نہ یہ کہ پہلے یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور پھر مسیح علیہ السلام کی آمد کا انتظار کیا جائے، چنانچہ صحیح مسلم کی ایک طویل حدیث میں مذکور ہے۔

فبينما هو كذلك اذ بعث الله المسيح ابن مريم فينزل عند المنارة البيضاء شرقي دمشق بين مهرودتين و اضعا كفيه علىٰ اجنحة ملكين اذا طاطا رأسه قطر و اذا رفعه تحدر منه جمان كا للؤلؤ فلا يحل لكافر يجد ريح نفسه الامات و نفسه ينتهي حيث ينتهي طرفه فيطلبه حتى يدركه باب لد فقتله ثم يأتي عيسىٰ ابن مريم قوم قد عصمهم الله منه فيمسح عن وجوههم و يحدثهم بدرجتهم في الجنة فبينما هو كذلك اذا اوحى الله الى عيسى انى قد اخرجت عباداً الى لا يد ان لا حد بقتالهم فحرز عبادى الى الطور و يبعث الله ياجوج و ماجوج وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۔ (مسلم كتاب الفتن)

واقعات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کو بھیجے گا اور وہ (جامع) دمشق

---

[1] رہا یہ امر کہ آج جبکہ کاکیشیا کا تمام علاقہ متمدن ہو چکا اور یہاں کی بیشتر آبادی مسلمان ہے تو قریب بہ قیامت یاجوج وماجوج کا خروج اس علاقہ سے کس طرح ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ صفحات میں یہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ کاکیشیا کے اس حصہ سے چین وتبت تک کے تمام ساحلی اور پہاڑی علاقوں کا سلسلہ ان ہی وحشی قبائل کا مسکن رہا ہے اور آج بھی ہے۔ پس ان ہی علاقوں کے مختلف حصے سے بے تعداد وحشی انسان وقتِ موعود پر نکل کر دنیاء انسانی کو تاراج کرنے کیلئے پھیل جائیں گے۔

کے سپید مشرقی منارہ کے نزدیک اس طرح اتریں گے کہ زعفرانی رنگ کی دو چادروں میں ملبوس اور فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھوں کا سہارا دیئے ہوئے ہوں گے۔ جب سر کو جھکائیں گے تو پانی ٹپکنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو اس سے پانی کے قطرات اس طرح گرنے لگیں گے گویا ہار سے موتی ٹوٹ کر گر رہے ہیں یعنی آسمان پر غسل کر کے فوراہی نزول ہو گا، جہاں تک ان کا سانس جائے گا کافر کی موت کا باعث ہو گا اور ان کا سانس ان کی حد نظر تک پہنچے گا پھر اتر کر وہ دجال کا پیچھا کریں گے اور وہ اس کو بیت المقدس کے قریب بستی لد کے دروازہ پر پائیں گے اور قتل کر دیں گے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے پاس تشریف لائیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے دجال کے فتنہ سے محفوظ رکھے گا اور ان کے غبار آلودہ چہروں کو مس کرتے ہوئے ان کو جنت میں جو درجات ملیں گے اس کے متعلق باتیں کریں گے۔ حالات یہاں تک پہنچیں گے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کرے گا کہ اب میں اپنے بندوں میں سے ایک ایسی قوم نکالتا ہوں جن سے جنگ کرنے کی دنیا میں کسی کے اندر طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا تم میرے تمام بندوں کو طور پر لے جاؤ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالے گا جو تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ہر بلند جگہ سے نکل پڑیں گے۔

پس یاجوج و ماجوج کا خروج کسی حال میں بھی ان اقوام پر صادق نہیں آسکتا جو تمدن اور حضارت کی راہوں سے قاہرانہ اور جابرانہ جنگ و پیکار کے ذریعہ سے دنیا پر غالب و قابض ہوتی رہی ہیں اور کسی شخص کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یاجوج و ماجوج قبائل کی تاریخی بحث سے ناجائز فائدہ اٹھا کر جدید نبی بن کر اسلام کے اساسی اور بنیادی مسئلہ ختم نبوت کے خلاف تشکیل نبوت کی جدید طرح ڈالے اور اس طرح اسلام میں رخنہ انداز ہو کر دوست نما دشمن بنے۔

کیا ذوالقرنین نبی تھے

ذوالقرنین کی تعیین کے بعد یہ مسئلہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا ایک نیک نہاد بادشاہ؟ سلفِ صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی جانب ہے کہ ذوالقرنین صالحین میں سے ہیں اور نیک نفس بادشاہ اور وہ نبی یا رسول نہیں۔

چنانچہ حضرت علیؓ کی اس روایت میں کہ جس میں ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ بیان کی گئی ہے ان کا یہ قول مصرح موجود ہے:

لم یکن نبیا و لا ملکا (الحدیث، فتح الباری ج ٦ ص ٢٩٥)

ذوالقرنین نہ نبی تھے اور نہ فرشتہ۔

کان رجلا احب اللہ فاحبہ الخ

وہ ایک انسان تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو محبوب رکھا پس اللہ تعالیٰ نے بھی انکو محبوب رکھا۔

حافظ ابن حجر نے اس روایت کو نقل کر کے اس کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس روایت کو حافظِ حدیث ضیاء الدین مقدسی کی کتاب مختارہ کی احادیث سے بسند صحیح سنا ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ذوالقرنین کے متعلق یہ الفاظ بھی مذکور ہیں۔

بعثه اللّٰه الی قومه (فتح الباری ج ۶ ص ۲۹۸)

اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔

اس سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ لفظ "بعث" تو نبوت ورسالت کیلئے بولا جاتا ہے۔ پھر نبوت سے انکار کے کیا معنی؟ اس کے بعد خود ہی یہ جواب دیا ہے کہ "بعث" یہاں اپنے عام معنی میں ہے جو نبی اور غیر نبی دونوں کیلئے بولا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

و قیل کان من الملوك و و علیه الاکثر۔ (فتح)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا اور اکثر کی یہی رائے ہے۔

حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہی مسلک ہے کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے بلکہ ایک نیک اور صالح بادشاہ تھے:

عن ابن عباس قال کان ذوالقرنین ملکاً صالحاً رضی اللّٰه عمله و اثنی علیه فی کتابه و کان منصوراً۔ (البدایه والنهایه ج ۲ ص ۱۱۳)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نیک اور صالح بادشاہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اعمال کو پسند فرمایا اور اپنی کتاب (قرآن) میں اس کی تعریف فرمائی اور وہ فاتح و کامیاب بادشاہ تھا۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ ذوالقرنین کو صالحین میں سے مانتے تھے۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۳)

البتہ حضرت عمرو بن العاص کی جانب یہ نسبت کی جاتی ہے کہ وہ ذوالقرنین کو نبی مانتے تھے:

عن مجاهد عن عبد اللّٰه بن عمرو قال کان ذوالقرنین نبیا۔ (فتح ج ۶ ص ۲۶۵)

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ ذوالقرنین نبی تھے۔

اور حافظ ابن حجر اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ قرآن کا ظاہر یہی بتاتا ہے[۱] مگر ان تمام اقوال کو نقل کرنے کے بعد فیصلہ کچھ نہیں دیتے لیکن حافظ عمادالدین ابن کثیر ان اقوال کو نقل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا فیصلہ یہ دیتے ہیں:

والصحیح انه کان ملکا من ملوك العادلین۔ (فتح ج ۶ ص ۲۹۵)

اور صحیح یہ ہے کہ ذوالقرنین عادل بادشاہوں میں سے تھا۔

اور حضرت استاذ علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی تحقیق بھی یہی ہے چنانچہ عقیدۃ الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:

بل ملك اخر من الصالحین منتهی نسبه الی العرب السامیین الاولین۔

کہ وہ ایک اور نیک بادشاہوں میں سے تھا اور اس کا نسب قدیم سامیوں پر پہنچتا ہے۔

پس ان نقول کے پیش نظر مولانا آزاد کا یہ فرمانا:

"تو صحابہ و سلف سے جو تفسیر منقول ہے وہ یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا۔ الخ" (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۲۰)

---

[۱] فتح ج ۶ ص ۱۹۷۔

اپنے عموم کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ بیشتر سلف صالحین ذوالقرنین کی نبوت کے قائل نہیں ہیں بلکہ انکوایک بادشاہ کی حیثیت میں تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ بعض سلف کی رائے میں وہ نبی تھے۔

اسی طرح متاخرین میں ابن کثیر کے متعلق یہ کہنا بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ ذوالقرنین کے نبی ہونے کی تائید میں ہیں اسلئے کہ سطورِ بالا میں ابن کثیر سے جو کچھ منقول ہے وہ قطعاً اس کے خلاف ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ذوالقرنین اور خضر کا جوایک جگہ ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے اس میں خضر کی نبوت کی توثیق فرمائی ہے تو اس جگہ شاید ضمائر کے مرجع میں مولانا نے موصوف کو مغالطہ ہو گیا ہے چنانچہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

فان الاول کان عبداً مؤمناً صالحاً و ملکا عادلاً و کان و زیره الخضر و قد کان نبیا علی ما قررناه قبل هٰذا۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۰۲)

اسلئے کہ اول (یعنی ذوالقرنین) ایک عبد مومن اور صالح تھا اور عادل بادشاہ اور اس کے وزیر خضر علیہ السلام تھے اور وہ (خضر) اس تحقیق کے مطابق جو ہم سابق میں بیان کر چکے ہیں بے شک نبی تھے۔

بہر حال حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، امام رازیؒ، ابن کثیرؒ اور ان کے علاوہ سلف صالحین اور متاخرین کی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل صالح بادشاہ تھے۔ پس جبکہ صحابہ اور سلف صالحین بلکہ متاخرین میں سے بھی اکثر اسی جانب ہیں کہ ذوالقرنین نبی نہ تھے تو جمہور کا یہ رجحان بلاشبہ اس امر کی دلیل ہے کہ آیت قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ میں خدائے تعالیٰ کی مخاطبت ذوالقرنین کے ساتھ اسی قسم کی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قصہ میں "اوحینا" کے اندر ہے۔

و اوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه۔

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر وحی کی کہ تو اس (موسیٰ) کو دودھ پلانا منظور کر لے۔

اور یقیناً ان حضرات کا منطوق پر مفہوم کو ترجیح دینا بے وجہ نہیں ہے، خصوصاً جب کہ اس مخاطبت کو نہ "اوحینا" سے تعبیر کیا گیا اور نہ "انزلنا" سے اور نہ "قلنا" کے علاوہ ذوالقرنین سے متعلق آیات میں کوئی ایسا مؤید موجود ہے جو "قلنا" کی خطابت کو خطابت وحی قرار دیتا ہو۔

لہٰذا راجح مذہب یہی ہے کہ ذوالقرنین نبی نہیں تھے بلکہ عادل اور صالح بادشاہ تھے۔

بصائر

۱) مطالبِ قرآن کی بصیرت کیلئے جس طرح لغتِ عرب معانی، بلاغت و بیان صرف و نحو احادیث اور آثارِ صحابہؓ جیسے علوم کی معرفت ضروری ہے۔ اسی طرح صحیح علم تاریخ کی معرفت بھی ضروری ہے چنانچہ گذشتہ اقوام و امم کے حالات و واقعات کا علم حاصل کر کے ان سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی ترغیب خود قرآن عزیز نے پرزور اسلوبِ بیان کے ساتھ دی ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○

کہہ دیجئے، زمین کی سیاحت کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○

بے شبہ تم سے پہلے (خدا کی مقرر کردہ) راہیں گزر چکی ہیں۔ پس زمین کی سیر کرو پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

۲) جہاں تک اسلام کے بنیادی مسائل کا تعلق ہے اس میں "سلف صالحین" کا مسلک ہی بغیر چون وچرا دلیل راہ ہے اور اس سے تجاوز زیغ و گمراہی ہے لیکن جہاں تک قرآن کے لطائف و نکات، معارف و علوم، اسرار و غوامض اور علمی و تاریخی مطالب کا تعلق ہے۔ اس کیلئے کسی زمانہ میں بھی در تحقیق بند نہیں ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

فلا تنقضی عجائبه

قرآن کے لطائف و حکم کبھی ختم ہونے والے نہیں ہیں۔

خصوصاً جبکہ تاریخی مطالب کے حصول کیلئے آج کے ذرائع معلومات قدیم علوم تاریخ کے ذرائع سے زیادہ وسیع ہو چکے ہیں تو سلف صالحین کے مسلک قدیم پر قائم رہتے ہوئے قرآنی حقائق اور اس کے تاریخی مباحث کی تفصیلات و جزئیات میں اقوال سلف کا پابند نہ رہتے ہوئے قرآن کی تائید کیلئے قدیم تحقیق اٹھانا سلف صالحین کا اقتداء ہے نہ کہ ان کے مسلک سے انحراف، کیا کوئی اہل علم اور صاحب نظر اس حقیقت کا انکار کر سکتا ہے کہ ان مطالب تفسیری کے علاوہ جن کے متعلق دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ ارشادات نبوی ﷺ ہیں۔ صحابہ ﷺ کے ذاتی اقوال کے خلاف یا ان سے جدا تابعین اور تبع تابعین کے اقوال بہ کثرت کتب تفسیر میں مذکور ہیں اور متاخرین علماء تفسیر، متقدمین کے اقوال پر نقد و جرح کرتے اور اختلاف رائے رکھتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کی تحقیق قرآن عزیز کے مطالب کی خدمت ہی سمجھی جاتی ہے۔ البتہ اہلیت شرط ہے اور جو شخص بھی اس خدمت کیلئے اقدام کرے اس کا فرض ہے کہ فیما بینی و بین اللہ یہ غور و فکر کرے کہ وہ جس مسئلہ میں کوئی راہ اختیار کرتا ہے۔ حقیقت میں اس کے تمام مالہ اور ماعلیہ سے واقف ہے یا نہیں اور یہ کہ اس کی اس تحقیق سے قرآن کی مزید تائید ہی ہوتی ہے اور سلف صالحین کے بنیادی مسلک قدیم سے قطعاً تجاوز لازم نہیں آتا۔

۳) عدل و ظلم کی حکومت کے درمیان ہمیشہ سے یہ امتیازی فرق چلا آتا ہے کہ عادل حکومت کا نصب العین رعایا اور عوام (پبلک) کی خدمت ہوتا ہے اور اسلئے عادل بادشاہ کا شاہی خزانہ رفاہِ عام اور پبلک خدمات اور ان کی خوشحالی کیلئے ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات پر ضروری حاجات سے زیادہ اس میں سے صرف نہیں کرتا اور نہ عوام کو ٹیکسوں کی کثرت سے پریشان حال بناتا ہے۔ اس کے برعکس جبر و ظلم کی حکومت کا منشاء بادشاہ اور حکومت کا اقتدار، ذاتی تعیش اور اس کا استحکام ہوتا ہے۔ اسلئے وہ نہ رعایا کے دکھ درد کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ان کی راحت و آرام کا خیال رکھتا ہے اور اس سلسلہ میں اگر کچھ ہو بھی جاتا ہے تو وہ حکومت کے مفاد و مصالح کے پیش نظر ضمنی ہوتا ہے۔ نیز اس حکومت میں رعایا ہمیشہ ٹیکسوں کے بوجھ سے دبی رہتی اور اس

ملک کی اکثریت افلاس و غربت ہی کا شکار رہتی ہے۔

ذوالقرنین چونکہ ایک صالح اور عادل بادشاہ تھا اسلئے اس نے شمالی سیاحت میں اس قوم سے ٹیکس لینے سے انکار کر دیا جو یاجوج و ماجوج پر سد بنانے کے سلسلہ میں دینا چاہتے تھے اور اس نے صاف کہا کہ خدا نے مجھ کو حکومت و ثروت اسلئے نہیں دی کہ میں اس کو ذاتی تعیش پر صرف کروں بلکہ صرف اسلئے عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مخلوقِ خدا کی خدمت انجام دوں۔ نیز اس نے جو ملک بھی فتح کیا اس کی رعایا پر عفو و کرم ہی کی بارش کی اور کبھی ان کو نہیں ستایا۔

اصحاب الکہف والرقیم

۱۰۰ء (تخمیناً)

- قرآن عزیزاور اصحاب الکہف والرقیم
- کہف ورقیم
- واقعہ کی حیثیت
- تفسیری حقائق
- نتائج وعبر

قرآن عزیزاور اصحاب الکہف والرقیم

ابن اسحٰق بروایت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش مکہ میں یہ مشورہ ہوا کہ محمد ﷺ کا معاملہ بہت سنگین ہوتا جارہا ہے۔ اسلئے ایسا کوئی یقینی فیصلہ ہونا چاہئے کہ یہ صادق ہیں یا کاذب تاکہ ہم ان کے متعلق اپنی آخری رائے پر عمل کرسکیں، بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہودِ مدینہ سے حل کیا جائے کیونکہ وہ خود کو اہل کتاب کہتے اور س قسم کے معاملات میں صاحب بصیرت ہیں۔ قریش نے اس غرض سے نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط پر مشتمل ایک وفد علماءِ یہود کے پاس بھیجا۔ علماءِ یہود نے ان سے کہا کہ تم ان سے تین باتیں دریافت کرو اگر وہ صحیح صحیح جواب دیں تو بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں۔ تم کو ہرگز ان کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے اور اگر وہ صحیح جواب نہ بتا سکیں تو تم کو اختیار ہے جو چاہو ان کے ساتھ کرو۔ وہ تین سوال یہ ہیں: ذوالقرنین کا واقعہ کیا ہے؟ اصحابِ کہف کون تھے اور ان پر کیا گزرا؟ روح کی حقیقت بیان کیجئے؟ وفد نے مکہ جاکر صنادید قریش سے صورت حال کہہ سنائی اور قریش نے اس بات کو بہت پسند کیا اور خدمت اقدس میں حاضر ہوکر آپ ﷺ سے یہ تینوں سوالات کیئے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس کا جواب وحی آنے پر دوں گا۔ چنانچہ جب وحی کے ذریعہ آپ ﷺ کو ان واقعات کی حقیقت سے آگاہ کردیا گیا تب آپ نے ان کے سامنے سورۂ کہف تلاوت کرکے واقعات کی حقیقت ان پر واضح کردی:

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا ○ إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ○ فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ○ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا أَمَدًا ○ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ ط

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ○ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوْبِهِمْ إِذْ قَامُوْا
فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِلٰهًا لَقَدْ قُلْنَآ إِذًا
شَطَطًا ○ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ آلِهَةً ط لَوْلَا يَأْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ
بَيِّنٍ ط فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ○ وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا
يَعْبُدُوْنَ إِلَّا اللّٰهَ فَأْوُوْا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ
مِنْ أَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ○ وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ
الْيَمِيْنِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِنْهُ ط ذٰلِكَ مِنْ
آيَاتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ○
وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُمْ
بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ط لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ
مِنْهُمْ رُعْبًا ○ وَكَذٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ط
قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوْا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْٓا أَحَدَكُمْ
بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ إِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَآ أَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ
وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا ○ إِنَّهُمْ إِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ أَوْ
يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا إِذًا أَبَدًا ○ وَكَذٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا
أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَآ إِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا
ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ط رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ
عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ○ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ
كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ط قُلْ رَّبِّيْٓ أَعْلَمُ
بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ
مِّنْهُمْ أَحَدًا ○ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ إِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ○ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ إِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓى أَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِأَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ○

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۝ قُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا لَهٗ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهٖ وَأَسْمِعْ ط مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ أَحَدًا ۝ (الکہف)

کیا تم نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اصحاب کہف ورقیم (کا معاملہ) ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب (معاملہ) ہے جبکہ چند نوجوان پہاڑ کے غور میں پناہ گیر ہو گئے تھے اور یہ دعا مانگ رہے تھے، اے ہمارے پروردگار تو اپنے پاس سے ہم کو رحمت عطا کر اور ہمارے لیئے رشد وہدایت مہیا کر، پھر ہم نے غار میں چند سال تک کیلئے ان کو تھپک کر سلا دیا، پھر ان کو اٹھایا (پیدا کیا) تا کہ ہم جان لیں کہ دونوں بستی والوں اور غار والوں میں سے کس نے ان کی مدت کا صحیح اندازہ لگایا، ہم تجھ کو ان کا صحیح اور سچا واقعہ بتائے دیتے ہیں، بیشک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت کی روشنی اور زیادہ عطا کر دی تھی اور جب وہ (حاکم وقت کے سامنے) یہ اعلان کرنے پر کمر بستہ ہو گئے کہ ہمارا پروردگار وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اور ہم ہرگز اس کے علاوہ کسی کو خدا نہیں پکار سکتے اور اگر ایسا کریں گے تو خدا پر بہتان باندھیں گے، اس وقت ہم نے ان کے دل خوب مضبوط کر دیئے تھے وہ کہتے تھے کہ یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے اللہ کے ماسوا بہت سے معبود بنا لیئے ہیں۔ یہ کیوں کھلی دلیل اپنے معبودانِ باطل (کی صداقت) کیلئے نہیں لاتے پس اس سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے اور اے رفیقو! جب تم ان سے اور ان کی عبادت سے جو اللہ کے سوا وہ باطل معبودوں کی کرتے ہیں علیحدگی اختیار کرتے ہو تو پہاڑ کے غار میں چلے چلو تمہارا پروردگار اپنی رحمت نچھاور کرے گا اور تمہارے معاملہ میں سہولت پیدا کرے گا اور اے پیغمبر تم سورج کو دیکھو گے کہ وہ نکلتے وقت ان کے غار سے داہنی جانب بچ کر نکل جائے گا اور ڈوبتے وقت غار سے کترا کر بائیں جانب کو ہو جاتا ہے اور وہ کشادہ غار میں ہیں یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جس کو وہ ہدایت دے وہی راہ یاب ہے اور جس شخص کو (اس کی مسلسل سرکشی کی بناء پر) گمراہ کرتے تو اس کیلئے کسی راہ دکھانے والے مددگار کو نہ پائے گا اور تو ان کو بیدار گمان کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہوں گے اور ہم ان کی کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ داہنے بھی اور بائیں بھی اور ان کا کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے منہ پر بیٹھا ہوا ہے اگر تو ان کو جھانک کر دیکھے تو انکی اس شان اور حالت کو دیکھ کر مرعوب ہو جائے اور بھاگ پڑے اور اسی طرح ہم نے ان کا اٹھا دیا، جگا دیا تا کہ آپس میں پوچھ گچھ کریں، ایک نے ان میں سے کہا تم غار میں کب سے ہو، دوسروں نے جواب دیا ایک دن یا دن کے کچھ حصہ سے، پھر انہوں نے کہا تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم یہاں کتنی مدت سے ہو تو (اب یہ کرو کہ) اپنے میں سے کسی ایک کو شہر میں یہ سکہ دے کر بھیجو کہ وہ تمہارے لیے دیکھ بھال کر عمدہ قسم کا کھانا لائے اور اس کو چاہئے کہ بہت ہی رازدارانہ طریقہ پر جائے اور ہرگز کسی کو اطلاع نہ ہونے دے کہ ہم یہاں مقیم ہیں۔ اسلئے کہ اگر ان پر تمہارا معاملہ منکشف ہو گیا تو وہ تم کو سنگسار کر دیں گے یا تم کو زبردستی اپنے دین کی جانب لوٹانے پر مجبور کریں گے او راس وقت تم ہرگز کامیاب نہ رہو گے (نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں) اور اسی طرح ہم نے شہر والوں پر ان کا معاملہ ظاہر کر دیا تا کہ وہ یہ یقین کر لیں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے، ہم نے ان کو اس وقت اس معاملہ کی اطلاع دی جبکہ وہ قیامت کے وجود و عدم پر آپس میں اختلاف کر رہے تھے پھر وہ کہنے لگے کہ ان اصحابِ کہف پر قبہ تعمیر کر دو، ان کا پروردگار ان کے حال کا خوب

واقف کار ہے (یعنی ان سے کوئی تعرض نہ کرو) ان لوگوں نے جو برسر حکومت تھے کہا ہم تو ان کے غار پر ایک مسجد (ہیکل) تعمیر کریں گے اے پیغمبر کچھ لوگ کہیں گے وہ تین آدمی ہیں چوتھا ان کا کتا ہے کچھ لوگ ایسا بھی کہتے ہیں نہیں پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا ہے، یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں، بعض کہتے ہیں سات ہیں آٹھواں ان کا کتا ہے، (اے پیغمبر) کہہ دے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیونکہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے اور تو لوگوں سے اس بارہ میں نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو (یعنی باریکیوں میں نہیں پڑھنا چاہئے کہ کتنے آدمی تھے کتنے دنوں تک رہے تھے) اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارے میں کچھ دریافت کر۔ اور ہرگز کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہنا کہ میں کل کو یہ ضرور کرنے والا ہوں مگر (یہ کہہ کر) کہ ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور جب بھی بھول جاؤ تو اپنے پروردگار کی یاد تازہ کرلو تم کہہ دو امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا اور کہتے ہیں وہ غار میں تین سو برس تک رہے اور لوگوں نے نو برس اور بڑھا دیئے ہیں (اے پیغمبر) تو کہہ دے اللہ ہی بہتر جانتا ہے وہ کتنی مدت تک رہے وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جاننے والا ہے بڑا ہی دیکھنے والا بڑا سننے والا ہے اس کے سوا لوگوں کا کوئی کارساز نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔

کہف و رقیم

لغت میں کہف پہاڑ کے اندر وسیع غار کو کہتے ہیں مگر رقیم کے معنی میں مفسرین کو سخت تردد ہے اور ضحاک او سدی جوہر ایک تفسیری روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب ضرور منسوب کر دیا کرتے ہیں، اس مقام پر بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد اقوال نقل کرتے ہیں۔

۱) یہ رقم سے مشتق ہے اور رقیم بمعنی مرقوم (مکتوب) ہے چونکہ بادشاہِ وقت نے ان کی تلاش کے بعد انکے نام پتھر کی ایک تختی پر کندہ کر دیئے تھے۔ اس لیئے ان کو اصحاب رقیم بھی کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیر اسی کی تائید میں ہیں اور مفسرین کے یہاں یہی قول مشہور ہے۔

۲) یہ وادی کا نام ہے جہاں پہاڑ میں وہ غار تھا جس میں اصحابِ کہف روپوش ہوئے تھے۔ قتادہ، عطیہ عوفی اور مجاہد بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

۳) یہ اس پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھا۔

۴) عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو یہ کہتے سنا "ما ادری ما الرقیم کتاب ام بنیان" میں نہیں کہہ سکتا کہ رقیم سے کندہ تختی مراد ہے یا شہر مراد ہے۔

۵) بروایت کعب احبار، وہب بن منبہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ ایلہ (عقبہ) کے قریب ایک شہر کا نام ہے، یہ بلاد روم میں واقع ہے۔

تاریخ اور اثری تحقیقات کے پیش نظر یہ آخری قول ہی صحیح اور قرآن عزیز کے بیان کے مطابق ہے اور باقی اقوال محض قیاس و تخمین پر مبنی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل کیلئے تاریخ اور علم الآثار کے چند اوراق کا مطالعہ ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ واقعہ بعثتِ مسیح علیہ السلام سے کچھ زمانہ بعد کا ہے اور انباط کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ انباط کون ہیں؟ اور ان کا مسکن و

موطن کہاں ہے؟ یہی وہ گتھی ہے جس کے سلجھ جانے پر حقیقت روشن ہو سکتی ہے۔

مؤرخین عرب انباط کے متعلق عموماً یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عجمی النسل ہیں اور اسی لیئے وہ نبطی کو عربی کا مقابل قرار دیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اور عرب مؤرخین کے مختلف تاریخی مقولے اور توراۃ اور رومی و یونانی تاریخیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبطی خالص عربی اور اسمعیلی النسل ہیں مگر بدویانہ زندگی ترک کر دینے اور حجاز سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بس جانے کی وجہ سے یہ عربوں کیلئے اجنبی ہو گئے۔ حتیٰ کہ خود بھی یہ بھول گئے کہ عرب سے ان کو کیا نسبت ہے؟ اسی بناء پر حضرت فاروقِ اعظمؓ کا مشہور مقولہ ہے:

تعلموا النسب ولا تکونوا کنبط السواد اذا سئل احدھم عن اصلہ قال من قریۃ کذا۔

اپنے نسب کو سیکھو، عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب ان میں سے کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم کس خاندان سے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔

لیکن "انباط" کی بحث کو چھوڑ کر جب مؤرخینِ عرب سے دریافت کیا جائے کہ نبط یا نابت کون ہے تو وہ بغیر کسی اختلاف کے فوراً یہ جواب دیں گے "ابن اسمٰعیل علیہ السلام" کیونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکوں میں سے بڑے کا نام نابت یا نبط ہے۔ چنانچہ ابن کثیر اپنی تاریخ میں نابت کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

ثم جمیع عرب الحجاز علیٰ اختلاف قبائلھم یرجعون فی انسابھم الیٰ ولدیہ نابت وقیدارو وکان الرئیس بعدہ والقائم بالامور الحاکم فی مکۃ والناظر فی امر البیت وزمزم نابت بن اسمٰعیل وھو ابن اخت الجرھمین ثم تغلب جرھم علی البیت طمعاً فی بنی اختھم فحکموا بمکۃ وماوالاھا عوضا عن بنی اسمٰعیل مدۃ طویلۃ فکان اول من صار الیہ امر البیت بعد نابت مضاض بن عمرو بن سعد بن الرقیب بن عبیر بن نابت۔

تمام حجازی عرب کے مختلف قبائل کا نسب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے دو صاحبزادوں نابت اور قیدار پر ختم ہوا ہے اور اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد ان کا جانشین نابت ہوا، وہی تمام امور کا والی مکہ کا حاکم، زمزم اور کعبہ کا متولی قرار پایا اور یہ بنی جرہم کا بھانجا تھا۔ پس بنی جرہم اس تعلق کی وجہ سے اس کے بعد عرصہ تک مکہ پر حاکم و قابض رہے اور اطرافِ مکہ پر بھی انہی کی حکومت رہی، مدت دراز کے بعد نابت کی پانچویں پشت میں سے ایک شخص مضاض نے دوبارہ مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت کو بنی جرہم کے قبضہ سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لیا۔
(البدایہ والنہایہ جلد ۲)

مگر اس کے آگے عرب مؤرخین عام طور پر اس بارے میں خاموش ہیں کہ جب نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل کثرت سے بڑھی تو کیا وہ صرف حجاز ہی کے اندر محدود رہی یا اطراف و جوانب میں پھیلی اور اگر ادھر اُدھر گئی تو اس کا سلسلہ کہاں تک پھیلا۔ البتہ ابن خلدون نے اس سے متعلق معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے، وہ کہتا ہے:

"نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام بیت اللہ کا متولی ہوا اور مکہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مقیم رہا تا آنکہ اس کی نسل نے اس درجہ ترقی کی کہ وہ مکہ میں نہ سما سکے اور حجاز کے اطراف و جوانب تک

میں پھیل گئے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۲)

لیکن توراۃ نے اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر جو کچھ کہا ہے وہ اصل گتھی کو سلجھانے میں بہت زیادہ مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس نے شروع میں تو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی فہرست دی ہے اور اس کے بعد اس نے یہ بتایا ہے کہ خاندان نابت ساعیر (کوہ سراط) یعنی حجاز سے شام کے علاقوں تک پھیلا ہوا ہے اور ایلہ (عقبہ) تک ان کا قبضہ ہے توراۃ میں نابت کا تلفظ بھی مختلف طریقوں سے مذکور ہے کہیں نبیت ہے تو کہیں نبط اور کہیں نبایوط۔

توراۃ کے حوالجات یہ ہیں:

"یہ اسمٰعیل علیہ السلام کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق ان کے ناموں اور نسبتوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلوٹھا نبیت اور قیدار اور ادبئیل اور بیسیام اور مسماع اور دومہ اور مَسّا اور حدر اور تیمہ اور اطور اور نفیس اور قدماہ"۔ (تکوین باب ۲۵ آیات ۱۴-۱۳)

یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں یروشلم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

"اور قوموں کی دولت تیرے (یروشلم) کے پاس فراہم ہوگی اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عنیفہ کی سانڈنیاں تیرے گرد آ کے جمع ہوں گی وہ سب جو سبا کے ہیں آئیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے۔ (باب ۶۰ آیات ۷)

اور حزقیل نبی کے صحیفہ میں ہے:

"نبایوط (نابت) کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی۔" (باب ۲۵ آیات ۱۸)

اور سفر تکوین میں خاندان نابت کا علاقہ سکونت یہ بتاتے ہیں:

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے آشور کو جاتے ہیں بستے تھے ان کا قطعہ زمین ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا۔ (باب ۲۵ آیات ۱۸)

ان حوالجات کی تفصیل و تشریح کیلئے اب اگر ان رومی مؤرخین کی شہادات بھی شامل کر لی جائیں جو نبطیوں (انباط) کے معاصر ہیں تو یہ بات بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے کہ انباط اور بنو نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام ایک ہی ہیں اور یہ کہ انہوں نے غیر متمدن زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی تھی۔

یوسیفوس جو پہلی صدی عیسوی میں ہو گذرا ہے اور انباط کا معاصر بھی ہے لکھتا ہے:

"ملک بحر احمر سے نہر فرات تک اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جن کے سبب سے ان کا نام نبوطیہ (Nabotena) پڑ گیا ہے اس کی سرحد (مغرب میں) مصر او[illegible] ب[illegible]ستان (Petania) مل گئی ہیں اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو ش[illegible] ہے جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتہی ہوتی ہے۔ عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام [illegible]ب (Natayotn) ہے۔

([illegible] آف ریز ص ۱۴۲۵ نمبر ۱۲ (ارض القرآن ج ۲))

اورذاندروس ۸۰ق م بیان کرتا ہے:

"انباط خلیج ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں"۔ (ارض القرآن ج ۲ ص ۱۲ ماخوذ از گولڈ کاس آف مدین ص ۲۲۵ ۔ انیٰ ۱۲)

اور دوسری جگہ لکھتا ہے:

"اوپر گذرتے ہوئے تم خلیج عقبہ (ایلہ) میں داخل ہو گے جس کے حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں جن کو لوگ نبط کہتے ہیں۔ (ایضاً ج ۲ ص ۶۰)

اور آثار اور کتبات میں نبط کا نام سب سے پہلے ۷۰۰ ق م میں نظر آتا ہے جبکہ آشور بنی پال شاہ اسیریا کے کتبہ میں وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں ناتان شاہ نبط کا تذکرہ کرتا ہے۔ (ایضاً جلد ۲ ص ۶۰)

ان تمام تفاصیل کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایلہ (عقبہ) کی خلیج سے شام تک اور سواحلِ مصر سے خلیج فارس تک جو قوم مسطورۂ بالا حوالجات میں برسر اقتدار نظر آتی ہے وہ نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام ہی کی نسل سے ہے جو نبط، انباط، نبایوط اور نبیت کے ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے۔

البتہ ایک بات طبیعت میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی جس نسل سے توراۃ اور رومی مؤرخین اس تفصیل کے ساتھ واقف ہوں وہ عرصۂ دراز کے بعد اپنے بھائیوں (اہل عرب) کی نگاہ میں کیوں اجنبی ہو گئی بلکہ خود نبطی یہ کیوں بھول گئے کہ وہ خالص عربی النسل اور اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ سو اس کے متعلق یاقوت حموی کے ایک جملہ سے بآسانی جواب دیا جا سکتا ہے، یاقوت (ربہ) کے عنوان میں بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے:

اما النبط فکل من لم یکن راعیاً او جندیاً عند العرب من ساکن الارضین۔

اہل عرب دنیا کے ہر اس انسان کو نبطی کہہ دیتے ہیں جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز سے نکل کر مدت مدید کے بعد چونکہ نبطیوں نے بدویانہ، سپاہیانہ زندگی کو چھوڑ کو متمدن شہریوں کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اسلئے آہستہ آہستہ اہلِ عرب کی نگاہ میں بنی نابت اجنبی ہو گئے اور وہ ان کو بھی عجمی حکمرانوں کی طرح سمجھنے لگے۔ لہٰذا ان کے طریق بود و ماند، معاشرتی تمدن اور اختلافِ احوال نے ان حجازوں سے الگ کر کے ان ہی کے بھائیوں کی نگاہ پر ان کے حجابی پردے ڈال دیئے۔

مؤرخین کے نزدیک انباط کا رقبۂ حکومت تین مختلف العہد قوموں کے دائرۂ حکومت پر حاوی تھا یعنی (۱) ثمود کا ملک "وادیٔ قریٰ" اس کا دارالحکومت مشہور شہر حجر تھا۔ (۲) ملک مدین اس کا دارالحکومت خود شہر مدین ہی تھا۔ (۳) ملک ادوم[۱] اس کا دارالحکومت رقیم تھا۔

انباط کا زمانۂ حکومت ۷۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۱۰۶ تک ختم ہو جاتا ہے۔ اوائلِ صدی عیسوی میں رومیوں نے ان پر لشکر کشی کر کے اور شکست دے کر رقیم اور اس کے پورے علاقہ پر قبضہ کر لیا تھا اور انباط کے پاس صرف حجر کا علاقہ باقی رہ گیا تھا۔ جو ۱۰۶ میں جب ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو انباط کی حکومت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ

۱: ادوم کا علاقہ اول عیسو بن اسحٰق (علیہ السلام) کے قبضہ میں تھا جیسا کہ ادوم کے ذکر میں قصص القرآن ج ۲ میں ذکر ہو چکا ہے۔

ہو گیا، رومیوں نے رقیم پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس کو اپنی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقیوں کا مرکز بنایا تو اس کا پورا نام بدل کر پٹیرا رکھا۔

یہی وہ رقیم ہے جس کا ذکر اصحاب کہف کے واقعہ میں قرآن عزیز نے کیا ہے ام حسبت ان اصحب الکہف والرقیم کانوا من ایاتنا عجبا اور یہی وہ شہر ہے جس کے کچھ سعادتمند انسان بت پرستی سے نفور ہو کر اور بت پرست حکمرانوں کے ظلم وجور سے محفوظ رہنے کی خاطر اس شہر کے پہاڑوں کے ایک غار میں چھپ رہے تھے۔ پس حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا یہ ارشاد کہ رقیم "ایلہ" کے قریب شہر تھا اور یہ کہ وہ روم کے علاقہ میں تھا بالکل صحیح اور قرآن اور تاریخ دونوں کے عین مطابق ہے۔ بلا شبہ وہ ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب واقع تھا اور چونکہ رومیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اسلئے اس کو روم کے علاقہ میں شمار کرنا قطعاً درست ہے۔

مگر حیرت ہے اس تاریخی انقلاب پر کہ جب رومیوں نے انباط کے اس مرکزی شہر کا نام پٹیرا رکھ دیا تو اس نام نے تھوڑے ہی دنوں میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی کہ عرب اور عجم نے اس کے سیناؤں اور فنون لطیفہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہو کر اس کا اصل نام بالکل فراموش کر دیا اور ان کیلئے چند صدیوں ہی میں رقیم ایک اجنبی اور غیر معلوم نام ہو گیا۔ حتیٰ کہ اہل عرب نے بھی اس کو بطرا ہی کے نام سے یاد رکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب قرآن نے اس کا اصل نام بیان کیا تو دوسروں کی طرح اہل عرب بھی حیران تھے کہ رقیم غار کا نام ہے یا لوح کی تختی کا یا پہاڑ کا یا شہر کا لیکن جس نام کو انباط کے بھائیوں (حجازیوں) نے بھلا دیا تھا اس کو توراۃ نے اپنی سند میں محفوظ رکھا تا کہ جب نبی امی وحی کے ذریعہ اصل حقیقت کا اعلان کرتے تو وہ اس کی تائید کیلئے خود کو پیش کر سکے۔

گذشتہ جنگ عظیم کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات نے جہاں اور بعض جدید انکشافات کیئے ہیں ان میں سب سے نمایاں اسی شہر رقیم (پٹیرا یا بطرا) کی دریافت ہے اور اس کے متعلق جس قدر اثری تحقیق کی جارہی ہے۔ اس سے قرآن عزیز کی حرف بحرف تصدیق ہوتی جاتی ہے۔

خلیج عقبہ (ایلہ) سے شمال کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں کے دو متوازی سلسلے ملتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک پہاڑ کی بلندی پر انباط کا دارالحکومت رقیم آباد تھا۔

اس شہر کی موجودہ زمانہ میں جو اثری پیمائش کی جارہی ہے اس میں نئے نئے اکتشافات کے ساتھ اس کے پہاڑوں کے عجیب وغریب "غار" بھی قابل ذکر ہیں، یہ غار بہت وسیع اور دور دور تک چلے گئے ہیں اور اس طرح واقع ہیں کہ دن کی دھوپ اور تپ ان تک نہیں پہنچتی، ایک غار ایسا بھی دریافت ہوا ہے کہ جس کے دہانہ پر قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بہت سے ستونوں کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی ہیکل کی عمارت ہے۔

اس صاف اور بے لاگ اثری اور تاریخی شہادتوں کے بعد یہ کہنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن عزیز نے جن اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے وہ اسی شہر رقیم سے تعلق رکھتا ہے۔

۱: توراۃ سفر عدد اور صحیفہ یسیعاہ میں اس شہر کا نام "راقیم" بیان کیا گیا ہے۔ دائرۃ المعارف (عرب)

واقعہ

اسمٰعیلی عربوں کے مذہب سے متعلق تاریخ کے صفحات یہ شہادت دیتے ہیں کہ ان میں گو کچھ عرصہ باپ دادا کا دین حق "ملت ابراہیم" باقی رہا۔ مگر آہستہ آہستہ مصر، شام اور عراق کے صنم پرستوں کے تعلقات نے عمرو بن لحی کے ذریعہ ان میں بت پرستی اور ستارہ پرستی کی داغ بیل ڈال دی اور کچھ عرصہ بعد ان عربوں کو شرک پرستی میں ایسا ید طولیٰ حاصل ہو گیا کہ وہ دوسروں کیلئے پیش رو بن گئے۔ چنانچہ نابت کی اولاد بھی شرک کی گمراہی میں مبتلا تھی اور ان کے مشہور بت ذوالشریٰ لات، منات، ہبل، کعبہ، عمیاس اور حریش تھے۔[1] صدیوں تک نبطی بت پرستی کی اسی گمراہی میں مبتلا رہے کہ مسیحی دور کے اوائل میں دارالحکومت رقیم کے اندر ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسیحی مذہب کا ابتدائی دور ہے۔ نبطی حکومت کے اطراف یعنی شام وغیرہ میں عیسائیت کا زور ہے کہ رقیم کی چند نوجوان سعید روحیں شرک سے بیزار اور نفور ہو کر توحید کی جانب مائل ہو جاتی اور دین عیسوی کو قبول کر لیتی ہیں۔ شدہ شدہ یہ بات بادشاہ وقت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ نوجوانوں کو دربار میں بلاتا اور انکشاف حال چاہتا ہے۔ نوجوان کلمۂ حق بلند کرنے میں بے باک اور جری ثابت ہوتے ہیں، یہ بات بادشاہ کو ناگوار گذرتی ہے مگر وہ دوبارہ معاملہ پر غور کرنے کے لیئے ان کو چند روز کی مہلت دیتا ہے، یہ دربار سے واپس آکر آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور طے پاتا ہے کہ خاموشی کے ساتھ کسی پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہو جانا چاہئے تاکہ مشرکوں کے شر سے محفوظ رہ کر عبادت الٰہی میں مشغول رہ سکیں۔ یہ سوچ کر وہ ایک غار میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ غار میں داخل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نیند طاری کر دیتا ہے اور وہ خواب ہی کی حالت میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ غار کی عجیب کیفیت ہے، اندر سے بہت وسیع ہے مگر قدرت نے اس کو ایسا موقع نصیب کیا ہے کہ زندگی کے بقاء کے قدرتی سامان وہاں سب موجود ہیں، ایک طرف دہانہ ہے تو دوسری جانب ہوا گذرنے کے منفذ دار سوراخ ہیں جن کی وجہ سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی جاتی رہتی ہے، غار شمال و جنوب رویہ ہے اسلئے طلوع و غروب کے وقت آفتاب کی تپش اندر نہیں پہنچ پاتی مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچتی رہتی ہے اور ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ نہ تاریکی ہی ہے کہ کچھ نظر نہ آئے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کی طرح جگہ روشن ہو جائے۔ اس حالت میں چند انسان اس غار میں خواب آلود ہیں اور ان کا رفیق کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے دہانہ پر باہر کی جانب منہ کیئے بیٹھا ہے۔

اس مجموعی صورت حال نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ پہاڑوں کے درمیان غار کے اندر جھانکنے والے انسان پر خوف وہراس کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

برسوں تک یہ نوجوان اسی حالت میں آرام کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں کہ شہر میں انقلاب ہو جاتا ہے، رومی عیسائی نبطی حکومت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور دشمن کو شکست دے کر اس پر قابض ہو جاتے ہیں اور اس طرح رقیم (پٹیرا) عیسائیت کے آغوش میں آجاتا ہے۔ اب خدا کی مشیت فیصلہ کرتی ہے کہ یہ نوجوان بیدار ہوں، وہ

---

[1] کتاب الاصنام لدین ابکلی۔

بیدار ہو جاتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کتنی مدت سوتے رہے؟ ایک نے جواب دیا کہ ایک دن اور دوسرے نے کہا یا دن کا بھی کچھ حصہ، پھر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی شہر جا کر کھانا لے آئے اور یہ سکہ لے جائے مگر جو بھی جائے اس طرح لین دین کرے کہ شہر والوں کو پتہ نہ لگ سکے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ورنہ مصیبت آجائے گی بادشاہ ظالم بھی ہے اور مشرک بھی، وہ یا تو شرک پر آمادہ اور بے دینی پر مجبور کرے گا اور یا ہم سب کو قتل کر ڈالے گا اور یہ باتیں ہماری دین و دنیا کو برباد کر دینے والی ثابت ہوں گی۔

اب نوجوان میں سے ایک شخص سکہ لے کر شہر گیا وہاں دیکھا تو حالات بالکل بدل چکے ہیں اور نئے آدمی اور نیا طور و طریقہ نظر آ رہا ہے مگر پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے ایک باورچی کی دوکان پر پہنچا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جب قیمت ادا کرنے لگا تو باورچی نے دیکھا کہ سکہ قدیم ہے۔ اس طرح آخر بات کھل گئی، لوگوں کو جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے اس شخص کا خیر مقدم کیا اور اس عجیب و غریب معاملہ سے بہت زیادہ دلچسپی لی۔ کیونکہ عرصہ ہوا کہ یہاں مشرک بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کرلی تھی۔

اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو اگرچہ عیسائیت پھیل جانے سے اس کو بے حد خوشی ہوئی مگر اپنے اور اپنے رفیقوں کیلئے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہ کر یادِ خدا میں گزار دیں۔ اسلئے کسی طرح مجمع سے جان بچا کر پہاڑ کی راہ لی اور اپنے رفقاء میں پہنچ کر سب حال کہہ سنایا۔ ادھر شہریوں میں ان کی جستجو کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے آخر ان کو ایک غار میں پالیا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ شہر چلیں اور اپنی پاک زندگی سے اہل شہر کو فائدہ پہنچائیں مگر وہ کسیطرح آمادہ نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی عمر کا باقی حصہ راہبانہ زندگی کے ساتھ اسی غار میں گزار دیا۔

جب ان مردانِ خدا راہبوں کا انتقال ہو گیا تو اب لوگوں میں چرچا ہوا کہ ان کی یادگار قائم ہونی چاہئے چنانچہ ان میں جو حضرات ذی اثر اور بااقتدار تھے انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ہیکل (مسجد) تعمیر کریں گے اور غار کے دہانہ پر ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کر دیا۔ (فتح الباری ج ۶ احادیث غار، و تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف البدایہ والنہایہ ج ۲)

واقعہ کی تاریخی حیثیت

ابن کثیر کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور دیگر بزرگوں کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے کچھ زمانہ بعد کا ہے۔ یعنی ابتداءِ دورِ مسیحی کا واقعہ ہے مگر مجھ کو اس قول میں یہ تردد ہے کہ محمد بن اسحٰق کی اس روایت سے جو اس واقعہ کے شانِ نزول سے متعلق ہے'' یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف کے بارے میں قریش مکہ کو یہود نے تعلیم کیا تھا کہ وہ دوسرے سوالوں کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کریں اور یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اس واقعہ کے ساتھ یہود کو خاص دلچسپی تھی پس اگر یہ واقعہ عیسائیت کی ترقی سے متعلق تھا تو یہود کو اس کے ساتھ دلچسپی کے کیا معنی، کیونکہ یہودیت اور عیسائیت تو نبرد آزما اور حریف جماعتیں ہیں اس سے راجح یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام سے بہت پہلے

یہودی دور سے متعلق ہے۔　(تفسیر ابن کثیر ج ۳ سورۂ کہف، البدایہ والنہایہ ج ۲)

ابن کثیر (رحمہ اللہ) کا یہ سوال اگرچہ اہمیت رکھتا ہے لیکن تاریخی سندات اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ خلاف فیصلہ کرتی ہیں۔ اسلئے کہ یہ مسلم ہے کہ واقعہ زیر بحث شہر رقیم میں پیش آیا ہے اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ "رقیم" اپنی آبادی کے وقت سے کبھی یہودیت سے متاثر نہیں ہوا بلکہ نبطی دور میں بت پرستی کا گہوارہ رہا اور اس کے بعد رومیوں نے جب اس پر قبضہ کر لیا تو وہ عیسائیت کی آغوش میں آگیا۔ چنانچہ رقیم کی تاریخ ان ہی دو عہدوں سے بنتی ہے تو پھر ایک خاص نکتہ کے پیش نظر محض ظن و تخمین سے کس طرح اس واقعہ کو یہودیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مسیحی مذہب کے ابتدائی دور میں اس قسم کے چند واقعات اور بھی پیش آئے ہیں۔ جن میں مشرک اور بت پرست بادشاہوں کے خوف سے عیسائیوں نے غاروں اور پہاڑوں میں جا کر راہبانہ زندگی اختیار کی ہے۔ چنانچہ ایک واقعہ شہر افسس میں پیش آیا، ایک انطاکیہ میں اور ایک خود روم میں پیش آچکا ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے ایک ایسے ہی واقعہ کی خبر دی ہے جو شہر رقیم یا راقیم میں پیش آیا تھا۔

اس بناء پر ابن اسحٰق کی روایت کے متعلق دو باتوں میں سے ایک بات تسلیم کرنی چاہئے اول یہ کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت میں تین سوالات کا جو ذکر کیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سوالات تو صرف یہودی علماء کے بنائے ہوئے تھے اور ان سے مشرکین مکہ قطعاً ناآشنا تھے۔ مگر تیسرے سوال واصحاب کہف کا سوال، سے متعلق خود قریش مکہ کو بھی ایک حد تک علم تھا۔ اسلئے کہ یہ واقعہ ان کے بہت قریب ہی پیش آیا تھا اور اگرچہ وہ رقیم کو بھول گئے تھے لیکن پٹیرا (بطرا) سے وہ بخوبی واقف تھے اور شام کی تجارت کی وجہ سے نبطیوں کے ساتھ اکابر وقت کا واسطہ تھا اور واقعہ بھی کچھ زیادہ طویل عرصہ کا نہ تھا پس ہو سکتا ہے کہ وہ اس واقعہ کی کچھ معمولی باتیں جانتے ہوں اور چونکہ اس کا تعلق اہل کتاب سے تھا اس لئے قریشیوں نے آپ ﷺ کی صداقت کے امتحان کیلئے بمشورہ یہود اس کو بھی شامل کر لیا ہو اور چونکہ سوالات بہر حال مشرکین ہی کی جانب سے کئے گئے۔ اس لئے حضرت ابن عباسؓ نے اختصار کے طور پر ان تینوں کو ایک ہی اسلوب سے نقل فرما دیا۔

یہ احتمال محض اندھیرے کا تیر نہیں ہے بلکہ قرآن عزیز کے اسلوب بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ زیر بحث تینوں سوالات میں سے پہلے اور دوسرے سوالوں کے متعلق قرآن کا اسلوبِ بیان یہ ہے: يَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ، يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ یعنی ان دونوں جگہ سوال کی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ مگر تیسرے مسئلہ میں پیرایۂ بیان اس سے جدا یہ اختیار کیا گیا ہے: اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا اس جگہ اگرچہ خطاب نبی اکرم ﷺ کی جانب ہے لیکن مقصود وہی لوگ ہیں جو سوال کر رہے ہیں اور اس واقعہ کی کچھ حقیقت جاننے کی وجہ سے اسے ایک عجیب و غریب واقعہ سمجھتے اور نبی اکرم ﷺ سے مزید تفصیلات کے طالب ہیں۔ نیز اسی واقعہ میں قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جب آپ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ان کو بتائیں گے تو آپ ان کی تعداد کے بارے میں مختلف چرچے سنیں گے "سیقول ثلثه" "یقولون خمسة" یہ بھی ثبوت ہے اس امر کا کہ قریش مکہ ضرور اس واقعہ سے قدرے آگاہ تھے اور اسی لئے "الرقیم" کہہ کر قرآن نے اس جانب ان کو توجہ دلائی کہ تم آج جس کا بطرا کہہ کر ذکر کرتے ہو وہ دراصل تمہارے ہی بھائیوں کی حکومت کا

مرکزی شہر "رقیم" ہے جو تم سے فراموش ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے رومیوں کی فتوحات رقیم و حجر تک نبطیوں کے ہاتھوں یہودیوں کو ہر قسم کی تکالیف پیش آچکی اور ان کے ساتھ سیاسی و مذہبی حریفانہ نبرد آزمائیاں بھی ہو چکی تھیں۔ اسلئے اگرچہ اس واقعہ میں عیسائیت کی صداقت کا ایک پہلو ضرور نکلتا تھا تاہم نبطیوں کی مشرکانہ زندگی اور رومیوں کے ہاتھوں ان کی تذلیل و تحقیر کا پہلو بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ جو بہر حال ان کی مسرت کا باعث تھا اور اسی لئے غالباً یہود نے اس حیثیت کو نظر انداز کر دیا اور دو سوالوں کے ساتھ اس تیسرے سوال کو بھی خصوصیت کے ساتھ منتخب کیا۔

تفسیری حقائق

۱) اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا اے پیغمبر کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم ہماری نشانیوں میں سے عجیب نشانی تھے؟ یعنی جو لوگ اس واقعہ کو خدا کی نشانیوں میں سے بہت زیادہ نشانی سمجھ رہے ہیں تو ان پر یہ ظاہر کر دو کہ میرے خدا کے نشان یوں تو کائنات انسانی کیلئے بلاشبہ عجیب ہیں لیکن اس کی قدرت کاملہ کے پیش نظر اس کے دوسرے نشانات کے مقابلہ میں یہ کوئی عجیب و غریب نشان نہیں ہے۔ اس لئے کہ زمین و آسمان کی صناعی، سورج، چاند اور ستاروں کی تخلیق اور ان کا حیرت زا نظام کشش، نظام فلکی کی یہ بے نظیر ترتیب، انسان پر وحی الٰہی کا نزول اور بظاہر اسباب حق کی کمزوری اور باطل کی قوت کے باوجود حق کی فتح اور باطل کی شکست ایسے امور ہیں جو اس واقعہ سے کہیں زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں۔ پس جن لوگوں کو یہ واقعہ بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتا ہے وہ اگر قدرت حق کی مسطورہ بالا کار فرمائیوں پر نگاہِ حقیقت آگاہ سے غور کریں تو پھر انکو بھی اقرار کرنا پڑے کہ بلاشبہ قدرتِ حق کے سامنے یہ واقعہ نہ عجیب ہے اور نہ حیرت انگیز البتہ عبرت زا اور بصیرت افزا ضرور ہے۔ لَعَلَّهُمْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۔

۲) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اصحاب کہف پر بھی ایک باب مُعنْوَن کیا ہے مگر مسطورہ بالا واقعہ سے متعلق مشہور حدیث ان کی شرائط کے مطابق ثابت نہیں ہوئی اس لیے انہوں نے سورہ کہف کی آیات زیر بحث کی تفسیر اس روایت کے ذریعہ نہیں کی البتہ انہوں نے بنی اسرائیل کے ایک دوسرے واقعہ کے پیش نظر جو کہ "حدیث الغار" کے عنوان سے مُعنْوَن ہے یہ سمجھا ہے کہ "اصحاب کہف" اور "اصحابِ رقیم" دو الگ الگ شخصیتیں ہیں اور اصحاب رقیم وہ حضرات ہیں جن کا ذکر "حدیث الغار" میں کیا گیا ہے اسی بناء پر انھوں نے حدیث غار کو "اصحاب الرقیم" کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ حدیث غار کا واقعہ یہ ہے:۔

حضرت عبداللہ بن عمر نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے بنی اسرائیل میں سے تین شخص سفر کر رہے تھے اثناء راہ میں بارش آگئی وہ تینوں پہاڑ کی کھوہ (غار) میں پناہ لینے کے لیے داخل ہو گئے اتفاقاً پہاڑ کی اونچائی سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر غار کے منہ پر آگرا اور اس کو ڈھانپ لیا۔ یہ دیکھ کر

۱: سفر عدد باب ۲۰ آیت ۲۱۔ ۴ اور یسعیاہ۔

تینوں نے ایک دوسرے سے کہا: بھائی اب اس ویرانہ میں اس حادثہ سے نجات کی بظاہر اسباب تو کوئی صورت نظر نہیں آتی، البتہ اگر ہم میں سے ہر ایک شخص اپنی زندگی کے کسی ایسے کام کا ذکر کر کے جو اس نے ریاء و نمود سے خالی صرف رضاء الٰہی کی خاطر کیا ہو رب العلمین کی درگاہ میں دعاء مانگے تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نجات دیدے، تب ان میں سے ایک نے کہا خدایا تجھ کو خوب معلوم ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک مزدور سے چند سیر چاولوں پر مزدوری کرائی تھی مگر کام کے بعد مزدور چلا گیا اور اس کی اجرت میرے ذمہ باقی رہ گئی فصل پر جب میں نے چاول کی کاشت کی تو اس کا حصہ بھی شامل کر لیا اور پیداوار پر اس کے حصہ کے چاولوں سے ایک عمدہ بیل خرید لیا۔ اس عرصہ میں مزدور آیا اور اس نے اپنی مزدوری کا مطالبہ کیا میں نے بیل کی رسی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ تیری مزدوری کا حاصل ہے اور اس کو واقعہ سنایا وہ بہت خوش ہوا اور بیل کو لے گیا پس اے خدا اگر تیرے نزدیک میرا یہ عمل صرف تیری خوشنودی اور حقوق العباد کی حفاظت پر مبنی تھا تو اس کی برکت سے ہماری اس مصیبت کو دور کر دے چنانچہ اس کی دعاء کا یہ اثر ہوا کہ بھاری چٹان نے حرکت کی اور غار کے منہ سے کچھ ہٹ گئی اور کشادگی پیدا ہو گئی۔ اب دوسرے نے کہا خدایا تو دانا بینا ہے کہ میرے والدین بہت ضعیف اور ناتواں تھے اس لیے میرا یہ دستور تھا کہ اپنی بکریوں کا دودھ دوھ کر شام کو سب سے پہلے ان کو پلاتا اور بعد میں اپنے اہل و عیال کو شکم سیر کرتا ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھ کو جنگل میں دیر ہو گئی دودھ لے کر گھر آیا تو والدین انتظار کر کے سو چکے تھے۔ اہل و عیال بھوک سے مضطرب اور بیتاب تھے اور دودھ کے خواہش مند مگر میں نے کہا کہ جب تک والدین اٹھ کر نہ پی لیں گے کسی کو دودھ نہیں ملے گا اور والدین کی نیند خراب نہ ہو اس لے بیدار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور تمام شب اسی طرح ان کے سرہانے دودھ لیے بیٹھا رہا کہ شاید درمیان میں بیدار ہوں اور بھوک ستائے مگر وہ صبح کو ہی بیدار ہوئے تب میں نے پہلے ان کو دودھ پلایا اور جب وہ سیراب ہو گئے تو بعد میں اہل و عیال کو دیا" پس اے خدا اگر میرا یہ عمل صرف تیری رضاء اور طاعت والدین کے اداء حق کے لئے تھا تو ہماری اس مصیبت کو ٹال دے پتھر میں دوبارہ جنبش ہوئی اور چٹان اس درجہ ہٹ گئی کہ سامنے آسمان نظر آنے لگا۔ اب تیسرے شخص کی نوبت تھی اس نے کہا! الٰہی تو علیم و خبیر ہے کہ میں اپنی چچازاد بہن پر عاشق تھا اور اس کے وصل کے لیے بیتاب مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی بمشکل تمام میں نے اس کو سودرہم دے کر ورغلایا اور عمل بد پر آمادہ کر لیا جب میں اس کے قریب ہوا اور ہم دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ رہا تو اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "بندۂ خدا! خدا کے خوف سے ڈر اور ناحق عصمت ریزی پر بے باک نہ بن" یہ سننا تھا کہ مجھ پر تیرا خوف غالب آیا اور میں اس سے الگ ہو گیا اور سودرہم بھی اسی کو بخش دیئے الٰہ العالمین اگر میرا یہ عمل خالص تیری رضا اور تیرے خوف کے پیش نظر تھا تو ہماری اس آفت کو دور کر اور ہم کو اس سے نجات دے، اس کے بعد فوراً چٹان حرکت میں آئی اور غار کے دہانہ پر سے لڑھک کر نیچے جا رہی اور وہ تینوں اسرائیلی اس مصیبت سے نجات پا کر مسرت و شادمانی کے ساتھ اپنی منزل پر روانہ ہو گئے۔

اس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ بزار اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ نعمان بن بشیر سے یہی روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نعمان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا آپ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا رہے تھے غالباً اسی بناء پر امام

بخاریؒ نے رقیم کی تفسیر میں یہ "حدیث غار" روایت کی ہے۔ (فتح الباری ج۶ حدیث الغار)

لیکن اس تحقیق کے بعد گذشتہ سطور میں زیر بحث آچکی جب کہ قرآن، بعض آثار صحابہ اور تاریخ سے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جس کے کسی پہاڑ کے غار میں اصحاب کہف جا چھپے تھے تو اب مسند بزار اور معجم طبرانی کی روایت کے مبہم الفاظ سے اصحاب رقیم کو اصحاب کہف سے جدا سمجھنا صحیح نہیں ہے خصوصاً جب کہ روایت نعمان میں یہ احتمال موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ اصحاب رقیم کا ذکر فرمار ہے ہوں اور اس کے ساتھ اس واقعہ کا بھی ذکر فرمایا ہو اور بعد کو راوی نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے حدیث غار کا واقعہ دراصل اصحاب رقیم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے نیز جب کہ عربی زبان میں "رقیم" کے معنی "غار" کے کبھی نہیں آتے حقیقتہً نہ مجازاً تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ذات قدس ﷺ نے "رقیم" بمعنی "غار" کہہ کر حدیث غار کو اس کی تفسیر بتایا ہو یہ راوی کا وہم ہے اور غالباً اسی لیے بزار اور طبرانی کے علاوہ کسی نے بھی اس اضافہ کو بیان نہیں کیا حالانکہ کتب حدیث میں یہ واقعہ بہ کثرت منقول ہے اور خود صحیح بخاری بھی اس اضافہ سے خالی ہے نیز اگر صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے "الرقیم" کی تفسیر صاف اور واضح الفاظ میں خود ارشاد فرمادی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جلیل القدر مفسرین اپنی تحقیق کے مطابق الرقیم کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل فرماتے؟ اور خود حافظ ابن حجر عسقلانی بھی یہ جرأت نہ کرتے کہ اس روایت کے خلاف یہ فرمائیں کہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم دونوں ایک ہی ہیں، چنانچہ یہ فرماتے ہیں۔

وقال قوم اخبر الله عن قصة اصحٰب الكهف ولم يخبر عن قصة اصحٰب الرقيم (قلت) وليس كذٰلك بل السياق يقتضى ان اصحٰب الكهف هم اصحاب الرقيم۔
(فتح الباری، ج۶ ص ۲۹۳)

اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا واقعہ تو ہم کو سنایا ہے مگر اصحاب رقیم کا واقعہ نہیں بیان کیا (میں کہتا ہوں) یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کا سیاق یہ چاہتا ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم ایک ہی ہیں۔

۳) فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا مولانا آزاد نے فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِ کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں "صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے یعنی دنیا کی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی"[1] آیت کی تفسیر میں یہ قول ضعیف اور شاذ ہے۔[2] اسکے برعکس مفسرین کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ ان پر نیند طاری ہو گئی تھی چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا اس لیے اس حالت کو "ضرب علی الاذان" سے تعبیر کیا گیا۔ مگر اس تفسیر کے متعلق مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں: "اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کیلئے "ضرب علی الاذان" کی تعبیر نہیں ملتی لیکن وہ (مفسرین) کہتے ہیں، یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو "ضرب علی الاذان" کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ (ترجمان القرآن ج۲)

ہمارے نزدیک مفسرین کی تفسیر ہی راجح ہے اور یہ استعارہ ہر زبان کے محاورات میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً جب

۱: ترجمان القرآن ج۲۔ ۲: فتح الباری ج۶۔

ماں خود کے بچے کو لوریاں دے کر سلاتی ہے تو اس کے کان اور بازو پر ہاتھ رکھ کر تھپکتی جاتی ہے۔ اسلئے اردو زبان میں بھی "کانوں کو تھپک دینا" نیند طاری کر دینے کیلئے بولا جاتا ہے، چنانچہ شیخ الہند (نور اللہ مرقدہٗ) نے اس جملہ کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے۔ (ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن نور اللہ مرقدہٗ)

"پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان اس کھوہ (غار) میں چند برس گنتی کے"۔ (الکہف)

علاوہ ازیں عربی زبان میں "ضرب علیٰ ذانة" کے معنی "منعه ان یسمع" کے آتے ہیں یعنی اس کو سننے سے روک دیا"۔ اب سننے سے روک دینے کی متعدد صورتیں ہیں: ایک یہ کہ کوئی شخص بستی سے دور جنگل میں غاری کھوہ میں جا بیٹھا اور اسلئے دنیا کی باتوں سے اس کے کان نا آشنا ہو گئے۔ دوسری یہ کہ وہ بہرا ہو گیا اور سننے سے معذور کر دیا گیا۔ تیسری یہ کہ وہ سو گیا اور اس کے دیگر حواسِ ظاہرہ کی طرح کان بھی سننے سے معطل ہو گئے۔ لہٰذا "ضرب علی الاذان" کی تعبیر ان سب صورتوں کے لیے یکساں قابل استعمال ہے اور استعارہ و تشبیہ ہے تو تینوں معنی کیلئے ہے البتہ مولانا آزاد کی تفسیر میں یہ اشکال ضرور لازم آتی ہے کہ اگر ضرب علی الاذان کے مطابق بستی سے دور پہاڑ کے غار میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ

اور ہم نے ان کو اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال کریں، ایک نے ان میں سے کہا تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ"۔

کیا یہ آیت اپنے صاف معنی میں یہ ظاہر نہیں کرتی کہ ضرب علی الاذان کی صاف تعبیر یہاں وہی ہے جو جمہور مفسرین کی نزدیک صحیح اور راجح ہے بلکہ ایسے موقع پر "بعثنھم" کی تعبیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ مفسرین کی تفسیر کے علاوہ دوسرے معنی لینا قطعاً بے محل ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے اصحاب کہف کی اس گفتگو کے بعد جو وہاں سوئے رہنے کی مدت سے متعلق ہے ان کی یہ گفتگو بھی نقل کی ہے کہ ان میں سے کوئی شہر جائے اور پوشیدہ طور پر جائے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے یہ بھی جمہور کی تفسیر کو قوت پہنچاتی ہے اس لیے کہ غار میں مدت قیام پر بات چیت اور پھر فوراً کھانے کی خواہش کا اظہار دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑیے تو صاف معنی وہی بنتے ہیں جو مفسرین نے بیان کیے ہیں اور مولانا آزاد کی یہ تفسیر کو عرصۂ دراز کے بعد ان کو شہر کی حالت معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی تکلف بارد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کو شروع سے آخر تک اس واقعہ کی تمام آیات میں تکلف بارد اختیار کرنا پڑا ہے مثلاً جب قرآن نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ کہا وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ تو ان کو گمان کرے گا کہ وہ بیدار ہیں حالانکہ وہ خواب میں ہیں" تو مولانا موصوف کو اپنی تفسیر کو صحیح بنانے کے لیے یقظہ کے معنی زندہ اور رقد کے معنی مردہ کے اختیار کرنے پڑے ہیں حالانکہ ان کے حقیقی معنی بیداری اور نیند کے ہیں اور یہ معنی بلا تکلف یہاں صادق آتے ہیں پس مولانا پر بھی وہی بات صادق آتی ہے جو انھوں نے مفسرین کی مسلمہ تفسیر پر

لازم کی ہے یعنی ففی الکلام تجوز بطریق الا ستعارة (کلام میں استعارہ کی راہ سے مجاز اختیار کیا گیا ہے)

بلکہ اگر غائر نظر سے دیکھیے تو "حقیقت کے صادق ہوتے ہوئے مجاز اختیار کرنا" مولانا آزاد کی تفسیر پر تو صادق آتا ہے لیکن جمہور مفسرین کی تفسیر پر صادق نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آیات زیر بحث کی تفسیر میں اگرچہ مفسرین کے مختار قول کے خلاف ضعیف قول کو اپنا مختار بنایا ہے تاہم مفسرین کے اقوال کو احتمال کے درجہ میں تسلیم کرتے ہوئے ان کی تائید میں جو جملے ارشاد فرمائے ہیں وہ بلا شبہ ایسے حضرات کے لیے خصوصاً قابل مطالعہ ہیں جو اس قسم کے واقعات کو محض تعجب خیز سمجھ کر خلاف عقل کہہ دینے کے عادی ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"بہر حال اگر یہاں ضرب علی الاذان سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور بعثنٰھم کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے طبی تجارب کے مسلمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربہ میں آتی رہتی ہیں پس اگر اصحاب کہف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انھیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں"۔ (ترجمان القرآن ج ۲)

ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا لَبِثُوٓا أَمَدًا ○

پھر ہم نے ان کو (خواب سے اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ دو جماعتوں میں سے کس نے اس مدت کو محفوظ رکھا جس میں وہ (غار کے اندر) رہے۔

یہاں دو جماعتوں میں سے ایک اصحاب کہف کی اور دوسری اہل شہر کی جماعت مراد ہے مطلب یہ ہے کہ یہ اس لیے کیا کہ صحیح مدت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ خدائے تعالیٰ نے ان کو برسوں تک بحالت خواب زندہ رکھا جب کہ وہ زندگی کی بقاء کے وسائل سے یکسر محروم تھے"

لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ بلا شبہ اسی طرح وہ مخلوق کو مرنے کے بعد بھی زندہ کرے گا اور بے شک قیامت اور بعث بعد الموت کا مسئلہ حق ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب ان کو بیدار کیا اور ان میں سے ایک نوجوان شہر میں کھانا خرید کرنے گیا تو اس زمانہ میں بستی والوں کے درمیان بعث بعد الموت پر جھگڑا اور مناقشہ جاری تھا ایک جماعت کہتی تھی کہ فقط روح کا بعث ہو گا اور دوسری جماعت قائل تھی کہ روح اور جسم دونوں کو زندہ ہونا ہے یہ تو نصاریٰ کی جماعتیں تھیں اور جو نبطی مشرک آباد تھے وہ سرے سے بعث بعد الموت ہی کے منکر تھے ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو غار سے بیدار کر کے بھیجا اور اس طرح جب اصحاب کہف کا واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا تو اس نے علی رؤس الاشہاد یہ نظیر قائم کر دی کہ جس طرح برسوں تک اسباب حیات سے محروم رہنے کے باوجود روح کے ساتھ جسم بھی صحیح و سالم باقی رہا اسی طرح بعث بعد الموت روح اور جسم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح سوتے رہنے کے بعد اصحاب کہف بیدار کر دیے گئے اسی طرح قبر (عالم برزخ) میں سینکڑوں اور

ہزاروں برس مردہ رہنے کے بعد قیامت میں زندہ کردیے جائیں گے۔ وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ اور پھر (دیکھو) اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم لوگوں کو ان کے حال سے واقف کردیا (ان کی بات پوشیدہ نہ رہ سکی) اور اس لئے واقف کردیا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ عن عکرمہ)

آیت کی یہ تفسیر عکرمہ کی روایت سے ماخوذ ہے اور اسی کو عام طور پر اختیار کیا گیا ہے لیکن مولانا آزاد لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ سے جدا کرتے ہوئے آیت کے معنی یہ کیے ہیں: "اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے ان لوگوں کے معاملہ میں کیا کیا جائے لوگوں کہا اس غار پر ایک عمارت بنادو حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ (مرقدہ) نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے)

"در آں وقتیکہ نزاع کردند مرد ماں در میان خود در مقدمہ ایشاں پس گفتند عمارت کنید بر غار ایشاں"

یعنی یہ حضرات یتنازعون میں قیامت کے متعلق شہریوں کے باہم اختلاف کو مراد نہیں لیتے بلکہ اس گفتگو کو مراد لیتے ہیں جو اصحاب کہف کے مرقد پر ہیکل تعمیر کرنے کے بارے میں ہوئی۔

۵) فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ ہم نے واقعہ کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اور قرآن کی اندرونی اور تاریخ و روایات کی بیرونی شہادتوں سے جن امور کو ثابت کیا ہے ان سے جدا عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ یہود بنی اسرائیل کے قدیم زمانہ کا ہے جو شہر افسس میں ایک مشرک بادشاہ دقیانوس کے زمانہ حکومت میں پیش آیا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انھوں نے عیسائیت نہیں بلکہ یہودیت کو قبول کرلیا تھا اور بادشاہ وقت کے ظلم وجور سے بچ کر غار میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ لیکن ہم اس پر گذشتہ سطور میں نمبر حاصل بحث کرچکے اور ثابت کرچکے ہیں کہ اس واقعہ کا تعلق عیسائی دور سے ہے۔

۶) سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ اللہ تعالی اس واقعہ سے متعلق ان حقائق کے اظہار کے بعد جو اس کے مقصد "تذکیر" کے لیے مفید تھے۔ واقعہ کی ان جزئیات کے متعلق جو محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے جان لینے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ پیغمبر ﷺ کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ان لاحاصل بحثوں سے پرہیز کریں اور ان پر سرسری طور سے گذر جائیں اور بیکار باتوں کے کھوج لگانے کی فکر نہ کریں۔ مثلاً یہ کہ ان نوجوانوں کی تعداد کیا تھی؟ ان کی عمروں کا تناسب کیا تھا وہ غار میں کتنی مدت مقیم رہے؟ مدت کی صحیح مقدار کیا ہے؟ وغیرہ

قُلْ رَّبِّيٓ أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا ○

(اے پیغمبر) کہہ دے ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیوں کہ ان کا حال بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے"۔

اور جب صورت حال یہ ہے) تو لوگوں سے اس بارہ میں بحث و نزاع نہ کر مگر صرف اس حد تک کہ صاف

صاف بات میں ہو اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس بارہ میں کچھ دریافت کر؟ اس لیے کہ جو بات بھی ہو گی اٹکل سے ہو گی۔

تاہم حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے یہ فرماتے ہوئے کہ ان قلیل میں سے جن کو ان کی تعداد کا علم ہے ایک میں بھی ہوں ارشاد فرمایا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا اور یہ اسلیے کہ اللہ تعالیٰ نے تعداد کے متعلق پہلے دو مقولوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ یہ باتیں اٹکل کے تیر ہیں مگر تیسرا قول ذکر کرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کہی اس لیے یہ ہی صحیح تعداد ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳)

۷) وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا اس آیت کا ترجمہ عام طور پر مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے اطلاع دے رہا ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے مگر حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے بعض روایات میں جو معنی مذکور ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں ہے یعنی وہ آیت بشوا الآیۃ کو اس سے قبل کے جملہ یقولون کے تحت میں داخل سمجھتے اور یہ معنی کرتے ہیں کہ جس طرح لوگ (عیسائی) اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق مختلف باتیں کہتے ہیں اور کہیں گے اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اصحاب کہف تین سو نو سال تک غار میں رہے چنانچہ قاضی شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر میں نقل فرماتے ہیں:

اخرج ابن ابی حاتم و ابن مردویه عن ابن عباس قال ان الرجل لیفسر الایة ویری انها کذلك فیهوی ابعد ما بین السماء والارض ثم تلا :

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثم قال کم لبث القوم قالوا ثلث مائة وتسع قال ولو كانوا لبثوا كذلك لم یقل الله قل الله اعلم بما لبثوا ولکنه حکی مقالة القوم فقال سیقولون ثلثة الی قوله رجما بالغیب فاخبر انهم لا یعلمون ثم قال سیقولون :

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں انھوں نے فرمایا آدمی آیت کی تفسیر کرتا ہے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے بالکل صحیح تفسیر کی ہے حالانکہ وہ اس میں فاش غلطی کرتا ہے گویا وہ اس آسمان و زمین سے بھی دور جاگرا۔ حضرت ابن عباسؓ نے یہ فرما کر بعد میں اس آیت کو تلاوت کیا وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ اور فرمانے لگے لوگوں نے یہ سوال پیدا کیا کہ اصحاب کہف کتنے عرصہ غار میں رہے اور خود ہی یہ کہنے لگے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے پھر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اصحاب کہف واقعی اتنے عرصہ ہی غار میں رہے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ آپ کہہ دیجیے اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنے عرصہ مقیم رہے دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قول کو حکایت کیا ہے اور ان کی گفتگو کو یہاں سے شروع کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ صحیح تعداد سے واقف نہیں ہیں اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا دوسرا یہ مقولہ بیان کیا کہ وہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے۔ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ۔ (فتح القدیر سورۂ کہف)

اور ابن کثیر نے تفسیر میں بروایت قتادہ عبد اللہ بن مسعود سے یہ نقل کیا ہے۔

قال قتادة وفی قرائة عبداللّٰه وقالوا ولبثوا یعنی انه قاله الناس وهكذا قال قتادة ومطرف۔[1]

قتادہ کہتے ہیں عبد اللہ بن مسعود کی قراءت میں یہ ہے و قالوا ولبثوا یعنی یہ مقولہ لوگوں کا ہے۔ قتادہ اور مطرف کی رائے بھی یہی ہے۔

ہمارے نزدیک بھی یہی معنی راجح ہیں کیونکہ قرآن کا سیاق اسی کو ظاہر کرتا ہے اس لیے کہ ان ہی آیات میں قرآن نے نبی اکرم ﷺ کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اس قسم کی غیر مفید اور اٹکل کی باتوں کے پیچھے نہ پڑیں پس جب کہ وَلَبِثُوا فِیْ كَهْفِهِمْ کے بعد یہ کہا گیا اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تو اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ غار میں قیام کی مدت کا مسئلہ بھی اندھیرے کا تیر ہے اور اس لیے صحیح طریق کار اس بارے میں بھی یہی ہے کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کردیا جائے لہٰذا اس صورت میں یہ مقولہ اللہ تعالیٰ کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو زمانۂ نبوت میں اس واقعہ کی تفصیلات کے سلسلہ میں بے فائدہ اٹکل کے تیر چلاتے رہتے تھے۔

بایں ہمہ ابن کثیر عام مفسرین کے معنی کو ہی راجح کہتے ہیں اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت کو منقطع اور ان کی قرأۃ کو شاذ ثابت کرکے اس کو ناقابل حجت قرار دیتے ہیں مگر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی صحیح روایت کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ ابن کثیر یہ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اول تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر وَازْدَادُوْا تِسْعًا کہہ کر نو سال کا اضافہ اس لیے کیا تاکہ شمسی حساب قمری حساب کے ساتھ مطابق ہوجائے مگر اول نظر میں بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ آیت کی یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل ہے اس لیے کہ ایک طرف تو قرآن تذکیر و موعظت کے مقصد سے زائد تفصیلات کو دور از کار کہتا ہے اور دوسری جانب خود ہی ایسی باتوں کے درپے ہوتا ہے جس کا موعظت و بصیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں بلکہ خالص علم ہیئت کا مسئلہ ہے۔[1] ابن کثیر کے نزدیک یہ مقولہ اس لیے بھی لوگوں کا نہیں ہوسکتا کہ نصاریٰ کے یہاں قیام کہف کی مدت تین سو سال مشہور ہے اور نو کا ان کے یہاں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا مگر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے اس لیے کہ دوسرے مفسرین نے ان کے دونوں قول نقل کیے ہیں۔ شاید ابن کثیر کی نظر سے دوسرا مقولہ نہیں گزرا۔

۸) وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ (الی) وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ان آیات میں قرآن عزیز نے اصحاب کہف کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جب کہ وہ شروع میں غار کے اندر جا کر پوشیدہ ہوئے تھے اور یہ اس لیے کہ ان آیات کے متصل ہی جو آیات اس واقعہ پر روشنی ڈال رہی ہیں ان میں یہ باتیں مذکور ہیں وہ نیند سے بیدار ہوئے اور انھوں نے ایک رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اس کی وجہ سے شہر والوں پر حقیقت حال ظاہر ہوگئی بیان کی وہ دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہوگئے اور اہل شہر نے اس غار کے دہانہ پر ہیکل تعمیر کردیا ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد ان آیات میں اس کیفیت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اصحاب کہف پر نیند طاری ہونے کی حالت میں گذری یعنی اس غار کی اندر سے کیا حالت تھی دھوپ اور تازہ ہوا پہنچنے نہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی ایک طویل مدت تک خواب کی حالت میں ... کی کیا شکل تھی، کیا ایک ہی کروٹ پر سویا یا زندہ انسانوں کی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے، ا... رح

[1] نیز از روئے حساب بھی نو کا اضافہ تطابق حساب کیلئے کافی نہیں ہے۔

وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس مجموعی کیفیت کا اثر باہر سے جھانک کر دیکھنے والے انسان پر کیسا پڑتا تھا۔

جمہور مفسرین نے یہی تفسیر کی ہے اور آیات کے باہم نظم و ترتیب کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور واضح تفسیر ہے مگر مولانا آزاد ان تمام آیات کو اصحاب کہف کے دوبارہ غار میں عزلت گزین ہو جانے سے متعلق سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن یہ تفصیلات اس حالت کی بیان کر رہا ہے جب ان پر موت طاری ہو چکی تھی اور انھوں نے "ایقاظ" میں "یقظہ" کے معنی زندگی اور "رقود" میں "رقد" کے معنی ت کے اختیار کر کے کافی تکلف کیا ہے اور بعض مقدمات کے اضافہ کے ساتھ اپنی تفسیر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ چونکہ مفسرین نے ان آیات کو اصحاب کہف کے پہلی مرتبہ غار میں پوشیدہ ہو جانے سے متعلق کہا ہے اسلئے ان کو آیات کی تفسیر میں حیرانی پیش آئی ہے مگر اس پوری تفصیل کے مطالعہ سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیات زیر بحث کی تفسیر میں مفسرین قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی البتہ خود مولانا ئے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں ضرور تکلفات باردہ اختیار کرنے پڑے ہیں اور سچ پوچھیے تو اس مقام پر ان کی تفسیر تاویل ہو کر رہ گئی ہے۔

۹) ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

یعنی پہاڑ کے اندر غار کی یہ مجموعی کیفیت کہ غار کا دہانہ اگرچہ تنگ ہے مگر اس کے اندر بہت کافی وسعت ہے اس کا جاء وقوع شمالاً و جنوباً ہے کہ جس کی وجہ سے طلوع و غروب حالتوں میں آفتاب غار کے سامنے سے داہنے اور بائیں کترا کر نکل جاتا ہے اور غار اس کی تپش سے محفوظ رہتا ہے اور دوسری جانب منفذ ہونے کی وجہ سے ہوا اور روشنی بقدر ضرورت پہنچتی رہتی ہے گویا جسمانی بقاء کیلئے جو چیز مضر ہے یعنی تپش اس سے حفاظت اور جو بقاء حیات کے لیے ضروری شے ہے یعنی روشنی اور ہوا اس کی موجودگی یہ ایسے امور ہیں جو خدائے تعالیٰ کی کھلی نشانیاں کہی جا سکتی ہیں کہ ان کی بدولت برسوں تک خدا کے نیک بندے دنیا کے علائق سے جدا ہو کر غار میں بحالت خواب بسر کر سکے اور ایسی حالت میں بسر جب کہ سامان خورد نوش اور بقاء حیات کے دیگر وسائل دنیوی سے قطعاً محروم تھے۔

۱۰) عام طور پر مشہور ہے کہ اصحاب کہف ابھی تک غار میں سو رہے ہیں اور زندہ ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حضرت ابن عباسؓ نے بصراحت یہ فرمایا ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا۔

قال قتادة غزا ابن عباس مع حبيب بن مسلمة فمروا بكهف في بلاد الروم فراؤا فيه عظاما فقال قائل هذه عظام اهل الكهف فقال ابن عباس لقد بليت عظامهم من اكثر من ثلث مائة سنة۔[1]

قتادہ کہتے ہیں: ابن عباسؓ ایک مرتبہ حبیب بن مسلمہ کے ساتھ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے راہ میں بلا دروم میں اس مقام پر گذر ہوا جہاں پہاڑی غاروں کا سلسلہ ہے وہاں انھوں نے کسی غار کے اندر انسانوں کی ہڈیاں یا ڈھانچے دیکھے تو کسی کہنے والے نے کہا یہ اہل کہف کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں اس پر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ بوسیدہ ہو چکیں۔

۱۱) قرآن عزیز اور صحیح روایات سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ اصحاب کہف کے نام کیا تھے بلکہ قرآن عزیز

۱: یہ روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے۔

نے تو مشرکین مکہ یا نبطی اور رومی عیسائیوں کے یہاں اس سلسلہ میں جو اٹکل کی باتیں مشہور تھیں ان پر اعتماد رکھنے اور ان کی تحقیقات میں پڑنے سے روکا ہے البتہ اسرائیلی روایات میں ان کے نام یہ بتائے گئے ہیں کمسلمینا، تملیخا، مرطونس، کسطونس، بیرونس، دنیموس، نطونس اور ان کے کتے کا نام قطمیر یا حمران ہے۔[1]

۱۲) وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ کتے نے وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا اور صلحاء کی صحبت پائی تو قرآن نے بھی اس کا ذکر خیر کر کے اس کو وہ عزت بخشی کہ انسانوں کے لیے قابل رشک بنا دیا شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے کیا خوب کہا ہے۔

سگ اصحاب کہف روزے چند پے نیکاں گرفت مردم شد

پسر نوح بابداں بہ نشست خاندان نبوتش گم شد

۱۳) وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ

"اور کسی چیز کے لیے یہ نہ کہو کہ کل میں اس کو ضرور کروں گا مگر (یہ کہہ لیا کرو) یہ کہ خدا چاہے تو۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب مستقبل میں کسی کام کا ارادہ ہو تو دعویٰ کے ساتھ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں اس کو ضرور کروں گا اس لیے کہ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہو گا اور کہنے والا اس کائنات میں موجود بھی ہو گا یا نہیں لہٰذا اس معاملہ کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے انشاءاللہ ضرور کہنا چاہیے۔

۱۴) وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا

تم کہو امید ہے میرا پروردگار اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا۔

اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ تم کو بھی پیش آنے والا ہے بلکہ وہ اس سے بھی عجیب و غریب ہو گا یعنی اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑے گا۔ راہ میں غار ثور کے اندر کئی دن تک پوشیدہ رہو گے۔ دشمن غار ثور کے منہ پر پہنچ جانے کے باوجود تم کو نہ پا سکیں گے تم بخیر و خوبی مدینہ پہنچ جاؤ گے اور وہاں تم پر فتح و کامرانی کی ایسی راہیں کھول دی جائیں گی جو اس معاملہ سے کہیں زیادہ عظیم و جلیل ہوں گی یہ سورت مکی عہد کی آخری سورتوں میں سے ہے اس لیے اس کے نزول کے بہت تھوڑے زمانہ بعد ہجرت کا وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا جس نے مسلمانوں کے دور حیات زا انقلاب پیدا کر دیا اور باطل نے حق کے سامنے سپر ڈال دی۔

۱۵) لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِدًا ۝

ہم ضرور ان کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔

معلوم نہیں کہ اس کہنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ واقعی ان کے مرقد پر ہیکل کو سجدہ گاہ عام و خاص بنائیں گے کیونکہ یہ خدا کے مقبول بندے تھے تب تو ان عیسائیوں کا یہ عمل اسلام کی نگاہ میں قابل مذمت و نفرت ہے اس لیئے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا

۱: یہ روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے۔

لعن اللّٰہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا قبور انبیائھم مساجداً۔ (رواۃ الصحیحین)

اللہ تعالیٰ یہود نصاریٰ پر لعنت بھیجے کہ انھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد (سجدہ گاہ) بنالیا تھا یعنی قبروں کو سجدہ کرتے تھے۔

اور پھر ارشاد فرمایا

لا تتخذوا قبری عیدا

لوگو! تم میری قبر کو عید کی طرح تہوار نہ بنالینا۔

اور اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کی یادگار میں غار کے منہ پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے کہ جس میں صرف خدائے عزوجل ہی کی عبادت ہوا کرے گی تو ان کا یہ فیصلہ بے شبہ محمود اور قابل ستائش تھا۔

نتائج وعبر

۱) اگر ہم کو کوئی بات اپنی عقل کے مطابق عجیب وغریب معلوم ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی واقعی کوئی عجیب بات ہے اور اگر وہ عجیب ہے بھی تو ہمارے لیے ہے نہ کہ خالق کائنات کے لیے جس نے کہ کائنات ہست وبود کو پیدا کیا اور پھر ایسے محکم نظام پر اس کو قائم کیا کہ عقل حیران ہے مگر آنکھ روزانہ اس کا مشاہدہ کرتی اور قلب ہر لمحہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ○

خدائے تعالیٰ پر یہ بات کچھ بھاری نہیں ہے۔

۲) جب شر وفساد اور ظلم وسرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ خدا کے نیک بندوں کے لیے کہیں پناہ نہ رہے تو اگرچہ عزیمت کا مرتبہ یہی ہے کہ کائنات کی رشد وہدایت کی خاطر ہمہ قسم کی تکالیف برداشت کرے اور کلمۂ حق پر کوہ استقامت بنا رہے اور مخلوق خدا سے منقطع ہو کر عزلت وکنج نشینی اختیار نہ کرے لیکن اگر حالات اس درجہ نزاکت اختیار کرلیں کہ مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کی شکل میں یا جان دینی پڑے اور یا دین باطل قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑے اور حالت یہ ہو جائے۔

إِنَّهُمْ إِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ أَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا إِذًا أَبَدًا ○

تو اس وقت رخصت ہے کہ جان کی حفاظت اور دین کی صیانت کے لیے دنیا کے علائق سے کٹ کر عزلت نشینی اختیار کرے۔

"گویا یہ اضطراری حالت کا ایک ہنگامی اور وقتی علاج ہے جو صرف تحفظ دین وایمان کیلئے کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام کی نگاہ میں بذاتہ کوئی محبوب عمل نہیں ہے اور اختیاری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کرنا رہبانیت ہے "ولا رھبانیۃ فی الاسلام" اور اسلام رہبانیت کو ناپسند کرتا ہے۔ عیسائیوں کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ

سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی عہد میں بعض سچے عیسائیوں کو اصحاب کہف کی طرح کے چند واقعات پیش آئے جن میں سے ایک روم میں ایک انطاکیہ میں اور ایک شہر افسس میں پیش آنا بتایا جاتا ہے چنانچہ انھوں نے حالات سے مجبور ہو کر اضطراری طور پر اس جوگیانہ زندگی کو اختیار کیا تھا مگر بعد میں دوسری بدعات کی طرح یہ عمل بھی عیسائیت کا اہم جزء اور محبوب عمل شمار ہونے لگا اور جس طرح ہندوستان کے قدیم دھرم کے مطابق علائق دنیا سے کٹ کر ہندو جوگی پہاڑوں کی کھوہ اور ویرانوں میں یوگ کرنا مقدس عمل سمجھتے ہیں اسی طرح عیسائیوں نے بھی اختیاری رہبانیت کو مذہب کے مقدس اعمال میں شامل کر لیا۔

لیکن قرآن حکیم نے ان کے اس عمل کے متعلق صفائی کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بذاتہ یہ عمل کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ اہل کتاب کی مذہبی بدعات میں سے ایک بدعت ہے

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا

"اور راہبانہ زندگی کو کہ جس کو ان (عیسائیوں) نے دین میں ایجاد کر لیا ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا، مگر انھوں نے اختیار کیا تھا اللہ کی رضاجوئی کے لیے پر اس کے حق کی رعایت نہ رکھ سکے"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ طریق دین کے طریقوں میں سے نہیں مقرر کیا تھا بلکہ انھوں نے خود ہی اختیار کر لیا تھا اور اگرچہ ابتداء میں انھوں نے یہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اختیار کیا تھا مگر بعد میں اس کو نباہ نہ سکے اور رہبانیت کے پردہ میں دنیاداروں سے زیادہ دنیا طلبی اور ہوسناکیوں میں مبتلا ہو گئے۔

حق یہ ہے کہ صاف اور سیدھی راہ اعتدال کی راہ ہے نہ اس میں پیچ وخم ہے اور نہ نشیب و فراز، یہ راہ افراط اور تفریط دونوں سے جدا کر کے منزل مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور چونکہ اسلام دین فطرۃ ہے اس لیے اس نے ہر معاملہ میں اعتدال ہی کو پسندیدہ عمل قرار دیا ہے اس کی نگاہ میں جس قدر دنیا میں انہماک برا ہے اسی قدر مخلوق خدا سے کٹ کر جوگیانہ رہبانیت بھی مذموم ہے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس امت کے لیے رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے کیونکہ میدان جہاد کے لیے انسان جب ہی قدم اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے نفس اپنے اہل و عیال اور ہر قسم کے دنیوی علائق سے بے نیاز ہو کر صرف خدائے تعالیٰ کی مرضی کو پورا کرنا اپنا مقصد اور نصب العین بنا لے۔

۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آیۃ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کے شان نزول کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے کہ جب مشرکین مکہ نے نبی اکرم ﷺ سے اصحاب کہف کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں کل وحی سے معلوم کر کے اس کا جواب دوں گا مگر آپ کو انشاء اللہ کہنا یاد نہ رہا اس وجہ سے تقریباً پندرہ روز وحی کا نزول نہیں ہوا تب مشرکین نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں اور آپ ﷺ اس وجہ سے دل فگار ہونے لگے۔ پندرہ روز کے بعد وحی کا نزول ہوا اور اس نے واقعہ کی ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ انسان جبکہ فردا سے ناواقف ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جب کل کے لیے کسی بات کا وعدہ کرے تو خدا کی مشیت کا حوالہ ضرور دیدیا کرے تاکہ یہ

بات کبھی فراموش نہ ہونے پائے کہ بندہ نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں اور اگر زندہ بھی رہا تو وعدہ کے ایفاء پر قادر ہو سکوں گا یا نہیں۔

۴) دین اور ملت خدائے تعالیٰ کی صاف اور سیدھی راہ کا نام ہے اس لیے وہ جبر واکراہ سے قلب میں نہیں اترتی بلکہ اپنی صادق روشنی سے اندھے دلوں کو روشن اور منور کرتی ہے لا اکراہ فی الدین دین کے بارہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے مگر اس کے برعکس باطل کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ خدا کی مخلوق پر زبردستی ظلم اور جبر سے اپنا اثر جمائے اور دلیل کی جگہ جبر سے کام لے لیکن خدا کی مشیت انجام کار صداقت (دین حق) کو غالب اور باطل کو مغلوب کر دیتی ہے اور انجام و نتیجہ حق ہی کے ہاتھ رہتا ہے مگر چونکہ خدا کی گرفت کا قانون اول کافی مہلت دیتا ہے اس لیے ظالم اقوام جہالت سے اس کو اپنی کامیابی سمجھ کر خدا کی بطش شدید سے غافل ہو جاتی ہیں اور اس لیے تاریخ بار بار اپنے سبق کو دہراتی رہتی ہے۔

۵) تجربہ اس کا شاہد ہے کہ حق و صداقت کی تحریک اور نہ صرف یہ بلکہ ہر انقلابی تحریک جس درجہ قوم کے نوجوانوں پر اثر انداز ہوتی ہے عمر رسیدہ افراد قوم پر اس سرعت کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتی۔ علم النفس کے ماہرین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ معمر افراد کا دل و دماغ چونکہ عمر کے بڑے حصہ میں پرانی ریت و رسم کا عادی ہو جاتا اور گذشتہ نظام سوسائٹی سے عرصہ تک مانوس رہ چکا ہوتا ہے اور اس کے رگ و ریشہ میں قدیم اثرات راسخ ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے ہر وہ تحریک جو قدیم نظام یا فرسودہ رسوم کے خلاف ظاہر ہوتی ہے ان کا دل و دماغ اس کے جدید اثرات سے اذیت و تکلیف محسوس کرتا ہے اور جدید و قدیم محرکات کا تصادم ان کے لیے بار بن جاتا ہے اس لیے وہ جدید انقلاب سے مانوس ہونے کی بجائے اور زیادہ متوحش ہو جاتے ہیں البتہ ان میں سے جو دل و دماغ جذبات کے مقابلہ میں عقل کو اور تاثرات کے مقابلہ میں دلائل کو راہ نما بنا لیتے اور ہر معاملہ میں جدت و قدامت سے قطع نظر متانت و سنجیدگی کے ساتھ اس کی افادیت و مضرت پر غور کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ اس عام اصول سے مستثنیٰ ہیں اور جب وہ انقلابی تحریک کے فوائد کو دلائل کی قوت سے محسوس کر لیتے ہیں تو اس تحریک کے لیے زبردست پشت پناہ ثابت ہوتے ہیں مگر جماعتوں اور قوموں میں عموماً ان کی تعداد کم ہوتی ہے۔

لیکن عمر رسیدہ افراد کے برعکس چونکہ نوجوانوں کے دل و دماغ بڑی حد تک غیر جانبدار ہوتے اور پرانے رسم و رواج کے لیے ابھی تک راسخ نہیں ہوتے اس لیے ان پر جدید نقوش بہت جلد منقش ہو جاتے ہیں اور وہ کسی تبدیلی اور کسی انقلاب کو محض اس لیے کہ وہ جدید محرکات کے داعی ہیں توحش کی نظروں سے نہیں دیکھتے بلکہ دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے اور صاف دل و دماغ سے اس پر غور کرتے ہیں۔

اب یہ انقلابی تحریک کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس میں صداقت اور حقانیت کار فرما ہے اور جماعتوں اور قوموں کی غلط روی سے نکال کر صراط مستقیم کی جانب داعی ہے تو اس کی جانب سرعت کے ساتھ جوق جوق بڑھنے والوں اور پیروی کرنے والوں کی زندگی میں چار چاند لگ جاتے اور ان کا وجود کائناتِ ہست و بود کے لیے رحمت ثابت ہوتا ہے اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہے تو وہ ان تر و تازہ اور صاف دل و دماغ رکھنے والے نوجوانوں کو تباہی اور بربادی کی راہ پر لگا دیتی ہے اور ان کا وجود دنیاء انسانی کے لیے مصیبت اور عذاب بن جاتا ہے۔

پس قرآن عزیز نے اس واقعہ کے اظہار میں عبرت و موعظت کے جو پہلو نمایاں کئے ہیں ان میں سے ایک اہم پہلو اس نفسیاتی مسئلہ کی جانب توجہ دلانا ہے۔

وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قریش مکہ میں سے بوڑھوں اور سن رسیدہ لوگوں کی اکثریت کا اسلام کی مقدس تعلیم سے گریز اور انفرادی و اجتماعی حیات انسانی کے اس جدید انقلاب (اسلام) سے توحش اور ان کے نوجوانوں کی اکثریت کا اس کی جانب تیزی کے ساتھ متوجہ ہونا اور اس کی دعوت انقلاب کی کشش سے فوج در فوج اس کے لیے حلقہ بگوش ہو جانا دنیا کا انوکھا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ جب کبھی بھی فرسودہ نظام اور باطل رسم و رواج کے خلاف خدا کے پیغمبروں نے حق و صداقت کا انقلاب برپا کیا ہے تو قبول حق کے لیے عمر رسیدہ انسانوں سے زیادہ نوجوانوں کے دل و دماغ پر ہی اس کا گہرا اثر پڑا ہے۔

سبا اور سیل عرم

۲۰۰ء تخمیناً

- تمہید
- سبا
- نام یا لقب
- زمانہ حکومت
- سبا اور طبقات حکومت
- مکارب سبا اور ملوک سبا
- وسعت حکومت
- طرز حکومت
- سبا کی عمارات
- سبا کا تمدن
- سد مارب
- جنتان عن یمین وشمال
- سیل عرم
- چند تاریخی مباحث
- تفسیری مطالب
- نتائج وبصائر

تمہید

سبا اور سیل عرم کا واقعہ بھی تاریخی واقعات میں بہت اہمیت رکھتا اور قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ میں صد ہزار سامان عبرت وموعظت مہیا کرتا ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کا پس منظر بخت واتفاق کی وجہ سے نہیں بلکہ نوامیس الٰہی کے قانون پاداش عمل کے عین مطابق ہوئی ہے۔

سبا اور قوم سبا کا وہ عبرت ناک سانحہ اور ان کے عروج وزوال کا وہ بصیرت افروز واقعہ جو سطور ذیل میں درج کیا جا رہا ہے قوموں کے عروج وزوال کے اس دوسرے قانون کے ہی زیر اثر عالم وجود میں آیا تھا اور تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ جو قوم خوش عیشی اور فاہیت کے اونچے درجہ پر بے خوف وخطر زندگی بسر کر رہی تھی وہ یک لخت ہلاکت وبربادی کے قعر مذلت میں محض اتفاق وقت سے نہیں گر گئی تھی بلکہ اپنے دور رس اعمال بد کی پاداش میں اس کو یہ روز بد دیکھنا پڑا تھا۔

پس مناسب یہ ہے کہ قرآن عزیز نے ان حقائق کو جس انداز میں بیان کر کے سامان موعظت وبصیرت عطا کیا ہے تاریخ کی بے لوث شہادت سے ان کی تفاصیل کو نقل کر دیا جائے تاکہ صداقت قرآن کا یہ پہلو بھی منکرین قرآن کے حق میں حجت کاملہ بن سکے۔

سبا

سبا، قحطانی قبائل کی مشہور شاخ ہے مؤرخین عرب اس کا نسب اس طرح بیان کرتے ہیں: سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان۔

مگر توراۃ میں یہ کہا گیا ہے کہ سبا، قحطان کا بیٹا ہے۔

اور یقطان (قحطان) سے املوداد، سلف حصار، مادت، ارخ، ہدورام، ادزال، وقلاہ عوبل، ابی مائل، سباہ خضار موت اوفیر، حویلہ، یارج، یعرب اور یوباب پیدا ہوئے یہ سب بنی یقطان تھے اور ان کے مکان میسا سے سفار کی راہ میں اور یورپ کے پہاڑ تک[1] تھے قحطان کو یقطان، یقطون یقطین اور یقطن بھی کہا جاتا ہے۔[2]

زبیر بن بکار کہتے ہیں کہ عربی میں قحطان اور عبرانی و سریانی میں یقطان اور یقطن کہتے ہیں۔ مؤرخین جدید توراۃ کے بیان کو صحیح سمجھتے ہیں اس لیے کہ قحطان کی اولاد سے متعلق جو تفصیلات اس نے دی ہیں وہ تاریخی اقوال اور اثری و حفری کتبات سے مطابقت رکھتی ہیں، جدید مؤرخین کی اس تحقیق کے علاوہ یوں بھی ایسے معاملات میں توراۃ کا بیان دوسری روایات تاریخی کے مقابلہ میں زیادہ مستند سمجھا جاتا ہے۔

غرض سبا بروایت توراۃ، قحطان کا بیٹا تھا اور بروایت عرب قحطان کا پوتا اور یعرب بروایت توراۃ سبا کا بھائی تھا اور بروایت عرب قحطان کا بیٹا۔

اہل نسب و تاریخ کا اس پر تو اتفاق ہے کہ قحطان امم سامیہ کی شاخ ہے لیکن اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ عرب عاربہ میں سے ہے یا عرب مستعربہ میں یعنی وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہے اور عدنانی و قحطانی ایک ہی سلسلہ ہے یا عدنانی تو بنی اسمٰعیل ہیں اور قحطانی اس سلسلہ سے الگ قدیم سلسلہ ہے۔

بعض مورخین عرب کا رجحان یہ ہے کہ قحطانی بھی بنو اسمٰعیل ہی ہیں اور تمام اقطاع عرب بنی اسمٰعیل کے علاوہ اور کسی نسل سے نہیں ہیں، چنانچہ علماء انساب میں سے زبیر بن بکار اور محمد بن اسحٰق کی یہی رائے ہے[3] اور امام بخاری بھی اسی جانب مائل ہیں اس لیے کہ انھوں نے بخاری میں ایک باب تحریر کیا ہے۔ باب نسبة اليمن الى اسمٰعيل عليه السلام۔

اور اس باب کے تحت ایک حدیث نقل کی ہے جس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ بنی اسلم جو خزاعہ کی شاخ ہیں ان کو نبی اکرم ﷺ نے بنی اسمٰعیل فرمایا ہے اور خزاعہ بنی اسد کی شاخ ہیں اور بنی ازد باتفاق قحطانی ہیں لہذا قحطانی بھی بنی اسمٰعیل ہی میں سے ہوئے وہ حدیث یہ ہے۔

خرج رسول الله ﷺ علىٰ قوم من اسلم يتناضلون بالسوق فقال ارموا بنى اسمٰعيل

۱: پیدائش باب ۱۱ آیات ۳۰-۲۶۔
۲: الانباہ فی قبائل الرواہ لابن عبدالبر۔
۳: تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶۔

فان اباکم کان رامیا۔ (فتح الباری ج ٦ ص ٣٠٤ باب قول اللّٰہ تعالٰی واتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلا)

ایک مرتبہ بنی اسلم کی ایک جماعت پر نبی اکرم ﷺ کا گذر ہوا دیکھا تو وہ بازار میں تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! اے اولاد اسمٰعیل خوب تیر اندازی کرو اسلئے کہ تمہارے باپ اسمٰعیل بھی تیر انداز تھے۔

اور کتاب احادیث الانبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں حضرت ہاجرہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں۔

تلك أُمكم يا بني ماء السماء

اے عرب یہ (ہاجرہ) تمہاری ماں ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس جملہ کی شرح میں یہ کہا ہے کہ

حضرت ابو ہریرہ نے بنی ماء السماء کہہ کر اہل عرب کو اس لیے خطاب فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے مویشیوں کی خاطر ایسے مقامات پر خیمے لگاتے پھرتے تھے جہاں بارش کا پانی جمع ہو گیا ہو یا ماء سماء سے زمزم زمزم مراد ہے اور ان ہر دو معنی کے لحاظ سے یہ جملہ ان لوگوں کے لیے دلیل بن سکتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تمام عرب بنی اسمٰعیل ہیں۔

اور بعض اس جملہ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ اہل عرب کی شرافت نسب اور نجابت حسب کے لیے بطور تشبیہ کے بولا گیا ہے کہ جس طرح آسمان سے نازل پانی صاف اور بے عیب ہوتا ہے اسی طرح اہل عرب بھی حسب و نسب میں بے عیب ہیں پس اگر یہ معنی مراد ہیں تو اس صورت میں یہ جملہ ان حضرات کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

عنقریب اس مسئلہ کی مزید تفاصیل انشاءاللہ تعالیٰ اوائل مناقب میں آئیں گی۔"

(فتح الباری ج ٦ ص ٣٠٤ باب قول اللّٰہ تعالٰی واتخذ اللّٰہ ابراھیم خلیلا)

اور اس مقام پر پہنچ کر پہلے قول کو تسلیم نہیں کرتے اور آخر قول ہی کو صحیح مانتے ہیں جیسا کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

اور محققین کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام عرب کے انساب کا منبع دو ہیں۔ عدنان اور قحطان، عدنان، بنی اسمٰعیل اور عرب مستعربہ ہیں اور قحطان عرب عاربہ گویا ان کے نزدیک قحطانی بنی اسمٰعیل نہیں ہیں چنانچہ ہمدانی، ابن عبدالبر، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، ابن کلبی اور حضرت عبداللہ بن عباس اسی کے قائل ہیں۔

قال هشام ومن زعم ان قحطان ليس من ولد اسمٰعيل فانه يقول قحطان هو يقطون بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح قال ابو عمر هكذا قال ابن الكلبي في العرب العاربة ورايت بخط ابي جعفر العقيلي قال نا محمد بن اسمٰعيل قال نا سلام بن مسكين قال ناعون بن ربيعة عن يزيد الفارسي عن ابن عباس قال العرب العاربة قحطان بن الهميسع والامداد والسالفات وحضر موت وهذا حديث حسن

الاسناد وھو اعلی ماروی فی ھذا الباب و اولیٰ بالصّواب۔

ہشام کہتے ہیں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قحطان بنی اسمٰعیل میں سے نہیں ہیں تو وہ اسکا نسب نامہ یہ بیان کرتے ہیں قحطان (یقطون) بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح ابو عمر (ابن عبد البر) کہتے ہیں کہ ابن کلبی نے بھی عرب عاربہ کی تفصیل کرتے ہوئے اسی طرح بیان کیا ہے اور میں نے ابو جعفر عقیلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ روایت دیکھی ہے کہ انھوں نے محمد بن اسمٰعیل سے بسلسلۂ سند یہ سنا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس فرماتے تھے کہ قحطان بن الہمیسع اور امداد اور سالفات اور حضر موت یہ سب عرب عاربہ ہیں اور اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس مسئلہ میں یہ قول بلحاظ روایت بھی اعلیٰ درجہ کا ہے اور قرین صواب بھی ہے۔

(الانباہ علی قبائل الرواۃ ص ۱۸۔۱۹)

بلکہ ابن کثیر تو یہ کہتے ہیں کہ جمہور کی یہی رائے ہے:

لکن الجمھور علی ان العرب القحطانیة من عرب الیمن وغیرھم لیسوا من سلالة اسمٰعیل وعندھم ان جمیع العرب یقسمون الی قسمین قحطانیة وعدنانیة۔

(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۶)

لیکن جمہور کی تحقیق یہ ہے کہ قحطانی عرب خواہ وہ یمنی ہوں یا غیر یمنی حضرت اسمٰعیل کی نسل سے نہیں ہیں اور ان کے نزدیک تمام عرب دو اصل پر تقسیم ہیں، قحطانی اور عدنانی۔

اور جمہور کی جانب سے بنی اسلم سے متعلق حدیث کا حافظ ابن حجر نے یہی جواب دیا ہے کہ اس حدیث سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ جو قبائل بھی قحطان کی جانب منسوب ہیں وہ سب بنی اسمٰعیل ہیں اس لئے کہ بعض قحطانی قبائل وہ ہیں جن کے متعلق علماء انساب میں سخت اختلاف ہے کہ وہ قحطانی ہیں یا عدنانی مثلاً بنی خزاعہ کے بارہ میں یہی بحث ہے، تو یہ ممکن ہے کہ بنی اسلم کے متعلق بھی اسی قسم کا اختلاف موجود ہو (چنانچہ موجود ہے) اور ابن عبد البر نے اسی حدیث کو بروایت صحیح نقل کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ بنو خزاعہ اور بنو اسلم دونوں تیر اندازی کر رہے تھے تو یہ ہو سکتا ہے کہ خزاعہ کی اکثریت کی وجہ سے آپ نے تغلیباً ایسا فرمادیا ہو۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۴۲۰)

لیکن ان جوابات کے علاوہ حافظ بن حجر نے انساب عرب کے مشہور عالم ہمدانی سے یہ نقل کیا ہے کہ یمن کی حکومت کے زوال کے بعد قحطانی قبائل حجاز میں آکر بس گئے تھے ان کے اور عدنانی قبائل کے درمیان ازدواجی رشتے بکثرت ہونے لگے تھے اس لیے نبی اکرم ﷺ نے بہ سبیل توسع ایسا ارشاد فرمایا یعنی پدری سلسلہ کی بجائے مادری سلسلہ سے انکو بنی اسمٰعیل فرمایا ہے۔

ہمدانی کا یہ جواب تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یمن سے نکلنے کے بعد قحطانی اور عدنانی قبائل کے مابین ازدواجی رشتہ نے ہی یہ صورت پیدا کر دی ہے کہ بعض اہل نسب مشہور قحطانی قبائل کو عدنانی اور عدنانی کو قحطانی کہتے نظر آتے ہیں مثلاً انصار (اوس و خزرج) کے متعلق تمام محققین علم الانساب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں مگر اسی ازداواجی رشتہ سے کبھی بہ سبیل توسع ان کو عدنانی بھی کہہ دیا جاتا ہے اور اس سے بعض مؤرخین کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ وہ قحطانی نہیں بلکہ عدنانی ہیں چنانچہ ابن عبد البر کہتے ہیں:

فاول ذلك الازدوهى جرثومة من جراثيم قحطان وافترقت الازدو فيما ذكر ابن عبده وغيره من علماء الانساب على نحو سبع وعشرين قبيلة فمنهم الانصار۔
(الانباہ ص ۱۰۶)

قبائل یمن میں سے پہلا قبیلہ ازد ہے اور قحطانی سلسلہ کی شاخ ہے اور ابن عبدہ وغیرہ علماء انساب کے اقوال کے مطابق ازد کی تقریباً ستائیس شاخیں ہیں پس ان ہی میں سے انصار (اوس خزرج) بھی ہیں"۔

قال ابن اسحق امهما قيلة ابنته كاهل بن عذرة من قضاعة كانت تحت حارثة بن ثعلبة۔ (ایضاً ص ۱۰۹)

ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ اوس وخزرج کی والدہ قیلۃ بنت کاہل بن عذرہ، بنی قضاعہ میں سے تھی جو حارثہ بن ثعلبہ (قحطانی) کے نکاح میں آئی۔

وروى عن عمر بن الخطاب وعبد الله بن عباس (رضى الله عنهم) ان قضاعة بن معد (بن عدنان)۔ (ایضاً ص ۶۳)

حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن عباس۔ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے کہ قضاعہ بن معد (بن عدنان) کی نسل سے ہیں۔

اسی طرح مصنف ارض القرآن کا وہ قول بھی درست ہے جو انھوں نے اس سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ بعض علماء انساب وحدیث خود قحطان کو اسمٰعیلی کیوں کہتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

اس مبالغہ میں اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض قحطانی اسماعیلی ہیں اور یمن میں سکونت کے باعث یا کسی اور سبب سے ان کو قحطانی فرض کر لیا گیا ہے۔ (الانباہ ج اص ۲۷۷)

ایک جانب بعض عدنانی قبائل کا یمن میں مقیم ہو جانا اور دوسری جانب سبا کے انتشار سے بعض قحطانی قبائل کا حجاز، شام، عراق، نجد، بحرین میں جا کر وطن بنا لینا اور عدنانی قبائل کے ساتھ ازدواجی رشتے قائم کر لینا یہ وہ امور ہیں جن کی وجہ سے بعض قبائل کے متعلق قحطانی اور عدنانی ہونے میں اختلاف پیدا ہو گیا البتہ اہل عرب کو خود قحطان کے متعلق اسماعیلی ہونے کا خیال کیوں پیدا ہوا؟ اس کے جواب میں ہم مصنف ارض القرآن سے متفق نہیں ہیں کیونکہ جو اہل نسب اور علماء حدیث قحطان کو بنی اسمٰعیل میں سے سمجھتے ہیں وہ یہ بات اس الجھاؤ کی وجہ سے ہرگز نہیں کہتے کہ بعض عدنانی قبائل یمن میں بس جانے کی وجہ سے قحطانی کہلانے لگے جیسا کہ سید صاحب کا خیال ہے بلکہ یہ تو ایک مستقل نظریہ ہے جو بعض علماء نسب وحدیث کے درمیان اس لیے مقبول ہے کہ ان کے نزدیک تمام عرب صرف حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں اور ان کے نزدیک عرب مستعربہ کے علاوہ عرب بائدہ اور عرب عاربہ کی کوئی شاخ عرب میں باقی ہی نہیں رہی۔

حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کا حجاز کعبۃ اللہ اور حرم کے ساتھ جو تعلق ہے اس کی عظمت اور اکثر قبائل عرب کے ابو القبائل ہونے کا جو علاقہ اس کی اہمیت یہ دو اہم باتیں ہیں کہ جن کی وجہ سے غالباً بعض قحطانی قبائل نے بھی خود کو عدنانی کہنا شروع کر دیا خصوصاً مقیم حجاز قبائل نے اس کو زیادہ نمایاں کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو قبائل خود کو

اس پردہ میں نہیں چھپا سکتے تھے انھوں نے اس سے بڑھ کر ایک اور قدم اٹھایا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ خود قحطانی بھی اسمٰعیلی ہے تا کہ عدنانی اور قحطانی کا یہ فرق باقی ہی نہ رہے جو ایک کے اسمٰعیلی اور دوسرے کے غیر اسمٰعیلی ہونے سے باہمی امتیاز و شرف کا سبب بنتا تھا اور اسی بناء پر علماء انساب کے درمیان یہ مسئلہ اختلافی بن گیا اور علماء حدیث میں سے بعض محدثین نے غالباً اس لیے اس نظریہ کی تائید کی کہ ان کے سامنے چند ایسی صحیح روایات تھیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید کل عرب بنی اسمٰعیل ہی ہیں مثلاً حدیث کا یہ جملہ تلك امكم يا بنى ماء السماء میں ایک قسم کا عموم پایا جاتا ہے یا مثلاً بعض ایسے قبائل کے متعلق کہ جن کو قحطانی سمجھا جاتا ہے نبی اکرم ﷺ کا ان کے لیے بنی اسمٰعیل فرمانا مگر ان محدثین کا یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم حافظ ابن حجر، ابن عبدالبر، ابن کثیر بلکہ حضرت عمر اور حضرت ابن عباسؓ کے مقالات سے ثابت کر چکے ہیں کہ وہ روایات کے ان الفاظ کا مطلب کیا سمجھتے ہیں بلکہ ابن عبدالبر نے اس مسئلہ کو صاف کرتے ہوئے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس دعوے کے ثبوت میں بعض مرفوع احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں، جن میں جرہم سلف اور ثقیف کو مستثنیٰ کرتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے العرب كلها من ولد اسمٰعيل! معلوم رہے کہ یہ اور اس قسم کی تمام روایات نا قابل اعتماد اور نا قابل حجت ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی جانب ان کی نسبت غلط ہے اور ابن عبدالبر کے اس قول سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

قال ابو عمر اكثر الاختلاف المذكور فى كتابنا هذا وفى غيره من اهل النسب تولد من اختلافهم فى نسبة جميع العرب الىٰ اسمٰعيل بن ابراهيم (عليهما السلام) على ماقد منا ذكره فى كتابنا هذا فى باب قحطان غيره ـ (ايضاً ص ١٠٦)

ابو عمر (ابن عبدالبر) کہتا ہے کہ ہماری اس کتاب میں اور اس کے علاوہ نسب کی دوسری کتابوں میں قبائل کے متعلق جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس نظریہ کی بدولت پیدا ہوا ہے کہ تمام عرب اسمٰعیل بن ابراہیم کی اولاد ہیں جیسا کہ ہم اسی کتاب میں قحطان اور بعض دوسرے ناموں کے تحت ذکر کر آئے ہیں۔

اور ابن کثیر کے اس قول سے بھی:

قيل ان جميع العرب ينتسبون الى اسمٰعيل بن ابراهيم (عليهما السلام) والتحية والاكرام الصحيح المشهور ان العرب العاربة قبل اسمٰعيل وقد قدمنا ان العرب العاربة منهم عاد وثمود وطسم جديس واميم وجرهم و العماليق وامم اخرون ال يعلمهم الا الله كانوا قبل الخليل عليه الصّلوٰة والسّلام وفى زمانه ايضًا ـ (ابن اثیر ج ۲ ص ۱۵۶)

کہا جاتا ہے کہ تمام عرب حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے ہیں اور صحیح اور مشہور قول یہ ہے کہ عرب عاربہ حضرت اسمٰعیل سے پہلے بتا چکے ہیں کہ عاد، ثمود، طسم، جدیس، امیم، جرہم اور عمالیق اور ان کے علاوہ اور قبائل جن کا حال صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے حضرت ابراہیم سے پہلے سے تھے اور ان کے زمانہ میں عرب میں ان کی نسلیں پائی گئی ہیں۔

الانباہ ص ۹۲ "وہی آثار کلہا ضعیفۃ الاسناد"۔

پس حضرت ابوہریرہؓ کے اس ارشاد کے متعلق جو انھوں نے اہل عرب کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت ہاجرہؑ کے سلسلہ میں فرمایا یعنی تلك امكم یا بنی مآء السماء بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یا تو انھوں نے عدنانی قبائل کی اکثریت کے پیش نظر جو حجاز میں آباد تھی۔ تغلیباً یہ فرمادیا اور یا اس لیے فرمایا کہ عرب کے قحطانی قبائل ہوں یا عدنانی پدری یا مادری کسی نہ کسی سلسلہ سے بنی ہاجرہ ضرور ہیں۔

اس کے برعکس اگر حضرت ابوہریرہؓ کے اس مقولہ کا مطلب یہ لیا جائے کہ تمام عرب پدری سلسلہ سے حقیقۃً بنی ہاجرہ بنی اسمٰعیل ہیں تو یہ واقعہ کے بھی خلاف ہوگا اور ان صحیح روایات کے بھی مخالف رہے گا جن سے یہ ثابت ہے کہ عرب کے قبائل کا سلسلہ نسب قحطانی اور عدنانی قبائل کے علاوہ بنی جرہم اور بعض دوسرے ان قبائل سے بھی تعلق رکھتا ہے جو عرب عاربہ کہلاتے تھے اور توراۃ اور مؤرخین تو اس کے متعدد سلسلے بیان کرتے ہیں۔

نام یا لقب

سبا نام ہے یا لقب؟ یہ بھی ایک سوال ہے جو اس جگہ زیر بحث آتا ہے، توراۃ کہتی ہے کہ یہ نام ہے اور مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ سبا لقب ہے اور نام عمرو یا عبد شمس[1] ہے عصر حاضر کے اہل تاریخ اسی کو صحیح سمجھتے ہیں پھر عرب کے اہل تاریخ سبا کی وجہ لقب یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لفظ سبا بمعنی قید سے ماخوذ ہے چونکہ اس نے عرب میں سب سے پہلے جنگی قیدیوں کا طریقہ رائج کیا اور ان کو غلام بنایا اس لیے سبا لقب پایا اور جدید مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ س، ب الف، مع ہمزہ سے مرکب ایسے لفظ سے ماخوذ ہے جس کے مفہوم میں تجارت کے معنی داخل ہیں اور سبا اور قوم سبا چونکہ تاجر پیشہ قوم تھی اس لیے سبا کے نام سے مشہور ہوئی چنانچہ آج بھی لغت عرب میں یہ لفظ شراب[2] کی تجارت کے لیے بولا جاتا ہے۔ سبا الخمر شر اها بشر بها و سبیٰ سباء لاخمر۔ حملها من بلد الی بلد ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کا لقب الرائش بھی تھا لغت میں ریش یا ریاش بمعنی مال کے آتے ہیں۔ یہ چونکہ بہت بڑا فاتح اور سخی تھا اور لوگوں کو کثرت سے مال و متاع دیتا رہتا تھا اس لیے اس لقب سے مشہور ہوا۔

زمانۂ حکومت

عام مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ سبا نے چار سو بیس برس حکومت کی[3] مگر جدید فلسفۂ تاریخ کے لحاظ سے اسکے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ یہ خاندان سبا کی مدت حکومت بیان کی گئی ہے لیکن یہ قاعدہ اس جگہ صحیح نظر نہیں آتا اس لیے کہ اگر قحطان کی تیسری پشت سے اس مدت کو شروع کیا جائے تو یہ تقریباً ۲۵۰۰ ق م ہو سکتی ہے۔ اس حساب سے سبا کی حکومت کو ۲۰۰۰ ق م ختم ہو جانا چاہیے حالانکہ ہم حضرت سلیمان ؑ کے تذکرہ میں توراۃ سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ۹۵۰ ق م میں ملکۂ سبا "بلقیس" نے حاضر خدمت ہو کر سلیمان ؑ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے اور بہت سے تحفے پیش کیے ہیں اور جیسا کہ سورۂ نمل میں ملکۂ سبا کے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے یہ زمانہ سبا کی حکومت کا زمانۂ عروج ہے، چنانچہ زبور میں حضرت داؤد ؑ کی یہ دعا مذکور ہے:

۱: البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸ و تفسیر ابن کثیر ج ۳۔
۲: اقرب الموارد۔
۳: البدایہ والنہایہ ج ۲۔

اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے، وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں گذاریں گے اور وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اسے دیا جائے گا اس کے حق میں سدا دعا ہو گی۔" (زبور ۷۲)

حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا مقبول ہوئی اور ۹۵۰ق م میں ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں ملکہ سبا نے حاضر ہو کر بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہرات پیش کیے۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو سبا کی عمر کے متعلق مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور یا اس سے سبا کے پورے دور حکومت کی مدت نہیں بیان کی گئی بلکہ انکی حکومت کے دوسرے دور یعنی ملوک سبا کی مدت حکومت مراد ہے جو کم و بیش چار سو چھتیس سال ہے۔ (ارض القرآن)

سبااور طبقات حکومت

مؤرخین کہتے ہیں کہ سبا کے دو بیٹے تھے ایک حمیر اور دوسرا کہلان اور تمام قحطانی قبائل ان ہی دو سلسلوں سے وابستہ ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عدنانی (اسمٰعیلی) قبائل جو نابت اور قیدار کی اولاد ہیں ان کا اصلی وطن شمالی عرب ہے اور قحطانی قبائل کا مسکن جنوبی عرب (یمن ہے)۔

اور عام اہل نسب جب حکومت سبا کا ذکر کرتے ہیں تو وہ حمیر کو براہ راست سبا کا جانشین کہہ دیتے ہیں اور تمام سلسلہ حکومت کو حمیری حکومت ہی سے یاد کرتے ہیں اور سبا کی حکومت کو مستقل حیثیت نہیں دیتے حالانکہ تاریخی حیثیت سے یہ نظریہ بالکل غلط ہے اس لیے کہ سباء یمن کے دور حکومت سے متعلق جو کتبات اثری اور جعفری ذرائع سے بر آمد ہو رہے ہیں نیز یونانی اور رومی معاصر سبا مورخین کی جو تاریخی شہادتیں ہیں ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سبا کی حکومت دو طبقات میں منقسم رہی ہے اور پھر ہر دو طبقات کا زمانۂ حکومت جدا جدا دو دو دوروں میں تقسیم ہے۔

طبقہ اولیٰ کا پہلا دور تقریباً ۱۱۰۰ق م سے شروع ہو کر ۵۵۰ق م پر ختم ہوتا ہے کیونکہ بلحاظ کتبات سب سے پہلے حکومت سبا کا ذکر زبور ۵۵۰ق م میں ہوا ہے اور یہ ان کے عروج کا زمانہ قیاس کیا گیا ہے اس دور میں شاہان سبا کا لقب مکارب سبا نظر آتا ہے اور سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کی ملکہ ٔ سبا (بلقیس) اسی دور سے تعلق رکھتی ہے اور طبقہ اولیٰ کا دوسرا دور ۵۵۰ق م سے شروع ہو کر ۱۱۵ق م پر ختم ہوتا ہے جیسا کہ علم الآثار سے ثابت ہو چکا ہے اور سیل عرم اور سبا کا انتشار اسی دور سے متعلق ہے اس دور کے بادشاہ ملوک سبا کہلاتے ہیں۔

اور طبقہ ثانیہ کا پہلا دور ۱۱۵ق م سے شروع ہو کر اواخر ۳۰۰ء پر ختم ہو جاتا ہے یہ بادشاہ ملک سبا دریدان اور ملوک حمیر کہے جاتے ہیں اور دریدان ان کے مشہور قلعہ کا نام ہے اور سبا اور حمیر قومیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حمیری سنہ اگرچہ غیر معروف رہا ہے لیکن ان کے ایک کتبہ میں حبشہ کے حملۂ یمن اور ذونواس کی موت کا تذکرہ ہے چونکہ یہ واقعہ عرب اور رومی تاریخی روایات کے مطابق ۵۲۵ء میں پیش آیا ہے اور کتبہ میں ۶۴۰ حمیری درج ہے لہٰذا اس کو پیش نظر رکھ کر سنہ حمیری کی ابتداء ۱۱۵ق م سے مطابقت رکھتی ہے اس دور میں سبا کا یہ خاندان صرف یمن اور اطراف یمن کا حکمراں رہا ہے۔

اور طبقۂ ثانیہ کا دوسرا دور ۳۰۰ء کے اواخر سے شروع ہو کر ۵۲۵ء پر ختم ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب آخری مرتبہ اہل حبش یمن پر قابض ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ آفتاب اسلام کی ضیاء یمن تک پہنچتی ہے اور سارا یمن ایک ہی روز مشرف باسلام ہو جاتا ہے اس دور میں حکومت کا تسلسل باقی نہیں رہا بلکہ ۴۰۰ء کے وسط میں پہلی مرتبہ اکسومی حبشی خاندان نے کچھ عرصہ کے لیے یمن پر فاتحانہ قبضہ کر لیا تھا مگر چند سال کے بعد حمیر پھر اس کو واپس لے لیتے ہیں۔ اس دور میں شاہان سبا کا لقب مورخین عرب کے نزدیک تبع ہو جاتا ہے اور یہ "تبابعۂ یمن" کہلاتے ہیں۔ سامی زبان میں "تبع" کے معنی سلطان اور قاہر بادشاہ" کے ہیں چونکہ اس دور میں شاہان حمیر نے یمن کے علاوہ حضر موت حبشہ، نجد اور تہامہ تک اپنی حدود مملکت کو وسیع کر لیا تھا اس لیے وہ اس لقب سے مشہور ہوئے چنانچہ ان کے دور کے کتبات میں "ملک سبا دریدان و حضر موت" ملک سبا دریدان و حضر موت و بخد وغیرہ ملکوں کے نام اضافہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور یہی وہ تبع ہیں جن کا ذکر قرآن کی سورۂ دخان اور سورۂ میں کیا گیا ہے ریدان کا قلعہ ان کا ابتدائی دارالحکومت رہا ہے اور یہ شہر ظفار کے قریب آباد تھا جو صنعا موجودہ دارالحکومت (یمن) کے متصل ہے اور جب سبا کے طبقۂ اولیٰ کے انتشار سے اس کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو حمیر نے مارب تک اپنی حکومت کو وسیع کر لیا۔

واول من ملك اولاد قحطان حمير بن سبا فبقى مليكاً حتى مات هرماً و توارث ولده الملك بعده فلم يعدهم الملك حتى مضت قرون و صار الملك الى الحارث وهو تبع الاول فمن ملك اليمن قبل الرائش ملكان ملك بسبا وصار الملك بحضر موت فكان لا يجمع اليمانيون كلهم عليهم الىٰ ان ملك الرائش فاجتمعوا عليه و تبعوه فسمى تبعاً۔ (ص ۱۰۸ مطبوعه کلکته)

قحطان کی اولاد میں جو پہلا بادشاہ ہوا وہ حمیر بن سبا ہے یہ آخری وقت تک بادشاہ رہا یہاں تک کہ بوڑھا ہو کر مر گیا پھر حکومت اس کی اولاد میں وارثۃً جاری رہی اور چند صدیوں تک ان کے ہاتھ سے نہیں نکلی پھر حارث الرائش بادشاہ ہوا جو پہلا تبع ہے اس سے پہلے دو بادشاہ ہوتے تھے: ایک سبا میں اور ایک حضرت موت میں تمام یمنی ایک پر جمع نہیں ہوتے تھے لیکن جب الرائش بادشاہ ہوا تو اسکی بادشاہی پر سب مجتمع ہو گئے اور اس کی اطاعت قبول کر لی اس لیے اس کا لقب تبع ہوا۔

اور مؤرخ و محدث ابن کثیر نے بھی اپنی تاریخ میں یہی بیان کیا ہے:

وكانت العرب تسمىٰ كل من ملك اليمن مع الشجر وحضر موت تبعا كما يسمون من ملك الشام مع الجزيرة قيصر و من ملك الفرس كسرى و من ملك مصر فرعون و من ملك الحبشة النجاشي و من ملك الهند بطليموس۔ (البدایه والنهایه ج ۲ ص ۱۵۹)

اور عرب اس بادشاہ کو جو یمن کے ساتھ شجر اور حضر موت کا بھی بادشاہ ہو تبع کہتے ہیں جیسا کہ اس بادشاہ کو جو شام اور جزیرہ دونوں کا حکمران ہو قیصر کہتے ہیں اور جو فارس کا بادشاہ ہو اس کو کسریٰ اور ملک مصر کے بادشاہ کو فرعون اور حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی اور ہندوستان کے بادشاہ کو بطلیموس کہتے ہیں۔

غرض یہ خیال کہ سبا کی حکومت اور حمیری حکومت ایک ہی بات ہے نہ صرف تاریخ ہی کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن عزیز کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ قرآن عزیز نے حکومت سبا سے متعلق سورۂ نمل اور سورۂ سبااور میں جو دو واقعے بیان کیے ہیں ان کا تعلق سبا کے اس طبقہ سے ہے جو ملوک حمیر اور تبابعہ سے قبل گزرا ہے اور اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حمیر ہرگز سبا کا بلاواسطہ جانشین نہیں ہے بلکہ اس کے اور حمیر کے درمیان بہت زیادہ واسطے ہیں اور حمیر اگرچہ سبا کا بیٹا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا اپنا زمانہ اور اس کی نسل میں قیام حکومت کا زمانہ ایک ہے بلکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ سبا کے بعد اس کی اولاد میں حکومت کا وہ سلسلہ جو طبقہ اولیٰ سے تعلق رکھتا ہے بجائے حمیر کی نسل کے کہلان کی کسی قدیم شاخ میں قائم کر رہا ہے کیونکہ مارب اور سبا کی نو آبادیوں کی تباہی کا اثر ہم بنی کہلان میں زیادہ پاتے ہیں اور مارب تک حمیری حکومت کی ابتداء سبا کی بربادی سے شروع ہوتی ہے چنانچہ عام مؤرخین کے خلاف ابن عبدالبر نے یہ تصریح کی ہے کہ سبا کی حکومت صرف حمیر کی نسل ہی میں نہیں رہی بلکہ کہلان کے خاندان میں یہ سلسلہ رہا ہے وہ فرماتے ہیں:

وولد سبا حمیر بن سبا و کھلان بن سبا فمن حمیر و کھلان کانت ملوك الیمن من التبابعة و الاذواء ۔

اور سبا کے دو بیٹے تھے حمیر اور کہلان اور حمیر و کہلان دونوں ہی کی نسل سے یمن کے بادشاہ تبع اور ذو ہوئے ہیں۔

مکارب سبا و ملوک سبا

سبا (طبقہ اولیٰ) کے دور اول کے حکمران تاریخ میں مکارب سبا کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں یہ لفظ مکا بمعنی "مذہبی" اور "رب" مالک سے مرکب ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبا کا ابتدائی دور حکومت مذہبی پیشواؤں یعنی کاہن حکمرانوں سے شروع ہوتا ہے ان بادشاہوں کا دارالحکومت صرواح تھا اور یہ مارب اور صنعاء کے درمیان واقع تھا اور اس کے کھنڈرات بھی موجود ہیں اور ملوک سبا (شاہان سبا) کا دارالحکومت مارب تھا اور ان کا بادشاہ اس کے مشہور قلعہ "سلحین" میں رہتا تھا۔ ابن علقمہ جاہلی شاعر مسلمان مؤرخین سے قبل ان دونوں زمانہ ہائے حکومت کو الگ الگ ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے:

من یا من الحدثان بعد ملوك صرواح و مارب

صرواح اور مارب کے بادشاہوں کے بعد اب کون حوارث سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

اور یہی شاعر قلعۂ سلحین کا بھی ذکر کرتا ہے۔

وقصر سلحین قد عفاه ریب الزمان الذی یریب

اور سلحین کا محل، جس کو زمانہ کے حوارث نے فنا کر دیا۔

وسعت حکومت

حکومت سبا کی ابتداء جنوبی عرب "یمن" کے مشرقی حصہ سے ہوتی ہے اس کا دارالحکومت اول صرواح

تھااور پھر مارب ہوا آہستہ آہستہ اس حکومت نے ترقی کی اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ تجارتی ذرائع سے بھی بہت زیادہ کامیابی حاصل کی اس لیے اس کا رقبہ حکومت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور شمالی عرب اور افریقہ تک اس کے حدود نظر آنے لگے چنانچہ حبشہ اذنیہ کا ضلع اسی کے مقبوضات میں تھا اور حکومت سبا کی جانب سے مغافر کے لقب سے ایک سبائی حکومت کرتا تھا یمن سے براہ حجاز شام تک جو قدیم تجارتی شاہراہ تھی اور جس کا ذکر قرآن عزیز نے سورۂ قریش میں رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ کہہ کر کیا ہے اور دوسری جگہ جس کو امام مبین فرمایا ہے وہ بھی ان ہی کے قبضہ میں آگئی تھی اور شام فلسطین اور مدین کے نواح میں بھی ان کے مقبوضات موجود تھے اور اس طرح تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل معین پر غلبہ پانے کے بعد سبا کی حکومت عرب کی عظیم الشان متمدن حکومت تھی۔ (دائرۃ المعارف للبستانی (سبا) و معجم البلدان (یمن))

طرز حکومت

سبا کے طرز حکومت کے متعلق اہل تاریخ یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے محدود سلسلہ رسل و رسائل کے پیش نظر ضروری سمجھا جاتا تھا کہ دارالحکومت سے فاصلہ پر آباد شہروں اور بستیوں پر آزاد گورنروں کی چھوٹی چھوٹی حکومتیں ہوں اور جو مرکزی حکومت قائم تھی اور اس کی ترتیب و تنظیم اس طرح پر تھی کہ آس پاس کے گاؤں اور قصبوں کے درمیان عموماً ایک قلعہ ہوتا تھا جس پر قلعہ دار رہتا تھا اور وہی ان آبادیوں کا حاکم اور ذو کہلاتا تھا اور اس مجموعہ آبادی کو "محفد" کہتے تھے یمنی زبان میں ذو کے معنی "آقا" کے ہیں جو عربی میں بمعنی صاحب و مالک بولا جاتا ہے اور اس کی جمع اذواء آتی ہے اور قلعہ کا جو نام رکھا جاتا تھا اسی کے انتساب سے قلعدار کا لقب قرار پاتا تھا مثلاً ذو غمدان ذو ثعلبان۔

پھر چند محفد مل کر ایک مخلاف بنتا تھا اور اس مخلاف کے حاکم کو قیل (صوبہ دار) کہتے تھے قیل کی جمع "اقیال" "ملک" (بادشاہ) کے تابع فرمان ہوتے تھے، انہی بادشاہوں کو یمن کی تاریخ میں مکارب سبا اور ملوک سبا کہا جاتا تھا اور بادشاہ کا بھی ایک زبردست اور محکم قلعہ ہوتا تھا چنانچہ قلعہ ریدان اور سلحین ان ہی بادشاہوں کے قلعے تھے اور یہ بادشاہ ان ہی قلعوں اور دارالحکومت کے شہروں کے انتساب سے لقب پاتے تھے مثلاً ملک سبا ذوریدان یا ملک سبا ذو سلحین مارب کے آثار سے جو سکے حاصل کیے گئے ہیں ان پر یہ نقش کندہ ہے ضرب بیت سلحین و حفر مارب یعنی یہ قلعہ سلحین اور شہر مارب میں مسکوک کیا گیا۔

یمن کے اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے بعد بھی "اذواء" اور "اقیال" کا یہ نظم حکومت باقی رکھا گیا اور یہی وہ اقیال یمن ہیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے دعوت اسلام کے لیے نامہ ہائے مبارک تحریر فرمائے اور انھوں نے برضا و رغبت دعوت اسلام کو قبول کیا۔

سبا کی عمارات

ہمدانی جو کہ قدیم مورخین کی طرح جدید یورپ کی نگاہ میں بھی بہت مستند اور سچا مؤرخ تسلیم کیا جاتا ہے اس نے اپنی مشہور کتاب اکلیل میں ایک باب سبا کی عظیم الشان اور عجیب و غریب عمارات کے لیے مرتب کیا ہے اور

حکومت سبا کے سلسلہ میں جو کتبات پائے گئے ہیں ان میں بھی اکثر ان قلعوں اور بے نظیر عمارات ہی کے کتبے ہیں اور یورپین سیاح بھی ان کھنڈرات کے عجیب وغریب حالات سناتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ قصر غمدان بے مثل صناعی کا نمونہ تھا یہ قصر بیس منزل رکھتا تھا اور ہر ایک منزل کا ارتفاع بقدر دس گز معماری تھا اور سب سے اوپر کی منزل نہایت بیش قیمت آبگینوں سے بنائی گئی تھی اور اس قصر میں وسیع وعریض کمرے تھے، اسی طرح بے نظیر عمارات کا سلسلہ تھا جو اس زمانہ کے رفیع تمدن اور سبا کی حیرت انگیز ترقی کا آئینہ دار تھا۔[1]

سبا کا تمدن

گذشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے کہ اہل سبا ایک تاجر قوم تھی اور یہ وصف ان کا قومی مزاج بن گیا تھا اس لیے وہ حکومت کے وسائل ترقی کے لیے بھی اسی کو زیادہ اہم وسیلہ سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حدود میں جو خزانے مدفون کر رکھے تھے وہ اور زیادہ ان کی اس فطرت کے لیے تائید غیبی بن گئے تھے کیونکہ عرب میں سونے اور جواہرات کی بکثرت کانیں موجود ہیں اور ان کا بیش تر حصہ ان ہی کے رقبۂ حکومت میں موجود تھا۔ مدین میں سونے کے علاوہ دوسری قسم کی معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔ حضرت موت اور یمن کا علاقہ خوشبودار اشیاء کی پیداوار کے لیے مشہور تھا اور اب بھی ہے، عمان اور بحرین میں موتیوں کے خزانے ہیں جن سے آج بھی تمام دنیا میں بیش قیمت موتی جاتا ہے خود یمن کے ساحل ہندستان اور حبش کی پیداوار کے لیے منڈی تھے اور شام، مصر اور یورپ اور ہندستان، حبش کے درمیان جو درآمد و برآمد ہوتی اور تجارتی کاروبار ہوتا تھا اس زمانہ میں سبا ہی اس کے واحد اجارہ دار اور براہ حجاز ان ملکوں تک سامان تجارت پہنچاتے تھے اسی بناء پر توراۃ میں سبا کی دولت وثروت اور اس کی وجہ سے ان کے تمدن کی عظمت کے بہ کثرت تذکرے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے:۔

> ”مصر کے مزدور اور حبش اور سبا کے تجارتی مال اور تنومند آدمی تیرے پاس آئیں گے اور وہ تیرے ہوں گے۔“ (۴۵-۱۴۱)

اور اسی کتاب میں دوسری پیشین گوئی ہے:

> (اے یروشلم) اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی، مدین اور عیفا کی اونٹنیاں (بھی) یہ سب سبا سے آئیں گی اور سونا اور لوبان لے کر آئیں گی۔ (۶۰-۶)

اور یرمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:

> خداوند غصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: کس مقصد کیلئے میرے پاس سبا کا لوبان پیش کرتے ہو۔“ (۶-۲۰)

اور حزقیل نبی کی کتاب میں ہے:

۱: يقال ان غمدان قصر باليمن بناه يعرب بن قحطان و ملكه بعده واحتله واثلة بن حمير بن سبا و يقال كان ارتفاعه عشرين طبقة۔ البدايه والنهاية ج ۲ ص ۱۷۹۔

اور عوام کے ساتھ سبا والے بیابان (عرب) سے لائے گئے جن کے ہاتھوں میں کنگن ہیں اور خوبصورت تاج ان کے سروں پر ہیں۔ (۲۳-۴۲)

اور دوسری جگہ ہے:

اور سبا اور رعمہ کے سوداگر تیرے ساتھ سوداگری کرتے تھے وہ تیرے بازاروں میں ہر قسم کے نفیس اور خوشبودار مصالحے اور ہر طرح کے جواہرات اور سونا اور یمن کے شہروں، خران، قانہ اور عدن اور سوداگران سبا اور اشور اور کلماد تیرے سوداگر ہیں یہ ہی تیرے تاجر تھے ہر قسم کی چیزوں کے جو کمخاب اور چوغے اور ارغوانی اور منقش پوشاکیں اور سب طرح کے بوٹے دار نفیس کپڑے گٹھوں سے کسے ہوئے اور مضبوط بندھے ہوئے تیری تجارت گاہ میں بیچنے کیلئے لاتے تھے۔ (۲۷-۲۴-۲۲)

سد مارب

عرب میں مستقل دریا ناپید ہیں، اکثر بارش کے پانی پر گذر ہے اور کہیں کہیں پہاڑی چشمے بھی ہیں بارش کا پانی ہو یا پہاڑی چشموں کا تمام پانی بہہ کر وادی کے ریگستان میں جذب ہو کر ضائع ہو جاتا ہے قوم سبا نے اس پانی کو کام میں لانے اور باغات وزراعت کو سرسبز وشاداب بنانے کے لیے یمن کے اقطاع وامصار میں ایک سو سے زائد بند باندھے تھے اور ان کی وجہ سے تمام ملک سرسبز و بہارستان بنا ہوا تھا، ان ہی بندوں میں سے سب سے بڑا اور عظیم الشان بند "سد مارب" تھا جو دار الحکومات مارب میں بنایا گیا تھا۔

اس "سد" کے متعلق قدیم وجدید مؤرخوں اور سیاحوں نے جو حالات لکھے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ سبا کو فن انجینئری اور ہندسہ میں بہت بڑا کمال حاصل تھا۔

مارب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ جو کوہ ابلق کے نام سے مشہور ہیں اور ان کے درمیان بہت طویل وعریض وادی ہے جس کو وادیٔ اذنیہ کہتے ہیں جب اپنی برستا یا پہاڑی چشموں سے بہہ نکلتا تو وادی دریا بن جاتی۔ سبا نے یہ دیکھ کر ۸۰۰ ق م میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بند باندھنا شروع کیا اور عرصہ تک اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔

بعض مؤرخین عرب کہتے ہیں کہ یہ بند دو میل مربع تھا[1] اور صاحب ارض القرآن ایک یورپین سیاح ازماؤ کے مضمون کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک سو پچاس فٹ لانبی اور پچاس فٹ چوڑی دیوار ہے جس کا بہت بڑا حصہ منہدم ہو چکا ہے اور ایک تہائی اب بھی باقی ہے اور وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس سیاح نے اس کا بہت عمدہ نقشہ تیار کر کے اپنے مضمون کے ساتھ شائع کیا ہے جو فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا ہے اور جس کو انہوں نے ارض القرآن میں بھی نقل کیا ہے۔

مؤرخین عرب یہ بھی کہتے ہیں کہ سبا نے اس کو اس طرح تعمیر کیا تھا کہ پانی کو روکنے کے بعد موسموں کے اختلاف کے پیش نظر آبیاری کے لیے پانی کے اوپر نیچے تین درجے قائم کر دیے تھے اور ہر درجے میں تیس تیس

۱: تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۵۹۔

کھڑکیاں رکھی تھیں جن کے ذریعہ پانی کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا اور پھر ان کے نیچے ایک بہت بڑا حوض بنایا تھا اس کے دائیں اور بائیں دو بڑے بڑے آہنی پھاٹک تھے جن کے ذریعہ حوض کا پانی تقسیم ہو کر مارب کے دونوں جانب نہروں، گولوں اور جھبوں کے ذریعہ حسب ضرورت کام میں آتا تھا۔ اس عظیم الشان بند کی وجہ سے تقریباً تین سو مربع میل تک داہنے اور بائیں چھواروں کے نخلستان، میووں اور پھلوں کے حسین و جمیل باغ، خوشبوؤں کے کھیت اور مرغ زاد دار چینی، عود اور مختلف قسم کے خوشبودار درختوں کے گنجان باغات اس کثرت سے ہو گئے تھے کہ تمام علاقہ چمنستان اور فردوس بنا ہوا تھا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۵۸)

ابن کثیر وغیرہ بروایت ابن منبہ یہاں تک مبالغہ کرتے ہیں کہ اگر ایک عورت کسی موسم میں بھی سر پر ٹوکری رکھ کر ان باغات کے اندر گذر جاتی تو ہاتھ لگائے بغیر ہی اس کی ٹوکری پختہ پھلوں کے ٹپکنے سے بھر جاتی۔
(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۵۹)

یمن کی طبعی خصوصیت کے لحاظ سے خوشبوؤں۔ پھلوں اور پھولوں کے درختوں کی کثرت مارب کے بند کی وجہ سے اس میں عظیم الشان اضافہ اور ترقی تجارتی کاروبار اور معدنیات کی کثرت کی وجہ سے سونا، چاندی اور جواہرات کی بہتات نے قوم سبا میں اس درجہ خوش عیشی، رفاہیت فارغ البالی اور اطمینان پیدا کر دیا تھا کہ وہ ہر وقت مسرت و شادمانی کے ساتھ خدا کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے اور شب و روز طمانیت و مرفہ الحالی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

اور ملک کے بہارستانوں اور چمنستانوں کی وجہ سے آب و ہوا میں اس درجہ اعتدال تھا کہ اہل سبا مچھروں، مکھیوں اور پسوؤں جیسے ایذا رساں کیڑوں سے پاک و محفوظ تھے چنانچہ سبا کے معاصر مؤرخ اہل سبا کی اس رشک پیدا کرنے والی زندگی کے حالات اس طرح بیان کرتے ہیں (راٹو تھینس (EROTOOTHENS) ۱۹۴ ق م لکھتا ہے:

"عرب کے انتہائی حد پر سمندر (بحر ہند و عرب) کے پہلو میں سبا کے لوگ ہیں جن کا دارالحکومت مارب ہے یہ قطعہ ملک مصر کے زیریں پڑا ہے گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں جا کر خشک ہو جاتے ہیں اسی سبب سے زمین اس قدر سرسبز شاداب ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دو بار ہوتی ہے حضر موت سے سبا کے ملک تک چالیس روز کا راستہ ہے اور معین سے سوداگر ستر دن میں ایلہ (عقبہ) پہنچتے ہیں، حضرت موت، معین اور سبا کے ملک خوش و خرم ہیں اور ہیکلوں اور شاہی عمارتوں سے آراستہ ہیں۔

اور یونانی مؤرخ اگاتھر شیڈس (agathershidos) ۱۴۵ ق م لکھتا ہے:

"سبا عرب آبادان (arabiafler) میں رہتے ہیں جہاں بہت اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں۔ زمین جو سمندر کے متصل ہے اس میں بلساں اور نہایت خوب صورت درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں، اندروں ملک بخورات، دار چینی اور چھوارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں بو پھیلا کرتی ہے درختوں کے اقسام کی کثرت و تنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے جو خوشبو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں، اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی جو اشخاص زمین سے

دور ساحل سے گذرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں، وہ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل میں ناقص ہے۔

اور یہی مؤرخ دوسری جگہ لکھتا ہے:

سبا میں تمام دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند لوگ ہیں چاندی اور سونا بکثرت ہر طرف سے لایا جاتا ہے بعد کے سبب سے کسی نے ان کو فتح نہیں کیا ہے اسی لیے خصوصاً ان کے دار الحکومت میں سونے چاندی کے برتن ہیں تخت اور پلیٹ گاہیں ہیں جن کے ستون زرنگار اور نقرئی و طلائی نقش و نگار سے آراستہ ہیں ایوان اور دروازے زرو جواہر سے منقش ہیں، اس قسم کے زیب و زینت پر وہ نہایت ہنر مندی اور محنت صرف کرتے ہیں۔"

اور مشہور مؤرخ آرٹی میڈوروس ۱۰۰ ق م باشندہ شہر افسس لکھتا ہے

"سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے جو ایک پر اشجار پہاڑ پر زنانہ خوش حالی (عیش و عشرت) میں واقع ہے میووں کی کثرت کے سبب سے لوگ سست اور ناکارہ ہو گئے ہیں، خوشبودار درختوں کی جڑوں میں لپٹے پڑے رہتے ہیں۔ جلانے کی لکڑی کے بدلے دار چینی اور خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں کچھ لوگوں کا پیشہ زراعت ہے اور کچھ ملکی و غیر ملکی مسالوں کی تجارت کرتے ہیں یہ مسالے مقابل کے حبشی ساحل سے لائے جاتے ہیں جہاں سبا کے لوگ چمڑے کی کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے پار چلے جاتے ہیں قرب و جوار کے قبائل سبا سے تجارتی اسباب خریدتے ہیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو دیتے ہیں اور اسی طرح دست بدست وہ شام اور جزیرہ تک پہنچتے ہیں۔"

(ارض القرآن ج ۲ ص ۵۴ ۔ ۵۲)

جَنَّتَانِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ

غرض یمن کی طبعی خصوصیات کے علاوہ جو اس ملک کی شادابی اور معتدل آب و ہوا کے لیے قدرتی وسائل کی شکل میں موجود تھیں ملک کے اندر اس "بند آب" نے ہمہ قسم کی راحت و عیش و عشرت کی زندگی کے لیے سامان فراہم کر دیے تھے اور ان سب چیزوں پر یہ مستزاد تھا کہ یمن سے شام تک جس مشہور شاہراہ امام مبین پر اہل سبا کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت تھی اس کے بھی دونوں جانب حسین و خوب صورت بلساں اور دار چینی کے خوشبودار درختوں کا سایہ تھا اور قریب قریب فاصلہ سے حکومت سبا نے ان کے سفر کو آرام دہ بنانے کے لیے کاروان سرائے بنا رکھی تھیں جو شام کے علاقہ تک ان کو اس آرام کے ساتھ پہنچاتی تھیں کہ خنک پانی اور میووں اور پھلوں کی افراط یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ اپنے وطن میں ہیں یا دشوار گذار سفر میں حتی کہ جب خوش گوار سایہ اور فرحت بخش ہوا میں ان کارواں سراؤں میں ٹھہر تا میوے اور تازہ پھل کھاتا اور سرد و شیریں پانی پیتا ہوا حجاز اور شام تک آمد و رفت رکھتا تو ہمسایہ قومیں رشک و حسد سے ان پر نگاہیں اٹھاتی اور حیرت و تعجب کے ساتھ ان کے اس عیش و عشرت پر انگشت بدنداں ہو جاتی تھیں جیسا کہ آپ ابھی ان کے معاصر مؤرخین کی زبان سے سن چکے ہیں کہ وہ کن الفاظ کے ساتھ ان کی اس خوش حالی کا

تذکرہ کر رہے ہیں اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بے حد ارزاں کر دیا تھا۔

ان تاریخی تصریحات کے بعد اب ہم کو قرآن عزیز کی ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے جو سبا کی اس خوش حالی کا ذکر کرتے ہوئے اس کو اہل سبا پر خدائے تعالیٰ کا عظیم الشان انعام واکرام اور احسان عظیم ظاہر کرتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ط بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۝

بلاشبہ اہل سبا کے لیے ان کے وطن میں قدرت الٰہی کی عجیب وغریب نشانی تھی دو باغوں کا (سلسلہ) داہنے بائیں اور خدا نے ان کو یہ فرمادیا تھا "اے سباوالو! اپنے پروردگار کی جانب سے بخشی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر کرو۔ شہر ہے پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشنے والا۔

ایک مرتبہ گذشتہ تاریخی تفاصیل کو اور مطالعہ کیجیے اور صرف مسلمان مؤرخین کی روایات کی روشنی میں نہیں بلکہ ان غیر مسلم مؤرخین کی معاصرانہ شہادتوں کی روشنی میں پڑھیے جو اسلام دشمنی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور پھر قرآن کی مسطورہ بالا آیت کا مطالعہ فرمائیے قرآن کہتا ہے کہ: سبا کے اپنے گھر ہی میں خدائے تعالیٰ کی بے نظیر اور عجیب وغریب نشانی موجود تھی وہ یہ کہ سینکڑوں میل تک ان کے شہر کے داہنے بائیں میووں پھلوں اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کا گنجان سلسلہ باغات کی شکل میں موجود تھا یہ خدائے تعالیٰ کا عطا کردہ رزق تھا جو آس پاس کی قوموں کے مقابلہ دو طرح سے ان کو بخشا گیا تھا ایک ملک کے طبعی خوص کے ذریعہ جو اللہ کی فطرۃ کے ہاتھوں سے معتدل ہوا سرد وخشک پانی عمدہ پھلوں اور پھولوں کی خودرد پیداوار اور خوشبودار چیزوں کے درختوں کی طبعی نشو ونما کی شکل میں ظاہر ہوا اور دوسرا آب رسانی کے بہتر طریقوں کی صورت میں جو درحقیقت خالق کائنات ہی کی عطا کردہ عقل وخرد اور فہم وذکا کا نتیجہ تھا پس اہل سبا کا فرض ہے کہ وہ اس خوش عیشی اور عافیت کوشی پر جو ان کو ان کے وطن ہی میں بے محنت حاصل ہے اس کے شکر گذار بندے بنیں، اگر وہ ان نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور خدا کے رشتہ کو مضبوط کرنے کے لیے اس کی مرضیات پر گامزن رہیں گے تو بلاشبہ انھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک جانب ان کی دنیا کی زندگی کے لیے ان کو ایسا عمدہ اور ہر طرح سے پاک صاف وطن حاصل ہے اور دوسری جانب ان کی حیات ابدی اور نجات اخروی کے لیے ان کا پروردگار بہت بخشنے والا ہے۔

اہل سبا اور خدا کی نافرمانی

اہل سبا اس ایک عرصہ تک تو اس جنت ارضی کو خدا کی عظیم الشان آیت ونعمت ہی سمجھتے اور حلقہ بگوش اسلام رہتے ہوئے احکام الٰہی کی تعمیل اپنا فرض یقین کرتے رہے لیکن تمول، خوش عیشی اور ہر قسم کے تنعم نے آہستہ آہستہ ان میں بھی وہی اخلاق ردیہ پیدا کر دیے جو ان کی پیشرو گذشتہ متکبر اور مغرور قوموں میں موجود تھے اور یہ یہاں تک ترقی کرتے رہے کہ انھوں نے دین حق کو بھی خیرباد کہہ دیا اور کفر وشرک کی سابق زندگی کو دوبارہ اپنالیا۔ تاہم رب غفور نے فوراً گرفت نہیں کی بلکہ اس کی وسعت رحمت نے قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) سے کام لیا اور انبیاء علیہم السلام نے ان کو راہ حق کی تلقین فرمائی اور بتایا کہ ان نعمتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم دولت، ثروت، اور جاہ وحشمت کے نشہ میں چور ہو کر مست ہو جاؤ اور نہ یہ کہ اخلاق کریمانہ کو

چھوڑ بیٹھو اور کفر و شرک اختیار کر کے خدا کے ساتھ بغاوت کا اعلان کر دو، سوچو اور غور کرو کہ یہ راہ بری ہے اور اس کا انجام برا انجام ہے۔

محمد بن اسحاق بروایت ابن منبہ کہتے ہیں کہ اس درمیان میں ان کے پاس خدائے تعالیٰ کے تیرہ نبی حق رسالت ادا کرنے آئے مگر انھوں نے مطلق توجہ نہ کی اور اپنی موجودہ خوش عیشی کو دائمی وراثت سمجھ کر شرک و کفر کی بدمستیوں میں مبتلا رہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

آخر تاریخ نے خود کو دہرایا اور ان کا انجام بھی وہی ہوا جو گذشتہ زمانہ میں خدائے برحق کی نافرمان قوموں کا ہو چکا ہے۔

سیل عرم

چنانچہ خدائے تعالیٰ نے ان پر دو قسم کا عذاب مسلط کر دیا جس کی بدولت ان کے جنت مثال باغات برباد ہو گئے اور ان کی جگہ جنگلی بیریاں خاردار درخت اور پیلو کے درخت آگ کر یہ شہادت دینے اور عبرت کی کہانی سنانے لگے کہ خدا کی پیہم نافرمانی اور سرکشی کرنے والی اقوام کا یہ حشر ہوتا ہے۔

پہلی سزا

ہوا یہ کہ وہ "بند" جس کی تعمیر پر ان کو بے حد ناز تھا اور جس کی بدولت ان کے دارالحکومت کے دونوں جانب تین سو مربع میل تک خوبصورت اور حسین باغات اور سرسبز و شاداب کھیتوں اور فصلوں سے یمن گلزار بنا ہوا تھا وہ خدا کے حکم سے ٹوٹ گیا اور اچانک اس کا پانی زبردست سیلاب بنا ہوا وادی میں پھیل گیا اور مارب اور اس تمام حصہ زمین پر جن میں یہ فرحت بخش باغات تھے چھا گیا اور ان سب کو غرق آب کر کے برباد کر ڈالا اور جب پانی آہستہ آہستہ خشک ہو گیا تو اس پورے علاقہ میں باغوں کی جنت کی جگہ پہاڑوں کے دونوں کناروں سے وادی کے دونوں جانب جھاؤ کے درختوں کے جنڈ، جنگلی بیروں کے جھانڈوں اور ان پیلو کے درختوں نے لے لی جن کا پھل بدذائقہ اور بکسا پن لیے ہوتا ہے۔

اور خدا کے اس عذاب کو اہل مارب اور قوم سبا کی کوئی قوت و سطوت نہ روک سکی اور بند باندھنے میں انجینئری اور علم ہندسہ کی مہارت فن کا جو ثبوت انھوں نے دیا تھا وہ اس کی شکستگی کے وقت سب ناکارہ ہو کر رہ گیا اور اہل سبا کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا کہ اپنے وطن مالوف اور بلدۂ طیبہ مارب اور نواح مارب کو چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔

قرآن عزیز نے اسی عبرت ناک واقعہ کو بیان کر کے عبرت نگاہ اور بیدار قلب انسان کو نصیحت کا یہ سبق سنایا ہے:-

فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ۝ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا ط وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ۝

پھر انھوں نے (قوم سبانے) ان پیغمبروں کی نصیحتوں سے منہ پھیر لیا۔ پس ہم نے ان پر بند توڑنے کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دو (عمدہ) باغوں کے بدلے دو ایسے باغ اگا دیے جو بدمزہ پھلوں جھاؤ اور کچھ بیری کے درختوں کے جھنڈ تھے یہ ہم نے ان کی ناشکر گذاری کی سزا دی اور ہم ناشکر قوم ہی کو سزا دیا کرتے ہیں۔

غور کیجیے کہ یہ سیلاب بہ اسباب ظاہر کس طرح آیا۔ کیا اس لیے کہ مارب کا بند کہنہ اور شکستہ ہو گیا تھا؟ نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس قسم کے مہندسین اور انجنیری کے ماہرین نے اس کو بنایا تھا سبا میں ان کی اس وقت بھی کمی نہ تھی اور وہ اس کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں سینکڑوں بند تعمیر کراتے رہے تھے پھر کیا وہ اس کہنگی اور شکستگی کا اتنا انتظام بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اگر اس کو اپنی طبعی عمر پر ٹوٹنا ہی ہے تو پانی کے زور کو اس طرح کم کر دیا جائے یا اس کے لیے تعمیر میں ایسے اضافے کر دیے جائیں کہ جس سے یہ اچانک شکست ہو کر اس مصیبت عظمٰی کا باعث نہ بن سکتا۔ پھر یہ سیلاب کیوں آیا کیا اس لیے کہ اس حقیقت کے جان لینے کے باوجود کہ یہ بند عنقریب شکستہ ہو کر اس داہیۂ کبریٰ کا باعث بننے والا ہے انھوں نے کاہلی اور سستی سے اس کی پرواہ نہیں کی تو تاریخ کی روشنی میں یہ بھی غلط ہے اس لیے کہ حکومت سبا کے متعلق جو معاصرانہ تاریخی شہادتیں مہیا ہیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اس بند کی مضبوطی استحکام اور ہر قسم کے حفاظتی امور کے بارے میں بہت مطمئن تھے اور برابر اس سے آبپاشی کا کام لے رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم و جدید تاریخیں اس ہولناک تاریخی واقعہ کے اسباب و علل کے بارے میں قطعاً خاموش ہیں اور اس لیے خاموش ہیں کہ سبا پر یہ عذاب بلاشبہ غیر متوقع اور اچانک آیا جس سے وہ خود بھی حیران و سراسیمہ ہو کر رہ گئے اور وہ اس کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکے کہ یہ جو کچھ ہوا اچانک غیبی ہاتھ سے ہوا کیونکہ بند کے استحکامات اور انتظامات میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی پھر یک لخت بند کا ٹوٹ جانا اور پانی کا سیلاب عظیم کی شکل میں پھیل کر تمام جنت نشان علاقہ کو تباہ و برباد کر دینا بجز عذاب الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے انھوں نے جب جائز اور پاک خوش عیشی کو عیاشی اور بداطواری میں بدل دیا، خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے غرور و تکبر کے ساتھ کفران نعمت کیا نبیوں اور پیغمبروں کے بار بار رشد و ہدایت پہنچانے کے باوجود شرک و کفر پر اصرار کی تو اچانک عذاب الٰہی آ کر ان کو تباہ و برباد نہ کرتا تو اور کیا ہوتا۔

فَأَعْرَضُوْا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ......... ○ ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ط وَهَلْ نُجَازِيْٓ إِلَّا الْكَفُوْرَ ○

ابن جریر ابن کثیر اور دوسرے اصحاب سیر نے اس موقع پر ایک اسرائیلی حکایت بیان کی ہے جس کو محمد بن اسحٰق نے وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جب سد مارب کو برباد کرنے کا ارادہ کر لیا تو بند کی بنیادوں میں بڑے بڑے گھونس پیدا کر دیے اور انھوں نے آہستہ آہستہ اس کی جڑوں کو کھو کھلا کرنا شروع کر دیا قوم سبا نے جب یہ دیکھا تو بند کی بنیادوں کے ہر ایک پایہ اور اس ستون سے بلیاں بندھوا دیں کہ اس خوف سے گھونس جڑوں کو کھوکھلا نہ کر سکیں گے۔

وہب بن منبہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں یہ پیشین گوئی درج تھی کہ اس سد کی بربادی گھونسوں کے ذریعہ ہوگی اس لیے جب انھوں نے سد میں گھونسوں کو دیکھا تو بلیاں باندھ دیں مگر جب خدائے تعالیٰ کی مشیت کے پورا ہونے کا وقت آیا گھونس اتنے منہ زور ہوگئے کہ وہ بلیوں سے گھبرانے کی بجائے ان پر حملہ آور ہونے لگا اور انھوں نے چند ہی روز میں بند آب جڑیں ہلادیں اور نتیجہ یہ نکلا کہ بند پانی کا زور برداشت نہ کر سکا اور سیلاب کی صورت میں بہہ نکلا اس روایت کو بعض راویوں نے بغیر سند کے حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت قتادہ کی جانب بھی منسوب کیا ہے۔

یہ روایت، اسرائیلی حکایت اور اسرائیلی داستان سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی اور اصول روایت و درایت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد ہے روایت کے لحاظ سے اس لیے قابل احتجاج نہیں کہ اس کے بعض طریقے بے سند ہیں اور بعض منقطع اور درایت کے اعتبار سے اس لیے اعتماد کے قابل نہیں کہ اس روایت میں سیلاب سے متعلق جو واقعہ درج ہے یعنی گھونس اور بلیوں کا معاملہ وہ صرف وہب بن منبہ کی روایت میں مذکور ہے اور وہب اسرائیلی روایات کے مدار ہیں نیز اگر سد مارب کی تباہی میں گھونسوں اور بلیوں کا یہ معرکہ بھی کچھ تعلق رکھتا تو قرآن واقعہ کی اس اہم کڑی کو کبھی نظر انداز نہ کرتا یا کم از کم کسی صحیح حدیث میں اس تفصیل کا تذکرہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں جس ملک میں ایسے ماہر انجینیر موجود ہوں جنوں نے مارب اور اس کے علاوہ یمن کے بہت سے حصوں میں بہترین "بندِ آب" اپنی فنی مہارت کی مدد سے بنائے ہوں ان کے متعلق عقل یہ کیسے باور کر سکتی ہے کہ جب ان کے علم میں یہ بات آئی ہو کہ اس بند آب کی بنیادیں گھونس کھوکھلا کر رہے ہیں تو بند کے استحکامات کی تمام ان حفاظتی تدابیر کو چھوڑ کر جو فن انجیزی اور استحکامات تعمیرات کے اصول پر ضروری تھیں صرف اس طفلانہ حرکت پر اکتفا کر لیا کہ بند کے ستونوں اور پایوں کے ساتھ بلیاں باندھ دیں پھر گھونس آزاد اور بلیاں مقید، یہ عجیب حفاظتی تدبیر کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔

اس روایت کے برعکس قرآن عزیز کی صنیع سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پر سیل عرم کا یہ عذاب اچانک آیا اور اس نے اس طرح مارب اور اطراف مارب کو تباہ کیا کہ اہل مارب کو سنبھلنے اور پیش آمدہ حالات کا صحیح اندازہ لگانے کا بھی موقع نہیں ملا۔ لہٰذا اگر چوہوں یا گھونسوں سے متعلق حکایت کو کسی درجہ میں تسلیم بھی کیا جائے تو واقعہ کی حقیقت صرف اسی قدر ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے موسم میں جب کہ یمن میں بارش بکثرت برستی ہے "بند آب" میں بڑے بڑے گھونسوں کی اتنی کثیر تعداد پیدا کر دی ہو جنھوں نے غیر معمولی طور پر چند ہی دنوں میں اس کو کھوکھلا کر ڈالا اور پانی کے زور نے یک لخت بند کو شکست کر کے سیلاب عظیم بپا کر دیا۔ اور قوم سبا اس حال سے ناواقف رہی اور اچانک حادثہ نے ان کو خانماں برباد کر کے ادھر ادھر منتشر کر دیا اگرچہ اس تفصیل کا ثبوت بھی کسی صحیح روایت سے نہیں ملتا۔

قرآن عزیز کا سیاق اور اس کا اسلوب بیان ان تمام روایات یا حکایات کا بھی انکار کرتا ہے جو محمد بن اسحٰق وغیرہ اصحاب سیر نے اس سلسلہ میں نقل کی ہیں کہ انصار اور بعض دوسرے قبائل یمن کے بعض بزرگوں کو پرانی کتابوں یا کاہنوں کے ذریعہ سے سیل عرم کے متعلق تفصیلی حالات معلوم ہو گئے تھے اور اس لیے وہ اس حادثۂ کبریٰ کے واقع ہونے سے قبل ہی مختلف حیلوں اور بہانوں سے یمن (مارب) چھوڑ کر یثرب، شام، اعراق جیسے

مقامات میں جا کر آباد ہو گئے تھے ابن اسحٰق وغیرہ کی روایات کا خلاصہ یہ ہے:

عمر بن عامر لخمی اور بعض دوسرے ابو القبائل کو پرانی کتابوں اور کاہنوں کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ شہر مارب پر سد کی شکست کی بدولت سخت بربادی آنے والی ہے اور اس سد کی شکست کا جب وقت آئے گا تو اول اس کی بنیادوں میں گھونس پیدا ہوں گے جو بنیادوں کو کھوکھلا کریں گے اور جب بند آب کمزور پڑ جائے گا تب برسات کے موسم میں ٹوٹ کر سینکڑوں میل تک سیلاب آ جائے گا اور مارب اور اس کے دونوں جانب میلوں تک حصۂ ملک تباہ و برباد ہو جائے گا چنانچہ سب سے اول عمرو بن عامر نے یہ دیکھا کہ چوہے یا گھونس بند آب کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں تب اس نے سمجھا کہ اب مارب کی بربادی کا وقت آ پہنچا اس لیے اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی قوم کو اصل حقیقت سے مطلع کیے بغیر کسی حیلہ سے ترک وطن کر کے کسی دوسری جگہ آباد ہو جانا چاہیے تا کہ آنے والی مصیبت سے محفوظ رہ سکیں اور بعض روایات میں ہے کہ عمرو کی بیوی بھی کاہنہ تھی اور اس واقعہ کی اطلاع اس نے پہلے سے ہی اپنے شوہر کو دیدی تھی لہٰذا اس نے یہ طے کر لیا کہ یہاں سے ترک وطن کر دینا چاہیے مگر یہ ایسے طریقہ سے ہو کہ قوم کو کسی طرح علم نہ ہو سکے ورنہ تو معاملہ بگڑ جائے گا، چنانچہ اس نے اپنے چھوٹے بیٹے کو تنہائی میں بلا کر یہ سمجھایا کہ میں ایک خاص ضرورت کے پیش نظر یہ چاہتا ہوں کہ کل جب میں مجلس میں تجھ سے کسی کام کے متعلق حکم کروں تو انکار کر دینا اس پر میں مصنوعی غصہ سے تیرے منہ پر طمانچہ ماروں گا تجھ کو بھی چاہیے کہ ادب و احترام کو بالائے طاق رکھ کر میرے منہ پر انتقامی طمانچہ لگائے اس کے بعد میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں کر سکوں گا۔

لڑکے نے باپ کا یہ انوکھا مشورہ سنا تو بے حد پریشان ہوا اور اس نے ایسی گستاخی کرنے سے انکار کر دیا لیکن باپ کے پیہم اصرار کے بعد اس کو منظور کرنا پڑا۔ چنانچہ دوسرے روز بر سر مجلس وہی صورت پیش آئی جو باپ بیٹے کے درمیان مشورہ سے طئے پائی تھی عمرو نے جب بیٹے کے ہاتھ سے طمانچہ کھایا تو بے حد مشتعل ہوا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اس کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑیگا۔ اہل مجلس نے اس کے غصہ کو فرو کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے نہ مانا آخر لڑکے کے ماموں دخل انداز ہوئے اور انھوں نے عمرو کو دھمکی دی کہ اگر تو اپنے بیٹے کو قتل کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر ڈالیں گے عمرو نے یہ سن کر انتہائی غم و غصہ کے ساتھ اہل مجلس کو اپنا یہ فیصلہ سنایا کہ جس ملک میں ایک باپ کو اپنے بیٹے کی سخت گستاخی کی سزا دینا ناممکن ہو ایسے ملک میں رہنا عبث ہے کہیں دور جا بسوں، یہ دیکھ کر لوگوں نے عمرو کی جائداد کو سستے داموں خرید لیا اور وہ مع اپنے اہل و عیال کے ترک وطن کر کے چلا گیا اور اسی طرح بعض دوسرے لوگ بھی حادثہ سے قبل ہی حادثہ کے خوف سے ترک وطن کر گئے۔

ان روایات کا اسلوب بیان خود بتا رہا ہے کہ یہ ایک فرضی داستان ہے جو داستان گوئی کے طرز پر بنالی گئی ہے نیز مستند تاریخی روایات سے بھی ان واقعات کی تائید نہیں ہوتی اور ان واقعات کے غیر مستند ہونے کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کا سیاق ان کے خلاف صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ سبا کے قبائل اور خاندانوں کا تفرق و انتشار سیل عرم کے حادثہ کے بعد وقوع میں آیا ہے نہ کہ واقعہ سے قبل۔

پس تعجب ہے مولانا حبیب الرحمان صاحب (مرحوم و مغفور) جیسے دور اس عالم پر، کہ انھوں نے "اشاعت اسلام" میں سبا اور سیل عرم پر مفصل و مدلل بحث کرتے ہوئے کس طرح ان داستانوں کو اہم روایات کی طرح بغیر

کسی نقد و تبصرہ کے بیان فرمادیا۔

غرض یہ روایات صحیح ہوں یاغلط یہ بات واضح ہے کہ سبا اپنے غرور و تکبر عیاشانہ کاہلی و غفلت اور کفر و شرک پراصرار سرکشی کے سبب سیل عرم کے ذریعہ اس طرح تباہ و برباد ہوئے کہ فن تعمیر اور استحکامات عمارات کی تمام مہارت اکارت اور رائگاں گئی اور وہ خود کو اس عذاب الٰہی سے نہ بچاسکے اور خدا کی مشیت پوری ہو کر رہی۔

دوسری سزا

مارب کے "بند آب" ٹوٹ جانے پر جب شہر مارب اور اس کے دونوں جانب کے علاقے سرسبز کھیتوں، خوشبودار درختوں اور عمدہ میووں اور پھلوں کے شاداب باغوں سے محروم ہو گئے تو ان بستیوں کے اکثر باشندے منتشر ہو کر کچھ شام، عراق اور حجاز کی جانب چلے گئے اور کچھ یمن کے دوسرے علاقوں میں جابسے مگر عذاب الٰہی کی تکمیل ہنوز باقی تھی اس لیے کہ سبا نے صرف غرور سرکشی اور کفر و شرک ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو نہیں ٹھکرایا تھا بلکہ ان کو یمن سے شام تک راحت رساں آبادیوں اور کارواں سراؤں کی وجہ سے وہ سفر بھی ناپسند تھا جس میں ان کو یہ محسوس نہیں ہو تا تھا کہ سفر کی صعوبتیں کیا ہوتی ہیں اور پانی کی تکلیف اور خورد نوش کی ایذا کس شے کا نام ہے اور قدم قدم پر میلوں تک دورویہ خوشبوؤں اور پھلوں کے باغات کی وجہ سے گرمی اور تپش کی زحمت سے بھی ناآشنا تھے۔

انھوں نے ان نعمتوں پر خدا کا شکر ادا کرنے کی بجائے بنی اسرائیل کی طرح ناک بھوؤں چڑھا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ انسان سفر کے ارادہ سے گھر سے نکلے تو یہ بھی نہ معلوم ہو کہ حالت سفر میں ہے یا اپنے گھر میں وہ بھی کیا خوش نصیب انسان ہیں جو ہمت مردانہ کیساتھ سفر کی ہمہ قسم کی تکالیف اٹھاتے، پانی اور خورد نوش کیلئے آزار سہتے اور اسباب راحت و آرام کے مہیانہ ہونے کی وجہ سے لذت سفر کا ذائقہ چکھتے ہیں، اے کاش ہمارا سفر بھی ایسا ہو جائے کہ ہم یہ محسوس کرنے لگیں کہ وطن سے کسی دور دراز جگہ کا سفر کرنے نکلے ہیں اور ہم دوری منزل کی تکالیف سہتے ہوئے حضر اور سفر میں امتیاز کر سکیں۔ بدبخت اور ناسپاس گذار انسانوں کی یہ ناشکری تھی جس کی تمناؤں اور آرزوں میں مضطرب ہو کر خدا کے عذاب کو دعوت دے رہے تھے اور اس کے انجام بد سے غافل ہو چکے تھے۔

سبا نے جب اس طرح کفران نعمت کی تکمیل کر دی تو اب خدائے تعالیٰ نے بھی ان کو دوسری سزا یہ دی کی یمن سے شام تک ان آبادیوں کو ویران کر دیا جو نزدیک نزدیک مسلسل چھوٹے چھوٹے قصبے گاؤں، کارواں سراؤں اور تجارتی منڈیوں کی صورت میں آباد اور ان کے راحت و آرام کی کفیل تھیں اور سفر کی ہر قسم کی صعوبتوں سے ان کو محفوظ رکھتی تھیں اور اس طرح اس پورے علاقہ میں خاک اڑنے لگی اور یمن سے شام تک نو آبادیوں کا یہ سلسلہ ویرانہ میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔

چنانچہ قرآن عزیز کی یہ آیات اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ط سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِيْنَ ○ فَقَالُوْا رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا

وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ○

ہم نے ان کے (ملک) اور برکت والی آبادیوں (شام) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں (کارواں سرائیں) مقرر کی تھیں، اور کہہ دیا تھا، چلو ان آبادیوں کے درمیان دن رات بے خوف و خطر، مگر انھوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ہمارے سفروں (منزلوں) کے درمیان دوری کر دے اور یہ (کہہ کر) انھوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا بس ہم نے ان کو کہانی بنادیا اور ان کو پارہ پارہ کر دیا بلاشبہ اس (واقعہ) میں عبرت کی نشانیاں ہیں صابر اور شکر گذار بندوں کے لیے۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ سبا کے مقابلہ میں عرصۂ دراز سے رومیوں کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح وہ بھی ہندستان اور افریقہ کے ساتھ عربوں کی طرح براہ راست تجارت کر کے بیش بہا فائدہ حاصل کریں مگر عرب کسی طرح ان کو اس کا موقع نہیں دیتے تھے اور ان تجارتی سواحل پر قابض تھے لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں رومیوں نے یکے بعد دیگرے مصر اور شام پر قبضہ کر لیا اور اب ان کو موقع ملا کہ وہ اپنے منصوبہ کو پورا کریں لیکن تجارتی مراکز کے لیے جو شاہراہ امام مبین عربوں نے بنا رکھی تھی وہ خشکی کی راہ تھی اور گذرنے والوں کے لیے عربوں سے واسطہ پڑنا لازمی تھا اور رومی ان پہاڑی راہوں کو عبور کرنے میں ویسے بھی دقت محسوس کرتے تھے اس لے انھوں نے عربوں کے خوف سے محفوظ رہنے کے لیے یہ کیا کہ ہندستان اور افریقہ کی تجارت کے بری راستہ کو بحری راستہ میں تبدیل کر دیا اور بحر احمر میں کشتیوں کے ذریعہ تمام مال مصر اور شام کی بندرگاہ پر اتارنے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ اس جدید طریق تجارت نے یمن سے شام تک سبا کی تمام نو آبادیوں کو برباد کر دیا اور وہاں چند دنوں میں ہی خاک اڑنے لگی اور سبا کی حکومت کا شیرازہ اس طرح بکھر گیا کہ وہ حقیقتاً ایک کہانی بن کر رہ گئے اور فجعلنہم اور [illegible] کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آگیا۔

اگر آپ تاریخ کا بغور مطالعہ کریں گے تو یہ بات حقیقت بن کر آپکے سامنے آجائے گی کہ سیل عرم کا واقعہ اور طریق سفر کی تبدیلی کی یہ صورت کہ جس کی وجہ سے یمن سے شام تک سبا کی نو آبادیاں برباد ہو کر رہ گئیں زمانہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں اور دونوں قسم کے عذاب کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہے۔

قرآن عزیز نے جب اہل عرب کو سبا اور ''سیل عرم'' کا یہ واقعہ سنایا تو اس وقت یمن کا ہر متنفس اس حقیقت کا بہ چشم خود مشاہدہ کر رہا تھا اور وہ تمام خاندان بھی جو حجاز، شام عمان، بحرین، نجد میں اس حادثہ کی بدولت پناہ گزین ہو گئے تھے اپنے آباء واجداد کے اس مرکز کی حالت زار کو دیکھ اور سن رہے تھے حتی کہ ہمدانی جو کہ چوتھی صدی ہجری کا سیاح مورخ ہے اپنی کتاب اکلیل میں یمن کے اس حصہ کے متعلق اپنی عینی شہادت پیش کرتا ہے کہ قرآن نے جنتان عن یمین وشمال کہہ کر جن باغوں کا ذکر کیا ہے بلاشبہ آج ان کی جگہ اس قدر کثرت سے پیلو کے درخت موجود ہیں کہ اتنی کثرت کے ساتھ اور کہیں نہیں پائے جاتے اور ان ہی درختوں کے ساتھ جھاؤ اور کہیں کہیں جنگلی بیر کے درخت بھی نظر آتے ہیں اور دیدۂ بینا اور گوش حق نیوش کو یہ کہہ کر سبا کی عبرت زا داستان

سناتے رہتے ہیں۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو

مولانا سید سلیمان نے ارض القرآن میں ابرہہ کے زمانہ کے کتبۂ عرم کا ذکر کرتے ہوئے کیا خوب فرمایا۔

''اس عصر تاریخی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت قابل شک واشتباہ ہے خدائے قرآن نے اپنے کلام معجز کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر دیا یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعۂ سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مل گیا ہے یہ عیسائی فاتح وہی ہے جو اپنے ہاتھیوں کے بل پر کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا لیکن آج اس دشمن کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبۂ مکرمہ کی کتاب مقدس کی تصدیق کے لیے بلند ہے۔ (ارض القرآن ج ا ص ۲۵۸۔۲۵۷)

اس کتبہ میں ان حالات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر ہے جو سبا کے دور میں سیل عرم کی وجہ سے ''بند آب'' کی شکستگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

الحاصل سبا کا یہ خاندان جو وسعت حکومت میں یمن (جنوبی عرب) اطراف شام و حجاز کی نو آبادیوں (شمالی عرب) اور حبشہ (افریقہ) پر حکمراں تھا ۱۱۵ق م کے پس و پیش حکومت سے بھی محروم ہو گیا اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور حبشہ پر اکسومی (سبا) خاندان نیا اور سملای عرب میں اسمٰعیلی عربوں نے اور خود یمن میں حمیری (سبا) خاندان نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ وانسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سبا))

اس جگہ یہ بات وضاحت ہے کہ سیل عرم کا سانحہ اور حادثہ سارے یمن پر پیش نہیں آیا تھا بلکہ یمن کے دارالحکومت مارب اور اس کے اطراف میں دونوں جانب سینکڑوں میل تک اس کا تباہی خیز اثر پڑا اور اس وقت صرف وہی قبائل ترک وطن پر مجبور ہوئے جو ان مقامات میں آباد تھے باقی ملک اور اس کے آباد باشندے یمن ہی میں مقیم رہے البتہ جب دوسرے عذاب نے رونما ہو کر پورے یمن کو اثر انداز کر لیا تب سبا کے باقی قبائل بھی منتشر ہونے پر مجبور ہوئے اور اس طرح ان کے اس مشہور خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ بات کہ سیل عرم کے حادثہ کا تمام قبائل یمن پر اثر نہیں پڑا تھا عرب اور غیر عرب مؤرخین دونوں کے یہاں مسلم ہے چنانچہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں

جب سیل عرم آیا تو تمام قبائل سبا یمن سے منتشر نہیں ہو گئے تھے بلکہ وہی قبائل منتشر ہوئے تھے جو مارب (دارالحکومت) میں مقیم تھے اور جن کے شہر میں مشہور مارب کا بند تھا اور عبد اللہ بن عباس کی روایات سے جو حدیث سابق میں ذکر ہو چکی ہے اس کا منشاء بھی یہی ہے کہ ان میں سے چار قبائل شام کے علاقوں میں جا بسے اور چھ قبائل یمن ہی میں مقیم رہے اور یمن میں مقیم قبائل، مذحج، کندہ، انمار، اشعر تھے اور انمار کی تین شاخیں تھیں، خثعم، بجیلہ اور حمیر یہی وہ سبائی قبائل ہیں جن میں سے سبا کے شکست وانتشار کے بعد یمن کے حکمراں ملوک اور تبابعہ پیدا ہوئے تا آنکہ ان سے حبشہ کے بادشاہ نے یمن چھین لیا اور اس پر قابض ہو گیا اور پھر واقعہ ولادت با

سعادت محمد ﷺ سے تھوڑے زمانہ قبل ہی پیش آیا جس کا تفصیلی ذکر ہم اپنے موقع پر کریں گے۔
(تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۹۱)

اور سبا کے جو قبائل و خاندان یمن سے نکل کر ادھر ادھر جا بسے تھے ان کی تفصیل دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

سبا کے قبائل میں سے غسانی قبائل کی ایک شاخ بصریٰ (شام) چلی گئی اور ایک شاخ خزانہ نے یثرب جاتے ہوئے بطن مر (تہامہ) کو شاداب دیکھ کر وہیں قیام کر دیا اور اوس و خزرج (انصار) یثرب (مدینہ) میں مقیم ہوگئے اور بنی ازد کا ایک حصہ عمان میں اور ایک وادی سراۃ میں جا بسا اور اسی طرح سبا کے یہ قبائل اقطاع و امصار عرب میں منتشر اور شذر و ندر پراگندہ ہوگئے۔
(تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۵۳۵ و تاریخ ج ۲ ص ۱۹۱)

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

شعبی کہتے ہیں کہ غسان، شام و عراق منتشر ہوگئے اور انصار (اوس و خزرج) یثرب (مدینہ) میں جا بسے اور خزاعہ، تہامہ (مکہ) میں اور ازد عمان میں جا بسے اور آس پاس منتشر ہو کر رہنے سہنے لگے۔
(تفسیر ابن کثیر ص ۵۳۹)

ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں:

عرب میں سبا کا یہ تفرق (انتشار اس درجہ مشہور اور عبرت ناک سمجھا جاتا ہے کہ جب اہل عرب کسی قوم یا خاندان کے تفرق و انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں " تفرقوا ایدی سبا و تفرقوا شذر و مذر " ان کا حال سبا کا سا ہو گیا وہ پارہ پارہ ہو کر رہ گئے۔ (ایضاً ص ۵۳۴)

چند تاریخی مباحث

۱) کتب سیر میں مذکور ہے کہ مارب کا بند سبا بن یعرب نے بنایا تھا مگر وہ اس کو پورا نہ کر سکا اور اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے اس کو مکمل کیا اور بعض کہتے ہیں کہ اس کو ملکہ سبا بلقیس نے تعمیر کرایا تھا لیکن یہ دونوں باتیں حقیقت سے بہت دور محض ظن و تخمین کی پیداوار تھیں، اس لیے کہ ماہرین علم الآثار نے سد کے کھنڈرات سے یہ پتہ چلایا کہ اس بند آب کے بنانے والوں کے نام سنگی کتبوں پر کندہ اسی بند کی شکستہ دیواروں پر موجود ہیں اور ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس بند کو سب سے پہلے ۸۰۰ ق م میں شیع امر بین بن سمعہلی نیوف (مکارب سبا) نے بنانا شروع کیا تھا مگر اس کے زمانہ میں تعمیر مکمل نہ ہو سکی اور اس کے بعد کے بادشاہوں نے اس کو پورا کیا، شیع امر کے علاوہ جو نام ان کتبوں سے پڑھے گئے وہ یہ ہیں سمعہلی نیوف بن ذمر علی (مکارب سبا) ذمر علی درح (ملک سبا) یدع ایل وتار۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سد مکارب سبا کے زمانہ سے شروع ہو کر ملوک سبا کے ابتدائی دور تک طویل عرصہ میں تعمیر ہو سکی ہے۔ (ارض القرآن ماخوذ مضمون از ماؤ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل ۱۸۷۴)

۲) ترمذی میں بروایت ابن عباس ایک حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک سائل نے نبی اکرم ﷺ سے

ا: تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۵۹۔

دریافت کیا کہ سبا کسی ملک کا نام ہے کسی عورت کا یا کسی مرد کا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مرد کا نام ہے جس کی نسل سے دس قبائل ہیں ان میں سے چار شام میں سکونت رکھتے ہیں اور چھ یمن میں یمنی قبائل مذحج، کندہ، ازد، اشعر، انمار، حمیر ہیں اور شامی قبائل میں لخم، جذام، عاملہ، غسان ہیں، ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب[1] کہا ہے اور ابن کثیر نے اس کے مختلف طرق روایت کو بیان کر کے بعض طریق روایت کو حسن قوی کہا ہے[2] اور ابن عبد البر نے انساب عرب پر بحث کرتے ہوئے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے۔

هذا اولىٰ ما قيل به في ذٰلك والله اعلم (ایضا ص ۱۰۶)

یہ روایت ان سب اقوال سے بہتر ہے جو اس سلسلہ میں کہے جا چکے ہیں۔

اس روایت سے قبائل مسطورۂ بالا کا قحطانی ہونا ثابت ہوتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ ان میں سے متعدد قبائل کے متعلق علماء انساب میں سخت اختلاف ہے کہ یہ عدنانی ہیں یا قحطانی تاہم انصار (اوس وخزرج) کے متعلق جو بلا شبہ بنی ازد ہیں تمام علماء انسب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ قحطانی الاصل ہیں[3] اور بخاری کی وہ حدیث کہ جس سے مصنف ارض القرآن نے ان کو عدنانی ثابت کرنا چاہا ہے بقول علامہ ابن حجر عسقلانی ہرگز اس کے لیے دلیل نہیں بن سکتی جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں اور نہ ہم کو کسی عالم نسب انصاری کا یہ قول نظر آیا کہ اس نے خود کو قحطانی الاصل تسلیم نہ کیا ہو البتہ یہ ممکن ہے کہ چونکہ نبی اکرم ﷺ عدنانی اسمٰعیلی ہیں اس لیے بعض انصار نے حصول شرف ومجد کے جذبہ میں مادری سلسلہ سے خود کو عدنانی (اسمٰعیلی) کہہ دیا ہو۔

یہ بیشک صحیح ہے کہ بعض عدنانی قبائل نے چونکہ یمن میں سکونت اختیار کرلی تھی اس لیے بعض قحطانی اور عدنانی قبائل کے درمیان علماء انساب میں اختلاف نظر آتا ہے اور قضاعہ کے عدنانی سے قحطانی بن جائے کا عجیب قصہ تو ابن عبد البر اور خود شعراء عرب نے بیان کیا ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنے بھانجہ خالد بن یزید بن معاویہ کے اس مناقشہ میں جو اس کے اور بنوامیہ کے درمیان پیش آگیا تھا خالد کے کہنے سے اول خود کو یمنی قبائل کا حلیف بنایا اور پھر یمنی الاصل (قحطانی الاصل) ہونے کے مدعی بن گئے۔

۳) قرآن حکیم نے سورۂ سبا میں سبا کی مذہبی حالت پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا کے طبقۂ اولیٰ کی ہر دو شاخوں کا مذہب یا آفتاب پرستی (ستارہ پرستی) رہا ہے اور یا پھر یہودیت (دین موسوی) اور طبقۂ ثانیہ کی ہر دو شاخوں میں یا صنم پرستی قومی مذہب رہا ہے اور یا عیسائی (یہودیت) بھی کبھی کبھی ان میں نظر آجاتی ہے، قرآن نے اصحاب اخدود کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے اس لیے کہ ذونواس حمیری (یہودی) یمن ہی کا بادشاہ تھا۔

۴) اہل عرب اس کے قائل ہیں کہ تمام قبائل عرب بلا استثناء صرف دو شخصوں کی نسل سے ہیں عدنان اور قحطان مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ توراۃ اور تاریخ ان دو سلسلوں کے علاوہ بعض دوسرے سلسلے بھی بیان کرتی

۱: تفسیر ج ۳۔
۲: الانباہ ص ۱۰۴۔
۳: ایضاً ص ۵۹۔۶۰۔

ہے بلکہ بعض صحیح روایات میں بنی جرہم کا بھی ذکر موجود ہے جو ان دونوں (قحطانی) اور عدنانی) سلسلوں سے الگ تیسرا سلسلہ ہے پھر علماء انساب کے پاس کونسی دلیل ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں ان دو سلسلوں کے سوا سب معدوم ہو گئے اور تمام قبائل عرب ان دو ہی سلسلوں میں منحصر ہو گئے ہیں؟

نبی اکرم ﷺ سے ایک ضعیف روایت سے اور حضرت عبد اللہ بن مسعود عبد اللہ بن عباس عمرو بن میمون اور محمد بن کعب قرظی سے بروایت قوی منقول ہے کہ جب وہ اس آیت کو تلاوت فرماتے ہیں وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ اور وہ لوگ جو ان (قوموں) کے بعد ہیں ان کو اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تو ارشاد فرمایا کرتے تھے " کذب النسابون "نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں یعنی انھوں نے بیچ میں بہت کچھ جھوٹ ملا دیا ہے۔

ابن عبد البر معرفت علم انساب کو مفید علم ثابت کرتے ہوئے اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے ان حضرات کا یہ جملہ قریش کے نسب کے لیے مخصوص ہو اور ان کا مطلب یہ ہو کہ اس سلسلہ میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے درمیان جو کڑیاں ہیں وہ تحقیقی نہیں ہیں اور اس میں نسابین کا جھوٹ شامل ہے مگر ہمارے نزدیک اس جملہ کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ اہل نسب کا یہ دعویٰ کہ وہ بنی آدم کے سلسلۂ انساب کے ماہر اور محقق ہیں اور کوئی سلسلہ ہماری نگاہ تحقیق سے نہیں چھوٹا صحیح نہیں ہے اور وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ اللہ کے سوا کون اس کا دعویٰ کر سکتا ہے (انتھیٰ) (القصد والامم لابن عبد البر ص ۱۹)

ہم ابن عبد البر کی اس توجیہ کی حرف بہ حرف تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عرب قبائل میں ایسے سلسلے موجود ہیں جو عدنانی اور قحطانی سے الگ ہیں اور اکثر علماء انساب ان میں تمیز کرنے سے قاصر رہے جیسا کہ ہم ابن کثیر کے حوالہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

چند تفسیری مباحث

۱) مفسرین کو عرم کے معنی میں بحث ہے اور وہ چند معنی بیان کرتے ہیں:

"گہرا پانی" "وادی" "سیلاب عظیم" "بند آب" شاہ عبد القادر نور اللہ مرقدہ نے سیلاب عظیم مراد لیا ہے فرماتے ہیں پس بھیجی ہم نے ان پر روزور کی اور مصنف ارض القرآن فرماتے ہیں کہ جس کو عرب حجاز سدّ کہتے ہیں اسی کو عرب یمن عرم کہتے ہیں ہمارے نزدیک زیادہ صحیح اور موقع کے مناسب یہی معنی ہیں اور جب کہ لغت عرب میں عرمة کے معنی بند آب کے آتے ہیں تو دوسرے معانی کی جانب توجہ غیر ضروری ہے العرمة سد یعترض به الوادی[۱] اس معنی کے دلچسپ اور مناسب حال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اسطرح قرآن عزیز میں بند آب کا ذکر ثابت ہو جاتا ہے اور دوسرے معانی اگر مراد لیے جائیں تو ان سے صرف یہ لازم آتا ہے کہ کوئی بند آب ہو گا جس کو سیلاب بہا کر لے گیا بند آب کا ذکر صراحةً ثابت نہیں ہوتا۔

کسی خطۂ زمین میں باغوں کا ہونا گو خوش عیشی کی دلیل ہے لیکن گذشتہ تفاصیل سے یمن کے طبعی خواص اور

۱: الانباہ ص ۴۹۔

پھر بند آب کے عجیب وغریب طرز تعمیر نے سینکڑوں میل تک مارب کے داہنے بائیں مسلسل پھلوں پھولوں اور میووں کے بے شمار باغات نے جو صورت حال پیدا کر دی تھی، اس کے متعلق غیر مسلم مؤرخوں کی شہادتیں بھی یہ بتا رہی ہیں کہ مارب اور یمن کا یہ علاقہ دنیا میں فردوس نظیر بن گیا تھا اور ان کے ملک کی یہ صورت حال خدائے تعالیٰ کے خصوصی کرم کی رہینِ منت تھی اسی لیے قرآن عزیز نے اس کو خدا کی نشانی کہا ہے لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۔

۳) ان آیات میں ہے بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ شہر ہے پاک اور پروردگار ہے بخشنے والا اور اس کے بعد فَاَعْرَضُوا پس انہوں نے خدا سے روگردانی کی ان دونوں جملوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبا پہلے مسلمان تھے اور احکام الٰہی کے مطیع و فرماں بردار مگر آہستہ آہستہ انھوں نے نافرمانی اور کفر اختیار کر لیا جیسا کہ اس آیت سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام اور کفر کے یہ دو زمانے ان پر کب طاری ہوئے تاکہ ان آیات کی تفسیر واقعات تاریخی کی روشنی میں کی جا سکے۔

اس سوال کا حل یہ ہے کہ سورۂ سبا سے قبل سورۂ نمل میں قرآن عزیز نے ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعات میں یہ بیان کیا ہے کہ ملکۂ سبا اور اس کی قوم پہلے آفتاب پرست اور مشرک تھی مگر حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت وارشاد پر اس نے اسلام قبول کر لیا اور تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اپنی زندگی میں سریر آرائے سلطنت رہی اور تمام قوم اس کی مطیع و فرماں بردار تھی پس جو اصحاب بصیرت اس زمانہ کی قوموں کے مذاہب کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد ملکہ کا سلطنت پر قائم رہنا اس کی واضح اور روشن دلیل ہے کہ ملکہ کے ساتھ اس کی قوم بھی ایمان لے آئی تھی۔

آپ نبی اکرم ﷺ کے ان نامہائے مبارک کے ان جملوں کو پڑھیے جو آپ ﷺ نے شاہان عالم کے نام دعوت اسلام کے سلسلہ میں بھیجے ہیں فان تولیت فعلیك اثم اليريسين، فان تولیت فعلیك اثم القبط، فان تولیت فعلیك اثم المجوس اے شاہان روم وایران ومصر اگر تم نے خدا کی دعوت حق کا انکار کر دیا تو تمہاری رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہاری گردن پر رہے گا، یہ آپ ﷺ نے کیوں ارشاد فرمایا صرف اس لیے کہ قدیم شخصی حکومتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی قومی حکومتوں میں جو مذہب بادشاہ کا ہوتا تھا وہی پوری قوم کا مذہب بن جاتا تھا اور بعض اقوام میں تو بادشاہ "خدا کا مظہر" سمجھا جاتا تھا لہٰذا کسی بات کو اس کا قبول کر لینا گویا رعایا کے لیے خدا کے حکم کی برابر تھا۔

بہرحال ۹۵۰ ق م میں سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور صدیوں تک انھوں نے اس امانت الٰہی کو سینہ سے لگائے رکھا لیکن گذشتہ قوموں کی طرح جب انھوں نے اس سے روگردانی شروع کی اور دوبارہ شرک اختیار کیا تب خدا کے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانہ میں آکر ان کو رشد وہدایت کی جانب متوجہ کیا۔ غالباً یہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو بذات خود یا اپنے نائبوں کے ذریعہ ان کو ہدایت کی جانب بلاتے رہے ہیں مگر انھوں نے عیش وعشرت، دولت، ثروت اور حکومت وشوکت کے نشہ میں کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ بنی اسرائیل کی طرح خدا کی نعمتوں کو ٹھکرانے لگے تب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک صدی پہلے خدا کی جانب سے سیل عرم اور آبادیوں کی تباہی کا عذاب آیا اور اس نے سبا کے خاندان کو پارہ پارہ کر دیا۔

ایک یونانی مؤرخ تھیو فرستیسنس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تین سو بارہ برس پہلے اور سبا کا معاصر تھا لکھتا ہے۔

"یہ ملک سبا سے متعلق ہے جو بخورات کی بڑی حفاظت کرتے ہیں ان بخورات کا ڈھیر آفتاب کے ہیکل میں لایا جاتا ہے جو اس ملک میں نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے۔

(ارض القرآن ج ۲ ص ۲۳ ماخوذ از ہیرن کی ہنار یکل ریسرچیز ج ۱ ص ۳۵)

اور علمائے اسلام میں سے ماہرین علم الآثار نے دوسری یا تیسری صدی ہجری میں یمن کے ایک کتبہ میں پڑھا تھا۔

هذا ما بنى شمرير عش سيدة الشمس۔ (تاریخ حمزہ اصفہانی ص ۱۱۰ کلکتہ)

یہ شمر یرعش بادشاہ نے سورج دیبی کے لیے بنایا ہے۔

۴) سورۂ سبا کی ان ہی آیات میں ہے وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا مفسرین نے ان برکت والی بستیوں کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں ان میں سے صحیح قول یہ ہے کہ اس سے شام کی بستیاں مراد ہیں اس لیے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ ان ہی بستیوں پر صادق آتا ہے جن کا تعلق یمن سے شام تک تجارتی شاہراہ سے تھا مجاہد حسن قتادہ، سعید بن جبیر بن زید (رحمہم اللہ) وغیرہ یہی تفسیر کرتے ہیں۔

يعنى قرى الشام يعنون انهم كانوا يسيرون من اليمن الى الشام فى قرى ظاهرة متواصلة۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۳)

برکت والی بستیوں سے شام کی بستیاں مراد ہیں۔ یعنی وہ یمن سے شام تک امن و اطمینان کے ساتھ ان بستیوں میں ہو کر گذرتے ہیں جو اسی غرض سے قریب قریب بنائی گئی ہیں کہ ان کا سفر آسان اور خوش گوار رہے،

اور ابن کثیر قُرًى ظَاهِرَةً کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اى بينة واضحة يعرفها المسافرون ويقيلون فى واحدة و يبيتون فى اخرىٰ۔

یعنی ایسی بستیاں جو مسافروں (تاجروں) اور سیاحوں کے لیے ہی قریب قریب بنائی گئی تھیں اور جن کو وہ اچھی طرح پہچانتے تھے کہ ایک بستی میں دوپہر آرام سے گذاری تو شب باشی کے لیے دوسری بستی میں پہونچ گئے۔

۵) مفسرین (رحمہم اللہ) جب سبا کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہیں تو "سیل عرم" اور "قرى ظاهرة" یعنی یمن سے شام تک پھیلی ہوئی سبا کی نو آبادیات کی بربادی دونوں ہی کا تذکرہ کرتے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ تاریخ کے اس پہلو نہیں ہے جو رومیوں کے تجارتی راہ بدل دینے سے سبا کو پیش آیا اور خود سبا کی اس مانگ پر رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا خدا نے ان کو اس حالت میں بدل دیا کہ وہ تلاش معاش کے لیے دیگر قبائل عرب کی طرح سفر کے مصائب جھیلتے پھریں اور ان کو عبرت کی کہانی بنادیا اور پارہ پارہ کر دیا۔ مگر ہم گذشتہ سطور میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ چونکہ بری تجارتی شاہراہ سے بحری راہ کی وہ تبدیلی کہ جس کے نتیجہ میں سبا کی نو آبادیاں بہت جلد برباد ہو گئیں اور سبا کا یہ خاندان حکومت پارہ پارہ ہو گیا تقریباً اس ہی

زمانہ میں پیش آیا جو زمانہ سیل عرم کا تھا خواہ تبدیلی راہ کی داغ بیل اس سے بہت پہلے یونانیوں کے ہاتھوں پڑی ہو پس مفسرین اگرچہ قری ظاہرۃ کی بربادی میں تجارتی راہ کی تبدیلی کا تذکرہ نہیں کرتے مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ سیل عرم اور یمن سے شام تک کی سبائی آبادیوں کی بربادی دو جدا جدا معاملے ہیں یہ نہیں ہے کہ بند آب کے ٹوٹ جانے سے یہ تمام نو آبادیاں بھی برباد ہو گئی تھیں جیسا کہ ہم ابن کثیر سے سابق میں نقل کر چکے ہیں کہ سیل عرم کے بعد بھی مارب کے علاوہ یمن کے دوسرے حصوں میں قبائل یمن آباد تھے۔ لہٰذا قرآن کا فیصلہ مفسرین کے علی الرغم نہیں ہے جیسا کہ مصنف ارض القرآن نے سمجھا ہے۔

نتائج وعبر

ا) اللہ تعالیٰ نے قرآن عزیز میں موعظت ونصیحت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

الف تذکیر بآلاء اللہ یعنی خدائے تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جن نعمتوں کی ارزانی فرمائی ہے ان کو یاد کر کے خدا کے احکام کی پیروی کی جانب متوجہ کرنا سورۂ اعراف میں ارشاد ہے۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ

پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے مت پھرو۔

ب) "تذکیر بایام اللہ" یعنی ان گذشتہ قوموں کے حالات بیان کر کے نصیحت وعبرت دلانا جنھوں نے یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت وانقیاد کی وجہ سے کامرانی اور فلاح دارین حاصل کی اور یا سرکشی وطغیان کی انتہا پر پہنچ کر ہلاکت وتباہی مول لی اور عذاب الٰہی کی مستوجب قرار پائیں یا بالفاظ دیگر قوموں کے عروج وزوال کو پیش کر کے سامان عبرت مہیا کرنا۔ سورۂ ابراہیم میں ہے:

وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ

اور اے پیغمبر ان کو نصیحت کیجئے قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ یاد دلا کر۔

ج) "تذکیر بآیات اللہ" یعنی مظاہر قدرت کی جانب توجہ دلا کر خالق کائنات کی ہستی اور اس کی وحدت کا اعتراف کرانا اور تصدیق حق کے لیے اپنی نشانیوں (معجزات آیات قرآنی) کے ذریعہ چشم بصیرت وا کرنا۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ

اور زمین اور آسمان میں خدا کے بہت سے نشانات ہیں کہ جن پر وہ بے توجہی کے ساتھ گزر جاتے ہیں اور پرواہ بھی نہیں کرتے۔

د) "تذکیر بما بعد الموت" یعنی برزخ اور قیامت کے حالات سنا کر عبرت دلانا سورۂ ق میں ہے۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ

پس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرو اس شخص کو جو خدا کی وعید یعنی بعد الموت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

پس قوم سبا کا یہ واقعہ تذکیر بایام اللہ سے تعلق رکھتا ہے اور ہم کو یہ عبرت دلاتا ہے کہ جب کوئی قوم عیش و راحت اور ثروت و طاقت کے گھمنڈ میں آکر نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے تو اول خدائے تعالیٰ اس کو مہلت دیتا اور اس کو راہ راست پر لانے کے لیے اپنی حجت کو آخری حد تک پورا کرتا ہے پس اگر وہ اس پر بھی قبول حق کی دشمن رہتی اور بغاوت و سرکشی کے اس اعلیٰ معیار پر پہنچ جاتی ہے کہ اس کو خدا کی نعمتیں اور عطا کردہ راحتیں بھی ناگوار گذرنے لگتی ہیں اور وہ ان کو ٹھکرانے لگتی ہے تو پھر قانون گرفت اپنا فولادی پنجہ آگے بڑھاتا اور ایسی بدبخت قوم کو پارہ پارہ کر دیتا اور ہلاکت و بربادی کے چرخ پر اتار دیتا ہے اور ان کا سارا کروفر دنیا کے سامنے صرف ایک کہانی بن کر رہ جاتا ہے۔

سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ

اصحاب الاخدود (یا) قوم تبع

۵۲۵ء

اخدود	اصحابِ اخدود اور قرآن حکیم
واقعہ کی تفصیلات	تنقید و تبصرہ
تبع عرب کی دو حکایتیں	چند تفسیری نکات
بصائر و عبر	

اخدود؟

''خدیا اخدود'' کے معنی گڑھے، کھائی اور خندق کے ہیں یہ مفرد ہے اور اس کی جمع ''اخادید'' آتی ہے، چونکہ زیر بحث واقعہ میں کافر بادشاہ اور اس کے امراء و اعیان سلطنت نے خندقیں اور گڑھے کھدوا کر اور ان کے اندر آگ دہکا کر عیسائی مومنوں کو ان میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا اس نسبت سے ان کافروں کو ''اصحاب اخدود'' کہا جاتا ہے۔

اصحاب اخدود اور قرآن حکیم

اصحاب اخدود کا تذکرہ قرآن حکیم میں سورۂ بروج میں کیا گیا ہے اور اجمال و اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر پر اکتفا کیا گیا ہے جو رشد و ہدایت کے لیے باعث موعظت و بصیرت ہے۔

وہ کہتا ہے کہ محمد ﷺ کی بعثت سے قبل ایک مقام پر حق و باطل کا معرکہ پیش آیا۔ ایک جانب خدا کے مومن بندے تھے جن کے پاس اگرچہ مادی قوت و طاقت نہیں تھی اور وہ اس لحاظ سے ضعیف و کمزور تھے مگر ایمان اور حق و صداقت کی قوت اور خدا کے نام پر ایثار و فداکاری کی طاقت کے مالک تھے، دوسری جانب میں ایمان باللہ اور قبول حق سے محرومی تھی مگر مادی شوکت و صولت اور قاہرانہ طاقت کی فراوانی تھی ان حالات میں کافر و مشرک طاقت نے مومنوں کی ایمانی قوت اور قبول حق کی طاقت کو دعوت مبارزت دی کہ یا وہ ایمان باللہ کو ترک کر کے شرک و کفر پر واپس آجائیں ورنہ دنیا سے فنا ہو جانے کے لیے تیار ہو جائیں مومنین صادقین نے اس دعوت مبارزت (چیلنج) کو ایمانی جرأت کے ساتھ قبول کیا اور ایمان باللہ کی روشنی سے نکل کر شرک و کفر کی تاریکی میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔

یہ دیکھ کر کافر جماعت کی جانب سے حاکمانہ طاقت اور قاہرانہ جبروت کے ساتھ شہر کے مختلف حصوں میں خندقیں کھودی جا رہی ہیں خندقوں کے اندر آگ دہک رہی ہے شعلے بھڑک رہے ہیں اور زمین کا اکثر حصہ کرۂ نار بنا ہوا ہے اب مومن جماعت کے غیور اور فداکار انسان کشاں کشاں لائے جا رہے ہیں، وہ جگہ جگہ خندقوں کے

دبانوں پر کھڑے کر دیے گئے ہیں اور کفر و شرک اپنی مادی قوت کے بل پر کہہ رہا ہے کہ یا مجھ کو قبول کر و ورنہ بھڑ کتی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے گڑھوں کی نذر کر دیے جاؤ گے، یہ سن کر مومن جماعت کہتی ہے جہنم کی آگ کے مقابلہ میں تمہارا آگ کا یہ عذاب ایک کھیل ہے اس لیے ایمان باللہ جہنم کی آگ کے مقابلہ میں بخوشی اس کو قبول کرتا ہے مگر شرک و کفر کو ایک لمحہ کیلیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کفر وشرک کی طاقت یہ سن کر لاجواب ہو جاتی مگر غیظ و غضب میں آ کر فداکاران توحید کو زندہ نذر آتش کر دیتی ہے اور اس طرح حق کو فتح و کامرانی اور باطل کو شکست و ناکامی ہو جاتی ہے کیونکہ جو دنیا والوں کی نظر میں خندقوں کے اندر دہکتی آگ میں جلا دیے گئے وہ جلے اور مرے نہیں بلکہ زندۂ جاوید بن کر ابدی جنت اور سرمدی بہشت سے نوازے گئے اور جو اپنی دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر نکوکار انسانوں پر بجھ جانے اور فنا ہو جانے والی آگ دہکا رہے تھے وہ ابدی اور دائمی آگ جہنم کے مستحق قرار پائے انھوں نے دنیا میں آگ کی بھٹی روشن کی اور مومنین صادقین کو اس کا ایندھن بنایا خدائے تعالیٰ نے عالم آخرت میں ایک ہولناک بھٹی (جہنم) روشن کر رکھی ہے جس کا ایندھن کافر و مشرک ہونگے، جابر و ظالم ہوں گے ان کی بھٹی کو بہ عجلت یا بہ دیر بجھ جانا، فنا ہو جانا ہے لیکن خدا کی دہکائی ہوئی بھٹی کو خلود اور ہمیشگی حاصل ہے وہ نہ بجھے گی اور نہ فنا ہو گی کفر و شرک نے دنیا کی طاقت پر گھمنڈ کیا مگر اس کا نتیجہ عذاب الحریق اور عذاب جہنم ہے اور ایمان باللہ نے خدا کی طاقت پر بھروسہ کیا تو اس کا نتیجہ الفوز الکبیر اور جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

غرض سورۂ بروج میں یہ واقعہ معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح مذکور ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ○ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ○ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ○ قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُوْدِ ○ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ○ إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ○ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ○ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ إِلَّآ أَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ○ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ إِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ○ إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ○ (البروج، ۸۵: ۱-۱۱)

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں اور اس دن کی جس کا وعدہ ہے اور اس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اس دن کی جس کے پاس حاضر ہوتے ہیں مارے گئے کھائیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی جب وہ اس پر بیٹھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان سے بدلہ نہیں لیتے تھے مگر صرف اس بات کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں کا مستحق ہے جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ کے سامنے ہے ہر چیز

بیشک جو ایمان سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر توبہ نہ کرے تو ان کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور ان کیلئے عذاب ہے آگ میں جلنے کا بیشک جو لوگ یقین لائے (اللہ پر) اور انھوں نے بھلائیاں کیں ان کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں یہ ہے بہت بڑی کامرانی۔

واقعہ کی تفصیلات

مفسرین نے ان آیات کی تفسیر میں متعدد واقعات نقل کیے ہیں مگر ان میں سے دو زیادہ مشہور ہیں ایک کا ذکر امام احمدؒ نے مسند میں امام مسلم نے صحیح میں اور نسائی و ترمذی نے سنن میں کیا وہ یہ کہ حضرت صہیب رومی فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا گذشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا اس کے دربار میں ایک جادوگر تھا جب وہ بہت بوڑھا ہو گیا تو ایک روز اس نے بادشاہ سے کہا میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور موت کا وقت قریب ہے اس لیے میری خواہش ہے کہ آپ ایک فہیم و زیرک لڑکا میرے حوالہ کر دیں تا کہ میں اس کو اپنا یہ فن (سحر) سکھا کر اپنی زندگی ہی میں کامل کر دوں چنانچہ بادشاہ نے ایک لڑکے کو اس کے سپرد کر دیا اور اس نے ساحر سے سحر کی تعلیم شروع کر دی۔ بادشاہ کے محل اور ساحر کے مکان کے درمیان ایک راہب[1] کی کٹی تھی ایک مرتبہ لڑکا اس راہب کے پاس چلا گیا اور اس کی باتوں اور اس کے طریقوں کو دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور اس کے پاس آنے جانے لگا۔ یہاں دیر ہونے لگی تو ساحر اور بادشاہ مقررہ آمد و رفت میں تاخیر کرنے پر برفروختہ ہوئے لڑکے نے راہب سے اس کی شکایت کی راہب نے کہا کہ اس معاملہ کے مخفی رکھنے کی صرف یہ صورت ہے کہ جب بادشاہ باز پرس کرتے تو یہ عذر کر دینا کہ ساحر کے یہاں تاخیر ہو گئی اور جب ساحر ناراض ہو تو یہ کہہ دینا کہ بادشاہ کے پاس تاخیر ہو گئی۔

غرض یہ سلسلہ عرصہ تک یوں ہی جاری رہا کہ ایک مرتبہ لڑکے نے دیکھا کہ راہ میں بہت ہیبتناک اور عظیم الجثہ درندہ لوگوں کی راہ روکے ہوئے ہے اور کسی کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کے سامنے سے گذر جائے لڑکے نے سوچا کہ یہ بہترین وقت ہے اس بات کا کہ میں جانچ کروں آیا ساحر کا مذہب سچا ہے یا راہب کا دین یہ سوچ کر اس نے ایک پتھر اٹھایا اور کہنے لگا "خدایا! اگر تیرے نزدیک ساحر کے مقابلہ میں راہب کا دین سچا ہے تو میرے اس پتھر سے تو اس جانور کو ہلاک کر دے" یہ کہہ کر اس نے جانور کو پتھر مارا پتھر کا لگنا تھا کہ وہ وہیں ہلاک ہو گیا لڑکا چل دیا اور راہب سے جا کر سارا ماجرا کہہ سنایا راہب نے کہا صاحب زادے تم مجھ پر فضیلت لے گئے مجھے ڈر ہے کہ تم آزمائش میں ڈالے جاؤ گے، دیکھو وہ وقت آئے تو میرا ذکر نہ کرنا۔ لوگوں نے لڑکے کی اس جرأت کو دیکھ کر چرچا کیا اور کہنے لگے کہ اس کو عجیب و غریب علم آتا ہے یہ سن کر اس کے پاس اندھے اور جذامی آنے لگے اور انہوں نے کہا کہ اپنے علم کے زور سے ہم کو اچھا کر اور وہ خدا کے فضل سے اچھا کر دیتا تھا۔ بادشاہ کا ایک درباری مصاحب نابینا ہو گیا تھا اس نے جو لڑکے کا چرچا سنا تو تحفے تحائف کا بہت بڑا سامان لے کر اس کے پاس آیا اور تحفے پیش کرتے ہوئے بینا کر دینے کی درخواست کی۔ لڑکے نے جواب دیا، میں کچھ نہیں ہوں اور نہ مجھ میں یہ طاقت ہے بلکہ شافی مطلق تو خدائے واحد ہے پس اگر تو ایمان لے آئے اور اس واحد و یکتا کے سوا کسی کی پرستش نہ کرے تو میں ضرور تیری سفارش کے لیے دعاء کروں گا درباری یہ سن کر خدائے واحد پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس

[1]: الانباہ ص ۴۹۔

کو شفاء عطا فرمائی اور وہ بینا ہو گیا اگلے دن جب وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے نابینا کو بینا پایا، تب بادشاہ نے سوال کیا کہ اپنے بینا ہونے کی حقیقت بیان کر اس نے جواب دیا میرے رب نے مجھ کو شفا بخش دی" بادشاہ نے کہا تیرا رب تو میں ہوں میں نے تجھ کو اچھا کر دیا؟ درباری نے جواب دیا نہیں تیرے میرے اور کل جہان کے پروردگار نے مجھ کو اچھا کر دیا بادشاہ نے (غصہ میں آکر) کہا کیا میرے سوا بھی کوئی تیرا رب ہے درباری نے کہا جی ہا اللہ تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے تب بادشاہ نے اس کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا آخر اس نے لڑکے کا ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا "بیٹا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو سحر کے ذریعہ سے اندھوں کو بینا اور مبروص اور جذامی کو شفاء دیتا ہے" لڑکے نے کہا "مجھ میں یہ طاقت کہاں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے شفاء دینے سے شفایاب ہوتے ہیں" بادشاہ نے کہا "کیا میرے علاوہ بھی تیرا اور کوئی رب ہے؟" لڑکے نے کہا "وہ خدا جو واحد و یکتا ہے تیرا اور میرا دونوں کا رب ہے" تب بادشاہ نے اس کو عذاب میں مبتلا کرنا شروع کر دیا آخر اس نے راہب سے متعلق تمام واقعہ کہہ سنایا تب بادشاہ نے راہب کو بلایا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ دین حق سے پھر جائے مگر راہب نے کسی طرح اس کو قبول نہیں کیا تب بادشاہ نے اس کے سر پر آرہ چلوا دیا اور اس طرح اس کو شہید کر ڈالا۔ اب لڑکے سے کہا کہ تو راہب کے دین سے پھر جا لڑکے نے بھی صاف انکار کر دیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر وہاں سے گرا دو کہ پاش پاش ہو جائے جب سرکاری آدمی لڑکے کو پہاڑ پر لے کر چڑھے تو لڑکے نے دعا کی "الٰہی تو ان لوگوں کے مقابلہ میں میرے لیے کافی ہو جا، چنانچہ اسی وقت پہاڑ زلزلہ میں آگیا اور سرکاری آدمی گر کر ہلاک ہو گئے اور لڑکا صحیح و سالم بچ کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہو گیا بادشاہ نے یہ دیکھا تو کہا کہ تیرے ساتھ والے کہاں گئے؟ لڑکے نے کہا خدا نے ان کے مقابلہ میں میری مدد کی تب بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو لے جاؤ اور دریا میں لے جا کر غرق کر دو سرکاری آدمی جب اس کو دریا کے بیچ میں لے کر پہنچے تو لڑکے نے پھر وہی دعاء کی "خدایا ان سے مجھ کو نجات دے" فوراً ہی دریا میں جوش آیا اور وہ سب غرق ہو گئے اور لڑکا پھر بچ گیا اور صحیح تندرست بادشاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا، بادشاہ نے پھر سوال کیا اور لڑکے نے پھر وہی جواب دیا اور اس مرتبہ وہ کہنے لگا" بادشاہ اس طرح تو ہرگز مجھ پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا البتہ جو ترکیب میں بتاؤں اگر اس کو اختیار کرے تو بیشک تو مجھ کو قتل کر سکتا ہے، بادشاہ نے لڑکے سے وہ ترکیب دریافت کی لڑکے نے کہا: "تو شہر کی تمام مخلوق کو بلند جگہ پر جمع کر، جب سب جمع ہو جائیں تو اس وقت مجھ کو درخت پر سولی دینا اور میرے ترکش سے تیر لے کر اور یہ پڑھ کر میرے سینے پر مارنا "بسم اللہ رب الغلام" اللہ کے نام پر جو اس لڑکے کا پروردگار ہے تب میں مر سکتا ہوں۔ بادشاہ نے لڑکے کے قول پر عمل کیا اور جب تمام شہر جمع ہو گیا تو لڑکے کو سولی پر لٹکا کر اور لڑکے کی بتائی ہوئی عبارت پڑھ کر اس کے تیر مارا اور لڑکا تیر کھا کر جان بحق ہو گیا، مخلوق نے یہ دیکھا تو سب نے ایک دم با آواز بلند نعرہ لگایا "امنا برب الغلام ۔ امنا برب الغلام" ہم لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے اور سب مسلمان ہو گئے درباری کہنے لگے بادشاہ جس بات کا تجھ کو خوف تھا آخر وہی ہو کر رہی اور یہ تمام رعایا مسلمان ہو گئی بادشاہ یہ دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گیا اور اس نے حکم دیا کہ شہر کے ہر ایک محلہ اور گلی کوچہ میں خندقیں کھودو اور ان میں خوب آگ دہکاؤ اور پھر ہر محلہ کے لوگوں کو جمع کرو اور ان سے کہو کہ وہ اس دین سے باز آجائیں جو باز آجائے اس کو چھوڑ دو اور

جو انکار کرتا جائے اس کو دہکتی آگ میں ڈالتے جاؤ۔ لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے اور دین حق سے باز نہ رہنے کا اقرار کرتے اور دہکتی آگ میں بخوشی ڈالے جاتے تھے اور اس جاں گسل اور ہولناک نظارہ کو بادشاہ اور اس کے مصاحبین مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت لائی گئی جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا عورت بچہ کی محبت میں جھجکی، فوراً بچہ نے کہا "ماں صبر سے کام لے اور بے خوف خندق میں کود جا اس لیے کہ بلا شبہ تو حق پر ہے اور یہ ظالم باطل پر ہیں۔ (مسلم، نسائی، ترمذی، مسند احمد)

اور دوسرا واقعہ صاحب سیرۃ محمد بن اسحاق نے بہ سلسلہ سند محمد بن کعبؓ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ شام اور حجاز کے درمیان جو بستی نجران کے نام سے مشہور ہے اس کے باشندے بت پرست اور مشرک تھے اور ان کے قریب کی آبادی میں ایک ساحر رہتا اور وہ نجران کے لڑکوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد نجران اور ساحر کی بستی کے درمیان ایک راہب آکر خیمہ زن ہوا وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ اس کا نام فیمون تھا نجران کے جو لڑکے ساحر سے سحر کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان میں ایک لڑکا عبداللہ بن تامر بھی تھا ایک روز عبداللہ راہب کے خیمہ میں چلا گیا راہب نماز میں مشغول تھا عبداللہ کو راہب کی نماز اور طریق عبادت بہت پسند آیا اور اس کے پاس آنے جانے لگا اور اس سے اس کے دین کو سیکھنا شروع کر دیا اور ایمان لے آیا اور راہب سے سچی مسیحیت کی تعلیم حاصل کر کے آہستہ آہستہ عالم دین بن گیا۔

اب اس نے راہب سے یہ اصرار کیا کہ مجھ کو اسم اعظم کے متعلق کچھ بتایئے مگر راہب یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ برادر زادہ مجھے یہ خوف ہے کہ تو اس کو برداشت نہ کر سکے گا کیونکہ میں تجھ کو کمزور پاتا ہوں، لڑکا خاموش ہو گیا یہاں تو یہ سلسلہ جاری تھا اور ادھر عبداللہ کا باپ تامر یہ سمجھتا رہا کہ میرا لڑکا ساحر سے سحر سیکھ رہا ہے کچھ دن خاموش رہ کر لڑکے سے صبر نہ ہو سکا اور اس نے یقین کر لیا کہ راہب بخل کر رہا ہے اور بتانا نہیں چاہتا یہ سوچ کر اس نے تیروں کا مٹھا لیا اور ہر ایک تیر پر خدا کا ایک ایک نام لکھا اور پھر آگ روشن کی اور ایک ایک تیر کو اس میں ڈالنا شروع کیا، تیر آہستہ آہستہ آگ کی نذر ہوتے رہے اور جلتے رہے مگر ایک تیر جب آگ میں پہنچا تو فوراً اچھل کر دور جا گرا، لڑکا سمجھ گیا کہ اس تیر پر اسم ذات کندہ ہے یہی اسم اعظم ہے اور اس کے بعد راہب کو سارا قصہ کہہ سنایا راہب نے سنا تو عبداللہ کو نصیحت کی کہ اس کو حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھنا عبداللہ نے اس کو دین حق کی تبلیغ کا ذریعہ بنالیا وہ جس کسی کو مریض پاتا تو اس سے کہتا کہ اگر تو خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مومن بن جائے تو میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعاء کروں کہ وہ تجھ کو تندرست کر دے اور جب وہ شخص سچے دل سے ایمان لے آتا تو یہ دعاء کرتا اور مریض چنگا ہو جاتا شدہ شدہ یہ بات نجران کے بادشاہ تک پہنچی اس نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو نے میری مملکت میں فساد مچایا اور میرے اور میرے باپ دادا کے دین کی مخالفت شروع کر دی اس لیے اب تیری سزا یہ ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے۔

لڑکا کہنے لگا "بادشاہ! میرا قتل تیری قدرت سے باہر ہے۔ بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرادو، سرکاری آدمیوں نے اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرادیا مگر قدرت الٰہی نے اس کو صحیح سالم رکھا اور وہ بادشاہ کے پاس واپس آگیا، اب بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو دریا میں لے جا کر غرق کر دو۔ لیکن وہ دریا میں پھینک دیے جانے کے باوجود غرق نہ ہوا اور اس کو مطلق کوئی گزند نہیں پہنچا تب لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ اگر تو واقعی مجھ کو

قتل کر دینا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ خدائے واحد کا نام لے کر مجھ پر حملہ کر تو میں مارا جا سکتا ہوں، بادشاہ نے خدائے واحد کا نام لے کر لڑکے پر حملہ کیا تو لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ساتھ ہی عذاب الٰہی نے بادشاہ کو بھی اسی جگہ ہلاک کر دیا۔

اہل شہر نے جب لڑکے اور بادشاہ کے درمیان جنگ کا یہ نظارہ دیکھا تو وہ سب صدق دل سے خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور مشرف باسلام ہو گئے اور انھوں نے سچائی کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے احکام کی پیروی کو اپنا دین بنالیا چنانچہ نجران میں نصرانیت کے حقیقی اور سچے دین کی بنیاد اسی واقعہ سے پڑی۔

نجران میں عیسائیت کی ترویج اور لڑکے اور راہب کے واقعہ کا تذکرہ یہودی المذہب شاہ یمن ذونواس تک بھی پہنچا اس نے سنا تو سخت اشتعال میں آ گیا اور لشکر جرار لے کر نجران پہنچا اور تمام شہر میں منادی کرا دی کہ کوئی شخص عیسائیت پر قائم نہیں رہ سکتا یا تو وہ یہودیت قبول کرے ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جائے اہل نجران کے قلب میں عیسائیت اس درجہ گھر کر چکی تھی کہ انھوں نے مر جانا قبول کیا مگر عیسائیت سے منہ نہ موڑا۔ ذونواس نے یہ دیکھا تو غیظ و غضب میں آ گیا اور حکم دیا کہ شہر کی گلیوں اور شاہراہوں میں خندقیں اور کھائیاں کھودی جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے جب لشکریوں نے تعمیل کر دی تو اس نے شہریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ جو شخص یہودیت قبول کرنے سے انکار کرتا جائے مرد ہو یا عورت یا بچہ اس کو زندہ آگ میں ڈال دو چنانچہ اس حکم کے مطابق بیس ہزار کے قریب مظلوم انسانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بروج میں کیا ہے قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد ابن اسحٰق کہتا ہے کہ ذونواس یمن کا مشہور بادشاہ ہے اس کا اصل نام زرعہ تھا مگر سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد یوسف ذونواس کے نام سے شہرت پائی اس کے باپ کا نام تبان اسعد تھا اور ابوکرب کنیت رکھتا تھا، یمن کے ان بادشاہوں کا لقب ''تبع'' تھا اس لیے کتب تاریخ میں یہ خاندان تبابعۂ یمن کہلاتا ہے۔ ابوکرب وہ پہلا تبع ہے جس نے بت پرستی چھوڑ کر یہودیت کو قبول کر لیا تھا اس نے مدینہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا تھا مگر بنی قریظہ کے دو یہودی علماء کی تلقین پر سچے دین موسوی کو قبول کر کے مدینہ سے واپس چلا آیا اور پھر مکہ معظمہ پہنچ کر کعبہ پر غلاف چڑھایا اور دونوں یہودی علماء کو یمن ساتھ لے آیا، انھوں نے یمن میں یہودیت کی تبلیغ کی اور آہستہ آہستہ اہل یمن نے یہودیت قبول کر لی۔

الحاصل ذونواس نے ایک دن میں نجران کے بیس ہزار حق پرست انسانوں کو شہید کر دیا مگر ان میں سے ایک شخص دوس ذو ثعلبان کسی طرح جان بچا کر نکل بھاگا اور شام میں مقیم قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر نجران کے حادثہ کی ہوش ربا داستان کہہ سنائی اور احتجاج کیا قیصر نے فوراً حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' کو لکھا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے ذونواس سے اس ظلم کا انتقام لے۔ نجاشی نے اس پر چڑھائی کر دی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کو شکست دے کر تمام یمن پر قبضہ کر لیا ذونواس نے دریا کے راستہ فرار ہونے کی کوشش کی مگر غرق ہو گیا اور اس طرح تقریباً ستر سال تک یمن نصاریٰ کے زیر حکومت رہا اس کے بعد حمیری خاندان کے ایک رئیس سیف بن ذی

یزن نے کوشش کی کہ اپنے خاندان کے زیر نگین ملک پر دوبارہ قبضہ کرے چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کسریٰ فارس سے مدد طلب کی مگر کسریٰ نے حکم دیا کہ مملکت میں جس قدر بھی قیدی ہیں ان کو رہا کر کے اور ان کی فوج بنا کر سیف بن ذی یزن کی مدد کی جائے اور سیف نے سات سو ایرانی اور باقی اپنی فوج کی مدد سے یمن پر حملہ کیا اور نصاریٰ کے ہاتھ سے یمن کو آزاد کرالیا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۵۔ ۴۹۴ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۳۱۔ ۱۳۰)

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نجران کا بادشاہ بت پرست تھا۔ پس اگر عیسائی راہب کے ذریعہ نجران میں عیسائیت پھیل گئی تو ذونواس کو جو کہ یہودی المذہب تھا اس درجہ طیش کیوں آیا؟ اس کا جواب یورپین مؤرخین یہ دیتے ہیں کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے اس وقت سیاسی اور تجارتی صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ رومی (عیسائی) اور حبشی ایک فریق تھا اور حمیری (یہودی) اور ایرانی دوسرا فریق تھا اور دونوں میں زبردست رقابت قائم تھی اس لیے ذونواس نجران میں عیسائیت کو برداشت نہ کر سکا۔

ہم اس میں اس قدر اور اضافہ کرتے ہیں کہ تاریخ اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعۂ صلیب کے اس نظریہ کی بنا پر جو یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کے یہاں مسلمہ ہے اس درجہ آپس میں عداوت اور بغض بڑھ گیا تھا کہ دونوں فریق بت پرستوں کی ترقی کو برداشت کر سکتے تھے لیکن ایک دوسرے کی مذہبی ترقی ان کیلئے ناقابل برداشت تھی اور اسکا مظاہرہ اس درجہ نمایاں تھا کہ جب کبھی یہود کی موقع ملا ہے تو انھوں نے عیسائیوں پر محض مذہب کے نام پر سخت سے سخت مظالم روا رکھے ہیں اور حکومت کے دباؤ سے زبردستی ان کو یہودی بنانے کی کوشش کی ہے اور جب کبھی عیسائیوں کو موقع ہاتھ آیا ہے تو انھوں نے یہودیوں پر اسی طرح کے مظالم سے گریز نہیں کیا پس نجران کا واقعہ ایسے زمانہ پیش آیا جب کہ مسطورۂ بالا سیاسی اور تجارتی رقابت کی موجودگی میں رومی تاجر سواحل یمن تک پہونچتے اور مال تجارت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کی تبلیغ کو بھی جاری رکھتے تھے آہستہ آہستہ نتیجہ یہ نکلا کہ نجران جو ساحل یمن پر واقع تھا رومی تاجروں کا تجارتی و تبلیغی مرکز بن گیا حمیری بادشاہ یہ دیکھتے تھے اور سخت برہم ہوتے تھے مگر صاف طور سے ظلم کرنے کا بہانہ ہاتھ نہیں آتا تھا کہ حسب اتفاق راہب اور لڑکے کا یہ واقعہ پیش آگیا اور ذونواس نے جب یہ دیکھا کہ یہ بات ریاست و تجارت سے گذر کر مذہب تک پہنچ گئی تو یہودیت کے روایتی تعصب نے قابو سے باہر کر دیا اور پھر جو کچھ پیش آیا گذشتہ سطور میں آپ اسکا مطالعہ کر چکے ہیں۔

ان دو واقعات کے علاوہ مشہور محدث ابن ابی حاتم نے نقل کیا کہ حضرت انسؓ کے صاحبزادہ ربیع فرماتے ہیں کہ اصحاب اخدود کے متعلق ہم نے سنا ہے کہ فترۃ کے زمانہ محمد ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان زمانہ میں خدائے تعالیٰ کے نیک بندوں کی ایک جماعت نے جب یہ دیکھا کہ زمانہ بہت ہی خراب ہو چلا ہے اور فتنوں اور شرارتوں کا زور بڑھتا جارہا ہے اور دین حق گروہ بندیوں کی نذر ہو کر ہر شخص کی ذاتی رائے کے تابع بن گیا ہے تو انھوں نے باہم مشورہ کر کے عام آبادیوں سے بہت دور ایک چھوٹی سی بستی آباد کرلی اور اس میں سچی عیسائیت کے مطابق عبادت و صداقت کی زندگی بسر کرنے لگے مگر ان کا یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکا اور شدہ شدہ اس زمانہ کے بت پرست بادشاہ تک پہنچ گیا اس نے آکر بستی کا محاصرہ کرلیا اور ان کو توحید الٰہی کے خلاف بت پرستی پر مجبور کرنے لگا لیکن ان حق پرستوں پر اس کی سختیوں کا مطلق اثر نہ ہوا اور انھوں نے شرک و بت

پرستی سے صاف انکار کر دیا۔ تب بادشاہ نے غضبناک ہو کر خندقیں کھدوانے اور ان میں آگ دہکانے کا حکم دیا اور پھر جو شخص بت پرستی سے انکار کرتا جاتا تھا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا حق پرست گروہ کے بزرگ پروانہ وار آگ میں کود جاتے تھے اور اپنے بچوں اور نوجوانوں کو تسلی دیتے جاتے تھے کہ آج کا دن خوف کھانے کا دن نہیں ہے یہ آگ ہمارے لیے جہنم کی آگ سے محفوظ رہنے کا پیش خیمہ ہے چنانچہ تمام حق پرستوں نے حق پر نثار ہو جانا قبول کیا مگر شرک و بت پرستی پر آمادگی ظاہر نہ کی، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی ان پر اپنا یہ فضل فرمایا کہ جب وہ آگ میں ڈالے جاتے تو آگ تک پہونچنے اور اس کی تکلیف سہنے سے قبل ہی ان کی روح قبض کر لی جاتی تھی، مگر خندق اور کھائیوں کی آگ اس درجہ بھڑک رہی تھی کہ ان نکوکار انسانوں کو کھا لینے کے بعد بھی نہ بجھی اور بے قابو ہو کر کچھ اس طرح پھیلتی گئی کہ بت پرست ظالم بادشاہ اور اس کے تمام لشکری سب کے سب اس کے اندر گھر گئے اور جل کر وہیں خاک سیاہ ہو گئے قرآن عزیز کی یہ آیات قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ اسی واقعہ کا تذکرہ کر رہی ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ص ۴۹۳)

اور حضرت علیؓ سے نقول ہے کہ یہ واقعہ فارس میں پیش آیا، جب فارس کے بادشاہ نے دین حق چھوڑ کر باطل پرستی اختیار کر لی اور اپنے محارم (ماں، بہن، بیٹی وغیرہ) سے نکاح کرنا جائز قرار دے لیا تو ان کے بعض علماء نے جو ابھی تک دین حق پر قائم تھے بادشاہ کو اس بات سے منع کیا بادشاہ نے حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے غضبناک ہو کر یہ حکم کیا کہ کھائیاں کھدوائی جائیں اور جو شخص نکاح محارم کو باطل کہے اس کو کھائی میں جھونک کر زندہ جلا دیا جائے چنانچہ اہل حق کی جماعت نذر آتش کر دی گئی اور پارسیوں میں آج تک نکاح محارم کو جائز سمجھا جا رہا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ص ۴۹۳)

انتقاد

ان روایات کے مفہوم اور مقصد پر اگر نظر کی جائے اور تفصیلات و جزئیات کو نظر انداز کر دیا جائے تو سب کا حاصل ایک ہی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ گذشتہ زمانہ میں مشرک یا یہودی بادشاہ نے ایک حق پرست اور توحید الٰہی سے سرشار جماعت کو بت پرستی یا باطل پرستی پر مجبور کیا اور جب انھوں نے اس کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا اور ایمان باللہ اور حق پرستی کو ترک کر دینے سے انکار کر دیا تو ظالم و جابر بادشاہ نے ان کو آگ میں جھونک کر زندہ جلا دیا مگر نتیجہ کے اعتبار سے حق پرست جماعت کے حصہ میں ابدی کامرانی اور سرمدی فوز و فلاح آئی اور ظالم و باطل کوش جماعت دنیا میں بھی خائب و خاسر ہوئی اور آخرت میں ابدی جہنم پائی۔

نیز اگر اس حقیقت پر غور کیا جائے کہ نزول آیات و سور میں اصل شے مفہوم و مراد ہے اور شان نزول کو ثانوی اور تاریخی حیثیت حاصل ہے جیسا کہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نور اللہ مرقدہٗ نے "الفوز الکبیر" میں تصریح فرمائی ہے تو پھر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ باختلاف زمانہ اس چرخ نیلی فام کے نیچے ایسے واقعات متعدد پیش آ چکے ہیں جن کا ذکر مسطورۂ بالا روایات میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ بھی ایک مستقل واقعہ ہے جس کو مسلم نے صحیح میں اور امام احمد نے مسند میں نقل کیا ہے اور وہ بھی جس کو محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں بیان کیا اور وہ بھی جس کو ابن کثیر نے بروایت حضرت علیؓ نقل کیا ہے بلکہ ابن کثیر نے بحیثیت ایک مؤرخ کے یہ ثابت کیا ہے کہ بلاشبہ اس نوعیت کے واقعات متعدد پیش آ چکے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

و قد یحتمل ان ذلك قد وقع فی العالم کثیراً کما قال ابن ابی حاتم کانت الاخدود فی الیمن زمان تبع وفی القسطنطنیة زمان قسطنطین وفی العراق فی ارض بابل بخت نصر الذی صنع الصنم وامر الناس ان یسجدوا لهٗ۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج)

اور یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات عالم میں بہت ہو گذرے ہوں مثلاً ابن حاتم کا بیان ہے کہ اخدود کا معاملہ ایک تو یمن میں تبع کے زمانہ میں پیش آیا اور دوسرا قسطنطین کے زمانہ میں قسطنطنیہ میں اور تیسرا عراق (بابل) میں بخت نصر کے زمانہ میں پیش آیا جس نے ایک بت بنا رکھا تھا اور وہ لوگوں کو مجبور کرتا تھا کہ اس کو سجدہ کریں اور جو سجدہ نہ کرتا اس کو آگ میں جھونک دیا جاتا تھا۔

وعن مقاتل قال کانت الاخدود ثلاثة واحدة بنجر ان بالیمن والاخریٰ بالشام والاخریٰ بفارس احرقوا بالنار اما التی بالشام فهو انطنانوس الرومی واما الذی بفارس فهو بخت نصر واما التی بارض العرب (نجران) فهو یوسف ذونواس فاماالتی بفارس والشام فلم ینزل الله تعالیٰ فیهم قراناً وانزل فی التی کانت بنجران۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۴ سورۂ بروج)

اور مقاتل فرماتے ہیں کہ "اخدود" تین واقعے ہیں ایک یمن (عرب) کے شہر نجران میں پیش آیا دوسرا شام میں اور تیسرا فارس میں ان واقعات میں مظلوموں کو دہکتی آگ میں ڈالا گیا تھا اور شام کا واقعہ انطنانوس رومی کے ہاتھوں پیش آیا اور فارس کا بخت نصر (بنوکدنذر) کے ہاتھوں اور نجران کا واقعہ یوسف ذونواس کے ہاتھوں پیش آیا۔ لیکن فارس اور شام کے واقعات کا ذکر قرآن میں نہیں ہے البتہ نجران میں جو واقعہ پیش آیا اس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔[1]

بہر حال اگرچہ مسطورۂ بالا روایات بلکہ ان کے علاوہ اسی قسم کے اور واقعات اپنے مفہوم و مراد اور مقصد کے لحاظ سے سب ہی سورۂ بروج کی آیات زیر بحث کا مصداق بن سکتے ہیں لیکن تاریخی اعتبار سے اگر یہی سوال کیا جائے کہ قرآن عزیز نے خصوصیت کے ساتھ کس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے تو مشہور تابعی مقاتل کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن میں جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ نجران اور ذونواس سے تعلق رکھتا ہے اور یہی قول صحیح ہے اور یہ اس لیے کہ مسلم اور مسند کی روایت کے تو کسی ایک جملہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ نے

1: شام و فارس کے واقعات میں شام کے واقعہ سے تو غالباً قسطنطین کا واقعہ مراد ہے، وہ یہ کہ جب قسطنطین بانی قسطنطنیہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین حق کی بجائے مروجہ مسیحیت کو اپنا دین بنایا اور توحید کی جگہ تثلیث کو عقیدہ کی بنیاد قرار دیا اور صخرہ بیت المقدس سے منحرف کر کے مشرق کو قبلہ بنایا اور تمام قلمرو میں منادی کر دی کہ آباؤ اجداد کا دین چھوڑ کر دین مسیحی اختیار کرو اور جو انکار کرے اس کو دہکتی آگ میں جھونک دو۔ اوائل چھٹی صدی عیسوی میں ہزاروں انسان دہکتی آگ میں جھونک دیئے گئے اور فارس کے واقعہ سے متعلق ابن کثیر نے ایک اسرائیلی روایت جو کہ دانیال نبی علیہ السلام کے صحیفے میں بھی مذکور ہے یہ بیان کی ہے کہ عراق (بابل) میں بخت نصر نے سونے کا ایک بت بنوایا تھا اور تمام رعایا سے اس کو سجدہ کراتا تھا، سب نے سجدہ کیا۔ لیکن دانیال علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے سجدہ سے انکار کر دیا۔ تب بخت نصر نے خندق میں آگ دہکا کر اس میں ان سب کو دھکیل دیا۔ مگر وہ ان پر بردو سلام ہو گئی اور کوئی آنچ نہ آئی اور جن نو آدمیوں نے آگ کی بھٹی میں ان کو ڈالا تھا وہ جل کر خاک ہو گئے۔

اس واقعہ کو سورۂ بروج کی آیات کی تفسیر کے سلسلہ میں بیان فرمایا ہے یہی وجہ ہے کہ امام مسلم نے اس روایت کو کتاب التفسیر میں نقل نہیں فرمایا، البتہ ترمذی نے ایک حسن غریب روایت میں ضرور اس واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مربوط اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا یہ سورۂ بروج کی زیر بحث آیات کی تفسیر ہے لیکن ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ترمذی کی حدیث سے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے بلکہ یہ قوی احتمال ہے کہ یہ واقعہ راوی حدیث حضرت صہیب رومی کا اپنی جانب سے بیان کردہ ہو کیونکہ وہ اہل کتاب کے قصص و واقعات کے بہت بڑے عالم تھے ترمذی کی حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ عصر کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے لب مبارک کو اس طرح حرکت دی گویا کچھ بات فرمانا چاہتے ہیں مگر بیان نہ فرمائی تب کسی نے عرض کیا کہ آپ ﷺ کچھ ارشاد فرمانا چاہتے تھے مگر فرمایا نہیں لبوں کو حرکت دے کر رہ گئے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء سابقین میں سے ایک نبی اپنی امت کا حال دیکھ کر از راہ فخر کہنے لگے کہ ایسی امت کس نبی کی ہوگی؟ کون اس کے مقابلہ میں اپنی امت پیش کر سکے گا اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ انداز پسند نہ آیا اور ان پر وحی نازل ہوئی کہ دو باتوں میں سے ایک بات قبول کر و یا امت پر مصیبت کا نزول ہو یا ان پر دشمن کا تسلط ہو خدا کے نبی نے دشمن کے تسلط پر مصیبت کے نزول کو ترجیح دی، چنانچہ ستر ہزار کے قریب موت کی آغوش میں سلا دیے گئے (اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں۔) وکان اذا حدث بهذا الحديث حدث بهذا الحديث الآخر اور جب وہ اس واقعہ کو بیان کیا کرتے تھے تو اس کے ساتھ ایک اور واقعہ سنایا کرتے تھے (یہ دوسرا واقعہ وہی ہے جو مسلم میں مذکور ہے)

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن کثیر فرماتے ہیں:

وهذا السياق ليس فيه صراحة ان سياق هذه القصة من كلام النبي ﷺ قال شيخنا الحافظ ابو الحجاج المزی فيحتمل ان يكون من كلام صهيب الرومی فانه كان عنده من اخبار النصاریٰ۔ (تفسیر ابن کثیر ج ٤ ص ٤٩٤)

اور روایت کا یہ طریق بیان ہرگز اس کی صراحت نہیں کرتا کہ اس دوسرے واقعہ کا تذکرہ نبی اکرم ﷺ کی جانب سے کیا گیا ہمارے استاد ابوالحجاج مزی فرماتے ہیں اس بیان میں یہ احتمال ہے کہ یہ واقعہ صہیب رومی کی جانب سے ہو اس لیے کہ وہ نصاریٰ کے قصص و واقعات کے عالم تھے۔

اور حضرت علیؓ سے "اصحاب اخدود" کے متعلق کتب تفسیر و سیر میں تین روایات مذکور ہیں۔

ایک روایت اوپر بیان ہو چکی دوسری روایت میں ہے کہ یہ واقعہ یمن میں پیش آیا ہے اور تیسری روایت میں ہے کہ یہ حبشہ کا واقعہ ہے مگر ان تینوں روایت میں سے کسی ایک روایت کے متعلق بھی ان سے یہ بصراحت مذکور نہیں کہ وہ ان میں سے کسی واقعہ کو تاریخی حیثیت سے ان آیات کی تفسیر سمجھتے ہیں۔

پس جب کہ مسلم کی روایت اس مسئلہ میں خاموش ہے اور ترمذی کی روایت سے بھی اس کے متعلق کوئی بات صاف ثابت نہیں ہوتی اور حضرت علیؓ کی روایات بطور توسع اور مفہوم و مقصد کے پیش نظر تو آیات کا مصداق بنتی ہیں لیکن تاریخی حیثیت سے شان نزول پر دلالت نہیں کرتیں تو اس صورت حالات میں مقاتل کی صراحت اپنے اندر قوت رجحان رکھتی ہے چنانچہ اہل تحقیق کا رجحان اسی جانب ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ ذونو

اس سے ہی تعلق رکھتا ہے، ابن کثیر فرماتے ہیں۔

وما ذکرہ ابن اسحاق یقتضی ان قصتھم کانت فی زمان الفترۃ التی بین عیسیٰ ومحمد علیھما من اللّٰہ السلام وھو اشبہ۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۴۹۵)

اور ابن اسحاق نے جو واقعہ نقل کیا ہے اس کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور محمد ﷺ کے درمیان زمانہ (فترۃ) کا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔

وقد تقدم فی قصۃ اصحاب الاخدود ان ذونواس وکان اخر ملوك حمیر و کان مشر کا وھو الذی قتل اصحاب الاخدود وکانوا نصاریٰ وکانوا قریباً من عشرین الفاً۔ الخ (تفسیر ابن کثیر ج ٤ ص ٥٤٩ سورۃ الفیل)

اور اصحاب اخدود کے واقعہ میں گذر چکا ہے کہ ذونواس ہی وہ بادشاہ تھا جس نے تقریباً بیس ہزار سچے عیسائیوں کو خندقوں میں ڈال کر مار ڈالا تھا یہ بادشاہ مشرک تھا اور شاہان حمیر سے آخری بادشاہ تھا۔

اور شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) کا رجحان بھی اسی جانب ہے لیکن یہ دونوں بزرگ ذونواس کو مشرک کہتے ہیں مگر تاریخی سند سے ثابت ہو چکا ہے کہ ذونواس اپنے باپ کے دین یہودیت ہی پر قائم تھا۔

علاوہ ازیں قیاس بھی یہ چاہتا ہے کہ قرآن میں مذکور واقعہ نجران اور ذونواس سے ہی تعلق رکھتا ہے اس لیے کہ اس سلسلہ میں بیان کردہ واقعات میں سے یہ واقعہ زمانہ کے لحاظ سے بھی زیادہ قریب ہے اور ملکی اعتبار سے بھی خود عرب کے اندر کا واقعہ ہے اس لیے نزول قرآن کے وقت اہل عرب اس واقعہ سے ضرور آگاہ ہوں گے لہذا حق و باطل کے مختلف معرکوں میں سے موعظت و عبرت کے لیے قرآن نے اس واقعہ کو بیان کر دیا اور اس کے علاوہ دوسرے واقعات یا تو بہت ہی قدیم زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یا عرب کے باہر دوسرے ملکوں سے علاقہ رکھتے ہیں اس لیے وہ اس کے مقابلہ میں قابل ترجیح نہیں ہو سکتے۔

۱: محقق عصر حضرت استاذ علامہ انور شاہ (نور اللہ مرقدہٗ) ارشاد فرماتے تھے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آیت کا شانِ نزول تاریخی حیثیت سے متعین ہوتا ہے پھر بھی آیت کے مفہوم و مراد کے لحاظ سے اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ اس قسم کی دوسری جزئیات کو خود صاحبِ شریعت ﷺ اس آیت کا شانِ نزول فرما دیا کرتے ہی۔ چنانچہ اس کی بہترین مثال سورۂ توبہ کی یہ آیت ہے لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ط (الآیہ) باتفاقِ جمہور ''مسجد قبا کے بارے میں نازل ہوئی لیکن ایک مرتبہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے ذاتِ اقدس ﷺ سے اس آیت کے شان نزول کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''مسجدی ہذا'' اس آیت کا مصداق میری یہ مسجد (مسجد نبوی) ہے'' چنانچہ تمام محدثین کے نزدیک آپ ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جن اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چونکہ اس کا مصداق مسجدِ قبا سے بھی زیادہ مسجدِ نبوی بنتی ہے۔ اسلئے یہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کو شانِ نزول بنایا جائے۔

لیکن آپ ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تاریخی حیثیت سے یہ آیت کا شانِ نزول مسجدِ قبا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مسجد نبوی سے رکھتا ہے۔ پس اگر مسئلہ زیرِ بحث میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ترمذی کی روایات میں مذکورہ واقعہ کو نبی اکرم ﷺ ہی نے سورۂ بروج کی آیات کا شانِ نزول فرمایا ہے تو نقل و عقل سے پیدا شدہ قرائن و دلائل اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کا یہ ارشادِ مبارک مصداق کے توسع کے پیشِ نظر ہے نہ کہ اس حیثیت کے کہ تاریخی بناء پر ترمذی میں مذکور واقعہ ہی آیات کا شانِ نزول ہے۔

تبّع

"سیل عرم" کی بحث میں اگرچہ سبا کے ضمن میں "تبع اور تبابعہ" کا تفصیلی ذکر آچکا ہے، تاہم مختصر طور پر یہاں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ یمن کے حمیری بادشاہوں میں سے ان کا لقب رہا ہے۔ جنھوں نے تقریباً ڈھائی سو سال تک یمن کے مغربی حصہ کو دارالسلطنت قرار دے کر عرب، شام عراق اور افریقہ کے بعض حصوں پر بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی جدید تحقیق کے اصول پر حمیر حمرۃ (سرخی) سے ماخوذ ہے اور اس کے مقابلہ میں سودانی، سواد، (سیاہی) سے بنایا گیا ہے چونکہ اہل عرب یعنی حمیری حبشیوں کو سیاہ فام ہونے کی وجہ سے "سودانی" کہتے تھے اس کے جواب میں حبشی ان کو احمر (سرخ) کہتے تھے۔ یہی لفظ آگے چل کر حمیر بن گیا اور لفظ "تبع" اصلاً حبشی لفظ ہے یا سامی الاصل ہے؟ اس کے متعلق عرب مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ یہ عربی (سامی) لفظ ہے اور تبع سے بمعنی متبوع (سردار) بنالیا گیا ہے اور جدید اہل تحقیق یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ حبشی الاصل ہے اور بمعنی قاہر و غالب آتا ہے یعنی عربی میں "سلطان" اور حبشی زبان میں "تبع" مرادف ہے۔

قرآن عزیز نے بھی تبع کا ذکر دو مقامات سورۂ ق اور سورۂ دخان میں کیا ہے سورۂ دخان میں مختصر طور پر ان کی مادی قوت و طاقت کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ جب خدا کی نافرمانی کر کے وہ ہلاکت سے نہ بچے تو قریش جو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں وہ سرکشی کر کے کیسے بچ سکتے ہیں اور سورۂ ق میں صرف مجرم قوموں کی فہرست میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝

یہ (قریش) بہتر (قوی و طاقت ور) ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے گذر گئیں ہم نے ان کو اس لیے ہلاک کر دیا کہ وہ مجرم تھیں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ ۝ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ۝ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۚ

ان مشرکین مکہ سے پہلے نوح کی قوم نے اصحاب الرس نے ثمود، عاد، فرعون، اخوان، لوط اور اصحاب الایکہ اور قوم تبع نے خدا کے پیغمبروں کو) جھٹلایا ہے۔

عرب کی دو حکایتیں

ابن کثیر نے مشہور محدث ابو بکر بن ابی الدنیا کے واسطہ سے بروایت محمد بن جعفر بن ابی طالب یہ حکایت نقل کی ہے کہ انھوں نے بعض اہل علم سے سنا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے جب اصفہان فتح کر لیا اور شہر میں فاتحانہ داخل ہو گئے تو شہر پناہ کا ملاحظہ کیا دیکھا تو ایک جانب میں دیوار شکستہ ہے انھوں نے حکم دیا کہ دیوار کا یہ حصہ درست کر دیا جائے لیکن جب دیوار کو درست کر دیا گیا تو وہ ٹھہر نہ سکی اور یک لخت پھر گر گئی۔ چنانچہ دوبارہ مرمت کی گئی مگر وہ پھر منہدم ہو گئی تب بعض لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ اس مقام پر کسی مرد صالح کی قبر معلوم ہوتی ہے یہ سوچ کر جب بنیاد کو کھدوایا گیا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا مدفون ہے اور اس کے ہاتھ میں تلوار ہے اور تلوار پر

عبارت کندہ ہے جس کا حاصل یہ ہے "حارث بن مضاض ہوں جس نے اصحاب اخدود سے انتقام لیا" حضرت ابو موسیٰ نے اس کو وہاں سے نکال کر قبرستان میں دفن کرادیا اور دیوار کی تعمیر کرادی جو صحیح و سالم رہی۔
(تفسیر ابن کثیر ج ۴)

حارث بن مضاض عرب کے خاندان جرہم کا ایک بادشاہ تھا جس نے نابت بن اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے مکہ کی حکومت لے کر حکمرانی کی تھی اور یہ تقریباً حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پانچ سو سال بعد کا زمانہ ہے، اس اعتبار سے اصحاب اخدود کا واقعہ بہت قدیم زمانہ سے متعلق ہو جاتا ہے مگر یہ روایت سیر کی روایات میں سے ہے اور اس کی سند منقطع ہے اس لیے اس کی حیثیت حکایت اور کہانی سے زیادہ نہیں ہے علاوہ ازیں اگر یہ واقعہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ ان مختلف واقعات میں سے ایک واقعہ ہو جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے مگر وہ آیات بروج کے مصداق میں داخل ہیں۔

اسی طرز کی ایک حکایت مشہور محدث محمد بن ابو بکر بن حزم نے بغیر سند کے بیان کی ہے کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے زمانہ میں نجران کا ایک شخص زمین کھود رہا تھا، دیکھا تو اس جگہ ایک قبر ہے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک نعش کو اس طرح بیٹھے ہوئے پایا کہ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے ہے جب لوگوں نے اس کے ہاتھ کو سر سے ہٹایا تو اس سے خون بہنے لگا اور جب ہاتھ کو اسی طرح رکھ دیا تو خون بند ہو گیا اس شخص کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اور اس کے نگینہ پر یہ عبارت کندہ تھی ربی اللہ اس واقعہ کی خبر فوراً حضرت عمر بن الخطابؓ کو دی گئی حضرت عمرؓ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شخص کو اس کی حالت پر رہنے دیا جائے اور اسی جگہ دفن کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس زمانہ میں لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ نعش عبداللہ بن تامر کی ہے۔

نجران میں چونکہ راہب اور عبداللہ بن تامر کا واقعہ پیش آ چکا تھا اس لیے کوئی محل تعجب نہیں کہ اس قسم کی حکایات وہاں مشہور رہی ہوں اور عیسائیوں نے اپنی برتری کے لیے ان کو خوب آب و رنگ دیا ہو۔

چند تفسیری نکات

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝

قرآن عزیز کی ان آیات میں "واو" بمعنی قسم ہے اور ان آیات کے علاوہ قرآن کی متعدد سورتوں میں مختلف اشیاء کی قسم کا تذکرہ موجود ہے عام طور پر ان مقامات کی تفسیر میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح ہم آپس میں قسمیں کھاتے ہیں یا اس چیز کی قسم کھاتے ہیں جو ہمارے لیے بہت زیادہ عزت و عظمت کے لائق ہے مثلاً باپ، استاد، پیر، پیغمبر اور خدا کی قسم اور یا ایسی شے کی قسم کھائی جاتی ہے جو ہماری نگاہ میں بہت زیادہ محبوب ہو۔ مثلاً اولاد کی یا محبوب کی قسم اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی قرآن میں قسمیں کھائی ہیں اور یہ سمجھ کر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو قسم کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ قسم تو صرف اس لیے کھائی جاتی ہے کہ مخاطب کو اگر ہماری بات میں کوئی شبہ ہے تو ہم جس چیز کی عزت کرتے یا اسے بہت زیادہ محبوب سمجھتے ہیں اس کی عزت و محبت کو واسطہ بنا کر اپنی صداقت کا یقین دلائیں پس جب کہ خدائے برتر کی ذات سے نہ کوئی برتر ہے اور نہ وہ اپنی صداقت کی تائید کے لیے کسی محبوب سے محبوب تر شے کا محتاج تو پھر ان اقسام القرآن کا کیا مطلب ہے؟

نیز جو شخص خدائے تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے وہ تو خود اسکا قائل ہے کہ اس ذات واحد سے زیادہ کوئی سچا نہیں ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا

اور العیاذ باللہ جو شخص خدا کو نہیں مانتا اس کے لیے یہ سب قسمیں بیکار ہیں۔ لہٰذا قرآن عزیز میں مذکور اقسام کے کیا معنی؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآن عزیز کے ان مقامات میں واو قسم یا لفظ قسم سے متعارف قسم سمجھنا اور جن اشیاء کو واو قسم یا لفظ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان سے یہ مراد لینا کہ جس طرح عام طور پر ہم باپ یا بیٹے کی یا اپنے سے معظم و محترم یا پیاری شے کی قسم کھاتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی قسمیں کھائی ہیں قطعاً غلط اور عربی زبان کے محاورات سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور یہ اس لیے کہ عربی محاورات میں ان مواقع پر بھی واو قسم کو استعمال کیا جاتا ہے جہاں کسی شئی کو بطور تاکید کلام کے یا بطور شہادت و استشہاد کے پیش کیا جاتا ہے مثلاً کسی کلام میں ایسی بات کہی گئی جس کے متعلق یہ خطرہ ہے کہ وہ بات جس کے لیے گفتگو شروع کی گئی ہے دل نشین ہو جائے اس صورت میں الواؤ للقسم، بمعنی الواؤ للتاکید ہو جاتی ہے اسی طرح اگر متکلم کی جانب سے کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جس کا سمجھنا مخاطب کے لیے اس وقت تک مشکل ہے جب تک اس بات سے متعلق ایسے شواہد پیش کیے جائیں جو اس بات کو دل نشین بنا سکیں تو ایسے مواقع پر واو قسم کے ساتھ ایسے امور کو بیان کیا جاتا ہے جو اس مضمون کو تہ قلب میں اتارنے کے لیے مدد دے سکیں جس کے لیے متکلم مخاطب سے کلام کر رہا ہے اور ایسے موقعہ استعمال میں الواو للقسم کے معنی الواو للشہادۃ کے ہو جاتے ہیں چنانچہ جن مقامات پر واو قسم کو تاکید یا شہادت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور ان مقامات میں جن چیزوں کو واو یا لفظ قسم کے بعد بیان کیا گیا ہے ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ متکلم کے مقصد تاکید مضمون یا شہادت و استشہاد کے لیے مفید اور موقع کے مناسب حال ہو اس کا بیان کیا جانا ضروری ہے۔

پس قرآن عزیز میں جن جن مقامات پر واو قسم یا لفظ قسم سے کلام کی ابتداء کی گئی ہے ان تمام مقامات میں قسم سے متعارف معنی (حلف) مراد لینا قطعاً غلط اور باطل ہیں بلکہ عربی محاورۂ زبان کے مطابق ان میں سے اکثر مقامات میں واو بمعنی شہادت ہے اور بعض مقامات میں بمعنی تاکید ہے:

مثلاً سورۂ [illegible] میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود میں انسان کو سب سے بہتر مخلوق بنایا ہے مگر ان انسانوں کے علاوہ جو ایمان باللہ اور عمل صالح کے ذریعہ اپنی انسانیت کے امتیاز کو باقی رکھتے ہیں جن انسانوں نے عقل و شعور کے خصوصی امتیازات کے باوجود اپنے خالق اور پروردگار سے سرکشی کی وہ ذلت و رسوائی کے اسفل سافلین میں پھینک دیے گئے۔

لیکن یہ دونوں باتیں سطحی نظر میں دل کو لگتی نہیں تھیں اس لیے کہ کائنات عالم میں انسان سے زیادہ قوی و طاقت ور اور وسیع و عریض موجود ہیں جیسے شمس و قمر، کواکب و سیارات اور ارض و سماوات نیز انسان عالم کی ہر شے کا کسی نہ کسی درجہ میں محتاج ہے اور عالم کی کوئی شے اس کی محتاج نظر نہیں آئی لہٰذا یہ کس طرح باور کیا جائے کہ

ایک ضعیف البنیان اور ہر شے کی محتاج مخلوق اپنی خلقت کے اعتبار سے کل کائنات سے بہتر ہو اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو پھر احسن تقویم کے اعزاز سے معزز ہونے کے بعد اسفل سافلین میں گرا دیے جانے کے کیا معنی؟ اس ادق مضمون کو سمجھانے اور فہم وادراک کے قریب لانے کے لیے قرآن نے اول تین واقعات کو بطور شہادت کے پیش کیا اور پھر اصل مضمون کو واضح کیا اس نے کہا

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ ۝

کسی شے کے "احسن تقویم" پر ہونے کے معیار اس کی جسمانی طاقت یا طول کی فراوانی اور احتیاج سے استغنا نہیں ہے بلکہ عقل و شعور اور ادراکات و جذبات کا وجود اس کیلئے صحیح معیار ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے اندر ودیعت شدہ متضاد قوتوں کا توازن صحیح رکھ کر تمام کائنات سے ممتاز و معزز نظر آئے اور یہ وصف صرف انسان ہی کے اندر تخلیق کیا گیا ہے اور دوسری اشیاء عالم اس لیے یکسر محروم ہیں اور ان ہی اوصاف کی بدولت وہ بدی اور گمراہی سے محفوظ رہتا اور نیکی اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہو کر اپنے خالق کی معرفت حاصل کرتا اور گمراہی سے محفوظ رہتا اور نیکی اور ہدایت کی راہ پر گامزن ہو کر اپنے خالق کی معرفت حاصل کرتا اور ابدی و سرمدی نجات و فلاح پاتا ہے بلکہ عالم کی راہ نمائی اور کائنات الٰہی میں خدا کے پیغامات حق کی پیغمبری کا عظیم الشان اعزاز بھی اسی کے لیے مخصوص ہے۔

تم اگر تاریخ ماضی کے اوراق کا مطالعہ کرو گے تو تم پر بآسانی اس کی صداقت ظاہر ہو جائے گی: مثلاً شام (بیت المقدس) کا وہ مقام جہاں بکثرت انجیر و زیتون کے درخت اور باغات پائے جاتے ہیں اس بات کے لیے شہادت دے رہا ہے کہ اس جگہ خدا کا وہ سچا ہادی پیدا ہوا جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے اور جس نے پاک بازی کے ساتھ دنیا کو ہدایت اور راستی کا سبق سکھایا اور اس سے قدیم تاریخ کا مطالعہ کرو تو طور سینا اس کا گواہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس پر خدا کے کلام کو کتنی بار سنا اور خدا کی پیغمبری کا شرف حاصل کر کے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اور مساوات انسانی کا سبق سنایا اور دور کیوں جاتے ہو اس بلد امین (مکہ) سے پوچھو وہ شہادت دے گا کہ اس کی آغوش میں محمد ﷺ جیسی اس مقدس ہستی اور خدا کے بزرگ ترین پیغمبر نے جنم لیا اور عرب کے بے برگ و گیاہ ریگستان میں کھڑے ہو کر ساری کائنات کو حق و صداقت اور اخوت و مساوات کا سبق سنایا اور توحید الٰہی کی جانب صحیح راہ نمائی کی۔ کیا یہ تینوں مقدس ہستیاں انسان کے سوا کچھ اور تھیں اور علم کی راہ نمائی کا جو کام انھوں نے انجام دیا کیا وہ شمس و قمر، آسمان و زمین بلکہ جن و ملک انجام دے سکتے تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، پس اگر تاریخ ماضی کی یہ سب شہادتیں صحیح اور حق ہیں تو اب اس اقرار میں پس و پیش کیوں ہو کہ بلاشبہ انسان کو خدا نے بہترین قوام سے مخلوق کیا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ اور جب ایسا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ جو انسان ان مقدس ہستیوں کے طریق کار پر کاربند نہیں ہے اور ان کی راہ ہدایت سے منحرف ہو کر بدی اور گمراہی کو اپنی زندگی بنائے ہوئے ہے وہ یقیناً انسانیت کے معیار سے گر گیا اور وہ اسی قابل ہے کہ انجام کار انتہائی قعر مذلت أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ۔

ہاں جس نے ایمان باللہ اور عمل صالح کو اختیار کر کے یعنی اسلام کو راہ عمل بنا کر اپنی انسانیت کے شرف وامتیاز

کو محفوظ رکھا اس کے لیے خدا کے پاس بے منت اجر و ثواب اور نتائج و ثمرات کی کامرانی ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۔

یہ ہے مطلب قرآن کی قسموں کا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے لہذا باقی اقسام القرآن بھی اسی طرح اپنی اپنی سورت میں بیان کردہ مضمون کو دل نشین بنانے کے لیے مناسب حال شواہد نظائر کا کام دیتی اور بعض مقامات پر تاکید مضمون کا حق ادا کرتی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد سورۂ بروج کی اقسام کی تفسیر بہت سہولت کے ساتھ ذہن و فکر میں آسکتی ہے اس سورۂ میں چند چیزوں کو واو قسم کے ساتھ بیان کی گیا ہے۔

۱) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ برجوں والا آسمان۔

۲) وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ قیامت کا دن۔

۳) شَاهِدٍ جمعہ کا دن یا ہر وہ شخص جو حاضر و موجود ہو۔

۴) مَشْهُوْدٍ عرفہ کا دن یا ہر وہ شخص جو اس واقعہ سے متعلق ہے اور ان کے بعد یہ کہا گیا قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ یعنی جن باطل پرستوں نے خندقیں کھدوا کر اور ان میں آگ دہکا کر مومنوں کو خدا پرستی کی بناء پر ایسی حالت میں آگ کے اندر دھکیل کر زندہ جلادیا کہ خود کناروں پر بیٹھے اپنی اس انسانیت سوز حرکت کا تماشہ دیکھ رہے تھے وہ اپنی اس کمینہ حرکت پر زیادہ دن نازاں نہ رہ سکے اور انجام کے لحاظ سے ہلاکت و بربادی ظالموں کے ہی حصہ میں آئی اور دائمی سرور و کامرانی مظلوموں نے پائی۔

اس واقعہ میں دو باتیں واضح کی گئی ہیں ایک یہ کہ دنیا کے کسی گوشہ میں ایسا المناک واقعہ پیش آیا دوسری بات یہ کہ نتیجہ اور ثمرہ کے پیش نظر ظالم خسارہ میں رہا اور مظلوموں کو فوز و فلاح نصیب ہوئی اور جب کہ پہلی بات گذشتہ تاریخ سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری بات بھی یا تو تاریخ ماضی سے ہی متعلق تھی یا مستقبل سے اس کا تعلق تھا تو ضروری ہوا کہ مخاطب کو یہ دل نشین کرایا جائے کہ ایسا ضرور ہوا اور جب کبھی ایسا ہوا ہے تو اس کا انجام ظالم کے حق میں خسران ہی رہا ہے چنانچہ اظہار مقصد سے قبل "واو قسم" کے ذریعہ اس طرح کلام کی ابتدا کی گئی کہ برجوں والا آسمان اس بات کا شاہد ہے کہ اسی چرخ نیلی فام کے نیچے ایک المناک واقعہ پیش آیا اور یوم قیامت بھی گواہ ہے جس میں ہر حق و باطل کا فیصلہ ٹھیک ٹھیک ہو جانے والا ہے کہ اس المیہ کا انجام ظالم کے حق میں برا رہا اور ہر وہ شخص اس کا گواہ ہے جو واقعہ کے وقت موجود تھا اور خود وہ ظالم اور مظلوم گواہ ہیں جن کا اس معاملہ سے تعلق رہا ہے کہ بلاشبہ خندق کھود کر آگ میں انسانوں کو جلانے والے ہی انجام کار ہلاک و برباد ہوئے یا یوں کہہ دیجئے کہ وہ برجوں والا آسمان جو اپنی حیرت زا صنعت اور کواکب و نجوم کے ساتھ زینت پر خدائے واحد کی وحدانیت کا اقرار کر رہا ہے اور وہ قیامت کا دن جس دن میں خدائے واحد کے سوا کسی کی قوت و طاقت باقی نہ رہے گی اور جہاں لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ کا اعلان ہوگا اور وہ جمعہ کا دن جس میں ہر ہفتہ کروڑوں انسان خدا کے سامنے سر بسجود ہو کر اسکی وحدانیت کا اعلان کرتے ہیں اور وہ عرفہ کا دن جسمیں سال بھر میں تمام خدا پرست دنیا

خدائے واحد کی پرستش کا مظاہرہ کرتی ہے یہ سب اس بات کیلئے شاہد اور گواہ ہیں کہ "اصحاب اخدود اپنے ظلم کے نتیجہ میں ناکام رہے اور ہلاک و برباد ہوئے اور نہ صرف وہ بلکہ ہر ظالم کا انجام جہنم اور ابدی ذلت و رسوائی ہے اور مظلوم کے لیے دنیا و دین دونوں میں فوز و فلاح اور کامرانی ہے اور پھر اس بات کو ثابت کرنے کے لیے چند تاریخی واقعات کو بھی دوہرایا گیا اور بتایا گیا کہ تم ثمود اور فرعون کے واقعات پر غور کرو اور تاریخ ماضی میں محفوظ ان کی عبرت ناک داستانوں کا مطالعہ کرو تاکہ تم کو یقین ہو جائے کہ جن حقائق کی جانب سورۂ بروج میں توجہ دلائی گئی ہے ان کا ایک ایک حرف صحیح اور صادق ہے کیا اصحاب الاخدود میں طاقت و قوت ثمود اور فرعون سے زیادہ تھی اور کیا جب انھوں نے خدا کے مقابلہ میں سرکشی کر کے مظلوم ایمان داروں پر ہولناک مظالم کیے اور اسکی سزا میں خدائے تعالیٰ کی سخت گرفت نے ان کو بے یار و مددگار بنا کر ہلاک و برباد کر دیا تو دنیا کی کوئی طاقت و قوت یا خود ان کی قوت و سطوت ان کے کچھ بھی کام آئی اور ان کو تباہی سے بچا سکی؟

هَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ○ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ○ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ○ وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ○

۲) ذَاتِ الْبُرُوْجِ میں مفسرین نے برج کی تفسیر کرتے ہوئے تین معنی مراد لیے ہیں:

الف بڑے بڑے نجوم و کواکب مراد ہیں

ب) بروج ہیئت مراد ہیں جن کی تعداد بارہ ہے اور بحساب ہیئت قدیم ہر ایک برج میں سورج پورے ایک ماہ میں دورہ کرتا اور چاند دو دن اور تہائی دن میں دورہ کرتا اور دو راتیں مستور رہتا ہے اور اس طرح یہ دونوں مہینے اور سال بناتے ہیں۔

ج) بروج سے وہ قلعے مراد ہیں جو آسمان پر محافظ فرشتوں کیلئے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے نزدیک قرآن عزیز میں دوسرے معنی قطعاً مراد نہیں ہیں اس لیے کہ ہیئت کا یہ حساب ضروری نہیں کہ صحیح ہو بلکہ آج کی ترقی یافتہ ہیئت نے تو تجربہ اور مشاہدہ کی حد تک یونان کی ہیئت قدیم کو تقویم پارینہ بنا دیا ہے اور بطلیموس کا نظام فلکی فرسودہ داستان بن کر رہ گیا ہے اور پہلے اور تیسرے معانی میں پہلے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بڑے بڑے کواکب و نجوم ہی محافظ ملائکہ اللہ کا مستقر ہیں تو پہلے اور تیسرے معنی میں مطابقت ہو جائے گی۔

۳) وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ کی تفسیر میں جلیل القدر صحابہ اور تابعین سے مختلف اقوال منقول ہیں۔

الف) شاہد سے مراد جمعہ محمد ﷺ، انسان یا اللہ تعالیٰ مراد ہے۔

ب) مشہود سے عرفہ، قیامت یا جمعہ مراد ہے مگر اکثر کا رحجان یہ ہے کہ شاھد سے جمعہ اور مشہود سے عرفہ مراد ہے اس لیے کہ جمعہ کا دن ہر ہفتہ آتا ہے اور دنیا کے ہر گوشہ سے لوگ عرفات میں حاضر ہوتے ہیں۔

ابن جریر طبری نے نبی اکرم ﷺ سے بھی ایک روایت اسی طرح کی بیان کی ہے:

قال رسول اللّٰه ﷺ اليوم الموعود يوم القيٰمة وان الشاهد يوم الجمعة وان المشهود يوم عرفة ۔ (الحديث)

۴) اصحاب اخدود کو قیامت کے دن جو عذاب ہو گا اس کے متعلق قرآن عزیز نے عذاب جہنم کے ساتھ "عذاب الحریق" آگ لگنے کا عذاب کا بھی ذکر کیا ہے اس سے یا تو عذاب جہنم ہی مراد ہے اور جزاء از جنس عمل کے اصول پر اس کو عذاب حریق بھی کہہ دیا گیا ہے یا جہنم میں ہی جلنے کا کوئی خاص قسم کا عذاب مراد ہے حافظ ابن کثیر کی یہی رائے ہے اور شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہ نے یہ معنی مراد لیے ہیں کہ آخرت میں جہنم کا عذاب اور دنیا میں آگ کے اندر جلنے کا عذاب اور اس سے ان کا مقصد غالباً اس واقعہ کی جانب اشارہ کرنا ہے جس کو ہم ابن ابی حاتم کی روایت سے نقل کر آئے ہیں۔

بصائر و عبر

۱) جب انسان انفرادی اور اجتماعی زندگی میں خدا کے خوف سے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور اس کو دولت و حکومت کا نشہ کبر و غرور کی اس بلندی پر پہنچا دیتا ہے جس پر چڑھ کر اس کی نگاہ میں تمام مخلوق ہیچ اور حقیر نظر آنے لگتی ہے تو اخلاق حسنہ اور جذبات عالیہ اس سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی ذات اور ذاتی اغراض کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتا تب یکایک غیرت حق کو حرکت ہوتی ہے اور وہ اس کو اس طرح بلندی سے پٹخ دیتی ہے کہ پستی و ذلت کے تاریک غار کے علاوہ اسکے کے لیے اور کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور انا ربکم الاعلیٰ کہنے والا رب حقیقی کی ایسی سخت گرفت میں آ جاتا ہے کہ پھر کائنات کی بھرپور طاقت اس کے کام آتی ہے نہ عالم ہست و بود کی دولت و حشمت اور اس کو سرنگوں ہو کر یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ۔

۲) انسان "انسانیت کے امتیازات و خصائص" سے بنتا ہے ورنہ حیوان سے بھی بدتر ہے اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ جب انسان کو ہمہ قسم کی دولت و حشمت اور سامان عیش میسر ہوں اور سطوت و طاقت بھی بے اندازہ نصیب ہو تو اس وقت بھی خدا اور خوف خدا سے ہرگز بیگانہ نہ ہو۔

ظفر مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَکُمْ فِی الْخَلْقِ بَسْطَةً فَاذْکُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ۝

اور اے قوم عاد وہ وقت یاد کرو جب تم کو قوم نوح علیہ السلام کے بعد ان کا جانشین بنایا اور تم کو مخلوق میں ہر طرح کی فراخی عطا کی۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو۔

وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ط قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ۝

اور ہم نے بے شبہ تم کو زمین میں قدرت و سطوت عطا کی اور تمہارے لیے ان میں زندگی کے سامان بخشے پھر تم میں بہت کم شکر گذار ہیں۔

۳) انسان جب خدائے تعالیٰ پر یقین محکم کر لیتا اور حلاوت ایمانی سے فیض یاب ہو جاتا ہے تو پھر کائنات

کی بڑی سے بڑی طاقت اور عالم کا ہولناک ظلم بھی اس کو حق و صداقت سے متزلزل نہیں کر سکتا اور وہ کوہ استقامت بن کر ایثار و قربانی کا پیکر ثابت ہوتا ہے چنانچہ اصحاب اخدود کا واقعہ اس کی زندہ شہادت ہے۔

۴) ''جزا از جنس عمل خدائے تعالیٰ کا قانون ناطق ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ظالم و متکبر کو ظلم و کبر کے عالم وجود میں آتے ہی فوراً سزا مل جائے اس لیے کہ بہ تقاضائے صفت رحمت یہاں ساتھ ساتھ قانون امہال (مہلت دینے کا قانون) بھی کام کر رہا ہے البتہ جب اچانک گرفت کر لی جاتی ہے تو پھر چھٹکارا ناممکن ہے۔

اصحاب الفیل

۵۷۱ء سنہ ولادت باسعادت ﷺ عام الفیل

- حبش
- نجاشی
- یمن و حبش کی کشمکش
- القلیس
- قرآن حکیم اور اصحاب الفیل
- بصائر و عبر
- حکومت
- مذہب و تمدن
- ابرہۃ الاشرم
- اصحاب الفیل
- تفسیری مباحث

حبش

سبا کی بحث میں یہ ذکر آچکا ہے کہ حکومت سبا کی حدود مملکت جنوبی عرب سے شروع ہو کر شمال عرب اور افریقہ تک وسیع ہو گئی تھیں۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن اور افریقہ کے درمیان بحر احمر اور بحر عرب کے جو گوشے حائل ہیں۔ ان کو بحر حبش کہا جاتا ہے اس لئے یمن کے مقابل بحر حبش عبور کر کے افریقہ کے سواحل پر جو آبادیاں ہیں اور جو دراصل سبا کی تجارتی نو آبادیاں تھیں اس قطعہ کو عرب جغرافیہ داں حبش کہتے ہیں اور یہ یورپین اقوام میں ابی سینیا، یونان میں ایتھوپیا اور خود اہل حبش میں جیز کہلاتا ہے۔ لغت عرب میں حبش کے معنی اختلاط و امتزاج کے آتے ہیں۔[1] چونکہ عرب مؤرخین کے نزدیک حمیر (سبا) اور حبشہ کے اصل باشندوں کے اختلاط سے یہ قوم عالم وجود میں آئی اس لیے انھوں نے ان کا یہ نام تجویز کیا ہے۔[2]

اور علماء انساب کہتے ہیں کہ جب اہل حبش (اکسوم) نے یمن پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تو سبا کے خاندانوں میں یہ کہہ کر سلسلۂ ازدواج قائم کیا کہ اصلاً وہ طے بن ادد (بنی کہلان) کی اولاد ہیں اور سبا ہی کی ایک شاخ ہیں۔
(القصد والامم ص ۱۶۶ ابن عبد البرؒ)

اور یورپین مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ اہل حبش (اکسوم) غیر مخلوط سامی الاصل نہیں ہیں بلکہ اصل باشندوں کے ساتھ مختلف اقطاع عرب کے مختلف قبائل مل گئے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (سبا))

بہر حال ان اقوال کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ افریقی قبائل (بنی حام) کے اختلاط سے قوم حبش وجود میں آئی ہے۔

۱: حبش الشیء۔ جمعہ والاحابیش، جماعة من الناس لیسوا من قبیلة واحدة۔
۲: دائرۃ المعارف للبستانی و وجدی و دائرۃ المعارف الاسلامیہ (حبش و سبا)

حکومت

اس مخلوط سبائی قوم کا دارالحکومت شہر اکسوم تھا جو ملک حبش کے صوبہ تجریے میں بجانب مشرق واقع تھا۔ اس شہر کے آثار اب تک باقی ہیں اور اہل حبش اس کو مقدس شہر سمجھتے ہیں۔ (ایضاً ایڈیشن ۹ ج ۱ ص ۶۷-۶۶)

کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں حمیر نے ریدان کے قلعہ میں اپنی حکومت کا پرچم بلند کیا اسی زمانہ میں حبش نے اکسوم میں حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً ۱۱۵ ق م سے چھٹی صدی ہجری تک قائم رہی۔

نجاشی

عرب، حبشہ کے بادشاہ کو نجاشی کا لقب دیتے ہیں دراصل یہ حبشی لفظ نجوس کا معرب ہے حبش کی زبان میں نجوس کے معنی "بادشاہ" کے ہیں۔ اصحمہ بن ابجر مشہور نجاشی حبش ان خوش قسمت بادشاہوں میں سے ہے جنھوں نے نبی اکرم ﷺ کی پیدائش کا زمانہ پایا اور اسلام کی دولت سے مشرف ہوئے ان ہی کے زمانہ میں مسلمانوں نے پہلی ہجرت حبشہ کی جانب کی نجاشی نے ان کو باعزت پناہ دی اور قریش کے اس مطالبہ کو ٹھکرا دیا کہ مسلمانوں کو ان کے حوالہ کر دیا جائے اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی اس تقریر سے متاثر ہو کر جو نجاشی کے دربار میں انھوں نے صداقت اسلام اور حقیقت اسلام پر کی تھی اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی وہ نجاشی ہیں جن کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا سلسلہ مراسلت رہا ہے اور یہی وہ نجاشی ہیں جن کے انتقال پر نبی اکرم ﷺ نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بذریعہ وحی ان کے انتقال کی خبر دی۔

مذہب و تمدن

حبش کا مذہب اور ان کا تمدن شروع سے ہی مصر (عرب) کے مذہب و تمدن سے متاثر رہا ہے اس لیے ان کا تمدن قریب قریب عرب ہی کا تمدن ہے اور مذہبی اعتبار سے یہ خاندان شروع میں مصری اور یمنی قبائل کی طرح یمنی اور بت پرست تھا لیکن جب رومی بادشاہوں کے اثر سے مصر نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو اس کا اثر حبش پر بھی پڑا اور ۳۳۰ء میں سب سے پہلے اُذینہ نجاشی نے عیسائیت کو قبول کیا۔

حبش و یمن کی کشمکش

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ روم و ایران کی رقیبانہ و حریفانہ کشمکش نے یمن اور حبش کو بھی متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا اور سیاسی اور تجارتی رقابت نے ان دونوں کے درمیان بھی کشمکش قائم کر دی جس کے نتیجہ میں یمن اور ایران ایک جانب نظر آتے ہیں اور حبش و روم دوسری جانب، پھر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ جس زمانہ میں حبش میں عیسائیت کا ظہور ہوا اسی کے قریب یمن میں یہودیت نے قدم جمائے، اگرچہ اس زمانہ میں عیسائیت کو کافی فروغ حاصل تھا مگر نہیں معلوم کن وجوہ کی بناء پر اہل عرب عیسائیت کے ساتھ مانوس نہیں تھے اس لیے یمن نے جب تبدیل مذہب کیا تو یہودیت کو قبول کیا اور عیسائیت کی جانب رجحان نہ کیا مگر چوتھی صدی عیسوی میں جب اُذینہ نجاشی حبشہ نے عیسائیت کو قبول کر لیا تو یمن اور حبش کے درمیان مذہبی منافرت کے جذبات نے سابق رقابت کو اور زیادہ مشتعل کر دیا اور اسی اشتعال کے نتائج میں "اصحاب اخدود" کا سانحہ پیش آیا اور ذونواس شاہ یمن

کے اس ظلم کی دادرسی کے لیے نجران کے ایک سردار دوس بن تغلبان نے نجاشی کے توسط سے قیصر روم تک فریاد پہنچائی اور قیصر روم نے نجاشی حبش کو حکم دیا کہ وہ یمن پر حملہ کر کے حمیریوں سے انتقام لے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:

اوائل چھٹی صدی میں حمیر (ذونواس) نے عیسائیوں کو سخت تکلیف پہنچائی، جیٹنین اول نے شاہ حبش کالب الاصبح کو لکھا کہ انکی امداد کرے چنانچہ اس نے حمیر کے ہاتھ سے یمن چھین لیا۔

(ج مضمون یمن بینا)

اور ابن کثیر کہتے ہیں کہ دوس نے قیصر روم کے پاس براہ راست فریاد کی اور قیصر نے ایک حکم نامہ دے کر اس کو نجاشی کے پاس بھیج دیا۔ دوس جب قیصر کا شاہی فرمان نجاشی کے پاس لے کر پہنچا تو وہ ستر ہزار فوج کے ساتھ یمن پر حملہ آور ہوا، ذونواس بھی فوج گراں لے کر مقابلہ پر آیا مگر شکست کھا گیا اور گھوڑے پر سوار دریا میں کود گیا کہ پار اتر کر فرار ہو جائے مگر پار نہ ہو سکا اور دریا میں غرق ہو گیا۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ص ۱۶۹)

عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ یمن کے فاتح کا نام ارباط تھا اور ابرہۃ الاشرم اس کے ہمرکاب تھا مگر یونانی کہتے ہیں کہ اس کا نام اسمیفوس تھا اور اس زمانہ کے نجاشی کا نام الیباس (الاصبح) تھا۔

غرض مؤرخین عرب کی روایت کے مطابق ارباط یمن کا پہلا گورنر بنایا گیا حتی کہ چند سال کے بعد ابرہہ نے اس پر بغاوت کر دی اور اس کو مار ڈالا اور بلاشرکت غیرے یمن پر قابض ہو گیا۔ جب نجاشی الاصبح کو یہ خبر پہنچی تو وہ سخت غضبناک ہوا اور اس نے قسم کھائی کہ ابرہہ کو قتل کر کے اس کے دارالحکومت کو پیروں تلے روند ڈالے گا۔

ابرہہ نے یہ سنا تو بہت گھبرایا اور اپنے جسم سے کچھ خون نکال کر ایک شیشی میں بند کیا اور ایک تھیلہ میں یمن کی خاک بھری اور دونوں چیزوں کو قاصد کے ہاتھ نجاشی کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ جس طرح ارباط آپ کا تابع فرمان تھا اسی طرح یہ غلام بھی ہمیشہ تابع اور مطیع رہے گا جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ حضور والا مجھ سے خفا ہیں اس وقت سے سخت پریشان ہوں اور میں آپ کی قسم کو پورا کرنے کے لیے اپنا خون اور یمن کی خاک بھیج رہا ہوں کہ آپ اس خون کو یمن کی خاک پر ڈال کر پیروں سے روند دیجیے اور اپنی قسم پوری کر لیجیے نجاشی نے ابرہہ کی معافی کو وقت کی مصلحت کے مناسب خیال کرتے ہوئے قبول کر لیا اور یمن پر ابرہہ کی گورنری کو منظور کر لیا اور اس طرح وہ یمن پر مطمئن حکومت کرنے لگا۔ (ایضاً ج ا)

ابرہۃ الاشرم

ابرہہ کے متعلق مؤرخین کا یہ بیان ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تھا اور چونکہ نکٹا تھا اس لیے اہل عرب اس کو ابرہتہ الاشرم کہتے ہیں۔ عربی میں "اشرم" نکٹے کو کہتے ہیں اس کی حکومت کا آغاز بعض کے نزدیک ۵۲۵ء اور بعض کے نزدیک ۵۴۳ء سے ہوتا ہے۔

صاحب ارض القرآن دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابرہہ ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے یہ عیسائیت میں بہت پر جوش تھا اس نے تمام قلمرو میں عیسائی مبلغ مقرر کیے اور شہروں میں بڑے بڑے گرجا (کنیسا) تعمیر کرائے ان تمام کلیساؤں میں سب سے بڑا اور مشہور کلیسا دارالحکومت

صنعاء میں تیار کرایا جس کو اہل عرب ''القلیس'' کہتے ہیں جو یونانی لفظ ''کلیسا'' کا معرب ہے۔

ابن جریر اور ابن کثیر بروایت محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ ''کلیسا'' بلحاظ فن تعمیر عدیم النظیر تھا اور جب یہ تعمیر ہو گیا تو ابرہہ نے نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لیے صنعاء میں ایسا بے نظیر گرجا تعمیر کرایا کہ اس سے قبل تاریخ نے ایسا گرجا کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اب میری تمنا یہ ہے کہ اقطاع وامصار کے عرب جو مکہ میں کعبہ کا حج کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں ان سب کا رخ اس کلیسا کی جانب پھیر دوں اور کل عرب کے لیے یہی مقام حج بن جائے اہل عرب نے سنا تو ان میں سخت برہمی پیدا ہو گئی۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۰)

سہیلی کہتے ہیں کہ ابرہہ نے اس کی تعمیر میں اہل یمن پر بہت سخت مظالم کیے اہل یمن کو جبر امزدور بنایا اور یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زروجواہر کو بے دریغ اس پر صرف کیا یہ بیش قیمت پتھروں کی بہت خوبصورت اور بہت طویل و عریض عمارت تھی اور عجیب و غریب زرکار نقوش سے منقش اور جواہر ریزوں سے مزین تھی اور ہاتھی دانت اور آبنوس کے نہایت حسین و جمیل منقش منبروں اور سونے چاندی کی صلیبوں سے اس کو سجایا گیا تھا۔[1]

اصحاب الفیل

تاریخ عرب اس کی شاہد ہے کہ تمام اہل عرب خواہ وہ کسی بھی فرقہ اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں کعبہ کی بہت زیادہ عظمت کرنے اور اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اس کا حج کرنا مقدس فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ خاص کعبہ کے اندر عرب کے مختلف فرقوں کے بت تین سو ساٹھ کی تعداد میں نصب تھے۔

(روض الانف ج ۱ و تاریخ ابن کثیر ۲ ص ۱۷۰)

حتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام کی تصاویر بھی موجود تھیں اور جب فتح مکہ میں نبی اکرم ﷺ فاتحانہ داخل ہوئے ہیں تو آپ ﷺ کے ارشاد پر جس وقت حضرت علیؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ نے ان بتوں کو کعبہ سے خارج کیا ہے تو اس وقت بھی یہ تصاویر کعبہ کے اندر موجود تھیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے جب یہ ذکر آیا کہ مشرکین عرب نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تصویر اس طرح بنائی ہے کہ ان کے ہاتھ میں ''پانسے'' ہیں تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مشرکین جھوٹے ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام کا دامن اس بیہودہ عمل سے پاک ہے۔ (بخاری باب فتح مکہ)

بہر حال جب صنعاء میں مقیم کسی حجازی نے یہ سنا کہ ابرہہ نے ''القلیس'' کو اس نیت سے بنایا ہے تو اس کو غصہ آیا اور اس نے ایک شب میں موقع پا کر اس کلیسا کو نجس کر دیا۔ ابرہہ کو جب صبح کو یہ معلوم ہوا اور تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ کام کسی حجازی کا ہے تو غصہ سے بے قابو ہو گیا اور گرجا کی بے حرمتی دیکھ کر غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھانے لگا اور قسم کھائی کہ اب کعبۂ ابراہیمی کو برباد کیے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا، یہ ارادہ کر کے ابرہہ لشکر جرار اور ہاتھیوں کی ایک تعداد ساتھ لیکر مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہ خبر تمام قبائل عرب میں ہوا پر

[1] اس کے آثار عباسی خلیفہ اول سفاح کے زمانہ تک موجود تھے۔

سوار ہو کر پہنچ گئی اور تمام عرب میں اس سے ایک ہیجان پیدا ہو گیا سب سے پہلے یمن ہی کے ایک امیر ذونصر نے یمن سے نکل کر عرب کے مختلف قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ میں ابرہہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں آپ کو چاہیے کہ اس نیک مقصد میں میرا ساتھ دیں چنانچہ وہ آگے بڑھ کر ابرہہ کے مقابل آیا اور اس سے جنگ کی مگر شکست کھا گیا اور ذونصر گرفتار کر لیا گیا۔ اسکے بعد قبیلہ بنی خثعم کے سردار نفیل بن حبیب سے مقابلہ ہوا اور اس کو بھی شکست اٹھانی پڑی اور وہ بھی گرفتار ہو گیا جب ابرہہ طائف پہنچا بنی ثقیف کے سردار مسعود بن معتب نے آگے بڑھ کر ابرہہ کو یقین دلایا کہ مجھ کو اور میرے قبیلہ کو آپ سے کوئی پرخاش نہیں ہے اسلئے کہ ہم کو یہ یقین ہے کہ آپ ''بیت اللات'' کے انہدام کا ارادہ نہیں رکھتے جس میں ہمارا سب سے معظم و محترم معبود لات نصب ہے ابرہہ نے ان کو اطمینان دلایا اور خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ مسعود ثقفی نے راستہ بتانے کیلئے ایک شخص ابوغال کو راہنما بنادیا مگر ابورغال وادی مغمس پہنچ کر مر گیا کہتے ہیں کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں اس کی قبر کو سنگسار کیا کرتے تھے کہ یہ کعبہ کے انہدام کیلئے راہنما بنا تھا۔

مغمس پہنچ کر ابرہہ نے ایک حبشی فوجی افسر کو جس کا نام اسود بن مقصود تھا حکم دیا کہ وہ مکہ جا کر چھاپہ مارے اسود، مکہ کے قریب پہنچا تو قریش اور دوسرے قبائل کے اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو جو کثیر تعداد میں چر رہے تھے، پکڑ کر اپنے لشکر میں لے گیا ان میں عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ شامل تھے۔

اس زمانہ میں عبدالمطلب قریش کے سردار تھے یہ حال دیکھ کر قریش کنانہ، ہزیل اور دیگر قبائل نے آپس میں مشورہ کیا کہ ابرہہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ ہم میں طاقت مدافعت نہیں ہے اس لیے ہم کو مکہ چھوڑ کر قریب کہ پہاڑی پر چلے جانا چاہیے ابھی یہ لوگ مکہ میں میں تھے کہ ابرہہ کی جانب سے جناطہ الحمیری پہنچا اور دریافت کیا کہ مکہ کا سردار کون ہے۔؟

لوگوں نے عبدالمطلب بن ہاشم کی جانب اشارہ کیا جناطہ نے کہا میں ابرہہ کی جانب سے آیا ہوں ہمارے بادشاہ کا یہ حکم ہے کہ آپ سے جنگ کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں ہم تو صرف اس گھر (بیت اللہ) کو ڈھانے کے لیے آئے ہیں۔ پس اگر تمہارا ارادہ مقابلہ اور مدافعت کا ہو تو تم جانو اور اگر تم ہمارے اس ارادے میں حائل نہ ہو تو ہمارا بادشاہ آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا ہمارا قطعاً ارادہ نہیں کہ ہم تمہارے بادشاہ سے جنگ کریں اور نہ ہم میں یہ طاقت ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس کے برگزیدہ نبی ابراہیم کی یادگار، پس اگر اللہ اس کی حفاظت کرنا چاہے گا تو وہ کر سکتا ہے اور اگر اس کو اس کی حفاظت مقصود نہیں ہے تو ہم قوت مدافعت کے قابل قطعاً نہیں ہیں۔

غرض اس گفتگو کے بعد عبدالمطلب ابرہہ کے لشکر میں پہنچے اور ایک درباری کی جانب سے سفارش و تعارف پر اس کے سامنے پیش ہوئے عبدالمطلب بہت شاندار اور وجیہ و شکیل انسان تھے، ابرہہ نے دیکھا تو ان کے ساتھ عزت سے پیش آیا اور اپنے برابر ان کو جگہ دی۔

گفتگو شروع ہوئی تو ان کی طلاقت لسانی اور خطابت سے ابرہہ بہت زیادہ متاثر ہوا۔

دوران گفتگو میں جب معاملہ پر بات چیت شروع ہوئی تو عبدالمطلب نے شکایت کی کہ آپ کے ایک سردار

نے میرے اونٹ گرفتار کر لیئے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ ان کو میرے حوالہ کر دیجیے ابرہہ نے یہ سنا تو کہا عبد المطلب! میں تو تم کو بہت فہیم و عقیل سمجھتا تھا لیکن اس سوال پر سخت متعجب ہوں تم کو معلوم ہے کہ میں کعبہ کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں جو تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ باعظمت اور مقدس ہے لیکن تم نے اس کے متعلق ایک جملہ بھی نہیں کہا اور ایسی چھوٹی اور حقیر بات کا ذکر کر رہے ہو؟ عبد المطلب نے جواب دیا" بادشاہ یہ اونٹ چونکہ میری ملکیت ہیں اس لیے میں نے ان کے متعلق درخواست پیش کی اور کعبہ میرا گھر نہیں، خدا کا مقدس گھر ہے وہ آپ اس کا محافظ ہے میں کون ہوں جو اس کے لیے سفارش کروں؟ ابرہہ کہنے لگا اب اس کو میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ عبد المطلب نے جواب دیا آپ جانیں اور رب البیت جانیں یہاں پہنچ کر سلسلۂ گفتگو ختم ہو گیا اور ابرہہ نے اپنے لشکریوں کو حکم دیا کہ عبد المطلب کے اونٹ واپس کر دیے جائیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ عبد المطلب کے ہمراہ بنی بکر کا سردار یعمر بن نفاثہ اور بنی ہزیل کا سردار خویلد بن واثلہ بھی تھے روانگی سے قبل انھوں نے ابرہہ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ اگر کعبہ کے انہدام سے باز آجائیں تو ہم تہامہ کا ایک تہائی مال آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے مگر ابرہہ نے اپنی طاقت کے نشہ میں اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور اپنے ارادہ پر اڑا رہا تب یہ لوگ ناکام واپس آگئے۔

عبد المطلب نے واپس آکر قریش اور دوسرے قبائل عرب کو جمع کیا اور ان کو تمام گفتگو سنا کر یہ مشورہ دیا کہ اب ہم سب کو قریب کی کسی پہاڑی پر پناہ گزین ہو جانا چاہیے تاکہ اس منظر کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں جب اہل مکہ پہاڑی پر جانے لگے تو عبد المطلب کی قیادت میں کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور اس کی زنجیر پکڑ کر درگاہ الٰہی میں یہ دعاء کی:

"خدایا ہم اس بارے میں غمگین نہیں ہیں کہ جب ہم اپنی متاع کی حفاظت کر سکتے ہیں، تو اپنی متاع (کعبہ) کی تجھ کو بھی ضرور حفاظت کرنی ہے اور تیری تدبیر پر نہ صلیب کی طاقت غالب آسکتی ہے اور نہ اہل صلیب کی کوئی تدبیر، ہاں اگر تو ہی یہ چاہتا ہے کہ ان کو اپنے مقدس گھر کو خراب کرنے دے تو پھر ہم کون؟ جو تیرا جی چاہے سو کر۔"

مؤرخین نے عبد المطلب کے ان اشعار کو بھی نقل کیا ہے جو انھوں نے اپنے خاص اندازِ خطابت کے ساتھ فی البدیہ درگاہ الٰہی میں پیش کیے اور جن کا ترجمہ ہم ابھی نقل کر چکے ہیں

لا هم ان العبد يمنع رحاله فامنع رحالك

لا يغلبن صليبهم ومحالهم غدٓ وامحالك

ان كنت تاركهم و قبلتنا فامر ما بدالك

(تاریخ ابن کثیر ج ۲)

اس کے بعد عبد المطلب اور تمام قریش مکہ کو خالی کر کے قریب کے پہاڑوں پر چلے گئے اور گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو کر حالات کا انتظار کرنے لگے۔

اگلے دن صبح کو ابرہہ نے اپنا لشکر مکہ کی جانب بڑھایا اگلی قطاروں میں ہاتھی تھے اور ان کے پیچھے لشکر جرار، ابھی

یہ لشکر مکہ تک نہیں پہنچا تھا کہ راہ میں ہی اچانک پرندوں کے غول کے غول نمودار ہوئے اور لشکر کے سر پر فضا میں چھاگئے ان کی چونچ اوران کے پنجوں میں سنگریزے لگتے تھے، بدن پھوڑ کر باہر نکل آتے تھے اور فوراً ہی اعضاء گلنے اور سڑنے لگتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑی دیر میں سارا لشکر زیروزبر ہو کر رہ گیا۔

محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اسی حال میں لشکر سے فرار ہو کر یمن اور حبشہ پہنچے اور انھوں نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی تباہی کا حال سنایا۔

اور مشہور محدث ابن ابی حاتم بروایت عبید بن عمیر نقل کرتے ہیں کہ جب ابرہہ کا لشکر مکہ کی جانب بڑھا تو تیز ہوا چلی اور سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اڑتے ہوئے لشکر پر چھاگئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضا میں پرندوں کا زبردست لشکر پرے کے پرے باندھے ہوئے ہے ان کے منھ اور ان کے دونوں پنجوں میں سنگریزے تھے انھوں نے اول تو آواز کی اور پھر لشکر پر سنگریزے مارنے لگے۔ ساتھ ہی تندو تیز ہوا چلنے لگی جس نے اس سنگ باری کو لشکر کیلئے مصیبت عظمیٰ بنادیا، چنانچہ جس شخص پر یہ سنگریزے گرے بدن پھوڑ کر باہر نکل آئے اور بدن گلنے اور سڑنے لگااور اس طرح ان سنگریزوں نے سارے لشکر کو چھلنی کر ڈالا۔[1]

محمد بن اسحٰق نے بروایت عکرمہ نے نقل کیا ہے کہ اسی سال عرب میں مرض چیچک کا ظہور ہوا۔

قرآن اور اصحاب فیل

قرآن عزیز نے اس واقعہ کا سورۂ الفیل میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے گویا ذات اقدس محمد ﷺ پر خدائے تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور ان کے اعزاز و اکرام کا عظیم الشان ''نشان'' ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ○ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ○

۱: کہتے ہیں کہ ابرہہ نے فوج کو حکم دیا کہ وہ مکہ کی جانب بڑھے، جب وہ مکہ کے قریب پہنچی ہے تو ہاتھیوں کی قطار میں سے سب سے پہلے اس ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، جس پر ابرہہ سوار تھا۔ فیلبان اگرچہ اس کے آنکس پر آنکس اگار ہا اور زبانی ڈپٹ رہا تھا۔ مگر وہ کسی طرح آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن جب اس کو یمن کی جانب چلاتے تھے تو وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگتا تھا، اس حالت میں اچانک پرندوں کے غول نے آگھیرا۔

گویا قدرت کی جانب سے ابرہہ

یہ آخری تنبیہ تھی کہ وہ اب بھی سمجھ جائے کہ اس کا یہ ارادہ باطل اور ناپاک ہے اور یہ جرأت دراصل خدا کی طاقت کو چیلنج ہے۔ اسلئے اس کو اس سے باز آجانا چاہئے لیکن اس بدبخت نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کردار کی پاداش کو پہنچ کر رہا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب پرندوں کی سنگساری سے ابرہہ کا لشکر برباد ہو گیا تو اس میں سے بعض آدمی جو بدحالی کے ساتھ فرار ہو کر یمن پہنچے تھے۔ ان میں سے خود ابرہہ بھی اس حالت میں پہنچا کہ اس کے تمام اعضاء گل سڑ کر گر چکے تھے اور وہ صرف ایک مضغہ گوشت نظر آتا تھا۔

یعنی قدرت نے جس طرح فرعون کو غرق کر دینے کے بعد اس کی نعش کو اسلئے کنارہ پر پھینک دیا تھا کہ وہ مصر کے قبطیوں اور بنی اسرائیل دونوں کیلئے سامانِ عبرت و بصیرت بنے۔ اسی طرح یمن اور حبش کے باشندوں کی عبرت کیلئے ابرہہ کو اس حالت میں یمن پہنچایا کہ وہ یہ غور کریں کہ جس شخص نے اپنی مادی قوت کے گھمنڈ پر خدا کی طاقت کو چیلنج کیا تھا۔ آج قدرت کے زبردست ہاتھ نے اس کا یہ حال کر دیا فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ

وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ○ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ○

(اے محمد ﷺ) کیا تو نے نہیں دیکھا (تجھ کو معلوم نہیں) کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکارہ نہیں بنادیا اور بھیج دیے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ، وہ پھینک رہے تھے ان پر سنگریزے پس کر دیا ان کو کھائے بھوسہ کی طرح۔

اصحاب فیل کا یہ عجیب وغریب واقعہ ماہ محرم میں ولادت باسعادت محمد ﷺ سے چالیس یا پچاس روز قبل پیش آیا، اہل عرب میں یہ واقعہ اس درجہ اہمیت وشہرت رکھتا تھا کہ انھوں نے اس سال کا نام "عام الفیل" (ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا اور اس کے بعد تاریخی واقعات کو اسی سنہ کے حساب سے شمار کرنے لگے جو عیسوی سنہ کے حساب سے ۵۷۱ء اور رومی سنہ کے حساب سے ۸۸۲ سکندری کے مطابق ہوتا ہے۔

روایات عرب اور عرب مؤرخین میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور ومعروف تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ کی زندگی مبارک میں سورۃ الفیل کا نزول ہوا تو مشرکین یہود اور نصاریٰ کی اس عداوت کے باوجود جو آپ ذات مبارک سے ان کو تھی کسی سمت سے بھی اس سورۃ میں بیان کردہ واقعہ کے خلاف کوئی صدا بلند نہیں ہوئی کہ یہ واقعہ غلط ہے یا اس کی اصل حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دوسری ہے۔

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ یہ واقعہ صرف ذات اقدس ﷺ ہی سے نہیں بلکہ تمام عرب خصوصاً قریش کی عظمت وعزت بڑھاتا تھا اس لیے کسی نے اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی یہ بات اس لیے غلط ہے کہ جس وقت یہ سورۃ نازل ہوئی ہے اس وقت عرب میں مذہبی فرقہ بندی کے اعتبار سے عرب کے مختلف حصوں میں عموماً اور نجران کے مشہور شہر میں خصوصاً عیسائیت مشرکین مکہ اور محمد ﷺ دونوں کی حریف ورقیب تھی اس لیے وہ عربی نژاد ہونے کو قطع نظر کر سکتے تھے مگر عیسائیت کی اس توہین کو جوان کے زعم میں یا قریش مکہ کی عزت کو بڑھاتی تھی اور یا محمد ﷺ کی عظمت کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے بلکہ وہ اور یہود دونوں ایسے واقعہ کو سننا بھی گوارانہ کرتے جو ان کے قبلہ "صخرۂ بیت المقدس" کے علاوہ ایسے مقام "کعبہ" کی صد ہزار عظمت کا اظہار کرتا ہے جس کے قبلہ بننے کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور علی الاعلان اس کو جھٹلاتے تھے۔

بہر حال تاریخ کی صاف اور بے لوث شہادت یہ ثابت کر رہی ہے کہ ایک عیسائی معاصر نے بھی اس واقعہ کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کی اور ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں نجران کا وفد (ڈیپوٹیشن) آیا ہے تو وہ اپنے خیال میں اسلام کے خلاف جس قسم کی نکتہ چینیاں کر سکتا تھا اور محمد ﷺ اور قرآن کی تکذیب میں جو دلائل دے سکتا تھا وہ سب اس نے پیش کیے لیکن اس واقعہ کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا اور اگر ایسا ہوا ہوتا تو جس تاریخ نے ساڑھے تیرہ سو برس سے ان تمام اعتراضات کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے جو معاندین کی جانب سے نبی اکرم ﷺ قرآن اور اسلام پر کیے گئے ہیں وہ کیسے اس اعتراض کو فراموش کر سکتی تھی۔

لہٰذا تعصب سے پاک حقیقت بین نگاہ کو یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ یہ واقعہ اپنی تفصیلات کے ساتھ جس طرح

عرب روایات اور مؤرخین عرب کے یہاں محفوظ اور مشہور ہے وہ قطعاً صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی آخر کون سی وجہ ہے جب کہ سورۃ الفیل کے نزول کے وقت اس واقعہ کو گذرے صرف بیالیس تینتالیس سال ہوئے اور اس لیے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھنے والے ہزاروں اور اپنے والدین اور وطنی روایات سے سننے والے لاکھوں کی تعداد میں تمام اقطاع عرب میں موجود تھے۔

لیکن صدیوں کے بعد آج یورپین مؤرخین یہ کہتے ہیں واقعہ صرف اتنا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا، راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہوگئی اور لطف یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعویٰ کے لیے نہ کوئی تاریخی دلیل ہے اور نہ معاصرانہ شہادت بلکہ صرف عرب مؤرخین (محمد بن اسحٰق وغیرہ) کے اس بیان سے کہ "اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا" یہ فیصلہ کر لیتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا یہ کون سا نظریہ ہے کہ ایک روایت کے تمام واقعات کا تو اپنے مخالف سمجھ کر بلا دلیل انکار کر دیا جائے اور اس واقعہ کے ایک ضمنی جملہ کے مفہوم کو بدل کر اور بغیر کسی سند کے اپنی جانب سے اس میں اضافہ کر کے ایک نیا مطلب پیدا کر لیا جائے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بقول ابن اسحٰق اسی سال عرب میں چیچک کا ظہور ہوا اور غیر اسلامی روایات کے مطابق ہم یہ بھی قبول کیے لیتے ہیں کہ اسی سال یمن اور حبش میں بھی اس مرض نے سر نکالا تاہم اس سے یہ کیسے لازم آجاتا ہے کہ

۱) ابرہہ "کعبہ" کے ڈھانے کے لیے لشکر لے کر نہیں نکلا تھا جیسا کہ مستند تواریخ سے ثابت ہوتا ہے بلکہ رومیوں کی مدد کو نکلا تھا جیسا کہ یورپین مؤرخین بے دلیل محض اٹکل سے کہہ رہے ہیں۔

۲) اور یہ کہ ابرہہ کا لشکر رب کعبہ کے حکم سے چڑیوں کی سنگ باری سے تباہ نہیں ہوا جیسا کہ معاصر شہادتوں اور تواتر کے درجہ کی روایاتِ ملکی و تاریخی سے ثابت ہے بلکہ چیچک کی وبا سے برباد ہوگیا جس کے لیے تاریخ میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

یہ بات تو ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ ابرہہ "القلیس" کے انتقام میں کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا پس اگر سمندر کی جانب سے آنے والی چڑیوں نے سنگریزوں کے ذریعہ سے بحکم رب کعبہ چیچک کے ایسے سخت جراثیم پیدا کر دیے کہ انھوں نے حملہ آوروں کو سانس لینے کی بھی مہلت نہیں دی اور سنگریزوں کے لگنے کے فوراً بعد ہی بدن گلنے اور سڑنے لگا اور سارا لشکر ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا تو اس کو کیا کہنا چاہیے؟ اور یہ اگر قادر مطلق کی جانب سے ابرہہ اور اس کے لشکر پر عذاب نہیں تھا تو اور کیا تھا فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ فطرت پرست "یورپین مؤرخین" یا تو اس واقعہ کو اس وجہ سے مسخ کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے کعبۃ اللہ کی عظمت اور وقت کی خود ساختہ عیسائیت کی اہانت کا پہلو بہت صاف اور نمایاں طور پر سامنے آتا اور قدرت کے ہاتھوں حق و باطل کے معرکہ میں حق کے غلبہ اور باطل کی مغلوبیت کا اعلان ہو جاتا ہے یا محض فطرت پرستی اور مادہ پرستی کے جذبہ میں انھوں نے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود طاقت کے مشاہدہ سے آنکھ بند کر لی ہے اور وہ ایسے واقعات کو ناممکن خیال کر لیتے ہیں حالانکہ اسی آسمان کے نیچے تاریخ اقوام و

امم نے بار ہا ایسے مشاہدے کیے ہیں اور تاریخ نے ان کو اپنی آغوش میں محفوظ رکھا ہے کہ جب بھی کوئی قوم ظلم و تکبر طغیان و عصیان اور فساد و سرکشی میں حد سے گذر گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اجرام ارضی و سماوی میں سے کبھی ہوا کو کبھی برق کو کبھی باد و باراں کو کبھی ہولناک چیخ کو اور کبھی حیوانات کی یورش کو اس طرح ان پر مسلط کر دیا ہے کہ آنکھوں دیکھتے وہ اور ان کا زبردست تمدن و حکومت کی مالک تھیں مگر جب انھوں نے خدا کی زمین میں فساد مچا دیا۔ زیر دستوں پر ظالمانہ قابض ہو کر ان کو کچل ڈالا۔ شرک و کفر میں بے باک ہو کر خدا کے پیغمبروں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کیا اور انانیت میں آ کر بعض نے خدائی کا دعویٰ تک کر دیا تو ان ہی عناصر اور مخلوق ارضی و سماوی کے ذریعہ جن کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس طرح ہلاک و برباد کر دیا کہ تاریخ کے اوراق کے سوا دنیا میں ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

مگر انسان کی اس غفلت کو کیا کیجیے کہ وہ کوتاہی عقل سے گذشتہ واقعات کا انکار کرنے پر بہت جلد آمادہ ہو جاتا اور نئے کرشمۂ غیبی کا طالب ہوتا ہے بلکہ بنی اسرائیل کی طرح بیجا جسارت کے ساتھ یہ کہہ اٹھتا ہے،

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً

اور جب وہ بھی اگلوں کی طرح عذاب الٰہی میں گرفتار ہو جاتا ہے تو حسرت و افسوس کرتا ہوا دوسروں کے لیے سامان عبرت و بصیرت بن جاتا ہے اور اس وقت کا اعتراف و اقرار اور اس وقت کی حسرت و ندامت اس کے کسی کام نہیں آتی،

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ○ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ط سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُوْنَ ○

پس جب دیکھا انہوں نے عذاب ہمارا تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے ایک خدا پر اور جس چیز کو خدا کا شریک ٹھیراتے تھے اس سے منکر ہوئے، پس ان کے اس ایمان نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا، جب انہوں نے ہمارا عذاب آنکھوں سے دیکھ لیا، اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے جو ہمیشہ سے اس کے بندوں کے ساتھ جاری ہے اور کافروں نے اس موقع پر خسارہ ہی اٹھایا۔

یہی حال آج یورپین مادہ پرستوں اور ان کے کور باطن مقلدوں کا ہے کاش کہ وہ حقیقت حال کو سمجھنے کی کوشش کریں اور حقائق سے انکار اور ان کا استہزاء نہ کریں۔ انھیں تاریخ کے دہرائے ہوئے اس سبق کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ لارڈ کچز نے اسی زمانہ میں مصر پر جارحانہ مظالم کرتے ہوئے بڑے تکبر کے ساتھ سر بلند کرتے ہوئے یہ کہا تھا "آج میں مصر کا فرعون ہوں" پھر تم نے دیکھا کہ خدائے برتر کے قانون "پاداش عمل" نے اس کو وہی جواب دیا جو فرعون کو ملا تھا فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ اور اس کی غرق دریا نعش کو یورپ کی سائنس جدید کا کوئی کرشمہ بھی قعر دریا سے اوپر نہ لا سکا۔

یہ واقعہ صدیوں کا نہیں ہے، ہماری اور تمہاری زندگی کا واقعہ ہے پھر کیا منکرین خدا اور منکرین قدرت خدا

نے اس واقعہ سے کوئی سبق حاصل کیا؟ نہیں بلکہ انھوں نے یہ کہہ کر ضمیر کی آواز کو دبالیا کہ یہ تو بخت واتفاق کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے جو گزرا،اور انہوں نے ایسا کیوں سمجھ لیا قرآن کہتا ہے صرف اس لیے کہ:

لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ وہ کور چشم ہیں وہ خوب دیکھتے ہیں لیکن ان کے سینوں کے اندر ان کے دل اندھے ہو گئے ہیں" اس لیے جو کچھ دیکھتے ہیں اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے لہٰذا ایسی جماعت کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے:

فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ○

سورۂ فیل اور بعض دیگر تفسیریں

سطورِ بالا میں سورۂ فیل کی تفسیر سلف صالحین رحمہم اللہ اور جمہور کے مسلک کے مطابق کی گئی ہے اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرم کعبہ کی صیانت و حفاظت کے لیے ابرہۃ الاشرم اور اس کے عظیم الشان لشکر کو اپنے قانونِ تعذیبِ اُمم کے پیش نظر اس لیے معجزانہ طور پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے ذریعہ کنکریوں کی مار سے ہلاک و برباد کر دیا کہ قریش بہ اسباب ظاہر اس لشکر جرار کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور رب کعبہ کو بہر حال کعبہ کی حفاظت مقصود تھی۔

یہ تفسیر لغت عرب کی مطابقت، سلف صالحین سے منقول روایات اور تاریخی تواتر کے پیش نظر بغیر کسی رد و انکار کے تیرہ سو سال سے قابل قبول رہی ہے۔

لیکن اس تفسیر کے مطابق چونکہ اس واقعہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اعجاز قدرت اور معجزانہ فعل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اس لیے گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر یورپ کے الحاد سے مرعوب ہو کر بعض حضرات نے سلف کے خلاف یہ سعی فرمائی ہے کہ خواہ حقیقت حال نظر انداز ہو جائے مگر کسی طرح اس واقعہ کا عجوبہ پن دور کر دیا جائے چنانچہ انھوں نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے تفسیر بالرائے سے کام لیا ہے تفسیر بالرائے کے یہی معنی ہیں کہ اس پر نظر کیے بغیر کہ اس بارہ میں قرآن خود کیا کہتا ہے اور ایک خالی الذہن انسان اس سے کیا مطلب اخذ کرتا ہے، اپنی جانب سے پہلے ایک خاص خیال قائم کر لیا جائے اور اس کے بعد آیات قرآنی کی تفسیر اپنی اس اختراعی خیال پر کر دی جائے۔

تفسیر بالرائے کے اصول پر سورۃ الفیل کی پہلی تفسیر سر سید کی جانب سے تہذیب الاخلاق میں کی گئی۔ سید صاحب چونکہ بذات خود عربیت (علوم لغت عرب) اور ان علوم سے جو قرآن عزیز کے حقائق سمجھنے کے لیے از بس ضروری ہیں بیگانہ تھے اس لیے ان کی یہ تفسیر سر تا سر اغلاط اور لغو تاویلات پر مبنی ہے۔ اور تفسیر احمدی کے ان دوسرے مقامات کی طرح جس میں انھوں نے خود قرآن عزیز کی دوسری آیات اور نبی معصوم سے منقول صحیح روایات کے خلاف تفسیر بالرائے بلکہ تحریف معنوی پر غلط اقدام کیا ہے اس مقام پر بھی قرآن کی زبان سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جس کو قرآن کہنے کے لیے تیار نہیں اس کے منہ میں وہ بات رکھ دینی چاہتے ہیں جسے خود اس کی

زبان قبول نہیں کرتی۔

سرسید کی تفسیر سورۃ الفیل کی بنیاد اس امر پر قائم ہے کہ آیت وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ میں "طیر" سے پرند نہیں بلکہ بد فالی مراد ہے اور کنایۃً یہ لفظ بلا و مصیبت کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

مگر سید صاحب اس بات سے قطعاً ناآشنا ہیں کہ عربی لغت میں "طیر" کے معنی بد فالی کے ہرگز نہیں آتے اور وہ لفظ طائر ہے جس کے معنی بد فالی کے آتے ہیں اور جس سے کنایۃً مصیبت و بلاء کا مفہوم مراد ہوتا ہے نیز وہ عربیت کے اس قاعدہ سے بھی قطعاً ناواقف معلوم ہوتے ہیں کہ اگر بفرض محال طیر کے معنی بد فالی کے تسلیم بھی کر لیے جائیں تب بھی اس مقام پر یہ معنی اس لیے نہیں بن سکتے کہ لغت عرب میں اس معنی کے ہوتے ہوئے اس کی جانب ارسال کی نسبت قطعاً غلط اور باطل ہے بلکہ اس کے لیے ارسل علیہم کی جگہ [illegible] علیہم اور القی علیہم بولا جاتا ہے۔

حقائق قرآن سے بے بہرہ مگر یورپ کے الحاد و زندقہ سے مرعوب یہ حضرات قرآن کی تفسیر پر جرأت بے جا تو کرتے ہیں مگر اس بات کو یکسر فراموش فرما دیتے ہیں کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا اور تمام زبانوں کی طرح عربی الفاظ و تراکیب کے لیے بھی کچھ قواعد اور شروط ہیں پس اگر کوئی شخص ان کے خلاف اس کے الفاظ اور اس کے جملوں کے معنی اور مفہوم بیان کرتا ہے تو در حقیقت تحریف معنوی کا مجرم بنتا ہے بہر حال سید صاحب کی تفسیر اس قسم کی اغلاط کا مجموعہ ہے اس لیے علمی مباحث میں جگہ پانے کے لائق نہیں ہے۔

سلف صالحین کے خلاف سورۃ الفیل کی دوسری تفسیر مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ مصنف نظام القرآن کی ہے، یہ تفسیر سلف اور جمہور کی تفسیر سے قطع نظر کر کے صرف عربیت اور اشعار عرب کے پیش نظر کی گئی ہے اور یہ اگرچہ مولانائے مرحوم کی علمی دیانت تقویٰ و طہارت اور درک علوم قرآنی کے پیش نظر ان حضرات کی تفاسیر کی فہرست میں شامل نہیں ہے جنھوں نے محض معجزات کے انکار کی بناء پر تفسیر بالرائے کی مجرمانہ جسارت کی ہے تاہم واقعہ کے عجوبہ پن کو دور کرنے کے لیے مولانائے مرحوم کی یہ سعی معنوی اسقام کی حامل ہے اور اس لیے ہم مولانائے مرحوم کی خدمت قرآن کا احترام کرتے ہوئے ان کے بعض دوسرے تفسیری مقامات کی طرح اس مقام سے بھی اختلاف کرنے پر مجبور ہیں۔

مولانائے مرحوم کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ "ترمی" کا فاعل طیر نہیں ہے بلکہ انت ہے جو "الم تر" کا بھی فاعل ہے اور آیت وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ اس حقیقت کا اظہار کرتی ہے جو عام طور پر عربوں کا خیال تھا کہ جب کوئی جرار فوج کسی جانب کا رخ کرتی ہے تو مردار خوار جانوروں کا غول پرے باندھے ساتھ ہوا میں اڑتا چلتا ہے مثلاً ابو نواس کہتا ہے ہمارے ممدوح کی فوج کے ہمراہ پرندے ہیں کیونکہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے "یا بصرہ میں جنگ جمل سے جو صورت حال پیش آئی اس کا حال اسی روز اہل حجاز کو اس لیے معلوم ہو گیا تھا کہ مردار خور جانور انسانوں کے کٹے ہوئے اعضاء پنجوں میں لیے اڑتے پھرتے تھے۔

اس تفسیر کے پیش نظر سورۃ الفیل کی آیات کے معنی یہ ہوں گے:

''تو نے دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا اس نے ان کی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا؟ اس نے ان پر پرندوں کے پرے کے پرے بھیجے تو ان ہاتھی والوں کو پتھروں سے مارتا تھا پھر خدا نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔''

اس تفسیر پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱) اگر ''ترمی'' کا فاعل ''انت'' ہے ''طیر'' نہیں ہے تو بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کا اضافہ بے ضرورت بلکہ بے معنی ہو جاتا ہے۔

۲) اس صورت میں وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ کی غرض و غایت یا اس کے فائدہ اور مقصد سے خود قرآن خاموش ہے اور اس طرح سورۃ کی آیات کے باہم ربط باقی نہیں رہتا بلکہ نظم و انسجام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

۳) شعراء عرب کے کلام میں فوج کے ساتھ پرندوں کے غول کا چلنا صرف ایک شاعرانہ تخیل ہے اس لیے قرآن کے بیان کردہ حقائق کی تفسیر کو اس خیال سے وابستہ کرنا صحیح نہیں ہے۔

۴) واقعہ کے معاصر یا کچھ عرصہ بعد کے عرب شعراء جب کہ خود اپنے اشعار میں اقرار کرتے ہیں کہ ''ترمی'' کا فاعل ''طیر'' ہے نہ کہ الم تر کی ضمیر ''انت'' (قریش) تو اس سے عدول کیوں اور کس لیے؟

۵) فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ میں ''فا'' ثمرہ اور نتیجہ ہے ''ترمی'' کا اور ''جعل'' کا فاعل ''رب'' ہے تو معلوم ہوا کہ قریش کی سنگ باری سے ہاتھیوں والی فوج جرار کا کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعجاز قدرت کا عمل بھی ہو ورنہ بلحاظ اسباب عادیہ یہ صورت قطعاً غیر معقول ہے اور اگر اسمیں اعجاز کا دخل ہے تو جس عجیب بات سے بچنے کے لیے سلف کے خلاف تفسیر کو اختیار کی گیا تھا اسی کو تسلیم کرنا لازم آجاتا ہے۔

۶) عرب کی جنگوں میں محض بدویانہ سنگ اندازی کے طریقۂ جنگ کے لیے تاریخی سند مطلوب ہے ورنہ خاص اس موقع کے لیے طریقۂ جنگ کی یہ تفسیر بے سند رہ جاتی ہے اور نا قابل قبول ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بلاغت کا تقاضا ہے کہ جب کسی لفظ کے ساتھ متعلقات کا اضافہ ہو تو ضروری ہے کہ اس کا کوئی فائدہ ہونا چاہیے یعنی اس اضافہ کو کسی مقصد کے لیے لایا گیا ہو ورنہ وہ کلام بلاغت سے گر جائے گا اور اس کا اعجاز بلاغت تک پہنچنا تو معلوم؟ کیونکہ ایسی صورت میں یہ اضافہ بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اشعار کے تنگ میدان میں بھی بے ضرورت اس کو جائز نہیں سمجھا جاتا۔

دوسرا مقدمہ یہ قابل توجہ ہے کہ سِجِّیل لغت عرب میں کنکری کو کہتے ہیں یعنی اگر مٹی کو آگ میں پکایا جائے تو پکنے کے بعد اس میں پتھر کی سی سختی پیدا ہو جاتی ہے اسی مٹی کی چھوٹی چھوٹی ٹھیکریوں کا نام عربی میں سِجّیل اور فارسی میں سنگ گل ہے بلکہ بعض علماء لغت نے تو یہ تصریح کی ہے کہ سجیل فارسی مرکب لفظ ''سنگ گل'' کی ہی تعریب ہے یعنی ''مٹی سے بنا ہوا پتھر'' اور یہ ظاہر بات ہے کہ مکہ کی پہاڑیوں پر چھوٹے بڑے پتھر تو بہر حال کافی ملیں گے لیکن وہاں سِجّیل (کنکریوں) کی افراط کے کوئی معنی نہیں۔

پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ترمیھم بحجارة من سجیل میں قریش کی بدویانہ سنگ بری مراد ہے تو اس صورت میں بحجارة کہنا کافی تھا بلکہ "حجارة" کو سجیل کے ساتھ مخصوص کرنا حقیقت واقعہ کے خلاف ہو جاتا اور ایک غلط کا اظہار لازم آجاتا ہے۔

ممکن ہے کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ اس مقام سجیل سے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے معنی سنگ ریزے مراد ہیں تو یہ اس لیے صحیح نہ ہوگا کہ لغت عرب میں پتھر کے چھوٹے ٹکڑے کو "الحصیٰ" کہتے ہیں اور اس کی جمع "حصاة" آتی ہے چنانچہ متداول کتب لغت میں بھی بصراحت یہ فرق مذکور ہے الحصیٰ صغار الحجارة الواحدة حصاة۔ سجیل الحجارة من الطین الیابس حتیٰ کہ علماء لغت اس فرق کو یہاں تک نمایاں کرتے ہیں کہ جو ٹھیکریاں مٹی کے برتن سے ٹوٹ کر وجود میں آتی ہیں اگرچہ وہ سجیل کہلائی جا سکتی ہیں تاہم دقیق امتیاز کے وقت لغت عرب میں ایسی ٹھیکری کے لیے لفظ "خزف" مخصوص ہے اور ہم کو یہ حقیقت بھی کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محققین علماءِ لغت کا یہ دعویٰ ہے کہ لغت عرب میں ایک لفظ بھی دوسرے لفظ کا مرادف نہیں ہے اور جو لفظ بھی فصحاء و بلغاء عرب کے کلام میں استعمال ہوتا ہے وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور جن کو ہم مرادف الفاظ سمجھتے ہیں ان کے باہم جو نازک اور دقیق فرق ہے ان کی خصوصیات ضرور ملحوظ رہتی ہیں۔

غرض مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے مطابق اس مقام پر سجیل کا ذکر نہ صرف بے ضرورت بلکہ خلاف واقعہ اور بے محل ہو جاتا ہے اور

دوسرے اعتراض...... کا حاصل یہ ہے کہ اگر "ترمی" کا فاعل "طیر" مان لیا جائے جیسا کہ جمہور نے اختیار کیا ہے تو بغیر کسی خارجی مدد کے آیات سورۃ اپنا اپنا مطلب صاف صاف ادا کر دیتی ہیں اور سیاق و سباق کی مطابقت اور کلام کا انجام اور اس کی ترتیب بحالہ باقی رہتی ہے۔

لیکن تفسیر زیر بحث کے مطابق اگر ترمی کا فاعل طیر نہیں ہے بلکہ انت ہے تو اس صورت میں ارسال طیر کی غرض و غایت سے قرآن (سورۃ الفیل) قطعاً خاموش نظر آتا بلکہ ربط کلام میں خلل واقع ہو جاتا ہے اس لیے کہ آیت الم یجعل کیدھم کے درمیان ترمیھم اپنے مقصد کے لیے قطعاً واضح نہیں ہے اور نہ سیاق و سباق میں اس کی جانب کوئی اشارہ موجود ہے بلکہ یہ کلام اجنبی ہے جو اپنی تصریح کے لیے آپ ہی ذمہ دار ہے اور بغیر تصریح کے باعث خلل کلام ہے اور اگر کلام کی اس اجنبیت کو باہر کی مدد سے حل اور آیت سے پیدا شدہ قدرتی سوال پر اس کی خاموشی کو خارجی تمہید سے دور کیا جاتا ہے تو بلحاظ بلاغت کلام ایسے ابہام و اجمال سے کہ جو خصوصی واقعہ کے سلسلہ میں اس طرح کلام میں موجود ہو کہ سیاق و سباق نہ اس کی وضاحت کرتے ہوں اور نہ اس پر دلالت کرتے ہوں کلام میں نقص لازم آتا اور بے محل ابہام کا الزام وارد ہوتا ہے۔

تعجب ہے کہ ارسال طیر کی غرض و غایت یا حکمت کا اپنی جانب سے اختراع تو درست سمجھا جائے اور بغیر کسی سند کے یہ کہہ دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پرندوں کو صحن حرم میں افتادہ مردہ نعشوں سے پاک کرنے کے لیے بھیجا تھا اور بقاء ترتیب مضمون آیات اور حفاظت نقص کلام کی خوبیوں کے باوجود خود سورۃ میں ہی جو غایت اور حکمت بیان کی گئی ہے اور جو خارج سے مدد کی قطعاً محتاج نہیں ہے یعنی ترمیھم تو اس کو رد کر کے غیر

(۱) مشہور اور متداول کتب لغت کا مطالعہ کیجیے۔

معقول قرار دیا جائے اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ مردہ نعشوں سے صحن حرم کی پاکی کے متعلق صحیح تاریخی روایت میں یہ موجود ہے:

وذکر النقاش فی تفسیرہ ان السیل احتمل جثتھم فالقاھا فی البحر۔

(البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۱۷۴)

اور نقاش نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ سیلاب آیا اور اس نے مردہ نعشوں کو بہا کر سمندر میں جا ڈالا

تیسرے اعتراض...... کا خلاصہ یہ ہے کہ بالفرض اگر آیت وارسل علیھم طیرا ابابیل کی تفسیر میں صاحب نظام القرآن کے اس استشہاد کو صحیح تسلیم کر لیا جائے جو بطور تمہید انھوں نے اشعار عرب سے کیا ہے اور آیت کی خاموشی کی ختم کرنے کے لیے اصول بلاغت کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ابو نواس یا نابغہ جیسے شعراء عرب کے کلام میں اگر یہ تخیل پایا بھی جاتا ہے کہ جب کوئی فوج جنگ کے لیے سفر کرتی تھی تو مردار خوار جانور جھنڈ کے جھنڈ اس کے ساتھ چلتے تھے تو اس تخیل سے یہ کیسے لازم آیا کہ شعراء کا یہ خیال مبنی بر حقیقت ہے اور محض شاعرانہ تخیل نہیں ہے کہ قرآن تفسیر کے لیے استشہاد کا کام دے سکے؟ بلکہ جب ہم عرب کی لڑائیوں کے ان تفصیلی حالات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہوئیں اور جن کے جزئی جزئی حالات اور معمولی معمولی واقعات تک کی تفصیلات کتب سیر و تاریخ میں محفوظ ہیں تو ان میں سے کسی ایک جنگ میں بھی اس حقیقت کا ذکر موجود نہیں ہے کہ مردار خوار پرندوں کے یہ جھنڈ کے جھنڈ مسلم یا مشرک لشکر کی ابتداء مسافت ہی سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے چنانچہ غزوۂ بدر، احد، حنین، احزاب کے حالات اس قسم کے واقعہ سے قطعاً خاموش ہیں بلکہ اس کے خلاف غزوۂ بدر میں اس کا ثبوت تو موجود ہے کہ زعماء قریش کی نعشیں اٹھا کر ایک گڑھے میں ڈال دی گئیں اور یہ ذکر نہیں پایا جاتا کہ مسلمانوں کے یا مشرکین مکہ کے لشکر کے ساتھ مردار خوار پرند شروع ہی سے ہم سفر تھے انھوں نے اہل مردہ نعشوں کو فوراً ہی ٹھکانے لگا دیا اسی طرح عرب کے علاوہ دنیا کی اور جنگوں میں بھی کہیں اس واقعہ کا ثبوت نہیں ملتا پس اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعراء عرب کا یہ کلام شاعرانہ مبالغہ آمیز تخیل سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا در اصل وہ اپنے ممدوح کی بہادری پر مبالغہ آمیزیاں کرتے ہوئے یہ مبالغہ بھی کرتے ہیں کہ انسان تو انسان مردار خوار جانور تک اس کی بہادری کا یقین رکھتے اور اس لیے اس کے لشکر کے ہمراہ چلتے ہیں حالانکہ حقیقت حال صرف اتنی ہوتی تھی کہ جب اس ممدوح نے دشمن کو شکست دے دی تو شکست خوردہ لشکر کی نعشوں پر گدھ چیل وغیرہ مردار خوار جانور نوچنے کھانے کو ڈٹ گئے اس عام بات کو شعراء نے شاعرانہ دقیقہ سنجی کے ساتھ ادا کر دیا ہے کیا ابو نواس کا یہی شعر جو مفسر صاحب نے باطور استشہاد پیش کیا ہے خود ہی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ محض شاعرانہ سنجی ہے اس لیے کہ وہ کہتا ہے کہ میرے ممدوح کے لشکر کے ہمراہ پرند ہیں کیوں کہ ان کو اس کے فاتح ہونے کا یقین ہے"۔ تو کیا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان مردار خوار پرندوں کی فراست و کیاست انسانی فراست سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی تھی کہ یہ معرکۂ جنگ پیش آنے سے پہلے ہی یہ بھی سمجھ جاتے تھے کہ فلاں کو فتح اور فلاں کو شکست ہوگی اور اس لیے فاتح کی فوج کے ہمراہ چلتے تھے نہ کہ مفتوح کی فوج کے ساتھ۔

اور اگر اپنی خیالی تفسیر کی خاطر یہ سب عجیب باتیں تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو نہ معلوم سلف اور جمہور کی تفسیر ہی کو مان لینے میں کیوں اس قدر جھجک ہے۔

رہا بصرہ میں جنگ جمل کا ہونا اور حجاز میں پرندوں کے ذریعہ اس طرح اصل کیفیت کا حال معلوم ہو جانا کہ وہ انسانوں کے اعضاء کو پنجوں میں لیے اڑتے تھے تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ یہ مردار خوار پرندے طرفین کے لشکر یا جو فاتح بننے والا تھا اس کے لشکر کے ساتھ ساتھ چل کر میدان معرکہ تک پہنچ کر درختوں اور جھاڑیوں میں خیمہ زن ہو گئے تھے کیا بصرہ میں نسر (گدھ) اور زاغ و زغن نہیں تھے اور کیا جو کچھ آج بھی ہوتا ہے وہی وہاں بھی نہیں ہوا ہو گا کہ مردار خوار پرند آپہنچے اور کٹے ہوئے اعضاء کو پنجوں میں لے اڑے اور فضا میں ان کے کے ذریعہ اہل حجاز کو بھی واقعہ کی اصل کیفیت کا پتہ چل گیا چنانچہ گدھ کے لیے تو ماہرین علم الحیوانات کے بیان یہ ہے کہ قدرت نے اس کو قوت شامہ کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ مردہ نعشوں کی پھیلی ہوئی بو یا فضا میں پھیلی ہوئی گوشت کی بو کو بیسیوں میل کی مسافت سے محسوس کر لیتا اور سرعت رفتار کے ساتھ وہاں پہنچ جاتا ہے۔

الحاصل تفسیر زیر بحث میں آیت وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ کی تفسیر کے لیے خارج سے ان اشعار کی مدد لینا جو صرف شاعرانہ تخیل کی پیداوار ہیں اور صحیح تاریخی حقائق سے اعراض کرنا بلکہ خود قرآن کے سیاق و سباق سے ہی بغیر خارجی مدد کے واقعہ کی جو مکمل تصویر بنتی ہے اس سے گریز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

اس تفسیر پر **چوتھے اعتراض**...... کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ "ترمی" کا فاعل قریش ہیں تو آیت فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَأْكُولٍ میں الفاء للجزاء داخل ہو کر یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس کا مدخول (یعنی جس جملہ پر وہ داخل ہے) آیت تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِنْ سِجِّيلٍ کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کا مطلب زیر بحث تفسیر کے مطابق یہ ہوا کہ جب قریش نے سنگ باری کے ذریعہ ان پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا یعنی سب وہیں کھیت رہے اور ہاتھیوں اور انسانوں سب کا کچومر نکل گیا۔

تو سوال یہ ہے کہ قریش کی بدویانہ سنگ باری سے کسی فوج گراں کا کہ جس میں دیو پیکر ہاتھیوں کی قطاریں بھی ہوں اس طرح بھرکس نکل جانا کہ وہ اگر فرار ہو کر جان بچانا بھی چاہیں تو نہ بچ سکیں۔ اسباب عادیہ کے اعتبار سے کیا معقول سمجھا جا سکتا ہے اور کیا عقل یہ نہیں کہتی کہ جب ابرہہ نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ اور اس کی فوج گراں قریش کی سنگ باری کی تاب نہیں لا سکتے تو اس نے کیوں وہاں رہ کر ساری فوج کا بھرکس نکلوا لیا اور کیوں وہ ان ہی وادیوں میں سے ہو کر فرار نہیں ہو گیا جن وادیوں سے ہو کر آیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قریش کے پاس سنگ باری کے لیے مشینیں نہیں تھیں کہ وہ ابرہہ کے لشکر پر ہزاروں من کی مہیب چٹانیں اس عجلت کے ساتھ لڑھکا دیتے کہ تمام لشکری اور ہاتھی گھوڑے اور اونٹ سب کے سب وہیں دب کر رہ جاتے اور کھائے ہوئے بھس کی طرح سب کا کچومر نکل جاتا۔

اور قریش پر خدائے تعالیٰ کا احسان تو اس صورت میں بھی پورا ہو جاتا تھا کہ اس نے ایسے عظیم الشان لشکر کو بدویانہ سنگ باری سے ہزیمت خوردہ بنا کر فرار پر آمادہ کر دیا۔

البتہ یہ بات اس وقت صحیح ہو سکتی اور باور کی جاسکتی ہے کہ اس کو اسباب عادیہ کے عام قانون سے مستثنیٰ قرار دے کر قدرت الٰہی کے معجزانہ عمل کے ساتھ وابستہ سمجھا جائے اور یہ کہا جائے کہ عام طریق جنگ کے خلاف یہ ایک معجزہ تھا مگر اس صورت میں تفسیر زیر بحث کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قرآن عزیز کی اس سورۃ کا اسلوب بیان از اول تا آخر یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں جو صورت حال پیش آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے خاص نوامیس قدرت کے زیر اثر ہوئی ہے اور اسی لیے جن لوگوں نے اس واقعہ کو آنکھوں سے دیکھا یا مشاہدہ کرنے والوں کی زبانی سنا ہے، وہ اس سے آگاہ ہیں کہ یہ معاملہ کس درجہ عجیب اور کرشمہ قدرت کے زیر اثر کس درجہ حیرت زا ہو گزرا ہے اور یہ سبق ہے اور عبرت و بصیرت ہے قریش کے لیے جو اپنی طاقت کے گھمنڈ میں محمد ﷺ اور مسلمانوں کو پیس ڈالنا چاہتے ہیں وہ سمجھیں کہ جس نے کعبہ کی حفاظت کا یہ غیبی انتظام کر دیا وہی آج قبلہ ابراہیمی ''کعبہ'' کی صحیح عظمت کے داعی کی حفاظت و صیانت کا ضامن ہے۔

غرض غیر مسلح انسانوں کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کی سنگ باری سے دیو پیکر ہاتھیوں اور آہن پوش لشکریوں کو فرار کا موقع نہ دے کہ موقع ہی پر کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دینا اسی طرح عجیب ہے جیسا کہ پرندوں کی ماری ہوئی کنکریوں کا بندوق کی گولی کی طرح لگنا یا ایسے مہلک جراثیم کا حامل ہونا جن سے ایک فوج گراں کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو کر رہ جائے مگر یہ کہ تسلیم کیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک ''معجزانہ نشان'' تھا۔

اور اگر اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ سلف اور جمہور بلکہ بلا واسطہ خود آیات قرآنی سے حاصل شدہ تفسیر سے عدول کر کے ایسی تفسیر کیوں اختیار کی جائے جو لغت اور روایات دونوں لحاظ سے اسقام و نقائص کی حامل ہو۔

پانچویں اعتراض...... کا مقصد یہ ہے کہ زیر بحث تفسیر میں اگر شعراء عرب کے اشعار سے استشہاد کرنا حل مطلب کے لیے ضروری سمجھا گیا تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے لیے واقعہ سے متعلق مخصوص اشعار کو جن میں اس واقعہ کے معاصر عبد المطلب کے اشعار بھی شامل ہیں نظر انداز کر دیا گیا بلکہ ان سے اعراض روا رکھا گیا اور شعراء عرب کے ایک ایسے تخیل کو بطور استشہاد تسلیم کیا گیا جس کا مبنی بر حقیقت ہونا خود محل نظر ہے اور جس کے لیے خود آیات قرآنی میں بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مقام پر موجودگی طیر کا معاملہ تمام حالات کی بناء پر نہیں تھا بلکہ کرشمۂ قدرت نے خاص صورت حال کے ساتھ ان کو بھیجا تھا تب ہی تو ترمیہم سے قبل کی آیت میں ارسل فرما کر اللہ تعالیٰ ان کی آمد کو خاص طور سے اپنی جانب منسوب کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ کارخانۂ عالم میں جو کچھ بھی حرکت و سکون ہے سب اسی کی قدرت کے ہاتھوں سے ہے۔

نیز ترمی کے بعد فجعلھم کہہ کر یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ رمی کا یہ نتیجہ کہ وہ عصف ماکول کی طرح ہو گئے ہمارا اپنا فعل تھا جس میں دوسرے کو کوئی دخل نہیں تھا ورنہ اگر پرندوں کا وجود عام حالات کی بنا پر ہوتا اور ''عصف ماکول'' نتیجہ ہوتا قریش کے عمل سنگ باری کا تو اسلوب بیان یہ نہ ہوتا بلکہ یوں کہا جاتا ''ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلانے لگے جب کہ تو ان پر سنگ باری کر رہا تھا اور ہو گئے وہ اس سنگ باری سے

کھائے ہوئے بھس کی طرح۔"

...... جب کہ عرب قبل از اسلام بعد از اسلام دونوں زمانوں میں شعراء عرب کے وہ اشعار موجود ہیں جن میں صاف صاف اس کا اقرار ہے کہ واقعہ کی نوعیت وہی ہے جس کو روایات سلف ظاہر کرتی ہیں تو ان سے اعراض اور شعراء کے ایک عام تخیل سے استشہاد ہرگز درست نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ عبد المطلب کے وہ اشعار جو اس سے قبل ذکر میں آچکے ہیں اس حقیقت کا صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ قریش نے ابرہہ کے لشکر کے مقابلہ میں طاقت مقاومت نہ دیکھتے ہوئے جنگ سے اعراض کیا اور وہ کعبہ کو رب کعبہ کے حوالہ کر کے پہاڑیوں پر پناہ گزیں ہو گئے اور حالات کا انتظار کرنے لگے عبد المطلب کہتے ہیں:

لاهم ان العبد يمنع رحاله فامنع رحالك۔

ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر سے جا رہے ہیں لیکن یہ کوئی غم کی بات نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے خدایا تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔

اور آخر میں دشمن کے مقابلہ سے اپنے عجز اور درماندگی اور بظاہر اسباب کعبہ کی حفاظت سے مایوسی کے اثرات کا ان الفاظ میں اظہار کرتے ہیں:

ان كنت تاركهم وكعبتنا فامر ما بدالك

اور اگر تیری یہی منشاء ہے کہ وہ ہمارے کعبہ کے متعلق اپنا منشاء پورا کر لیں تو پھر جو تیرا جی چاہے وہ حکم فرما۔

عبد المطلب، واقعہ اصحاب فیل کے معاصر ہیں، سردار قریش ہیں اور ان کی جانب سے جنگ و صلح کے ضامن ہیں وہ اقرار کر رہے ہیں کہ قریش دشمن کے مقابلہ سے عاجز ہو کر کعبہ اور ابرہہ کے معاملہ کو سپرد بخدا کر کے نتیجہ کے منتظر ہیں مگر اس کے برخلاف زیر بحث تفسیر اصرار کرتی ہے کہ قریش نے ضرور ابرہہ کے لشکر سے جنگ کی اور ان کو تباہ و ہلاک کر دیا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

واقعہ سے متعلق یہ اشعار تمام کتب سیر میں بسند صحیح مذکور ہیں نیز عام روایات کی طرح اس واقعہ سے متعلق دور ائے تک موجود نہیں ہیں بلکہ صرف ایک ہی قول تاریخی تواتر سے منقول چلا آتا ہے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا۔

علاوہ ازیں اگر فرض کر لیجیے کہ یہ اشعار عبد المطلب کی جانب غلط منسوب ہیں تب بھی ان اشعار سے یہ تو بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ جن اہل عرب اور اہل حجاز کے سامنے قرآن، واقعہ فیل کو بیان کر رہا ہے ان کے یہاں قبل از اسلام اس واقعہ سے متعلق یہی روایت مسلم تھی جو ان اشعار کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے اور اسی کو انھوں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنا یا واقعہ کا خود مشاہدہ کیا تھا اور اسی لیے عرب بعد الاسلام کے تمام شعراء بھی اپنے اشعار میں بلا خلاف اسی حقیقت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔

عبد اللہ بن زبعری سہمی اس واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

سائل امیر الحبش عنہا ما رائی
فلسوف ینبی الجاھلین علیھما
ستون الفاً لم یؤبوا ارضھم
بل . لم یعش بعد الایاب سقیمھا

حبشہ کے سردار سے معلوم کرو کہ اس نے کیا کچھ دیکھا، عنقریب ناواقفوں کو اس واقعہ سے خبر دار لوگ واقف کر دیں گے۔ ساٹھ ہزار لشکریوں میں سے کسی کو وطن لوٹنا نصیب نہیں ہوا اور اگر کوئی اکا دکا زخم خوردہ بھاگ نکلا تو وہ بھی خدائی مار کے زخموں سے نہ بچ سکا۔

اور عبداللہ بن قیس کہتے ہیں:

کادہ الاشرم الذی جاء بالفیل فولی و جیشہ مھزوم
واستھلت علیھم الطیر بالجندل حی کانہ مرجوم

ابرہۃ الاشرم نے یہ تدبیر چلی کہ کعبہ کے گرانے کو ہاتھیوں کو لے کر آیا پس وہ بھاگا اور اس کا لشکر بھی شکست خوردہ ہو گیا جب کہ پرندوں کے لشکر ان پر کنکریوں کی بارش کرتے ہوئے پرے کے پرے آپہونچے اور سارا لشکر سنگسار ہو کر رہ گیا۔

اور ابو قیس بن الصلت انصاری ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لیے خدائی مدد کا اس طرح ذکر کرتے ہیں:

فلما اتاکم نصر ذی العرش ردّ ھُمْ
جنود الملیك بین ساف و حاصب
فولوا سراعاً ھاربین و لم یؤب
الی اھلہ بحبش غیر عصائب

پھر جب عرش والے کے پاس سے تمہارے لیے مدد آ پہنچی تو ابرہہ اور اس کے لشکر کا خدائی لشکر (پرندوں کے غول) نے منہ پھیر دیا جب کہ وہ ٹھیکریاں اور کنکریاں برسا رہا تھا پس سارا لشکر جلد ہی شکست کھا کر بھاگا اور ان میں سے چند معمولی ٹولیوں کے سوا کوئی بھی حبشہ تک نہ پہنچ سکا اور سب یہیں ہلاک و تباہ ہو کر رہ گئے۔

پہلے اعتراض ...... کی تفصیل یہ ہے کہ قبل از اسلام اور بعد از اسلام عرب کی مشہور حروب کی تاریخی تفصیلات اشعار عرب کتب سیرت اور مسلم وغیرہ مسلم تواریخ میں موجود ہیں جن میں مذہبی ملکی اور قومی ہر قسم کی جنگوں کے تذکرے پائے جاتے ہیں مگر ایک جنگ کے متعلق بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ اہل عرب یا قریش نے محض بد دیانہ سنگ باری کی جنگ کی ہو بلکہ اس زمانہ کے متداول اسلحہ تلوار، تیر اور تبر وغیرہ سے ہی وہ جنگ کیا کرتے تھے جس میں منجنیق (گوپھن) کا بھی استعمال ہو جایا کرتا تھا اور اگر یہ تسلیم نہیں ہے تو اشعار عرب اور تاریخ عرب سے کوئی سند دکھائی جائے کہ محض سنگ باری کی جنگ کا کون سا مشہور یا غیر مشہور واقعہ تاریخ میں مذکور ہے کیونکہ تاریخ تو آج تک یہی کہتی چلی آتی ہے کہ اہل عرب تلوار کے دھنی اور بات بات پر ان کے درمیان تلوار کا

نیام سے نکل آنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بدویانہ سنگ باری کا یہ طریقہ اسی خاص واقعہ میں پیش آیا اور اس کے ثبوت کے لیے یہی اول اور آخر مثال ہے تو پھر خود اس مخصوص واقعہ کیلئے تاریخی ثبوت چاہیے تاکہ یہ متعین ہو سکے کہ سلف اور جمہور سے منقول تفسیر غلط اور یہ جدید تفسیر ہی صحیح تفسیر ہے حالانکہ اس کیلئے کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

پس اگر نہ خود عرب کے واقعات جنگ میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور نہ خاص اس واقعہ کے لیے کوئی تاریخی شہادت پائی جاتی ہے بلکہ اس کے برعکس حجاز کی قومی روایات، تاریخی وقائع اور سلف صالحین کی نقل و روایات سے باتفاق یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابرہہ کے لشکر جرار کے مقابلہ میں قریش نے کوئی جنگ نہیں کی اور وہ تاب مقاومت سے عاجز ہونے کی وجہ سے کعبہ کو رب کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر پہاڑی پر پناہ گزیں ہو گئے تھے تو محض عربیت کے پیش نظر دو احتمالات میں سے ایسے احتمال کو اختیار کرنا جو بقاعدۂ عربیت بھی استقام کا حامل ہے اور تاریخی شہادات اور سلف کی روایات کے بھی خلاف ہے، ناقابل قبول ہے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی آشکار ہو جانی چاہیے کہ کتب تفسیر و سیر میں چونکہ بکثرت ایسی روایات پائی جاتی ہیں جن کی نسبت سلف صالحین کی جانب بسند صحیح ثابت ہو جانے کے بعد بھی محققین علماء تفسیر یہ کہہ کر اس کے قبول و تسلیم کی قیمت گھٹا دیتے ہیں کہ یہ روایت اسرائیلیات میں سے ہے یعنی گو اس کی نسبت حضرت عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن مسعود ابو ہریرہؓ کی جانب بلحاظ سند روایت صحیح ہے لیکن وہ ان روایت میں سے نہیں ہے کہ جو نبی معصوم کے قول و عمل یا تقریر تثبیت سے تعلق رکھتی اور اس بناء پر سلف کا مسلک قرار دی جا سکتی ہو بلکہ حضرت عبد اللہ بن سلام، وہب بن منبہ اور کعب احبار جیسے بزرگوں کی ان حکایات و اقوال سے ماخوذ ہے جو یہ حضرات متبحر علماء یہود میں سے ہونے کی بناء پر اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کی مجالس میں بیان کیا کرتے تھے اور نبی اکرم کی اس اجازت کے پیش نظر کہ مسلمانوں کو توراۃ اور اسرائیلی روایات کی نقل اس حد تک جائز ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات کے خلاف نہ ہو مسلمان روایات کو بطور حکایت نقل کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے اس لیے سورۂ الفیل کی تفسیر میں بھی کیا یہ امکان ہے کہ ترمی کا فاعل طیر کو مان کر سلف سے جو روایات منقول ہیں وہ بھی اسی قسم کی اسرائیلی حکایات ہوں کہ جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ آیات کی یہ تفسیر سلف اور جمہور کا متفقہ مسلک نہیں ہے تو اس کا جواب نفی میں ہو گا اور یہ اس لیے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور جس وقت سورۂ الفیل کا نزول ہوا دونوں زمانوں میں اس واقعہ سے کعبہ کی عظمت کے مقابلہ میں عیسائیت کی سخت توہین لازم آتی ہے اور اسی بناء پر جدید یورپین مؤرخین بھی اس توہین سے تلملا کر جو قدرت کے ہاتھوں عیسائیت کو کعبۃ اللہ کی عظمت کے مقابلہ میں پیش آئی تھی اس واقعہ کی بے سند اور دور از کار تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور جب کہ یہود اور علماء یہود بھی اپنی روایتی حاسدانہ خو کی وجہ سے اس مرکز توحید کی عظمت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جو بوڑھے پیغمبر ابراہیم کی اسمٰعیلی شاخ کی اسرائیلی شاخ پر برتری کا باعث تو بے شبہ یہ کہنا مبنی بر حقیقت ہو گا کہ جس واقعہ کی اشاعت یہود و نصاریٰ کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں ہو سکتی اس سے متعلق روایات کو اسرائیلیات اور اسرائیلی روایات کسی طرح نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان روایات کی صداقت کی سب

سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ جس وقت سورۂ الفیل کا نزول ہوا ہے واقعہ کو گذرے ابھی پچاس سال سے زیادہ نہ ہوئے تھے مگر پھر بھی کسی مخالف جماعت یا فرد کو اس کی تکذیب کی جرأت نہ ہو سکی اور کسی ایک شخص نے یہ تک نہ کہا کہ آیات الفیل کا دعویٰ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن قریش میں اس کے متعلق جس قسم کی باتیں مشہور ہیں وہ سر تا سر غلط ہیں اور اگر تکذیب کی گئی ہوتی تو تاریخ اس کو اپنے سینہ میں اسی طرح محفوظ رکھتی جس طرح اسلام کے مخالفوں کی ہر قسم کی ہرزہ سرائیوں اور معاندانہ واقعات واحوال کو آج تک محفوظ رکھا ہے۔

پس ایک منصف مزاج اور طالب حق انسان کا فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ سورۂ الفیل سے متعلق واقعہ کی تفصیلات جس طرح عرب روایات اور شعراء عرب کے اشعار اور سلف سے منقول تفاسیر میں منقول ہیں وہی صحیح تفسیر ہے۔

سلف سے منقول سورۂ الفیل کی تفسیر اس لیے بھی قابل قبول ہے کہ اس کے مطابق وہ اسقام نہیں پیدا ہوتے جو جدید تفسیر کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اگر ہم خارج کی شرح و تفصیل سے قطع نظر صرف قرآن کی آیات کے معانی ہی میں محدود رہ کر تفسیر کریں تو ربط آیات اور ترتیب مضمون اور انسجام سورۂ یہ سب امور بغیر کسی دقت و تاویل کے قائم رہتے اور آیات کے معنی یہ ہوتے ہیں:

> کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا ان کی شر آمیز تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا اور اس نے ان پر پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے جو ان پر کنکریاں پھینک رہے تھے، پس کر دیا پروردگار نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح۔

آیات کے اس صاف اور صحیح ترجمہ پر غور فرمائیے کہ کس طرح ایک آیت دوسری آیت کے ساتھ مربوط اور بغیر کسی اضافۂ مضمون کے خود ہی پوری حقیقت کا اظہار کر رہی ہے البتہ قرآن میں مذکور معجزات کے سلسلۃ الذہب میں ایک کڑی کا ضرور اضافہ کرتی ہے۔

اور قرآن سے باہر عرب روایات نثر و نظم اس صاف اور واضح حقیقت کے لیے بغیر کسی اضافہ کے صرف تفصیل واقعہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جمہور سلف کے خلاف سورۂ الفیل کی تفسیر ایک جدید مدعی تفسیر علوم قرآن نے بھی کی ہے جدید مفسر صاحب چونکہ نبی معصوم ﷺ سے منقول احادیث صحیحہ کو بھی ادلۂ شرعیہ سے خارج سمجھتے اور انکار حدیث کو اپنا مسلک بنائے ہوئے ہیں اور خدمت مذہب کے نام سے اپنے مضامین میں اس الحاد کو خاص رنگ میں پیش کر کے انکار حدیث کی تبلیغ فرماتے رہتے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان کی نگاہ میں سلف صالحین کے مسلک کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔

سورۂ الفیل کی یہ تفسیر اگرچہ مصنف نظام القرآن ہی کی تفسیر سے ماخوذ ہے مگر چونکہ جدید مفسر صاحب حقیقتاً علوم عربیت اور علوم قرآن دونوں سے ناواقف ہیں اور بایں ہمہ مختلف زبانوں میں قرآن کی تفاسیر بکثرت وجود میں آنے کے باعث ارزاں شہرت حاصل کرنے کے لیے مفسر بننا چاہتے ہیں، اس لیے انھوں نے نظام القرآن میں مسطور تفسیر کی علمی پہلوؤں سے گریز کرتے ہوئے محض خطابیات کے طریقہ پر آیات کے مفہوم و

معانی سے جدا اپنی جانب سے چند ایسے اضافوں کے ساتھ اس کو پیش کیا ہے جن کو دیکھ کر صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایسے کلام کی تفسیر کر رہے ہیں جو ان کے خیالوں میں خود اپنے اداء مقصد میں کوتاہ اور اپنے اسلوب بیان میں ناقص ہے اور محتاج ہے ایسے چند اضافوں کا جن کے ذریعہ اس کی تکمیل ہو سکے اور جو اس کے سقم اور نقص کو دور کر سکیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

جزئی تفاصیل میں جانے کے بغیر یوں سمجھو کہ اہل مکہ کی ایک مخالفت قوت (ابرہہ) نے چاہا کہ قریش پر حملہ کیا جائے لیکن اس انداز سے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے چنانچہ اس کے لیے اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آ پہنچے اور فوج کے مہیب ہاتھی انہیں کچل ڈالیں، یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر (کید) اس تدبیر کے مخفی رکھنے کیلئے اس نے پورا پورا اہتمام کر لیا لیکن مشیت کا منشاء اہل مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس مہم میں ایک ایسی کڑی ساتھ جا لگی جس سے یہ تمام اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی جس زمانہ میں بارود اور بم زمین کے ساتھ آسمان کو بھی آتش زار نہیں بنایا کرتے تھے بڑے لاش خور پرندے مثل گدھ، چیل فوجوں کے ہمراہ ہو جاتے جوں ہی کوئی فوج نقل و حرکت کرتی یہ اپنی خداداد فراست سے اندازہ کر لیتے کہ اب رزق کا سامان پیدا ہونے لگا ہے ہاتھیوں والی فوج نے اپنی نقل و حرکت کو اہل مکہ سے چھپائے رکھا لیکن ان پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ طیر ابابیل کے معنی جھنڈے کے جھنڈ ہیں نہ کہ وہ ابابیلیں جو سر شام ہمارے ہاں اڑتی پھرا کرتے ہیں اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو لیے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا اہل مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے اور اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے اور پہاڑوں پر چڑھ کر ایسا پتھراؤ کیا کہ فوج کا ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا۔ قرآن کریم نے اہل مکہ کو اس واقعہ کی یاد دلائی ہے۔ (طلوع اسلام نمبر ۲ ص ۵۸)

اس تفسیر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا تفصیلی ذکر تو مصنف نظام القرآن کی تفسیر سورۃ الفیل کے سلسلہ میں آ چکا اس لیے یہ بر خود غلط مقلدانہ تفسیر قابل اعتناء نہیں ہے البتہ اس میں اپنی جانب سے نئے اضافات کر کے قرآن کو جو لقمے دیے گئے ہیں ان کی خرافات کا اظہار از بس ضروری ہے مفسر جدید نے ان اختراعی اضافات کو اس لیے بیان کیا ہے کہ ان کی گھڑی ہوئی تفسیر کے مطابق آیات کے مفہوم و معنی میں جو سقم پیدا ہو جاتا ہے اس کو دور اور ربط آیات میں جو خلا واقع ہو جاتا ہے اس کو پر کر دیا جائے۔

ایک جانب مصنف نظام القرآن کے تفسیری مطالب کا اپنی جانب انتساب اور دوسری جانب تقلیدی مضمون میں مجتہدانہ غیر علمی اضافات کی اپج ان دونوں باتوں نے مل کر جدید مفسر صاحب کی تفسیر سورۃ الفیل کو طرفہ معجون بنا دیا ہے۔

آپ ایک مرتبہ پھر نشان زدہ عبارت کا مطالعہ فرمائیں اور ساتھ ہی سورۃ الفیل کی آیات کے سادہ معانی پر بھی توجہ دیتے جائیں تو آپ خود ہی حیرت و تعجب میں پڑ جائیں گے کہ اصحاب الفیل کے واقعہ سے متعلق یہ تمام کڑیاں جو جدید مفسر صاحب نے بیان فرمائی ہیں کہاں سے حاصل ہوئیں۔

سورۃ الفیل کی آیات میں تو ان باتوں کا پتہ تک نہیں ہے پھر نہیں معلوم کہ جدید مفسر صاحب نے ان کو کہاں اخذ کیا جب کہ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ واقعہ سے متعلق روایات کو غلط اور "تل کے اوٹ پہاڑ" کی طرح سمجھتے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں خود قرآن کے اندر سے کہہ رہے ہیں کیونکہ واقعہ سے متعلق روایات تو مفسر صاحب کے اضافوں کے برعکس یہ بیان کرتی ہیں:

۱) ابرہہ اپنی فوج گراں لے کر کہ جس میں بہت سے ہاتھی بھی شامل تھے علی الاعلان یمن سے مکہ کے لیے نکلا تھا اور اسی لیے راہ میں بعض قبائل عرب نے مزاحمت کی اور ناکام رہے۔

۲) ابرہہ کے اس خروج کی تمام اقطاع عرب میں شہرت ہو گئی تھی۔

۳) اس لیے ابرہہ کی تدبیر جنگ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ تھی

۴) ابرہہ نے حجاز پہنچ کر عبدالمطلب سے صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے قریش سے کوئی سروکار نہیں، میں تو کعبہ کے انہدام کے لیے آیا ہوں۔

۵) عبدالمطلب اور قریش نے تاب مقاومت نہ رکھتے ہوئے مقابلہ نہیں کیا بلکہ پہاڑی پر چلے گئے۔

۶) مشیت کا منشاء کعبہ کی حفاظت تھی نہ کہ قریش کا بچانا کیونکہ ابرہہ کعبہ ہی کو گرانے آیا تھا۔

اب جبکہ نہ قرآن ہی میں ان اضافوں کا ذکر ہے جن کو جدید مفسر صاحب نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے اور نہ ان کی بیان کردہ تفصیلات کے لیے کوئی تاریخی یا حدیثی سند موجود ہے تو ایسی تفصیلات پر مبنی تفسیر بلا شبہ تفسیر بالرائے اور قطعاً غلط اور مہمل ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ مفسر صاحب کے ان تمام اضافوں کی بنیاد صرف لفظ کید ہے جو سورۃ الفیل کی آیت یجعل کیدھم میں مذکور ہے اور جس کے معنی انھوں نے خفیہ تدبیر کے کیے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی لغو ہے اس لیے کہ اول تو فقط لفظ کید سے یہ داستان طویل کس طرح وجود میں آسکتی ہے تاوقتیکہ اس کے لیے قرآن کے اندر یا باہر سے کوئی سند موجود نہ ہو، دوسرے لغت عرب میں کید کے معنی خفیہ تدبیر کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہیں بلکہ کبھی وہ شر آمیز تدبیر کے مفہوم کو ادا کرتا ہے خواہ اعلانیہ ہو یا خفیہ اور کبھی مطلق جنگ کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

الکید، الحیلة، المکر، الخبث، الحرب اور ان سب معانی میں شر آمیز تدبیر کا مفہوم مشترک ہے بلکہ خود قرآن نے لفظ کید کو مختلف مقامات پر مطلق تدبیر اور طریق کار کے معنی میں یا علانیہ تدبیر کیا ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنْ لَنْ يَنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ (الآیۃ سورۃ الحج)

جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا اور آخرت میں کوئی مددگار نہیں دے گا (یعنی خدا سے ناامید ہے) تو اس کو چاہیے کہ آسمان کی بلندی تک رسی کھینچ لے جائے اور جب اس کو پکڑے ہوئے معلق ہو تو چاہیے کہ اس کو کاٹ ڈالے پھر دیکھے کہ اس کی تدبیر اور اس کا یہ طریق کار کیا اس چیز کو کھودے گا جو اس کو

غصہ میں آتی ہے (یعنی خدا سے ناامیدی ہونا ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی بلندی پر رسی باندھ کر چڑھے اور پھر بیچ میں پہنچ کر اس کو کاٹ ڈالے۔

اس مقام پر کید کے معنی فقط طریق کار اور مطلق تدبیر کے ہیں اور خفیہ اور علانیہ دونوں شرطوں سے آزاد۔

اور سورۂ انبیاء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں ہے۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ○ قُلْنَا يَانَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ ○ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ○

کافروں نے کہا تم اس (ابراہیم) کو آگ میں جلا ڈالو اور اپنے معبودوں (بتوں) کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو ہم نے کہا (اللہ تعالیٰ نے کہا) اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کی چیز بن جا انہوں نے (کافروں نے) ابراہیم کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کو ہی خسارہ اٹھانے والوں میں کر دیا۔

اور سورۂ والصفت میں ہے۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ ○ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ ○

انھوں نے (مشرکوں نے) کہا بناؤ اس کے (ابراہیم کے) لیے ایک عمارت (یعنی آگ کی بھٹی) پھر ڈال دو اس کو آگ کی بھٹی میں پس انھوں نے اس کے ساتھ بری تدبیر کا ارادہ کیا سو کر دیا ہم نے ان کو ذلیل وخوار۔

ان ہر دو مقامات کا سیاق کلام یہ ہے کہ جب مشرکین ابراہیم علیہ السلام کے واضح اور روشن دلائل توحید کے مقابلہ میں لاجواب اور عاجز ہو گئے تو قبول حق کی بجائے غیظ وغضب میں آکر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ شخص چونکہ ہمارے معبودوں (بتوں) کے حق میں گستاخ ہے اس لیے اس کو آگ کی بھٹی میں ڈال کر زندہ جلا دو، ابراہیم علیہ السلام اس فیصلہ کو سن رہے تھے مگر انھوں نے مطلق کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے اعلان حق پر قائم رہے۔

قرآن نے مشرکین کے اس فیصلہ کو کید سے ہی تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ خفیہ نہیں تھا بلکہ اعلانیہ تھا۔

غرض جب کہ کید خفیہ تدبیر کے لیے مخصوص نہیں ہے تو جب تک وضاحت کلام یا واضح قرینہ اسکا متقاضی نہ ہو کہ فلاں مقام پر کید کے معنی خفیہ تدبیر کے ہونے چاہیں اس لفظ کو اس معنی کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

اور ظاہر ہے کہ سورۃ الفیل میں اس تخصیص کے لیے نہ کوئی وضاحت موجود ہے اور نہ کوئی واضح قرینہ حتیٰ کہ خود جدید مفسر صاحب کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس اپنی بیان کردہ خفیہ تدبیر کی داستان کے لیے لفظ کید کے سوا نہ قرآن کے اندر سے کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ باہر ہے اس لیے انھوں نے ابرہہ کی لشکر کشی سے متعلق داستان بیان کرتے ہوئے بے سند یہ کہنے پر اکتفا کیا ہے یہ تھی اس کی خفیہ تدبیر کید اور یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ کید کی یہ تفصیل انھوں نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

یہ سوال اس لئے اور بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس مقام پر کید کے معنی خفیہ

تدبیر ہی کے ہیں تب بھی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ خفیہ تدبیر کی تفصیلات وہی ہوں جو جدید تفسیر میں بیان کی گئی ہیں کیونکہ خفیہ تدبیر کو کسی خاص تفصیل کے اندر محدود کرنے کیلئے دلیل اور سند درکار ہے۔

نیز جب کہ سورۃ الفیل میں اصحاب الفیل کاذکر ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے تو اس سلسلہ میں محض احتمالات عقلی بے معنی ہیں بلکہ از بس ضروری ہے کہ واقعہ کے بنیادی اجزاء و تفاصیل خود قرآن میں موجود ہوں اور مفسرین کے ذہنی اختراع وایجاد کے محتاج نہ ہوں اور پھر فروعی تفاصیل بھی اگر بیان کی جائیں تو ان کے لیے بھی داخلی یا خارجی سند صحیح کا ہونا ضروری ہے ورنہ تو واقعہ واقعہ نہیں رہے گا بلکہ ہر شخص کی دماغی اپچ کا کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

جدید تفسیر میں خفیہ تدبیر کی بیان کردہ تفصیلات کے متعلق ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ آیت و ارسل علیھم طیرا ابابیل میں ارسال طیر اور کید دونوں مل کر اس تفصیل کو ظاہر کرتے ہیں تو یہ کہنا لغو اور بے سود ہے اس لیے کہ اس آیت میں تو صرف یہ کہا گیا ہے کہ بھیج دیے ہم نے ان پر پرند جھنڈ کے جھنڈ اور جدید مفسر صاحب یہ فرما چکے ہیں کہ آسمانی فضا میں بارود اور بموں کے استعمال سے قبل مردار خوار جانور لشکروں کے ساتھ ساتھ اس لیے منڈلاتے ہوئے چلتے تھے کہ ان کی فراست راہنمائی کرتی تھی کہ اب ان کی غذا کا سامان مہیا ہونے والا ہے اور شعراء عرب کے اشعار سے مصنف نظام القرآن بھی یہ استشہاد کر چکے ہیں کہ جب دو فریق میدان جنگ میں نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی جگہ سے روانہ ہوتے تھے تو ان کے سروں پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اڑتے ہوئے چلا کرتے تھے تاکہ مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں۔

تو تفسیر جدید کے مطابق ان دونوں باتوں کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ نکل سکتا ہے کہ آیت و ارسل علیھم طیرا ابابیل یہ ظاہر کرتی ہے کہ عام حالات جنگ کی طرح اس جگہ بھی اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے کہ وہ اس کی مردہ نعشوں سے غذا حاصل کریں لیکن خفیہ تدبیر کی یہ تفصیلات کہ

۱) قریش پر اس انداز سے حملہ کیا جائے کہ حملہ اچانک ہو اور قریش کو بے خبر جا پکڑا جائے۔
۲) چنانچہ اس نے ایسا راستہ اختیار کیا کہ وادیوں میں چھپتا چھپاتا مکہ تک آپہنچے۔
۳) لیکن مشیت کا منشاء چونکہ اہل مکہ کا بچانا تھا اس لیے اس میں ایک ایسی کڑی ساتھ لگی جس سے یہ اسکیم ناکام ہو کر رہ گئی (وہ یہ کہ) پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اس فوج پر منڈلاتے ہوئے ساتھ ہو گئے اور یوں زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا۔
۴) اہل مکہ جانتے تھے کہ اس قسم کے پرندوں کی پرواز کا کیا مطلب ہوتا ہے وہ اس دھوئیں سے نیچے کی آگ کا پتہ پا گئے نہ آیت ارسل علیھم (الآیہ) سے ظاہر ہوتی ہیں اور نہ کید سے اور نہ دونوں کو باہم ملا کر مطلب حاصل کرنے سے ان تفصیلات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے بلکہ یہ تک ظاہر نہیں ہوتا کہ اصحاب الفیل نے جو کید کیا تھا وہ خفیہ تدبیر کی ہی صورت میں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ جدید تفسیر میں بایں ادعاء تردید مسلک سلف صالحین رحمہم اللہ خفیہ تدبیر کی ان تفصیلات کیلئے کوئی ثبوت بہم پہنچایا نہ جا سکا اور جو کچھ کہا گیا صرف دماغی اختراع سے کہا گیا اور اگر جدید مفسر صاحب کے پاس ان کیلئے کوئی سند داخلی یا خارجی موجود ہے تو اس کے لیے صرف یہی کہا جا سکتا ہے

تفسیر زیر بحث میں واقعہ سے متعلق تفصیلات کو اپنی جانب سے گڑھ کر جو شکل وصورت دی گئی ہے اس میں جدید مفسر صاحب نے جگہ جگہ اس پر زور دیا ہے کہ اصحاب فیل کا مقصد قریش پر حملہ کرنا اوران کو تباہ وبرباد کرنا تھا اور مشیت کا منشاء ان کو بچانا تھا اسی لیے وہ سب کچھ ہوا جو سورۃ الفیل میں مذکور ہے لیکن ان تاریخی تفصیلات سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے جو واقعہ سے متعلق کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہیں اور جو بے تکلف سورۃ الفیل کی آیات کی تفسیر یا تفصیل کرتی ہیں تب بھی بخاری و مسلم (صحیحین) کی احادیث، تفسیر جدید کے اس بنیادی مقدمہ کے قطعاً خلاف فیصلہ دیتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ اصحاب فیل کی یہ جنگ قریش کی تباہی کے لیے نہیں تھی بلکہ کعبۃ اللہ کی بربادی کے لیے تھی اوراس لیے مشیت کا منشاء کعبہ کی حفاظت تھا نہ کہ قریش کو بچانا۔

چنانچہ بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت مسور بن مخرمہ سے حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق جو طویل روایت نقل کی ہے اس میں ہے۔

مسلمان اگرچہ جنگ کی نیت سے نہیں بلکہ زیارت بیت اللہ کے مقصد سے مکہ جارہے تھے مگر مشرکین نے یہ سمجھا کہ جنگ کا ارادہ ہے اس لیے خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) مقدمتہ الجیش بن کر راہ روکنے کے لیے ایک چھوٹے دستے کے ساتھ آگے بڑھے۔

صدیق اکبر نے یہ دیکھا تو کہا بخدا ہمارا ارادہ کعبہ کی زیارت کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن اگر مشرکین مکہ ہمارے اس نیک مقصد میں حائل ہوئے تو ہم بے شبہ مقابلہ کریں گے تب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ راہ بدل کر چلو تاکہ خالد کو پتہ نہ چلے کہ ہم کس طرف سے ہو کر آرہے ہیں اور ایک لخت ان کے سر پر پہنچ جائیں، چنانچہ جب مسلمان ثنیۃ المرار (پہاڑی ٹیلہ) پر پہنچے جہاں سے اچانک خالد کے دستہ پر حملہ کیا جا سکتا تھا تو رسول ﷺ کی اونٹنی (قصواء) بیٹھ گئی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہر چند اس کو اٹھانا چاہا مگر وہ نہ اٹھی تب سب کہنے لگے قصواء بھڑک گئی اور بے قابو ہو گئی آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا قصواء نہ بھڑکی ہے اور نہ بے قابو ہوئی ہے اور نہ اس کی یہ عادت ہے بلکہ اس کو اسی خدا نے روک رکھا ہے جس نے ہاتھیوں والوں کو روک دیا تھا۔

فقال ﷺ ما خلاءت و ماذاك لها بخلق ولكن حبسها حابس الفيل۔

اور پھر فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں مشرکین مکہ شعائر اللہ کی عظمت کے سلسلہ میں جس بات کے بھی طالب ہوں گے اس کو پورا کروں گا اس ارشاد کے بعد اونٹنی کو ڈپٹا اور اونٹنی فوراً کھڑی ہو گئی اور حدیبیہ کے آخری کنارہ پر جا پہنچی۔ (غزوۂ حدیبیہ)

اس روایت میں حبسها حابس الفيل فرما کر نبی اکرم ﷺ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ مشرکین مکہ اگر شعائر اللہ کی حرمت کے سلسلہ میں کسی بات کے بھی طالب ہوں گے تو میں اس کو پورا کروں گا تو یہ ارشاد مبارک صاف صاف یہ ظاہر کر رہا ہے کہ حابس الفیل نے جس طرح پیغمبر خدا ﷺ اور مسلمانوں سے یہ عہد لینے کے لیے قصواء کو چلتے چلتے روک دیا کہ اگر قریش سے جنگ پیش آئی تو وہ حرم اور کعبہ کی عظمت وحرمت کو مطلق کوئی

آنچ نہ آنے دیں گے اسی طرح ماضی میں خدائے تعالیٰ نے اصحاب فیل کو اس لیے کر برباد کر دیا اور مکہ تک نہ پہنچنے دیا کہ وہ حرم اور کعبہ کو برباد کرنے اور اس کی توہین کرنے آئے تھے چنانچہ خالد کے آمادۂ جنگ ہونے اور صدیق اکبرؓ کے ارادۂ مقاومت نے جب صورت حال کو جنگ کے قریب کر دیا تو حرم کے قریب پہنچ کر بحکم رب العلمین آپ ﷺ کی ناقہ بیٹھ گئی تا کہ نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے صحابہؓ کی موجودگی میں یہ اعلان کرایا جائے کہ مشرکین مکہ سے ارادۂ جنگ ہے لیکن سر زمین مکہ شعائر اللہ کا مرکز و محور ہے یہاں کعبۃ اللہ ہے مقام ابراہیم ہے سعی ہے مسجد حرام ہے اور تمام سر زمین مکہ حرم ہے اس لیے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مشرکین مکہ (قریش) سے جنگ کے سلسلہ میں شعائر اللہ کی حرمت و عظمت میں کوئی فرق آنے پائے۔

نبی اکرم ﷺ چونکہ اس حقیقت حال کو فراست وحی سے سمجھ رہے تھے اس لیے اول آپ نے ناقہ (قصواء) کے بیٹھ جانے کی وجہ بیان فرمائی اور اس کے بعد یہ مسطورہ بالا اعلان فرمایا اور اب جب کہ کعبۃ اللہ اور شعائر اللہ کی عظمت و حرمت کا وعدہ منجانب اللہ لے لیا گیا تو اس کے فوراً بعد ہی خدا کے حکم سے قصواء خود بخود کھڑی ہو گئی اور منزل مقصود کی جانب گامزن ہوئی۔

اور بخاری و مسلم (صحیحین) کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے روز جو خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا:

> اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے بچالیا تھا مگر اس نے اپنے رسول اور مسلمانوں کو اس پر قبضہ دیدیا تو یاد رہے کہ خدا کے اس حرم کی عظمت اب بھی اسی طرح ہے جس طرح اس سے پہلے تھی جو موجود ہیں ان کو چاہیے کہ غائب تک اس خبر کو پہنچائیں۔

اس روایت میں بھی سرور عالم ﷺ نے صاف الفاظ میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو ہاتھیوں کی یورش سے قریش کی خاطر نہیں بلکہ کعبۃ اللہ اور حرم کی عظمت و حرمت کی خاطر بچایا تھا اور پھر مسلمانوں کی اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے کہ کہیں وہ فتح مکہ کے زعم میں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ مکہ میں جنگ کی اجازت نے حرم کی عظمت آج ختم کر دی ہے یہ خطبہ ارشاد فرما کر حقیقت حال کو واضح فرمایا اور تاکید فرمائی کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں ہیں موجود حضرات اس بات کو ان تک پہنچادیں بلکہ امت مسلمہ کو ہمیشہ پہنچاتے رہیں۔

قریش کی بقاء اور ان کی حفاظت اور حرم و کعبہ کی بقاء اور ان کی حفاظت یہ دو جدا جدا حقائق ہیں اور خدائے تعالیٰ نے دوسری حقیقت کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ پہلی کو اس کے متعلق فتح مکہ کے وقت بعض صحابہ کو یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اس خاص وقت میں اللہ تعالیٰ نے شاید نبی معصوم ﷺ کی خاطر حرم کی عظمت و حرمت کو بھی نظر انداز کر دینے کی اجازت دیدی ہے یہی غلط فہمی حضرت سعدؓ کو پیش آئی اور جب نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے بہت سختی کے ساتھ ان کے اس خیال کی تردید فرمائی اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ ان کو ان کے لشکر کی سرداری سے بھی معزول کر دیا چنانچہ بخاری نے فتح مکہ سے متعلق حضرت عروہ کی طویل روایت میں اس طرح اس واقعہ کو نقل کیا ہے:

> جب حضرت سعدؓ پرچم لہراتے ابو سفیان کے پاس سے گذرے تو کہنے لگے ابو سفیان الیوم یوم

الملحمة الیوم تستحل الکعبه (آج کا دن لڑائی کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت کو بھی گزند پہنچ جائے گا یہ سن کر ابو سفیان نے نبی اکرم ﷺ سے شکایت کی کہ سعد یہ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے سن کر فوراً فرمایا کذب سعد ولکن ھذا الیوم یعظم اللّٰہ فیه الکعبة ویوم تکسی فیه الکعبة (سعد نے جو کہا جھوٹ کہا، آج کی حرمت کیلئے اس پر غلاف چڑھایا جائے گا اور بعض روایات میں اس کے ہم معنی یہ الفاظ ہیں الیوم یوم المرحمة الیوم تکسی الکعبة۔

اس روایت میں اگر چہ ”اصحاب فیل“ کا کوئی حوالہ نہیں ہے مگر فتح مکہ کے دوران میں اس واقعہ کے پیش آجانے سے یہ حقیقت بہر حال اور زیادہ روشن ہو گئی کہ جنگ و صلح ہر دو حالات میں اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ قریش کی حفاظت نہیں بلکہ کعبہ اور حرم کی حفاظت مقصود رہی ہے۔

فتح مکہ میں آخر قریش مکہ پر ہی ان کی بد عہدی کی وجہ سے چڑھائی ہوئی اور اگر چہ قریش کے فرار سے جنگ کی صورت پیدا نہیں ہوئی تاہم جن قریشیوں نے تھوڑی بہت مزاحمت کی وہ قتل بھی ہوئے مگر ”حابس الفیل“ نے ان کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو ہی کامیاب کر دیا کیوں؟ صرف اس لیے کہ مسلمانوں کا اعلان جنگ قریش کے لیے تھا اور وہ اس طرح کعبہ اور حرم کی حقیقی عظمت و حرمت کو واپس لانا چاہتے تھے اور اصحاب الفیل کو تباہی اور بربادی سے اس لیے واسطہ پڑا کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود وہ مشرکین مکہ (قریش) کے خلاف نبرد آزما نہیں ہوئے تھے بلکہ مرکز توحید کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے ارادہ سے آئے تھے۔

ہم نے جدید مفسر صاحب کی مفروضہ داستان کے خلاف نبی معصوم ﷺ کی صحیح احادیث سے اگر چہ مسکت اور فیصلہ کن شواہد پیش کر دیے ہیں مگر ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں اپنی من گھڑت داستان کے سامنے احادیث کی یہ شہادات اسی طرح قابل مضحکہ اور لائق تحریہ ہیں جس طرح وہ اپنے مزعومہ اسلامی رسالہ[1] میں بخاری اور مسلم کی بعض دوسری احادیث کا مذاق اڑا چکے اور ان کو نا قابل اعتماد قرار دے چکے ہیں۔ و الی اللّٰہ المشتکی۔

الحاصل جس طرح موثق دلائل و شواہد کی روشنی میں تفسیرِ جدید کا یہ بنیادی مقدمہ یا اختراعی تفاصیل کا یہ اہم حصہ بے بنیاد اور باطل ہے اسی طرح باقی حصص کو بھی بمصداق:

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

سمجھ لیجیے کہ ان کی حقیقت کیا ہے کہ ان کے لیے نہ قرآن کے اندر کوئی سند موجود ہے اور نہ باہر تاریخ و احادیث سے کوئی ان کو تائید حاصل ہے۔

مگر تفسیر بالرائے پر جدید مفسر صاحب کی یہ جسارت کس درجہ حیرت زا ہے کہ وہ اپنی خود ساختہ تفسیر کے مقابلہ میں سلف سے منقول تفسیر پر جو کہ احادیث صحیحہ، عرب روایات اور تاریخی تواتر سے ہے تل کے اوٹ پہاڑ کی پھبتی کسنے سے بھی نہیں چوکتے۔

مگر مفسر صاحب نے باقی تفسیر قرآن میں بھی یہی گل کاریاں کی ہیں اور اسلامی خدمت کے لیے اسی پیمانہ کو

---

[1] طلوع اسلام۔

معیار بنایا ہے تو ہم اس خدمت دین کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے ؎

گر ہمیں مکتب است و ہم مُلا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

چند تشریحی مطالب

۱) آیت وَاَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ میں ابابیل پرندوں کی جماعت کو کہتے ہیں اور اس کے مفہوم میں جماعت اور تتابع دونوں ایک ساتھ داخل ہیں یعنی وہ پرند مراد ہیں جو پرے کے پرے باندھ کر اڑتے ہوئے ایک دوسرے میں گھسنے کی کوشش کرتے ہوں، چنانچہ لغت میں ہے "الابابیل" الفرق طیراً ابابیل متتابعة مجتمعة اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں" ابابیل ای تتبع بعضها بعضا" اور یہی مجاہد سے منقول ہے اور پرے کے پرے بن کر اس طرح اڑنا کہ ایک دوسرے کے پیچھے لگا ہوا ہے طبعاً اور فطرۃً بعض چھوٹے پرندوں کا خاصہ ہے بعض علماء لغت کہتے ہیں کہ یہ" ابالة" کی جمع ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ یہ ایسی جمع ہے جس کے لیے کوئی واحد نہیں ہے۔ الابابیل جمع لا واحد له۔

۲) بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ میں حجارۃ کو سجیل کے ساتھ مقید کیا ہے یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس سے وہ شے مراد ہے جس کو فارسی میں سنگ گل اور اردو میں کنکر کہتے ہیں اور یہ کہ سنگ اور سنگریزوں کو سجیل نہیں کہا جاتا بلکہ ان کے لیے حجر پتھر اور حصیٰ (سنگریزہ یا پارہ ہائے سنگ) بولا جاتا ہے۔

اہل لغت پتھر اور پتھر سے مشابہ اشیاء کے درمیان جو فرق بیان کرتے ہیں اس کا حاصل بھی یہی ہے یعنی الحجر پتھر، حصٰی سنگریزہ یا پارہ سنگ، سجیل کنکر یا سنگ گل، الخزف مٹی کے برتنوں کے شکستہ ٹکڑے یا ٹھیکری۔

لہٰذا جس شخص نے حِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ کے معنی سنگ یا پارۂ سنگ سمجھ کر تَرْمِیْهِمْ کا ترجمہ سنگ باری کر رہے تھے کیا ہے غلط کیا ہے کیونکہ یہ لغت اور محاورات عرب دونوں کے خلاف ہے اور اس لیے اس معنی پر مبنی تفسیر بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور اگر یہ کہا جائے کہ قرآن نے حصیٰ کو مجازاً سجیل کہا ہے تو ثابت کرنا چاہیے کہ قرآن نے حقیقت کو چھوڑ کر کس لیے اس مقام پر مجاز استعمال کیا ہے؟

اور اگر سجیل کے حقیقی معنی مراد ہیں تو یہ بتانا چاہیے کہ مکہ کی اس پہاڑی پر جہاں چڑھ کر قریش نے کنکھر مارے یہ کنکھر کہاں سے آ گئے تھے جب کہ پہاڑیوں پر سنگریزے یا پارہ ہا کے سنگ تو ہوتے ہیں مگر کنکر نہیں ہوتے؟

۳) آیت فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ اس بات کے لیے نص ہے کہ ایسی فوج گراں کا جس میں ہزارہا مسلح لشکریوں کے علاوہ دیو پیکر ہاتھی بھی تھے کنکروں کی مار سے کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو جانا اور فرار ہو کر جان بچا لینے کی مہلت تک نہ ملنا قدرت کے اعجاز ہی کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا اور اسباب عقلی و عادی کے ماتحت عمل نہیں آیا۔

بصائر و عبر

مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون تعذیب اقوام و امم بہ تقاضائے حکمت دو دور میں منقسم رہا ہے۔

۱) جب تک پیروان دین حق اور متبعین پیغمبران خدا کی تعداد معاندین اور مخالفین کے مقابلہ میں اس قدر قلیل رہی ہے کہ عام حالات میں وہ دشمن کے مقابلہ سے معذور رہے ہیں تو اس پورے دور میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے زمین و آسمان یعنی اجرام ارضی و فلکی کے ذریعہ ان کی نصرت و حمایت کا سامان ہوتا رہا اور تعلیم حق و صداقت سے سرکش اور متمرد قوموں پر قدرت بلاواسطہ مختلف قسم کے زمینی اور آسمانی عذاب نازل کرتی رہی ہے چنانچہ قوم نوح ﷤ عاد، اصحاب ایکہ، فرعون و قوم فرعون وغیرہ اقوام و امم سب اسی قسم کے عذاب سے ہلاک و برباد کی گئیں یہ دور حضرت موسیٰ ﷤ پر ختم ہو جاتا ہے۔

۲) جب جاں نثاران حق و صداقت کی تعداد اس درجہ پر پہنچ گئی کہ وہ اگرچہ معاندین کے مقابلہ میں تھوڑے بھی رہے ہوں تب بھی اپنی تعداد کی اکثریت کے لحاظ سے دشمن کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونے کے قابل ہیں تو پھر سنۃ اللہ یہ رہی ہے کہ خود فداکاران حق اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ میدان کارزار میں نکل کر دشمنان خدا کا مقابلہ کریں اور اپنی جان کی بازی لگا کر ملت بیضاء اور دین حق کی حمایت کے لیے سینہ سپر بنیں اور ساتھ ہی سچے رسولوں کے ذریعہ یہ وعدہ بھی دیا جاتا رہا کہ ثمرہ اور نتیجہ میں فتح و نصرت تمہارا ہی حصہ ہے ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ اور یہ نصرت و فتح کبھی ملائکۃ اللہ کی معیت جہاد سے پوری کی جاتی ہے اور کبھی اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

غرض جن قوموں نے بھی حق و صداقت کے ظاہر ہو جانے اور خدائے برتر کے سچے پیغمبروں کی صداقت کو جان لینے کے بعد از راہ عداوت و غرور تعلیم حق سے نہ صرف منہ موڑا بلکہ اس کو مٹانے کی سعی ناکام کی تو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ان کو پاداش عمل کے چرخ پر کھینچ کر اور مختلف قسم کے عذاب چکھا کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور اگرچہ ان کی تعذیب کا قانون عام طور سے ان ہی دو دوروں کے اندر منحصر رہا تاہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کسی خاص طریق کار کے دائرہ میں محدود نہیں ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہماری اس تقسیم میں بعض مستثنیات بھی موجود ہوں البتہ تتبع اور استقراء کے پیش نظر یہ تقسیم ضرور صحیح ہے۔

۳) کعبۃ اللہ کے خلاف اصحاب فیل کی لشکر کشی اگرچہ قانون تعذیب امم کے دوسرے دور میں پیش آئی لیکن ایسے حالات اور ایسے زمانہ میں پیش آئی جو دور اول کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں یعنی فترۃ وحی (انقطاع وحی کا زمانہ جس میں نہ کوئی رسول ہے اور نہ کوئی نبی اور نہ وقت کے سچے دین کے حامل ہی نظر آتے ہیں اور اگر ہیں بھی تو منتشر افراد ہیں نہ کہ بااثر جماعت کہ وہ کعبۃ اللہ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو بلکہ ایک مدعی دین مسیحی ہی کعبہ ابراہیمی اور مرکز توحید کو برباد کرنے کے درپے نظر آتا ہے۔

اور مشرکین مکہ شرک و کفر کے باوجود اگرچہ بیت اللہ کی عظمت کے قائل ہیں مگر ایسی فوج گراں کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہیں رکھتے کہ جس کے ساتھ دیو پیکر ہاتھی بھی ہیں اور کعبہ کو رب کعبہ کے بھروسہ پر چھوڑ کر

پہاڑ کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں تو ایسی حالت میں دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں ایک یہ کہ ابرہہ اور اس کا لشکر (اصحاب فیل) کامیاب ہو اور بیت اللہ برباد کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کا ایسا نشان (معجزہ) ظاہر کرے جو اسباب و وسائل سے بالاتر ہو کر اس مرکز دین اور قبلۂ عالم "کعبہ" کی عظمت و حرمت کی حفاظت کا ضامن ہو اور ابرہہ اور اس کے لشکر (اصحاب فیل) کو قانون تعذیب امم کے پہلے دور کے مطابق ہلاک و برباد کر دے تاکہ یہ واقعہ کائنات انسانی کے لیے باعث عبرت و بصیرت ہو چنانچہ حضرت حق کی جانب سے یہی دوسری صورت رونمائی ہوئی اور اس کے اعجاز قدرت نے اصحاب فیل پر جو عذاب سماوی نازل کیا تھا سورۃ الفیل میں اسی کو بیان کیا گیا ہے... ذلك هو الحق وما ذلك على الله بعزيز

۴) یہ واقعہ ولادت باسعادت محمد ﷺ سے چند روز[1] قبل پیش آیا یہ وہ وقت تھا جب کہ کائنات کا گوشہ گوشہ خدا پرستی اور توحید الٰہی کے نغموں سے محروم ہو چکا تھا۔ خدا کی بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے مدعی ہر جگہ موجود تھے مگر سچی تعلیم معدوم ہو چکی تھی اور ادیان و ملل کے اصل خدوخال اور ان کی حقیقی شکل و صورت کی تحریف و تبدیل کے مرض نے مسخ کر دیا تھا ہر جگہ شرک و کفر کا دور دورہ تھا، کہیں اصنام پرستی ہو رہی تھی تو کسی جگہ کواکب پرستی کا شور تھا، کہیں آتش پرستی مقصد عبادت تھی تو کسی مقام پر عناصر پرستی دین کا نصب العین بن چکی تھی، کہیں تثلیث نے جگہ پا کر حضرت یسوع علیہ السلام کو مسیح بن اللہ بنایا تھا تو کسی گروہ نے عزیر بن اللہ، اصنام پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی، حیوانات پرستی نے فلسفیانہ تخیل کی آڑ لیکر شرک و کفر کو نمایاں کیا تھا اسلئے یہاں خدا پرستی کے علاوہ اور سب کچھ موجود تھا اگر مفقود تھی تو وہ فقط خدائے واحد کی پرستش ہی تھی۔

ان حالات کے پیش نظر غیرت حق کا یہ فیصلہ ہوا کہ وہ نور ہدایت روشن اور وہ آفتاب رسالت جلوہ گر ہو جو کسی ایک خاص خطۂ دنیا کو ہی نہیں بلکہ تمام عالم اور ساری کائنات کو راہ مستقیم دکھائے اور کائنات پرستی سے ہٹا کر خدا پرستی سکھائے وہ گم کردہ راہ انسانوں کو راہ بتائے اور بھٹکے ہوئے غلاموں کو حقیقی مالک و آقا سے ملائے ٹوٹے ہوؤں کا رشتہ جوڑے اور جاہلیت کی زنجیروں کو توڑے وہ دعائے خلیل اور نوید مسیح کا حاصل ہو اور اس مرکز توحید "کعبہ" کی حقیقی عظمت و حرمت کا داعی جو خدا پرستی کے لیئے سب سے پرانا اور مقدس گھر ہے اور جس کی تعمیر کا شرف ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام جیسے پیغمبروں کو بخشا گیا۔ آج اسرائیل کے خاندان سے دعوت حق کی امانت واپس لے لی گئی کیونکہ انھوں نے خیانت کی اور اپنے بزرگوں کی وصیت کو فراموش کر دیا نعبد الٰهك و اله ابائك ابرٰهم واسمٰعيل واسحٰق آج اسمٰعیل علیہ السلام کا خاندان نوازا گیا اور خدا کی پاک امانت "سلالۃ اسمٰعیلی" کو عطا کر دی گئی۔ وقت آرہا ہے کہ رسالت و نبوت کا یہ چاند عنقریب غار حرا سے کھیت کرے اور آفتاب حقیقت بن کر دنیا پر چمکے، اس کی ملت ابراہیمی کہلائے اور دنیا میں خدا کا سب سے پہلا گھر (کعبہ) پھر قبلۂ عالم اور مرکز کائنات بنے۔

ادھر حضرت حق کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے مگر دوسری جانب دنیا کی ایک حقیر ہستی یمن اور حبشہ کی فانی حکومت کا

---

[1] کتب سیر میں راجح قول یہ ہے کہ یہ واقعہ ولادت باسعادت سے پچاس روز قبل پیش آیا۔

زعم میں یہ چاہتی ہے کہ مرکز توحید اور کعبۂ ملت حق بیت اللہ کو برباد کر کے اور صفحۂ ہستی سے مٹا کر مرکز تثلیث صنعاء کے القلیس کو کائنات انسانی کا قبلہ مقصود اور کعبۂ محمود بنائے اور اس طرح توحید خالص کی جگہ تثلیث کی شرک پرستی کو فروغ دے وہ سمجھتا ہے کہ میری فوج گراں اور شوکت و ہیبت کے مقابلہ سے سارا عرب عاجز و درماندہ ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ مہیب ہاتھویں کا یہ لشکر جب کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کے لیے آگے بڑھے گا تو خدا کے اس گھر کو کوئی نہ بچا سکے گا اس لیے وہ کروفر اور ہیبت و عظمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یمن سے چلتا ہے اور راہ میں جو قبائل مزحمت کرتے ہیں ان کو پامال کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور سردارِ قریش عبد المطلب جب اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ اپنے غرور و نخوت کے ساتھ یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ ہمارا مقصد قریش سے نبرد آزما ہونا نہیں ہے بلکہ کعبہ کا انہدام و فنا مقصود ہے۔ عبد المطلب اچھوتے اور عبرت آموز انداز میں اپنی بے چارگی اور تاب مقاومت سے معذوری کا اظہار کر کے کعبہ کو رب کعبہ کے سپرد کر کے قریش سمیت ابرہہ کی راہ مزاحمت سے ہٹ جاتے ہیں۔

اب مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے نہیں ہے بلکہ فرعون صفت اور ہامان نمط انسانی طاقت خدا کی طاقت سے ٹکرانا چاہتی ہے یہاں انسانی مقاصد دوسرے انسانوں کے مقاصد سے متصادم نہیں ہیں بلکہ حضرتِ حق کے مقصد پاک سے ایک ناپاک ہستی کا ارادۂ ناپاک تصادم چاہتا ہے پھر نتیجہ کیا؟ نکلا وہی جو ہونا چاہیے تھا، کہ خدا کی معجزانہ قدرت کے سامنے انسانی قوت پاش پاش ہو کر رہ گئی اور اصحاب الفیل کا مقصدِ شر حضرتِ حق کے مقصدِ خیر کے مقابلہ میں خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ کا مصداق بن کر رہ گیا۔

آج نہ اصحاب الفیل کا نام و نشان باقی ہے اور نہ القلیس صنعاء کا اور نہ وہ قریش مکہ ہی باقی ہیں جن کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا تھا لیکن قبلۂ توحید اور مرکزِ صداقت کعبۃ اللہ اسی طرح اپنی عظمت و جلالت کے ساتھ قائم و دائم ہے اور آج بھی قرآن عزیز اس کی رفعتِ شان کا بانگ دہل یہ اعلان کر رہا ہے إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ بے شک سب سے قدیم وہ گھر جو انسان کی خدا پرستی کے لیے بنایا گیا۔ یقیناً وہ ہے جو مکہ میں ہے جو سر تا سر مبارک اور جہانوں کے لیے (مرکز) ہدایت ہے۔

۵) سورۃ الفیل کے مطالعہ سے دو باتیں صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس سورۃ میں ایک متمرد اور سرکش جماعت کی ہلاکت کا عبرت آموز واقعہ مذکور ہے دوسرے یہ کہ اس واقعہ سے منجانب اللہ کعبۃ اللہ کی حرمت و عظمت کی حفاظت کا بصیرت افروز نتیجہ نکلتا ہے۔

اب رہا یہ امر کہ اس واقعہ کے بیان کرنے سے جو غرض و غایت ہے وہ اپنے اندر کیا اسرار و حکم محفوظ رکھتی ہے تو اگرچہ خدا کی حکمتوں کا احاطہ انسان فانی کے حیطۂ امکان سے باہر ہے تاہم بنظر استحسان دو حکمتیں نمایاں نظر آتی ہیں:

الف یہ واقعہ ولادت باسعادت ﷺ کے لیے ایک زبردست نشان کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے کہ نظام قدرت کے ابھرے ہوئے نقوش ہم کو یہ خبر دیتے ہیں کہ اس کارگہِ عالم میں جب بھی کوئی عظیم انقلاب بپا ہوتا ہے تو اس کے وجود سے قبل ضرور ایسے آثار اور ایسی علامات ظاہر ہوتی ہیں کہ جن کو دیکھ کر عبرت

نگاہ اور حقیقت آگاہ انسان آنے والے انقلاب کا اندازہ کر لیتا ہے اور انسان ہی نہیں بلکہ حضرت حق نے حیوانات تک میں احساس جزئیات کا ایسا ملکہ ودیعت کیا ہے کہ وہ طوفان باد و باراں اور بھونچال جیسے حوادث کا پتہ صرف علامات و آثار سے پا لیتے اور وقت سے قبل ہی اپنے اضطراب و کرب کے ذریعہ دور رس انسانوں کو ان حقائق کا علم کرا دیتے ہیں۔

دور نہ جایئے روزانہ ہونے والے انقلاب ہی کو دیکھیے اور اس سے اس حقیقت کی صداقت کو وزن کیجیے شبِ دیجور کی حیاتِ چند ساعت کا جب پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور طلوع آفتاب عالم تاب کی وجہ سے اس کو پیام مرگ مل جاتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ رات کے آخری کنارہ پر پہونچ کر وہ کائنات کو اپنے رخ روشن کا جلوہ دکھا دیتا ہو بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اول افق مشرق میں سپیدہ صبح نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ تاریکی کو روشنی سے بدلتا جاتا ہے اس وقت ہر ذی ہوش یہ سمجھ جاتا ہے کہ خورشید خاور کی تنویر کا وقت آ پہنچا، گو نیند کے ماتے شب تاریک کی مرگِ ناگہانی اور سپیدۂ صبح کی منادی طلوع آفتاب سے غافل سوئے پڑے ہیں لیکن مرد باہوش اس علامت کو دیکھ کر روز روشن کی آمد کا پتہ لگا لیتے اور خواب غفلت سے بیدار ہو جاتے ہیں تاکہ آفتاب نشانی سے قبل ہی خود کو اس کے خیر مقدم کے لائق بنا سکیں۔

عالم مادی کے اس انقلاب کی طرح عالم روحانیت میں بھی "سنۃ اللہ" اسی طرح جاری و ساری ہے کیونکہ عالمین کا رب ایک ہی وحدہ لاشریک لہ ہستی ہے اس لیے ہر عالم کے لیے اس کے نوامیس و قوانین میں بھی وحدت اور یکسانیت جلوہ گر ہے۔

کائنات روحانی میں عالم مادی کے وجود ہی سے انقلاب تو ہوتا ہی رہا کہ جونہی توحید الٰہی کی روشنی پر کفر و شرک کی تاریکی نے غلبہ پایا ناموس الٰہی نے کسی روشن ستارہ یا قمر یا لیلۃ القدر کے ذریعہ اس ظلمت کو کافور کر دیا لیکن ابھی عالم ایسی روشنی کا طلب گار تھا کہ اس کے طلوع کے بعد روشنی اور تاریکی کا فرق اس طرح نمایاں ہو جائے کہ پھر کبھی ظلمت کفر نور توحید پر اس طرح نہ چھا سکے کہ سراب اور آب حیات کے درمیان امتیاز مشکل ہو جائے ہاں اگر روز روشن کی موجودگی میں بھی کسی شپر چشم کو آفتاب کی روشنی نظر نہ آئے تو یہ ایک جدا بات ہے کہ قصور کس کا ہے؟ آفتاب کا...... یا شپر چشم کا؟

غرض جب وہ وقت قریب آ پہنچا کہ نبوت و رسالت کا آفتاب عالمتاب محمد ﷺ طلوع ہو اور شرک و کفر کے پردہ ہائے ظلمت ظُلُمات بَعْضُهَا فَوقَ بَعْض چاک کر دیے جائیں تو آسمان و زمین میں سپیدۂ صبح سعادت کے ایسے آچار و علائم نمودار ہونے لگے کہ چشم حق بین اور دل حق آگاہ نے یکہ محسوس کر لیا کہ عنقریب عالم روحانیت میں عظیم الشان انقلاب بپا ہونے والا اور وہ وقت آنے والا ہے کہ داستان شب سرد پڑ جائے گی اور حقیقت کا آفتاب چمک اٹھے گا اور دل و زبان یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے:

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

عالم روحانیات کا یہ سراج منیر[1] ظاہر ہے کہ سرزمین مکہ سے طلوع ہونے والا تھا اور اس کی دعوت عام کا محور

[1] قرآن نے مادی آفتاب کو بھی "سراج" ہی کہا ہے و جعل الشمس سراجا اسلئے روحانی آفتاب کو بھی سراج منیر کہا۔

مرکز یہی مقدس مقام بننے والا تھا جہاں عبادت الٰہی کا سب سے پرانا گھر کعبۃ اللہ قبلہ عالم و عالمیان تھا پس ایسے عظیم الشان انقلاب کے وقت کفر و شرک کی ظلمت شب نے ایک آخری سہارا لیا اور نور آفتاب پر غالب آنے کی کوشش کی یہی وہ منظر تھا جو ابرہہ اور اس کے لشکر اصحاب فیل کی بدولت دنیا کے اس پردۂ متحرک پر نظر آیا کہ کسی طرح مرکز توحید کعبۃ اللہ کو برباد کر کے مرکز تثلیث القلیس کو مرجع خلائق اور مرجع عبادت بنا دیا جائے تاکہ ظلمت شرک ایسا فروغ پائے کہ طلوع آفتاب کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔

مگر قدرت کے منشاء کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور خدا کے ارادہ پر کوئی ہستی غالب نہیں آسکتی لہٰذا دنیا نے دیکھا کہ یہ منظر بہت جلد ہی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور تھوڑے سے عرصہ کے بعد ہی رسالت و نبوت کے آفتاب عالمتاب نے روشن ہو کر ساری کائنات الٰہی کو منور کر دیا۔

تو اب کہنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت سے قبل جو نشان ظہور میں آئے اور صبح سعادت کے لیے آثار و علامات کہلائے ان ہی سے اصحاب فیل کا واقعہ بھی ایک زبردست نشان اور عظیم المرتبت علامت ہے۔

ب اس واقعہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے قریش کو اپنا بہت بڑا احسان یاد دلایا ہے کہ وہ یہ نہ بھول جائیں کہ جس وقت وہ کعبہ کی عظمت کے قائل ہونے کے باوجود ابرہہ (اصحاب فیل) کے اس مقابلہ سے عاجز رہے تھے جس میں اس نے کعبہ کی بربادی کا بیڑا اٹھایا تھا اس وقت ہم نے اپنی قدرت کاملہ کے نشان اعجاز سے وہ کر دکھایا کہ دشمن کی شر آمیز تدبیر اور اس کا ارادۂ بد دونوں خاک میں مل کر رہ گئے۔

کیا تم نے اس عبرت زا واقعہ سے یہ سبق حاصل نہیں کیا کہ یہ سب کچھ تمہاری خوشنودی کے لیے نہیں تھا جب کہ تم شرک کی تاریکیوں میں غرق اور کفر کی آلودگیوں میں ملوث تھے بلکہ کعبہ کی اس عظمت کی بقاء کے لیے تھا جس کی تعمیر بوڑھے پیغمبر ابراہیم ؑ اور جواں پیغمبر اسمٰعیل ؑ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور جس کے متعلق انھوں نے یہ فرمایا

رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسۡكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيۡرِ ذِي زَرۡعٍ عِندَ بَيۡتِكَ ٱلۡمُحَرَّمِ

(اے میرے پروردگار میں نے بسایا ہے اپنی بعض اولاد کو بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے باعزت و حرمت گھر کے پاس)

اور اس حرم مقدس کی خاطر جس کے لیے ابراہیم ؑ نے یہ دعا کی

وَإِذۡ قَالَ إِبۡرَاهِيمُ رَبِّ ٱجۡعَلۡ هَٰذَا ٱلۡبَلَدَ ءَامِنٗا وَٱجۡنُبۡنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعۡبُدَ ٱلۡأَصۡنَامَ ○

(وہ وقت یاد کرو جب ابراہیم ؑ نے کہا اے میرے پروردگار تو اس شہر مکہ کو امن والا کر دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے بچا کہ ہم بت پرستی میں مبتلا ہوں)

آج پھر وہ وقت ہے کہ خدا کا پیغمبر محمد ﷺ کعبہ کی حقیقی عظمت قائم کرتا اور اس کو بتوں اور بت پرستی کی تلویث سے پاک کرنا چاہتا ہے مگر تم ان کو اور مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر اور اپنی قوت کے غرور اور گھمنڈ

میں اکڑ کر آڑے آرہے ہو تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس ذات نے اصحاب فیل کے کبر و غرور کو خاک میں ملا دیا تھا وہ تمہارے غرور کا بھی یہی حشر نہیں کر سکتا؟

سمجھو اور معاملہ کی حقیقت پر غور کرو اور پیغمبر خدا ﷺ کی مخالفت سے باز آجاؤ۔

اس بات کی تائید سورہ الفیل سے متصل سورۃ القریش سے بھی ہوتی ہے اس لیے کہ اس سورۃ میں قریش کو یہ توجہ دلائی گئی ہے یا ان پر اپنے اس احسان کو ظاہر کیا گیا ہے کہ عرب قبائل کے باہم بات بات پر جنگ و جدل اور معمولی معمولی معاملہ پر حرب و ضرب کے باوجود وہ حرم مکہ میں کس طرح مامون و محفوظ ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی خدمت کے انتساب کی وجہ سے حرم سے باہر بھی سردی اور گرمی دو موسموں میں اپنے محبوب تجارتی سفروں میں شام اور یمن تک بے خوف و خطر آتے جاتے ہیں اور کوئی آنکھ اٹھا کر بھی ان کی جانب دیکھنے نہیں پاتا۔

تو کیا وہ اس احسان کے شکر گذار نہیں ہوتے اور حرم اور کعبہ کی حقیقی عظمت کو سر بلند کرنے کے لیے خدا کا آخری پیغمبر ﷺ کو جس صداقت کی جانب بلاتا ہے اس پر لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بات ہر گز زیبا نہیں دیتی۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ

(پس ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے پروردگار کی سچی پرستش کریں کہ جس نے ان کی بھوک کے لیے سامان رزق بہم پہنچایا اور ان کو خوف و خطر سے مامون و محفوظ کر دیا)

۶) ابرہہ مذہباً عیسائی تھا اور اس لیے وہ بیت اللہ کعبہ کی عظمت کو کسی طرح برداشت نہیں کرتا تھا اور اس کا وجود گویا ایک خار تھا جو کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کعبہ معمولی پتھروں کی اک سادہ عمارت ہے اگر اسکے مقابلہ میں ایک ایسی خوبصورت اور بے نظیر عمارت بشکل کلیسا (گرجا) تیار کی جائے جو بیش قیمت پتھروں اور جواہرات سے مزین ہو تو اس طرح میں سارے عرب کی توجہ کعبہ سے ہٹا سکوں گا اور اس جدید معبد کو مرجع خلائق بنا سکوں گا یہ سوچ کر ایک طرف اس نے یمن کے دارالحکومت صنعاء میں ایک بے نظیر گرجا القلیس بنوایا اور دوسری جانب ایک معمولی واقعہ کو حیلہ بنا کر کعبہ کی بربادی کا تہیہ کیا نتیجہ جو کچھ ہوا مفصل مذکور ہو چکا لیکن اس واقعہ میں اس جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ عیسائیوں کو ہی اس بیت اللہ کعبہ کے ساتھ عداوت رہے گی اور وہ اپنے غیر متمدن اور متمدن ہر زمانہ میں اس کے خلاف اپنی عداوت کا اظہار کرتے رہیں گے اور ہمیشہ اس مرکز توحید کے درپے رہیں گے چنانچہ تاریخ ماضی اس کی شاہد ہے کہ جب کبھی نصاریٰ کو اس کا موقع میسر آیا انھوں نے عملاً اپنی عداوت کا اظہار کیے بغیر نہ چھوڑا اور اگرچہ خدائے تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ہمیشہ ان کے ارادوں کو ناکام رکھا مگر وہ بہر حال اپنے قلبی بغض و حسد کا ثبوت دیے بغیر نہیں رہے۔

۷) "کعبہ" بیت اللہ یعنی خدا کا گھر کہلاتا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "العیاذ باللہ" اللہ تعالیٰ کسی گھر میں ساکن ہے اور وہ گھر کا محتاج ہے بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اسنے اپنی خالص عبادت کی غرض سے انقطاع و امصار کے مسلمانوں اور سچے عبادت گذاروں کے لیے کعبہ کو مرکز و محور بنایا ہے اور یہ اس لیے کہ جب کہ

خدائے تعالیٰ جہات سے وراءالوراء اور پاک ہے اور انسان اپنے ہر کام میں جہات میں کسی جہت کا محتاج تو از بس ضروری تھا کہ تمام کائنات کے پیروان توحید اور عبادت گذاران رب العلمین کی عبادت اور ان کی حیات ملی ودینی کے لیے مرکز ہوتا کہ وہ انتشار اور تفرق وتشتت سے محفوظ رہیں اور وحدت اجتماعی کا سبق سیکھیں۔

لہٰذا اس کے لیے وہ مقدس عمارت "شعائر اللہ" قرار دی گئی جس کو مجدد انبیاء ورسل ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مقدس بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام نے دنیا میں سب سے پہلے صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے تعمیر کیا تھا اور جو توحید کے اعلان کی سب سے پرانی یادگار تھی۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ○

جو لوگ اللہ کی نشانیوں کی عظمت کریں گے تو یہ ان کے دل کی پرہیزگاری کی دلیل ہے۔

پس کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کعبہ کی اس لیے عظمت کرے کہ وہ "صنم" ہے یا خود قابل پرستش ہے اس لیے کہ جو ایسا سمجھے گا وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک کہلائے گا بلکہ اس کی حرمت صرف اس لیے ہے کہ وہ شعائر اللہ ہے اور مرکز توحید چنانچہ اسی حقیقت کو ایک عارف باللہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے: ع

"قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں"

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْأَبْصَارِ ○

بحمد اللہ تمام

قصص القرآن

حصہ چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے
واقعات وحالات کا مبصرانہ اور محققانہ بیان

دیباچہ طبع ثانی

اللہ رب العزت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ اس نے آج قصص القرآن کی چوتھی جلد کے دوسرے ایڈیشن کو شائقین کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

بلا شبہ یہ مؤلف کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کتاب بحمد اللہ مقبولِ خاص و عام ہوئی بلکہ یہ تو قرآن حکیم کا اپنا معجزہ ہے کہ ایک سطر یا ایک لفظ بھی اس کی سچی خدمت سے اگر وابستہ ہو جائے تو وہ لفظ اور وہ سطر بھی مخدوم و مقبول بن جاتی ہے۔

پہلا ایڈیشن جب طبع ہو کر سامنے آیا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کافی کنج و کاؤ کے باوجود "ختم نبوت" کے اہم عنوان سے کتاب خالی ہے —— بار بار غور کیا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ عنوان کی اہمیت کس طرح نظر انداز ہو گئی۔ یہ کمی ایسی نہ تھی جو قلب کو خلش سے آزاد کر سکتی، اس لیے ایڈیشن کے ختم ہونے کا بے چینی کے ساتھ انتظار رہا، اور اب بحمد اللہ نقشِ ثانی میں اس کی تلافی کر سکا فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِكَ۔

۱۴ر ستمبر ۱۹۴۷ء کے خونی حادثہ نے ندوۃ المصنفین کو بھی بھڑکتے ہوئی شعلوں کی لپیٹ میں لیے بغیر نہ چھوڑا اور تقریباً پونے دو لاکھ قیمت کے بہترین علمی اسٹاک کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

اب نہ وہ قرول باغ کی خاموش فضاء ہے اور نہ قلب و دماغ کو پہلا سا سکون نصیب —— ایک قرول باغ اور ندوۃ المصنفین کا بہترین آفس ہی کیا سرے سے وہ دلّی ہی نہ رہی، اب تو اس "مرحوم دلّی" کا ذکر افسانوں ہی میں سنیے گا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ دلی پھر دلی ہے سترہ مرتبہ اجڑ کر بھی نئی بہار کے ساتھ اپنا جوبن دکھا رہی ہے — خدا اسے نظرِ بد سے بچائے۔

بہر حال اس نازک اور ناساز گار ماحول کے باوجود قصص القرآن جلد رابع کا دوسرا ایڈیشن طبع ہو کر آپ کو دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ اب آپ کا علمی و دینی فرض ہے کہ اس قیمتی ادارہ کو اس قابل بنائیں کہ وہ سابق کی طرح آج بھی علمی، ادبی اور دینی خدمات انجام دیتا رہے اور دنیا کی نئی ترقیوں کے ساتھ وہ بھی عروج کی آخری منزل تک پہنچ سکے —— واللہ غالب علیٰ امرہ۔

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہ
۲۱ر ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

طبع سوم

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے، لیکن نظر ثانی کا موقع نہ مل سکا، اور یہ تیسرا ایڈیشن نظرِ ثانی کے بغیر ہی شائع ہو رہا ہے۔ طبع دوم میں ایک نہایت اہم باب "ختم نبوت" کے اضافہ کے بعد یوں بھی یہ ایڈیشن نظرِ ثانی کا

محتاج نہ تھا، پھر بھی انسانی جد وجہد کسی وقت بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی —— موقع میسر آیا تو طبع چہارم کے وقت نظر ثانی ہو سکے گی۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۳۱/ اکتوبر ۱۹۵۵ء

دیباچہ طبع عکسی

شکر ہے سالہا سال کے انتظار اور کاوش کے بعد قصص القرآن جلد چہارم کا بھی عکسی ایڈیشن تیار ہو گیا ہے اور اس طرح کتاب کی چاروں جلدیں ایک ہی رنگ اور ایک ہی معیار پر آ گئی ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قصص القرآن ندوۃ المصنّفین کی نہایت اہم اور مقبول ترین کتاب ہے اور اپنے مضامین کی افادیت، نُدرت اور اثر انگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی، پوری کتاب کے کم و بیش اٹھارہ سو صفحات ہیں، ان صفحات میں قرآن کریم کے بیانات کی روشنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی ایمان افروز زندگی کے واقعات و حالات سادہ اور پُراثر پیرایے میں تحریر کیے گئے ہیں۔

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ قصص القرآن کے درجے کی کوئی کتاب دُنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے جس میں قصصِ قرآنی اور پیغمبرانِ حق کی تاریخ اتنی تفصیل و تحقیق سے بیان کی گئی ہو۔

قدرتی طور پر جی چاہتا تھا کہ اس لاجواب کتاب کی طباعت بھی اس کی شان اور مرتبے کے مطابق ہوتی، الحمد للہ یہ آرزو پوری ہو گئی اور چاروں جلدیں نفیس کتابت کے زیور سے آراستہ ہو کر آفسٹ پر چھپ گئیں۔

ندوۃ المصنّفین کے وسائل نہایت ہی محدود ہیں اور اس کے لیے گرانی کی شدت کے اس دور میں اتنی ضخیم کتاب کی اشاعت جتنی کچھ دشوار ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے۔

دعاء ہے خواص اور عوام، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید طالبانِ علم سب ہی بقدرِ ظرف و ہمت اس سے پورا پورا فیض حاصل کریں۔

ضرورت ہے کہ موعظت و عبرت کے اس دفتر کا ایڈیشن عربی میں بھی شائع ہو اور انگریزی میں بھی، دیکھئے اس کی نوبت کب آتی ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ندوۃ المصنفین

۲۷/ جمادی الآخر ۱۳۹۹ھ

مطابق ۲۴/ مئی ۱۹۷۹ء

پیش لفظ

اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَزَّلَ الفُرقَانَ عَلٰی عَبدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا - وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ المَبعُوْثِ کَافَۃً لِلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا-

امّابعد— خدائے تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گئی، میں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی ہوا خدا کے فضل اور قرآنِ حکیم کی برکت کی بدولت ہوا — فالحمد للّٰہ علی ذلک

یہ جلد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت و دعوت اور حیوٰۃ طیبہ اور دیگر مباحث متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات و امتیازات کی حامل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائق مراجعت ہیں جو قرآن کریم کے حکیمانہ دلائل و براہین کی روشنی میں "حیوٰۃ عیسیٰ علیہ السلام" سے متعلق ہیں یا عہدِ قدیم و عہد جدید (توراۃ و انجیل) کے مضامینِ الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کی "حیوٰۃ طیبہ" تو وہ مخدوم شے ہے کہ از سلف تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمتِ پاک کو اپنا فرض یقین کرتی ہے اور اداءِ فرض سے سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے۔ خصوصاً عربی زبان کے بعد اردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے اور مختصر، متوسط، مطول — ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لیے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپردِ قلم کیا جائے جن کا قرآن حکیم سے براہِ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذاتِ اقدس ﷺ کا ہر شعبۂ حیات قرآن حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپ ﷺ کا ہر اُسوۂ حسنہ آیاتِ قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصدِ تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے، اس کا فیصلہ اربابِ ذوق کی نگاہِ بصیرت کے سپرد ہے— خدائے تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ وَھُوَ حَسْبِیْ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ

خادمِ ملّت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہ

۹ر صفر المظفر ۱۳۶۵ھ

مطابق ۱۳ر جنوری ۱۹۴۶ء

حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام

لائق توجہ بات　　　کفارہ؟

قرآن عزیز اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، اور جس طرح نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیاء ورسل ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاءِ بنی اسرائیل ہیں، اور جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، اور درمیان کا زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سو ستّر سال ہے فترۃ (انقطاعِ وحی) کا زمانہ رہا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاء بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ورسالت کا مقام امامت حاصل ہے تو عیسیٰ علیہ السلام مجددِ انبیاء بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ قانون ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کے لیے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانون تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے یعنی نزول تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دین حق میں پیدا کر لی تھیں انجیل نے تورات کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیلِ تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فراموش شدہ پیغام ہدایت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے دوبارہ یاد دلایا اور تازہ بارانِ رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔ مزید برآں یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام سرورِ کائنات محمد ﷺ کے سب سے بڑے مناد اور مبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔[1]

قرآن عزیز نے نبی اکرم ﷺ کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے ان میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآن کے "تذکیر بایام اللہ" میں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دین قویم اور ملتِ بیضاء کا عروج وکمال محمد ﷺ کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت وتبلیغ کا محور ومرکز ذاتِ اقدس ﷺ بننے والی تھی وہ ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے نام سے موسوم ہے مِلَّةَ أَبِيكُمْ کیونکہ یہی وہ بوڑھے پیغمبر ہیں جنہوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحیدِ الٰہی کو حنیفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کیلئے خدا کی راہِ مستقیم کیلئے "ملۃ حنیفیۃ" کا امتیاز قائم کر دیا، یعنی جو خدا کی پرستش کیلئے مظاہر کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے وہ "مشرک" ہے اور جو خالقِ کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہِ راست اُسی کی پرستش کرتا ہے وہ "حنیف" ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیانِ حق کیلئے اس کی پیروی حق وصداقت کا معیار بن گئی اور

۱: تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطا ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائناتِ رشد و ہدایت کا امامِ اکبر اور مجددِ اعظم قرار پا گیا: فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا اور پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی، جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے۔

مِلَّةَ أَبِيْكُمْ إِبْرَاهِيْمَ ط هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا

یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی، اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا نزولِ قرآن سے قبل اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام "مسلم" ہے۔[1]

اور موسیٰ علیہ السلام کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی دعوت و تبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی، دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی پیہم مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا دوام و ثبات، اور اسی قسم کے دوسرے کوائف و حالات ہیں ان کے اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہے اور اس لیے وہ واقعات و حالات، قبول و انکارِ حق اور ان سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت و عبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر و شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ کا مقدس ذکر مسطورہ بالا خصوصیات و امتیازات کی بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور ان کی حیات طیبہ کے دیباچہ کے طور پر ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے واقعاتِ زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد "تذکیر بایام اللہ" پورا ہو۔

یہ ذکر پاک قرآنِ عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نامِ مبارک عیسیٰ (یسوع) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ "مسیح علیہ السلام" اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت "ابن مریم" کے اظہار کے ساتھ۔

نقشۂ ذیل اس حقیقت کا کاشف اور اربابِ مطالعہ کی بصیرت کے لیے مدد و معاون ہے:۔

شمار	سورۃ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرہ	۸۷، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۲۵۳	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آلعمران	۴۲، ۶۴، ۸۴	۵	۱	۰	۱	۲۴
۳	النساء	۲۵۶، ۱۵۹، ۱۷۱، ۱۷۲	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المآئدہ	۱۷، ۴۶، ۷۲، ۷۵، ۷۸، ۱۱۰، ۱۲۰	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۲۰، ۳۱	۰	۱	۰	۱	۲

۱: مسلم اور حنیف مفہوم میں متحد ہیں۔ مسلم خدا کا تابعدار اور حنیف سب سے منہ پھیر کر صرف خدا کا ہو جانے والا۔

۷	مریم	۳۵،۱۶	۱	۱	۱	۱	۱۹
۸	المؤمنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۸،۷	۱	۰	۰	۱	۲
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۶۳،۵۷	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحدید	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصّف	۱۴،۶	۲	۰	۰	۲	۲

عمران وحنہ

حضرت زکریا اور یحیٰ علیہما السلام کے حالات میں گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد وزاہد شخص تھے اور اسی زہد وعبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان ہی کے سپرد تھی اور ان کی بیوی حنہ بھی بہت پرسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب ومقبول تھے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱ (آل عمران))

محمد بن اسحٰق صاحبِ مغازی نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

عمران بن یاشم بن میشا بن جزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجر بن یہوا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایاز بن رخیم (رحبعام) بن سلیمان بن داوٗد علیہما السلام۔

اور حافظ ابنِ عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہین اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماء انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنت فاقوذ بن نبیل بھی داوٗد علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۶)

عمران صاحب اولاد نہیں تھے اور ان کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ ان کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہِ الٰہی میں دست بدعاء اور قبولیتِ دعاء کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحن مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالتِ اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعاء کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور عرض کیا:

پروردگار! اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے۔

دل سے نکلی ہوئی دعاء نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انہوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجد اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی۔[1]

[1] بنی اسرئیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کیلئے وقف کریں۔ البدایۃ والنہایۃ جلد ۲۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعاء کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ امید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحٰق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ ان کے شوہر عمران کا انتقال ہو گیا۔ (فتح الباری جلد ۶ ص ۳۶۴)

مریم علیہا السلام کی ولادت

جب مدتِ حمل پوری ہو گئی اور ولادت کا وقت آ پہنچا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر ان کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مبارک قرار پایا، حنہ نے لڑکی کا نام مریم رکھا، سریانی میں اس کے معنی خادم[۱] کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ[۲] رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا

بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو اپنے اپنے زمانہ میں جہان والوں پر بزرگی عطا فرمائی (ان میں سے) بعض، بعض کی ذریت ہیں) اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ (وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے کہا "خدایا! میں نے نذر مان لی ہے کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے" پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما۔ بیشک تو سننے والا، جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا تو کہنے لگی "پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔ اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

۱: فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵

۲: عمران، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی۔ یہاں والد مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح قبول فرمایا اور اس کی نشو و نما اچھے طریق پر کی اور زکریا کو اس کا نگرانِ کار بنایا۔

حضرت مریم علیہا السلام جب سنِ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں[1] میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرت زکریا سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لیے کہ وہ مریم علیہا السلام کی خالہ ایشاع (الیشع) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لیے سب سے پہلے انہوں نے اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور بقول روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا علیہ السلام ہی کا نام نکلتا، کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا علیہ السلام کے ساتھ تائیدِ غیبی ہے تو انہوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح یہ "سعید امانت" حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم علیہا السلام کی کفالت کا یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اور اس لیے کفالت کا سوال پیدا ہوا[2]۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لیے کہ مریم علیہا السلام اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذرِ ہیکل" ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لیے ازبس ضروری تھا کہ وہ کسی مردِ نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں۔

غرض زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ ان کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادتِ الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو ان کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں۔[3]

۱: کاہن سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمت ہیکل پر مامور تھیں۔

۲: تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰

۳: روح المعانی سورۂ آل عمران —— مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں:

قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا گیا ہے، یہاں اور سورۂ آل عمران کی آیات ۳۵-۶۳ میں، یہاں یہ ذکر حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور حضرت یحییٰ کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیل اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آل عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے، یعنی حضرت مریم کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا اس نے حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی کے اوائل تک سرگذشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔ ج ۲ ص ۴۴۳۔

حنہ اور ایشاع

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (الیشع) مریم علیہا السلام کی ہمشیرہ تھیں اور حدیث معراج میں نبی اکرم ﷺ نے عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق یہ فرما کر "وھما ابنا خالۃ" جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآن عزیز اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا "خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطا فرمائی" بلکہ درگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعاء تو نے قبول فرمائی ہے اس کو حسب وعدہ تیری نذر کیسے کروں نیز توراۃ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم علیہا السلام کے ماسوا کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع، مریم علیہا السلام کی خالہ تھیں۔

دراصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیث معراج کے مسطورۂ بالا جملہ کے پیش نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد "وھما ابنا خالۃ" وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں، مجاز متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ نے بہ طریقِ توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰ علیہ السلام کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع وذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابن کثیر رحمہ اللہ کا اس کو "قول جمہور" کہنا بھی محل نظر ہے اس لیے کہ محمد بن اسحٰق، اسحٰق بن بشیر، ابن عساکر، ابن جریر اور ابن حجر رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر اصحاب حدیث وسیَر کا رجحان اس جانب ہے کہ ایشاع، حنہ کی ہمشیر اور مریم علیہا السلام کی خالہ ہیں، حنہ کی بیٹی نہیں ہیں۔

مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ

مریم علیہا السلام شب و روز عبادتِ الٰہی میں رہتیں اور جب خدمتِ ہیکل کے لیے ان کی نوبت آتی تو اس کو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ ان کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا اور ان کی زہادت و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں۔

مقبولیتِ خداوندی

زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لے جایا کرتے تھے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوت کدہ میں داخل ہوتے تو مریم علیہا السلام کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے[1] — آخر زکریا علیہ السلام سے رہا نہ گیا اور انہوں نے دریافت کیا: مریم تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم (علیہا السلام) نے فرمایا: "یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم

---

[1] یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہے اور آیت میں صرف لفظ "رزق" آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مریم کا یہ رزق انسانی داد و دہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بطور کرامت من جانب اللہ تھا۔ (مؤلف)

ہے،وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے"۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے یہ سنا تو سمجھ گئے کہ خدا کے یہاں مریم علیہا السلام کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیئے، کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطا نہ کرے گا؟ یہ سوچ کر انہوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہ ربانی میں دعاء کی اور وہاں شرف قبولیت کا مژدہ عطا ہوا:

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَامَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

اور اس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اس (مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اسکے پاس کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: "اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں"۔ مریم نے کہا "یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے"۔

مریم (علیہا السلام) اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان کے زہد و تقویٰ سے بے حد متاثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت اور جلالت قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ ان کو برگزیدۂ بارگاہِ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سنائی:۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَآئِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ ○ يَامَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ ○

(اے پیغمبر وہ وقت یاد کیجئے) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور پاک کیا اور دنیا کی عورتوں پر تجھ کو برگزیدہ کیا، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر"۔

.....وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○

اور تم اس وقت ان کاہنوں کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلموں (پوروں) کو قرعہ اندازی کیلئے ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اس وقت (بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کی کفالت کے بارے میں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرت مریم (علیہا السلام) جبکہ نہایت مرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا

تو من جانب اللہ ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بحقدار رسید کا مصداق ہے، تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن وحدیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابل توجہ ہے کہ آیت وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ کی مراد کیا ہے اور کیا درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے ؟اور یہی نہیں بلکہ اس آیتِ فضیلت نے مریم علیہا السلام کی ذات سے متعلق علماءِ سلف میں چند اہم مسائل کو زیر بحث بنادیا ہے۔ مثلاً (۱) کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ (۲) کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی تھیں؟ (۳) اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ وَاصْطَفَاكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعَالَمِيْنَ کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟

محمد بن اسحٰق، شیخ ابوالحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہ) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حوا، سارہ، ہاجرہ، ام موسیٰ علیہا السلام، آسیہ اور مریم (علیہن السلام) یہ سب نبی تھیں، اور محمد بن اسحٰقؒ کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ مریم (علیہا السلام) نبی تھیں۔

ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبد العزیز اور قاضی عیاض (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور اس لیے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی اور ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک دعویٰ کرتے ہیں۔ جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں سکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ ...... ۝

اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی بھیجتے تھے ہم ان کی طرف۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن عزیز نے ان کو "صدیقہ" کہا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے:

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ

بس ابن مریم تو ایک پیغمبر ہیں جن سے پہلے اور بھی پیغمبر گذر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں۔

اور سورۂ نساء میں قرآن عزیز نے مُنعَم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لیے نصِ قطعی ہے کہ "صدیقیت" کا درجہ "نبوت" سے کم اور نازل ہے۔[1]

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن عزیز نے حضرت سارہ، ام موسیٰ علیہا السلام اور حضرت مریم علیہن السلام کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے ان میں بصراحت موجود ہے کہ ان پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور ان کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور ان تک اپنی معرفت،

۱: فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۝

عبادت کا حکم پہنچایا، چنانچہ حضرت سارہ کے لیے سورۂ ہود اور سورۂ الذاریات اور ام موسیٰ کے لیے سورۂ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لیے آل عمران اور سورۂ مریم میں بواسطۂ ملائکہ اور بلا واسطہ خطاب الٰہی نہیں ہیں جیسا کہ آیت وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ میں شہد کی مکھی کے لیے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مریم علیہا السلام کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورۂ مریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس طریقہ پر دیگر انبیاء و رسل کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوْسٰى ،وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِدْرِيْسَ...، وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِسْمٰعِيْلَ.....، وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ اِبْرٰهِيْمَ ...، وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ

اور

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا........

ہم نے مریم علیہا السلام کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل کو بھیجا

اور

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ........

میں بلاشبہ تیرے پروردگار کیجانب سے پیغامبر ہوں

نیز آل عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکۃ اللہ نے جس طرح خدا کی جناب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے۔

اور مریم علیہا السلام کو "صدیقہ" ہونے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرت مریم علیہا السلام کو "صدیقہ" کہا ہے تو یہ لقب ان کی شانِ نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو مُسلّم نبی ہونے کے باوجود آیت يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ میں ان کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکرِ پاک مقامی خصوصیت کی بناء پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو "نبی" ہے وہ بہر حال "صدیق" ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

ان علماءِ اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم رحمہ اللہ نے کی ہے اس تفصیل و قوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گذری اس لیے سطورِ ذیل میں اس پورے مضمون کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے۔

نبوۃ النساء اور ابن حزم

یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف بپا ہوا، علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہو

سکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں، اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات و نفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں۔ مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصب نبوت کا انکار کرتے ہیں ان کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيٓ إِلَيْهِمْ

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایتِ خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اس نے کسی عورت کو "رسول" بنایا ہے، بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوت میں ہے، پس طلب حق کے لیے ضروری ہے کہ اول یہ غور کیا جائے کہ لغتِ عرب میں لفظِ "نبوت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "انباء" سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی "اطلاع دینا" ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لیے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلا شبہ "نبی" ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو "علم یقین" سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنوں کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے۔ اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو "بابِ کہانۃ" سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی یہ کہ شیاطین، آسمانی باتوں کو سننے اور چرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر شہاب ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے:

شَيَاطِيْنَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا
(الانعام:۶:۱۱۲)

کیونکہ یہ باب کہانۃ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا۔ اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجرباتِ علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اس کے رؤیا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کو کائی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جدا "وحی بمعنی نبوۃ" یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورۂ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقتِ ثابتہ بن کر اس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ار اللہ تعالیٰ اس علمِ خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت و کسب کے بداہۃً ایسا صحیح یقین عطا کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس

طرح وہ حواس اور بداہت عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اسکو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آکر اس شخص کو خدا کا پیغام سناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کر سکتے۔

اور جب کہ نبوت کے معنی وہی ہیں ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے ان مقامات کو بغور مطالعہ کیجئے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان عورتوں کو "وحی حق" سے مطلع کیا چنانچہ فرشتون نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ام اسحٰق (سارہ علیہا السلام) کو اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت سنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَامْرَأَتُهُ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَّرَآءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوْبَ ○
قَالَتْ يَاوَيْلَتَآ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ○
قَالُوٓا أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ ......○

ان آیات میں فرشتوں نے ام اسحٰق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحٰق اور ان کے بعد یعقوب علیہما السلام کی بشارت سنائی ہے اور سارہ علیہا السلام کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحٰق (سارہ علیہا السلام) نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح ان سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل فرشتہ کو مریم (ام عیسیٰ علیہما السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے:

وَقَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ......○

تو یہ "وحی حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے مریم علیہا السلام کے پاس جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریا علیہ السلام جب مریم علیہا السلام کے حجرہ میں آئے تو ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور انہوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحب فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اس طرح ہم موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچہ کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی ان کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کروں گا اور اس کو "نبی مرسل" بناؤں گا، پس کون شک کر سکتا ہے کہ یہ "نبوت" کا معاملہ نہیں ہے۔ معمولی عقل و شعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کی

والدہ کا یہ عمل اللہ کے عطا کردہ شرفِ نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بناء یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل، گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنوں اور پاگل کہا جائے گا اور علاج کیلئے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا، یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک وشبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈال دینا اسی طرح وحی الٰہی کی بناء پر تھا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رؤیا[1] (خواب) میں اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا اس لیے کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی نہ ہوتے اور ان کے ساتھ وحی الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گذرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ام موسیٰ علیہ السلام نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کٓهٰیٰعٓصٓ میں ان کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ

یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور ان میں جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا جن پر اللہ کا انعام واکرام ہوا۔

تو آیت کے اس عموم میں مریم علیہا السلام کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم علیہا السلام کے لیے یہ کہا "وامه صديقة" تو یہ لقب ان کی نبوت کے لیے اس طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ (وباللہ التوفیق)

اب حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت ام موسیٰ علیہن السلام کے مسئلہ نبوت کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجئے، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كمل من الرجال كثير ولم يكمل من النساء الا مريم بنت عمران و آسية بنت مزاحم امراءة فرعون[2] (او كما قال ﷺ)

۱: نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

۲: بخاری میں الفاظِ حدیث یہ ہیں:
قال رسول الله ﷺ كمل من الرجال كثير ولم يكمل من النساء الا آسية امرأة فرعون و مريم بنت عمران و ان فضل عائشة على النساء كفضل الثريد على سائر الطعام۔

یعنی مردوں میں سے تو بہت آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف دو ہی کامل ہوئیں، مریم بنت عمران اور آسیہ بنتِ مزاحم زوجۂ فرعون۔

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجۂ کمال بعض رسولوں علیہم السلام ہی کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ ان کے علاوہ انبیاء ورسل بھی درجۂ نبوت ورسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلین کاملین کے درجہ سے نازل ہیں، اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں صرف دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجۂ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو ہستی بھی اس درج سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہرحال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نصِ قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو بھی درجۂ کمال حاصل ہوا ہے۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ......

حقیقت یہ ہے کہ کامل اس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اُس کا ہمسر نہ ہو، پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء ورسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر "محمد ﷺ" اور "ابراہیم علیہ الصلوٰۃ السلام" ہیں جن کے متعلق نصوص (قرآن و حدیث) نے ان فضائلِ کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء ورسل کو حاصل نہیں ہیں، البتہ اسی طرح عورتوں میں ہی وہی درجۂ کمال کو پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث میں کیا ہے۔[1]

ابن حزم رحمہ اللہ کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے ان معانی کو نظرانداز کر کے "جن کا اطلاق بلحاظِ عموم لغت جبلت یا نفس میں ظن و وہم کے درجہ کا القاء والہام پر ہوتا ہے" وہ اصطلاحی معنی لیئے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء ورسل کیلئے مخصوص کیا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشاء مخلوقِ خدا کی رشد وہدایت اور تعلیم اوامر ونواہی سے ہو۔ اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص سے براہ راست یا فرشتہ کے واسطہ سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا، کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا، یا خاص اس کی ذات کیلئے کوئی امر و نہی فرمانا مقصود ہو، اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ "نبوۃ مع الرسالۃ"[2] ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورۂ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دورائے نہیں ہیں۔

اور اگر وحی الٰہی کی دوسری شکل ہے تو ابن حزم اور ان کے موئدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک

۱۔ الفصل فی الملل والاہواء والنحل، مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ جلد ۵ صفحہ ۱۴-۱۳-۱۲- یہ بحث فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۳۴۸،۳۴۷،۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابل مراجعت ہے۔

۲۔ یہاں نبی اور رسولوں کے اس فرق کو نظرانداز کر دیا گیا ہے، جو علم کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مرادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔

قسم ہے کیونکہ قرآن عزیز نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزول وحی کے جو طریقے بیان کیئے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَآءُ ط إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝ (الشوریٰ، ۴۲:۵۱)

اور کسی انسان کیلئے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ یا پس پردہ کلام کے ذریعہ اس اور یا اس صورت سے کہ اللہ کسی فرشتہ کو پیغامبر بنا کر بھیجے! اور وہ اس کی اجازت سے جس کو کہ وہ چاہے اس بشر کو وحی لا کر سنا دے بلا شبہ وہ بلند و بالا حکمت والا ہے۔

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نص صریح حضرت مریم، حضرت سارہ، حضرت ام موسیٰ اور حضرت آسیہ (علیہن السلام) پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہود، قصص اور مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر "نبی کا اطلاق" قطعاً صحیح ہے اور اسکو بدعت کہنا سر تا سر غلط ہے۔

ابن حزم (رحمہ اللہ) کے موئد علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے "کہ قرآن نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے۔ اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا" جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ "نبوۃ مع الرسالۃ" جو کہ مردوں کیلئے مخصوص کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ نوعِ انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اسکا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے۔ اسکے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے، تاکہ امت پر اس کی دعوت و تبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اس ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اسکے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو "وحی من اللہ" انبیاء و رسل کیلئے ہی مخصوص ہے اس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے ان علماء کی ہے جو اس مسئلہ "سکوت اور توقف" کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی (رحمہ اللہ) نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں ان کا یہ قول مذکور ہے:

قال السبكي اختلف فی هذه المسئلة ولم يصح عندی فی ذلك شیء الخ۔

(فتح الباری ج ٦ کتاب الانبیاء)

سبکی فرماتے ہیں "اس مسئلہ میں علماء کی آراء مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ اثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔

کیا حضرت مریم علیہا السلام نبی ہیں؟

اس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر امام الحرمین کا دعوائے اجماع صحیح نہیں ہے نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرستِ انبیاء میں مسطورۂ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں

حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی، ابن حزم اور قرطبی (رحمہم اللہ) کے درمیان حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ انبیاء کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کے متعلق تمام مثبتین نبوت کا اتفاق ہے۔

ہم کو ابن کثیر (رحمہ اللہ) کے اس دعویٰ سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور، انکار کی جانب ہیں، البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے۔

آیت وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ کا مطلب

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو نبی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق تو آیت وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں ان پر اسلئے کہ مریم (علیہا السلام) نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں ان پر اسلئے وہ ان قرآنی نصوص کے پیش نظر جو ان کے فضائل و کمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام کو "نبیہ" نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جدا جدا خیال رکھتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جملہ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لئے بلاشبہ حضرتِ مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثناء کے کائناتِ انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ "العلمین" سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرتِ مریم علیہا السلام کی معاصر تھیں۔ یعنی قرآنِ عزیز حضرتِ مریم علیہا السلام کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں میں برگزیدہ اور صاحبِ کمال ہیں اور ہم نے ان سب میں سے اُن کو چُن لیا ہے اور "العلمین" کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی اُمت (بنی اسرائیل) کے لئے اس آیت میں اختیار کی گئی ہے۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝

اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے ان (بنی اسرائیل) کو جہاں والوں کے مقابلہ میں پسند کر لیا ہے۔

اور جبکہ باتفاق آراء بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "العلمین" سے ان کی معاصر و امم و اقوام مراد ہیں کہ ان میں سے امت موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرت مریم (علیہا السلام) کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرتِ مریم علیہا السلام کا تقدس اور تقویٰ و طہارت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر ان کے مشکوئے معلیٰ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت ان کو معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

۱: فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۸۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ بابِ فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریق بیان یہ ہے کہ وہ جامع ومانع ہو یعنی اسکی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے، نہ ایسی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ کرے کہ بعض دوسری حقائق بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔اسی طرح اسکے برعکس بیانِ فضیلت کیلئے فصاحت وبلاغت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو بیانِ حقیقت کی طرح حدود وقیود میں نہ جکڑ دیا جائے۔ کیونکہ اس مقام پر حقیقتِ شے نہیں بلکہ فضیلتِ شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آ جائے تو بیانِ حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعتِ بیان ہی از بس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہارِ فضیلت سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرنا ہے وہ دل نشین اور مؤثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی، بلکہ یہ ہوگا کہ حضرت مریم علیہا السلام کو فضائل و کمالات میں بلند مرتبہ حاصل ہے، باب فضائل کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائلِ صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے مابین تضاد و تناقض نظر آنے لگتا ہے،البتہ ان فضائل کی حدود سے گزر کر جب ہم صاحب فضائل افراد کے انفرادی واجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرقِ مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کیلئے حد فاصل ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً حضراتِ صحابہ وصحابیات کے فضائل کے پیش نظر فرق مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کے ان فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبان وحی ترجمان سے نکلے ہیں ان سے متعلق خصوصی ارشاداتِ قرآنی وحدیثی،ان کی اسلامی خدمات،اسلام سے متعلق ان کی سرفروشیاں وجاں سپاریاں، نصرت حق میں مالی فداکاریاں،اسلام کے نازک ترین لمحات میں ان کے علم و تدبر کی عقدہ کشائیاں اور ان کی عملی جدوجہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بشاراتِ کتبِ سابقہ

ادیان وملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین حق اور ملت بیضاء کی تبلیغ ودعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد ﷺ تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ کو مزید قوت اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبول حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنادے، گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق وصداقت کا صور پھونک کر ایک انقلابِ عظیم بپا کر دے اور مردہ دلوں میں نئی روح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام وامم میں اس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے ان کے بادیانِ ملت اور داعیان حق (انبیاء علیہم السلام) اس مقدس رسول کی آمد کی بشاراتِ وحی الٰہی کے ذریعہ سناتے رہتے ہیں تاکہ اس کی دعوت حق کیلئے زمین ہموار رہے اور جب اس نور حق کے روشن ہونے کا وقت آجائے تو ان اقوام وامم کیلئے اس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان چند اولوالعزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بناء پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام ان کی آمد سے قبل ان کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سناتے نظر آتے ہیں اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدت مدید سے منتظر تھے کہ مسیح موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر ہدایت کی خشک کھیتی میں روح تازہ پیدا ہو گی اور خدا کے جاہ و جلال سے ان کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اٹھیں گے۔ بائبل (توراۃ وانجیل) اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی ان چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔

توراۃ استثناء، میں ہے:

اور اس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) اسے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب ۳۳۔ آیت ۲۰)

اس بشارت میں ''سینا سے خدا کی آمد'' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نوبت کی جانب اشارہ ہے اور ''ساعیر سے طلوع ہونا'' نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے، کیونکہ ان کی ولادتِ باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام ''بیت اللحم'' میں ہوئی ہے اور یہی وہ مبارک جگہ ہے جہاں سے نور حق طلوع ہوا اور ''فاران پر جلوہ گر ہونا'' آفتاب رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران، حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے۔[1]

اور حضرتِ یسعیاہ نبی علیہ السلام کے صحیفہ میں ہے:

''ایک میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا، بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اسکے راستے سیدھے بناؤ''۔ (باب ۴۰ آیات ۸۔۳)

اس بشارت میں ''پیغمبر'' سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناد تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں ان کی بعثت و رسالت کا مژدۂ جانفزا سناتے تھے۔

اور متی کی انجیل میں ہے:

''جب یسوع، ہیرودیس باشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت اللحم میں پیدا ہوا تو دیکھا کئی مجوس پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ اور جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟.... یہ سن کر ہیرودیس بادشاہ اور اسکے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے ان سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہئے؟ انہوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے، اے بیت لحم یہوداہ کے علاقہ: تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری امت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔
(باب ۲ آیات ۶۔۱)

اور دوسری جگہ ہے:

---

[1] تفصیل اپنے موقعہ پر آئے گی۔

اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندئی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ تمہیں ملے گا، انہیں کھول کر میرے پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور انہیں بھیج دے گا۔ یہ اسلئے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہوا کہ ”صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے گدھے پر سوار ہے بلکہ لادو بچہ پر“۔ (باب ۲۔ آیات ۶۔۱)

اور یوحنا کی انجیل میں ہے:

اور یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کیلئے اس (یحییٰ علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے، اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا کہ یشعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔ (باب ۱۔ آیات ۲۳۔۱۹)

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے:

وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح تھے یا نہیں تو یوحنا (یحییٰ علیہ السلام) ان سب کے جواب میں کہا: میں تو تمہیں بپتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لائق نہیں، وہ تمہیں روح القدس سے بپتسمہ دے گا۔ (لوقا باب ۳۔ آیات ۱۶۔۱۵)

ان ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بناء پر جن اولوالعزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے ان میں مسیح علیہ السلام بھی تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ وہ نہ ایلیا ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح (علیہم السلام) بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت کے مناد اور مبشر ہیں۔

قرآن عزیز نے بھی حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے واقعہ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحییٰ علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مبشر اور مناد بتایا ہے۔ آل عمران میں ہے:

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ .... ○

پس جب فرشتوں نے اس (زکریا) کو اس وقت پکارا جبکہ وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا، بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو یحییٰ (فرزند) کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ کے کلمہ (عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرے گا۔

۱: عہد نامہ جدید (انجیل) میں یوحنا دو جدا جدا شخصیتیں ہیں، ایک یحییٰ علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔

ولادتِ مبارک

عابد وزاہد اور عفت مآب مریم (علیہا السلام) اپنے خلوت کدہ میں مشغول عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اس سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرت مریم علیہا السلام نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں "اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں"۔ فرشتے نے کہا: "مریم! خوف نہ کھا، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں"۔ حضرت مریم علیہا السلام نے یہ سنا تو از راہ تعجب فرمانے لگیں: میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا۔ اسلئے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں"۔ فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں، اس نے مجھ سے اسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اسلئے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کیلئے اپنی قدرتِ کاملہ کے اعجاز کا "نشان" بنادوں اور لڑکا میری جانب سے "رحمۃ" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا "کلمہ[۱]" ہوگا، اس کا لقب "مسیح[۲]" اور اسکا نام عیسیٰ (یسوع) ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحبِ عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالتِ شیر خوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سن کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رشد وہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اسلئے ضرور ہو کر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اسکا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہوجا" اس شے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے۔ لہٰذا یوں ہی ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اسکو اپنی کتاب عطا کرے گا، اسکو حکمت سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی رشد وہدایت کیلئے رسول اور اولوالعزم پیغمبر بنائے گا۔

قرآن عزیز نے ان واقعات کا معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ سورۂ آل عمران اور سورہ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے:

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ○ يَامَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ○ ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ط وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ○ إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ

۱: یعنی توالد وتناسل کے عام قانون سے جدا قانونِ اعجاز کے مطابق محض حکم الٰہی اور ارادۂ باری سے ہی رحم مریم علیہا السلام میں وجود پذیر ہو جائے گا۔

۲: مسیح بمعنی مبارک یا سیاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ○ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ ○ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○ (سورۂ آل عمران ۳، ع ۵)

(وہ وقت قابل ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریم علیہا السلام سے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت دیتا ہے اس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں صاحبِ وجاہت اور ہمارے مقربین میں سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت کے زمانہ میں لوگوں سے کلام کرے گا اور وہ نکوکاروں میں سے ہوگا۔ مریم علیہا السلام نے کہا: "میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا" فرشتہ نے کہا "اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کر دیتا ہے، وہ جب کسی شے کیلئے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے "ہو جا" اور وہ ہو جاتی ہے اور اللہ اسکو کتاب و حکمت اور توراۃ و انجیل کا علم عطا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہوگا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ○ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ○ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ○ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ○ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ○ قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ○ (مریم، ۱۹: ۲۱-۱۶)

اور اے پیغمبر! کتاب میں مریم علیہا السلام کا واقعہ ذکر کر و اس وقت کا ذکر جب وہ ایک جگہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوئی پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا، پس ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہو گیا مریم علیہا السلام اسے دیکھ کر گھبرا گئی، وہ بولی اگر تو نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔ "فرشتہ نے کہا: "میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لئے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دیدوں"۔ مریم علیہا السلام بولی، "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بد چلن ہوں؟" فرشتہ نے کہا: "ہوگا ایسا ہی، تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیئے کچھ مشکل نہیں وہ کہتا ہے یہ اسلئے ہوگا کہ اس مسیح کو لوگوں کیلئے ایک نشان بنادوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہو چکا ہے۔

جبرئیل امین نے مریم (علیہا السلام) کو یہ بشارات سنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا۔ مریم (علیہا السلام) نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری ان پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کیفیت نے اس وقت شدید صورت اختیار کر لی، جب انہوں نے دیکھا کہ مدت حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، انہوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہے۔ اسلئے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے، اسلئے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہئے۔ یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اب "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے، یہاں پہنچ کر چند روز بعد دردزہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں "کاش کہ میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ یک قلم فراموش کر چکے ہوتے"۔ تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پھر پکارا "مریم علیہا السلام! غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے تلے[1] نہر جاری کر دی ہے اور کھجور کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے۔ پس تو کھا پی اور اپنے بچہ کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا"۔

حضرت مریم (علیہا السلام) پر تنہائی، تکلیف اور نزاکت حال سے جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے برگزیدہ بچہ کے نظارہ سے کافور ہو گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ دیکھ کر شادکام ہونے لگیں۔ تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاک دامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی ان کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جا سکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

مگر جس خدائے برتر نے ان کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب ان کو اس کرب و بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا، اسلئے اس نے فرشتہ کے ذریعہ مریم (علیہا السلام) کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اسلئے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے، اس بچہ سے دریافت کر لو، تب تیرا پروردگار اپنی قدرتِ کاملہ کا نشان ظاہر کر کے ان کی حیرت کو دور اور ان کے قلوب کو مطمئن کر دے گا۔ حضرت مریم (علیہا السلام) وحی الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے کر، بیت المقدس کو روانہ ہوئیں۔ جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے: "مریم! یہ کیا؟ تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کر لیا، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا

---

[1] سری لغت عرب میں نہر کو بھی کہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مراد لیئے ہیں، اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم (رحمہم اللہ) سے دوسرے معنی منقول ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کر دی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

باپ برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بد چلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے، اس سے معلوم کر لو، میں تو آج روزہ[1] سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا: "ہم کس طرح ایسے شیر خوار بچہ سے باتیں کر سکتے ہیں جو ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے"۔ مگر بچہ فوراً بول اٹھا: "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلۂ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اس نے مجھ کو مبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا اور خود سر اور نافرمان نہیں بنایا اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے۔ جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا"۔

اللہ تعالیٰ نے ان تفصیلات کو سورۂ انبیاء، تحریم اور سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے:۔

وَالَّتِيْٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعَالَمِيْنَ ۝ (الانبیاء، پ ۱۷ رکوع ٦)

اور اس عورت (مریم علیہا السلام) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اس میں اپنی "روح" کو پھونک دیا اور اس کو اور اس کے لڑکے کو جہان والوں کیلئے "نشان" ٹھہرایا ہے۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا......

(تحریم پ ۲۸ ع ۲)

اور عمران کی بیٹی مریم علیہا السلام کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا پس ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَأَجَآءَهَا الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَالَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَآ أَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَهُزِّيْٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا فَقُوْلِيْٓ إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمَانِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ۝ فَأَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ط قَالُوْا يَامَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝ يَآأُخْتَ هَارُوْنَ مَا كَانَ أَبُوْكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ط اٰتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝

[1] بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخل عبادت تھی۔

وَّجَعَلَنِيْ مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِيْ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ○
وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ○ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ
أَمُوْتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ○ (مریم، پ ۱۶ ع ۲)

پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا وہ (اپنی حالت چھپانے کیلئے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی، پھر اسے دردِ زہ کا (اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اس کے تنہ کے سہارے بیٹھ گئی) اس نے کہا میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ یک قلم بھول گئے ہوتے، اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے نے) اسے نیچے سے پکارا ''غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر جاری کر دی ہے اور کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے، کھا پی (اور اپنے بچہ کے نظارے سے) آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہہ دے میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کر سکتی'' پھر ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی، لڑکا اس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اٹھے ''مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا کام کر گذری، اے ہارون[1] کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا نہ تیری ماں بد چلن تھی''۔ (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریم علیہا السلام نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں بتلا دے گا کہ حقیقت کیا ہے) لوگوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا شیر خوار بچہ ہے'' مگر لڑکا بول اٹھا'' میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خودسر اور نافرمان ہوتا، مجھ پر اس کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا''۔

قوم نے ایک شیر خوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ مریم (علیہا السلام) کا دامن بلاشبہ ہر قسم کی برائی اور تلویث سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک ''نشان'' ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائعِ انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے مختلف کروٹیں بدلنی شروع کر دیں، اصحابِ خیر نے اس کے وجود کو اگر یمن و سعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحاب شر نے اس کی ہستی کو اپنے لیئے قابل بد جانا اور بغض و حسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر ان کی فطری استعداد کو کھانا شروع کر دیا۔

غرض اسی متضاد فضا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا۔ تاکہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مردہ قلوب کو حیات تازہ بخشے اور ان کی روحانیت کے شکر خشک کو ایک مرتبہ پھر بار

---

[1] کہتے ہیں کہ ہارون، مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد و زاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

آور اور مثمر بنائے:

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ○

(سورۂ مومنون پ ۱۸ ع ۳)

اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کا) نشان بنادیا اور ان دونوں کا ایک بند مقام (بیت اللحم) پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے۔

بشارتِ ولادت

قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصد تذکیر و موعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کر دیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقِل حضرت وہب بن منبہ سے جو واقعات منقول ہیں اور متی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے ان میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملکِ شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملک شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اس نے تفتیش حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ جو مستقبل قریب میں روحانیت کا بادشاہ ہوگا یہود نے اہلِ فارس کی زبان سے یہ کلمات سنا تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بلا کر استصوابِ حال کیا اور ان کی زبانی واقعہ کو سن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کو دیکھا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اول ان کو سجدۂ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں ان پر نثار کیں ار چند روز وہیں قیام کیا، دورانِ قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرت مریم علیہا السلام یسوع مسیح

۱: عن ابن عباس فی قوله وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ قال المعین الماء الجاری وھو النھر الذی قال اللّٰہ تعالیٰ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا و کذا قال الضحاك و قتادة الی ربوة ذات قرار و معین ھو بیت المقدس فھذا واللّٰہ اعلم ھو الاظھر لانه المذکور فی الایة الاخریٰ والقران یفسر بعضه بعضا و ھذا اولیٰ ما یفسر به ثم الاحادیث الصحیحة ثم الاثار۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۶) یعنی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ کی تفسیر میں منقول ہے کہ ''معین'' سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ کا بھی یہ قول ہے کہ وَآوَيْنَاهُمَا إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ سے بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا بعض حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کر دیا کرتا ہے اور تفسیر آیت میں پہلی جگہ اسی طریقِ تفسیر کو حاصل ہے۔ اس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور عیسیٰ کی عمر مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو ان کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے بچپن کے حالاتِ زندگی بھی غیر معمولی تھے اور ان سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال) (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۷۷ وانجیل متی باب ۲)

حلیۂ مبارک

بخاری حدیث معراج میں ہے کہ نبی اکرم نے ارشاد فرمایا: "میری ملاقات حضرت عیسیٰ سے ہوئی تو میں نے ان کو میانہ قد سرخ سپید پایا"۔

بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے، اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھلتا ہوا گندم گوں تھا۔ بخاری کی روایت اور اس روایت میں اداء و تعبیر کا فرق ہے، حسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آگئی تو چہرہ پر حسن و لطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

بعثت و رسالت

حضرت عیسیٰ سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرت یحییٰ کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لیے کیا کہ وہ حضرت یحییٰ کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر ان کے نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرت عیسیٰ کی زندگی مبارک ہی میں ان کی بعثت سے قبل پیش آچکا تھا۔

دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا للبستانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزءِ مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بد اخلاقیوں کو تو عملاً اخلاقِ کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بناء پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے علماء و احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانونِ الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر مکمل نقشہ ہم کو شعیا کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے:

خداوند فرماتا ہے: یہ امت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔

بہر حال ان تاریک حالات میں جب حضرت یحییٰ علیہ السلام کے قتل کا واقعہ بھی گذرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقتِ سعید آپہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرت مریم علیہا السلام کی آغوش میں پیغام حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا، سنِ رُشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے ''کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایتِ خلق اس کا فرضِ منصبی'' قوم میں ہلچل پیدا کر دی، وہ شرفِ رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا، اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوت کدوں، بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتی کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغام حق سنایا:

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی ہے، میں اس کی جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کج روی سے پسِ پشت ڈال دیا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سنو اور سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور ان کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سنیے اور ''احقاقِ حق و ابطالِ باطل'' کے لطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجیے، کیونکہ ''تذکر بایام اللہ'' سے قرآن کا مقصدِ عظیم یہی بصیرت و عبرت ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَاَيَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

اور بیشک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توراۃ) عطا کی اور اس کے بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام کو واضح معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اس کو روح پاک (جبرئیل) کے ذریعہ قوت و تائید عطا کی، کیا جب تمہارے پاس (خدا کا) پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے کو تمہارا دل نہیں چاہتا تو تم نے غرور کو شیوہ (نہیں) بنالیا؟ پس (پیغمبروں کی) ایک جماعت کو جھٹلاتے ہو تو ایک جماعت کو قتل کر دیتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہمارے دل (قبولِ حق کے لیے) غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ ان کے کفر کرنے پر خدا نے

ان کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے سے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيٓ إِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

اور (اے عیسیٰ) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت وارادۂ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے کہا، یہ کچھ نہیں ہے مگر کھلا جادو ہے۔
(المائدہ پ ۷ ع ۱۵)

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○ إِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ فَلَمَّآ أَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِيْٓ إِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ...... (آل عمران، ۳: ۵۰-۵۲)

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے اور میں (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو (تمہاری کجروی کی وجہ سے) تم پر حرام کر دی گئیں تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔ پس جبکہ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لیے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى آثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيْلَ

پھر ان کے بعد (نوح وابراہیم علیہما السلام کے بعد) ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطا کی۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيْلَ (المائدہ: ۱۱۰)

(وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا "اے عیسیٰ ابن مریم! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی جب کہ میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری تائید کی کہ تو کلام کرتا تھا آغوشِ مادر میں اور بڑھاپے میں اور جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل۔ (سورۃ المائدہ پ ۷ ع ۱۵)

وَإِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَابَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ ط (الصف، ۶۱: ۶)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں بلاشبہ تمہاری جانب اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیاتِ بیّنات

قصص القرآن جلد اول معجزات کی بحث میں گذر چکا ہے کہ حق وصداقت کے تسلیم وانقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے: ایک یہ کہ "مدعیٔ حق" کی حقانیت وصداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ من جانب اللہ اس کی صدات کی تائید میں عام قانونِ قدرت سے جدا بغیر اسباب ووسائل اور تحصیل علم وفن کے اس کے ہاتھ پر امور عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام وخواص اس کے مقابلہ سے عاجز ودرماندہ ہو جائیں اور ان کے لیے اسباب ووسائل کے بغیر ان مور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل وفکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعیٔ حق (نبی و پیغمبر) کا یہ عمل دراصل خود اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے چنانچہ قرآن میں آیت:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ

اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشتِ خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔ (مفصل بحث جلد اول میں گذر چکی ہے)

میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے ان اصحابِ علم ودانش پر جو قوتِ فہم وادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید وتقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعیٔ حق (نبی وپیغمبر) کے دعوائے نبوت ورسالت کی صداقت کا مزید عملی ثبوت یقین کر کے اس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان حضرات اربابِ عقل وفکر کے برعکس اربابِ قوت واقتدار اور ان کی ذہنیت سے متأثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقۂ تصدیق سے زیادہ متأثر ہوتے اور نبی وپیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت وقوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ وقوت، فعل یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ان امور کو "خدائی نشان" باور کر کے دعوت حق صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اکثر وبیشتر مقامات پر پہلے طریقِ دلیل کو "حجۃ اللہ" "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ انعام میں خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، معاد وآخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے، اللہ کیلئے ہی ہے حجت کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل) (پ۸ ع۱۸)

اور اس سورۃ میں دوسری جگہ حضرت ابراہیم ؑ کے تذکرہ میں ہے:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ (پ ۷ ع ۱۶)

اور یہ ہماری "دلیل" ہے جو ہم نے ابراہیم ؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔

سورۂ نساء میں ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (پ ٦ ع ۳)

(ہم نے بھیجے) پیغمبر ؐ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت (دلیل) باقی نہ رہے (کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہِ مستقیم بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لیے ہم دینِ حق کی معرفت سے محروم رہے) (پ ٦ ع ۲۳)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (نساء پ ٦ ع ٢٤)

......اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (قرآن) آ گیا۔

اور سورۂ یوسف میں ہے:

لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (سورۂ یوسف پ ١٢ ع ٢)

اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اس (یوسف) نے اپنے پروردگار کی دلیل۔

اور سورۂ نحل میں ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل:٢٤)

اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت و حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلہ خیالات کرو ان (مخالفین) کے ساتھ اچھے طریقِ گفتگو سے۔

اور سورۂ نساء میں ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (النساء)

اور اللہ تعالیٰ نے اتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو۔

اسی طرح "حکمت" کا یہ ذکر سورۂ بقرہ، آل عمران، مائدہ، لقمان، ص، زخرف، احزاب اور قمر میں بکثرت موجود ہے اور دوسرے طریقِ دلیل کو اکثر "آیۃ اللہ" اور "آیات اللہ" اور بعض مقامات پر "آیات بیّنات" اور "بیّنات" کہا ہے۔

ناقۂ صالح ؑ کے متعلق ارشاد ہے:

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً (الاعراف:۷۳)

یہ اونٹنی تمہارے لیے (خدا کی جانب سے) ایک "نشان" ہے۔

اور حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم علیہا السلام کے متعلق ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (الانبیاء: ۹۱)

اور ہم نے کر دیا مریم اور اس کے لڑکے عیسیٰ علیہما السلام کو جہان والوں کے لیے "نشان" (معجزہ)۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ارشاد باری ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ آيَاتٍ (سورۂ بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۱۲)

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو (۹) نشان (معجزات) عطا کیے۔

اور حضرت مسیح علیہ السلام کو جو معجزات دیے گئے تھے ان کے متعلق ارشاد ہے:

وَآتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ (سورۂ بقرہ)

اور دیے ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو معجزات۔

إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اس وقت جبکہ تو ان کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں منکروں نے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔
(مائدہ پ ۷ ع ۱۵)

ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآن عزیز کے اسلوبِ بیان سے واقف اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعتِ تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ "معجزہ" بھی ایک خاص قسم کا "برہان" ہے اور قرآن کریم اور آیات قرآن جس طرح سر تا سر "علم" و برہان ہیں اس طرح "معجزہ" بھی ہیں، اس لیے معجزہ پر برہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دو معجزوں عصاء اور یدِ بیضاء کے متعلق سورۂ قصص میں ہے:

فَذَانِكَ بُرْهَانَانِ مِنْ رَّبِّكَ (القصص پ ۲۰ ع ٤)

پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔

اور کتاب اللہ اور اس کے جملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورۃ ہی خالی ہو گی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اسی طرح "آیات بیّنات" کا گرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراۃ، زبور، انجیل) میں ان کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورۂ بالا مقامات کی طرح بعض بعض جگہ اس کو "معجزات" کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

لائقِ توجہ بات اور حقیقتِ معجزات

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات میں رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجاب اللہ وحی کی روشنی اس فرضِ منصبی کو انجام دیتا ہے اور علم و برہان اور حجۃ حق کے ذریعہ راہِ صداقت دکھاتا ہے، وہ یہ

دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماوراءِ فطرت ماموں میں تصرف و تغیر بھی اس کا کارِ منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا ایلچی، اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لیے، اس کی تعلیم، اس کی تربیت اور اس کی شخصیت کا زیرِ بحث آنا یقیناً معقول لیکن اس سے ماوراءِ فطرت اور خارقِ عادت عجائبات و غرائب کا مطالبہ خلافِ عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیبِ حاذق کے دعوئے حذاقت طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ الماری یا لکڑی ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراض جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبر خدا کا یہ دعوی نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہمہ قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اس کا دعوی تو یہ ہے کہ وہ تمام امراضِ روحانی کے لیے طبیبِ کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعوئ نبوت اور معجزات (خارقِ عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "معجزہ" لوازمِ نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلا شبہ یہ سوال بہت زیاد قابلِ توجہ ہے اور اس لیے علم کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی لیکن ہم نے "آیات بیّنات" عنوان کے ماتحت ابتداءِ کلام میں دعوئے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور ان کے فطری رجحانات کے پیش نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جوہرِ عقل کے تفاوتِ درجات نے بلا شبہ انسانوں کی قوتِ فکریہ کو جدا جدا و طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات و مجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطا سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصبِ نبوت و رسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور تعلیم حق و صداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور ان کا جوہرِ عقل اس جانب متوجہ ہوتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ اس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے ناممکن ہے پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی صدائے اصلاح اور اس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم و رواج یا مذہب و دھرم کے ان عقائد و اعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف تعلیمات کی صداقت و بطالت کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی اور ماوراءِ فطرت یا خارقِ عادت امر کر دکھائے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ بغیر اسباب و وسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خداء برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اس کی صداقت پر مہر لگا دی، نیز وہ صاحبِ قوت و اقتدار انسان جن کے غور و فکر کی قوت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی ہے کہ ان پر کوئی امرِ حق اس وقت تک مؤثر ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو غیبی ٹھوکر سے بیدار نہ کیا جائے، وہ بھی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مدعی نبوت و رسالت اپنی صداقت کو دلیل و برہان کے ساتھ ساتھ ایک ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابلِ انکار بنا دے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب و وسائل کے استعمال کیے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہو تا کہ یہ باور کیا جا سکے کہ بلا شبہ اس ہستی کی تعلیم و تبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل

ہے۔اسی لیے علماء کلام نے دعوئے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہِ وقت نے اپنا نائب مقرر کر کے بھیجا ہے تو اس ملک یا صوبے کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعِ نیابت اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی سند اور علامت پیش کرے چنانچہ مدعی نیابت ایک جانب اگر سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی ''نشانی'' بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جا سکے کہ بادشاہ کی عطا کردہ یہ نشانی اس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہرِ حکومت) یا ایسا خاص عطیہ جو صرف اس منصب پر فائز ہستی کو عطا کیا جاتا ہو۔

تو اگرچہ بظاہر دعویٔ نیابت اور انگشتری یا عطیۂ خاص کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے تاہم اس تعلق خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم ربط پیدا کر دیا ہے۔

لیکن جب کہ یہ طریق تصدیق، معیارِ صداقت و حقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقۃً معیاری حیثیت صرف طریقِ اول ''حجت و برہان حق'' کو ہی حاصل ہے، اس لیے معجزہ کے وقوع و صدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود و صدور سے قطعاً جدا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک مدعی نبوت و رسالت کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویِ حق و صداقت کو حجۃ و برہان کی روشنی اور علم و یقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے اور اپنی تعلیم و تربیت اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل و برہان کی مطابقت کو واضح کرے اور انسانی جوہر عقل کے فکر و تدبر کی رہنمائی کا فرض اسطرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن و وہم اور فاسد و کاسد خیالات کے مقابلہ میں ''یقین محکم'' روز روشن کی طرح نمودار ہو جائے اور اس ادائے فرض کے لیے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہ راست فرض ہے جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے، اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کر دیتا ہے:

يَآأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط

اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تو اس کو پورا پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصبِ رسالت کو ادا نہ کیا۔

اِس کے برعکس معجزہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اس کی تعمیل کرے بلکہ ''معجزہ'' حجت و برہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس سے اس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی ''حکمت و مصلحت'' پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کس کا سوال جویائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنت اور انکارِ مزید کے لیے کن، سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ کہہ اٹھیں گی اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ ... اور کن بد بختوں پر اس طرح اثر انداز ہو گا کہ یوں گویا ہوں گے اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔

پس قرآن عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوصِ قطعیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجۃ و

برہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لیے معجزات عطا کیے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط "نذیر مبین" "بشیر و نذیر" اور "رسول و نبی" ہوں۔

میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائناتِ خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماوراء فطرت امور پر قادر ہوں، ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس نے ایسا کیا بھی ہے مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کو منطق الطیر اور تسخیر ہوا، طیور و جن کے نشان دیے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تسع آیات بینات نو کھلے نشان عطا کیے گئے جن میں سے دو نشان عصا اور ید بیضاء کو قرآن نے بڑے نشان کہا ہے اور بحر قلزم میں غرق فرعون اور نجات قوم موسیٰ کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک نشان عظیم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "برد و سلام" بنا دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لیے "ناقہ صالح" کو نشان بنایا کہ جوں ہی اس کو کسی نے ستایا اسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائے گا چنانچہ ٹھیک اسی طرح پیش آیا۔

حضرت ہود اور حضرت نوح علیہما السلام سے ان کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب ان کا اصرار قائم رہا تو ان پیغمبروں نے عذاب الٰہی کی جو وعیدیں سنائی تھیں وہ ٹھیک اپنے اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب موقع میں بہ ظاہر اسباب نزول عذاب اور وقوع حوادث و ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان (معجزات) دیے گئے ان کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیر بحث آئیں گے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی علمی معجزۂ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت و یاوری اور وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی کے اعلان سے اس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور "شق القمر" کا معجزہ عطا فرمایا۔ معاملۂ زیرِ بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی دعوت ارشاد و تبلیغ حق کے روشن دلائل و براہین کو کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو از راہِ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارقِ عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر ﷺ کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلبِ حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد اور تعصب کی راہ سے کہتے ہیں اس لیے ان کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشہ مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد امور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لیے "نذیر مبین" اور "نبی و رسول" ہوں:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ

بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝

اور انہوں نے (مشرکوں نے) کہا: ہم اس وقت تک ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ اُبال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگوروں کا باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہا دے یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرا دے تا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل لائے یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے کو بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کریں گے تاوقتیکہ تو ہمارے پاس (آسمان سے (کتاب لے کر نہ آئے کہ اس کو ہم پڑھیں (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔ (الاسراء پ۱۵ ع۱۰)

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لَقَالُوْٓا إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝

اور اگر کھول دیں ہم ان پر آسمان کا دروازہ اور یہ اس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضروری کہیں گے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مست کر دی گئی ہیں ہماری آنکھیں بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ (الحجر، پ۱۴ ع۱)

وَإِنْ يَّرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا (الانعام پ۷ ع۳)

اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی (ضد اور تعصب کی بناء پر) ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اب ان تفصیلات سے یہ بھی خوب روشن ہو گیا کہ علم کلام میں جن علماء کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہے ان کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعویٰ نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورۂ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لیے "حجۃ و برہان" پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحی الٰہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لیے پیش کرتی ہے برہان و حجت کے ذریعہ اس کی حقیقت کو واضح کرے، تو گویا اس طرح نبوت و رسالت اور حجۃ و برہان صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشانات خداوندی) کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بتقاضائے حکمت الٰہی جب رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھائے تو بلا شبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابل انکار 'دلیل' ہے اور اس کا انکار درحقیقت اس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار حقیقت اور واقعہ کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار "حق" نہیں بلکہ "باطل" ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیم حق کی روشنی، وحیِ الٰہی پر دلائل و براہین کا یقین، اور اصولِ دین پر حجۃ و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلب معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحی الٰہی کی روشنی میں حجت و برہان کے ذریعہ تعلیم حق جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے

کہ میں نے ماوراءِ فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور کسی امت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیم حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت و بیّنہ سے اس لیے منہ پھیرے اور اس لیے اس کا انکار کر دے کہ اس کی طلب پر اچنبھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

پس قرآن عزیز نے جن انبیاء و رسل کے واقعات و حالات تذکر بایام اللہ کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوص قطعیہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے ان کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) ان کو عطا اور مخالفین کے سامنے ان کا مظاہر کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون و چرا ان کو قبول اور ان کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالم غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں ان کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جانا ہے:

وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۝

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتابِ الٰہی کے بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان ایک راہ بنا لیں۔ (النساء پ۶ ع۲۱)

اور ظاہر ہے کہ یہ مؤمن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھے راہ یہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝

اے پیروانِ دعوت ایمانی! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مسلم بن جاؤ، مسلم ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان سے اسلام کا اقرار کر لو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (البقرہ پ۲ ع۲۵)

بہر حال "سنۃ اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائنات انسانی کی فوز و فلاح کے لیے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اس کو منجانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحیِ الٰہی کے ذریعہ کائنات کے معاش و معاد سے متعلق اوامر و نواہی اور بہترین دستور و نظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسبِ مصلحتِ خداوندی "خدائی نشانات" کا مظاہر کر کے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز ہر ایک پیغمبر کو اسی قسم کے معجزات و نشانات عطا کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی و ملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز و درماندہ کر دیں اور کوئی ان کے مقابلہ میں تابِ مقاومت نہ لا سکے اور اگر تعصب اور ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقیقتوں سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر، ان کی دسترس سے باہر، اور صرف خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں علم نجوم ASTRONOMY اور علیم کیمیاء CHEMISTRY کا بہت

زور تھا اور ساتھ ہی ان کی قوم کواکب و نجوم کے اثرات کو ان کے ذاتی اثرات سمجھتی اور ان کو مؤثرِ حقیقی یقین کر کے خدائے واحد کی جگہ ان کی پرستش کرتی تھی اور ان کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی و حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں ان کی نگاہ میں کائنات کی بقاء و فلاح کے لیے اصل الاصول تھیں اور اسی بناء پر کرۂ ارضی میں "آگ" کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں ان کو اشیاء کے خواص و اثرات اور ان کے رد عمل پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریقہ ہائے عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم و تلقین کے لیے ایک جانب ایسے روشن حجۃ و برہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاقِ حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے رخِ روشن کو نمایاں کر سکیں:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝

اور دوسری جانب جب کواکب پرست اور بت پرست بادشاہ سے لے کر عام افرادِ قوم نے ان کے دلائل و براہین سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اسی خالق اکبر نے جس کی دعوت و ارشاد کی خدمت حضرت ابراہیم علیہ السلام انجام دے رہے تھے كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان "معجزہ" عطا کیا جس نے باطل کے پرہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران و پریشان اور ذلیل و خاسر ہو کر رہ گئی۔

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر (MAGIC) مصری علوم و فنون میں بہت زیاد نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فن سحر میں کمال حاصل تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قانون ہدایت (توراۃ) کے ساتھ ساتھ ید بیضاء اور عصا جیسے معجزات دیے گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحرینِ مصر کے مقابلہ میں جب ان کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام اربابِ کمال اس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ بلاشبہ یہ سحر نہیں، یہ تو اس سے جدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبروں کی تائید کے لیے ان کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر انہوں نے فرعون اور قوم فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں:

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝

مگر فرعون اور امراءِ دربار اپنی بد بختی سے یہی کہتے رہے:

قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُ إِنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ ○ (۲۶:۳۴)

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسٰى بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُفْتَرًى وَمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ○ (۲۸:۳۶)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں علم طب (MEDICALSCIENCE) اور علم الطبیعات (PHYSICS) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطباء و حکماء (فلاسفر) کی طب و حکمت گرد و پیش کے ممالک و امصار کے ارباب کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت و دانش اور کمالات طب کا مظاہر کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دین حق کی تعلیم سے خواص و عوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلا تھے سطورِ گذشتہ میں ان پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس ان حالات میں "سنۃ اللہ" نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رشد و ہدایت کے لیے منتخب کیا تو ایک جانب ان کو حجہ و براہن (انجیل) اور حکمت سے نوازا تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات) بھی عطا فرمائے جو اس زمانہ کے ارباب کمال اور ان کے پیروں پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ جویائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلا شبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسول برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب اور متمرّد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ ان کو "صریح جادو" کہہ کر اپنے بغض و حسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انہوں نے قوم کے سامنے کیا قرآن عزیز نے "چار معجزات" کا بصراحت ذکر کیا ہے:

۱: وہ خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ
۲: اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے۔
۳: وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی۔
۴: وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج و معالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس مریض شفا پاتے تھے ان میں ماہر طبیعات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح و مادہ کے حقائق اور ارضی و سماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات و تجربات کے مالک سمجھے جاتے تھے اور حقائق اشیاء میں ان کی باریک بینی اور مہارت ارباب کمال کے لیے باعث صد نازش تھی لیکن جب ان کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام نے اسباب و وسائل اختیار کیے بغیر ان امور کا مظاہرہ کیا تو ان پر بھی ہدایت و ضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اس نے اقرار کیا کہ بلا شبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبی برحق کی تائید و تصدیق کے

لیے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت، حسد اور بغض عناد تھا ان کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو ان کے پیشر وانبیاء ورسل سے کہتے آئے تھے اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ

چوتھے معجزے کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب ان کی دعوت رشد وہدایت سے نفور ہو کر ان کو جھٹلاتے اور ان کے پیش کردہ آیات بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی از راہِ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسیٰ علیہ السلام ان کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے اور وحی الٰہی کی نصرت سے ان کے سوال کا جواب دیدیا کرتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۲)

مگر قرآن حکیم نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کی بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام پیغام ہدایت و تبلیغ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی محبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیبِ بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمۂ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی تھیں اس کے برعکس شریر النفس انسان ان کے مواعظِ حسنہ سے قلبی نفرت و اعراض کے باوجود امتثالِ امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ ان کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں لہذا قدرتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا "نشان" عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہو جائے اور حقوق اللہ اور حقوق انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جا رہا ہے اس کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

ان چہارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان "خدائی نشان" تھا جس کے متعلق ابھی تفصیلات سن چکے ہو۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا ان کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی یہود نے از راہِ حسد ان کا انکار تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعیِ اسلام حضرات نے بھی ان کے انکار کے لیے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے، ان میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنہوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرین خدا یورپین علماء جدید سے مرعوبیت کی بناء پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ ان کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے، ان میں سر سیّد اور مولوی چراغ علی صاحب خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر از راہِ حسد و بغض حضرت مسیح علیہ السلام کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلاتِ باطل کے پردہ میں ان کا مضحکہ اڑاتے ہیں، ان میں متنبی کاذب مرزا قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

قادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے معجزہ،

أَنِّيْٓ أَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِإِذْنِ اللّٰهِ

وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ (آل عمران:۴۹)

کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مسیح کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہینِ منت تھا، معجزہ کچھ نہیں تھا، اس تالاب کی مٹی کی یہ خاصیت تھی جس کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور منہ سے دم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی، گویا العیاذ باللہ! ان بد بختوں کے نزدیک حضرت مسیح کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اسی طرح احیاء موتیٰ (مردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اول تا آخر پڑھ لیا جائے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیات تازہ بخشی ہے مثلاً سورۂ بقرہ کی آیات ذبح بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے:

فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ[1]

یا سورۂ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ[2]

یا اسی سورۃ میں تیسری جگہ مذکور ہے:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا[3]

چنانچہ ان تمام واقعات میں "احیاءِ موتیٰ" کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں "احیاءِ موتیٰ" سے مجازی یا کنائی معنی لیے ہیں ان کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر ان کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احیاءِ موتیٰ کی یہ تاویل اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیاتِ مسطورۂ بالا کے سیاق و سباق کے پیشِ نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

۱: حضرت موسیٰ کے واقعات میں بحث گذر چکی ہے ملاحظہ ہو قصص القرآن جلد ۲۔

۲: ایضاً

۳: قصص القرآن جلد اول میں بحث گذر چکی ہے۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دارِ دُنیا میں "احیاء موتیٰ" وقوع پذیر ہو صرف مرزا قادیانی مسٹر لاہوری کے دماغ کی اُپج سے جو قطعاً باطل ہے اور غیر ثابت ہے اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانونِ فطرت کے ماتحت ایسا نہیں پیش آتا رہتا سو اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر یہ "معجزہ" ہرگز نہ کہلاتا اور خدائے برتر کا قانونِ خاص جو تصدیق انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بطورِ تحدّی (چیلنج) کے پیش آتا رہا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا تھا۔

اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور قادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق و مخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے متعلق تمام آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرے گا تو اس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائے گی کہ قرآن حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرضِ منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن کی دعوتِ حق کا ظہور ہوا ہے، یہود اور نصاریٰ اس بارہ میں دو قطعاً مخالف او متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں، یہود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالث ثلثہ تھے، ان حالات میں قرآن نے ان اوہام و ظنون کے خلاف علم و یقین کی راہ دکھاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہِ حق افراط و تفریط کے درمیان ہے اور صراطِ مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہِ حق کے داعیِ صادق تھے، انہوں نے دعوتِ حق کی تصدیق کے لیے جو بعض عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزاتِ انبیاء کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آسکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے، کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسوا خدا یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی واقعہ تھا جیسا کہ وفدِ نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

تو جب کہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے ان تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قائم کر لیے تھے اپنا فریضۂ اصلاح انجام دیا، یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کے پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیتِ مسیح علیہ السلام کا، اس کے متعلق واضح بیان کر تا جاتا جیسا کہ متّی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے، اس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا باپ فلاں شخص تھا اس ساری عمارت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیتِ مسیح علیہ السلام کی بنیاد رکھی گئی ہے مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیح علیہ السلام کی

الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں؟ اس لیے کہ:

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ○

پس اگر بن باپ کی پیدائش مسیح کو درجۂ الوہیت دی سکتی ہے تو آدم کو اس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوا ہے۔

بہر حال جن تاویل پرستوں نے حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے جملوں کو جدا جدا کر کے غلط احتمالات پیدا کیے ہیں وہ اس لیے باطل ہیں کہ جب اس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مطالعہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی آیات کے معانی میں بن باپ پیدائش کے معنی کے ماسوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معیّن مدلولات واطلاقات میں تحریفِ معنوی پر بے جا جسارت کی جائے۔

نیز بقولِ مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدائش سے متعلق آیات میں تاویلِ باطل کی ہے اُن کی دلیل کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھے، ایسی صورت میں میاں بیوی کے درمیان مقاربت گو شریعتِ موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم و رواج کے قطعاً خلاف تھی اس لیے حضرت مسیح کی پیدائش لوگوں کو گراں گذری، لیکن اول تو اس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرت مریم علیہا السلام پر جو بہتان لگایا تھا ''انسائیکلو پیڈیا آف بائبل'' میں تصریح ہے کہ اس بہتان کی نسبت ایک شخص پینتھر اٹالی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسف نجار کی جانب، اس لیے تاویل کی یہ بنیاد ہی از سر تاپا غلط اور بے اصل ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲)

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے، سائنس کی موجودہ دنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جب کہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت و پیدائش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیۂ تخم[1] کہتے ہیں، یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیاتِ تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں، یہی خلیہ زندگی اور حیات کا تخم ہے اور قدرتِ حق نے اس کو بہت باریک جثہ عطا فرمایا[2] ہے، تو اس تحقیق نے امریکہ انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنسِ رجال کے خلیاتِ تخم کو آلات کے ذریعہ جنسِ اُناث کے بیض میں داخل کر کے ''وجودِ انسانی'' حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے

۱: خلیہ کو انگریزی میں (CATL) کہتے ہیں۔
۲: اس کا قطر انچ کا ۵۰۰/۱ ہوتا ہے۔

کتنا ہی دور ہو، لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش، آنکھوں دیکھے عام طریق ولادت کے علاوہ بعض دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے اور ان کو قانونِ قدرت کے خلاف اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اس کے سامنے قدرتِ حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں۔

پس اگر یہ صحیح ہے کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جارہی ہے اور جلد یا بدیر اس کے وقوع پر یقین کیا جارہا ہے تو نہیں معلوم پھر اس قانونِ قدرت کا انکار کر دینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہے مگر انبیاء و رسل جیسی قدسی صفات ہستیوں پر اس علم کی حقیقت آشکارا ہے تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہے کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اس کو ناممکن اور لامحالہ نہ ثابت کرتی ہو اس کا انکار صرف "عدمِ علم" کی وجہ سے کر دیا جائے خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعیِ مسیحیت و نبوت کی جانب سے ہو تو اس کے لیے تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ان "آیاتِ بیّنات" کو قرآن حکیم سے سنیے اور موعظت و عبرت کے حصول کو سر و سامان کیجیے کہ ماضی کی ان واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَمُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ۝ (۳:۴۸-۵۱)

اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسیٰ) کو کتاب، حکمت، توراۃ اور انجیل، اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب (وہ کہتا ہے) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے "نشان" لے کر آیا ہوں، وہ یہ کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اس میں پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے کو سوانکھا کر دیتا اور سپید داغ کے جذام کو اچھا کر دیتا ہوں، اور خدا کے حکم سے مردہ کو زندہ کر دیتا ہوں، اور جو تم کھا کر آتے ہوئے اور جو تم گھر میں ذخیرہ رکھ آتے ہو، سو اگر تم حقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان امور میں (میری صداقت اور منجانب اللہ ہونے کے لیے) "نشان" ہے اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض ان چیزوں کو جو تم پر حرام ہو گئی ہیں تمہارے لیے حلال کر دوں تمہارے لیے پروردگار ہے کے پاس سے "نشان" لایا ہوں، پس تم اللہ سے ڈرو، اور (اس کے دیے ہوئے احکام میں) میری اطاعت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، سو اس

کی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔ (سورۂ آل عمران پ ۳ ع ۵)

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِيْ

اور (اے عیسیٰ ابن مریم! تو میری اس نعمت کو یاد کر) جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا اور پھر اس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے زندہ پرند بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو سوانکھا اور سپید داغ کے کوڑھ کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے مردہ کو زندہ کر کے قبر سے نکالتا تھا۔

(سورۂ مائدہ پ ۷ ع ۵)

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (صف، پ ۲۸ ع ۱)

پھر جب وہ (عیسیٰ علیہ السلام) ان کے پاس کھلے نشان لے کر آیا تو انہوں نے (بنی اسرائیل نے) کہا "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔

انبیاء علیہم السلام نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے تو منکروں نے ہمیشہ ان کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔ پس کیا ایک جویائے حق اور غیر متعصب انسان کے لیے یہ جواب اس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانینِ قدرت سے جدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لیے ہی مخصوص رہا ہے اور ان کے علاوہ انسانی دنیا اس کے فہم حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی اُن لوگوں کے پاس جو از رہِ عناد و ضد انکار پر تلے ہوئے تھے، اس کے انکار کے لیے اس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو "سحر و جادو" کہہ دیں۔ لہٰذا ان امور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے "معجزہ" اور "نشانِ خداوندی" ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کا خلاصہ

بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو حجۃ و برہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دین حق کی تعلیم دیتے رہتے اور ان کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلا کر مردہ قلوب میں حیات تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل (علیہم السلام) کی تصدیق، آخرت (معاد) پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، قضاء و قدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان، اخلاق حسنہ کے اختیار، اعمال سیئہ سے پرہیز و اجتناب، عبادتِ الٰہی سے رغبت، دنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوقِ خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم و تلقین تھی جو ان کی زندگی کا مشغلہ اور فرضِ منصبی بنا ہوا تھا۔ وہ بنی اسرائیل کو توراۃ، انجیل اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امور کی جانب دعوت دیتے۔ مگر بدبخت یہود اپنی فطرت کج صدیوں میں مسلسل سرکشی اور تعلیم الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ متشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے ان کے قلوب کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کی جماعت کی بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اسلئے انبیاء کی سنت

راشدہ کے مطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دنیوی جاہ وجلال کے لحاظ سے کمزور وناتواں اور زیردست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی، ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ ان پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جدوجہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا:

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ط هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيْمٍ ○

اور جب عیسیٰ علیہ السلام ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: بلاشبہ میں تمہارے پاس "حکمت" لے کر آیا ہوں اور اسلئے آیا ہوں تاکہ ان بعض باتوں کو واضح کردوں جن کے متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے سو اس کی پرستش کرو یہی سیدھی راہ ہے" پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے لگے، سو ان لوگوں کیلئے دردناک عذاب کے ذریعہ ہلاکت اور خرابی ہے

وَإِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَابَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ (صف پ ۲۸ ع ۱)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے کہا: اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا نام اس کا احمد ہے، پس جب (عیسیٰ علیہ السلام) آیا ان کے پاس معجزات لے کر تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے، یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

فَلَمَّآ أَحَسَّ عِيسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِيْٓ إِلَى اللّٰهِ ط قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَآ أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِيْنَ ○ (آل عمران پ ۳ ع ۵)

پھر جب عیسیٰ نے ان (بنی اسرائیل) سے کفر محسوس کیا تو کہا "اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے؟" حواریوں نے جواب دیا: "ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تو نے اتارا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار کرلی پس تو ہم کو (دین حق کی) گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے۔ (سورۂ آل عمران پ ۳ ع ۵)

حواری عیسیٰ علیہ السلام

مگر عیسیٰ علیہ السلام معاندین و مخالفین کی درازدستیوں اور ہرزہ سرائیوں کے باوجود اپنے فرض منصبی "دعوۃ الی الحق" میں سرگرم عمل رہتے اور شب و روز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغام حق سناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبول حق و صداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور حکم خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید روحیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دین حق کو قبول کر لیتی تھی، ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرت عیسیٰ کے شرف صحبت سے فیضیاب ہو کر نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دین حق کی سربلندی اور کامیابی کیلئے انہوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمت دین کیلئے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت سرانجام دیتی تھیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ "حواری" (رفیق) اور "انصار اللہ" (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز و ممتاز کی گئیں۔ چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے پیغمبر خدا کی حیات پاک کو اپنا اسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں:

وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ أَنْ آمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْآ آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ○ (مائدہ پ ۷ ع ۵)

اور (اے عیسیٰ وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انہوں نے جواب دیا "ہم ایمان لائے اور اے خدا تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْآ أَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّيْنَ مَنْ أَنْصَارِيْٓ إِلَى اللّٰهِ ط قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ فَآمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَأَيَّدْنَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوْا ظَاهِرِيْنَ ○ (صف پ ۲۸ ع ۲)

اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے جب حواریوں سے کہا: "اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے" ...... تو حواریوں نے جواب دیا "ہم اللہ (کی راہ) کے مددگار پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی پس وہ (مؤمن) غالب رہے۔

گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ "سنۃ اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ ان کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دین حق پر جان سپاری کا مظاہرہ کرنے کیلئے اول غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زیردست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحب اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ

اور معارضہ کیلئے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانونِ پاداش عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح وکامرانی ان کمزور فدایان حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعر مذلت میں جاگرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھتیں۔

حواری عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن وانجیل کا موازنہ

قرآن عزیز نے عیسیٰ علیہ السلام کے حواریون کی منقبت بیان کی ہے، سورۂ آل عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام جب دین حق کی نصرت ویاری کیلئے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنہوں نے "نحن انصار اللّٰہ" کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورۂ صف میں اللہ رب العلمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کی ترغیب دی تو "تذکیر بایام اللہ" کے پیش نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرت حق کیلئے برانگیختہ کیا اور سورۂ مائدہ میں ان کے قبول ایمان اور دعوت حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی ان کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس وقت کا حال ہے جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے درمیان موجود ہیں لیکن آپکے رَفْعِ اِلَی السَّمَآءِ کے بعد بھی ان کی پر استقامت اور دین قدیم کی فداکارانہ خدمت کے معلق سورۂ صف کی آیت فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہ) نے اسی بناء پر آیت زیر بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اس طرح ذکر فرمایا ہے:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی حنفیوں نے اسے زیادہ کیا۔

مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل) بعض مقامات میں اگر ان کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت یسوع علیہ السلام کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں، اس طرح مذکور ہے:

> یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑا دے گا۔ شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے...... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا...... اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے، پھر اس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اور اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دے دیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔ (باب ۱۳ آیات ۲۷-۲۱)

اور انجیل متی میں اس شمعون بطرس حواری کے متعلق جو "بقول اناجیل ساری عمر حضرت یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا" یہ مسطور ہے:

شمعون بطرس نے اس سے کہا، اے خداوند تو کہاں جاتا ہے، یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آ سکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئے گا۔ پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آ سکتا، میں تو تیرے لیئے اپنی جان دوں گا۔ یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے پیچھے اپنی جان دے گا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔ (متی باب ۲۷، آیت ۴۶)

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

''اس پر سارے شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے''۔ (باب ۲۶ آیت ۵۶)

ان حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل نقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں، اول یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرت یسوع کے زیادہ قریب، ان کے معتمد علیہ اور ان کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ ''منافق'' نکلے مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہت قلب ظاہر داری کے طور پر شریک جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے۔ مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لیکن نبی اور پیغمبر کو ''وحی الٰہی'' کے ذریعہ شروع ہی سے مخلص اور منافق کی اطلاع دے دی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعت حق اور اس کی دعوت و اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے، نبی اس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب، معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ایک جدا امر ہے کہ نبی، دین حق کی مصالح کی وجہ سے اس کے ساتھ اعراض اور درگذر کا طریق عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ ''جب آپ منافقین کے حالاتِ منافقت سے آگاہ ہیں تو ان کا مقابلہ کرکے کیوں ان کو کیفر کردار تک نہیں پہنچادیتے تاکہ جماعت مسلمین کو ان کی منافقت سے نجات ملے'' یہ جواب دیا: ''اسلیئے کہ ان کے قبول ایمان کی ظاہر داری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو اکہ وہ کہہ اٹھیں ''محمد، اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے''۔

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اس وقت حلول کیا جب حضرت یسوع نے اپنے ہاتھ سے اس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اسلیئے عقل اور نقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر برکت، طہارت اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہو جایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس پیمانہ کے مس کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہو جائے اور انجیل کے اس بیان میں صورت حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضرت یسوع کے تمام ان حواریوں میں سے ''جن کی مدح و ستایش میں جگہ جگہ بائبل

رطب اللسان ہے ''ایک، دو، یا دس پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اس وقت حضرت مسیح علیہ السلام سے کنارہ کش ہو گئے، جب دین حق کی حمایت و نصرت کیلئے سب سے زیادہ ان کی ضرورت تھی اور جب کہ پیغمبر خدا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اس شہادت کے خلاف سورۂ آل عمران میں قرآن عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دین حق کی نصرت و یاری کیلئے پکارا تو اس نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا: ''نحن انصار اللّٰہ'' اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے سامنے اپنی استقامت دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورۂ صف میں قرآن عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جو کچھ کہا تھا ان کی موجودگی میں اور ان کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنین صادقین ثابت ہوئے اور اسلئے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی مدد فرمائی اور ان کو دشمنان حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس معاملہ میں ''حق'' قرآن کے ساتھ ہے اور علماء نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کر کے اس قسم کے گھڑے ہوئے واقعات کا اضافہ اسلئے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ عقیدہ عقیدۂ ''صلیبِ مسیح'' سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح علیہ السلام کو صلیب پر لٹکایا گیا تو انہوں نے یہ کہتے کہتے جان دے دی ''ایلی ایلی لما سبقتنی'' ''اے خدا! اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ و تنہا چھوڑ دیا'' اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح علیہ السلام کا ساتھ نہ دیا)...... بہر حال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

نزول مائدہ

مخلص اور فداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی و مجلسی تکلفات گفت و شنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریاتِ زندگی کے سر و سامان کے اعتبار سے غرباء اور ضعفاء کی جماعت تھی۔ اسلئے انہوں نے ازراہِ سادگی و سادہ دلی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذات اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدائے تعالیٰ نے جن کو آپکی تصدیق نبوت و رسالت کیلئے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہو گی کہ وہ ہمارے لیئے غیب سے ایک دستر خوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینان قلب یادِ خدا اور دین حق کی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر ان کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچے بندہ کیلئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سن کو حواریوں نے جواب دیا ''ہم اور خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا تو یہ مقصد نہیں، ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جد و جہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنالیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقادِ راسخ حاصل ہو

جائے اور ہم اسکی خدائی پر کائناتِ انسانی کیلئے شاہد عدل بن جائیں"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب ان کا بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو بارگاہ الٰہی میں دعا کی "اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دستر خوانِ نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیئے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اول و آخر سب کیلئے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا "نشان" کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شاد کام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے" اس دعاء کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ تمہاری دعاء قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔ قرآن عزیز نے نزول مائدہ کے واقعہ کا اس معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے:

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يَاعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ أَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ قَالُوْا نُرِيْدُ أَنْ نَّأْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ أَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشَّاهِدِيْنَ ○ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنْكَ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ ○ قَالَ اللّٰهُ إِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّيْٓ أُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ أُعَذِّبُهٗٓ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِيْنَ ○

(مائدہ، پ ۷، ع ۱۵)

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا "اے عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہمیں ایک خوان اتار دے؟" (یعنی ہماری غذا کیلئے آسمان سے غیبی سامان کر دے) عیسیٰ علیہ السلام نے کہا خدا سے ڈرو (اور ایسی فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو، انہوں نے کہا (مقصود اس سے قدرت الٰہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ) ہم چاہتے ہیں (ہمیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے دعا کی "اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان بھیج دے کہ اس کا آنا ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں سب کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل و کرم کی) ایک نشانی ہو۔ ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے" اللہ نے فرمایا "میں تمہارے لیے خوان بھیجوں گا، لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (راہِ حق سے) انکار کریگا تو میں (پاداشِ عمل میں) عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآن عزیز نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے، البتہ آثار صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں:-

مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا، اسلئے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا۔ طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھیریں اپنے سوال کو واپس لے لیا۔ علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو وہ ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہیں ہوتی تاہم ان کے یہاں اس نزولِ مائدہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔[1]

اور حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حضرت عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا، جمہور کا رجحان اسی جانب ہے۔ البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا کہ نازل نہ ہوا، یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا، ان پر سخت قسم کا عذاب بھی آ پہنچا؟ جو نقول یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا، وہ بند ہونے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزول مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر، مسکین اور مریض ہی کھائیں، تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں۔ مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی، یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کیلئے ذخیرہ نہ کریں۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنے والے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیئے گئے۔[2]

بہر حال ان آثار میں جو قدر مشترک ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعاء قبول فرمالی تو مشیتِ باری کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتہ فضاءِ آسمانی سے اسکو لے کر اترے، ادھر فرشتے آہستہ آہستہ اس کو لئے ہوئے اتر رہے تھے اور ادھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا تھے کہ مائدہ آ پہنچا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اول دو رکعت نمازِ شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور ترو تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھلتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں، مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتداء آپ کریں، آپ نے ارشاد فرمایا، یہ میرے لیئے نہیں ہے، تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے، یہ سن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں، آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا: "اچھا فقراء، مساکین، معذورین اور مریضوں کو بلاؤ یہ ان کا حق ہے، تب ہزار ہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آیا۔[3]

۱: تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۱۶۔ مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ "عید فصح" کے موقع پر پیش آیا۔

۲: نزول مائدہ کا سوال اگرچہ کیا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے۔ اسلئے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق عذاب کا ذکر ہے ان کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوصِ قرآنی کے خلاف ہے۔

۳: یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتبِ تفسیر میں موجود ہیں۔

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزول مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے:۔

(ھل یستطیع) ''ہو سکے'' یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعاء سے اس قدر خرق عادت کرے یا نہ کرے فرمایا (اتقوا اللہ) ''ڈرو اللہ سے'' یعنی بندہ کو چاہئے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند! (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے و نکون علیها من الشهدین یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ آزمانے کو نہیں کہتے ہیں۔ وہ خوان اترا چالیس روز تک اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقراء اور مریض کھاویں نہ محظوظ (توانگر) اور چنگے پھر قریب اسی آدمی سور اور بندر ہو گئے (مگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا[1]

اور بعضے کہتے ہیں (مائدہ) نہ اترا، تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اسکی شکر گذاری بہت مشکل ہے، اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔

(موضح القرآن سورۂ مائدہ)

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسرؓ نے موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے:۔

''عیسیٰ علیہ السلام سے ان کو قوم نے نزولِ مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا: ''تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اسمیں خیانت کرنا نہ اس کو چھپائے رکھنا اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا''۔

اے معشر عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا، جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو، اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آجاؤ گے اور اس پر چھا جاؤ گے۔ اور اس نے تم کو سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گزریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورۂ مائدہ)

---

[1] شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ واقعۂ مسخ صحیح نہیں ہے۔

رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھالیا جانا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ شادی کی اور نہ بود و ماند کیلئے گھر بنایا۔ وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دین حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آ پہنچتی وہیں کسی سر و سامانِ راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذات اقدس سے مخلوقِ خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی۔ اسلئے جس جانب بھی ان کا گزر ہو جاتا خلقت کا انبوہ حسن عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ ان پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوتِ حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا، اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب ان کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو برداشت نہ کر سکے تو ان کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیوں نے ذات اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اسکے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہِ وقت کو مشتعل کر کے اس کو دار پر چڑھا دیا جائے۔

گذشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار، وقت کے بت پرست شاہنشاہ قیصر روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

یہود اگرچہ اس بت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اس سے متنفر تھے۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: "عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لیئے بلکہ حکومت کیلئے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے، اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کر دیا گیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رکھے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے۔ اسلئے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اس فتنہ کا انسداد از بس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے۔"

غرض کافی گفت و شنید کے بعد پیلاطیس نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں، بنی اسرائیل کے سردار اور فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بے حد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا منتظر

رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقع پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔
انجیل، یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے:۔

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے۔ اگر ہم اسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کرلیں گے اور ان میں سے کائفا نام ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا، ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی امت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔ (باب ۱۱ آیات ۵۰-۴۷)

یہ اس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہِ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کیلئے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومت یہود کا بھی خاتمہ نہ کردے۔

اور مرقس کی انجیل میں ہے:

دو دن کے بعد فصح اور عید الفطر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقع ڈھونڈ رہے تھے کہ اسے کیونکہ فریب سے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے۔ (باب ۱۴ آیت ۲-۱)

دوسری جانب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آل عمران اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہود کے کفر وانکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش وامتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ میں تم سے سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر وانکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر ومددگار بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشادِ مبارک سن کر سب نے بڑے جوش وخروش اور صداقتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار، خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم وفاشعار ہیں اور درگاہِ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کیلئے یوں دست بدعاء ہیں، اے پروردگار! ہم تیری اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدق دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں۔ خدایا! تو ہم کو صداقت وحقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے فریضۂ دعوت وتبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ تو اکثر وبیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے پورے حصۂ بیان میں دونوں کی قطعاً جدا جدا راہیں ہیں اور ان کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لیئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اس کو یہود بنی اسرائیل

کی ایک قابل لعنت جدو جہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ ان کو سولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ علیہ السلام کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا، مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا اور اس کسمپرسی کی حالت میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

> سردار کاہن نے اس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ یسوع نے اس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی۔ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انہوں نے اسکے منہ پر تھوکا اور اس کو مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا "اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا...... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطیس کے حاکم کے حوالہ کیا...... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا۔ اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا۔ پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟...... وہ بولے برابا کو، پیلاطیس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے، کیا کروں، سب نے کہا اس کو صلیب دی جائے۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے۔ جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا الٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا: "میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو"۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا "کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر"، اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا

اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب اور اس پر تھوکا اور وہی سر کنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے۔ ایک داہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا۔ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اتر آ۔ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کر ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا...... اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: ''ایلی ایلی لما سبقتنی'' (اے میرے خدا! اے میرے خدا تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا) جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا، یہ ایلیا کو پکارتا ہے...... یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دے دی''۔ (باب ۲۶ آیات ۲۷ تا ۵۷)

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت انتہائی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور گرچہ خدا کے پاک اور مقدس بندوں کیلئے یہ کوئی اچنبھی بات نہ تھی بلکہ مقربین بارگاہِ صمدی کیلئے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اسکے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روزِ روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولوالعزم پیغمبر بلکہ مردِ صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضاءِ الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دے دی ''ایلی ایلی لما سبقتنی'' کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورت حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شایانِ شان نہیں کہی جا سکتی۔ پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی ''اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے'' اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا ''اگر یہ میرے پیئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو''۔

باعثِ حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدۂ ''کفارہ'' کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی اور اگر لوازم بشریت کی بناء پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود ازراہِ فخر و غرور اس پے بے حد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیحِ ناصری اگر ''مسیح موعود'' ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو

ہمارے ہاتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اسکو بچائے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقتاً خدا کا بیٹا اور "مسیح موعود" ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچالیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس جب کہ اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ تب انہوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا۔ یوحنا کی انجیل میں ہے:۔

لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مرچکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑ دیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہہ نکلا...... ان باتوں کے بعد ارملیتہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا۔ یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطیس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لے جائے۔ پیلاطیس نے اجازت دے دی۔ پس وہ آکر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا۔ پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اسے صلیب دی گئی، وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا۔ پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا، قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا...... لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائینتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی۔ انہوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے؟ اس نے ان سے کہا اسلئے کہ میرے خداوند کو اٹھا لے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا مریم! وہ پھر کر اس سے عبرانی زبان میں بولی "ربّونی"، یعنی اے استاد! یسوع نے اس سے کہا مجھے نہ چھو، کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدلینی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ پھر اسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا، شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے۔ یہودیوں کے ڈر سے بند تھے، یسوع آکر بیچ میں کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پسلی انہیں

دکھائی۔ پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے یسوع نے پھر ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر ان کو پھونکا اور ان سے کہا ''روح القدس'' لو۔ (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴۔ ۳۳ و آیت ۴۲۔ ۳۸ و باب ۲۰ آیات ۱تا۲۲)

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد بہ سہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصۂ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخص سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے بس و بے کس مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصۂ بیان ایسی ہستی کا رخ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف، ذات باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کے اپنے اداءِ فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بہر حال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصۂ دراز کے بعد ''عقیدۂ کفارہ'' کی بدعت نے نصاریٰ کو اس کے خلاف اس گھڑے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا۔ اسلئے قرآن عزیز نے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقتِ حال کے رخ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا۔ جس کو مذاہبِ عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوتِ تجدیدی و اصلاح کہا جاتا ہے۔

اس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل، پیغمبرِ حق اور رسول خدا (عیسیٰ بن مریم علیہما السلام) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور ان پر نازاں تھے۔ اسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانون قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اس کو دشمنوں کے ہر ''مکر'' سے محفوظ رکھے گی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے ان پر نرغہ کیا تو ان کو پیغمبر خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہوئی اور ان کو بحفاظت تمام اٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی حفاظت کیلئے کیا گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کیلئے سرگرم سازش ہیں تو انہوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے صورتحال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں، اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہوں گا۔ اسلئے میرے بعد دین حق پر استقامت، اس کی نشر و اشاعت اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے۔ اسلئے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے۔ حواریوں نے یہ کلام حق سن کر کہا: ''ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقتِ ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیش نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات

ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعاء ہوگئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔

اس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے فریضہ 'دعوت وارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھئے معاندین کی سرگرمیاں کیا رخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآن عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون واوہام فاسدہ کے خلاف "علم الیقین کی روشنی" بخشتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرم عمل تھے۔ اسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرتِ کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق معاندینِ حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جا سکے گی۔ اسلئے کہ اس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی:۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝ (آل عمران، پ ۳، ع ۱۳)

اور انہوں نے (یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔

لغتِ عرب میں "مکر" کے معنی خفیہ تدبیر (اور دھوکا کرنے) کے ہیں اور علم معانی کے قاعدہ "مشاکلہ" کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو وہ اخلاق اور مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی "مکر" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے "برائی کا بدلہ برائی ہے"۔ حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں "برائی" نہیں ہے۔ تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو "مشاکلہ" کہتے ہیں اور یہ فصاحت وبلاغت کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی۔ ایک جانب برے بندوں کی بری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادر مطلق کی تدبیر کامل تھی۔ جس میں نقص وخامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تارِ عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آ پہنچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں اور فقیہوں نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا۔ ذات اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کیئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہو کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے۔ تاکہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعویٰ تدبیر خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بے شک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اس کی تدبیر محکم نے عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اس نازک گھڑی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی نے یہ بشارت سنائی: "عیسیٰ! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائے گی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکیں گے اور نہ تم اس وقت موت سے دوچار ہو گے) اور ہو گا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھالوں گا اور ان

کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھوں گا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پاسکیں گے) اور تیرے پیروؤں کو ان کافروں پر ہمیشہ غالب رکھوں گا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہیں گے اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہے۔ پس میں ان باتوں پر فیصلہ حق دوں گا، جن کے متعلق تم آپس میں اختلاف کر رہے ہو۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَاعِيْسَى إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْآ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○ (آل عمران، پ۳ ع۱۴)

(وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا: "اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کروں گا اور تجھ کو اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں اور جو تیری پیروی کریں گے، ان کو تیرے منکروں پر قیامت تک کیلئے غالب رکھنے والا ہوں۔ پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے، پھر میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن کے بارے میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔"

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ (پ۷، ع۵)

(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار کراتے ہوئے فرمائے گا) اور وہ وقت یاد کرو، جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پاسکے) جبکہ تو ان کے پاس معجزات لے کر آیا اور ان میں سے کافروں نے کہہ دیا: "یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے"۔

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تم کو قتل نہ کر سکیں گے اور تم کو غیبی ہاتھ ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لے گا اور اس طرح دشمنان دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دیئے جائیں گے، تو اس جگہ پہنچ کر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالا۔ تب قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے قتل و صلیب کی پوری داستان سر تا سر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کو بقید حیات ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو ان پر صورت حال مشتبہ کر دی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اس مکان میں سے مسیح علیہ السلام کہاں چلا گیا:

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ط وَإِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ط مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ○ بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا

حَكِيْمًا ○

اور (یہود ملعون قرار دیئے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبر خدا کو قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت) اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس کے قتل کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں بلا شبہ وہ اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقت حال کے بارے میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی روشنی نہیں ہے اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب (ملاءاعلیٰ کی جانب) اٹھالیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

قرآن عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اس نے حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کے متعلق دیا ہے۔ اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں۔ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت اور ان کے دعوت وارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجئے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر ان تفصیلی واقعات پر نظر ڈالئے۔ جو ایک اولوالعزم پیغمبر، مقرب بارگاہِ الٰہی اور نصاریٰ کے عقیدۂ باطل کے مطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلہ کے سامنے مایوس، مضطرب، بے یار و مددگار اور خدا سے شاکی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس تضادِ بیان پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جانب عقیدۂ کافرہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کا بیٹا بن کر آیا ہے۔ اس غرض سے ٹھاکہ مصلوب ہو کر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور دوسری جانب صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کی داستان اس اساس پر کھڑی کی گئی ہے کہ جب وہ وقتِ موعود آپہنچتا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت دنیا میں وجود پذیری کو یکسر فراموش کر کے "ایلی ایلی لما سبقتنی" کا حسرت ناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضی الٰہی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا نظر آیا ہے۔ کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں تو ان دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنی؟

پس اگر ایک حقیقت بیں اور دور رس نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات و حالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مطالعہ کرے تو وہ تصدیق حق کے پیش نظر بلا تامل یہ فیصلہ کرے گی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گھڑی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ "یہود" کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولوس رسول) نے تثلیث اور 'کفارہ' پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو 'کفارہ' کے عقیدہ کی استواری کے لیے یہود کی خرافی داستان کو بھی مذہب کا جزء بنالیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب کہ چودہ صدیوں سے قرآن حکیم نے عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و جلالت قدر کا اعلان کرتے ہوئے ان کے رفع الی السّماء کی حقیقت کو یہود و نصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم ویقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود و نصاریٰ کو دلائل و براہین کے ذریعہ لاجواب اور

سرنگوں کر دیا تھا تو اس کے مقابلہ میں آج ایک مدعیِ اسلام، دعوئے نبوت و مسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خود غرضانہ خوشامد میں یہود و نصاریٰ کے اسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس پر اپنے "باطل عقیدۂ نبوت" کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متنبّی قرآن عزیز کی تصریحات سے بے نیاز ہو کر نہایت جسارت کے ساتھ ان تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لیے اختراع کیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلا شبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے اسیر کیا، ان کا ٹھٹھا اڑایا، ان کے منہ پر تھوکا، ان کے طمانچے بھی لگائے، ان کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین و تذلیل کا سلوک کرنے کے بعد ان کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں ان کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود و نصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعش ان کے حوالہ کر دی گئی اور وہ تجہیز و تکفین کے لیے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انہوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ ان کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی میں وہیں انتقال پا گئے۔ گویا یوں کہیے کہ یہود و نصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق توہین و تذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متنبّی کاذب نے قبول کر لیے باقی ان کی عظمتِ شان اور جلالتِ مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کر کے اس کے ساتھ ایک ایسا فرضی حصہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب عیسیٰ علیہ السلام کی باقی زندگی مبارک کو گمنامی کے ساتھ وابستہ کر کے توہین و تذلیل کا ایک گوشہ جو تشنۂ سامان رہ گیا تھا اسکی تکمیل ہو جائے۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ)

متنبّیِ پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اسکی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لیے پروفیسر برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" لائق مطالعہ ہے، یا خود متنبّیِ کاذب کی تصنیفی ہفوات اس حقیقت کو عریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبّی پنجاب نے کس طرح قرآن حکیم کی نصوصِ قطعیہ کے خلاف یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ "توہین" "تصلیب" اور "قتل عیسیٰ علیہ السلام" کی تائید پر بے جا جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعویٰ قرآنی کے خلاف ان کی حیاتِ طیبہ کو نامراد و ناکام اور گمنام ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

آپ ابھی سن چکے ہیں کہ قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعویٰ حفاظت و برتری کو کس قوتِ بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ، اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوائے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم علیہما السلام پر قابو نہ پا سکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے۔ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ ، وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ

يَقِينًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ -

تو اب قابلِ غور ہے یہ بات کہ ہم دنیا میں روز و شب یہ مشاہدہ کرتے ہیں رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحبِ قوت و اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کے خلاف ان کا دشمن درپے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحبِ اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، وہ صاحبِ اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی ان کو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن ان کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ ان تک اس کی دسترس ہی نہیں ہونے دی جائے گی تو ہر ایک اہلِ عقل اس کا یہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں ان کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحبِ اقتدار ہستی یا اپنے وعدہ کا ایفاء نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت و نصرت میں مغلوب ہو کر رہ جائے۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحبِ اقتدار ہستی کے عزیز، دوست یا مصاحب کو اس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مارا پیٹا، منہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل و رسوا کر کے اپنے گمان میں مار بھی ڈالا اور مردہ سمجھ کر نعش اس کے عزیزوں کے سپرد کر دی مگر حسبِ اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان اٹکی رہ گئی ہے لہٰذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ روبصحت ہو گیا تو دنیاءِ انسانی اس صاحبِ اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کرے گی جس نے اس مظلوم کی حمایت و نصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لیے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیاءِ انسانی کے معاملات میں صورتحال یہ ہے کہ معلوم نہیں کہ متنبّی پنجاب کے عقل و دماغ نے قادرِ مطلق خدا کے متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا، جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں متنبّی پنجاب نے تسلیم کر لیا اور اشک شوئی کیلئے صرف اس قدر اضافہ کر دیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب و قتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح قفسِ عنصری سے نکل چکی ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمقِ جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی۔ اسلئے اسی طرح ان کی جان بچ گئی، جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا۔ اس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے بعد رمقِ جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے اچھا ہو جاتا تھا۔

بہرحال ہم تو اس ذاتِ واحد، قادرِ مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدۂ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اس کو پورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادرِ مطلق ہستی کیلئے شایاں اور لائق ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم کے منکرینِ حق کا معاملہ سورۂ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اس پر غور فرمائیے۔ ارشادِ باری ہے:

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَأَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهٖ وَإِنَّا

لَصَادِقُوْنَ ○ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِيْنَ ○ تِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً م
بِمَا ظَلَمُوْا إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ وَأَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا
يَتَّقُوْنَ ○

اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مفسد تھے اور کوئی کام صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انہوں نے آپس میں کہا "باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالح علیہ السلام اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اسکے خاندان کی ہلاکت کے وقت موقع پر موجود ہی نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں" اور انہوں نے (صالح علیہ السلام کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی (ان کی سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور ہماری مخفی تدبیر کو نہیں سمجھتے تھے پس (اے محمد ﷺ!) دیکھو! کہ انکی خفیہ سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا؟ یہ کہ ہم نے ان کو (مفسدوں کو) اور ان کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کر دیا (نگاہ اٹھا کر) دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں ان کے گھروں کے کھنڈر ویران ہیں ان کے ظلم کی وجہ سے، بیشک اس واقعہ میں نشانی ہے سمجھ والوں کیلئے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں کو جو کہ پرہیزگار تھے۔

اور پھر مطالعہ کیجئے اس عظیم الشان واقعہ کا جو ہجرت خاتم الانبیاء ﷺ سے تعلق رکھتا ہے اور سورۂ انفال میں دشمنانِ حق کی ذلت و رسوائی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کیلئے وعدۂ الٰہی اور اس کے بے غل و غش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے۔ تاریخی نگاہ سے ان پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجئے کہ جس خدا نے صالح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے ساتھ اپنے وعدۂ حفاظت کو اس شانِ رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو۔ کیا متنبی پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شانِ معجزانہ کے ساتھ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں، حالانکہ آیات قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے کیئے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور ان میں صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمن ان کو ہاتھ تک نہ لگا سکیں گے، تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات و انعامات کو شمار کرائے گا ان میں سے ایک بڑا انعام و احسان یہ بھی ہوگا:۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ عَنْكَ

اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا۔

متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افترا اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کیلئے حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیسا کہ متنبی کاذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے تب بھی یہود و نصاریٰ کی اس اندھی تقلید کیلئے مقابلہ میں جو نصوصِ قرآنی کے خلاف "کفر بواح" تک

پہنچاتی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی شانِ رفیع کے حق میں باعث توہین و تذلیل اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کرتی ہے" کیا یہ کافی نہیں تھا کہ تاویل باطل[1] کے پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقید حیات آسمان پر نہیں اٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر ان کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح ان کو نہ پا سکے، لیکن وائے بر حال متنبّی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ بغض و عناد نے "خسر الدنیا والآخرہ" کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

قادیانی تلبیس اور اس کا جواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس معرکۃ الآراء مسئلہ میں "جو ان کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے"۔ سورۂ آل عمران کی آیات کا باہمی ربط اور ترتیب ذکری خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ متنبّی کاذب نے اس میں بھی تلبیس الحق بالباطل" کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن عزیز، سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دشمنوں کے نرغہ میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری شکل و صورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنانِ دین نے حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیش نظر قدرتی طور پر حضرت عیسیٰ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے راہ حق میں جاں سپاری یا قدرت الٰہی کا کوئی اور کرشمہ؟ اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لئے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہو گی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا؟ اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب و آلام اٹھانے کے بعد تحفظ جان ہو گا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پا سکیں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اس طرح جواب دیا: "عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدت حیات پوری کروں گا یعنی مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کر پائیں گے اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ اور صورت یہ ہو گی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لوں گا وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ اور یہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہو کر گذریں گے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کرا کر اٹھائیں گے نہیں بلکہ یوں ہو گا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکے گا وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کریں گے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا کہ نصاریٰ اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان) ان کو قیامت تک یہود پر غالب رکھیں گے اور تا قیام قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہو گا باقی رہا تمام معاملات کا فیصلہ سو اس کے لے (قیامت کا) دن مقرر ہے اس روز سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا جائیگا۔

---

[1] تاویل باطل اسلئے کہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوص قرآنی، حدیثی اور اجماع امت کے پیش نظر اس مقام پر یہ تاویل بلاشبہ "باطل" ہے مگر اس سے کم از کم حضرت مسیح علیہ السلام کی توہین اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

زیر بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلف صالحین اور اجماع امت کے مطابق ہے اسی طرح اس میں آیات میں کیے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی مسند مسیحیت و نبوت کو قائم کرنے کیلئے قرآن واحادیث صحیحہ اور اجماع امت کے خلاف جبکہ یہ دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریف معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعویٰ کیا کہ اگر مسیح علیہ السلام کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطیعین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائے گا تو ترتیب ذکری میں فرق آجائے گا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم ماننا پڑے گا اور یہ قرآن عزیز کی شان بلاغت کے خلاف ہے لہذا یہ ماننا چاہیے کہ انی متوفیک کے وعدہ کا وقوع ہو چکا اور عیسیٰ علیہ السلام پر موت آچکی۔

مرزائے قادیانی کی یہ "تلبیس" اگرچہ ان حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوب بیان کا ذوق رکھتے ہیں لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لئے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود زائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیب ذکری کا مطلب یہ ہو تا کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار کی گئی ہیں تو ان کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت پر تقدیم و تاخیر کو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ علم معانی کا مشہور مسئلہ ہے۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہل اسلام کی تفسیر کے مطابق ترتیب ذکری بحالہ قدیم ہے اس لئے کہ خدا کی جانب سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کروں گا انی متوفیک یعنی تمہاری موت ان دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہو گی بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مرو گے مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں: یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہو جائے اور فرار ہو جائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام ان کی زد سے بچ جائیں یا یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آکر ان سب کو ہلاک کر دے یا یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام کسی ترکیب سے ان کے نرغہ میں سے محفوظ نکل جائیں اور ان کی دسترس سے باہر ہو جائیں یا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمۂ قدرت سے عیسیٰ علیہ السلام کو مکان بند رہتے ہوئے ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لے وغیرہ وغیرہ۔ تو قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورہ بالا آخری شکل یعنی و رافعک الی کی شکل میں ہو گا اور ہو گا بھی ایسی قدرت کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکیں گے اور میں ان کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھوں گا و مطهرك من الذين كفروا اور ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ہو گا کہ میں تیرے پیروؤں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا بہر حال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئیں گے کہ پہلے وعدۂ اول وقوع پذیر ہو جائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے ان آیات میں پہلے وعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اول تجھ کو ماروں گا اور پھر

بالترتیب یہ سب امور انجام دوں گا کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہے لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہے وہ ہرگز ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ ترتیب ذکری کے لئے یہ تو ہونا چاہیے کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ترتیب میں فرق لاکر تقدیم و تاخیر کا عمل جراحی کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے اور اس کا آخری حصہ وقوع ان تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جو اس کے بعد مذکور تھے مگر ترتیب ذکری میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اس وقوع کے متاخر ہو جانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوع ترتیبی کا ترتیب ذکری کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلہ زیر بحث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اس کا ترتیب ذکری سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے یہاں تو اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہو گے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہوگی اس طریق پر ہوگی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہر حال باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آسکے، اور اگر کہیں دشمن حضرت مسیح علیہ السلام کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر "رفع" اور "تطہیر" کے لئے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتے اور مرزا قادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات کی آڑ لینی پڑتی اور آیات زیر بحث کی "روح" فنا ہو کر رہ جاتی۔ اور یہ اس لئے کہ اگر "رفع" سے رفع روحانی اور "تطہیر" سے روحانی پاکی مراد لئے جائیں تو یہ قطعاً بے محل اور بے موقع ہوگا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیے جا رہے ہیں تو حضرت عیسیٰ کو یہ بتانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد کہ تم کاذب اور ملعون ہو غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفع روحانی کرنے والا ہوں قطعاً عبث تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ پیغمبر خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افتراء کیا حقیقت رکھتا ہے نیز یہود کو حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع روحانی کا پتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معاملہ عالم غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرت مسیح علیہ السلام کی بر محل تسلی کا باعث ہو سکتا تھا اور نہ یہود کے لئے سود مند اور یہی حال دوسرے وعدۂ تطہیر کا ہے بلکہ جب بقول قادیانی یہود کے ہاتھوں حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھا دیے گئے تو نعش پالینے کے بعد شاگردوں کا مرہم عیسیٰ علیہ السلام لگا کر چنگا کر لینے اور پھر منجانب اللہ جن کی ہدایت و ارشاد کے لئے مامور کیے گئے تھے ان سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گمنامی میں زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد وَرَافِعُكَ اِلَیَّ اور وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کہہ دینے سے نہ یہود کے عقیدۂ متعلق مسیح علیہ السلام کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکے گا کہ ایسے موقع پر جبکہ عیسیٰ علیہ السلام دشمنوں کے نرغے میں ہیں ور جبکہ ان کو یہ یقین ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد رفع روحانی اور تطہیر لازم شے ہے ان تسلیوں اور وعدوں کا کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہل حق کی تفسیر کے مطابق آیت قرآنی کی روح اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرت مسیح سے جس طرح کیے گئے وہ بر محل اور فطری اضطراب کے لے بلا شبہ باعث تسکین

ہیں اور نبی اکرم ﷺ کی معرفت کا وقت کے یہود و نصاریٰ کے وراثتی عقائد باطلہ کی تردید کے لئے کافی اور مدلل۔

جمہور اہل حق کی یہ تفسیر "توفی" کے معنی "مقررہ مدت پوری کرنا" اختیار کر کے کی گئی ہے جس کا حاصل (تو فی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ کے مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ لغت عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وفی، یفی، وفاء ہے جس کے معنی "پورا کرنے" کے آتے ہیں اور اس کو جب باب تفعل میں لے جا کر "توفی" بناتے ہیں تو اس کے معنی "کسی شے کو پورا پورا لینا" یا کسی شے کو سالم قبضہ میں کر لینا" آتے ہیں توفی اخذہ وافیاً تا ما یقال "توفیت من فلان مالی علیہ" اور چونکہ موت میں بھی اسلامی عقیدہ کے مطابق روح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لئے کنایہ کے طور پر کہ جس میں حقیقی معنی بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں "توفی بمعنی موت مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں توفاہ اللہ ای اماتہ لیکن اگر موقع پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیش نظر توفی کے حقیقی معنی لئے جا سکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اس مقام پر خواہ فاعل "اللہ تعالیٰ" اور مفعول "ذی روح انسان" ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی، معنی "پورا لے لینا" ہی مراد ہوں گے مثلاً آیت اللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا[1] اللہ تو پورا لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ کیلئے بھی لفظ "توفی" بولا گیا یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں ان کے ساتھ "توفی" کا معاملہ کرتا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے "متوفی" اور نفس انسانی مفعول ہے "متوفی" مگر پھر بھی کسی صورت سے "تو فی بمعنی موت" صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائے گا یا مثلاً

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ

(اور وہی (اللہ) ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو دن میں۔
(سورہ انعام)

میں بھی کسی طرح توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس ہیں یا مثلاً آیت

حَتّٰىٓ إِذَا جَآءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (انعام)

یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے)۔

میں ذکر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی تَوَفَّتْهُ میں توفی کے معنی موت کے نہیں بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا یعنی احدکم الموت میں جب لفظ "موت" کا ذکر آ چکا تو اب تَوَفَّتْهُ میں بھی اگر توفی کے معنی موت ہی کے لئے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظ کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام

[1] سورۂ زمر۔

فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روز مرہ کے محاورہ اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لا طائل ہو جاتا ہے البتہ اگر "توفی" کے حقیقی معنی کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کے پورا لے لینا مراد لئے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ٹھیک ادا ہو گا اور کلام بھی اپنے حد اعجاز پر قائم رہے گا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ "توفّی" کے حقیقی معنی موت کے ہیں۔ خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہر حال اس موقع پر "موت" اور "توفی" دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لئے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیث و اسد (بمعنی شیر) ابل و جمل (بمعنی اونٹ) نون و حوت (بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمع: شمل کسب (بمعنی جمع ہونا) اور لبث مکث (بمعنی ٹھہرنا) اور عطش، ظمأ (پیاس) اور جوع: سغب (بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے موت اور توفی کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ ان کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے اور مثلاً آیت

فَأَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ

پس روکے رکھوان (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے ان کو موت

میں موت کو فعل اور توفیٰ کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے عین ذات فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفیٰ کے حقیقی معنی "موت" ہر گز ہر گز نہیں ہیں ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا۔

ان تین مقامات کے علاوہ سورۂ بقرہ کی آیت:

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ

پھر پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو اس نے کمایا ہے۔

اور سورۂ نحل کی آیت:

وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ

اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔

میں بھی توفّی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفس انسانی ہے تاہم یہاں توفّی بمعنی موت نہیں بن سکتے اور یہ بہت واضح اور صاف بات ہے۔

غرض ان آیات میں موجود اس امر کے کہ "توفّی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اس کا مفعول "انسان یا نفس انسانی" ہے پھر بھی با جماع اہل لغت و تفسیر "موت کے معنی" نہیں ہو سکتے خواہ اس لئے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لئے کہ اس مقام پر توفی کے حقیقی معنی (پورا لے لینا یا قبض کر لینا) کے ماسواء "موت کے معنی" کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔

تو مرزائے قادیانی کا یہ دعویٰ کہ "توفی" اور "موت" مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول انسان یا نفس انسانی ہو تو اس جگہ صرف موت ہی کے معنی ہونگے دونوں دعوے باطل اور نصوص قرآنی کے قطعاً خلاف ہیں

فَهَاتُوْ بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

توفی اور موت یقیناً مرادف الفاظ نہیں ہیں اور توفی کے حقیقی معنی "موت" نہیں بلکہ "پورا لے لینا یا قبض کر لینا" ہیں۔ قرآن عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا گیا مگر اس کے برعکس توفی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھیرایا ہے مثلاً سورۂ نساء میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ

بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا،

اور سورۂ انعام میں ہے

تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا

قبض کر لیا یا پورا لے لیا اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے

اور سورۂ سجدہ میں ہے،

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ

(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے قبض کرے گا تم کو موت کا فرشتہ)

اور سورۂ انفال میں ہے،

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ

اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں فرشتے ان لوگوں (کی روحوں) کو جنھوں نے کفر کیا ہے)

ان تمام پر اگرچہ توفی "کنایہ" بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چوں کہ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لئے لفظ "توفی" کا اطلاق کیا گیا اور لفظ "موت" استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لئے کہ موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روح انسانی کا قبض کرنا اور اس کا پورا پورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے تو جن مقامات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورت عمل کیا پیش آتی ہے ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ "توفی" کا لفظ ہی اس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیش نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ "موت" اور "حیات" کو تو مقابل ٹھیرایا ہے لیکن "توفی" کو کسی ایک مقام پر بھی "حیات" کا مقابل قرار

نہیں دیا۔ مثلاً سورۂ ملک میں ہے

هُوَالَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ

خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو" اور سورۂ فرقان میں ہے

وَلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيَاةً

اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے

اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کے مقابل ٹھیرایا ہے مثلاً

- كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ط (بقرہ)
- وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (روم)
- فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (بقرہ، نحل، جاثیہ)
- وَأُحْيِ الْمَوْتٰى بِإِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران)
- وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى (شوریٰ)

(وغیرہ ذلک کثیرا) البتہ توفی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطہ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریق کنایہ اس پر بھی حسب موقع اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھیرا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

"توفی" کے معنی کی اس مفصل تشریح و توضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغت عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں خواہ توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول انسان اور روح انسانی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطہ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریق "توسع" اور "کنایہ" "توفی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے پس جس مقام پر قرینہ اور محل استعمال کا تقاضہ یہ ہوگا کہ وہاں توفی بول کنایۃً موت کے معنی لئے جانے چاہئیں تو اس جگہ "موت" کے معنی مراد ہوں گے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل قرینہ اور محل استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اس جگہ وہی معنی مراد ہوں گے اور ان ہی کو مقدم سمجھا جائے گا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محل استعمال اور دوسرے دلائل اس کو مرجوع یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابوالبقاء نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفی کے معنی اگرچہ موت کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اس کے معنی "پورا لے لینا" اور "قبض کرنا" ہیں فرماتے ہیں:

التوفی الاماتة و قبض الروح و علیه استعمال العامة و الاستیفاء و اخذ الحق و علیه استعمال البلغاء۔

الحاصل سورۂ مائدہ کی آیت إِنِّي مُتَوَفِّيكَ میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر و لغت نے اختیار کیے ہیں تب بھی مرزائے قادیانی کے علی الرغم آیات زیر بحث کا میں تجھ کو پورا پورا لے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں اور صورت یہ ہوگی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاء اعلیٰ کی جانب) اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں الخ" یعنی جب شروع میں یہ بتایا کہ تجھ کو قبض کر لیا جائے گا یا پورا لے لیا جائے تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آجائے اور روح کو قبض کر لیا جائے اور پورا لے لیا جائے گا یا پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاء اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اٹھا لیا جائے تو یہاں کونسی صورت پیش آئے گی پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لئے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائے گی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدۂ الٰہی وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ اور وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے اور "توفی" اور "رفع" ہو جانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذات اقدس کافروں کے ہاتھ سے ہر طرح محفوظ ہو جائے اور اس طرح وعدۂ ربانی

وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

بغیر کسی تاویل کے صحیح ہو جائے اور تاویل باطل کے ذریعہ شک اور تردد یا حقیقت حال سے انکار صرف ان ہی قلوب کا حصہ رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اول اپنے ذاتی اوہام و ظنون کو راہنما بناتے اور پھر قرآن کے منطوق و مفہوم کے خلاف اس کے منہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور اس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآن عزیز کی اس صفت سے غافل رہتے ہیں۔

لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ

اس قرآن کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا یہ اتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے۔"

متنبی پنجاب کو جب قرآن عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریف معنوی میں ناکامی ہوئی اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہو کر قرآن عزیز کے اطلاقات احادیث صحیحہ کی اطلاعات اور اجماع امت کے فیصلہ کو پس پشت ڈال کر "فلسفہ" کی آغوش میں پناہ لینے کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرت مسیح آسمان پر زندہ اٹھا لئے گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اسلئے کہ کوئی مادی جسم ملاء اعلیٰ تک پرواز نہیں کر سکتا اور کر بھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ ہے اور وہاں کھانے پینے اور رفع حاجت کرنے کی صورت کیسے عمل میں آسکتی ہے؟

قدرت الٰہی کے معجزانہ افعال کو خلاف عقل کہہ کر بات اگر ختم ہو سکتی تو شاید قادیانی کی یہ فلسفیانہ موشگافی

درخور اعتناء سمجھی جاسکتی۔ لیکن آج فلسفۂ جدید بہ شکل سائنس ترقی کر کے جس حد تک پہنچ چکا ہے ہوا نظریات (THIORIS) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات (PRACTICLES) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضاء کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ ہٹادیا جائے یا ان کو ضبط (CONTROL) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لئے غیر معلوم بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائے گا اور اس کے لئے جو جدو جہد وہ کر رہے ہیں وہ ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائنٹفک (SCINTIFIC) طریقہ پر کر رہے ہیں پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جا سکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان سے باتیں کرتے وقت اس کے جسم کے تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گذرے ہوئے واقعات کو فضا میں نظم کر کے آج اس طرح سنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالق کائنات کے متعلق از رہ تفلسف یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاء اعلیٰ تک کیسے لے جاسکتا ہے اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظان صحت کے مختلف طریقوں سے عمر طبعی کو دو گنا اور تین گنا کیا جاسکتا اور کیا جارہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات و نتائج میں یہ فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ کسی سے فضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہو جائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دنیا میں دنوں ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خورد نوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالق ارض و سماوات کی جانب حضرت مسیح علیہ السلام کی رفعت آسمانی پر مسطورۂ بالا شکوک پیش کرنا یا ان کے پیش نظر ان کے بجسد عنصری ملاء اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے ناآشنا اور علوم قرآن سے محروم ہے وہ "خلاف عقل" اور "ماوراء عقل" ان دونوں باتوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لئے ہمیشہ ماوراء عقل کو خلاف عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف دو ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان "عقل" سے اس درجہ بے بہرہ ہو جائے کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالاتر نظر آئے اس کو فوراً جھٹلا دے اور یہ یقین کر لے کہ جس شے کو اس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کر سکتی وہ شے حقیقتاً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماوراء عقل سمجھی جاتی ہیں اس لئے کہ ان کی عقلیں ان باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز رہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جا کر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آجاتی ہیں پس اگر ہر ایک وہ شے جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اس کے دور کے تمام اہل عقل کے نزدیک ماوراء عقل تھی "خلاف عقل" کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کیلئے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آگئی۔

قرآن عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرص، اٹکل) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو ''الحاد'' کہا ہے اور یہ دونوں حالتیں ''علم و عرفان'' سے محرومی کا نتیجہ ہوتی ہیں خلاف و عقل اور ماوراء عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلاف عقل بات وہ ہو سکتی ہے جس کے نہ ہو سکنے کے متعلق علم و یقین کی روشنی میں مثبت دلائل و براہین موجود ہوں اور عقل، دلیل و برہان اور علم یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محال ذاتی ہے اور ماوراء عقل اس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہو جاتی لہٰذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آسکتی ہو مگر اس کے انکار پر علم و یقین کے ذریعہ برہان و دلیل بھی دی جا سکتی ہوں تو ایسی بات کو خلاف عقل نہیں بلکہ ماوراء عقل کہیں گے۔

خلاف عقل اور ماوراء عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلاف عقل کہا جاتا رہا ان کو اہل دانش و بینش نے خلاف عقل نہ سمجھتے ہوئے موجودہ دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل یہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماوراء عقل باتوں کو احاطہ عقل میں لا سکے گی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ کے بجسد عنصری رفع الی السماء کا اس لئے منکر ہے کہ عقلی فلسفہ اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ برہان و دلیل اور علم و یقین کی جگہ محض جہل، ظن اٹکل کے ماتحت ہے اور ایسے حضرت کے لئے پھر عالم غیب کی تمام ماوراءِ عقل باتوں مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ، وغیرہ تمام باتوں کو خلاف عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہیے۔ قرآن عزیز نے ان ہی جیسے منکرین حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا جائے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيْلُهٗ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (یونس پ ۱۱ ع ۴)

نہیں یہ بات نہیں ہے (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے ٹھیک اسی طرح انھوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں تو دیکھو ظلم کرنے کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

آیت میں كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک نہ کر سکے اس کو دلیل و برہان اور علم یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بناء پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے اس کی ایک نظیر مرزائے قادیانی کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع الی السماء سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہوری کی موشگافیاں بھی اسی بے دلیل انکار و جحود کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی کمزور سمجھ کر متنبّی پنجاب نے پھر رخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقع کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ''رفع'' سے رفع روحانی کے ماسوا کوئی معنی لئے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہٰذا اس مقام پر بھی رفع روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق و

استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متنبیّ کاذب کا یہ دعویٰ اول تو بنیاداً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محل استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ ''یہی استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابل تسلیم نہیں'' حد درجہ کی نادانی ہے تاوقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کردیا جائے کہ لغت عرب میں اس لفظ کا اس معنی میں استعمال جائز ہی نہیں اور اگر اتمام حجت کے طور پر اس قسم کے لچر سوال یا دعوے کو قابل جواب، یا لائق رد سمجھا ہی جائے تو سورۂ النازعات کی یہ آیت کافی ووافی ہے۔

أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا ○ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا ○

(اے افراد نسل انسانی) خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ بھاری اور بوجھل ہو یا آسمان جس کو خدا نے بنایا اور اس کے بوجھل جسم کو بلند کیا۔

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضا میں سورج چاند ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطا کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالق ارض وسماوات نے ان مادی اجسام کا رفع آسمانی کیا ہے وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفع آسمانی کردے تو اس کو قرآن کے اطلاق واستعمال کے خلاف کہنا غباوت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لئے قرآن عزیز کی نصوص، صحیح احادیث اوا جماع امت سے زیادہ موثق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع سماوی اور چند جذباتی باتیں

مرزائے قادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود ونصاریٰ کی پیروی میں تحریف مطالب کی کافی سعی ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوی نے بھی تفسیر قرآن میں تحریف معنوی کے ذریعہ اپنے مقتداء کی مدد کی تاہم دل کا چور ان کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس لئے انھوں نے دلائل و براہین کی جگہ جذبات کو دلیل راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ ان کو خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپ ﷺ زمین پر ہوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اس لچر اور لوچ جذبہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے ہمیشہ بقید حیات ملاء اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم ان سب کے مقابلہ میں بلکہ ان کی جلیل القدر ہستیوں مثلاً جبرئیل ومیکائیل علیہم السلام کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء ﷺ کا مرتبہ جلیل کہ جس کی عظمت ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر'' میں مضمر ہے علاوہ ازیں نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی ملک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو اس لئے حضرت مسیح علیہ السلام کا رفع آسمانی اس ''رفعت'' کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسریٰ میں آپ ﷺ کو حاصل ہوئی۔ بہر حال فاضل و مفضول کے درمیان فرق مراتب کے لئے تنہا ملاء اعلیٰ کا قیام معیار فضیلت نہیں ہے خصوصاً اس ''افضل ہستی'' کے مقابلہ میں جس کی فضیلت

کا معیار خود اس کا وجود باوجود ہو اور جس کی ذات قدسی صفات خود ہی منبع فضائل اور مرجع کمالات ہو ایسی ہستی سے تو "مقام" عزت و مرتبہ پاتا ہے نہ کہ وہ ذات گرامی۔

حسن یوسف دم عیسیٰ علیہ السلام ید بیضاداری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ تسلیم کرتا ہے وہ "العیاذ باللہ" "نبی اکرم ﷺ" کی اس لئے توہین کرتا ہے کہ وہ بقید حیات نہیں رہے اور اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھر ذات اقدس پر برتری حاصل ہو گئی۔

یہ مقولہ پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنی ہے بلکہ سر تا سر غلط بنیاد پر قائم، اس لے کہ کون اہل عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ "زندگی" بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیار فضیلت ہے اس لئے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات و فضائل سے ہے نہ اس لئے کہ وہ زندگی ہے پھر "معیار فضیلت" کی اس بحث سے قطع نظر اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے مسئلہ فضیلت کو درمیان میں لانا اس لئے بھی قطعاً بے محل ہے کہ جبکہ قرآن عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپ ﷺ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپ ﷺ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر ان نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی "زندگی" یا "رفع آسمانی" یا اور کوئی "وجہ فضیلت" اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں "فضل کلی" اسی جامع کمالات ہستی کو حاصل رہے گا۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ سورۂ نساء کی مسطورہ بالا آیت میں وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کی کیا تفسیر ہے؟ یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا تو قرآن عزیز کا جواب اس مقام پر بھی اور آل عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہے اور وہ رَفْعِ اِلَى السَّمَاءِ ہے آل عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا وَرَافِعُكَ اِلَيَّ اور نساء میں ایفاء وعدہ کی صورت میں یعنی بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب منکرین حق گرفتاری کے لئے اندر گھسے تو وہاں عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورت حال کیا پیش آئی اور اس طرح وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ کا مصداق بن کر رہ گئے اس کے بعد قرآن کہتا ہے

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ○

تو یہی اشتباہ کے بعد جو صورت حال پیش آئی اسکا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں: ایک یہ کہ یہود اس سلسلہ میں اس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا ان کے پاس علم و یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انھوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انھوں نے "مسیح علیہ السلام" کو قتل کر دیا پھر آیت زمانۂ نبوت محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے۔

پس قرآن عزیز کوان واضح اعلانات کے بعد جو حضرت مسیح علیہ السلام کی حفاظت وصیانت کے سلسلہ میں کیے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے ان دونوں باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثار صحابہ اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف ان ہی روایات و آثار کو قابل تسلیم سمجھا جائے گا جو اپنی صحت روایت کے ساتھ ساتھ ان بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جنکا ذکر متعدد مقامات پر قرآن عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور القران یفسر بعضہ بعضا قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے'' کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاءاعلیٰ کی جانب اٹھا لئے گئے اور جیسا کہ حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام کی بحث میں ابھی نصوص قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوع قیامت کیلئے ''نشان'' ہیں۔ اور اسلئے دوبارہ کائنات ارضی میں واپس آکر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دو چار ہوں گے۔

شخص مقتول و مصلوب سے متعلق آثار و تاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں انکا حاصل یہ ہے کہ ''سبت کی شب''میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس کے ایک بند مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے کہ بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بت پرست بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لئے ایک دستہ بھیجا اس نے آکر محاصرہ کر لیا اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ملاءاعلیٰ کی جانب اٹھالیا جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو انھوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہم شبیہ پایا۔ اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گذشتہ سطر میں ہو چکا ہے ان ہی روایات میں بعض اس کا نام یودس بن کرایا یوطا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجس اور دوسرے داؤد بن لوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخص مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرت مسیح علیہ السلام کا مشابہ اور ان کا نقش ثانی تھا، اسرائیلیات انجیلی میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے یہودا اسکر لوطی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شبیہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آپہنچی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو دعوت و تبلیغ حق سے متعلق تلقین وہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مدت تک کے لئے ملاءاعلیٰ کی جانب اٹھالیا جاؤں گا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لئے سخت آزمائش وامتحان میں جانے والا ہے۔ لہٰذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جام شہادت پئے اس کو جنت کی بشارت ہے تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لئے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔[1]

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیث مرفوعہ میں اس لئے وہ صحیح ہوں یا غلط نفس مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص اس لئے اصحاب ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا رفع الی السمآء اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق

---

[1] واقعات کی یہ تفصیلات تاریخ ابن کثیر جلد ۲ اور کتب تفسیر میں منقول ہیں۔ ۱۲

ثابتہ ہیں وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ اور وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ کی تفسیر میں ان روایت کی تفصیلات کو بھی قبول کرلیں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیر بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امر زائد ہے جو آیات کی تفسیر صحیح کیلئے مؤید ہے۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام

سورۂ آل عمران، مائدہ اور نساء کی زیر بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق حکمت الٰہی کا یہ فیصلہ صادر ہو کہ ان کو بقید حیات ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھالی جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ اٹھا لئے گئے۔ لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حسب موقع ان کی حیات امروز پر نصوص قطعیہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارات کیے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات طویل اور رفع الی السماء میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہل حق کے قلوب تازگی ایمان سے شگفتہ ہو جائیں اور باطل کوش اپنی کور باطنی پر شرمائیں۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ○ (نساء پ ٦ ع ٢٢)

اور کوئی اہل کتاب میں سے باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر اس (عیسیٰ علیہ السلام) کی موت اسے پہلے اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر (اہل کتاب پر) گواہ بنے گا۔

اس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورۂ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اٹھالیا یہ یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید ہے جو انھوں نے اپنے باطل زعم اور اٹکل سے قائم کرلیا تھا ان سے کہا جارہا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کے دعویٰ قابل لعنت ہے کیونکہ بہتان اور لعنت توام ہیں اس کے بعد اس آیت میں امر اول کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جارہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کر رہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام بن مریم علیہا السلام خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پورا کرنے کے لئے کائنات ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہد کے وقت اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔ اور پھر جب وہ اپنی مدت حیات ختم کر کے موت کی آغوش سے دوچار ہو جائیں گے تو قیامت کے دن پر امت (اہل کتاب) پر اسی طرح گواہ ہوں گے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین اپنی اپنی امتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اگر دہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعہ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ میں دونوں کے عقائد کی بنیاد قطعاً متضاد اصول پر قائم ہے، یہود، حضرت مسیح علیہ السلام کو

مفتری اور کاذب کہتے اور دجال[1] سمجھتے ہیں اور اس لئے فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے یسوع مسیح علیہ السلام کا صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مار بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان آدم علیہ السلام گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لئے خدا کی صفت "رحمت" نے ارادہ کیا کہ دنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لے اس کی صفت "رحمت" نے ابنیت (بیٹا ہونا) کی شکل اختیار کی اور اس کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائنات ماضی و مستقبل کے گناہوں کا "کفارہ" بن کر دنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورۂ نساء کی آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے دعوی کی بنیاد کسی بھی عقیدہ پر مبنی ہو لائق لعنت اور باعث ذلت و خسران ہے۔ خدا کے سچے پیغمبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کو بیٹا بنا کر اور "کفارہ" کا باطل عقیدہ تراش کر مسیح علیہ السلام کو مصلوب مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم و حقیقت کے خلاف اٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور مبنی بر حقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد "علم و یقین اور وحی الٰہی" پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لئے جو شک و ظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم و یقین کی روشنی آچکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنون کاسدہ اور اوہام فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحی الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلان حق کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام ملاءِ اعلیٰ سے کائنات ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادل خواستہ یا بادل ناخواستہ اس ذات گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلا شبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں خدا کے بیٹے نہیں برگزیدہ انسان ہیں مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے بقید حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ سورۂ آل عمران اور سورۂ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے لفظ "توفی" نہیں بولا گیا کہ بصراحت لفظ "موت" استعمال کیا گیا ہے یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ان دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اس کے لئے "توفی" ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران سے متعلق آیات کی تشریح و تفسیر میں گذر چکا اور سورۂ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہوگا اور اس جگہ چونکہ براہ راست "موت" ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام بھی كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کا مصداق بننے والے ہیں اس لئے یہاں "موت" کو بصراحت لانا ہی از بس ضروری تھا اور یہ مزید برہان ہے اس دعویٰ کے لئے کہ آل عمران اور مائدہ میں لفظ "موت" کی جگہ "توفی" کا اطلاق بلا شبہ خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر "توفی" کا اطلاق کیا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا جاتا یا

[1]: دجال دجل سے ماخوذ ہے جس کے معنی "فریب" ہیں۔

جس طرح اس جگہ لفظ "موت" کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان دونوں مقامات پر بھی لفظ موت ہی کا استعمال ہونا چاہیے تھا مگر قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیب بیان کے فرق کا فہم طالبین حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے قادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحاب زیغ کا جو اپنی خاص اغراض ذاتی کے پیش نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلہ کی تمام آیات قرآنی کو اس کے سانچہ میں ڈھال کر اس کا نام "تفسیر قرآن" رکھتے ہیں۔

بہر حال جمہور کے نزدیک آیت زیر عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپرد قلم کی جا چکی، مشہور محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مؤرخ، عماد الدین بن کثیرؒ اس تفسیر کو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حسن بصریؒ سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

قتادہ، عبد الرحمٰن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قول حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیل قاطع سے اس کو ثابت کریں گے۔ (انشاءاللہ تعالیٰ) (ابن کثیر جلد اول)

اور سر تاج محدثین ابن حجر عسقلانیؒ بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسی تفسیر پر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے یقین کیا ہے اور ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو ابن جریر نے بروایت سعید بن جبیر اور ابو رجاء نے بھی حسنؒ سے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا "قبل موتہ" یعنی قبل موت عیسیٰ ؑ قسم بخدا بیشک و شبہ حضرت عیسیٰ بقید حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اتریں گے تو سب اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریرؒ نے اسی تفسیر کو اکثر اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریرؒ آسمان سے اتریں گے تو سب اہل علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریرؒ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

(فتح الباری شرح بخاری ج ۶ ص ۳۰۴)

مگر اس صحیح تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں۔ مگر وہ دونوں بلحاظ سند ضعیف اور ناقابل اعتماد اور بلحاظ سیاق و سباق (یعنی آیت زیر بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابل التفات ہیں یعنی ایسے احتمالات عقلی ہیں جو نقل اور آیات کے باہمی نظم و ترتیب کے خلاف ہیں۔

ان ہر دو معنی میں سے ایک معنی یہ ہے کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اس کو حضرت عیسیٰ ؑ کی بجائے اہل کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے "اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰ ؑ پر ایمان نہ لے آتا ہو" یعنی اگرچہ یہود و نصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ سے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے عقیدہ پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں لیکن جب ان کو "موت" آ دباتی ہے تو اس آخری حالت میں "جو نزع کا وقت کہلاتا ہے" صحیح عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہل کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثناء یہی حالت گذرتی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ "اہل کتاب کا ہر ایک فرد اپنی موت سے پہلے محمد ﷺ پر ایمان لے آتا ہے" یعنی جب وہ عالم دنیا سے منقطع ہو کر عالم غیب سے وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اس وقت اس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد ﷺ بیشک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔

پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے اعتبار سے ناقابل اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق وسباق کے خلاف ہیں عقلی نقطۂ نظر سے بھی غلط ہیں۔اس لئے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطور بالا میں نقل کیے گئے تب یہ آیت اپنے مقصد بیان کے خلاف بے معنی اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ قرآن عزیز دوسرے مقامات پر صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالم دنیا سے کٹ کر عالم غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو معاملات اس ساعات سے قبل تک اس کے لئے جو غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اب تبدیلی اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند:

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِئُوْنَ ○ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوْٓا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ○ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ط سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُوْنَ ○ (سورۂ مومن پ ۱۸ ع ۹)

پس جب آئے ان کے پاس پیغمبر واضح دلائل لے کر تو اس چیز خوش ہوئے جو ان کے پاس علم سے تھی اور گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کو وہ مذاق بناتے تھے پس جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک بناتے تھے اس سے منکر ہوئے پس نہیں نافع ہوا ان کا (یہ) ایمان جب انھوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا، یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی اور اس موقع پر کافروں نے زیان پایا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰٓى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولٰٓئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا ○ (نساء پ ٤ ع ٣)

لیکن ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو) برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان میں سے کسی کے آگے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں (ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں ہوئی) اس طرح ان لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت میں جاتے ہیں ان تمام لوگوں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد ﷺ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے انسان جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ ملائکۃ اللہ، عذاب یا راحت جنت و جہنم، غرض دین حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصاریٰ کی ہی خصوصیت کیا ہے یہ حالت تو ہر ایک ابن آدم پر گذرنے والی ہے نیز جب اس قسم کا ایمان قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اسی سلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرق فرعون کے وقت فرعون کے

ایمانی اعتراف و اقرار کے لئے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقعتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ ایسے اسلوب بیان کے ساتھ گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصاریٰ) کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآن کی تصدیق او راس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آجانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا اس کی یہ تصدیق کائنات انسانی کے علم و ادراک سے باہر صرف اس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقع پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزوم و مجرم بنانے کے لئے فیصلۂ حق کی تائید کے لے ماضی اور مستقبل میں کائنات ارضی پر پیش آنیوالے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہو رہا ہے علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لئے بھی گنجائش نہیں ہے کہ غرغرہ کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا محمد ﷺ پر اس قسم کا ایمان تو ہر اس اہل کتاب سے متعلق ہے جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گذر چکے اور مر کھپ چکے ہیں لہٰذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کیلئے مؤکد مستقبل کی یہ تعبیر لیومنن فصاحت و بلاغت کلام کے بالکل خلاف ہے اس کیلئے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو ماضی حال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تاکہ قرآن کا مفہوم اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لئے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات میں یعنی سیاق و سباق میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا ذکر ہی نہیں ہے کیوں کہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور علیہم کی ضمیر ان کی امت تو پھر نبی اکرم ﷺ کا ذکر کیے بغیر درمیان کی ضمیر کا مرجع ذات اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدۂ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشار ضمائر کا موجب ہے

غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔[1]

حیوۃ و نزول عیسیٰ علیہ السلام اور احادیث صحیحہ

قرآن عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی، حیات امروز اور علامت

۱: اس مقام کے علاوہ سورۂ زخرف کی آیت مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اور سورۂ آل عمران کی ابتداء سے بیاسی آیات تک جو وفدِ نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقامات دلالۃ النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لیے دلیل و بُرہان ہیں اور اگرچہ ان کی تفصیلات اور وجود استشہاد میرے پاس مدوّن و مرتّب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، بوقتِ فرصت انشاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیۂ ناظرین ہوگا، اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کی کتاب ''عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام'' اس مقصد کیلئے قابلِ مراجعت ہے۔

قیامت بن کر نزول من السماء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرۂ احادیث نبوی میں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کر کے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے چنانچہ امام حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) میں حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت متعدد طریقہائے سند سے نقل کی ہے۔

قال رسول اللّٰہ ﷺ والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویفیض المال حتی لا یقبله احد وحتی یکون السجدة الواحدة خیر اله من الدنیا ومافیها ثم قال ابو هریرة اقرؤا ان شئتم:

وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (کتاب الانبیاء)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰ علیہ السلام بن مریم حاکم و عادل بن کر اتریں گے وہ صلیب کو توڑیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے (یعنی نشان الٰہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہو گا اور اسلامی احکام میں بارشاد رسول ﷺ جزیہ کا حکم اسی وقت تک کے لئے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہو گی کہ کوئی اس کو قبول کرنے والا نہیں ملے گا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمت رکھے گا (یعنی مالی کثرت کی وجہ سے خیرات و صدقات کے مقابلہ میں عبادت نافلہ کی اہمیت بڑھ جائے گی) پھر ابو ہریرہؓ نے فرمایا اگر تم (قرآن سے اس کے استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو

وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (النساء:۱۵۹)

اور کوئی اہل کتاب میں سے نہ ہو گا مگر (عیسیٰ علیہ السلام کی) موت سے پہلے اس پر (عیسیٰ علیہ السلام پر) ضرور ایمان لے آئیگا اور وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کے دن ان پر گواہ ہو گا۔

۲) بخاری اور مسلم میں بسند نافع مولی ابو قتادہ انصاریؓ حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت بھی منقول ہے۔

قال رسول اللّٰہ ﷺ کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامامکم منکم (کتاب الانبیاء)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تم میں ابن مریم اتریں گے اور اس حالت میں اتریں گے کہ تم ہی میں سے ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہو گا۔

ان دونوں روایات کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ سے متعدد طریقہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین: مسند احمد اور سنن[1] میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں، ان میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلہ زیر بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے مسند احمد میں ہے:

۳) ان النبی ﷺ قال "الانبیاء اخوة لعلات امهاتهم شتّٰی ودینه واحد وانی اولیٰ الناس

۱: ابو داؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ۔

بیعیسیٰ بن مریم لم یکن نبی بینی و بینه انه نازل فاذا رایتموہ فاعرفوہ رجلٌ مربوع الی الحمرۃ و البیاض علیه ثوبان ممصر ان کأن راسه یقطر ان لم یصبه بلل فیدق الصلیب و یقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویدعوا الناس الی الاسلام ویھلك اللّٰه فی زمانه المسیح الدجال ثم تقع الامانة علی الارض حتی ترتع الاسود مع الابل والنمار مع البقر والذئاب والذئاب مع الغنم ویلعب الصبیان بالحیات لا تضرھم فیمکث اربعین سنة ثم یتوفی و یصلی علیه المسلمون"

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "تمام انبیاء اصول دین میں علاتی بھائیوں کی طرح ہیں دین سب کا ایک او فروع دین مختلف اور میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسیٰ علیہ السلام بن مریم سے زیادہ قریب ہوں اس لئے ان کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور بلا شبہ وہ کائنات ارضی پر اتریں گے پس جب تم ان کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا: میانہ قد، سرخ وسپید رنگ ہوگا ان کے جسم پر دو سرخی مائل رنگ کی چادریں ہوں گی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کر کے آ رہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی کی طرح ٹپک پڑنے والے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (موجودہ عیسائیت کا خاتمہ کر دیں گے) اور جزیہ اٹھا دیں گے اور لوگوں کو "اسلام" کی دعوت دیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں تمام ادیان وملل کو مٹا دے گا اور صرف ایک ہی دین "دین اسلام" باقی رہ جائے گا اور اللہ تعالیٰ ان ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کو ہلاک کرے گا پھر کائنات میں "امانت" (امر خیر) جگہ کرلے گی حتیٰ کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے نظر آئیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے اور ان کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، پس عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال اس زمین پر زندہ رہیں گے پھر وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز ادا کریں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی ہے اس میں خروج دجال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مبارک مذکور ہے۔

فاذا جاؤ الشام خرج فبیناھم یعدون للقتال یسرون الصفوف اذا اقیمت الصلوٰۃ فینزل عیسیٰ بن مریم .... الخ

پس جب مسلمان ملک شام پہنچیں گے تو دجال کا خروج ہوگا ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی تیاریاں کر رہے ہوں گے صفیں درست کرتے ہونگے کہ نماز کے لئے اقامت ہونے لگے گی۔ اس درمیان میں عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا اور وہ مسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعانؓ سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے:

اذا بعث اللّٰه المسیح بن مریم علیھما السلام فینزل عند المنارۃ البیضاء الشرقی دمشق بین مھرودتین واضعاً کفیه علی اجنحة ملکین اذا طأطأ رأسه قطر و اذا رفعه تحدر منه جمان کاللؤلؤ .... الخ

(ابھی دجال ایک مسلمان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمائش کر ہی رہا ہوگا) کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم علیہما السلام کو بھیج دے گا وہ جب کائنات ارضی پر اتریں گے تو مسجد دمشق کے مشرقی جانب کے سپید منارہ پر اتریں گے اور ان کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں ہوں گے (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیریں حصہ، بدن پر لپٹی ہوں گی) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لئے ہوں گے جب سر جھکائیں گے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگے گا اور جب سر اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکیں گے (یعنی غسل کیے آرہے ہوں گے)

اور مختلف طریقہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی (رحمہ اللہ) نے سنن میں حضرت مجمع بن حارثہؓ سے بسند صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

یقتل ابن مریم الدجال بباب لد[1]

ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔

امام ترمذی اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں هذا حديث صحيح اور اس کے بعد ان حضرات صحابہؓ کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزول عیسیٰ علیہ السلام بن مریم اور ان کے ہاتھوں قتل دجال سے متعلق روایات کتب حدیث میں منقول ہیں فرماتے ہیں۔

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عینیہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابوہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ باہلی، ابن مسعود عبداللہ بن عمرو بن العاص، سمرۃ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف حذیفہ بن الیمانؓ سے بھی روایت منقول ہیں۔ (ترمذی باب نزول عیسیٰ بن مریم)

اور امام احمدؒ نے مسند میں امام مسلمؒ نے صحیح میں اور اصحاب نے سنن میں، بروایت حضرت حذیفہ بن اسیدی، نبی اکرم ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے:

قال اشرف علينا رسول الله ﷺ من غرفة و نحن نتذكر الساعة فقال:

لا تقوم الساعة حتى تروا عشر ايات: طلوع الشمس من مغربها و الدخان و الدابة و خروج ياجوج و ماجوج و نزول عيسىٰ بن مريم، و الدجال و ثلثة خسوف خسف بالمشرق و خسف بالمغرب و خسف بجزيرة العرب و نار تخرج من قعر عدن تسوق و تحشر الناس تبيت معهم حيث باتوا و تقيل معهم حيث قالوا۔[2]

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے بالاخانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا "قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لوگے آفتاب کا مغرب سے طلوع، دخان (دھواں) دابۃ الارض، خروج یاجوج وماجوج، عیسیٰ بن

---

[1] شہر دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔

[2] اس حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں مگر یہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لیے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر و حدیث میں شاہ رفیع الدین دہلوی نور اللہ مرقدہ کے رسالہ "علامت قیامت" میں قابل مطالعہ ہیں۔

مریم کا نزول، دجال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا۔ (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں آگ کا قعر عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائے گی اور جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ بھی ٹھہر جائے اور جب دوپہر کو قیلولہ کریں گے تب بھی وہ ٹھیری رہے گی۔

اور محدث ابن حاتم نے اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن جریر طبریؒ نے بروایت حسن بصریؒ بسند صحیح حیات و نزول بن مریم سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اس میں ہے:

قال رسول اللہ ﷺ للیھود ان عیسیٰ لم یمت و انه راجع الیکم قبل یوم القیمة

رسول اللہ ﷺ نے یہود سے فرمایا: "عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے پہلے تمہاری جانب لوٹ کر آئیں گے۔

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن جریر (رحمہما اللہ) نے سورۂ نساء کی آیات متعلقہ وفد نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصول حدیث کے نقطہ نظر سے بہ سند حسن ایک طویل روایت ربیع بن انسؓ سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے:

فقال لھم النبی ﷺ الستم تعلمون ان ربنا حی لا یموت و ان عیسیٰ یأتی علیه الفناء۔ (تفسیر ابن جریر ج ۵)

نبی اکرم ﷺ نے وفد سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس کے لئے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ علیہ السلام کو فنا (موت) سے دوچار ہونا ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ نے اس جگہ لفظ "یأتی" فرمایا ہے جو مستقبل کے لئے بولا جاتا ہے لفظ "اتی" نہیں فرمایا جو ماضی کے لئے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسناد حسن و صحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں ان میں نزول عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ "من السماء" کا لفظ بصراحت موجود ہے۔ (کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۴۰۱ و کنز العمال ج ۷ ص ۲۶۸)

یہ اور اسی قسم کا کثیر ذخیرۂ حدیث ہے جو حیات نزول عیسیٰ بن مریم پیغمبر بنی اسرائیل (علیہ الصلوۃ و السلام) سے متعلق کتب حدیث و تفسیر میں منقول ہے اور جو قوت سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبار شہرت و تواتر روایت جن کا یہ حال ہے کہ حسب تصریح امام ترمذی، حافظ حدیث عماد الدین بن کثیر، حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر ائمہ حدیث اور سولہ جلیل القدر صحابہؓ نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ تصریحات سینکڑوں صحابہؓ کے مجمع میں خطبہ دے کر فرمائیں اور یہ صحابۂ کرامؓ بغیر کسی انکار واجنبیت کے ان روایات کو خلفاء راشدینؓ کے دور خلافت میں علی رؤس الاشھاد سناتے تھے چنانچہ ان جلیل القدر صحابہؓ سے جن ہزار رہا شاگردوں نے سنا ان میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابل ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایت حدیث میں ضبط و حفظ ثقاہت علمی تجربے کے پیش نظر امامت و قیادت کا درجہ رکھتا ہے مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابو قتادہ، حنظلہ بن علی الاسلمی، عبد الرحمن بن آدم، ابو سلمہ، ابو عمرہ، عطاء بن یسار، ابو سہیل، موثر بن غفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نضیر، عروہ بن

مسعود ثقفی، عبد اللہ بن زید انصاری، ابوزرعہ، یعقوب بن عامر، ابو نصرہ ابو الطفیل (رحمہم اللہ)۔

پھر ان علماء کبار اور محدثین اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سنا ان میں سے راویان حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علوم قرآن کا رتبہ بلند حاصل ہے اور جو اپنے اپنے وقت کے امام الحدیث اور امیر المومنین فی الحدیث تسلیم کیے گئے ہیں بعض کے اسماء گرامی یہ ہیں: ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی، قتادہ، عبد الرحمٰن بن ابی عمرہ، سہیل، جبلہ بن سہیم، علی بن زید، ابو رافع عبد الرحمٰن بن جبیر نعمان بن سالم، معمر عبد اللہ بن عبید اللہ (رحمہم اللہ)۔

غرض ان روایات و احادیث صحیحہ کا صحابہ تابعین تبع تابعین یعنی خیر القرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہو چکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائق قبول ہو چکی تھیں کہ ائمہ حدیث کے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و نزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم و معنی کے لحاظ سے درجہ "تواتر" حاصل تھا اور اسی لئے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو احادیث متواترہ سے ثابت اور مسلم کہتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ روایت حدیث کے تمام طبقات و درجات میں ان روایات کو "تلقی بالقبول" کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں "ائمہ حدیث" اور روایت حدیث کے "مدار" نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع و موقوف بر صحابہ رضی اللہ عنہم احادیث اور روایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ جیسے اصحابِ صحیح و سُنن، آئمہ حدیث کے اسماءِ گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت و حسن کے قائل ہیں، چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیث صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث و مفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں اول یہ عنوان قائم کرتے ہیں:

ذکر الاحادیث الواردۃ فی نزول عیسیٰ بن مریم علیہما الصلوۃ والسلام الی الارض من السماء فی آخر الزمان قبل یوم القیمۃ۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اول ص ۵۸۳،۵۷۸)

ان احادیث کا ذکر جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے آسمان سے زمین پر اترنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

فھذہ احادیث متواترۃ عن رسول اللہ ﷺ من روایۃ ابی ھریرۃ و ابن مسعود و عثمان بن العاص و ابی امامۃ والنواس بن سمعان و عبد اللہ بن عمرو بن العاص و مجمع بن حارثۃ وابی شریحۃ و حذیفۃ بن اسید رضی اللہ عنھم و فیھا دلالۃ علی صفۃ نزولہ و مکانہ ....الخ (تفسیر ابن کثیر جلد اوّل ص ۵۸۳ و ۵۷۸)

پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول ﷺ سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور یہ نقلِ روایت (آپ ﷺ کے صحابہ) ابوہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن العاص، ابوامامہ، نواس بن سمعان، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، مجمع بن حارثہ، ابی شریحہ، حذیفہ بن اسیدؓ سے ثابت ہے اور ان روایات میں عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کے طریقۂ نزول اور مکان نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔

ظ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہ) علامہ ابوالحسین آبری (رحمہ اللہ) سے نزول عیسیٰ علیہ السلام

سے متعلق احادیث کے تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

قال ابو الحسن الخسعی الابری بان المھدی من ھذہ الامۃ و ان عیسیٰ یصلی خلفہ............الخ

ابوالحسن خسعی ابری سے منقول ہے کہ احادیث رسول اس بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی امت میں ہوں گے اور عیسیٰ ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔

اور تلخیص الحبیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

و اما رفع عیسیٰ فاتفق اصحاب الاخبار و التفسیر علی انہ ببدنہ حیًّا

لیکن رفع عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ تو تمام علماء حدیث و تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسد عنصری کے ساتھ ہنوز زندہ ہیں (اور وہی قریب قیامت نازل ہوں گے)۔

اور محدث عصر محقق وقت علامہ سید محمد انور شاہ عقیدۃ الاسلام" میں اس "تواتر" کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں۔

وللمحدث العلامۃ الشوکانی رسالۃ سماھا التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح ذکر فیھا تسعۃ و عشرین حدیثا فی نزولہ علیہ السلام ما بین صحیح و حسن و صالح ھذا و ازید منہ مرفوع و اما الآثار فتفوت الاحصاء الخ۔[1]

اور محدث علامہ شوکانی نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے جس کا نام یہ رکھا ہے "التوضیح فی التواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح" اس رسالہ میں انھوں نے انتیس احادیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے متعلق نقل کی ہیں جو اصول حدیث کے لحاظ سے صحیح، حسن، صالح تینوں درجات کو شامل ہیں اور مرفوع احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود ہیں اور آثار صحابہؓ تو بے شمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی اور حیات نزول من السماء پر امت محمدیہ علیہا الصلوٰۃ و السلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے چنانچہ علم عقائد و کلام کی مشہور و مستند کتاب عقیدۂ سفارینی میں امت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے:۔

و منھما ای من علامات الساعۃ العظمی العلامۃ الثالثۃ ان ینزل من السماء سید (المسیح) عیسیٰ بن مریم (علیھما السلام) ونزولہ ثابت بالکتاب والسنۃ و اجماع الامۃ واما الاجماع فقد اجمعت الامۃ علیٰ نزولہ ولم یخالف فیہ احد من اھل الشریعۃ وانما انکر ذٰلک الفلاسفۃ والملاحدۃ مما لا یعتد بخلافہ۔[2]

اور علامات قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ حضرت مسیح (عیسیٰ بن مریم علیہما السلام) آسمان سے اتریں گے اور ان کا آسمان سے اترنا کتاب (قرآن) سنت (حدیث) اور اجماع امت سے قطعاً ثابت ہے (قرآن

---

[1] صفحہ ۴ حضرت استاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے، عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء و طلبہ دونوں کے لیے لائق مطالعہ ہے۔ مصنف قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چین ہے۔

[2] حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ کریں۔

وحدیث سے نزول ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماع امت کا تعلق ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پرامت کا اجماع ہے اور اس بارہ میں پیروانِ شریعت اسلامی میں سے کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں مُلحدوں نے نزولِ عیسیٰ کا انکار کیا ہے اور اسلام میں ان کا انکار قطعاً بے وقعت ہے۔

حیات و نزول مسیح علیہ السلام کی حکمت

گذشتہ سطور میں حیات و نزول مسیح علیہ السلام کو دلائل و براہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالب حق کو علم یقین عطا کرتے ہیں اب مزید طمانیت قلب کے لئے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علماء حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہر حال پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقل انسانی کے لئے ناممکن ہے اور مخلوق، خالق کائنات کے سر اور حکم پر عبور بھی کیسے کر سکتی ہے؟ تاہم علماء امت فراست مومن اور علم حق کی راہ سے دین اور احکام دین کے اسرار و مصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق آئیں ہیں۔

اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دور اول میں علم الاسراء کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہؓ کو حاصل تھا اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماء ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفہ اموی عمر بن عبدالعزیز، امام ابو حنیفہ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، روحی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہر حال حکمت کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اس لئے زیر بحث مسئلہ میں بھی "حکمت و مصلحت" کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہیے واللہ اعلم بالصواب و لکل شئ عندہ فصل الخطاب۔

۱) یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشینگوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں "مسیح ہدات" اور "مسیح ضلالت" کہہ کر رفع کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادۂ قتل ہو گئے اور چونکہ قتل انبیاء ان کا دستور رہا تھا اس لئے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

۲: صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ کے تین زمانوں کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے کیونکہ نبی معصوم ﷺ نے ان تینوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم

سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر ان لوگوں کا اس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر اُن کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں۔

اور اس کے بعد فرمایا: "پھر جھوٹ کی کثرت ہو جائے گی"

یعنی ان ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دینی انحطاط پیدا ہو جائے گا اور اسلامی خصوصیات اخلاق [illegible]ٹ جائے گی۔

طرح ان کے قتل کے بھی قائل ہو گئے تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسیح ضلالت (دجال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسیح ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں کیونکہ مذہبی تعلیم کے پیش نظر ان پر مسیح ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسیح ہدایت کو مسیح ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسیح ضلالت کو ہی اس دعوے کے مطابق مسیح ہدایت تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر مشیت الٰہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسیح ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہو گا اور وہ اول خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے بعد مسیح ہدایت بنے گا اس لئے اس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہیے جو دور فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہو گا اس لئے حکمت الٰہی کا یہ بھی منشاء ہوا کہ "مسیح ہدایت" کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچا لیا جائے کہ وہ اس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آ پہنچے کہ مسیح ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسیح ہدایت ملاء اعلیٰ سے کائنات ارضی پر اترے اور یہود بنی اسرائیل کو جو کہ بہ تعداد کثیر مسیح ضلالت کے پیرو ہو رہے ہوں گے اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کرلیں اور جب مسیح ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسیح ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا حق الیقین بن کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے اور اس طرح قبول حق کے ماسوا ان کے لئے دوسرا چارہ کار باقی ہی نہ رہے اور یا پھر وہ بھی مسیح ضلالت کے ساتھ "فی النار" کر دیے جائیں۔

نیز یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو بھی قتل کرنے سے ہاتھ نہیں روکا لیکن حضرت موسیٰ ﷺ کے بعد یہود نے جن انبیاء کے خون ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف "نبی" ہی تھے جو علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا مصداق تھے مگر کوئی صاحب شریعت رسول ان کے اس قتل ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لئے یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریم علیہم السلام) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل تیاری کر لی تھی تب مشیت حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح ہدایت کو اس طرح بچا لیا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسیح بن مریم علیہم السلام پر دسترس نہ پا سکے لہٰذا فیصلہ مشیت بروئے کار آیا او رحضرت مسیح ﷺ کو ملاء اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور تمام دنیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن و گمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گو اپنی بات رکھنے کے لئے مشہور یہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریم کو قتل کر دیا۔ ادھر متبعین مسیح ہدایت (نصاریٰ) کی بدبختی دیکھئے کہ کچھ عرصہ کے بعد پولوس رسول نے ان میں عقیدۂ تثلیث و کفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گھڑے ہوئے افسانہ صلیب کو بھی داخل عقیدہ کر دیا اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلا ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہم السلام صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیے گئے تب قرآن عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرت مسیح ﷺ کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو دو الگ الگ رخ اختیار کیے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا ان سب کے متعلق علم یقین کے ذریعہ حقیقت حال کو واشگاف اور دونوں کی گمراہی کو واضح کر کے قبول حق کے لئے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے

انکار کر دیا اور حضرت مسیح علیہ السلام سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کن عقیدہ پر قائم رہے مگر عالم الغیب والشہادہ چونکہ ان حقائق کا ان کے وقوع سے قبل عالم و دانا تھا، اسلئے اس کی حکمت کا یہ تقاضہ ہوا کہ مسیح ہدایت کو کائنات ارضی پر اس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیح ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تاکہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقت حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرت الٰہی کے کرشمے کی بدولت وہ بقید حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سر تا پا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سر بلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآن عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں ''ایمان حق'' کو برضاء و رغبت اختیار کر لیں اور اپنے باطل عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہل باطل بھی کریں گے اس لئے وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح احادیث صحیحہ کے مطابق اس زمانہ میں کائنات ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہو گا اور وہ ''اسلام'' ہو گا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

ادیان و ملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور معاندین حق کے درمیان ''سنۃ اللہ'' یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبر کو ایذا دی اور ان کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور ہجرت کر جائیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے پیغمبر وہ ہیں جنہوں نے قوم[1] کے سامنے یہ اعلان کیا اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرما گئے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور ہجرت کے بھی آڑے آئے اس لئے وہ بحر قلزم میں غرق کر دیے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئی کہ جب قریش مکہ نے اذیت تمسخر دین حق کے ساتھ تصادم اعمال دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیت الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرشمۂ قدرت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

''سنت اللہ'' کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور ان کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ اور ان کی دعوت حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندین حق اور دشمنان دین اپنے پیغمبروں کے

۱: یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم نہیں تھی اسلئے کہ یہ بنی سام (سامی) تھے اور نمارودۂ عراق اور ان کی قوم بنی حام (حامی) تھے۔

ساتھ کرتے رہے تھے اور ان میں ایک یہ خصوصیت زیادہ تھی کہ وہ حضرت مسیح سے قبل چند انبیاء کو قتل تک کر چکے تھے اور اب حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے درپے تھے اسی کے ساتھ یہ مسطورۂ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہیے کہ یہود مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت دو مسیح کے منتظر تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن مریم کو مسیح ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیح ہدایت کے منتظر ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ہجرت کائنات ارضی کی بجائے ملاء اعلیٰ کی جانب ہو تاکہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیح ہدایت کو سمجھیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلۂ حق کو صداقت و حقانیت کو دیکھ کر دین حق "اسلام" کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیم قرآن کی صداقت پر یقین واعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورت حال ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے درمیان دعوت و تبلیغ حق اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت و مخالفت اور پھر اس کے نتائج و ثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا دونوں کی قوموں نے سازش قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا قدرت حق کے کرشمۂ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا دونوں کے لئے ہجرت کا معاملہ پیش آیا البتہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت چونکہ بعثت عامہ تھی اور اس کی دعوت و تبلیغ کے لئے ذات اقدس ﷺ کا کرۂ ارضی پر قیام مسلسل ضروری تھا، اس لئے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم علیہما السلام چونکہ قوم کو دعوت حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصد عظیم کے پیش نظر ان کا مدت مدید کے بعد کائنات ارضی پر موجود ہونا ضروری تھا اس لئے ان کو ہجرت ارضی کی بجائے ہجرت سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم ﷺ نے اپنے زمانہ کے قائد ضلالت امیہ بن خلف کو اپنے حربہ سے قتل کیا عیسیٰ بن مریم علیہم السلام بھی قوم کے مسیح ضلالت دجال کو قتل کریں گے اور جس طرح نبی اکرم ﷺ کو ہجرت کے بعد آپ کے وطن مکہ پر قدرت حق نے اقتدار عطا فرمادیا، عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کا نزول بھی شام ہی کے اس مشہور شہر میں ہوگا جس سے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بناء پر ملاء اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے ملک پر یہود کے علی الرغم ان کی حکومت ہوگی۔ (خلاصہ از عقیدۃ الاسلام)

۳) حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے قتل انبیاء علیہم السلام نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنادیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ نبی صادق ہے یا متنبّی کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے فقیہ کاذب قرار دیدیں وہ واجب القتل ہے چنانچہ اسی زعم باطل میں انھوں نے عیسیٰ بن مریم علیہم السلام کو مسیح ضلالت کہا اور ان کے فقیہوں نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا حالانکہ یہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغام حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مردہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈال دی تھی تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے بنی اسرائیل کے اس زعم باطل کو پاش پاش کر دیا جائے اور دکھایا جائے کہ رب

العالمین خالق کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کر لے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعہ کائنات بھی اس پر دسترس نہیں پاسکتی چنانچہ ید قدرت نے اس وقت اس مقدس ہستی کو کو جسد عنصری کے ساتھ ملاءاعلیٰ کی جانب اٹھالیا جبکہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اس کی حفاظت جان کے تمام وسائل دنیوی مسدود کر دیے تھے۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کر دی وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل و عدم قتل کے متعلق حق و باطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصاریٰ کے باہم واقعہ صلیب و قتل پر اتفاق کے باوجود باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی۔

یہود قتل و صلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ "مسیح ضلالت" تھے اور نصاریٰ وجہ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لئے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امر حق" کو واضح اور مسیح بن مریم علیہم السلام سے متعلق حقیقت حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا قدرت حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم علیہم السلام ہی وقت موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر دیں اور یہود و نصاریٰ کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیان اہل کتاب کو شرک و باطل کی پیروی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور خدا کی حجت ان پر تمام ہو جائے نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہست و بود کے لئے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ہے ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ، ﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ﴾ اور یہ ظاہر ہے کہ ملاءاعلیٰ ور عالم قدس مقام موت نہیں ہے بلکہ مقام حیات ہے اس لئے از بس ضروری ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہم السلام بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لئے کائنات ارضی پر اتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کی سپرد ہو اس لئے "حیات و رفع" کے بعد "نزول ارضی" مقدور ہوا۔ (فتح الباری ج۱)

علماء حق نے حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو "اسرار و حکم" بیان فرمائے ہیں یہاں ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس لئے مختصر چند حکمتوں کا ذکر کر دیا گیا ورنہ محدث عصر علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہ نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ عقیدہ الاسلام میں سپرد قلم فرمایا ہے جو لائق مطالعہ ہے حضرت استاد نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایۂ بیان میں کائنات عالم کو "انسان کبیر" اور انسان کو "عالم صغیر" قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت جو بحث فرمائی ہے اس سے حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع اور قربِ قیامت میں کائناتِ ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لیے اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس مبحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:-

۴: قرآن عزیز میں "میثاقِ انبیاء" سے متعلق یہ ارشادِ باری ہے:

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ قَالُوْٓا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَأَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشَّاهِدِيْنَ ○

(سورۂ آل عمران پ ۳ ع ۹)

اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب کہ اللہ نے نبیوں سے (یہ) عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے) کتاب اور حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک رسول (محمد ﷺ) آئے جو تصدیق کرتا ہو ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں ضرور تم اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں، "ہم نے اقرار کیا" اللہ نے کہا: پس تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

آل عمران کی ان آیات میں حسبِ تفسیر حضرت ابنِ عباس[1] رضی اللہ عنہما اس عہد و پیمان کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے متعلق انبیاء و رسل علیہم السلام سے لیا، قرآن کے اسلوبِ بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء و رسل کی معرفت ان کی امتوں سے تھا کہ ان میں سے جو امتیں خاتم الانبیاء ﷺ کا زمانۂ مبارک پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور دعوتِ حق میں ان کی نصرت و یاوری کریں چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں تعلیم حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور ان میں سے اہلِ حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور ان پر ایمان لائیں گے اور پیغام حق میں ان کی مدد کریں گے۔

تو یہ "میثاق النّبیین" اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اول مخاطب حضراتِ انبیاء و رسل تھے اس لیے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء و رسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہر کر کے دکھائے تاکہ یہ خطاب اولین براہِ راست بھی مؤثر ثابت ہو مگر "ثم جاء کم رسول" بقاعدۂ عربیت خطاب تھا ان تمام انبیاء و رسل سے جو ذاتِ اقدس ﷺ سے پہلے اس کائناتِ ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد ﷺ کی صفت "خاتم النّبیین" اور ازل سے مقدر "میثاق النّبیین" کا اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاءِ سابقین میں کوئی ایک پیغمبر بعثت محمد ﷺ کے بعد نزول فرمائیں اور وہ اور ان کی امت دنیاءِ انسانی کے سامنے خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لائیں اور "دینِ حق" کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تاکہ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کا وعدۂ حق پورا ہو۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء و رسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد ﷺ کی بشارات دیے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذاتِ اقدس

---

[1] عن علی و ابن عباس فی تفسیر ایة " ما بعث اللّٰه نبیاً من الانبیاء الاأخذ علیه المیثاق لئن بعث اللّٰه محمداً و هو حی لیؤمنن به ولینصرنه و امره ان یأخذ المیثاق علی امته لئن بعث محمد و هم احیاء لیؤمنن به ولینصرنه۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کیلئے مبعوث فرمایا تو اس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس وقت زندہ ہو جبکہ محمد ﷺ کی بعثت ہو گی تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی امتوں سے بھی یہی عہد و پیمان لیں کہ ان میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔

ﷺ کی بعثت کے لیے تمہید اور براہِ راست منادِ اور مُبشِّر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

إِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِي مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ

اور حقیقت یہ ہے کہ خاتم انبیاءِ بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء والرسل ﷺ کی بعثت کا ''منادِ اور مبشّر'' ہو اس لیے حکمت ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ میثاق النّبیین کے وقار کے لیے ان ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیاء ورسل کی نمائندگی کریں تاکہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہِ راست انبیاء ورسل کی جانب سے وفاءِ عہد کا عملی مظاہر ہو سکے، اسی حقیقت کے پیشِ نظر نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

''انا اولی الناس بعیسیٰ ابن مریم و الانبیاء اولاد علات لیس بینی و بینه نبیّ''

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کے وعدۂ الٰہی نے رہتی دنیا تک اس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لیے تدریجی طور پر کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدتِ طویل تک اپنا کام کرتے رہیں گے اور اس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور طاعت ربانی کے لیے مشتعل کرنے کے لیے ''علماءِ امت''انبیاءِ بنی اسرائیل کی طرح خدمتِ حق انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جب بعثت محمد ﷺ کو گذرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائے گا اور امتِ مرحومہ کے عملی قویٰ اور اجتماعی اعضاء میں انتہائی اضمحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ان کی بیداری اور تیز روی کے لیے صرف علماءِ حق کی روحانیت ہی کافی ثابت نہیں ہوگی وہ وقت اس کا متقاضی ہوگا کہ کوئی ''قائم بالحجۃ'' ان کو سنبھالے اور اس لیے مشیت الٰہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی (عیسیٰ بن مریم علیہما السلام) انبیاء ورسل کے میثاقِ ازل کی نمائندگی کے لیے مامور ہے اس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ امت محمد ﷺ کے درمیان رہ کر ذات اقدس کی نیابت اور امت کی امامت کا فرض انجام دے اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے۔

اب کرشمۂ قدرت دیکھیے کہ ازل کے ان مقدرات نے جو کہ ملاءِ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائناتِ ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی؟ اور بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لیے سازش مکمل کر چکے ہیں، شاہی دستہ چہار جانب سے مکان کو محصور کیے ہوئے ہیں، مگر قدرتِ حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ ان کو محفوظ وہاں نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں ''ہجرت'' کر دیتی، نہیں بلکہ ہوا یہ کہ ان کو ملاءِ اعلیٰ کی ہجرت کے لیے محفوظ و مامون زندہ اٹھالیا اور سازش و محصور کرنے والوں کو ظن وریب کی دلدل میں پھنسا کر ان کو خسر الدنیا و الآخرۃ کا نشان عطا کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو ''میثاق النّبیین'' کی نمائندگی کے لیے موزوں تھا، یہی وہ حقیقت ہے جس کو زبانِ وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا:

والذی نفسی بیده لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکما عدلا

اور اسی کو نصِ قرآن نے یوں واضح کیا:

وَاِنَّهٗ لَعِلْمُ السَّاعَةِ

پھر یہ ہستی میثاق انبیاء و رسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کرے گی کہ جب اس کا نزول ہو گا تو اس کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیق قرآن اور تازگی ایمان سے روشن ہو جائیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہِ مستقیم صرف "اسلام" ہی ہے، اور مخبرِ صادق کی جس طرح یہ "خبر" صادق نکلی عالم غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح اور بلاشبہ حق ہیں، اور نصاریٰ بحیثیت قوم اپنے باطل عقیدۂ "تثلیث" و "کفارہ" پر نادم و شرمسار ہوں گے اور قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کو اپنے لیے راہِ نجات اور راہِ سعادت یقین کریں گے اور یہود جب مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت کے معرکۂ حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں گے اور مسیح ہدایت کے نزول سے اپنے دعوئے قتل و صلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پالیں گے تو اب ان کو بھی "ایمان بالحق" کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا اور مسیح ضلالت کے رفقاء کے علاوہ وہ سب ہی "مسلم" بن جائیں گے یہی ہے قرآن کی وہ خبرِ صادق:

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ

مسلمانوں میں ایمان کی تازگی و شگفتگی، نصاریٰ اور یہود میں تبدیلی عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زبردست روحانی اثرات کار فرما ہوں گے اور نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح وحی ترجمان، حامل قرآن محمد ﷺ کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا:

ویدعوا الناس الی الاسلام و یهلك الله فی زمانه الملل کلها الا الاسلام و یهلك الله فی زمانه الدجال ۔

اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہو گیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ کا خصوصی شرف "خاتم النّبیین" باقی نہ رہتا اور دوسری طرف "میثاق النّبیین" کے خطاب اولین کا عملی مظاہر عالم وجود میں نہ آتا، کیونکہ وہ ہستی بہر حال محمد ﷺ کی امت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابقہ نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرفِ خصوصی "خاتم النّبیین" کے لیے بھی قادح نہیں ہے اور میثاق النّبیین "کو بھی پورا کرتی ہے۔

واقعاتِ نزول صحیح احادیث کی روشنی میں

گذشتہ صفحات میں نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور ان سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:۔

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذاتِ باری کے ماسوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا وقوع اچانک ہو گا،

وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ

اور قیامت کو علم خدا ہی کو ہے

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

حتیٰ کہ ان پر اچانک قیامت کی گھڑی آجائے گی

لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً

قیامت ان پر نہیں آئے گی مگر اچانک

اور حدیث جبرئیل میں ہے "ماالمسئول عنها باعلم من السائل" (آپ ﷺ نے کہا) "قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں، جواجمالی علم آپ کو ہے اُسی قدر مجھ کو بھی ہے"۔ اور ایک اور حدیث میں ہے:

سمعت رسول ﷺ يقول قبل ان يموت بشهر: تساء لون عن الساعة و انما علمها عند الله۔

تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے

البتہ قرآن عزیز اور احادیثِ صحیح نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب پیش آئیں گی اور ان سے صرف اس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، انِ "اشراطِ ساعت" میں سے ایک بڑی علامت حضرتِ مسیح علیہ السلام کا ملاءِ اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں:-

"مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکۂ جنگ بپا ہو رہا ہو گا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سُلالۂ رسول ﷺ میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہو گی جس کا لقب "مہدی" ہو گا۔ اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں مسیحِ ضلالت "دجال" کا خروج ہو گا، یہ نسلاً یہودی اور یک چشم ہو گا، کرشمۂ قدرت نے اس کی پیشانی پر (ک، ا، ف، ر) کافر لکھ دیا ہو گا جس کو اہل ایمان فراستِ ایمانی سے پڑھ سکیں گے اور اس کے دجل و فریب سے جدا رہیں گے۔ یہ اول خدائی کا دعویٰ کرے گا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائے گا، مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصہ کے بعد "مسیح ہدایت" ہونے کا مدّعی ہو گا، یہ دیکھ کر یہود بکثرت بلکہ قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں گے، اور یہ اس لیے ہو گا کہ یہود، مسیحِ ہدایت کا انکار کر کے ان کے قتل کا ادعاء کر چکے ہیں اور مسیح ہدایت کی آمد کے آج تک منتظر ہیں، اسی حالت میں ایک روز دمشق (شام) کی مسجد جامع میں مسلمان منہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہوں گے، نماز کے اقامت ہو رہی ہو گی اور مہدی موعود امامت کے لیے مصلے پر پہنچ چکے ہوں گے، کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کر لے گی، مسلمان آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے تو سپید بال چھایا ہوا نظر آئے گا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہو گا کہ عیسیٰ علیہ السلام دو زرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازؤں پر سہارا دیے ہوئے ملاءِ اعلیٰ سے اتر رہے ہیں، فرشتے ان کو مسجد کے منارۂ شرقی پر اتار دیں گے اور واپس چلے جائیں گے، اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق کائناتِ ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جائے گا اور وہ عام قانونِ فطرت کے مطابق صحن مسجد میں اترنے کے لیے سیڑھی کے طالب ہوں گے، فوراً

تعمیل ہو گی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آ کھڑے ہوں گے، مسلمانوں کا امام (مہدی موعود) ازراہِ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے امامت کی درخواست کرے گا، آپ فرمائیں گے کہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس لیے تم ہی نماز پڑھاؤ، فراغت نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرتِ مسیح علیہ السلام کے ہاتھوں میں آجائے گی اور وہ حربہ لے کر مسیح ضلالت (دجال) کے قتل کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور شہر پناہ سے باہر اس کو بابِ لُد پر مقابل پائیں گے، دجال سمجھ جائے گا کہ اس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آ پہنچا، اس لیے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح پگھلنے لگے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اس کو قتل کر دیں گے اور پھر یہود، دجال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائیں گے وہ اور عیسائی سب "اسلام" قبول کر لیں گے اور مسیحِ ہدایت کی سچی پیروی کے لیے مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئیں گے، اس کا اثر مشرک جماعتوں پر بھی پڑے گا اور اس طرح اس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یاجوج و ماجوج کا خروج ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں گے، حضرت مسیح علیہ السلام کا دورِ حکومت چالیس سال[1] رہے گا اور اس درمیان وہ ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور ان کے دورِ حکومت میں عدل وانصاف اور خیر و برکت کا یہ عالم ہو گا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے اور بدی اور شرارت کے عناصر دب کر رہ جائیں گے۔

(ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر فی تاریخہ)

وفات مسیح علیہ السلام

چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی طویل حدیث میں ہے:

فیکمث اربعین سنة ثم یتوفیٰ و یصلّی علیه المسلمون و یدفنونه۔[2]

پھر وہ کائنات ارضی پر اتر کر چالیس سال قیام کریں گے اور اس کے بعد وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی نماز پڑھیں گے اور اس کو دفن کریں گے۔

اور ترمذی نے بسند حسن محمد بن یوسف بن عبد اللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبد اللہ بن سلامؓ سے یہ روایت نقل کی ہے:

قال مکتوبٌ فی التوراة صفة محمد و عیسیٰ ابن مریم یدفن معه۔

۱: اور مسلم میں ہے کہ دورِ حکومت سات سال رہے گا۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب مسیح علیہ السلام کا رفع سماوی ہوا اُس وقت ان کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سات سال مزید بقیدِ حیات رہیں گے، اس طرح کائنات ارضی میں کل مدتِ حیات چالیس سال ہو جائے گی۔

۲: اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، امام احمد نے مسند میں، ابو داؤد نے سنن میں ابن جریر نے تفسیر میں اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے ۱۲۔

عبداللہ بن سلامؓ نے فرمایا، تورات میں محمد ﷺ کی صفت (حلیہ و سیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ان کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا

سورۂ مائدہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر آخر سورۃ بھی ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اول قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام ان کی امتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایت ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے خدایا! آج کا دن تو نے اس لئے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائق امور کے پیش نظر فیصلہ سنائے اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سوا کوئی نہیں اس لئے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تو علام الغیوب ہے اس لئے تو ہی سب کچھ جانتا ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝

وہ دن (قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کرے گا پھر کہے گا تم (اپنی اپنی امتوں کی جانب سے) کیا جواب دیئے گئے؟ وہ (پیغمبر) کہیں گے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے۔

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا "لا علم لنا" فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہوگا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ در حقیقت اپنی امتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ کذب بیانی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جانب اس عمل بد کی نسبت ناممکن ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورۂ بالا حقیقت کے ہی پیش نظر ہوگا ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اس کے لئے خود قرآن عزیز ہی شاہد عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں پر شہادت دیں گے کہ ہم نے ان تک خدا کا پیغام پہنچادیا تھا اور یہ کہ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یوں کہا جائے گا کہ پاس ادب کے طریقہ پر اول انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو مائدہ میں مذکور ہے لیکن جب ان کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں گے تب وہ شہادت دیں گے

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝

پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن) جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے (یعنی اس کے پیغمبر کو طلب کریں گے جو اپنی امت کے اعمال واحوال پر گواہ ہوگا) اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لئے طلب کریں گے۔

وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ

اور لائے جائیں گے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا جائے گا ان لوگوں کے درمیان اچھائی اور برائی کا حق کے ساتھ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی "لا علم لنا" کی ہی تفسیر فرمائی ہے۔

عن ابن عباس یوم یجمع اللّٰہ (الآیۃ) یقولوا لرب عزوجل لا علم لنا الا علم انت اعلم به منا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ آیت یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ (الآیہ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں انبیاء علیہم السلام رب عزوجل سے عرض کریں گے ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ جس کے متعلق تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔

اور شیخ المحققین علامہ انور شاہ (رحمہ اللہ) آیت کے جملہ "لَا عِلْمَ لَنَا" کو علم حقیقی کے انکار پر "محمول کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے "ظن" کے درجہ سے آگے "علم" تک نہیں پہنچتا اسی بناء پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، نحن نحکم با لظواھر واللّٰہ متولی السرائر "ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے نیز ایک دوسری حدیث میں ہے ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لئے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا وہ بلا شبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرے گا۔ (عقیدۃ الاسلام ص ۱۶۵)

بہر حال قرآن عزیز، احادیث رسول ﷺ، آثار صحابہؓ، اور اقوال علماء سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقع پر انبیاء علیہم السلام کا جواب "عدم علم" کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ از راہ پاس ادب "حقیقی علم پر انکار" کو واضح کرتا ہے۔

غرض ذکر یہ تھا کہ اصل مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا اور وہ حسب حال جوابات پیش کریں گے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لئے ان سے امتیاز پیدا کرنے کے لئے تمہیداً قیامت میں ہونے والے ان سوال وجواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے متعلق کیے جائیں گے اور اس لئے بھی یہ تذکرہ ضروری تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا پیرایہ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے:

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يَاعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ

دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِيٓ أَنْ أَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ أَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (مائدہ، پ ۷ ع ۱۶)

اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام بن مریم علیہما السلام سے کہے گا کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسوا خدا بنا لینا" عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لئے کیسے ممکن تھا کہ میں وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات ان سے کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لئے کہ) تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پا سکتا بلاشبہ تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے میں نے اس بات کے ماسوا جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا ان سے اور کچھ نہیں کہا" وہ یہ کہ صرف اللہ ہی کی پوجا کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے اور میں ان پر اس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں ان کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو قبض کر لیا تب تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے اگر تو ان سب کو عذاب چکھائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے پس تو ہی بلاشبہ غالب حکمت والا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکیں گے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے گا:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

(مائدہ پ ۷)

اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی راستبازی ہی کام آسکتی ہے ان ہی کے لئے بہشت ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ خدا سے راضی اور خدا ان سے راضی (کا مقامِ اعلیٰ پائیں گے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمت شان کے عین مطابق ہے وہ پہلے بارگاہ رب العزت میں عذر خواہ ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً حق کے خلاف ہے

سُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِيٓ أَنْ أَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ

پھر پاس ادب کے طور پر خدا کے علم حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے علمی کے مرادف ظاہر کریں گے،

إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَآ أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ

اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گذارش کریں گے،

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِي بِهٖٓ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ

اور پھر امت نے اس دعوت حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر امور کی شہادت کا بھی اس اسلوب کے ساتھ ذکر کریں گے جس میں ان کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے دقعت نظر آئے

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ

اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ امت میں مومنین قانتین بھی ہیں اور منکرین جاحدین بھی وقوع عذاب اور طلب مغفرت کا اس انداز میں ذکر کریں گے جس سے ایک جانب خدا کے مقررہ کردہ پاداش عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب امت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ پورا ہو جائے۔

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرضداشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العالمین نے اپنے قانون عدل کا یہ فیصلہ سنا دیا تاکہ مستحق رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے ان کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحق عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں،

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِيْنَ صِدْقُهُمْ

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیات زیر بحث کا سیاق و سباق صراحت کرتا ہے۔ کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ملاءِ اعلیٰ پر اٹھا لئے جانے کے وقت پیش نہیں آیا۔ اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ سے کرنا اور انتہاء واقعہ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (الآیہ) پر ہونا روز قیامت کے ماسوا اور کسی دن پر صادق نہیں آ سکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی امت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیات مائدہ میں مذکورہ اسلوب بیان اس لئے اختیار فرمائیں گے کہ دوسرے انبیاء و رسل علیہم السلام بھی مقام کی نزاکت حال اور رب العزت کے دربار میں غایت پاس ادب کے لئے یہی اسلوب بیان اختیار فرمائیں گے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور انبیاء علیہا السلام کے جوابات اسلوب بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال و تفصیل کا فرق صرف اس لئے ہے کہ زیر بحث آیات میں اصل مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت کے قبول وانکار اور ان کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقتِ حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور امت مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریف معنوی بھی قابل مطالعہ ہے کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں مذکور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پروردگار عالم کا یہ سوال وجواب اس وقت پیش آ چکا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعش ملنے پر شاگردوں نے ان کا علاج کر کے چنگا کر لیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کئے ہیں ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ اذ ماضی کے لئے مستعمل ہے نہ کہ مستقبل کے لئے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے تو ضروری ہے کہ ان کو اپنی امت (نصاریٰ) کے عقیدۂ الوہیت مسیح علیہ السلام اور تثلیث کا علم ہو چکا ہو گا کیونکہ نصاریٰ نے ان کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے ان کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریف معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لئے کیا کہ اپنے مرشد متنبّی قادیان (علیہ ماعلیہ) کے دعوئے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر ''خسران مبین'' کا سامان مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعد عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ ان کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیات قرآنی کے سیاق و سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانین عربیت میں ''اذ'' اور ''اذا'' کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا کہ ''اذ'' اگر فعل مستقبل پر داخل ہو تب بھی ''ماضی'' کے معنی دیتا ہے اور ''اذ'' اگرچہ فعل ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے ان ہی قوانین میں علماء معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی گزرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لئے گویا وہ زمانۂ حال میں پیش آ رہا ہے صیغۂ مستقبل سے تعبیر کر لیا کرتے ہیں یعنی اس کے لئے ''اذ'' کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو ''استحضار'' اور ''حکایۃ الحال'' کہتے ہیں اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یہ یقین دلانا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہے گا اور نا ممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغت تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور مفید یقین کرتے ہیں کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آ جاتا ہے گویا وہ ہو گزرا ہے اور یہ بھی ''استحضار'' ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے دور کیوں جایئے لفظ ''اذ'' کا استعمال مستقبل کے لئے خود قرآن عزیز متعدد مقامات پر ثابت ہے

سورۂ انعام میں قیامت کے دن مجرموں کی کیا کیفیت ہوگی اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرٰی إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يَالَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کئے جائیں گے آگ (جہنم) کے اوپر پس کہیں گے اے کاش کہ ہم لوٹا دیے جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔

اور اسی سورۂ انعام میں روز قیامت مجرموں کی حال کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَوْ تَرٰی إِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ط قَالَ أَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ط قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ط قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○

اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو (پروردگار) کہے گا کیا یہ حق نہیں ہے؟ وہ کہیں گے قسم ہے پروردگار کی یہ (روز حشر) حق اور سچ ہے پس پروردگار کہے گا تو چکھو اس کے بدلہ میں عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے۔

اور ان ہی مجرمین کی روز قیامت حالت کا نقشہ سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَلَوْ تَرٰی إِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ○ وَّقَالُوْآ اٰمَنَّا بِهٖ

اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائیں گے پس نہیں بھاگ سکیں گے اور پکڑے جائیں گے قریب سے اور کہیں گے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔

سورۂ سجدہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ بیا کیا ہے۔

وَلَوْ تَرٰی إِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ط

اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے ہوں گے اپنے رب کے سامنے۔

یہ اور اسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس لئے لفظ ”اذ“ کا استعمال مفید سمجھا گیا پس جس طرح ان مقامات میں ”اذ وقفوا“ ۔ قال، قالوا، اذ فزعوا، واخذوا، اذا المجرمون ناکسوا تمام افعال لفظ ”اذ“ کے باوجود مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اسی طرح اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى کے استعمال کو مستقبل کے لئے سمجھئے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سیاق وسباق دلالت کر رہے ہیں کہ ان واقعات کا تعلق روز قیامت سے ہے ٹھیک آیات مائدہ کی زیر بحث آیات کا سیاق وسباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔

قاعدۂ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈالئے تو وہ اس سے بھی زیادہ لچر نظر آئے گی اس لئے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی آیات زیر بحث میں حضرت عیسیٰ ﷺ کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ ان کو اپنی امت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ

اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے ایک مرتبہ ان آیات پر پھر غور کرو گے تو صاف نظر آئے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل جواب صرف یہ ہے مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ اور اول و آخر باقی آیات ہیں یا جواب کے مناسب حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت و جبروت اور اپنی بیچارگی و درماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرۃ القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اس لئے انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے۔ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ قادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد آئینہ کمالات میں قادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتایا گیا کہ اس کی امت کس طرح شرک میں مبتلا ہو گئی تب عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء کی خدایا! تو میر امثیل نازل فرماتا کہ میری امت اس شرک سے نجات پائے اور تیری سچی پرستار بنے ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بناتے ہیں اور پھر اس کے سانچہ میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اس سانچہ میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اس پر مشق ستم کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ایسا کرتے وقت حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن امت کی ہدایت کے لئے رہتی دنیا تک امام الہدیٰ ہے۔ اس لئے کوئی "ملحد و زندیق" خواہ کتنی ہی تحریف معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ و فکر کے بطلان کے لئے ناطق ہوں گے بلکہ بمصداق دروغ گو را حافظہ نہ باشد وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افترا پر مہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطور بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ

حیات و رفع علیہ السلام سے متعلق گذشتہ مباحث میں "توفی" کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورۂ مائدہ کی آیات مسطورۂ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں تاہم قرآن کے اعجاز بلاغت اور اسلوب بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے لئے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپرد قلم کر دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر قرآن عیسیٰ علیہ السلام کے قیام ارضی کو مَا دُمْتُ فِيْهِمْ سے اور کائنات ارضی سے انقطاع تعلقات کو تَوَفَّيْتَنِيْ سے کیوں تعبیر کیا۔

گذشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ "توفی" کے حقیقی معنی "اخذ و تناول" (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور موت کے معنی میں بطور کنایہ اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنی برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنی سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہ

میں استعمال ہونے لگے پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ ان کو موت آچکی اور سوال وجواب کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت ومعانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقع پر "حیات" اور "موت" ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تاکہ یہ حیثیت واضح ہو سکتی کہ سوال وجواب کا معاملہ "موت" کے ہم قرین ہے اور پھر لفظ "موت" کی صراحت اپنے مقابل لفظ "حیات" کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے ما دُمتُ فیھِم کو "حیوۃ" کی اور "توفی" کو "موت" کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لئے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت ومصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور امت تو اسکا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز وایجاز سے کام لیا ہے اور ان لفظوں میں وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول اور موت تمام مراحل کو سمود ینا چاہتا ہے وہ اگر یہ کہتا "ماحییت" "میں جب تک زندہ رہا اور "فلما امتنی" "پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں "زندگی" اور "موت" ان دونوں مراحل کے درمیان کوئی خاص صورت حال پیش نہیں آئی، لیکن جبکہ یہ خلاف واقعہ تھا اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آچکے ہوں گے: ایک "ملاء اعلیٰ کی جانب بقید حیات رفع اور دوسرے کائنات ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول) اس لئے از بس ضروری ہوا کہ حیات اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آسکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسب حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجاز بلاغت کا یہی تقاضہ ہے کہ اب ان کو ایجاز واختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورت حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لئے قرآن عزیز نے "ماحییت" کی جگہ ما دُمتُ فیھِم استعمال کیا تاکہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہو جائے اس حصہ پر بھی جو ابتداء زندگی سے شروع ہو کر رفع الی السّماء پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو "نزول ارضی" سے شروع ہو کر "موت" پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے فلما امتنی کا اسلوب بیان اختیار کیا تاکہ یہ جملہ بھی پہلے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمولے اس مرحلہ کو بھی جو رفع الی السّماء کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد "موت" کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے تو صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہو سکتی تھی مگر "توفی" میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف "اخذ وتناول" کے ساتھ ساتھ "موت" جیسا کہ سطور بالا میں "کنایہ" اور "مجاز" کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے خدایا! جو وقت میں نے ان کے درمیان گذارا اس کے لئے تو بے شک میں شاہد ہوں لیکن "توفی" کے اوقات میں ان پر فقط تو ہی نگہبان رہا۔ باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے

مسئلہ متعلقہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی اکرم ﷺ نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے لغت، معانی، بلاغت کے پیش نظر تھی ورنہ ان آیت کی تفسیر میں ایک مومن صادق کے لیے تو وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسند صحیح روایت کیا ہے مثلاً مشہور محدث حافظ بن عساکرؒ نے بروایت ابوموسیٰ

اشعریؓ نبی اکرم ﷺ سے جو حدیث نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے۔

جب قیامت کا دن ہو گا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی امتوں کو بلایا جائے اور عیسیٰ علیہ السلام بھی بلائے جائیں گے اللہ تعالیٰ اول ان کے سامنے اپنی ان نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں ان پر نازل ہوتی رہیں اور عیسیٰ علیہ السلام ان سب کا اعتراف کریں گے اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ ءَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام انکار فرمائیں گے پھر نصاریٰ بلائے جائیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں عیسیٰ علیہ السلام نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی یہ سن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہو جائے گا بدن کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور خشیت الٰہی سے ان کا رواں رواں بارگاہ صمدی میں سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہو گی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کر دیجائیگی اور ان کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائے گا اور پھر ان کو جہنم میں جھونک دیے جانے کا حکم ہو جائے گا۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ا سورۂ مائدہ)

اور محدث ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بسند صحیح یہ روایت نقل کی ہے حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں "کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القاء کر دیگا" اور اس القاء کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر القاء ہو گا کہ وہ یہ جواب دیں۔ سُبْحَانَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ ۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ا سورۂ مائدہ)

اور صحیحین (بخاری و مسلم) اور سنن میں جو حدیث شفاعت منقول و مشہور ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف و ہراساں ہوں گے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے ایک ہوں گے اور ان پر یہ خوف طاری ہو رہا ہو گا کہ جب ان سے امت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہو گا تو وہ درگاہ صمدی میں کس طرح اس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

الحاصل سورۂ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور امت کی جانب سے منقول ہے اور قادیانی اور لاہوری کی تفسیر بالرائے الحادو زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے

گذشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل عطا کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراۃ کا تکملہ تھی یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمی اساس اگرچہ توراۃ ہی پر قائم تھی مگر یہود کی گمراہیوں مذہبی بغاوتوں اور سرکشیوں کیوجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے یہود کی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرت مسیح علیہ السلام

نے مبعوث ہو کر ان سب کی اصلاح کے لئے قدم اٹھایا تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابل اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرم عمل رہے۔

۱) یہود کی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمال نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت میں جزاو سزا حشر و نشر، یہ سب باتیں غلط ہیں یہ "صدوقی" تھے۔

۲) دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لئے از بس ضروری ہے کہ لذات دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کش ہو کر "زہادت" کی زندگی اختیار کی جائے چنانچہ وہ بستیوں سے الگ خانقاہوں اور جھونپڑیوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترک دینا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی، ظاہر رسم و طریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندان بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کر لیں یہ "فریسی" کہلاتے تھے۔

۳) تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمت ہیکل سے متعلق تھی لیکن ان کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیے تھا اور جو اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے ان کو تجارتی کاروبار بنالیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمت ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لئے انھوں نے توراۃ کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی یہ "کاہن" تھے۔

۴) چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی اس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول و اعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر وہ جن پر وہ صادر کر دیں ان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنادیں، احکام دین میں اضافہ یا کمی کر دیں جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں۔ خدا کے یہاں ان کا فیصلہ اٹل اور ان مٹ ہے، غرض بنی اسرائیل کے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنے ہوئے تھے۔ اور تورات کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنالیا تھا اور عوام و خواص کی خوشنودی کے لئے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکام دین کو بدل ڈالنا ان کا مشغلۂ دینی تھا یہ "احبار" ای "فقیہ" تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے ان کے عقائد و اعمال جن کے درمیان حضرت مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاح حال کے لئے ان کی بعثت ہوئی انھوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد و اعمال کا جائزہ لیا رحم و شفقت کے ساتھ ان کے عیوب و نقائص پر نکتہ چینی کی، ان کو اصلاح حال کے لئے ترغیب دی اور ان کے عقائد و افکار اور ان کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کر کے ان کا رشتہ خالق کائنات اور ذات واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بد بختوں نے اپنے اعمال سیاہ کی اصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ ان کو "مسیح ضلالت" کہہ کر ان کی دعوت حق و ارشاد کے دشمن اور ان کے خلاف سازشیں کر کے ان کی جان کے درپے ہو گئے۔

اناجیل اربعہ

حضرت مسیح علیہ السلام پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہل علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی انجیل نہیں ہے اور نہ اس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے:

یہ بات بہر حال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بناء پر وہ یہ کہہ سکیں کہ ان کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام یا ان کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کیلئے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخ بلکہ اس سے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں اکیس سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں لیکن ۳۲۵ء میں نایسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دیدیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا چنانچہ ان اکیس سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں مثلاً انیسویں صدی میں ڈیٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متروک اناجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجودہ چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد موجود ہے موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے درج ہے لیکن سورۂ مریم میں قرآن عزیز نے اس واقعہ کو جس طرح حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش اور ہیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورۂ مریم میں مذکور واقعہ کی طرح درج ہے۔ (ترجمان القرآن جلد دوم)

اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سکٹس کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنابا ہے یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرامرینو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرا لایا چونکہ اس میں ختم الانبیاء محمد ﷺ سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ "احمد" نام تک مذکور تھا، نیز الوہیت مسیح علیہ السلام کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لئے وہ لاٹ پادری مسلمان ہو گیا حال ہی میں اس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابل مطالعہ ہے ڈاکٹر سعادہ نے اس کے مقدمہ میں جو قابل قدر علم کی تحقیق پیش کی ہے اس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسویں کے اواخر میں اس تاریخی منشور (حکمنامہ) سے چلتا ہے جو خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسیوس کی جانب کلیسائیوں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں ان کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا ان ہی میں انجیل برنابا کا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققین یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیح ﷺ کے بعد ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کر دی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق ان کا پڑھنا حرام کر دیا گیا اس لئے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل ایگنٹس (انجیل اغنطسی) بھی تھی جو اب ناپید ہے۔

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس رسول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیادیں قائم ہیں ان کے مطالعہ سے جگہ جگہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبر دار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ ان انجیلیوں کی جانب توجہ نہ دیں جو مسیح ﷺ کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح المقدس نے اسی کے لئے مامور کیا ہے کہ میں انجیل مسیح ﷺ کی حمایت کروں اسی کو اسوہ بناؤں اور اس کی تعلیم کو تمام عیسائی دنیا میں پھیلاؤں چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک مسیح ﷺ کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلیوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور ان ہی میں سے یہ چار ہیں جو نایسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے فال کے ذریعہ صحیح تسلیم کر لیں۔

اب ان چاروں کا حال بھی سنیئے ان میں سے سب سے قدیم متی کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے بایں ہمہ اس کے متعلق نصاریٰ میں سے علماء متقدمین تو بالاتفاق اور علماء موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیل متی اصل نہیں ہے بلکہ اس کا ترجمہ ہے اس لئے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اب ناپید ہے اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخ سند موجود نہیں حتیٰ کہ مترجم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زوبن الفتوحی الانبانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متی نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیموس نے کہا کہ اوسیبوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متیٰ کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب بانیتوس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اس نے متی کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانۂ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا۔

(الفارق بین المخلوق والخالق جلد اول ص ۲۰ ماخوذ از کتاب جرجیس زوبن لبنانی مطبوعہ بیروت)

دوسری انجیل مرقس کی ہے اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گواماگ اپنی کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسلاً یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ ﷺ کا شاگرد تھا رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کر لی تو ان کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی یہ الوہیت مسیح ﷺ کا منکر تھا اور اس نے اپنی انجیل میں اس حصہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح ﷺ پطرس کی مدح کرتے ہیں یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قید خانہ میں قتل ہوا بت پرستوں نے اس کو قتل کر دیا[1] اور عیسائی دنیا کو اس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی چنانچہ الفارق کے مصنف مرشد الطالبین ۱۷۰ ص کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ علماء نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۶۱ھ میں تصنیف ہوئی۔ (الفارق ص ۱۵۱ ج ۳)

۱: قصص الانبیاء للنجار۔

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متی کی انجیل سے متعلق ہے اس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت و عدم صحت کے متعلق اختلاف ہے چنانچہ الفارق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماء نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر گڈل اپنے رسالہ ''الہام'' میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اس نے ثاد فیلس کے ساتھ خط و کتابت کی بناء پر لکھی ہے وہ کو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھی تھیں انھوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں ان کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کر رہے ہیں اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کر دوں تاکہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہو جائے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کا زمانہ نہیں پایا اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔ (قصص الانبیاء النجار ص ۴۷۷ـ۴۷۹)

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا اس نے مسیح علیہ السلام کو نہیں دیکھا اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ دراصل متعصب یہودی اور عیسائیت کا بدترد شمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھتا تھا مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ہمہ قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کو ترقی ہوتی جا رہی ہے اور رد کے نہیں رکتی تب اس نے یہودیانہ مکر و فریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجب معجزہ ہوا، میں بحالت صحت تھا کہ ایکدم اس طرح زمین پر گر اجیسا کہ کوئی کشتی میں پچھاڑ دیتا ہے اس حالت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مجھ کو چھوا اور پھر سخت زجر و توبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیروں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا پس میں اسی وقت حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آیا اور پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے حکم سے میں مسیحی دنیا کی خدمت کے لئے مامور ہو گیا انھوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیح علیہ السلام کی انجیل کی بشارت سنادوں اور اس کے اتباع کی ترغیب دوں چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ ''کلیسہ'' پر ایسا قبضہ کیا کہ دین عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور برائیوں کا مجموعہ بنادیا الوہیت مسیح علیہ السلام، تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعت ایجاد کر کے مسیحیت کو وثنیت میں تبدیل کر دیا اور شراب مردار اور خنزیر سب کو حلال بنادیا۔ یہی وہ مسیحیت ہے پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے اور جیروم کہتا ہے کہ بعض قدیم علماء نصاریٰ اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ یہ اس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو مارسیون فرقہ کے ہاتھوں میں ہے اور مشہور نصرانی عالم اکہارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۳، ۴۴ الحاقی ہیں، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن اب صدق کا کذب سے امتیاز حد درجہ دشوار ہے اور کلی میش... لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت جگہ آپس میں مخالف اور متضاد واقعات کی حامل ہیں لیکن جس

معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہوا اس کو لوقاس کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل ہے[1] اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ۔[2] پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہے زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا جلیل کے بیت صیدا میں ولادت ہوئی اور حواری عیسیٰ علیہ السلام کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ ان ہی کو تقدیس حاصل ہے جرجیس زوبیں اللبنانی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں شیر نیطوس اور بیبسوں اور ان کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرت مریم علیہا السلام کے باطن سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام سے قبل وہ عالم وجود میں نہیں تھے اس زمانہ میں ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلس مشاورت ہوئی اور انھوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلیوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ماسوا جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیت مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیر نیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں تب یوحنا ان کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے۔[3] مگر اس کے باوجود مسیحی علماء زمانۂ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں، بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

مگر ان کے مقابلہ میں ان مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ[4] جلد نمبر ۷ میں پروفیسر لن سے منقول ہے کہ انجیل یوحنا از ابتداء تا انتہا مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برٹش نیدر لکھتا ہے کہ انجیل یوحنا اور رسائل یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کر کے اس لئے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کروٹیس کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا۔[5] ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا ہے کہ بلا شبہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کر کے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیت مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کنیسہ کو قوت پہنچائی جائے اور اصلاحِ عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اس کو دبایا جائے۔

چہار گانہ اناجیل کے متعلق مختصر تنقیدات کے علاوہ ان کے الہامی نہ ہونے کی دو واضح دلائل یہ بھی ہیں

۱: قصص الانبیاء ص ۴۷۷۔
۲، ۳: ایضاً ص ۴۷۷۔
۴: مطبوعہ ۱۸۴۴ء۔
۵: الفارق ص ۳۴۲۔۳۴۱۔

کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح کی زندگی کے وقائع درج ہیں حتی کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق ان کی گرفتاری صلیب قتل مر کر جی اٹھنے اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں پس اگر یہ اناجیل انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا کوئی حصہ ہوتیں تو ان میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہیے تھا وہ واقعات تو مسیح علیہ السلام کے بعد ان کے شاگرد جمع کرتے اور ان کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنّفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم واقعات میں بھی تناقض اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات و عجیب واقعات ایسے ہیں جو ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں ان کا اشارہ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے مثلاً صلیب مسیح علیہ السلام کا واقعہ اناجیل میں تضاد بیان کے ساتھ منقول ہے۔

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیل اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئی ہیں ان کی عبارات و کلمات کے بقاء و تحفظ کی کبھی پرواہ نہی کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی کمی اور بیشی موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماء نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آگئی ہے کہ ان کا مصدق خاتم الانبیاء ﷺ ہیں یا حضرت مسیح علیہ السلام یا کوئی اور نبی نیز جن مقامات پر الوہیت مسیح علیہ السلام کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہو ان کو کافی تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہے۔....... اگر تحریفات لفظی و معنوی اور تضاد بیان کی تفصیلات و تشریحات کو بہ نظر وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لئے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق و حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری، باجہ جی زادہ کی الفارق بین المخلوق و الخالق اور مولانا آل نبی امروہی کی اظہار حق لائق دید کتابیں ہیں۔

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں نہ ان کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی، نہ ان کے مصنّفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانہائے تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات ان کتابوں کی تاریخی حیثیت مضامین و مطالب کا باہمی تضاد و تخیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیل مسیح علیہ السلام یا اس کا حصہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیل مسیح علیہ السلام نصاریٰ کے ہی ہاتھوں اول تحریف لفظی و معنوی کا شکار ہوئی اور اسکے بعد مفقود ہو گئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے کوئی بھی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی و تغیر اور نقص و ازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ اناجیل اربعہ انجیل مسیح علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ کسی علمی تاریخی اور مذہبی سند سے ان کا شاگردان مسیح علیہ السلام کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنّفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ و نصائح اور مقامات حکمت کے سلسلہ میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشادات عالیہ سے ماخوذ ہے اس لئے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آجاتی ہے

قرآن اور انجیل

قرآن عزیز کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح اس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت اور خاص گروہ کی وراثت نہیں رہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدائی رشد وہدایت کا پیغام ایک ہی احساس وبنیاد پر قائم رہتے ہوئے اس کے سچے پیغمبر ویا ان کے نائبوں کے ذریعے ہمیشہ دنیا کے لئے راہ مستقیم کا داعی اور منادر رہا ہے اور اسی کا نام ''صراط مستقیم'' اور ''اسلام'' ہے اور قرآن اسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس سے تمام مذاہب ماضیہ کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائنات ارضی کی ہدایت کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس لئے اب اس کا انکار گویا خدا کی تمام صداقتوں کا انکار ہے اسی بنیادی تعلیم کے پیش نظر اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمت شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلا شبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی بہ دلائل بتلایا کہ علماء اہل کتاب نے اس کی سچی تعلیم کو مٹا ڈالا بدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کر کے اس کی تعلیم کو شرک وکفر کی تعلیم بنا دیا مگر بعض مقامات پر اہل کتاب کو توراہ وانجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتے ہوئے موجودہ تورات وانجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرف شکل میں ہی کیوں نہ ہوں پائے جاتے تھے بہر حال اس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ تورات موسیٰ اور انجیل مسیح علیہ السلام کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں۔

چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہل کتاب کے ہاتھوں ان کی تحریف اور ان کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ

اے محمد ﷺ اللہ نے تجھ پر کتاب کو اتارا حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس کے سامنے ہیں اور اتارا اس نے تورات اور انجیل کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لئے اور اتارا فرقان (حق وباطل میں فرق کرنے والی)۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۝

اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو حکمت کو توراۃ کو انجیل کو۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

اے اہل کتاب! تم کس لئے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ توراۃ اور انجیل کا نزول نہیں ہوا مگر ابراہیم علیہ السلام کے بعد پس کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَاٰتَيْنَاهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ○

اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو جو تصدیق کرنے والا ہے اس کتاب کی جو سامنے ہے تورات اور دی ہم نے اس کو انجیل جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو اپنے سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی ہے اور سر تا سر ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کیلئے اور چاہیے کہ اہل انجیل اس کے مطابق فیصلہ دیں جو ہم نے انجیل میں اتار دیا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے موافق فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ط مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَّكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ○

اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے (تحریف کر کے ان کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اس کو قائم رکھتے جو ان کی جانب ان کے پروردگار کی جانب سے ہوا ہے تو البتہ وہ (فارغ البالی کے ساتھ) کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے نیچے سے بعض ان میں میانہ رو صلاح کار ہیں اور اکثر ان کے بد عمل ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اے محمد ﷺ! کہہ دیجئے: اے اہل کتاب تمہارے لئے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل اور اس شے کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر نازل کیا قائم نہ کرو (تاکہ اس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق نکلے)

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ

اور جب میں نے تجھ کو (اے عیسیٰ) سکھائی کتاب حکمت تورات اور انجیل۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْاِنْجِيْلِ

(نکوکار) وہ شخص ہیں جو پیروی کرتے ہیں رسول کی جو نبی امی ہے اور جسکا ذکر اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰاةِ وَالْإِنْجِيْلِ

بلا شبہ اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات پر کہ ان کیلئے جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں ان کیلئے اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔

غرض یہ مدح و منقبت ہے اس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام کہلانے کی مستحق اور در حقیقت کتاب اللہ تھیں لیکن یہود و نصاریٰ نے ان الہامی کتابوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیے۔

أَفَتَطْمَعُوْنَ أَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○

کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اس کے مطالب کو سمجھتا تھا اور دیدۂ دانستہ تحریف کرتے تھے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ○

پس افسوس ان (مدعیان علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دنیوی فائدہ کی حاصل کریں پس افسوس اس پر جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں وہ اہل کتاب کتاب اللہ (تورات وانجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں یعنی تحریف لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں

ان کے علاوہ ثمن قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق توبقرہ، آل عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، تورات وانجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے تحریف لفظی کے ذریعہ بھی اور تحریف معنوی کے سلسلہ سے بھی گویا سیم و زر کے لالچ سے عوام کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی و معنوی تحریف ان کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت بد بختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجب لعنت ہے۔

انجیل اور حواری عیسیٰ

مفسرین عام طور پر حواری کو "حور" سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں جب کپڑا دھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا تو اہل عرب کہا کرتے ہیں "حار الثوب" اس لئے دھوبی کو "حواری" کہتے ہیں اور "حواریون" اس کی جمع آتی ہے اس معنی کے پیش نظر حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں کو اس لیے حواری کہتے

ہیں کہ ان میں سے اکثر دھوبی اور مچھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لئے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے حواری کے معنی ناصر مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبد الوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کے حواریوں کو ''شاگرد'' کہتے ہیں یہی تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے ''حبور'' عبرانی لفظ ہے جس کے معنی شاگرد کے ہیں اور اس کی جمع حبوریم آتی ہے یہی حبوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حوار بن کہلایا۔

حوارین عیسیٰ علیہ السلام کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آ چکا ہے لیکن قرآن عزیز نے صرف ''حواریوں'' کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے کسی کا نام مذکور نہیں ہے انجیل نے البتہ ان کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی چنانچہ متی کی انجیل کے باب میں بارہ نام شمار کیے ہیں کیے ہی اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب ۱۴ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے نقشہ حسب ذیل ہے۔

انجیل متی		انجیل برنابا	
شمار	نام	شمار	نام
۱	پطرس (سمعان)	۱	بطرس الصیاد (سمعان)
۲	اندراوس (پطرس کا بھائی)	۲	اندراوس
۳	یعقوب بن زبدی	۳	برنابا
۴	یوحنا (یعقوب کا بھائی)	۴	یعقوب بن زبدی
۵	فیلپس	۵	یوحنا بن زبدی
۶	برثولماوس	۶	فیلپس
۷	توما	۷	برثولماوس
۸	متی العشار	۸	تدادس
۹	یعقوب بن حلفی	۹	یعقوب بن حلفی
۱۰	لبادس (ملقب بہ تدادس)	۱۰	یہودا
۱۱	سمعان القانوی	۱۱	متی العشار
۱۲	یہودا اسخر یوطی	۱۲	یہودا اسخر یوطی[1]

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے متی میں توما اور سمعان قانوی ہیں اور برنابا میں ان کی جگہ خود برنابا اور تدادس ہیں ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی

۱: قصص الانبیاء للنجار ص ۴۸۲۔

میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسہ کی کونسل نے بے دلیل اور بے سند صرف اس بناء پر برنابااور اس کے رفیق تداوس کے نام منظور کر دیے کہ ان دونوں کی روایات الوہیت مسیح علیہ السلام اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور کلیسہ کے اس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی محرّف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھااور رہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اگر چہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں حواریوں سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم ان رسولوں کی جنھوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیااور مسیحی دین کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم حق کا خلاصہ گذشتہ بیانات میں سپرد قلم ہو چکا ہے وہ خدا کے سچے پیغمبر حق و صداقت کے داعی دین مبین کے ہادی و مبلغ تھے اور خدا کے تمام سچے پیغمبروں کی طرح ان کی تعلیم بھی پہلی صداقتوں کی موید اور وقت کی انفرادی اواجتماعی ضروریات کے انقلابات و حوادث کے مناسب حال انجیل کی شکل میں اصلاح و انقلاب کے لئے مناد تھی توحید خالص، معرفت کردگار کے لئے کردگار سے ہی بلاوسیلہ، تقرب محبت و شفقت، رحمت و عفو کی اخلاقی برتی ان کی ایک تولیم کا نچوڑ تھالیکن انسانی انقلابات کی ذہنی تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت اور تعجب کی غالباً کوئی بات نہ ہو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی مقدس تعلیم ہی کے نام پر موجودہ مسیحیت، توحید کی جگہ تثلیث، معرفت حق کے لئے ابنیت کا عقیدہ، نجات کے لئے علم و عمل کی درستکاری کی جگہ کفارہ پر ایمان جیسی مشرکانہ اور جاہلانہ بدعات کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سرگرم عمل ہے۔

تثلیث؟ بستانی نے دائرۃ المعارف (ENCYCLOPADIA) میں اس مسئلہ پر مسیحی نقطہ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نے سب سے پہلے تثلیث کا نام "رسولوں کے عہد" میں سنااس سے قبل مسیحیت اس عقیدہ سے قطعاً نا آشنا تھی اور رسولوں کا عہد سینٹ پال (پولوس رسول) سے شروع ہوتا ہے یہ وہی حضرت ہیں جن کی بدولت دین مسیح نے نیا جنم لیااور جن کی یہودیت نے ازراہ تعصب مسیحی صداقت و توحید کے عقیدہ کو وثنیت اور شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا یہ عقیدہ دراصل وثنی (بت پرستانہ) فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ عقیدہ "اوتار" کی صدائے بازگشت ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ذات یا صفات خداوندی بشکل انسانی کائنات ارضی میں وجود پذیر ہو سکتی ہے گویا یہ عقیدہ فلاسفہ ہیلانیسن اور غنوسطینین کے عقائد فلسفیانہ کا ایک معجون مرکب ہے چنانچہ تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ کے بشپ (BUSHAP) تھیوفیلوس نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں ایک یونانی کلمہ "ثریاس" کا استعمال کیااس کے بعد ایک دوسرے بشپ ترتلیانوس نے اس کے قریب قریب ایک لفظ تیرنیتاس ایجاد کیا، یہی وہ یونانی لفظ ہے جو موجودہ مسیحی عقیدہ "ثالوث (تثلیث) کے مرادف اور ہم معنی ہے اگر اس مسئلہ کی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو تاریخی حقائق سے یہ بات نمایاں نظر آئے گی کہ ثالوث کا عقیدہ در اصل مسیحیت کی وجہ سے پیش آیا، خصوصاً جب مصری بت پرستوں نے اس مذہب کو قبول کیا تو انھوں نے اس عقیدہ کو بہت ترقی دی اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ساتھ اس کو علمی بحث بنادیا۔ مسیحیت قبول کر لینے کے بعد بت

پرستوں پر جو رد عمل ہوا اس کے نتیجہ میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ ان کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ وہ کس طرح گذشتہ وثنیت کی موجودہ مسیحیت کے ساتھ مطابقت پیدا کریں؟ تاکہ اس طرح قدیم و جدید دونوں ادیان کے ساتھ ربط قائم رہ سکے چنانچہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "اسکندریہ کے فلسفہ اصنامی تخیل سیر اپیز (SERAPIS) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور ایزیز (ISIS) کی جگہ حضرت مریم علیہا السلام کو اور ہورس (HORS) کی حضرت مسیح علیہ السلام کو دی گئی اور اس یونانی اور مصری فلسفیانہ وثنیت کی بدولت موجودہ مسیحیت میں الوہیت مسیح اور تثلیث کلیسہ کا مقبول عقیدہ بن گیا۔

یہ عقیدۂ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علماء نصاریٰ میں اس کے رد و قبول پر معرکۃ الآراء بحثیں شروع ہو گئیں "نیقاد" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی اور عمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو کلیسہ نے فیصلہ دیا کہ مسئلہ ثالوث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے ان ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ بیونیین ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح انسان محض تھے دوسرا "سابلیین" ہے جس کا خیال ہے کہ خدا ذات واحد ہے اور ابن روح القدس یہ مختلف صورتیں ہیں جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذات واحد ہی پر ہوتا ہے تیسرا فرقہ "آریوسیین" ہے اس کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر "اب" کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائنات بلند و پست سے قبل "اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لئے وہ "اب" سے نیچے اور اس کی قدرت کے سامنے مغلوب و خاضع ہے اور چوتھا فرقہ "مقدونیین" ہے ان کا کہنا ہے کہ "اب" اور ابن دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے ان کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو "ملحد" قرار دے کر نیقادی کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور روح القدس" تینوں جدا جدا مستقل اقنوم (اصل ہیں) اور عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہے گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابل انکار بدیہی مسئلہ خلاف یا یوں کہیے کہ بداہتۂ عقل کے خلاف یہ تسلیم کر لیا کہ "ایک" اور "تین" ہے اور "تین" ایک اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہے اور پھر ۵۸۹ء میں طیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کر لی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب اور "ابن" دونوں سے ہوا ہے اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون و چرا تسلیم کر یا اور اس کلیسہ کا عقیدہ بنا لیا لیکن "یونانی کلیسہ" اول تو خاموش رہا مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو بدعت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کر لی کہ "یونانی کلیسہ" اور کیتھولک لاطینی کلیسہ کے درمیان کبھی اتفاق و اتحاد پیدا نہ ہو سکا۔

ثالوث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دین مسیحی کے رگ و پے میں خون کی طرح ایسا سرایت کر گیا کہ مسیحی کے بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل حیرت ہے یہ بات لوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصہ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو ہی بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے عقیدہ تسلیم کر لیا البتہ تیرھویں صدی عیسوی میں فرقہ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی، جرمانی، موحدین اور عمومیین وغیر ہم نے

اس عقیدہ کو نقل و عقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ (دائرۃ المعارف للبستانی جلد ۶ ص ۵۰۳ کلمہ (ثالوث))

یہ ہے مسیحیت میں عقیدہ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ دین مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہین منت ہے۔

عقیدۂ ثالوث کیا شے ہے اور "اب" "ابن روح القدوس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے ان مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اسکو صاف اور واضح کرنیکی کوشش کی گئی اس میں الجھاؤ اور پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت میں اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی وہی "معمہ" بن کر رہ گیا اور قدیم و جدید علماء نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید اور توحید میں تثلیث یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہو سکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقیدہ حل ہوگا۔ اسلیئے یہاں اسکو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے چنانچہ اواخر انیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر نے "میزان الحق" میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم اس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں ان کو مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ اس کائنات ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں "عالم ناسوت" کہا جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کہ جس کا تعلق عالم غیب سے ہے وہ اور اس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں کا گزر اور نہ مکین و مکاں، جہاں سب کچھ ہے لیکن مادیت سے بالاتر اور وراء الوراء ہے اس کا نام "عالم لاہوت" ہے تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں "وقت" ایک بے معنی لفظ تھا اس وقت تین اقنوم تھے "باپ"، "بیٹا"، "روح القدس" اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام "خدا" ہے رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور ان دونوں سے جدا کلیسہ شرقی تینوں ہی اس پر متفق ہیں اور اسی کو دین مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کی کتاب مقدس کی تصریحات اسی کا اعلان کرتی ہیں مطالعہ کرنے سے دیدہ حیرت اور چشم عبرت کے لئے بہت سا سامان مہیا ہو جاتا ہے، بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساوں کے بشپوں اور پاپاوں نے اس عقیدہ کی تشریح میں یہ عجیب و غریب مباحث پیدا کیے کہ "اقنوم اول" باپ سے کس طرح اقنوم ثانی بیٹے کی ولادت ہوئی اور پھر باپ سے یا باپ اور بیٹے دونوں سے کس طرح اقنوم ثالث "روح القدس" پھوٹ کر نکلی یا کس طرح اس کا صدور ہوا اور یہ ان کے باہم نسبت کیا ہے اور ان کے جدا جدا کیا القاب و صفات ہیں جو ایک دوسرے کو آپس میں متمائز کرتے ہیں اور پھر جب یہ تثلیث توحید بن جاتی ہے تو اس کی صفات و القاب کی کیا صورت ہو سکتی ہے، نیز یہ کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں اس میں تینوں اقانیم برابر کے شریک ہیں یا کوئی ایک پورا اور دوسرے دو جزوی حصہ دار ہیں اور جزوی شرکت ہے اور کس نسبت اور تعلق سے ہے؟ غرض خدائے برکت کی مقدس اور پاک ہستی کو معاذ اللہ کمہار کے چاک پر رکھا ہوا برتن فرض کر کے جس طرح اس کو بنایا اور تیار کیا ہے اور توحید خالص کو تباہ برباد کر کے جس طرح شرک و ترکیب کا نیا سانچہ ڈھالا ہے دنیائے مذاہب و ادیان کی تاریخ میں ایسا مذہبی تغیر و انقلاب چشم فلک نے نہ کبھی دیکھا نہ سنا ان ھذا لشیء عجاب بحر حال

''باپ'' ''بیٹا'' ''روح القدس'' کی جدا جدا تفصیلات و تشریحات اور پھر وحدت سے ترکیب اور ترکیب سے وحدت کی عجوبہ زا تعبیرات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کا کہیں اور چھور نظر نہیں آتا اور جب کہنے والا ہی لفظی تعبیرات کے علاوہ ''حقیقت'' سمجھنے سے عاری ہے تو سننے والا کیا خاک سمجھ سکتا ہے۔

باپ

اقانیم ثلاثہ میں ''اب'' پہلا اقنوم ہے۔اسی سے اقنوم ثانی کی ولادت ہوئی اور'' عالم لاہوت'' یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جدا نہیں ہوتا۔ مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ کی تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدت لاہوت میں تینوں کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آلوسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں بلکہ دوسرا اقنوم ''بیٹا'' اقنوم اول کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالم بالا وپست سے غیر معلوم مدت پہلے اقنوم اول سے پیدا ہوا ہے اس لئے اس کا درجہ ''باپ'' کے بعد اس سے کم ہے اور، مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف دو ہی اقنوم ہیں ''باپ'' اور ''بیٹا'' اور ''روح القدس'' مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے اور طلیطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس ''باپ'' اور ''بیٹا'' دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کی صرف باپ ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے اور قدیم وجدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنوم ثالث مریم (علیہا السلام) کو تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

بیٹا

عربی میں ''ابن'' فرنچ میں ''فی'----اور انگریزی میں سن (SON) اور اردو میں ''بیٹا'' کہتے ہیں، یہ اس شکل انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانون قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدۂ ثالوث کے مطابق وہ عالم لاہوت میں ''باپ'' سے جدا بھی نہیں اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی، آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب ''باپ'' کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنوم ثانی ''بیٹا'' عالم ناسوت (کائناتِ ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر ''مسیح'' کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالم ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیح کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنوم ثانی ''ابن'' کو اقنوم اول ''اب'' پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

روح القدس

اسی طرح ''روح القدس'' کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے: کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لیے عالم لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے چنانچہ مکدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور ان میں سب سے برتر و بلند ہے اور مارتوینوس کہتا ہے کہ روح القدس کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں، اس بناء پر اس قول کے قائلین کا ''مجازئین'' کہا جاتا ہے

اور علماء جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں عہد نامہ قدیم و جدید میں کسی ایک جگہ بھی ''الوہیت'' کا درجہ نہیں دیا گیا، فرقہ مکدونی نے الوہیت روح القدوس کا انکار کرتے ہوئے شدومد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہر الوہیت میں روح القدوس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ غیر مولود، اگر مولود ہے تو اس کے اور ''ابن'' کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور ''ب'' کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلے میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ ''روح القدوس'' کو بھی الوہیت حاصل ہے بوسیو رومانی کہتا ہے کہ روح القدس کا صدور ''اب'' اور ''ابن'' دونوں سے ہوا اور وہ ان کے جوہر نفس سے ہے اور دونوں کیساتھ وحدت لاہوت میں ''الہ'' ہے اور اثناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابل انکار ہے اور کتب سماویہ میں روح پر ''الہ'' کا اور ''الہ'' پر ''روح'' کا اطلاق ثابت و مسلم ہے اور اس کی جانب ان ہی امور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذات خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے مثلاً تقدیس ذات، معرفت جمیع حقائق وغیرہ اور یہ عقیدہ سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظم سولجیا سے ثابت ہے جس کی قدامت تالیف سب کے نزدیک مسلم ہے اس میں الوہیت روح القدس کا اعتراف موجود ہے اور مولٹ لفیلو پیٹرس نے انکار الوہیت روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیت میں مضمر ہونا ایک مسلم حقیقت ہے پھر روح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مار اثناسوس کہتا ہے کہ کتب سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح الاب اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہٰذا اس کو ''ابن'' یا ''اب'' کہنا صحیح نہیں اور نہ اس کو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہو سکتا ہے اور ادراک بشری عاجز ہے کہ کان فلسفیانہ بحثوں سے ''روح القدس'' کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں جو ''اب'' کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاک (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہو سکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید و انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کی تولید و انبثاق دونوں کا ''اب'' کے ساتھ ازلی وابدی اور تلازم کا تعلق ہے پس ہمارے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فلاسفہ قدیم (فلاسفہ یونان) کی طرح ''روح القدس'' اور ''اب'' کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کر لیں جو انھوں نے خدا سے صدور ارواح کے متعلق پیدا کر لیئے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیش نظر رہنے چاہیں جو گزشتہ سطور میں بیان ہو چکے ہیں کہ بعض کلیسہ ''روح القدس'' کا فقط اقنوم اول (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں کہ بعض کہتے ہیں باپ اور بیٹا دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے، یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشمکش کا سبب رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے ''منشور ایمانی'' میں یہ واضح کر دیا تھا کہ روح القدس کا صدور ''باپ'' ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ء میں اول ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزء عقیدہ بنایا کہ ''روح القدس'' کا صدور اقنوم اول (باپ) اور اقنوم ثانی ''بیٹا'' دونوں سے ہوا ہے، عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے شرق کے بطرق فوتیوس نے اس لئے پیدا کی کہ اس کی اور اس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جدا کر دیا جائے اور مشرق و مغرب کی کلیساؤں کا اتحاد

باقی نہ رہنے دیا جائے اسی خیال کی تائید و تقویت کے لئے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کرولاریوس نے اس عقیدہ کو بہت جلد شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک ان اختلافات نے کلیسہ ہائے مشرق و مغرب کے درمیان مخالفانہ کشمکش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام عائد کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کر کے حقیقی مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کشمکش کا یہ سلسلہ اس وقت تو انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں او بہیمانہ مظالم کا جہنم بن چکا تھا جبکہ اسلام اعتقادات کی سادگی اعمال صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت ''امن عام'' اور ''رحمت'' کا نیر درخشاں بنا ہوا تھا۔

زمنۂ مظلمہ اور اصلاحِ کنیسہ کی آواز

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسہ معمولی معمولی اختلافات کی بنا پر پوپ کی حکومت اور پیروان پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو وحشت ناک عذابوں میں مبتلا کر کے قتل کر دیا کرتی تھیں اسی بناء پر مورخین تاریخ کے اس دور کو ازمنۂ مظلمہ (زمانہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا پوپ اور کلیسا سے مرعوبیت نے اگرچہ ایک مدت مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔ مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کئے بغیر نہ رہ سکی، اس کی تفاصیل اگرچہ خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مذکور ہوں گی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پاک کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف آواز اٹھائی، مگر وہ آواز دب کر رہ گئی اور نقار خانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ بن سکی۔ مثلاً ۳۲۵ء اور ۳۸۱ء میں جب نیقادی کونسل اور قسطنطنیہ کونسل نے تثلیث کو دین مسیحی کی بنیاد قرار دیا اس وقت ابونیین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف انسان ہیں اور الوہیت کا ان سے کوئی علاقہ نہیں اور سابلئین کہتے تھے کہ اقانیم ثلاثہ، تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدتِ لاہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذاتِ واحد کے لیے اطلاق کرتا ہے تاہم اس وقت تک چونکہ پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے بشپ اور پاپا (اربابا من دون اللہ) یقین کیے جاتے تھے اس لیے ان اصلاحی آوازوں کو ''الحاد'' کہہ کر دبا دیا گیا۔ مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنے قریب کر دیا کہ انہوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بطارقہ (BATARIQA) بساقفہ (BISHAQIFA) کی غلط بیانی اور بہتان ان پر ظاہر ہونے لگی تب ان میں بھی آزادیٔ فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، چنانچہ لوتھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ ''ارباباً من دون اللہ'' کے بتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ میں کتابِ مقدس کی پیروی کی دعوت دی مگر آپ کو تعجب

ہو گا یہ سن کر کہ پوپ کی جانب سے لوتھر کی خلاف جو الحاد اور بد دینی کے الزامات لگائے تھے ان میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ در پردہ "مسلمان" ہو گیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے باز گشت ہے۔

بہر حال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلا شبہ اسلام کی دعوتِ تفکر و تعقل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاح کنیسہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اس کے شعلے نظر آنے لگے۔ ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدۂ ثالوث کتابِ مقدس (عہد نامۂ جدید) کے قطعی خلاف ہے۔ چنانچہ تیرہویں صدی عیسوی میں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سوسنیانیں---- جرمانیین--- موحدین-----اور عمومیین اور دوسری جماعتوں نے تعلیم کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل و عقل دونوں کے خلاف اور ناقابل تسلیم ہے اور اگرچہ قومی و مذہبی عصبیت نے ان کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انہوں نے عقیدۂ ثالوث باطل ہو کر توحیدِ الٰہی کے پاک اور مقدس جراثیم ہونے لگے۔ مثلاً سوئڈنبرگ نے کہا:

"اقانیم ثلاثہ" "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کا تعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات کے ماسوا ذات احدیت میں انسانی شکل کی تقیید کی وجہ سے "بیٹا" اور "اقنوم ثانی" ہے اور اس حیثیت سے کہ روح القدس کا صدور اس سے ہوا ہے وہ اقنوم ثالث "روح" ہے۔ غرض "ثالوث" کا تعلق صرف حضرت مسیح علیہ السلام سے ہے۔

اور کانٹ (CANT) کہتا ہے کہ:

عقیدۂ ثالوث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالم لاہوت میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب) حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ کے ان تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" "ضبط" کے نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں۔

اور ہیگل اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدۂ ثالوث حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں بلکہ ایک تخیلی نظریہ ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذاتِ وحدۂ لاشریک لہ ہے اور مسیح علیہ السلام، مخلوقِ خدا، لیکن عام خیال و تصور میں جب ہم لاہوتی علم کی جانب پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اس عالم میں خدا، مسیح علیہ السلام اور روح القدس کو "اب" "ابن" اور "روح" کی تعبیرات دیتا اور ان کی باہم تعلق کو اقانیم ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوتھرین" اور موحدین" اور "جرمانیین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو سابلیین کے عقیدہ کو اختیار کر کے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کی نشاۃِ جدید میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثالوث (تثلیث) پر ہی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلا شبہ شرکِ جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

قرآن اور عقیدۂ تثلیث

نزول قرآن کے وقت جمہور مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثالوث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جدا جدا اصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عین خدا ہے اور خدا ہی بشکلِ مسیح دنیا میں اتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا ہے) اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے:- باپ، بیٹا، مریم۔ اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرت مریم کی جگہ "روح القدس" کو اقنوم ثالث کہتا تھا۔ غرض وہ حضرت مسیح کو ثالث ثلاثہ (تین میں تیسرا) تسلیم کرتے تھے اس لیے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارہ میں راہِ حق ایک ہے اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے، باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطل محض ہے-----خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرت مسیح کی شانِ رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عند اللہ ان کو کیا قربت حاصل ہے؟ اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح یہود کے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جدا راہِ حق آشکارا نظر آنے لگے۔

حضرت مسیح خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں

قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝ وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا ۝

مسیح نے کہا "بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مبارک ٹھہرایا جہاں بھی رہوں اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نکوکار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بد بخت نہیں بنایا مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا، جب میں مر جاؤں اور جب میں حشر کیلئے زندہ اٹھایا جاؤں۔ (سورۂ مریم)

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ۝ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝

وہ (مسیح) نہیں ہے مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے اس کو مثال بنایا ہے بنی اسرائیل کے

لیے، اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلاشبہ وہ (مسیح علیہ السلام) نشان ہے قیامت کے لیے۔ پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

(سورۂ زخرف)

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَابَنِيٓ إِسْرَآئِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ ط

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے تورات اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام "احمد" ہے۔ (سورۂ صف)

حضرت مسیح علیہ السلام نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا ط وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کر لیا جنھوں نے یہ کہا "بیشک اللہ وہی مسیح بن مریم ہے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ یہ ارادہ کر لے کہ مسیح بن مریم مریم اور کائنات زمین پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے (اسکے خلاف) کسی شے کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اللہ کے لئے ہی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے اس کو پیدا کر سکتا ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوْٓا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَابَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ إِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ ○ (المائدہ)

بلاشبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کہا بلاشبہ اللہ وہی مسیح بن مریم ہے۔ حالانکہ مسیح نے یہ کہا: اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بیشک جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لئے کوئی مدد نہیں ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ط كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ ○

اور انھوں نے کہا: اللہ نے "بیٹا" بنالیا ہے وہ ذات تو ان باتوں سے پاک ہے، بلکہ (اس کے خلاف) اللہ کے لئے ہی ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ہر شئے اللہ کیلئے تابعدار ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ ط خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○

بلا شبہ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس کو کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ ط إِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلَاثَةٌ ط اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ إِنَّمَا اللّٰهُ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحَانَهٗ أَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ لَّهٗ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○

اے اہل کتاب اپنے دینی معاملہ میں حد سے نہ گزرو اور اللہ کے بارے میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو بلا شبہ مسیح ابن مریم اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ میں جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے حکم سے مریم کے بطن میں وجود پزیر ہوئے) اور اس کی روح ہیں پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہو گا بلا شبہ اللہ خدائے واحد ہے پاک ہے اس سے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کے لئے ہی (بلا شرکت غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ "وکیل" ہو کر۔

بَدِيْعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ط أَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ط وَّخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے لئے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کی بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر شے کا جاننے والا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط وَأُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ط كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ط

مسیح بن مریم نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلا شبہ ان سے پہلے رسول گذر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانے کھاتے تھے (یعنی دوسرے انسانوں کی طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ أَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيْعًا ○

ہرگز مسیح اس سے ناگواری نہیں اختیار کرے گا کہ وہ اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے حتیٰ کہ روح القدس "جبرئیل" ناک بھوئیں چڑھائیں گے اور جو عبادت سے ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب اکٹھا کرے گا یعنی جزاو سزا کے دن سب حقیقت حال کھل جائے گی۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارٰى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں، ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ○

اے محمد (ﷺ) کہہ دیجئے اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہستی، نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور کائنات میں کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

قرآن نے اس سلسلہ میں اپنی صداقت اور اصلاح عقائد و اعمال کا جو مدلل اور واضح اعلان کیا اس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ موجودہ کتاب مقدس کے محرف اور مسخ کردیئے جانے کے باوجود جس شکل و صورت میں آج موجود ہے وہ کسی ایک مقام پر بھی "ثالوث" کے اس عقیدہ کا پتہ نہیں دیتی جسکی تفصیلات و تشریحات ابھی سطور بالا میں علماءِ نصاریٰ، مذہبی کونسلوں اور کلیساؤں سے نقل ہو چکی ہیں اور بجز تعبیر کے جگہ جگہ حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے خدا کو "باپ" اور خود کو "بیٹا" ظاہر کیا گیا ہے اس کیلئے اور کوئی ثبوت واضح اور مصرح طور پر مہیا نہیں ہے پس اگر ہم اس سے قطع نظر بھی کرلیں کہ یہ تعبیرات "تحریفی" اور صنم پرستی کے تخیل کی رہین منت ہیں اور اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیں کہ خدائے برتر کی جانب سے سچی الہامی انجیل میں بھی یہ تعبیرات موجود تھیں تب بھی ان سے نصاریٰ کا عقیدہ "تثلیث" کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ "ابن" کا لفظ اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے اس انسان پر بولا جاتا ہے جو کسی کی صلب یا کسی کے بطن سے مادۂ منویہ کے ذریعہ پیدا ہوا ہو۔ تاہم محاوراتِ زبان اور اہل زبان کے استعمالات و اطلاقات شاہد ہیں کہ یہ لفظ کبھی مجاز کے طور پر اور کبھی تشبیہ یا کنایہ کے طریق۔ اور بھی مختلف معانی پر بولا جاتا ہے، مثلاً ایک بڑی عمر کا شخص اپنے سے چھوٹے کو مجازاً "ابن" (بیٹا) کہہ دیا کرتا ہے یا بادشاہ اپنی رعایا کو اولاد کہہ کر خطاب کرتا ہے یا استاد اپنے شاگردوں کو "بیٹا" کہہ دیا کرتا ہے یا جو شخص کسی علم و ہنر کا ماہر یا اس کی خدمت میں سرشار ہوتا ہے تو اس کو کنایۃً اس علم و ہنر کا بیٹا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں "ابن القانون" "ابن الفلسفہ" "ابن الفلاحۃ" "ابن الحدادہ" یا دنیا طلبی کی حرص و آرزو میں اگر حد سے گزر چکا ہے تو اسکو "ابن الدراہم" "ابن الدنانیر" کہہ دیا کرتے ہیں، اسی طرح مسافر کو

"ابن السبیل" مشہور شخصیت کو "ابن جلا" بڑے ذمہ دار انسان کو "ابن لیلہا" آنے والے دن سے بے پرواہ شخص کو "ابن یومیہ" دنیا ساز ہستی کو "ابن الوقت" کہتے ہیں یا جس کے اندر کوئی وصف نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے تو اس وصف کی جانب لفظ ابن کو منسوب کر کے ذات موصوف کو یاد کرتے ہیں مثلاً صبح کو "ابن ذکاء" کہتے ہیں اور ان تمام مثالوں سے زیادہ یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی امتوں کو ابناء اور اولاد کے ساتھ ہی خطاب کرتے اور نصائح و مواعظ میں یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ امم و آقا انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی روحانی اولاد ہوتی ہیں۔

اور یہی حال "اب" اور "باپ" کے اطلاقات و استعمالات کا ہے۔ ایک چھوٹا اپنے بڑے کو، ایک ضرورت مند اپنے مربی کو، ایک شاگرد اپنے استاد کو، ایک امتی اپنے نبی رسول کو "اب" اور "باپ" کہنا فخر سمجھتا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام اطلاقات مجاز، کنایہ اور تشبیہ کے طور پر کیئے جاتے ہیں اسی طرح بے نظیر مقرر اور خطیب کو "ابوالکلام" بہترین انشاء پرداز کو "ابوالقلم" ماہر نقاد کو "ابوالنظر" ڈراؤنی اور ہیبت ناک شے کو "ابوالہول" سخی کو "ابوالنجاد" فن کاشتکاری کے ماہر کو "ابوالفلاحہ" صنعت و حرفت کے حاذق کو "ابو الصنع" شب و روز بولتے رہتے ہیں۔

تو ان اطلاقات کے پیش نظر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب مقدس میں ذات احدیت پر اب (باپ) کا اطلاق رب حقیقی کی حیثیت میں اور حضرت مسیح پر ابن (بیٹا) کا اطلاق محبوب و مقبول الٰہی کی حیثیت میں ہوا ہے۔ یعنی جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان محبت و شفقت کا رشتہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محبت و شفقت کا وہ رشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اسکے مقدس پیغمبر مسیح علیہ السلام کے درمیان قائم ہے۔ ایک صحیح حدیث میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے استعارہ اور تشبیہ کو استعمال فرماتے ہوئے کہا ہے "الخلق عیال اللہ" (تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے)

پس روز مرہ کے محاورات و اطلاقات کو نظر انداز کر کے کتاب مقدس کے لفظ "اب" اور "ابن" کے ایسے معانی و مطالب مراد لینا جو صریح شرک کے مرادف ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ قباحت و شناعت کے ساتھ خدا کی ہستی کو تین اقانیم سے مرکب ظاہر کرتے اور خدا کے حصے بخرے بناتے ہوں" کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا اور صریح ظلم اور اقدام شرک ہے تعالیٰ اللہ علوًا کبیرا بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان ہی اناجیل میں بصراحت حضرت مسیح علیہ السلام کے انسان اور مخلوق خدا ہونے پر نصوص موجود ہوں مثلاً یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد مذکور ہے:۔ (باب آیت ۵۱)

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آسمان کو کھلا ہوا اور خدا کے فرشتوں کو اوپر جاتے ہوئے اور ابن آدم (مسیح) پر اترتے دیکھو گے"۔

اور باب ۱۳ میں بصراحت خود کو "رسول" کہا ہے:۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ "رسول" اپنے بھیجنے والے سے"۔

اور باب ۱۴ میں ہے:۔

''کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ ''نبی'' اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا''۔

اور باب ۳ میں ہے:۔

'اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اسکے جو آسمان سے اترا یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے''۔

اور باب ۶ میں ہے:۔

''پس جو معجزہ اس نے دکھایا وہ لوگ اسے دیکھ کر کہنے لگے جو نبی دنیا میں آنے والا تھا وہ فی الحقیقت یہی ہے''۔

اور انجیل متی میں[1] ہے۔

''لیکن ایسے کہ تم جان لو کہ ابن آدم (مسیح) کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے''۔

علاوہ ازیں اگر عہد نامۂ جدید میں حضرت مسیح ﷺ کیلئے ''ابن'' کا اطلاق موجود ہے تو نکوکار انسانوں پر بھی ''ابناء اللہ'' اور بدکاروں کیلئے ''ابناء ابلیس'' کا اطلاق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے:۔ (باب ۵ آیت ۹)

''مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے''۔

اور انجیل یوحنا میں ہے: (باب ۸ آیت ۴۰،۴۱)

''یسوع نے ان سے کہا: اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے''...... انہوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا''۔

لہٰذا عقیدۂ تثلیث میں نصاریٰ کیلئے موجودہ کتاب مقدس سے بھی کوئی حجت و دلیل نہیں ملتی اور اسلئے بغیر کسی شک و ریب کے یہ کہنا حق ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث صنم پرستانہ عقائد کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

لائق توجہ بات

یہ بات کبھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ ادیانِ ملل سابقہ کے مسخ و تحریف میں تحریف کرنے والوں کو اس سے بہت زیادہ مدد ملی کے بنیادی عقائد میں صراحت اور وضاحت کی جگہ وقت کے معبروں، مفسروں اور ترجمانوں نے کنایات، استعارات اور تشبیہات سے بہت زیادہ کام لیا۔ ان تعبیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان مذاہب حق کا صنم پرستوں اور فلسفیوں سے واسطہ پڑا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس دین حق کو قبول کر لیا تو اپنے فلسفیانہ اور مشرکانہ افکار و خیالات کیلئے ان ہی استعارات اور تشبیہات کو پشت پناہ بنایا اور آہستہ آہستہ ملت حقیقی کی شکل و صورت بدل کر اس کو معجونِ مرکب بنا ڈالا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر قرآن عزیز نے وجود باری، توحید، رسالت، الہامی کتب، ملائکۃ اللہ، غرض بنیادی عقائد میں ذو معنی الفاظ، پر پیچ تشبیہات ور توحید میں خلل انداز استعارات و کنایات کی بجائے واضح صریح اور غیر مبہم اطلاقات کو اختیار کیا ہے تاکہ کسی ملحد، زندیق اور مشرک فلسفی کو توحید خالص میں شرک اور اوہام و ظنون کی نکتہ آفرینیوں کا موقع ہاتھ نہ آنے پائے اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی بے جا جسارت کرے تو خود قرآن عزیز کی نصوص صریحہ ہی اس کے الحاد

---

[1] باب ۹ آیت ۶۔

کو پاش پاش کر دیں۔

کفارہ

موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دین مسیحیت کی حقیقت کو برباد کر ڈالا ''کفارہ'' کا عقیدہ ہے اس کی بنیاد اس تخیل پر قائم ہے کہ تمام کائنات ''جس میں نیکو کار اور انبیاء و رسل سب ہی شامل ہیں'' ابتداء آفرینش سے ہی گنہگار ہے، آخر رحمت الٰہی کو جوش آیا اور اس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ بیٹے کو کائنات ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اول و آخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اس طرح دنیا کو نجات اور رستگاری حاصل ہو سکے لیکن اس عقیدے کے قوام بنانے کیلئے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی تھی اسلئے ''عہد رسول میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اس عقیدے کو تسلیم کر لیا کہ ان کو صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرف قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ ''الوہیت'' کے باوجود مسیح علیہ السلام کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لیئے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کیلئے تھا۔ چنانچہ جب اس پر یہ حادثہ گذر لیا تو اس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالم لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہو گیا۔

پس جب مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحت عقیدہ اور نیک عملی مفقود ہو کر نجات کا دارومدار عمل و کردار کی بجائے ''کفارہ'' پر قائم ہو جائے اس کا حشر معلوم؟

قرآن نے اسی لیئے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کیلئے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا پرستی اور نیک عملی کا ماسوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اس ''راہِ مستقیم'' کو ترک کر کے خوش عقیدگی اور اوہام وظنون کو اسوہ بنائے گا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہو گا بلا شبہ گمراہ ہے اور راہِ مستقیم سے یکسر محروم:

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰى وَالصَّابِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

جو لوگ اپنے کو مومن کہتے ہیں اور جو یہودی ہیں اور جو نصاریٰ ہیں اور جو صابی ہیں ان میں سے جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا اور اس نے نیک عمل کیئے تو یہی وہ شخص ہیں جن کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر خوف طاری ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یعنی قرآن کی دعوت واصلاح ادیان و ملل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی، نصرانی، صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مومنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کر دے کہ گویا وہ بھی ایک قومی، نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو۔ مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے۔ قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ اس کی دعوت حق سے پہلے کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اگر

اس نے (قرآن کی تعلیم حق) کے مطابق خداپرستی اور نیک عملی کو اختیار کرلیا ہے بلاشبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا اور پلا اور بڑھا اور اسی سوسائٹی میں زندگی گزار کر مر گیا۔ مگر قرآن کی دعوت حق کے مطابق خداپرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم رہا یا مخالف تو اس کیلئے نہ کامیابی ہے اور نہ فوز و فلاح۔ باقی رہا مسیحیت کے کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اس کے ابطال اور تردید کیلئے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اس کو قائم کیا گیا تھا ان کی ہی جڑ کاٹ دی۔ چنانچہ گذشتہ سطور میں صلیب اور قتل مسیح علیہ السلام کے انکار، رفع الی السماء کے اثبات کے مبحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔

حضرت محمد ﷺ

- محمد ﷺ اور قرآن
- بشارات النبی ﷺ
- صبح صادق
- تاریخ ولادت کی تحقیق
- نسبِ مبارک یتیمی
- بت پرستی سے نفرت
- خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق
- حقیقتِ وحی
- صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل
- بعثت
- حدیث بخاری
- بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق
- نبی اور مصلح
- کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی
- نزول وحی کا پہلا دور
- نزول وحی کا دوسرا دور
- دعوت وارشاد کی پہلی منزل
- دعوت وارشاد کی دوسری منزل
- دعوت وارشاد کی تیسری منزل (بعثت عامہ)
- دعوتِ اسلام کا مجمل خاکہ
- قرآن اور تجدیدِ دعوت
- توحید ورسالت
- یوم آخرت
- اسراء (معراج)
- ہجرت
- غزوات
- غزوۂ بدر
- غزوۂ احد
- غزوۂ خندق یا احزاب
- واقعہ حدیبیہ
- معاہدۂ صلح
- فتح مکہ (الفتح الاعظم)
- حاطب بن بلتعہ کا واقعہ
- بت شکنی
- خطبہ غزوۂ حنین
- غزوۂ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب کا واقعہ
- غزوات اور نتائج وبصائر
- تبنی
- خرافی داستان
- بصائر
- بنو نضیر
- بصیرت
- واقعہ افک
- موعظت بناء فاسق

- موعظت
- مسجد ضرار
- وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ
- عبرت وموعظت

محمد ﷺ اور قرآن

قرآن کلام الٰہی ہے اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ اس کے مہبط ہیں، وہ ان پر نازل ہوا ہے، قرآن، علم ویقین کی روشنی ہے اور ذات اقدس ﷺ اس کا عملی نمونہ اسوہ اور نقشہ ہیں: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ قرآن رشد وہدایت ہے اور محمد ﷺ راشد وہادی، قرآن حق وصداقت کیلئے دعوت وپیغام ہے اور نبی اکرم ﷺ اس کے داعی اور پیغمبر، اسلئے قرآن کا ہر ایک جملہ اور اس کی ہر ایک آیت کسی نہ کسی حیثیت میں ذات قدسی صفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ کہا جائے کہ قرآن میں اتنی جگہ اس مقدس ہستی کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نبی اکرم ﷺ کے کچھ حالاتِ زندگی ہم کو سنائیں۔ صدیقہ عائشہؓ نے نگاہ تعجب سے دریافت کیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے جو مجھ سے خلق نبی کے متعلق سوال کرتے ہو۔ "فان خلقه كان القرآن" آپ ﷺ کی تمام اخلاقی زندگی قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی، قرآن جو کچھ کہتا ہے محمد ﷺ نے اس کو کر دکھایا۔ پس قرآن کے کسی حصہ کو سامنے لانا گویا حیات طیبہ کا پیش نظر لے آنا ہے۔

البتہ قرآن عزیز نے جن آیات میں آپ ﷺ کے اسمائے گرامی یا اوصاف عالی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ اور يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ کہہ کر مخاطب کیا، اس کی تفصیل مسطورہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقشہ میں نبی اور رسول کے علاوہ جن اسماء اور اوصاف کی تفصیل مسطور ہے وہ یہ ہیں:۔

۱	محمد	۲	احمد	۳	عبداللہ
۴	شاہد	۵	بشیر	۶	نذیر
۷	مبشر	۸	مذکر	۹	عزیز
۱۰	رؤف	۱۱	رحیم	۱۲	امین
۱۳	مزمل	۱۴	مدثر	۱۵	منذر
۱۶	ہادی	۱۷	یٰسین	۱۸	رحمۃ
۱۹	نعمۃ	۲۰	طٰہٰ	۲۱	نور
۲۲	حق	۲۳	سراج منیر	۲۴	شہید
۲۵	داعی الی اللہ	۲۶	خاتم النّبیین	۲۷	نبی
۲۸	رسول	۲۹	عبدہٗ		

نقشہ

نمبر شمار	نام یا صفت	سورة	آیات
۱	محمد	آل عمران	۱۴۴
		احزاب	۴۰
		محمد	۱
		الفتح	۱۹
۲	احمد	صف	۶
۳	عبد اللہ	جن	۱۹
۴	شاهد	الفتح	۸
		احزاب	۴۵
		مزمل	۱۵
۵	مبشر	احزاب	۴۵
		فتح	۸
		فرقان	۵۶
۶	بشیر	نساء	۱۹
		اعراف	۱۸۸
		ہود	۲
		سبا	۲۸
		فاطر	۲۴
۷	نذیر	بقرہ	۱۱۹
		عنکبوت	۵۰
		نساء	۱۹
		اعراف	۱۲۸
		ہود	۲
		حجر	۸۹

		فاطر	۲۳،۲۴،۳۷،۴۲،۴۶
		الفتح	۹
		الذاریات	۵۰،۵۱
		ملک	۸،۹،۱۷،۲۶
		فرقان	۵۶
		بقرہ	۱۱۹
		سبا	۲۸،۴۶
		ص	۷
		احقاف	۵
۸	مذکر	الغاشیہ	۲۱
۹	سراج منیر	فاطر	۴۶
۱۰	داعی الی اللہ	فاطر	۴۶
۱۱	حق	یونس	۱۰۸
۱۲	عزیز	توبہ	۱۲۸
۱۳	رؤف	توبہ	۱۲۸
۱۴	رحیم	توبہ	۱۲۸
۱۵	امین	دخان	۱۹
۱۶	نور	مائدہ	۱۵
۱۷	نعمۃ	بقرہ	۲۳۱
		نمل	۸۱
۱۸	ہادی	روم	۵۳
۱۹	رحمۃ	انبیاء	۱۱۷
۲۰	طٰہٰ	طٰہٰ	۱
۲۱	یٰسین	یٰسین	۱
۲۲	مزمل	مزمل	۱
۲۳	مدثر	مدثر	۱

۲۴	مدثر	نمل	۲۹
۲۵	خاتم النبیین	احزاب	۴۰
۲۶	نبی	آل عمران	۱۶۱
		اعراف	۱۵۷_۱۵۶
		مائدہ	۸۱
		انفال	۶۴،۶۵،۶۷،۷۰
		برأۃ	۶۱،۷۳،۱۱۳
		حجرات	۲
		احزاب	۱،۲۸،۳۲،۲۸،۴۶
		فاطر	۵۰،۵۲
		تحریم	۱،۳،۸،۹
		طلاق	۱
		ممتحنہ	۱۲
	رسول	بقرہ	۱۴۲،۲۵۰
		آل عمران	۲۳،۸۱،۸۶،۱۰۱،۱۳۲،۱۵۳،۱۷۲،۱۷۹،۱۸۳
		نساء	۱۴،۵۲،۶۱،۶۴،۶۹،۷۹،۸۰،۱۰۰،۱۱۵،۱۳۶،۱۷۰
		مائدہ	۱۵،۳۲،۴۱،۵۵،۵۶،۶۷،۸۶،۹۲،۹۹،۱۴۰
		اعراف	۱۵۷،۱۵۸
		انفال	۱،۱۲،۲۴
		توبہ	۱،۳،۷،۱۶،۲۴،۲۶،۲۹،۳۳،۵۴،۵۹،۶۳،۶۵،۸۰، ۸۱،۸۴،۸۶،۸۸،۹۱،۹۴،۹۷،۹۹،۱۰۵،۱۰۷،۱۲۸
		نحل	۱۱۳
		اسراء	۹۳
		حج	۷۸
		مومن	۷۸
		زخرف	۲۹

حدید ۹

کہف ۱

قرآن عزیز اور صحیح احادیث میں نبی اکرم کے جن اسماء و صفات کا ذکر ہے، علماء اسلام نے اس پر مستقل تصانیف کی ہیں اور ابن دحیہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس پر قلم اٹھایا۔ ان کے علاوہ ابن کثیر، بیہقی، ابن عساکر (رحمہم اللہ) جیسے محدثین نے ان تمام احادیث و آثار کو یکجا جمع کر دیا ہے جن میں آپ کے اسمائے صفات اور القاب مذکور ہیں۔ مشہور محدث ابی بکر بن عربی نے شرح ترمذی میں ان کی شمار چونسٹھ کرائی ہے۔ بعض نے ننانوے بعض نے تین سو اور بعض اہل علم نے ان کو ایک ہزار تک[1] پہنچایا ہے۔ مگر یہ کثرت تعداد اسلئے صحیح نہیں ہے کہ اس شمار میں ان تمام انتسابات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کسی مناسبتِ حال سے آپ کی جانب منسوب ہیں اگرچہ بحیثیت اسماء صفات یا القاب کے ان کا اطلاق ذات اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے درمیان صفتِ نبوت کے تعلق کو ظاہر اور ختم نبوت کو واضح کرنے کیلئے خود کو قصر نبوت کی آخری لبنہ (اینٹ) فرمایا ہے تو جن بزرگوں کو آپ کے اسماء و صفات کی کثرت سے شغف تھا، انہوں نے صفات النبی میں "اللبنہ" کو بھی شمار کر لیا۔ (فتح الباری ج۶ ص ۴۳۶)

الشاہد، البشیر، النذیر، المبین، الداعی الی اللہ، السراج المنیر، المذکر، الرحمۃ، النعمۃ، الہادی، الشہید، الامین، المزمل، المدثر۔ لیکن ہماری فہرست کے مقابلہ میں یہ فہرست ناقص ہے۔ جن اسماء و صفات کا ذکر نقشہ میں ہے وہ بھی جمہور کے نزدیک مسلم، حافظ ابن حجر (رحمہ اللہ) یہ بھی لکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکور اسماء و صفات میں سے حسب ذیل صفات بہت مشہور و معروف ہیں:۔

"المتوکل، المختار، المصطفیٰ، الشفیع المشفع، الصادق المصدوق"

بہر حال محمد اور احمد دو اسماء علم (نام ہیں اور باقی اسماء صفات والقاب ہیں اور قرآن میں آپ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورۃ کا نام سورۂ محمد ہے جس کے شروع میں ہی آپ کا اسم گرامی مذکور ہے۔

اور صرف ایک جگہ سورۂ صف میں احمد منقول ہے یعنی حضرت مسیح کی اس بشارت کے تذکرہ میں یہ نام آیا ہے جو آپ کی آمد سے متعلق انہوں نے بنی اسرائیل کو سنائی تھی:

یہ حقیقت بھی قابل فراموش نہیں ہے کہ آپ کے اسماء و صفات محض رسمی نہیں ہیں کہ والدین نے جو چاہا نام رکھ دیا اور احباب واصحاب نے جس صفت ولقب سے جی چاہا پکار لیا بلکہ ان سماءِ صفات کا آپ کی زندگی اور آپ کے اخلاق واعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ ابھی ماحی، حاشر اور عاقب کے متعلق خود زبانِ وحی ترجمان سے سن چکے ہو یا مثلاً محمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے تذکرے ہمیشہ خوبی اور نیک گوئی کے ساتھ ہوتے ہوں۔ یہ انبیاء سابقین (علیہم السلام) کی بشارات اور مستقبل میں تذکرہ ہائے حیات کی جانب اشارہ ہے اور احمد اس ذات پر اطلاق ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمد الٰہی کیلئے نغمہ سنج ہو۔ یہ ذات اقدس کی عبدیت کاملہ اور انسان

۱: فتح الباری ج۶ ص ۴۳۵۔

کامل ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ آپ خداپرست انسانوں کیلئے مبشر و بشیر اور فتنہ جو مفسدوں، کافروں او رمشرکوں کیلئے منذر و نذیر ہیں۔ روزِ قیامت، صادق وکاذب دونوں پر شاہد و شہید ہیں، چشمِ حق بین اور گوش حق نیوش کیلئے مذکر (ناصح) ہیں۔ راہِ حق سے بھٹکے ہوؤں کیلئے ہادی ور خدا سے بھاگے ہوؤں کیلئے داعی ہیں۔ ان کا وجود رحمۃ ہے کائناتِ عالم کیلئے اور ان کی ہستی نظام کائنات کیلئے نعمۃ ہے۔ جہل و شرک کیلئے نور ہیں اور پیغامِ الٰہی کیلئے نبی ورسول، مصائب و آلام میں عزیز ہیں اور نوعِ انسانی کے ہر ایک گوشۂ حیات کیلئے رؤف ورحیم، ان کی صدا، صدائے حق ہے اور ان کی ذات الصادق الامین، قرآن خدا کا آخری پیغام ہے، اسلئے وہ خاتم النبیین ہیں، ان کی بعثت عالمگیر ہے۔ اس لیئے طٰہٰ و یٰسین ہیں اور آسمان نبوت کے سراجِ منیر ہیں اور کائناتِ رسالت کے بشیر و نذیر، عالم ادیان وملل کی سلطانی کے باجود گدائے کملی پوش ہیں۔ اسلئے مزمل ہیں اور مدثر، پھر باایںہمہ حسن کمال انما انا بشر اور انا عبد اللہ کے مصداق ہیں اللھم صل وسلم و بارك علیه۔ خداپر توکل اس کا شعار ہے اسلئے متوکل اس کا وصف عالی وقار ہے اور وہ خدائے برحق کا برگزیدہ و مختار ہے بارگاہِ الٰہی میں ابرار و مقربین سے بھی زیادہ مصطفیٰ، مجتبیٰ، نکوکار و صالحین کیلئے الشفیع المشفع اور ہر ایک شعبہ ہائے حیات میں الصادق المصدوق ہے۔ ﷺ ۔

ہم جانتے ہیں کہ اظہارِ مقصد کیلئے یہ اشارات کافی نہیں ہیں بلکہ اپنے معنوی مناسبات کے لحاظ سے ہر ایک وصف و نام قرآن سے شہادت کا طالب ہے اور قرآن کی شہادت بلاشبہ ہر ایک گوشہ کی تفصیل کیلئے شاہد عدل لیکن افسوس کہ کتاب کا موجودہ ترتیبی نقشہ اس کا متحمل نہیں ہے۔ اسلئے صرف آیات کے حوالجات اور ارشادات پرہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بشارات النبی ﷺ

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَآ آتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنصُرُنَّهٗ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ ط قَالُوْٓا أَقْرَرْنَا ط قَالَ فَاشْهَدُوْا وَأَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشَّاهِدِيْنَ ۝

اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد کیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطا کروں اور پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم ضرور اس پر ایمان لانا اورضرور اس کی مدد کرنا (پھر) اللہ نے فرمایا کیا تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو تو انہوں نے کہا بیشک ہم اقرار کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا اب تم اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اس آیت "میثاق" میں اس عہد ومیثاق کا تذکرہ ہے جو ازل میں تمام انبیاء ورسل (علیہم السلام) سے خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے متعلق لیا گیا، خطاب اگرچہ براہِ راست انبیاء علیہم السلام سے ہے۔ مگر مقصود و مراد میں ان کی امتیں بھی شامل ہیں کیونکہ عمومی طور پر ان ہی کے ذریعہ وفاءِ عہد کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

اس عہد میثاق کو اس درجہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات کچھ تمہید کی محتاج ہے مادیات وروحانیت پر فاعل

مختار کا ایک ہی ہستی ہے اور وہ خدا ہے مگر مادیات میں خدائے برتر کے جاری قانون فطرت کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور ہم کو محسوس نظر آتا ہے اس کے برعکس عالم روحانیات حواسِ خمسہ سے بلند احساسات تعقل و تفکر کا محتاج ہے۔ یہاں وجدان و شعور جب عقل و فکر کو رہنما بناتے اور دونوں راہنما ریب و شک اور اوہام و ظنون سے محفوظ "سلیم" بن کر رہنمائی کا حق ادا کرتے ہیں تو انسان کے سامنے روز روشن کی طرح یہ حقیقت چمک اٹھتی ہے کہ خدائے واحد کی احدیت و یکتائی عالم مادیات روحانیت میں ایک ہی قسم کے قانون فطرت کو نافذ رکھتی ہے۔

اب ذرا دیدۂ عبرت کو وا کیجئے اور کائناتِ ہست و بود پر نظر ڈالیئے تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی ملے گی کہ ذات واحد کے ماسوا یہاں کائنات کی ہر ایک شے کیلئے دو ہی سرحدیں مقرر ہیں آغاز و انجام اور درمیان کی تمام کڑیاں نشو و ارتقاء کیلئے وقف ہیں ہر ایک چیز شروع ہوتی اور درمیان دور میں ترقی پذیر رہتی اور پھر حد کامل کر پہنچ کر اپنی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اس کو انجام اور شروع کو آغاز کہتے ہیں۔

روحانیت میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے نسل انسانی کا جب آدم علیہ السلام سے آغاز ہوا تو مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت کو بھی ساتھ لایا۔ وہ اگر ایک جانب نسل انسانی کے مادی باپ تھے تو دوسری جانب خدا کی بخشی ہوئی ہدایت و صداقت کیلئے "نبی" اور "ایلچی" بھی تھے اور جب کہ خدا کی ہستی ایک اور اس کی بنیادی صداقت و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہے تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی رشد و ہدایت اور خدا پرستی کی بنیادی تعلیم کا سلسلہ بھی ایک ہی لڑی میں پرویا جائے اور آغاز سے انجام تک اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوں کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلۂ روحانیت کی تکذیب کے مترادف ہو۔ چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح ظاہر کیا ہے: لا نفرق بين احد من رسله ہم ایمان و تصدیق میں خدا کے کسی ایک پیغمبر کے درمیان بھی تفریق جائز نہیں رکھتے اور اسی کو زبانِ وحی ترجمان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: نحن بنو علات ديننا واحد ہم تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات اصل و بنیاد میں اسی طرح ایک ہیں جیسا کہ علاتی بھائی کہ ان سب کا باپ ایک ہی ہے۔

پھر اس سلسلۂ روحانیت کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ مگر آغاز اور نشو و نما اور دورِ کمال و انجام کے پیش نظر اسی طرح باہم فرق مراتب رکھتی ہیں جس کا مظاہرہ ہم کو عالم مادیات کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے اور جسکو ہم فطری (NATURAL) کہتے ہیں اور ان درجات و مراتب میں بھی درجہ کمال کو جس سے کہ انجام کی سرحد ملتی ہے (CENTER) اور قطب رحی (چکی کی کیلی) ہوتا اور وابستہ و پیوستہ کی منزل مقصود سمجھا جاتا ہے۔ گذرا ہے، اس وقت دنیائے انسانی ایک چھوٹے سے کنبے کی طرح آباد تھی اور نسل انسانی کا باپ ہی روحانی طبیب بھی تھا لیکن جب سلسلۂ بود و ماند آہستہ آہستہ خاندانوں، برادریوں قبیلوں سے آگے بڑھ کر قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا اور وحدت نے کثرت کی ہی شکل نہیں اختیار کر لی بلکہ کثرت میں بھی تنوع پیدا ہونے لگا تو ان مادی نشو و نما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت نے بھی نقطۂ وحدت پر قائم رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک قوم و ملک میں جدا جدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے دعوتِ حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا۔ اگرچہ ان کی دعوتوں کی بنیاد سر تا سر ایک ہی "اصل و بنیاد" پر قائم تھی:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلَّا الَّذِيْنَ أُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ط وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

ابتداء میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے ایک ہی قوم و جماعت تھے (پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور الگ الگ ٹولیاں بن گئیں) پس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا وہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے اور انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے نیز ان کے ساتھ کتابِ الٰہی نازل کی گئی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو اور تمام لوگوں کو راہِ حق پر متحد کر دے) جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اسلئے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے، نہیں وحی الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھادی جس میں لوگ مختلف ہو رہے تھے اور للہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ط وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ (یونس، پ ۱۱ ع ۷)

اور (ابتدا میں) انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔

لیکن خدائے واحد کی جانب سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اگرچہ وقتی تقاضہ کے پیش نظر ہزاروں برس تک قوموں اور ملکوں میں تنوع اختیار کیئے رہا۔ تاہم وہ اپنے مقصدِ وحدت کو فراموش نہ کر سکا اور بنیادی وحدت کے ساتھ اس عارضی کثرت کو بھی ایک ہی نقطۂ وحدت پر لانے کیلئے اس وقت تک برابر حرکت کرتا رہا جب تک کہ اپنے مرکزِ وحدت اور مقصدِ کمال کو نہ پا سکا۔

یعنی خدا کی صداقت کا پیغام اگرچہ جدا جدا قوموں اور ملکوں میں نبیوں اور پیغمبروں کی زبانی پہنچایا جاتا رہا اور گو ان تمام پیغامات میں فروعی اور وقتی تنوع سے قطع نظر اساسی اور بنیادی وحدت قائم رہی۔ مگر خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کی اساسی وحدت کا تقاضہ یہی تھا کہ یہ مختلف دعوتیں اور پیغامات سمٹ کر ایک ایسے نقطہ اور مرکز پر آجائیں کہ وہ تمام کائنات کیلئے بیک وقت اور رہتی دنیا تک ایک ہی پیغام بن کر اپنی نمود دکھلائے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کی بعثت، بعثتِ عام ہو اور جس کی دعوت، عالمگیر دعوت ہو تاکہ پھر اس تنوع اور کثرت کی ضرورت باقی نہ رہے۔

عالم روحانیات کی اپنی "مثلِ اعلیٰ" یا اپنے محور و مرکز کی جانب یہ حرکت جب کہ عالم مادیات کے نشو و ارتقاء

کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اور خالق کائنات کا قانون فطرت جب کہ دونون سمتوں میں ایک ہی اصل پر کار فرما ہے تو یہ بھی از بس ضروری ہوا کہ انسانی کے ارتقاءِ دماغی و عقل کی استعدادات اپنے رشد و کمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ حجابِ مستقبل میں میں مستور تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور گو اس سلسلہ میں ایک مدت کیوں نہ ہو جائے مگر کائناتِ ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ اسباب مادی کی بناء پر ایک کنبہ اور ایک خاندان بن کر رہ جائے اور ملکوں اور قوموں کی بہتات و کثرت کے باوجود کسی ایک گوشہ کے حرکت و سکون کے اثر سے تمام کائنات متأثر ہونے پر مجبور ہو جائے تاکہ اس وقت عالم روحانیات کا آخری ارتقاء کائناتِ انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی دعوت کی یکتائی و وحدت سے متأثر کر سکے اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کنبہ بن جائے اور مساواتِ عالم اور اخوت ہمہ گیر کا مظاہرہ کر دکھائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ یدن حق صرف تعلیم قرآن ہی میں منحصر ہو کر رہ جائے۔

تاریخ اقوام و ملل شاہد ہے کہ قرآن کی دعوت و اصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اس وقت دنیا کے تمام مذاہب و ادیان خود اصحاب مذاہب کی تاریخی اقوال کے مطابق اپنی حقیقی روشنی کو یکسر فراموش کر چکے[1] تھے اور دنیا کے ہر گوشے اور ہر سمت میں مذہبن و دھرم اور نظام سوسائٹی تنگی و تاریکی اختیار کر چکا تھا۔ اس وقت قرآن کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور ان کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کر دیا اور اقوام و امم نے بہ عجلت یا بہ دیر، اعتراف و اقرار کے ساتھ یا حاسدانہ انکار کے ساتھ مذہب اور سوسائٹی دونوں میں اسی کی اصلاحات کو اپنایا اور قبول اصلاحات کے بغیر آنے والی دنیا میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

توحید کامل اور خالص خدا پرستی، نسل و خاندان یا کفارہ کی جگہ خدا پرستی اور نیک عملی پر مدار نجات، نسلی غرور و تفاخر کا انہدام، کاسٹ سسٹم کا خاتمہ، حقوق انسانیت میں تمام افراد انسانی کی مساوات، اخوت عام کی داغ بیل، رواجی غلامی کے خلاف اصلاح و انقلاب کی تشکیل، عورتوں کیلئے حقوق انسانیت میں مساوات کا اعلان اور حقوق صنفی میں امتیازی احکامات، انقلاب و اصلاح، وراثت، ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رواج کا خاتمہ اور جدید مفید اصلاحات (خلع و طلاق وغیرہ) زکوٰۃ کے وجوب، سود و قمار کی حرمت اور دوسری اصلاحات کے ذریعہ اقتصادی نظام میں "بنیادی انقلاب، انفرادی اور اجتماعی ملکیت کی تسلیم اور دونوں کے مابین تجدیدی اعتدال کا اعلان، سیاسی اور ملکی نظام میں بادشاہت شخصی اور پارٹی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ شوروی نظام کی تشکیل ایسے اہم امور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند عاقل کے نزدیک ان کی صداقت و افادیت تسلیم ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو بلا شبہ یورپ و ایشیا میں افریقہ و امریکہ میں سوسائٹی کے نظام اور مذہب و دھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی اس تعلیم اور اعلانِ حق کے بعد اٹھیں اگر بغیر کسی تعصب کے تاریخی انقلابات پر غور کیجئے گا تو ان میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی صدا کی بازگشت پائیں گے جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ کو تاریخ عالم میں سچ کر دکھایا۔

---

[1] اس سلسلہ کے حوالجات آئندہ تعلیم الاسلام اور مسئلہ ختم النبیین کے مبحث میں ذکر ہوں گے۔

تاریخی حقائق کی روشنی میں اب پھر ہم کو گذشتہ مضمون کی جانب واپس جانا چاہئے کہ جبکہ مادی استعدادات نشو نما پا رہے تھے اور چند صدیوں بعد جو قوموں کے انقلابات و اصلاحات کیلئے چند برسوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ مادی اسباب کی بدولت یہ سارا کارخانۂ عالم ایک کنبہ بن جانے والا تھا۔ اس وقت از بس ضروری ہوا کہ "وحدتِ مذہب" کی روحانی صدا بلند ہو اور اس کی صدائے حق کسی خاص قوم اور ملک کی بجائے کائنات کے ہر گوشہ کیلئے یکساں حیثیت رکھے۔

پس منشائے تقدیرِ الٰہی یہ ہوا کہ ایسے پیغام اور پیغمبر کی نصرت و حمایت کیلئے ازل ہی میں انبیاء و رسل سے عہد و میثاق لیا جائے اور ان کو مطلع کیا جائے کہ جب وہ پیغامِ کامل اور "آخری صدائے حق" بلند ہو جس کا تعلق رہتی دنیا تک تمام کائناتِ ارضی کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے تو وہ اور ان کی امتیں اسکو قبول کریں اور اس کی مدد فرض سمجھیں کیونکہ کائناتِ روحانی کا یہی مرکزِ وحدت اور نقطۂ مثلِ اعلیٰ ہے چنانچہ یہ وہ عہد میثاق ہے جس کو تمام امتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت "بشارات" کی شکل میں سنا اور آج بھی دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں خواہ وہ امتدادِ زمانہ کی بناء پر شرک کی آلودگیوں سے قطعاً منحرف ہو چکے ہوں یا ان میں تحریف و صداقت کا امتزاج قریبی دور سے وابستہ ہو۔ او تاریانبی مرسل کی معرفت کے ساتھ ایک "منتظر ہستی" کا مشترک عقیدہ پایا جاتا ہے۔ "یہود مسیح" کے علاوہ بھی "ایلایا" یا وہ نبی کہہ کر اس کی آمد کے منتظر ہیں، نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود مسیح کے بعد فارقلیط (پیر اکلیوطاس) بمعنی (احمد) یا "روحِ حق" یا "ناصر" وغیرہ صفات کے تعارف سے اسی کے انتظار میں ہیں۔ مجوس آج تک ایک "نجات دہندہ" کا انتظار کر رہے ہیں اور ویدک دھرم (سناتن دھرم) ہندوؤں میں بھی ایک "اوتار" کا انتظار ہو رہا ہے۔ اور آج عقلیت کے نام پر اس "ہستی منتظر" کے عقیدہ کتنا ہی مضحکہ خیز سمجھا جائے اور خود مذہبی افراد اپنے اپنے مذہب کے اس عقیدہ کو کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ٹھہرائیں لیکن ان کے پاس اس کا جواب کچھ نہیں ہے کہ مذاہب و ادیان کے موجودہ اختلافات کے باوجود چھوٹے سے ناستک گروہ کو چھوڑ کر ہزارہا برس کائناتِ انسانی میں اس عقیدہ کو کسی نہ کسی شکل میں مشترک عقیدہ بنا رہنا اس کے "حقیقت" ہونے کی ناقابلِ انکار دلیل ہے۔ البتہ یہ بات جدا ہے کہ جس طرح یہود نے ازراہِ حسد "مسیح ہدایت کے انتظار کے باوجود" حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو قبول نہ کیا اسی طرح مذاہبِ عالم کی اقلیت کو چھوڑ کر جو کہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئی ان کی اکثریت نے محمد ﷺ کو قومی و ملکی عصبیت اور گروہ بندی کی بندشوں کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا ان کی دعوتِ حق کو عرب کیلئے محدود قرار دے کر خود کو اس سے علیحدہ کر لیا۔

بہر حال ہندوستان کا قدیم مذہب چونکہ حقیقتِ مذہب کو فراموش کر چکا اور اس کی موجودہ شکل نے کسی طرح قدیم شکل و صورت کو بدل کر نیا رخ اختیار کر لیا اور اس کی تاریخ خود اس کے اپنے پاس بھی نہیں ہے اور اب اس کی تمام بنیاد صرف آبائی رسوم پر یا چند مخصوص فلسفیانہ عقائد پر قائم ہے۔ اسلئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ 'منتظر ہستی' کے متعلق جو روایات رکھتے ہیں، ان کی اصل حقیقت کیا تھی اور یہ حال بدھسٹ کا بھی ہے۔ اسلئے ہم ابو ریحان بیرونی اور بعض دیگر مفسروں اور مؤرخوں کے ان بیانات سے قطع نظر کرتے ہیں۔ جو انہوں نے ہندوؤں کے عقیدہ "کلنکی اوتار" کے "شنبلی" میں نزول کو محمد ﷺ پر منطبق کرنے کی سعی کی ہے۔

اور یہاں صرف یہود و نصاریٰ پر نازل کتب سماویہ تورات، زبور اور انجیل سے ہی ان بشارات کو پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ جن میں تحریف کے باجود اب بھی اصل کتاب کی چمک باقی ہے اور علمائے یہود و نصاریٰ کے پاس انطباق کے انکار کی موجہ دلیل موجود نہیں ہے، چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہٗ) کی میزان الحق اور حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاریٰ اور باجہ جی زادہ کی الفارق وغیرہ کتب سے اور ان مناظراتِ مطبوعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو علماءِ نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان ان بشارات سے متعلق پیش آئے ہیں اور جن کے متعلق بعض علماء نصاریٰ کو اقرار و اعتراف کے ماسوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔

تورات اور بشارات

تورات کتاب استثناء میں ہے:۔

خداوند تیرا خدا تیرے لیئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی طرف کان دھریو، اس سب کی مانند جو تو نے خداوند اپنے خدا سے جوب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ پھر دیکھوں تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھے کہا کہ انہوں نے (بنی اسرائیل نے) جو کچھ کہا سو اچھا کیا۔ "میں ان کیلئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا"۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو کہ جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ بھی اگر ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ (باب ۱۸، آیت ۲۱۔۱۵)

نشان زدہ جملوں کو غور سے پڑھئے اور پھر ہر ایک جملہ کی حقیقت کو تاریخی روشنی میں دیکھئے تو تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ایک اور صرف ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ اس بشارت کا مصداق ذات اقدس محمد ﷺ کے ماسوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

بشارت کا پہلا جملہ یہ ہے: "میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا"۔ تاریخ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمٰعیل میں محمد ﷺ کے ماسوا کوئی نبی ہی نہیں ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کی مانند کہلایا جاسکے اور دوسرا جملہ ہے: "میں اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا"۔ اس جملہ کو ایک بار پھر غور سے پڑھئے اور اس کے بعد قرآن کی ان آیات کا مطالعہ کیجئے کہ جن میں بعینہٖ یہی صفات نبی اکرم ﷺ کیلئے مذکور ہیں:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى ○

وہ (محمد ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ○

پس بے شبہ ہم نے اس (قرآن) کو تیری زبان پر آسان کر دیا تا کہ تو اس کے ذریعہ متقیوں کو بشارت دے اور کج راہوں کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے۔

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○ وَإِنَّهُ لَفِيْ زُبُرِ الْأَوَّلِيْنَ ○

اور یقیناً یہ جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے اس کو روح الامین (جبرئیل) نے تیرے قلب پر اتارا تا کہ تو گمراہوں کو (اعمال بد کے نتائج سے) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ ہے صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔

بشارات کے جملوں اور قرآن کی ان آیات کے اسلوبِ بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے۔ اب تیسرے جملہ کو پڑھئے: "جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا"۔ اور ساتھ ہی ان آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کیجئے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ○ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْأَرْضُ ط وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ○

اور پھر (اے پیغمبر) کیا حال ہو گا اس دن (قیامت کے دن) جب کہ ہم ہر ایک امت میں سے ان پر ایک گواہ طلب کریں گے، اور ہم تم کو ان سب پر گواہ بنائیں گے سو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور رسول (محمد ﷺ) کی نافرمانی کی وہ اس دن یہ پسند کریں گے کاش کہ (وہ دھنس جائیں اور) زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے اور اس دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے۔

غور کیجئے کہ دونوں عبارتوں میں کس درجہ مطابقت ہے اور سب کے بعد اس فقرے کو بامعانِ نظر دیکھئے: لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے"۔ اور پھر قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھئے اور فرمائیے کہ یا یہ دونوں مضامین ایک ہی حقیقت کے دو نقش نہیں ہیں؟

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيْلِ ○ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ○ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ ○ وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○

اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گھڑ کر ہماری جانب منسوب کر دے تو بے شبہ ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور پھر اس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کر دیں) اور اس وقت تم میں سے کوئی بھی اس کو ہماری گرفت سے باز نہیں رکھ سکتا۔

تورات کی پیش گوئی اور آیات قرآنی کے مسطورۂ بالا تطابق کے بعد تحدی (چیلنج) کے ساتھ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بشارات میں ذکر کردہ مجموعۂ صفات کا مصدق ذات اقدس محمد ﷺ کے ماسوا کوئی دوسری ہستی تاریخی دنیا میں نہیں پائی جاتی، یہ مجموعۂ صفات نہ حضرت مسیح علیہ السلام پر صادق آتے ہیں نہ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام پر اور نہ حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام پر اور نہ دوسرے انبیاء بنی اسرائیل پر صادق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب علماءِ یہود سے اس کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو وہ ایک "منتظر ہستی" کے مزید انتظار کے ماسوا دوسرا کوئی جواب نہیں رکھتے اور خاتم الانبیاء ﷺ کو اس کا مصداق نہ سمجھنے میں بے دلیل انکار اور خموشی کے علاوہ ان کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کو اس بشارت کا مصدق ثابت کرنے میں مجموعۂ صفات کے پیش نظر عاجز و درماندہ نظر آتے اور صاف اور واضح باتوں کو دور از کار تاویلات کا جامہ پہنا کر اعترافِ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

اور تورات استثناء ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک نغمہ باب ۳۱ میں مذکور ہے جو انہوں نے موت سے چند لمحات قبل بحکم الٰہی بنی اسرائیل کو سنایا۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ میدان تیہ میں اپنی قوم کو جمع کرو اور خدا کا یہ پیغام سناؤ کہ جب بنی اسرائیل خدا کے وعدے کے مطابق شہروں میں جا بسیں گے تو حکومت، تمول اور رفاہیت میں بدمست ہو کر خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہو جائیں گے حتیٰ کہ بت پرستی سے بھی باز نہیں رہیں گے۔ پس جب ان کی حالت اس درجہ ابتر ہو جائے گی تو میں ان سے خفا ہو جاؤں گا اور ان سے اپنا منہ چھپالوں گا اور اس کے بعد میری غیرتِ حق حرکت میں آئے گی اور میں بھی ان (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعہ خفا کروں گا اور ان سے اپنی نعمت (نبوت) چھین کر اس قوم کو بخش دوں گا جو ان پڑھ[1] اور تمدن سے دور، بے عقل، خانہ بدوش ہو گی جس کو تم اور دنیا کی قومیں "متمدن جماعت" نہ سمجھیں گی۔ اسکے بعد باب ۳۲ میں اس نغمہ کی تکمیل ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:۔

> اور اس خدا کو جس نے تجھے صورت بخشی بھول گیا اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو ان سے (بنی اسرائیل سے) نفرت کی اسلئے کہ ان کے بیٹوں اور بیٹیوں نے اسے غصہ دلایا، اور اس نے یہ فرمایا کہ میں ان سے اپنا منہ چھپاؤں گا تاکہ میں دیکھوں کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔ اس لیئے وہ کج نسل ہیں ایسے لڑکے کہ جن میں امانت نہیں۔ انہوں نے اسکے سبب سے جو کہ خدا نہیں ہے مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا۔ سو میں بھی انہیں اس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا اور ایک ان پڑھ قوم سے ان کو خفا کروں گا۔" (آیات ۱۸۔۲۱)

تم اس بشارت یا پیغمبرانہ پیشین گوئی کیلئے تاریخِ ماضی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ بنی اسرائیل کی متمردانہ

۱: کتابِ مقدس کے قدیم نسخوں میں "ان پڑھ" کا لفظ تمام زبانوں میں موجود ہے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی جگہ کہیں "بے عقل اور کہیں اسی کے مرادف الفاظ پائے جاتے ہیں، حاصل اگرچہ پھر بھی یہی رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن میں محمد ﷺ کی صفت امی اور آپ کی قوم کی "امیین" مذکور ہے جس کا لفظی ترجمہ "ان پڑھ قوم" ہوتا ہے اسلئے محض اسلئے کہ پیشین گوئی کا یہ صاف تطابق باقی نہ رہے قدیم لفظ کو بدل کر اس قسم کے الفاظ رکھے گئے۔ مختلف ایڈیشنوں کی اس قسم کی لفظی تحریفات کیلئے میزان الحق کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

سر گرمیاں، باغیانہ اور سر کشانہ شر انگیزیاں جب حد سے زیادہ متجاوز ہو گئیں اور نہوں نے مسیح ہدایت جیسی جلیل القدر ہستی کو بھی رد کر دیا اور حضرت یحییٰ ؑ جیسے مقدس پیغمبر کو قتل کر ڈالا تو ان کی جگہ خدا نے کس قوم کو پسند کیا۔ کس کو شرف رسالت سے نوازا اور کس نے ساری کائنات میں حیرت زا انقلاب بپا کر کے سچی خدا پرستی اور نیک عملی کا غلغلہ بلند کر دیا اور بنی اسرائیل نے کس کے عظمت وجلا کو دیکھ کر حاسدانہ اس کے روکنے کی سعی کی۔ کیا یہ عرب قوم نہیں تھی اور کیا یہ محمد ﷺ کی مقدس ہستی اور ان کی قوم نہ تھی جس پیغمبر نے دنیوی وسائل واسباب کی نظر میں امی "ان پڑھ" ہونے کے باوجود متمدن قوموں کے ظالمانہ وجابرانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اتار کر اس عظیم الشان عادلانہ تمدن کی بنیاد ڈالی کہ ہر قسم کے اسباب ووسائل کے فقدان اور موانع کے باوجود جس کی عظمت وسرعت رفتار نے ماہرین فلسفۂ تاریخ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام کی دعوت واصلاح اور انقلاب، دنیائے تاریخ کی مستثنیات میں سے ہے۔ یہی وہ امی اور گلہ بان قوم تھی جو ایک "امی" کی خدا پرستانہ تعلیمات سے تربیت پا کر چند ہی برسوں میں دنیا کی قوموں کی تربیت واصلاح کیلئے "بہترین معلم" ثابت ہوئی اور اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے چرواہے بن گئے اور بنی اسرائیل کی ہمہ قسم کی حاسدانہ اور معاندانہ جدوجہد اس کی راہ ترقی میں پر کاہ کی برابر بھی سنگ راہ نہ بن سکی تو کیا تاریخ کے ان ابھرے ہوئے نقوش کے بعد بھی اس انکار کیلئے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ توراۃ کی اس پیشین گوئی کا مصداق محمد ﷺ اور بنی اسمٰعیل ؑ کے ماسوا کوئی اور ہستی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہی وہ صاف اور واضح حقیقت ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط فَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ أُنْزِلَ مَعَهٗٓ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ قُلْ يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا نِالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

۱: امی لفظ ام کی جانب منسوب ہے، جسکے معنی ماں کے ہیں، اہل عرب یہ لفظ اس شخص کیلئے بولتے ہیں جس نے پڑھا لکھا نہ ہو گویا وہ ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے، اہل عرب چونکہ عام طور سے ان پڑھ تھے۔ اسلئے "امیین" کہلائے اور پیغمبر اسلام نے بھی چونکہ "وحی الٰہی" کے ذریعہ تعلیم وتربیت کے ماسوا دنیا کے اسباب تعلیم تعلم کے لحاظ سے کسی کے سامنے زانوے ادب تہہ نہیں کیا۔ اسلئے ان کی صفت بھی امی رہی، آپ ﷺ نے خود بھی یہ ارشاد فرمایا ہے: "نحن امة امية لا نكتب ولا نحسب"۔

(پس میں ان کیلئے رحمت لکھ دوں گا) جو الرسول (محمد ﷺ) کی پیروی کریں گے کہ وہ نبی امی ہوگا (یعنی دنیا کے سلسلۂ تعلیم و تعلم کے لحاظ سے ان پڑھ ہوگا اور) اس کے ظہور کی خبر وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا اور پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا اور گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اور اس بوجھ سے نجات دے گا جس کے تلے وہ دبے ہوں گے اور ان پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو جو لوگ ان پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کیلئے روک ہوئے (راہِ حق میں) اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) سو وہی ہیں جو کامیابی پانے والے ہیں (اے پیغمبر!) تم لوگوں سے کہو: اے افرادِ نسل انسانی! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمینوں کی بادشاہت اسی کیلئے ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی ایک ذات، وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول اور نبی امی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے، اس کی پیروی کرو تا کہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

اور تورات استثناء میں ہے:۔

”اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کیلئے تھی“۔

موسیٰ علیہ السلام نے یہ بشارت بنی اسرائیل کو اپنی موت سے قبل ایسی حالت میں سنائی تھی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی وداعی حالت کو دیکھ کر دل تنگ اور دلگیر ہو رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خداوند خدا موسیٰ علیہ السلام جیسا کوئی پیغمبر مبعوث نہ کرے گا۔

سینا جو طور کے نام سے مشہور اور وادی سینا میں واقع ہے اور زبانِ حال سے شہادت دے رہا ہے کہ آگ کی جستجو کے بہانے موسیٰ کو یہیں خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا اور وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا کا مظاہرہ میرے ہی سینہ پر ہوتا رہا ہے اور شعیر (ساعیر یا سراۃ) اس پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو عرب میں سب سے زیادہ طویل اور شام سے یمن تک شمالاً و جنوباً پھیلا ہوا ہے اور القدس (یروشلم) کے سامنے ہو کر گزرتا ہے، یہیں وہ جگہ ہے جو بیت اللحم کے نام سے آج بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادتِ مبارک کی گواہ اور بعثت مسیح کا مناد ہے اور فاران عبرانی (جرو) میں عرب کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہے، یہی مقام اس وادی غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) کو اپنے آغوش میں لیئے ہوئے ہے جس کو ”مکہ“ کہتے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہے اور مقام ولادت و بعثت ہے خاتم الانبیاء محمد ﷺ کا۔

اس تفصیل کے بعد پیشین گوئی کا مطلب واضح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا خدائے برتر کی صداقت و ہدایت کا پیغام نور ہدایت بن کر سینا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں نمودار ہوا اور سراۃ (شعیر) پر حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت میں طلوع افروز ہوا اور فاران پر محمد ﷺ کا رخ انور بن کر جلوہ گر ہوا۔

فراعنۂ مصر کی طویل مدید غلامی سے اس خانوادۂ نبوت (بنی اسرائیل) کے قلوب میں یاس و حرمان نے ایسے جگہ کر لی تھی کہ اب ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس بنجر زمین پر خدا کی رحمت کی بارش ہوگی اور تو بر تو حجابہائے

تریک سے "نورِ ہدایت" اپنی نمود دکھلائے گا۔ اسلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صدائے حق گویا نورِ ہدایت کی وہ نمود تھی جس نے صدیوں بعد پھر ان کے گھرانے پر رونمائی کی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد اگرچہ بہت انبیاء علیہم السلام احیائے حق کیلئے مبعوث ہوئے۔ مگر حضرت مسیح علیہ السلام کے وجودِ گرامی نے جس شان و عظمت کے ساتھ اس درمیان کی پیدا شدہ اندھیروں کا پردہ چاک کر کے ہدایت ورشد کی روشنی چمکائی گویا وہ طلوع تھا اس نورِ ہدایت کے افق میں صبحِ سعادت نے شبِ ظلمت سے جھانکنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی نورِ ہدایت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر جب بنی اسمٰعیل تک پہنچا تو خاتم الانبیاء محمد ﷺ میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ فاران کی چوٹیوں سے جب اس کی کرنیں کائنات کے چہار جانب پھیلیں تو تمام عالمِ انسانی کو روشن و منور بنا دیا اور ظلمتِ شرک و کفر کو مٹا کر نورِ توحید سے ہر گوشۂ عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا چنانچہ تورات میں مذکور اس حقیقت کو قرآن عزیز نے اس سے زیادہ بہتر اور معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ادا کیا۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ○ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ○ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ ○ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ○ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○

شاہد ہے (وہ مقام جو مرکز ہے) انجیر و زیتون کے باغوں کا (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقامِ ولادت "بیت اللحم" اور شاہد ہے طورِ سینا اور شاہد ہے یہ بلدِ امین "مکہ" یقیناً ہم نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا پھر اس کو انتہائی پستی میں پھینک دیا ماسوا اُن انسانوں کے جو ایمان لائے اور کام کئے نیک پس اُن کے لیے اجر ہے بے منت (یعنی خدا کا فضل اور رضا اور جنت)۔

الواو للشہادۃ، واؤ کا استعمال شہادت کے لیے بھی ہوتا ہے، عربیت کا مشہور قاعدہ ہے اور اس قسم کی شہادت اکثر ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہے کہ متکلم جس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے مختلف وجوہ کی بنا پر مخاطب کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تب بعض بدیہی اور محسوس مثالیں دے کر مخاطب کے لیے اس حقیقت کا سمجھنا آسان بنا دیتا ہے سورۂ والتین کی آیات میں بھی صورتِ حال ایسی ہی ہے اس لیے کہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا ہے اس کے باوجود اگر سچا خدا پرست اور نیک کردار نہیں ہے تو انجام کار وہ انتہائی پستی میں پھینک دیا جائے گا اور اس کی حقیقت چوپاؤں سے بھی بدتر ہو جائے گی اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ مگر یہ کہ سچا خدا پرست اور نیک اعمال ثابت ہو تو پھر انسانیت کے بلند سے بلند درجہ کا مستحق اور بے حساب و بے منت خدا کی نعمتوں کا مستوجب ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کافی تفکر و تدبر کی محتاج ہے۔ ایک ہستی تمام مخلوقات سے اپنی تخلیق و تکوین میں "احسن" بھی ہو اور پھر قعرِ مذلت کی گہرائیوں میں بھی پھینک دی جائے اس لیے بطورِ شہادت نہایت لطیف پیرایہ میں تین مشہور اور نمایاں دورِ ہدایت کا ذکر کر کے اس جانب توجہ دلائی کہ اگر تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھی جا سکے تو ان ہر سہ ادوارِ تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ خدائے برتر نے کائنات کی رشد و ہدایت کا شرف "انسان" ہی کو بخشا اور پھر غور کرو کہ وہ بھی انسان ہی تھے جنہوں نے خدا کے پیغمبروں کی پیروی میں سچی اور خدا پرستی اور نیک عملی اختیار کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ روزِ

قیامت کے فیصلہ سے قبل بھی اسی دنیا میں انہوں نے عزت، شرافت، حکومت سب کچھ پایا اور آخرت کا اجر تو بے منت و حساب الگ رہا اور وہ بھی انسان ہی تھے جو سرکشی، بغاوت اور پیغمبرانہ تعلیم کے خلاف فساد انگیزی کی بدولت آخرت سے پہلے ہی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کے قعر ہائے مذلت سے دوچار ہوئے اور جہنم کے اسفلِ سافلین سے جو واسطہ آئندہ پڑنے والا ہے وہ جدا ہے پس اگر ان حقائق کو پیش نظر رکھو گے اور تاریخ ماضی کے ان اوراق کو دیدۂ عبرت سے دیکھو گے تو پھر تمہاری یہ حیرت، اعترافِ حقیقت سے بدل جائے گی اور آئینہ عقل و فکر میں یہ سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ تورات کی بشارت کے یہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں۔

''وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ان کے لیے تھی''

قابلِ توجہ اس لئے ہے کہ جب ہم تاریخ کے اس واقعہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتح مکہ کی غرض سے جب محمد ﷺ روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم جلو میں تھے اور آتشی شریعت یعنی ''جہاد بالسیف'' کا حکم الٰہی —— ان کے ہاتھ میں تھی تو قدرتِ الٰہی کے اس اعجاز کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس ذاتِ برتر نے موسیٰ علیہ السلام کی لسانِ حق سے ان جلوں کو ادا کرایا۔ اسی نے محمد ﷺ کے حق میں اس کو کر دکھایا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ تو کیا کسی حق پرست حق آگاہ کو ذرا سا بھی تامل ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ موسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا مصداق خاتم الانبیاء محمد ﷺ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

تورات کی یہ اور اسی قسم کی دوسری بشارات ہیں جن کے پیش نظر بعثتِ محمد ﷺ سے صدیوں پہلے یہود کو نبی آخر الزمان کا انتظار تھا اور وہ یقین رکھتے تھے کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ نورِ ہدایت ''آفتاب عالمتاب'' بن کر جلوگر ہونے والا ہے، اسی لیے جب کبھی ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آجاتی تو کہا کرتے تھے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ نبی آخر الزمان مبعوث ہوں گے اور ہم ان پر ایمان لا کر ان کی قیادت میں تم سے حق و باطل کی جنگ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔ چنانچہ جب قومی اور نسلی تعصب اور بغض و حسد کی بناء پر انہوں نے آفتابِ ہدایت کی روشنی سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کر لیں تو قرآن عزیز نے ان کو (یادِ ایام) کے ساتھ ملزم و مجرم بناتے ہوئے یہ کہا:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ ○

چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے انکی ہدایت کے لیے ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ (تورات کی پیشین گوئیوں کی بناء پر اس ظہور کے منتظر تھے اور) کافروں کے مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے، لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آگئی تو صاف انکار کر گئے اور مخالفت پر کمر باندھ لیں پس ان لوگوں کے لیے جو دیدہ دانستہ کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے ایک دفعہ قبیلہ غطفان اور

یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو خیبر کے یہودان کے مقابلہ میں فتح ونصرت کیلئے یہ دعاء مانگتے تھے۔
(البدایہ والنہایہ جلد ۲ عن البیہقی)

اللهم انا نسئلك بحق محمد النبی الامی الذی وعدتنا ان تخرجه فی آخر الزمان ان نصرتنا علیهم۔

خدایا! ہم تجھ سے اس نبی امی کا واسطہ دے کر دعا مانگتے ہیں جس کے متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ نبی آخر الزماں ہوں گے۔" کہ تو ہم کو ان پر فتح و نصرت عطا فرما۔

اور علی ازدی سے منقول ہے کہ "یثرب" (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلہ کے وقت اکثر یہ دعا کرتے تھے:

اللهم ابعث هذا النبی یحکم بیننا و بین الناس۔

خدایا! اس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں (مشرکوں) کے درمیان حق کا فیصلہ کردے۔
(بدائع الفوائد جلد ۲ از مسند بزار)

اور عقبۂ ثانیہ میں جب مدینہ کے ستر اشخاص آپ ﷺ سے دعوتِ اسلام کی حقیقت معلوم کرنے آئے اور آپ ﷺ نے ان پر حقیقتِ حال ظاہر فرمائی تو انہوں نے اسی وقت ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے متعلق ہم اکثر یہودی علماء سے سنا کرتے ہیں[1] اور کیا اس تاریخی پہلو سے ان نقول کی صداقت پر روشنی نہیں پڑتی کہ جب رومیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی آخری اور فیصلہ کن تباہی عمل میں آئی تو آخر شام، فلسطین، شرقِ اردن یمن جیسے شاداب و زرخیز علاقوں کو چھوڑ کر وہ کون سی اہم وجہ تھی جس نے یہود کے نمایاں اور مشہور قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر (وغیرہ) کو یثرب اور نواحِ یثرب میں ہو گا۔ مگر وائے بد بختی کہ قبولِ حق کا سب سے بڑا مانع ان کو یہ پیش آیا کہ قومی، جماعتی اور نسلی حسد نے ان کو اس کی اطاعت سے باز رکھا۔ حتیٰ کہ جب انصار رضی اللہ عنہم میں سے بعض حضرات علماءِ یہود کے سامنے یہ کہہ کر گزرتے کہ ہم نے تو اس نبی امی پر ایمان لانے کی بات سب سے پہلے تمہاری ہی زبانی سنی تھی اور اس کے ظہور سے قبل تم ہی اسکے چرچے کیا کرتے اور ان کتابوں سے متعلق بشارات سنایا کرتے تھے، پھر اب کیا ہوا کہ جب اس کا ظہور ہوا تو تم انکار کر بیٹھے تو وہ علانیہ جھوٹ بول دیتے اور کہتے کہ ہم کو یاد نہیں کہ کب ہم نے تم سے ایسی باتیں کہی تھیں۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۱)

توراۃ کی طرح عہد نامۂ جدید (اناجیل) میں بھی تحریفِ لفظی و معنوی کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے متعلق یہ بشارات ملتی ہیں۔ متی کی انجیل میں ہے:-

لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تا کہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انہیں اپنے باغ میں بھیج دیا۔ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا اور ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمہیں دوں گا پس وہ چلے گئے پھر اس نے دوپہر اور سہ پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔

ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑا پایا اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے، انہوں نے اس سے کہا اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اس نے ان سے کہا، تم بھی باغ میں چلے جاؤ، جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لیکر پہلوں تک انہیں مزدوری دے دو جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے تو انہیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے (ہم نے) دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی، اس نے جواب دے کر ان سے کہا: "میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا، کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا، جو تیرا ہے اٹھا لے اور چلا جا، میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں، کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بری نظر سے دیکھتا ہے، اس طرح، آخر اول ہو جائیں گے اور اوّل آخر۔

اس بشارت میں حضرت مسیح علیہ السلام نے مثالی رنگ میں اقوام وامم عالم کی عملی زندگی اور خدا کی جانب سے ان پر اجر و ثواب کا مرقع پیش فرمایا ہے۔ پہلے مزدور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قبل کی دنیا کے لوگ ہیں اور دوسری جماعت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت بنی اسرائیل مراد ہیں، تیسرا گروہ نصاریٰ ہیں اور چوتھی جماعت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی امت ہے، کائناتِ ارضی کی عمر کے لحاظ سے پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے مقابلہ محمد ﷺ کی امت کا زمانۂ حیات یوں سمجھئے گویا دن کا آخری حصہ ہے اور اجر و ثواب میں اس آخری امت کو پہلی امتوں کے مقابلہ میں برابر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے یہاں ان کو دوسری تمام امتوں پر برتری حاصل ہے، اسلئے کہ اگرچہ ان کا وجودِ حیات امتوں کے آخر میں ہوا ہے لیکن چونکہ یہ خدا کے آخری پیغام "قرآن" کی حامل اور "سرخیل انبیاء و رسل" کی امت ہیں اور تمام امتوں سے ان ہی کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ میثاق لیا گیا ہے۔ لہٰذا حیاتِ دنیا کے لحاظ سے گو انکا زمانہ آخر ہے۔ مگر مرتبہ اور عظمت کے اعتبار سے وہ سب سے اول ہیں۔ یہی ہے مراد بشارت کے پہلے اور آخری جملہ کی یعنی "بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول اور اس طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر"۔

نبی آخر الزماں ﷺ نے بھی ٹھیک اسی طرح ایک مثال بیان فرمائی ہے جو بخاری میں منقول ہے:۔

دوسری امتوں کے مقابلہ میں دنیا کے اندر تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ دن کے طویل عرصہ میں عصر (شام) سے غروب آفتاب کے وقت کی اہل تورات (یہود) کو تورات عطا کی گئی اور انہوں نے اسپر عمل کیا حتی کہ وہ دوپہر ڈھلے عاجز رہ گئے (یعنی خدا کی تعلیم حق کو فراموش کر بیٹھے) تب ان کو مالک نے ایک قیراط مزدوری دے دی اور پھر اہل انجیل (نصاریٰ) کو کام پر لگایا اور انہوں نے دوپہر ڈھلے سے عصر (شام) تک کام کیا اور پھر وہ بھی عاجز رہ گئے تب ان کو بھی

مالک نے ایک ایک قیراط مزدوری دے دی۔ آخر میں ہم کو قرآن ملا اور ہم نے دنیا کی زندگی کے دن، غروب ہونے تک کام کیا۔ تب مالک ہم کو دو دو قیراط عطا کیئے اس پر پہلوں نے شکایت کی کہ ہم نے زیادہ محنت کی مگر تو نے ان کو اور ہم کو برابر کر دیا۔ مالک نے کہا میں نے تمہاری مزدوری میں سے تو کم نہیں کیا۔ تب مالک نے فرمایا: تو پھر میری یہ مرضی ہے کہ میں اپنے پاس سے جسکو چاہوں (مزدوری کی کیفیت و نوعیت کے فرق اور کام کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) زیادہ دوں۔ "فهو فضل اوتيه من اشاء"۔

اور امم ماضیہ و اقوام سابقہ کے مقابلہ میں امت محمدیہ کی یہی فضیلت ہے جس کو قرآن نے بصراحت اس معجزانہ اسلوب میں بیان کیا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم (تمام امم و اقوام میں) بہترین امت ہو جو کائنات انسانی (کی خدمت) کیلئے وجود میں لائی گئی ہے تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائیوں سے باز رکھتے ہو۔

بہر حال آخری جماعت کا اول ہو جانا اگر اس کا مصداق امت محمد نہیں تو اور کون ہے جس کا ذکر توراۃ کی ان بشارات میں ہو رہا ہے اور جس کی تصدیق "نبی امی" اور قرآن دونوں کر رہے ہیں، عقلاً بھی یہ فرق مراتب واضح ہے اسلئے کہ جبکہ محمد ﷺ تمام انبیاء و رسل کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ کے قبول کرنے والوں میں آپ ﷺ کی قوم سے بھی زیادہ دنیا کی دوسری اقوام و امم کے افراد شامل ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت پہلے سے کسی مذہبی جماعت میں شامل ہے تو اس کیلئے جدید دعوت حق کو قبول کرنے میں قومی، جماعتی اور نسلی عصبیت و غرور سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آجاتا ہے۔ پس جو شخص اس رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کر دعوت حق پر "لبیک" کہتا ہے وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں پہلی صداقتوں پر ایمان لانے والوں کے مقابلہ میں اس کو دو چند بلکہ چند در چند اجر و ثواب عطا ہو۔

اور انجیل یوحنا میں ایک بشارت اس طرح مسطور ہے:۔

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے "کاہن" اور "لیوی" یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے۔ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا کہ میں تو مسیح علیہ السلام نہیں ہوں انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا نہیں ہوں کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا نہیں پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو کون ہے تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ (باب ۱٦ آیات ۱۹۔ ۲۲)

اس پیشین گوئی کا تاریخی زمانہ وہ ہے جب حضرت یحییٰ (یوحنا[1] علیہ السلام) اپنی صداقت حق سے بنی اسرائیل کو مسحور کر رہے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دیتے تھے۔ اس وقت یہود کے ء مقدسین کی ایک جماعت ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے یہ سوالات کیئے۔

سوالات میں تین پیغمبروں کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ ان میں سے کون ہیں مگر انہوں نے انکار کیا کہ وہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہیں تو یہ سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ یہود تین یا دو پیغمبروں کے ظہور کے منتظر تھے، حضرت مسیح علیہ السلام، حضرت ایلیا[2] کے اور ایک ایسے پیغمبر کے جس کا ذکر ان کے درمیان اس درجہ مشہور تھا کہ انہوں نے سوالات کے وقت دو ناموں کی طرح نام لینا ضروری نہیں سمجھا اور صرف "وہ نبی" کہنا ہی کافی خیال کیا۔

یہ بشارت اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ نصاریٰ بجز بے دلیل انکار کے تاریخ کے اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اگر محمد ﷺ "وہ نبی" کا مصداق نہیں ہیں تو پھر کون ہے؟ کیا معاملہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ جس طرح یہود، ظہورِ مسیح علیہ السلام کے منتظر تھے مگر ان کی آمد پر ازراہِ حسد ان کو رد کر دیا۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ دونوں "وہ نبی" کی شہرت عام کے پیش نظر اس کے ظہور کے سخت منتظر ہونے کے باجود اس کی بعثت و ظہور کے بعد نسلی و قومی عصبیت کی بدولت منکر ہو گئے چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ آتَیْنَاهُمُ الْكِتَابَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ○

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ تم کو اس طرح "پیغمبر حق" پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ ان میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔

یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت بھی محمد ﷺ کی بشارت کیلئے شاہدِ عدل ہے، فرماتے ہیں:۔

"تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اسلیئے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کی ہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ (باب ۱۶)

۱: یوحنا عبرانی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا نام ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری کا نام بھی ہے جن کی جانب انجیل یوحنا منسوب ہے۔

۲: کہا جاتا ہے کہ کتبِ قدسیہ میں ایلیا بھی محمد ﷺ کی صفت منقول تھی اور اس لئے خواص علماءِ یہود ایلیا اور فارقلیط کو ایک ہی تسلیم کرتے تھے۔ مگر بعد کو تحریفات کی بدولت ایک اور "منتظر ہستی" کا اضافہ ہو گیا اور وہ الیاس علیہ السلام میں یہود نے اب یہ گھڑ لیا کہ حضرت الیاس کا دوبارہ ظہور ہو گا اور اسلیئے اب اناجیل میں بھی دو کی جگہ تین کے ظہور کا ذکر نظر آتا ہے۔

یہ بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی وصیت ہے اور تمثیلی استعاروں اور تشبیہوں کی بجائے واضح الفاظ میں ایک "موعود پیغمبر" کی خبر دیتی ہے اور موعود ہستی کی جن صفات کا اس میں ذکر ہے وہ حرف بحرف خاتم الانبیاء محمد ﷺ پر صادق آتی ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام حواروں اور شاگردوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ان کی جدائی سے کس درجہ متاثر ہیں، دل غم سے بھرے ہوئے ہیں، آنکھیں پرنم ہیں۔ حسرت ویاس چہرے سے ٹپک رہی ہے کیوں؟ کیا اسلئے کہ ایک انسان انسے جدا ہو رہا ہے نہیں، نہیں بلکہ خدا کا ایک ہادی، نبی و رسول، پیغمبر صداقت کی وداعی گھڑیاں قریب ہیں اور اب نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا ایسی مقدس ہستیوں سے بہرہ ور ہوگی یا نہیں کیونکہ منکروں اور باطل پرستوں نے خدا کی اس نعمت کی کوئی قدر نہ کی اور اس کو رد کر دیا۔ اس غم آگیں منظر میں حضرت مسیح علیہ السلام ان کو تسلی و تشفی دیتے اور یقین دلاتے ہیں کہ "میرا جانا تمہارے لیئے "فائدہ مند" ہے اور پھر اس کی معرفت کیلئے مزید باتیں بیان فرمائی کہ وہ دنیا کو گناہوں (برائیوں) سے باز رکھے گا، راست بازی کا حکم کرے گا اور افراط و تفریط کی ان روشوں کے خلاف جو انسانی دنیا کے ہر معاملہ میں رگ وریشہ کی طرح پھیلی ہوں گی "عدل" سے گریز پر مجرم اور قصوروار ٹھہرائے گا۔

قدرتی طور پر اب یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ہستی کون ہے جو ان مجموعہ صفات کا مصداق بن سکے۔ علماءِ نصاریٰ کہتے ہیں کہ اس سے مراد "روح القدس" ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے قبر میں جی اٹھنے اور آسمان پر باپ کے پاس چلے جانے کے بعد شاگردوں پر نمودار ہوئی لیکن جب اس باطل تاویل پر ان سے یہ کہا گیا کہ ماضی یا مستقبل میں کون سا زمانہ آچکا ہے یا آئے گا جس پر بشارت کا یہ جملہ صادق آسکے جو در اصل پوری وصیت کی روح ہے وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستبازی سے اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا" اور کس طرح یہ عبارت صرف اس نور پر صادق آسکتی ہے جو شاگردوں پر (روح القدس) ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہو کر دکھلائی گئی۔

یہ وصیت تو اس تاویل کے برعکس صاف یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ایک ایسے عظیم المرتبہ جلیل القدر پیغمبر کے ظہور کی بشارت سنا رہے ہیں جس کی آمد کائناتِ انسانی کیلئے حضرت مسیح علیہ السلام کی موجودگی سے بھی زیادہ سود مند ثابت ہوگی اور جو ایک مرتبہ پھر کائنات کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلائے گی اور اس کی تعلیم حق کا معیار سراسر "عدل" پر مبنی ہوگا کہ یہ تمام اخلاق کریمانہ اور شعبۂ حیات کیلئے اساس اور بنیاد کار ہے اور اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم تاریکی مذاہب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا مصداق کون ہے تو اس کے ماسوا اور کوئی جواب نہیں ملتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد وصیت میں مذکور اوصاف کی مصداق ہستی محمد ﷺ کے ماسوا کوئی ظہور میں نہیں آئی۔ یہی مقدس ہستی ہے جس نے ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کی قوموں اور ان کی سوسائٹیوں میں "عدل" ایک بے معنی شے رہ گئی تھی اور جب کہ سچی نیک عملی اور خدا پرستی، قومی اور اجتماعی زندگی سے خارج ہو چکی تھی۔ دنیاءِ انسانی کو یہ پیغام سنایا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

بے شک اللہ حکم دیتا ہے "عدل" کا "احسان" کا قرابت داروں کے ساتھ سلوک کا اور یقیناً منع کرتا ہے فحش کاموں، اور باتوں سے اور بغاوت و سرکشی سے وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔

اور یہی وہ مقدس ہستی ہے جسکے ظہور کی بدولت اس کی امت کا مقصدِ حیات یہ ظاہر کیا گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ط مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُوْنَ ○

(اے امت محمد ﷺ) تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی خدمت) کیلئے عالمِ وجود میں لائی گئی ہے تم لوگوں کو بھلائی اور نیکیوں کا حکم کرتے اور ان کو برائیوں سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہو۔

مضمونِ وصیت کے اس نمایاں پہلو کے ماسوا ایک اور روشن اور واضح بات اس وصیت کی بشارت میں وہ جملہ ہے جس میں موعود ہستی کو ایک خاص وصف کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ یہ وصف اگر چہ جدید ایڈیشنوں میں "مددگار"، "وکیل"، "معزی" اور "شفیع" ہے، لیکن قدیم یونان، فرنچ، لیٹن اور انگریزی تراجم میں "پیراکلیوتاس" اور عبرانی (جبرو) اور عربی تراجم میں "فارقلیط" پایا جاتا ہے جو عربی لفظ احمد کے ہم معنی اور مرادف ہے،

یہ بات تو علماءِ نصاریٰ اور ہر ایک تاریخ داں کے نزدیک متفق علیہ اور مسلم ہے کہ موجودہ اناجیل میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل انجیل نہیں ہے بلکہ جن ناموں سے یہ منسوب ہیں ان کے بھی اصل نسخے نہیں بلکہ تراجم ہیں اور یہ کہ مسیح کی انجیل کا اوریجنل (اصل) نسخہ قدیم جبرو (عبرانی) زبان میں تھا اسلئے یہ دعویٰ بسہولت کیا جا سکتا ہے کہ اوریجنل نسخہ میں یہ لفظ بلاشبہ احمد ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ صف میں قرآن عزیز نے حضرت مسیح کا یہ قول نقل کیا ہے: وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ أَحْمَدُ اور دلیل یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے تراجم میں فارقلیط اسی لفظِ احمد کا ہم معنی اور مرادف لفظ اختیار کیا گیا۔ مگر جب علماءِ نصاریٰ نے یہ دیکھا کہ صداقت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کیلئے کتابِ مقدس سے بصراحت تام بہت بڑی دلیل ہاتھ آئی اور علماء اسلام کی جانب سے ہم پر قوی حجت قائم ہوئی جاتی ہے تو بعد کے ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط یا پیراکلیوتاس نکال دیا گیا اور اب اس کی جگہ کبھی ناصر (مددگار) کبھی وکیل، کبھی شفیع اور کبھی معزی (تسلی دینے والا) لکھا جانے لگا۔ تاکہ واضح نام کی بجائے ایک ایسی صفت آجائے جس کا اطلاق بغیر کسی تعیین کے ہر ایک ذات حق پر ہو سکے۔ اناجیل کے قدیم وجدید نسخوں اور پھر قدیم وجدید کے مختلف ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط اور اسی قسم کی دوسری گوناگوں تحریفات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کیلئے میزان الحق اور الفارق کا مطالعہ از بس مفید ہے۔ یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کیلئے کہ اناجیل کے عربی تراجم میں مسطورہ بالا الفاظ کی بجائے فارقلیط تھا صرف یہ ایک ثبوت کافی ہے کہ ایک صدی قبل کے عربی نسخہ میں جو لندن سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا تھا یہ لفظ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں موجود تھا و اللهلب من الاب فیعطیکم فارقلیطا...... آخر۔

تاہم علماءِ نصاریٰ کی اس واضح تحریف کے بعد بھی ان کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اور ایک مرتبہ انسے پھر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس بشارت میں لفظ فارقلیط (احمد) کی جگہ مسطورۂ بالا الفاظ میں سے ہی کوئی لفظ سہی مگر جبکہ اس بشارت کا مصداق "روح القدس کا کبوتر کی شکل میں شاگردوں پر نمودار ہو جانا" کسی طرح نہیں بنتا تو پھر حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تاریخ ادیان میں وہ کون سی ہستی ہے جس کو اس کا مصداق سمجھا جائے۔ کیا علماءِ نصاریٰ اس بے دلیل انکار کے ساتھ کہ اس کا مصداق ذاتِ اقدس محمد ﷺ نہیں ہیں جرأت کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ہستی اس مجموعہ صفات کا مصداق تھی یا آج ہے یا آئندہ آئے گی۔ نہیں وہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اس انکار کیلئے صرف یہی ایک مثبت دلیل ہے کہ روح القدس اس کا مصداق ہے۔ کاش کہ وہ قدرت بھی رکھتے کہ روح القدس کو انسانی شکل میں کائنات کی ہدایت کیلئے لا سکتے کہ وہ پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی، برائیوں سے روکتی اور عدل ترک کر کے افراط و تفریط کی راہ بداختیار کرنے پر لوگوں کو قصوروار ٹھہراتی تب شاید ان کا یہ قول الفاظِ بشارت کی مطابقت کر سکتا۔ ورنہ تو یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس بشارت کو ذاتِ اقدس ﷺ کے حق میں تسلیم نہ کرنا صرف نسلی، قومی اور جماعتی گروہ بندی سے پیدا شدہ عصبیت و حسد کا نتیجہ ہے۔

اس سے قطع نظر ہم تسلیم کیئے لیتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی انجیل میں احمد (فارقلیط) کی بجائے مسطورۂ بالا الفاظ ہی میں سے کوئی لفظ تھا تب بھی اس کا مصداق خاتم الانبیاء ﷺ کے ماسوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ قرآن عزیز نے مختلف مقامات پر نبی اکرم ﷺ کے جو اوصافِ حمیدہ بیان کیئے ہیں وہ ان ہی مسطورۂ بالا الفاظ کے ہم معنی ہیں مثلاً سورۂ توبہ میں آپ ﷺ کو عزیز، رؤف، رحیم کہا گیا ہے:۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○

(ایمان والو!) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آ گیا ہے جو تم ہی میں سے ہے تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گزرتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے وہ ایمان والوں کیلئے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے (اے پیغمبر!) اگر اس پر بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اس کی ذات، میں نے اس پر بھروسہ کیا وہ تمام عالمِ ہستی کی جہانداری کے عرشِ عظیم کا خداوند ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے:۔

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر جہان والوں کیلئے رحمت بنا کر۔

اور اگر صحیح احادیث کی تصریحات کو بھی ان آیات کی تفسیر کے طور پر شامل کر لیا جائے تب تو انا جیل کے

تراجم میں مذکورہ صفت بعینہٖ آپ کو مل جائیں گے مثلاً الشافع المشفع الشفیع، الناصر (مددگار) وغیرہ۔

پھر اسی باب کی آیت ۱۳ کو اس مضمون کے ساتھ اگر ملایئے تو معاملہ اور زیادہ واضح اور صاف ہو جائے گا، حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا اسلئے کہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔

غور فرمایئے کیا یہ مضمون "روح القدس" پر صادق آسکتا ہے جس نے چند شاگردوں پر ظاہر ہو کر اپنی نمود دکھلائی یا ایسی ہستی پر جو لوازم بشریت سے متصف ہونے کے باوجود کائنات انسانی میں رہ کر سچائی کی راہ دکھلائے اور امور غیب سے متعلق خدا نے جو کچھ بتلایا ہے، (علاماتِ قیامت، جنت و جہنم، حشر و نشر وغیرہ کی تفصیلات) اسکو مخلوقِ خدا تک پہنچائے اور پھر معلوم کرو تاریخ ماضی سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد محمد ﷺ کے علاوہ کون آیا جس نے خدا سے بھٹکے ہوئے انسانوں کا رشتہ دوبارہ خدا سے ملایا اور ادیان و ملل کی گم شدہ صداقتوں کو قرآن کے ذریعہ روشن و نمایاں کیا۔ کیا موافق و مخالف دونوں شہادتیں اس پر متفق نہیں ہیں کہ اس کی قوم دوست و دشمن سب ہی اس کو "الصادق الامین" کہہ کر پکارتے تھے اور کیا انجیل کا یہ فقرہ "اسلئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا" اور قرآن کی یہ آیت وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے اس وحی سے کہتا ہے جو خدا کی جانب سے اتاری جاتی ہے۔ ایک ہی مقدس ہستی کی تقدیس حیات اور صداقت قول و عمل کے دو عکس نہیں ہیں پس سچائی کی روح میں لفظ "روح" سے فائدہ اٹھا کر اور بقیہ تمام مضمون بشارت سے آنکھ بند کر کے اس کو "روح القدس" کہہ دینا عملی دیانت ہے؟ ہرگز نہیں۔

غرض وصیت یا بشارت حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب سے واضح اور صاف اعلان ہے ظہور قدسی صفات ﷺ کا اور اس کا انکار بداہت کا انکار ہے اور تعصب بے جا کی دلیل۔[1]

بشارات النبی ﷺ کا یہ باب بہت وسیع ہے اور چھٹی صدی ہجری میں ایک مسیحی عالم سعید بن حسن اسکندرانی نے جب کتاب مقدس میں ان بشارات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا تو محیط النظر ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی اور ہمیشہ سے علماءِ اسلام بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض علماء نے ہندوؤں کی قدیم کتابوں اور مجوس کے قدیم نوشتوں میں بھی "منتظر ہستی" سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس کو بشارات النبی میں شامل کیا ہے۔ مگر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن عزیز کی ان آیات پر اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت سے یہود و نصاریٰ کے سامنے برابر اعلان کرتی رہی ہیں کہ قدیم سماوی کتابوں میں اس مقدس پیغمبر کا تذکرہ برابر رہا ہے اور چونکہ خدا کی تقدیر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا آخری اور کامل و مکمل قانون اسی ذات اقدس ﷺ کے ہاتھوں کائناتِ ہست و بود تک پہنچے گا۔ اسلئے از بس ضروری تھا کہ اس کا ذکر پہلے نوشتوں میں ہو تاکہ جب اس کے ظہور کا وقت آپہنچے تو تمام صادق ادیان و ملل سے متعلق امتیں میثاقِ الٰہی کے مطابق اس پر ایمان لائیں اور اس کی پیش کردہ صداقت اور قانونِ ہدایت "قرآن" کو

۱: اس پیشین گوئی میں فارقلیط سے متعلق مفصل محققانہ بحث کیلئے میزان الحق از مولانا رحمۃ اللہ (نور اللہ مرقدہٗ) الفارق، ہدایۃ الحیاریٰ اور رسالہ تہذیب الاخلاق مضمون فارقلیط قابل مراجعت ہیں۔

اپنے لیئے راہِ عمل بنائیں چنانچہ سورۂ الفتح میں ارشاد ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيْلِ

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ) ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم خو ہیں (اے مخاطب!) تو ان کو دیکھے گا (خدا کے سامنے) جھکنے والے سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے خدا کے فضل اور اس کی رضاء کے خواہش مند ہیں ان کی نشانی یہ ہے کہ ان کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے نشانات ہیں تورات اور انجیل میں ان کا ذکر اسی طرح ہے۔

یہ ذکر انجیل برنابا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور آپ ﷺ کی صفات بہت نمایاں الفاظ میں مذکور ہیں لیکن وہ نصاریٰ کے نزدیک متروک ہے مگر جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا ہے اس کا ترک کسی دلیل پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ اور بعض دوسری اناجیل کا ترک محض ایک فال کی بناء پر ہوا جو اسی غرض سے نکالی گئی تھی۔

اور سورۂ شعراء میں ہے۔

وَإِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ وَإِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْأَوَّلِيْنَ ۝

اور یقیناً یہ (قرآن) جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے اس کو روح الامین (جبرئیل علیہ السلام) نے (خدا کی جانب سے) تیرے قلب پر نازل کیا تا کہ تو (خدا کے نافرمانوں کو) ڈرانے والوں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں ہے اور اس کا ذکر پہلوں (گذشتہ پیغمبروں) کی کتابوں میں ہے۔

اور ایک مرتبہ خود نبی اکرم ﷺ نے انہی بشارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

دعوة ابی ابراهيم و بشرىٰ عيسىٰ

"یعنی میں اپنے باپ ابراہیم کی دعاؤں اور عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی بشارت ہوں (یعنی) دعاء خلیل اور نوید مسیحا"

قرآن عزیز نے دعاء ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس طرح کیا ہے

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

اے ہمارے پروردگار! ان (اہل عرب) ہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو (ہر قسم کی برائیوں سے) پاک کرے۔ بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور بشارت مسیح علیہ السلام کا ذکر سورۂ صف میں اس طرح منقول ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَابَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ إِنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ ط فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے جب عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے کہا "اے بنی اسرائیل میں تمہاری جانب اللہ کا رسول (ایلچی) ہوں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے موجود ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد (فارقلیط) ہوگا پس جب ان کے پاس وہ (خدا کا پیغمبر) دلائل لے کر آیا تو یہ کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے۔

صبح سعادت

تاریخ ادیان وملل شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور پر تقریباً چھ صدیاں گزر چکی ہیں اور معمورۂ عالم خدا کے پیغمبروں کی معرفت حاصل کی ہوئی صداقت حق کو فراموش کر چکا ہے تمام کائناتِ انسانی خدا پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور ہر ملک میں نوع انسانی سے لے کر نوع جمادات تک کی پرستش سرمایۂ نازش بنی ہوئی ہے کوئی انسان کو اوتار (خدا) کہہ رہا ہے تو کوئی خدا کا بیٹا۔ ایک اگر مادہ پرست ہے تو دوسرا خود اپنی آتما (روح) کو ہی خدا سمجھ رہا ہے سورج کی پوجا ہے چاند تاروں کی پرستش ہے حیوانوں درختوں اور پتھروں کی عبادت ہے، آگ پانی، ہوا، مٹی کے سامنے ناصیہ فرسائی ہے غرض کائنات کی ہر شے پرستش اور پوجا کے لائق ہے اور نہیں ہے تو صرف ذات واحد قابل پرستش نہیں ہے نہ اس کی احدیت کا تصور خالص ہے اور نہ صمدیت کا۔ اس کو اگر مانا بھی جاتا ہے تو دوسروں کی پرستش اور عبادت کے ذریعہ ہو اگر خالق موجودات ہے تو دوسروں کے واسطہ اور احتیاج کے ساتھ مادہ، روح اور ترکیب سب ہی باتوں کا محتاج ہے وہ اگر مالک موجودات ہے بھی تو انسان، حیوان، درخت پتھر کے بل بوتہ پر غرض ساری دنیا میں اصل کارفرمائی مظاہر کی تھی اور "ذات حق" صرف نام کے لئے حقیقت سے چشم پوشی تھی مگر مجاز کے ساتھ ذوق عشق ذات حق سے بعد تھا مگر مظاہر سے قربت، سرمایہ سعادت حق سے بیگانگی تھی مگر مخلوقات کی عبادت گزاری شعار عام تھا اور ہر طرف مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ہم ان کو نہیں پوجتے مگر اس لئے تاکہ وہ خدا کی جانب ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں کا مظاہرہ نظر آتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جس میں "سنۃ اللہ" یعنی خدا کے قانون ہدایت وضلالت نے ماضی کی تاریخ کو پھر دہرایا اور غیرت حق نے فطرت کے قانون رد عمل (RE ACTION) کو حرکت دی یعنی آفتاب ہدایت برجِ سعادت سے نمودار ہوا اور چہار جانب چھائی ہوئی شرک وجہالت اور رسم ورواج کی تاریکیوں کو فنا کر کے عالم ہست وبود کو علم ویقین کی روشنی سے منور کر دیا۔

۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کی صبح، وصبح سعادت تھی جب مدنیت وحضارت سے محروم بن کھیتی کی سرزمین مکہ کے ایک معزز قبیلۂ قریش (بنی ہاشم) میں عبد اللہ بن عبد المطلب کے یہاں آمنہ بنت وہب کے

مشکوئے معلی سے آفتاب رسالت محمد ﷺ نے ظہور کیا۔

خدایا! وہ صبح کسی سعادت افروز تھی جس نے کائنات ارضی کو رشد وہدایت کے طلوع کا مژدۂ جانفزاء سنایا اور وہ ساعت کس مبارک و محمود تھی جو معمورۂ عالم کیلئے پیغام بشارت بنی عالم کا ذرہ ذرہ زبان حال سے نغمے گا رہا تھا کہ وقت آپہنچا کہ اب دنیاء ہست و بود کی شقاوت دور اور سعادت مجسم سے عالم معمور ہر ظلمت شرک و کفر کا پردہ چاک ہو اور آفتاب ہدایت روشن و تابناک ہو۔ مظاہر پرستی باطل ٹھہرے اور خدائے وحد کی توحید مقصد حیات قرار پائے۔

دنیا تو کیا ملک قبیلہ اور خاندان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ مذاہب عالم جس آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں وہ اس غیر متمدن سر زمین اور عبد المطلب کے گھرانے سے جلوہ گر ہو گا کہ اس کی ولادت باسعادت کو خاص اہمیت دیتے اور تاریخ ولادت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے مگر جس خالق کائنات کے نوشتۂ تقدیر نے اس کو مقدس ہستی بنانے کا فیصلہ کیا اسی کے ید قدرت نے ولادت باسعادت کیلئے ایک معجزانہ تاریخی نشان بھی ظاہر کر دیا اور وہ اصحاب الفیل کا واقعہ تھا۔

معتبر اور مستند روایات شاہد ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی ولادت اس واقعہ سے چند ماہ بعد ہوئی۔[1]

یہ واقعہ جن خصوصیات کا حامل ہے ان کے پیش نظر یہ عرب کے لئے عموماً اور اہل حجاز کے لئے خصوصاً نہایت عجیب اور حیرت زا تھا اور اس لئے وہ کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے اس کا نام ہی عام الفیل (یعنی ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ دراصل یہ واقعہ ایک (نشان) ہے اس جلیل القدر ہستی کے ظہور کا جو ایک روز تمام معمورۂ انسانی کو مرکز توحید اور قبلۂ ابراہیمی پر جمع کر دے گی اور اس کو غیر اللہ (بتوں) کی آلودگیوں سے پاک کر کے توحید الٰہی کے نغموں کیلئے مخصوص کرائے گی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا مقام ہے جو صرف خدائے واحد کی پرستش کیلئے بنایا گیا۔ یہ مندر نہیں تھا کہ مورتی کی پوجا کی جائے، یہ گرجا اور کلیسا بھی نہ تھا کہ یسوع مسیح علیہ السلام اور کنواری مریم علیہا السلام کے مجسموں کے سامنے سر جھکایا جائے نہ یہ آتش کدہ تھا کہ آگ کو نور کا مظہر قرار دے کر اس کی پرستش کی جائے اور نہ یہ صلوات یہود تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا کر اس کی تقدیس کے نغمے گائے جائیں بلکہ یہ تو خدا اور صرف ایک خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۔

غرض بعثت کے بعد جب قدرت کے اعجاز نما ہاتھوں نے عام الفیل میں آپ ﷺ کی ولادت کا راز سربستہ آشکارا کر دیا تب دنیا نے یہ سمجھا کہ ابرہتہ الاشرام اور اس کے لشکر سے کعبۃ اللہ کی یہ حفاظت اس لئے تھی کہ وہ وقت قریب آپہنچا جب دوبارہ یہ مقدس مقام خدائے واحد کی عبادت اور توحید خالص کی مرکزیت کا شرف حاصل کرنے والا ہے پس جو طاقت بھی اس مقصد عظمیٰ سے متصادم ہوگی خود ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔

ابرہہ عیسائی تھا اور اہل عرب (قریش) مشرک، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی بربادی قریش کی نصرت وحمایت کے لئے تھی نہیں! بلکہ اس لئے سب کچھ ہوا کہ مشیت الٰہی کے خلاف ابرہہ کی

---

[1] واقعہ کی تفصیلات قصص القرآن جلد ۳ میں گزر چکیں۔

خواہش تھی کہ یمن (صنعاء) میں جو خوبصورت گرجا (القلیس) باپ، بیٹا، روح القدس (تثلیث) کے فروغ دینے کو بنایا گیا تھا مرکز "توحید کعبۃ اللہ" کی جگہ وہ مرجع خلائق بنے اور اس مقصد کی خاطر اس نے انہدام کعبہ کے لئے لشکر کشی کی ادھر قریش یعنی سارا عرب اس کی مقاومت سے عاجز و درماندہ تھا ابرہہ وقت کے تمام جنگی اسلحہ اور سر و سامان کا مالک اور قریش ان سب سے یکسر محروم تب غیرت حق حرکت میں آئی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر مشیت الٰہی سے ٹکرانے والا خود ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا اور محور توحید "کعبہ" خدائی حفاظت کے سایہ میں اسی طرح قائم رہا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّمَنْ یَّخْشٰی (بلا شبہ اس بات میں بڑی ہی عبرت ہے اس شخص کیلئے جو خوفِ خدا رکھتا ہے) قرآن عزیز نے سورۃ الفیل میں اسی حقیقت کو معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ نقل کیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيْلِ ○ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ○ وَّأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيْلَ ○ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ ○

(اے پیغمبر!) کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ انکے فریب کو ناکام نہیں بنا دیا؟ اور ان پر فوج در فوج پرند بھیج دیئے وہ پرند ان پر کنکریاں پھینکتے تھے پھر (خدا نے) ان ہاتھیوں والوں کو کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا۔

بہر حال عام الفیل نبی اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کا سال ہے اور یہ واقعہ آپ ﷺ کے ظہور قدسی کا سب سے بڑا قریبی نشان ہے اور یہ حقیقت اس شخص پر بخوبی عیاں ہے، لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ جس کے پاس قبول حق کیلئے دل ہے یا وہ حاضر دماغی کے ساتھ امر حق کی جانب کان لگائے ہوئے ہے۔"

تاریخ ولادت کی تحقیق

تمام ارباب تاریخ و سیر کا تین باتوں پر کلی اتفاق ہے ایک یہ کہ ولادت کا سال "عام الفیل" تھا چنانچہ سیرت و مغازی کا مشہور امام محمد بن اسحٰقؒ اور جلیل القدر محدث و مؤرخ حافظ ابن کثیرؒ جمہور کی یہی رائے نقل کرتے ہیں:

وکان مولوده علیه الصلوٰة والسلام عام الفیل و هذا هوالمشهور عن الجمهور و قال ابراهیم بن منذر الخرامی و هوالذی لا یشك فیه احد علماء نا انه علیه الصلوٰة والسلام ولد عام الفیل۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲٦١)

والمجتمع علیه انه علیه الصلوٰة والسلام ولد عام الفیل۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲٦١)

جمہور کے نزدیک یہی قول مشہور ہے کہ نبی علیہ الصلوۃ السلام کی ولادت عام الفیل میں ہوئی اور ابراہیم بن

منذر کہتے ہیں کہ اس بات میں کسی عالم کو بھی شک وشبہ نہیں کہ نبی ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔
اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد ﷺ عام الفیل میں پیدا ہوئے۔
اور دوسری اور تیسری بات یہ کہ آپ ﷺ کی ولادت ربیع الاول کہ مہینے میں شنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی:

وهذا ما لا خلاف فيه انه ولد صلى الله عليه وسلم يوم الاثنين ثم الجمهور على ان ذلك كان فى شهر ربيع الاول۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۱)

اور اس پر کلی اتفاق ہے کہ آپ ﷺ دوشنبہ (پیر) کے دن پیدا ہوئے پھر جمہور کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔

قال ابو قتادة رضى الله عنه ان اعرابيا قال يا رسول الله ما تقول فى صوم يوم الاثنين فقال، ذلك يوم ولدت فيه و انزل علىَّ فيه۔ (مسلم)

ابو قتادہؓ فرماتے ہیں گاؤں کے ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ پیر کے دن کے متعلق کیا فرماتے ہیں آپ ﷺ ارشاد فرمایا یہ وہ دن ہے جس میں میری ولادت ہوئی اور جس میں مجھ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔

لیکن اہل سیر و تاریخ اس باب میں مختلف الرائے ہیں کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی عوام میں تو مشہور قول یہ ہے کہ ۱۲ ربیع الاول تھی اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں اور اکثر علماء ۸ ربیع الاول کہتے ہیں لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹ ربیع الاول تاریخ ولادت ہے اور مشاہیر علماء تاریخ و حدیث اور جلیل المرتبہ ائمہ دین اسی تاریخ کو صحیح اور ''اثبت'' کہتے ہیں چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس، بن یزید، ابن عبد اللہ ابن حزم، محمد بن موسیٰ خوارزمی ابوالخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدر الدین عینی جیسے مقتدر علماء کی یہی رائے ہے۔

محمود پاشا فلکی نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گذرا ہے) ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد ﷺ کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک کسوف و خسوف (سورج گرہن و چاند گرہن) کا صحیح حساب معلوم کرے پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سن ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ (پیر) کا دن ۱۲ ربیع الاول کو نہیں آتا بلکہ ۹ ربیع الاول ہی کو آتا ہے[۱] اس لئے بلحاظ قوت و صحت روایات اور باعتبار حساب ہیئت و نجوم ولادت مبارک کی مستند تاریخ ۹ ربیع الاول ہے۔

اصحاب فیل کے واقعہ سے کس قدر عرصہ بعد ولادت ہوئی؟ متعدد اقوال میں سے مشہور قول یہ ہے کہ پچاس دن بعد ظہور قدسی ہوا ہے۔

وقيل بخمسين يوما وهو اشهر۔ (فتح الباری جلد ۲ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۰)

۱: ۸ اور ۹ کا اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ مہینے کے ۲۹ اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے اور جبکہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۲۱ ر اپریل تھی تو ۸ کے متعلق تمام اقوال دراصل ۹ کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں ۱۲

ایک قول یہ ہے کہ اصحاب فیل کے واقعہ سے پچاس دن بعد ولادت باسعادت ہوئی اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔

نسب مبارک

نبی اکرم ﷺ عربی النسل ہیں اور عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے زیادہ مقتدر شاخ بنی ہاشم سے ہیں، قرآن عزیز اہل عرب کو خطاب کرتے ہوئے متعدد مقامات پر آپ ﷺ کے عربی نژاد ہونے کا ذکر کیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

(خدا) وہ ذات ہے جس نے امیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے ہی ایک رسول بھیج دیا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو الکتاب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے۔ (جمعہ پ ۲۸ ع ۲)

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ

بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول (محمد ﷺ) آیا۔ (توبہ)

إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ

جب کہ بھیج دیا اللہ نے ان میں ایک رسول جو بلحاظ نسب ان ہی میں سے ہے۔ (آل عمران پ ۴ ع ۱۷)

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا

اسی طرح ہم نے آپ ﷺ پر قرآن کو بزبان عربی اتارا ہے تاکہ (اے محمد ﷺ) تم مکہ والوں اور ان کے گرد و پیش کے بسنے والوں (برائیوں سے) ڈراؤ۔ (شوریٰ پ ۲۵ ع ۱)

أَعْجَمِيٌّ وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ○

کیا (اس قرآن کو سکھا دیتا ہے کوئی عجمی اور حالت یہ ہے کہ یہ واضح عربی زبان میں ہے۔ (النحل پ ۱۴ ع ۱۴)

ماہرین انساب عرب کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اسلئے کہ قریش بغیر کسی اختلاف رائے کے عدنانی ہیں اور عدنان کے اسمٰعیلی ہونے میں دو رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عرب کے علم الانساب کے مشہور عالم محدث ابن عبدالبر تحریری فرماتے ہیں:

واجمعوا ان محمدا رسول الله ﷺ من ولد عدنان وان عدنان من ولد اسمعيل وان ربيعة و مضر من ولد اسمعيل ۔ (القصد والامم ص ۲۲ والانباہ علیٰ قبائل الرواۃ ص ۴۶)

اور علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ عدنان کی نسل سے ہیں اور عدنان اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہے اور ربیعہ اور مضر بھی اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

علماء انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اور والدہ کی جانب سے آپ ﷺ کا نسب نامہ کلاب پر جا کر پدری سلسلۂ نسب کے ساتھ مل جاتا ہے یعنی آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب کلاب کو حکیم بھی کہتے ہیں۔

البتہ عدنان اور حضرت اسمٰعیل کے درمیان سلسلہ کے ناموں سے متعلق ماہرین انساب کی آراء مختلف ہیں[1] اس لئے نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق ارشاد فرما کر کذب النسابون (نسب بیان کرنے والوں نے غلط بیانی کی ہے) کسی رائے کی توثیق نہیں فرمائی اور اپنے سلسلۂ نسب کے متعلق صرف اس قدر ارشاد فرمایا ہے:

ان اللّٰہ اصطفی کنانة من ولد اسمعیل واصطفی قریشا من کنانة واصطفی من قریش بنی ھاشم و اصطفانی من بنی ھاشم۔ (مسلم)

اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں سے کنانہ کو ممتاز بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو عزت و عظمت بخشی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔

گویا اس طرح سلسلۂ نسب کے صرف ان حصوں کی تصدیق فرمائی جو ماہرین انساب کے درمیان بلا خلاف مسلم تھے۔

اسلام نے نسبی تفاخر اور اس پر مبنی سماجی رسم و رواج کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا ہے وہ کہتا ہے خدا کے یہاں فضیلت کا معیار ایمان اور عمل صالح ہے اور وہاں حسب و نسب کی کوئی پرسش نہیں ہے نیز نسبی تفاخر اسلام کی بنیادی قانون ''اخوت اسلامی'' کے قطعاً منافی ہے اس لئے اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے تاہم واقعاتی طور پر تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ ہمیشہ انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی قوم اور اپنی ملک کے معزز خاندان میں سے ہوتے رہے ہیں حکمت خداوندی کا فیصلہ غالباً اس لئے ہوا کہ قوموں اور ملکوں کے رسم و رواج اور نسبی تفاخر کے خلاف ان کی دعوت حق اور ان کا پیغام صداقت کہیں ذاتی مفاد کے لیے نہ سمجھ لیا جائے اور اس طرح اس کا اخلاقی پہلو کمزور نہ ہو جائے مثلاً کسی سماجی زندگی میں ذات پات کی تقسیم اور کاسٹ سسٹم اس طرح موجود ہے کہ اس کی وجہ سے بعض انسان بعض کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے ہیں تو اگر اس قوم یا ملک میں کوئی پیغمبر اس خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کو قومی اور ملکی رواج نے نیچے اور پست اقوام کا لقب دے رکھا ہے ایسی حالت میں اس ظلم صریح اور باطل کوشی کے خلاف اس پیغمبر کی صدائے حق اتنی سرعت کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی جس قدر اس حالت میں ہو سکتی ہے جب کہ وہ خود اس قوم و ملک کے اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور صرف ایک اسی خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے پیغام حق کی تمام اصلاحات میں یہ فرق

---

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲۔

ضرور نظر آئے گا۔

بہر حال یہ حکمت ہر مقام اور ہر موقع پر مفید ہو یا نہ ہو عرب کے حالات و واقعات کیلئے از بس مناسب اور مفید ثابت ہوئی چنانچہ صدائے اسلام نے جب اپنی انقلابی اور اصلاحی گرج سے روحانیت کی خفتہ کائنات میں تہلکہ ڈال دیا تو ایک جانب نبی اکرم ﷺ نے اہل عرب کو یہ سنایا کہ یہاں تک خاندانی امتیاز کا تعلق ہے تو میں قریشی بھی ہوں اور ہاشمی بھی اور یہ امتیاز تمہارے نقطہ نظر سے بہت بلند ہے مگر میری نگاہ میں اس کی حیثیت صرف یہ ہے: ولا فخر یہ کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں ہے۔" اور دوسری جانب نسبی تفاخر کی بنیادوں کے انہدام اور مساوات انسانی کی دعوت عام کے لئے اس خدائی فرمان کا اعلان کر کے کائنات انسانی کی تمام تاریک ذہنیت کے خلاف انقلاب عظیم برپا کر دیا:

يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

لوگو! میں نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے (یعنی تخلیق انسانی کی ابتدا آدم اور اس کی بیوی حوا علیہما السلام سے ہوئی ہے) اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں صرف اس لئے بانٹ دیا ہے کہ آپس میں (صلہ رحمی کے لیے) پہچان اور معرفت کا طریقہ قائم کر لو (اور اصل یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی عزت والا ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے۔ (الحجرات پ۲۶ ع۱)

اور حجتہ الوداع کے موقع پر جب آپ ہزار ہا صحابہؓ کی موجودگی میں وداعی پیغام سنا رہے اور اسلام کے بنیادی اصول کے استحکام کیلئے اہم وصایا پیش فرما رہے تھے اس حکم خداوندی کی تائید میں یہ انقلاب آفریں پیغام بھی ارشاد فرمایا:

ان اللہ یقول،

يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ط إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

فلیس لعربی علی عجمی فضل و لا لعجمی علی عربی فضل و لا لاسود علی ابیض فضل ولا لابیض علی اسود فضل الا بالتقویٰ ۔ یا معشر القریش لا تجیؤ بالدنیا تحملونها علی رقابکم و یجیٔ الناس بالآخرة فانی لا اغنی عنکم من اللّٰہ شیئاً..........الخ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اے افراد نسل انسانی! بلاشبہ ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمہارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیے ہیں تاکہ (صلۂ رحمی کے لیے) تعارف پیدا کرو بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے جو زیادہ متقی (نیک کردار ہے) پس (خوب یاد رکھو کہ) نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت

ہے اور نہ گورے کو کالے پر کوئی بزرگی بلکہ ان سب کے لئے فضیلت کا معیار صرف تقویٰ (نیک عملی) ہے اے گروہ قریش ایسا نہ ہو کہ تم (خاندانی فخر کے زعم باطل کیوجہ سے قیامت میں) دنیا کو کاندھے پر لاد کر لاؤ اور دوسرے لوگ (نیک عملی کی بدولت) آخرت کا سامان لے کر آئیں، واضح رہے کہ (تمہارے محض قریشی ہونے کی وجہ سے) میں تم کو خدا کے فیصلے سے قطعاً بے پرواہ نہیں بنا سکتا (خدا کے یہاں تو صرف عمل ہی کام آئے گا) (مجمع الفوائد جلد از معجم طبرانی کبیر)

اور ایک مرتبہ نسبی فخر کے خلاف تبلیغ حق کرتے ہوئے اس کو جاہلی تعصب فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے لئے سخت تاکید فرمائی۔ رشاد فرمایا:

ان اللّٰہ تعالیٰ قد اذھب عنکم عبیۃ الجاھلیۃ و فخرھا بالآ بآء و انما ھو مؤمن تقی او فاجر شقی الناس کلھم بنو آدم و آدم خلق من تراب۔ (ابو داؤد۔ ترمذی)

اللہ تعالیٰ نے (دعوت اسلام کے ذریعہ) تمہارے درمیان سے جاہلیت کے تعصب اور نسبی فخر کو مٹا دیا ہے اور اب انسان یا نکوکار مومن ہے اور یا بدکار پاپی سب انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے، (پھر فخر کرنے کا کیا موقع ہے)؟

اسی مقدس تسلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے دور اولین میں نہ ذات پات کا کوئی سوال باقی رہ گیا تھا اور نہ خاندانی تفاخر کی کوئی حیثیت سمجھی جاتی تھی اور اس صدائے حق نے غلاموں تک کو سروری بخش دی تھی، چنانچہ اسامہ بن زیدؓ کی سالاری لشکر اور امامت جہاد بلال حبشیؓ کے لئے صدیق اکبرؓ کا یہ ارشاد "سید ھذہ الامۃ" اس امت کا سردار قریش اور ہاشمی صحابہ کے درمیان ایک عجمی انسان ابوہریرہؓ کی جلالت و عظمت، صہیب رومی اور سلمان فارسی کی رفعت و بلندی مرتبت اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات تھے جو چشم فلک نے آنکھوں سے دیکھے اور تاریخ نے آغوش صفحات میں محفوظ رکھے ہیں مگر وائے بدبختی کہ بیرونی اثرات اور عرب سے باہر عجمی ماحول نے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اسی لعنت سے دوچار کر دیا جس کا مرثیہ اقبال مرحوم کو اس طرح کرنا پڑا:-

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سرور دو عالم ﷺ نے یہ فرما کر انما ھو مومن تقی او فاجر شقی اس مسئلہ کو اس درجہ صاف کر دیا تھا کہ مسلمان کی زندگی میں کبھی اس کے برعکس زندگی کا کوئی اثر پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا، ذات پات تو صرف اس لئے تھیں کہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں باہمی تعارف صلہ رحمی اور حسن سلوک کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی ہو سکے ورنہ کسی ذات کہاں کا خاندان؟ کون برادری؟ یہاں تو صرف دو ہی فطری اور نیچرل تقسیمیں ہیں یا نکوکار یا بدکار کسی قوم کسی خاندان اور کسی ملک کا انسان ہو اگر سچی خدا پرستی اور نکوکاری رکھتا ہے تو وہ سب ایک برادری اور ایک قوم ہیں اور اگر مشرک و کافر اور بدکار پاپی تو یہ سب ایک گروہ اور ایک ٹولی ہیں۔

یتیمی

خاتم الانبیاء محمد ﷺ کے والد ماجد کا نام عبد اللہ اور والدۂ ماجدہ کا آمنہ تھا۔ ابھی آفتاب ہدایت نے کائنات ہست و بود میں طلوع نہیں کیا تھا اور حضرت آمنہ کی مشکوئے معلیٰ اس ودیعت کی امین ہی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور ارباب سیرت کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ ایک قافلہ کے ساتھ مدینہ (یثرب) پہنچا تو وہ بیمار ہو گئے اور اس لئے اپنے ننہال بنی نجار میں قیام پذیر رہے قافلہ جب مکہ پہنچا تو عبد المطلب نے بیٹے کے متعلق دریافت کیا قافلہ نے ان کی بیماری اور مدینہ میں قیام کا واقعہ کہہ سنایا۔ تب عبد المطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو دریافت حال کے لئے مدینہ بھیجا، حارث جب مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبد اللہ نے ایک ماہ چند روز بیمار رہ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ واپس آکر جب حارث نے باپ کو حادثہ کی اطلاع دی تو عبد المطلب اور تمام خاندان کو اس صدمۂ جانکاہ نے بے حال کر دیا کیونکہ عبد اللہ اپنے باپ بھائیوں کے بہت چہیتے تھے۔

غرض جب ولادت باسعادت ہوئی تو اس سے قبل ہی آپ ﷺ کو یتیمی کا شرف حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ قرآن نے آپ ﷺ کی یتیمی و دنیوی وسائل سے محرومی کے وجود آغوش رحمت کردگار میں نشو نما پا کر ہادی عالم بننے کا معجزانہ اختصار کے ساتھ سورۂ والضحیٰ میں تذکرہ کیا ہے:

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ ○ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ○ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ○

(اے پیغمبر!) کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پھر اپنی آغوش (رحمت) میں جگہ دی اور کیا تجھ کو ناواقف نہیں پایا پھر تجھ کو (کائنات کی ہدایت کے لیے) ہدایت مآب بنایا اور کیا تجھ کو (ہر قسم کے وسائل سے محروم و) محتاج نہیں پایا پھر تجھ کو (ہر قسم کی سروری دے کر) غنی بنا دیا۔

بقول حضرت ابو قتادہؓ ان آیات میں عجیب و غریب اعجاز اور اسلوب بیان کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام ارتقائی مدارج کا تذکرہ ہے تم سمجھتے ہو کہ فآوىٰ کے معنی یہ ہیں کہ پروردگار عالم نے آپ ﷺ کو رہنے سہنے کی صورت پیدا کر دی یا آپ ﷺ کو بے یار و مددگار نہیں رہنے دیا یہ بھی صحیح ہے مگر اس کلام ربانی کی اصل روح یہ ہے کہ اس نے ذات اقدس ﷺ کو ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل سے بے پرواہ رکھ کر اپنی آغوش رحمت میں لے لیا اور آپ ﷺ کے نشو و ارتقاء کو خالص اپنی تربیت میں کامل و مکمل کیا۔[1] اور ووجدك ضالا فهدىٰ کی تفسیر کو خود قرآن ہی نے دوسری جگہ روشن کر دیا ہے مثلاً سورۂ شوریٰ میں ہے:

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ

اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے امر کی روح کا ارتقاء کیا (حالانکہ اس سے پہلے) نہ تو کتاب (قرآن) سے

۱: تفسیر ابن کثیر

واقف تھا اور نہ ایمان کی حقیقت سے لیکن ہم نے اس کو نور (روشنی) بنادیا ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں (اس کی صلاحیت و استعداد کے پیش نظر) اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں۔ (شوریٰ پ ۲۵ ع ۵)

اور آیت عَائِلًا فَاغْنٰى میں دنیوی احتیاج و غنی کا ذکر روح کلام نہیں ہے بلکہ اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو قربت و کمال کا وہ مرتبہ عظمیٰ عطا فرمایا ہے کہ مادی اور روحانی ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر بنا کر صفات حمیدہ اور اخلاق کریمانہ کی مثل اعلیٰ غنی سے بہرہ ور بنادیا، یہی وہ غنی ہے جس کا خود ذات اقدس ﷺ نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:

لیس الغنی عن کثرة العرض ولکن الغنی عن النفس (تفسیر ابن کثیر)

غنی مالداری کی بہتات کا نام نہیں ہے حقیقی غنی نفس کا ماسویٰ اللہ سے مستغنی ہو جانا ہے۔

عمر مبارک ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ کا بھی انتقال ہو گیا بی بی آمنہ آپ ﷺ کو آپ کے ننھیال (مدینہ) میں لے کر گئی تھیں واپسی میں مقام ابواء میں بیمار ہو گئیں اور چند روز علیل رہ کر وہیں انتقال فرمایا اور سن مبارک ابھی آٹھ منزلیں ہی طے کر پایا تھا کہ دادا عبد المطلب نے بھی دنیا سے منھ موڑ لیا اور اس طرح عہد طفلی ہی میں وسائل تربیت اور دنیوی اسباب کفالت سے محرومی نے گویا مشیت الٰہی کی جانب سے یہ اعلان کر دیا کہ جس ذات قدسی صفات کو خدائے واحد نے خالص اپنی تربیت کے لئے منتخب کر لیا ہے کیسے ممکن ہے کہ اس کو دنیوی اسباب و وسائل تربیت کا محتاج بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک یتیم و یسیر اور مادی وسائل سے محروم ہستی کو اپنے لئے چن کر کس طرح اپنی ربوبیت کاملہ کا مظہر بنایا۔ سورۂ انشراح میں اس حقیقت کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا ہے:

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ۝ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝

کیا ہم نے (قبول حق و صداقت کے لیے) تیرا سینہ نہیں کھول دیا اور (معرفت الٰہی کی حقیقی طلب اور قوم اور کائنات انسانی کے بے راہ روی پر ان کی ہدایت کی تڑپ کا) وہ بوجھ ہم نے تجھ سے دور کر دیا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے تیرے ذکر کو کائنات ہست و بود میں بلند کر دیا۔ (انشراح پ ۳۰)

''شرح صدر'' یہ کہ اسباب و وسائل تعلیم و تعلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام علوم و معارف اس عطاء الٰہی اور وہبی معرفت و علم کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئے ہیں جس کی سمائی کے لئے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے اب علوم و معارف کے بحر ناپیدا کنار بھی ہوں تو تیرے سینہ کا دامن وسیع ان کے لئے کافی و وافی ہے اور اسی ''شرح صدر'' نے معرفت الٰہی کے تمام پوشیدہ گنجینے تجھ پر وا کر دیے اور وہ سارا بوجھ تیرے سینہ پر سے ہٹ گیا جس نے تیری کمر کو اس لئے شکستہ کر رکھا تھا کہ قلبی جستجو اور دلی تڑپ کے باوجود تو اس سے قبل نہیں جانتا تھا کہ معرفت الٰہی کی راہ مستقیم کون سی ہے اور گم کردہ راہوں کی راہنمائی کی سبیل کیا ہے؟ مگر اب یہ سب کچھ روشن ہو جانے کے بعد ہم نے عالم بالا و پست میں تیرے ذکر کو وہ بلندی اور رفعت عطا فرمائی کہ تیرا مقام، ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قرار پایا چنانچہ نام احمد ﷺ و محمد ﷺ ہے اور مقام، مقام محمود، سورۂ الحمد وظیفۂ حیات ہے اور لواء حمد قیامت میں طغرائے امتیاز۔ ع

حسن یوسف علیہ السلام دم عیسیٰ علیہ السلام ید بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دار ند تو تنہا داری

یہی نہیں بلکہ قرآن کی تجدید دعوت کے ذریعہ تیری صدائے حق نے اعتقاد و عمل اور ایمان و کردار کی راہ سے تمام دنیا کے نظام ہائے اجتماعی و سماجی میں جو عظیم الشان انقلاب بپا کر دیا اور سوسائٹی کے ہر شعبہ کی پرانی اور فرسودہ بساط کو الٹ کر جو نئی بساط بچھادی اس نے تیرے ذکر وہ رفعت و برتری عطا کی کہ کوئی قوم، کوئی مذہب اور کوئی جماعت کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق

عہد طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتب سیرت و حدیث میں منقول ہیں اس لئے وہیں لائق مراجعت ہیں مختصر یہ کہ دادا عبد المطلب کے انتقال کے بعد آپ ﷺ کے چچا ابو طالب آپ ﷺ کے ساتھ بہت اُنس رکھتے تھے اور زندگی بھر آپ ﷺ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے انبیاء و رسل کی سنت کے مطابق آپ ﷺ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا اور دنیوی مشاغل میں آپ ﷺ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی شام کے مشہور تجارتی شہر بصریٰ میں بھی اس غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے عقد کا باعث ہوا، آپ ﷺ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت مضاربت پر بصریٰ کی منڈی میں لے گئے، خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی رفیق سفر تھا، اس درمیان میں آپ ﷺ کی صداقت و امانت، ایک یہودی راہب کی بشارت اور بیش بہا منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا میسرہ نے وہ سب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہہ سنایا چنانچہ یہی تاثر ازدواجی رشتہ کا باعث بنا گیا۔

اب زندگی میں ایک اور انقلاب ہوا کہ آپ ﷺ کو خلوت گزینی کی طرف رغبت ہوئی اور غار حرا میں روز شب بسر ہونے لگے بت پرستی سے شروع ہی سے نفرت تھی اسلئے کبھی نہ کسی صنم کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت فرمائی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے، اب خلوت میں فطرت سلیم جس طرح راہنمائی کرتی خدائے واحد کی عبادت کرتے مگر ایک خلشِ سینہ میں ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین ہی رکھتی، اکثر یہ سوچ کر تڑپ جاتے تھے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیاء انسانی عموماً کس طرح خدائے واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور یہ کہ اخلاق کی دنیا کس طرح الٹ گئی ہے آخر وہ کونسا نسخۂ کیمیا ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کر دے اور سچی خدا پرستی اور نیک عملی پھر ایک مرتبہ اپنی نمود دکھلائے۔

یہی جذبات و تاثرات تھے جو قلب مضطرب میں موجزن تھے اور خلوت کدۂ حرا میں انہی کیفیات کے ساتھ ذات اقدس ﷺ مصروف یاد الٰہی رہتی اور جب کئی کئی دن اس طرح گزر جاتے تو کبھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حاضر ہو کر آذوقۂ حیات دے جاتیں اور کبھی خود بنفس نفیس جا کر چند روز کا سامان خورد و نوش لے آتے اور حرا میں پھر مشغول عبادت ہو جاتے چنانچہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج حراء زبان سے اس کیف آگیں منظر کا شاہد ہے جس کا لطف اس نے برسوں اٹھایا ہے مشہور محدث و مؤرخ حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اس واقعہ کو ان مختصر الفاظ میں

حسن وخوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:

و انما کان رسول اللّٰہ ﷺ یحب الخلا والانفراد علیٰ قومہ لما یراھم علیہ من الضلال المبین من عبادۃ الاوثان والسجود للاصنام و قویت محبۃ للخلوۃ عند مقاربۃ ایحاء اللّٰہ الیہ صلوات اللّٰہ و سلامہ علیہ۔ (البدایۃ والنہایۃ جلد ۳ ص ۵)

اور سول اللہ ﷺ (دور شباب میں) خلوت پسند ہو گئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت گزارتے تھے کیونکہ وہ قوم کی اس کھلی گمراہی کو دیکھ کر "کہ وہ بت پرستی میں مبتلا اور بتوں کے سامنے سجدہ گزار رہے" کڑھتے تھے اور جوں جوں آپ ﷺ پر وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ قریب ہوتا جاتا تھا (مشیت الٰہی سے) اسی قدر آپ ﷺ کی خلوت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا، صلوٰت اللہ و سلامہ علیہ اس ذات اقدس ﷺ پر خدا کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہو۔"

بہر حال یہی وہ خلوت کدۂ عبادت تھا جہاں ذات اقدس ﷺ پر سب سے پہلے وحی الٰہی کا نزول ہوا اور با لترتیب سورۂ اقرا اور سورۂ مدثر کی چند آیات سنانے کیلئے بشیر ونذیر بنادیا۔

حقیقت وحی؟

یہ وحی و "تنزیل" کیا ہے جس کو نبوت ورسالت کے خصائص میں سے کہا جاتا ہے اور یہ منصب نبوت و رسالت کیا شے ہے جس کا وحی وتنزیل کے ساتھ اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ منطقی اصطلاح میں لازم وملزوم کہا جاسکتا ہے اور اس اصطلاحی گفتگو سے قطع نظر سادہ الفاظ میں اس سوال کو کیوں نہ اس طرح کر دیا جائے کہ کائنات انسانی کے ہر معاملہ میں جبکہ حسن وقبح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے فطرت نے ہم کو جوہر عقل عطا کر دیا ہے اور انسان کے اندر کی یہ سرچ لائٹ (SEARCH LIGHT) ہر ایک مادی شعبۂ حیات میں راہنمائی کرتی ہے تو پھر رسول ونبی کے ذریعہ پیغام الٰہی کی حاجت کیا ہے؟ اور عالم روحانیت کے مسائل اور معرفت الٰہی کے حصول میں تنہا عقل ہی کیوں کافی نہیں سمجھی جاتی؟ یہی وہ سوال ہے جس کے حل ہو جانے پر وحی اور نبوت دونوں کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جا سکتی ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لئے پہلے ایک تمہید قابل توجہ ہے اور دراصل وہی اس مسئلہ کی کلید ہے۔

تم جب کائنات کے وجود و خلق کو عمیق فکر و نظر سے مشاہدہ کرتے ہو تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ خالق کائنات نے اپنی ربوبیت کاملہ کے فیض و عطاء سے ہر شے کو جس طرح وجود بخشا اور خلق کیا اس کو "ہدایت" ہر ایک جاندار پر زندگی اور معیشت راہ کھولتی، ان کی حیات کو مفید بناتی اور ضروریات حیات کی طلب و حصول میں راہنمائی کرتی ہے اور یہی ناموس فطرت کا وہ فیض عام ہے جس کے بغیر کوئی مخلوق بھی سامان حیات اور وسائل تربیت سے استفادہ نہیں کر سکتی اور نہ وجود حیات کی یہ گرمجوشیاں ہی ظہور پذیر ہو سکتیں۔

"مچھلی کے جائے کن تیرائے" اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے وہ جب اس دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو خود بخود پانی میں تیرنے لگتے اور اپنی غذا کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں، پرندوں کے بچے انڈے سے باہر آتے

ہی ہوا میں اڑنے کی کیوں کوشش کرتے نظر آتے ہیں حیوان اور انسان کا بچہ جب اس کارگاہ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو بھوک و پیاس دور کرنے کے لئے ماں باپ سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ خود بخود ماں کے سینہ پر منھ رکھ کر غذا کے خزانہ سے دودھ کیوں چوسنے لگتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ فطرت کا قانون ہے جو ان سب کو فیض ہدایت سے فیضیاب کر کے مخلوق کی نشو و نما کا سامان مہیا کرتا ہے یہ ہدایت ہے جو ہر حرکت حیات میں اپنا کام کر رہی ہے اور یہ فیض ہدایت ہے جو خالق کائنات کی جانب سے مخلوقات کی نشو و نما کے لئے فیض عام ہوا ہے۔

لیکن ابھی وسعت نظر کو آگے بڑھنے دیجئے اور قدرت حق کے مشاہدہ کے لئے تیز گام ہو جیے تو کارگر قدرت اور نوامیس فطرت کی کرم فرمائیاں اور زیادہ جلوہ آرا نظر آئیں گی۔ اور تم دیکھو گے کہ یہ "ہدایت" بھی دوسری موجودات کی طرح ارتقائی درجات رکھتی ہے اور ہر ایک درجہ اپنی افادیت کی نمود جدا رکھتا ہے چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلے وجدان کی ہدایت سامنے آتی ہے اور یہ طبیعت حیوانی کے فطری اور باطنی الہام کا نام ہے یہی وہ ابتدائی درجہ ہے جو بچہ کو قید ہستی میں آنے کے فوراً بعد ہی کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر اس کی غذا کا پتہ دیتا اور اسباب حیات کیلئے معلم بنتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی ارتقائی منزل پر پہنچ کر اور ضمیر کی آواز اندر کی صدا بن کر حقائق کی معرفت کیلئے خارجی دلائل و براہین سے زیادہ قوی حجت ثابت ہوتی ہے اس کے بعد ہدایت حواس کا درجہ یہ پہلے درجہ سے بلند ہے اور اس کی عطاء و بخشش سے ہر ایک ذی روح دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے چھونے کی قوتیں حاصل کرتا ہے اور ان کے ذریعہ کائنات عالم میں اپنی افادیت اور استفادہ دونوں کو ترقی دیتا ہے۔

قدرت حق کی جانب سے یہ دونوں درجے انسان اور حیوان دونوں سے بلند ایک درجہ اور ہے جو ہدایت عقل کہلاتا ہے اور صرف انسان ہی کے لئے مخصوص ہے اور یہ بھی پہلے دو درجوں کی طرح بدیہی او فطرت کے قوانین و نوامیس میں نمایاں جگہ رکھتا ہے یہی وہ ہدایت ہے جو انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشتی اس کے سامنے فکر و نظر اور ترقیوں کی رائیں کھولتی ہے اور اسی کی بدولت وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

عطیہ الٰہی ہدایت کے یہ تینوں درجے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں حضرت انسان کی راہنمائی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں چنانچہ وجدان اس میں سعی پیہم کا جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے "حواس" اس کے لئے معلومات فراہم کرتے ہیں اور عقل اسکو جزئیات و کلیات کا علم بخشتی اور ان سے متعلق احکام و نتائج ترتیب دیتی ہے۔

غرض یہی وہ "ہدایت" ہے قرآن عزیز نے جس کا ذکر انسانی تخلیق و تربیت کے سلسلہ میں کیا ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے باہمی مکالمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدائے برحق کی ربوبیت کاملہ کا جس طرح اظہار فرمایا ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے:

رَبُّنَا الَّذِيٓ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔

اور سورۂ اعلیٰ میں ہے:

اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝

وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اس کو درست کیا پھر ہر وجود کے لئے ایک اندازہ ٹھہرادیا، پھر اس پر راہ عمل کھول دی۔[1]

اور سورۂ بلد میں ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝

کیا ہم نے اس کو (دیکھنے کے لیے) دو آنکھیں نہیں دیں اور کیا (بولنے کے لیے) زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور ہم نے اس کو اچھی اور بری دونوں راہیں دکھادیں۔

اور سورۂ دہر میں ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (سورة الدهر) یا (سورة الانسان)

ہم نے انسان کو (مرد و عورت کے) ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا جس کو (ہم) مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں پھر اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنادیا ہم نے اس پر راہ عمل کھول دی اب یہ اس کا کام ہے کہ شکر گزار بنے یا ناشکر گزار۔

مگر یہ بات بھی بہت صاف ہے کہ ہدایت کے ان ہر سہ مراتب وجدان حواس عقل کی راہ عمل اپنے اپنے دائرۂ عمل ہی تک محدود ہے یعنی وجدان ایک جاندار کے اندر زندگی کے لئے جوش عمل اور سعی مسلسل ولولہ تو پیدا کرسکتی ہے مگر حیوان یا انسان سے باہر محسوسات خارجیہ کا ادراک اور علم اس کے دائرہ عمل سے خارج ہے، اسی طرح ہدایت حواس محسوسات کا ادراک ضرور پیدا کردیتی ہے لیکن یہ اس کے احاطۂ عمل سے ہے کہ وہ محسوسات کے نتائج و احکام اور جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کرسکے کیونکہ یہ کار فرمائی "ہدایت عقل" سے متعلق ہے جو عام حیوانات کے لئے نہیں بلکہ صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے تو ہدایت عقل اگرچہ پہلی دونوں ہدایات کے مقابلہ میں بلند مرتبہ رکھتی اور کائنات کی بلند ترین ہستی (حضرت انسان) کی راہنمائی کرتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ "عقل کا دائرہ" وسیع ہونے کے باوجود پھر محدود ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عقل جو کچھ اور جس قدر بھی نتائج و احکام کا استنباط و استخراج کرتی ہے اس کا دائرہ محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حواس خمسہ (قوت باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ) نے اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جو کچھ ہمارے لئے فراہم کیا ہے عقل اسی پر اپنا تصرف کرتی اور کرسکتی ہے لیکن یہ بات کہ محسوسات کی سرحد سے پرے کیا کچھ ہے اور اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ اس مقام

---

[1] اس آیت میں وجود کائنات کے چار مراتب بیان کرکے قرآن نے ایک عظیم الشان "حقائق علمیہ" کا باب کھول دیا ہے۔ یہ چار مراتب بالترتیب "خلق، تسویہ، تقدیر، ہدایت" ہیں اور یہی چار مراتب خلاصۂ حقائق ہیں، خلق یہ کہ وجود بخشا، تسویہ یہ کہ اسکی استعداد کے مطابق اس کی درست کاری کی، تقدیر یہ کہ ہر شے سے متعلق اس کے بدء خلق سے اس کے نتیجۂ حیات تک کے لیے پہلے سے ایک مقرر اندازہ طے کردیا اور ہدایت یہ کہ اس پر ہر قسم کی راہ عمل کھول دی۔ تفصیلات کتب تفاسیر میں مطالعہ فرمائیں۔

پر پہنچ کر عقل بھی درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ درجۂ ہدایت'' بھی اس سلسلہ میں ہم کو کسی قسم کی روشنی پہنچانے سے معذور نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر وجدان کی تکمیل کے لئے حواس اور حواس کی تکمیل کے لئے عقل کی ہدایت موجود نہ ہوتی تو انسان ہر گز ان مدارج ارتقاء اور مراتب رفیع پر نہ پہنچ پاتا جن تک آج پہنچا ہوا ہے اور آئندہ جن تک پہنچنے کے لئے میدان عمل میں گامزن ہے اگر انسان میں وجدان کی قوت نہ ہوتی تو کس طرح حواس کی دنیا تک اپنی حیات کو پہنچا سکتا اور اگر محسوسات کے ادراک کے لئے حواس کی قوتیں نہ ہوتیں تو انسان کس طرح اپنی ذات سے خارج اشیاء کا ادراک کر سکتا اور ترقی کے لئے کوئی قدم اٹھا سکتا اور جبکہ حواس کے وسائل ادراک محدود ہیں، اور نہ صرف محدود بلکہ بسا اوقات گمراہی اور غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں مثلاً ہم کو طویل فاصلہ کی بڑی سے بڑی چیز چھوٹی نظر آتی ہے یا خلط صفراء کے بڑھ جانے سے شیریں چیز ذائقہ میں تلخ معلوم ہوتی ہے یا فاصلہ ہونے کی وجہ سے ہم رنگوں کے امتیاز میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت کام آتی اور صحیح راہنمائی کرتی ہے اور اصل حقیقت کو پیش نظر لاتی ہے وہ کہتی ہے کہ اگر طویل فاصلہ کی بنا پر تم کو جہاز ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے تو یہ نگاہ اور قوت باصرہ کا قصور ہے ورنہ جہاز ایک لمبی چوڑی اور بڑی شے کا نام ہے اسی طرح شیریں اور تلخ کا فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی شیریں ہر حالت میں شیریں ہے اسلئے ذائقہ کی یہ تلخی مرض کی وجہ سے ہے غرض حواس کی غلطیوں سے محفوظ رکھ کر اصل حقیقت کو واضح کرنا عقل کی ہدایت کا فریضہ ہے اسلئے ہم ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے قطع نظر کہ عقل محسوسات کی حدود سے آگے کچھ نہیں جانتی —— انسان کی عملی زندگی کے تمام حالات میں عقل کی ہدایت بھی کافی اور مؤثر ثابت نہیں ہوتی اسلئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفس انسانی جذبات، رحجانات اور قسم قسم کی خواہشات سے متاثر و مغلوب ہے بلکہ اکثر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جب عقل اور جذبات کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو فتح جذبات ہی کی ہوتی ہے اور عقل درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

تو ان حالات میں عقل ہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں عقل سے بھی بلند اور کوئی درجہ ہونا چاہیے جو عقل سے زیادہ مؤثر رہنما اور ہر قسم کی کوتاہیوں سے پاک اور بے لوث ثابت ہو۔

اس تمہید کا حاصل یہ نکلا کہ انسان محسوسات کے دائرہ میں محدود رہ کر بھی اور ماوراء محسوسات کے ادراک کیلئے بھی ہدایت عقل سے بلند (ایک چوتھے) درجۂ ہدایت کا محتاج ہے تو اب لائق غور و فکر ہے یہ بات کہ جس رب العلمین نے اپنی ربوبیت کاملہ سے انسان کے ارتقائی کمالات کی حاجات و ضروریات کے پیش نظر ہدایت وجدان سے بلند ہدایت حواس اور ہدایت حواس سے رفیع ہدایت عقل عطا فرمائی تو جبکہ عقل کی ہدایت بھی خالص حدود سے آگے نہیں جا سکتی اور حصول کمالات اور اعمال کے صحیح ضبط و نظم کیلئے ہی کافی نہیں ہے نیز ماوراء محسوسات کے عدم علم کے باوجود اس کے انکار پر کوئی مثبت علمی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وجدانی جذبات و احساسات اور شعور نفس اس کے حقیقت ہونے کا پتہ دیتے ہیں تو کیا اس خدائے برحق کی ربوبیت اور فیض رحمت کے لئے یہ منافی نہ تھا کہ وہ انسان کو ہدایت عقل سے بلند کوئی مرتبہ ہدایت عطا نہ کرے؟ ضرور منافی تھا اور اس لئے ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے اس کو ایک اور بلند مرتبہ ہدایت وحی بخشا یہ مرتبۂ

ہدایت اپنی راہنمائی میں ہر قسم کی کوتاہیوں اور خطاء و قصور سے مامون و محفوظ ہے کیونکہ یہ خدا کی جانب سے ہر شے کی حقیقت کا علم و یقین عطا کرتا ہے اور ہدایت وحی کا افاضہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مقدس ہستی کو جو ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے ''معصوم'' ہوتی ہے اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے کہ وہ اس کی جانب لوازم بشریت کے ساتھ مقید رہ کر دوسرے انسانوں کی طرح انسان اور بشر کہلاتی ہے اور دوسری جانب عیوب و مآثم سے معصوم رہ کر خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھتی ہے جو دوسرے مقتدا انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس طرح خدا اور اس کے بندوں کے درمیان افاضۂ ہدایت وحی کیلئے ایلچی اور واسطہ بنتی ہے ایسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں نبوت و رسالت ہے

قرآن حکیم نے ہدایت کے اس مرتبۂ عالی کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے حسب ذیل چند شواہد ملاحظہ ہوں:

وَأَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى

لیکن قوم ثمود تو اسے بھی ہم نے راہ حق و ہدایت دکھلائی تھی لیکن اس نے اندھے پن کو پسند کیا اور ہدایت کی راہ نہ چلی۔ (فصلت)

قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝

(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے یقیناً اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے اور ہم سب کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام کائنات عالم کے پروردگار کے آگے سر عبودیت جھکا دیں۔ (انعام)

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں سعی و جانفشانی کی تو ضرور ہے کہ ہم بھی ان پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلا شبہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو نیک کردار ہیں۔ (العنکبوت)

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُوْلٰى ۝

بلا شبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں (ہدایت وحی عطا کریں) اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لئے ہیں۔ (اللیل)

ارتقائی نقطۂ نظر سے ہدایت وحی اور مسئلہ نبوت و رسالت کی وضاحت کے لئے اشہب فکر کو یوں بھی مہمیز کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ یہ عقلی اور عملی نظریہ مسلمات میں سے ہے کہ بقاء انفع یا بقاء اصلح کے فطری قانون کے مطابق کائنات کی گوناگوں موجودات میں ہر ایک شے اپنے موجود رہنے کے لئے کوئی حکمت و مصلحت ضرور رکھتی ہے اور حکیم مطلق کا قانون فطرت کسی شے کو اسی وقت تک باقی رکھتا ہے جب تک اس کا وجود نافع اور مفید ہونے کی صلاحیت رکھتا اور جس غرض و غایت کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے اس کو پورا کرتا ہے اور اسی قانون بقاء انفع و اصلح سے یہ بات بھی بہت واضح اور نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ نفع اور افادیت کا سب سے اہم جزیہ ہے کہ ہر شے اپنے سے بلند مخلوق اور سلسلۂ مخلوقات میں سے ہر نوع اپنے سے بلند نوع کی بقاء کے لئے مفید و معاون ثابت ہو پس جبکہ حضرت انسان کو عقل بھی موجودات عالم کی سب سے بلند مخلوق اور مدارج ارتقاء کی

بلند ترین کڑی تسلیم کرتی ہے اور اسی قانون کی رو سے موجودات عالم کی ہر شے اس کی خدمت اس کے نفع اور اس کی افادیت میں مصروف عمل نظر آتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اشرف المخلوقات (انسان) کا وجدان، اس کے جذبات عالیہ اور اس کے افکار و خیالات کی پرواز جبکہ عالم مادیات سے کہیں زیادہ بلند اور رفیع ہیں اور اس کی عقل یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ماوراء مادہ سے ناواقف ہے پھر بھی اس پردہ کے پیچھے کچھ ہونے کا احساس رکھتی اور اس کی معرفت کے لئے چسک محسوس کرتی ہے فطرت الٰہی کا فیضان اور بقاء انفع کا ناموس اس کو عالم مادیات و محسوسات ہی کے اندر محصور رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو بلا شبہ فطرت بخیل ٹھہرتی بلکہ یہ فطرت کا بہت بڑا ظلم ہوتا اور یہ ظاہر ہے کہ تنہا عقل اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لئے قاصر و ناکام ہے لہٰذا از بس ضروری تھا کہ فطرت الٰہی اس کی رہنمائی کے لئے مزید کوئی سامان مہیا کرتی اور انسان کی ذہنی و فکری ترقیوں کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتی۔ پس ماوراء مادہ علوم معارف اور کائنات انسانی کی فلاح و نجات کے مقصد عظمیٰ کے لئے عقل کی رہنمائی کا یہی وہ فیضان الٰہی ہے جس کو قرآن کی اصطلاح اور مذہبی بول چال میں وحی و نبوت کہا جاتا ہے اور آیات ذیل اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں:

وَأُوْحِيَ إِلَيَّ هٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ

اس نے (خدا نے) مجھ پر اس قرآن کی وحی کی تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں (اہل عرب کو) اور انھیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (ربع مسکون کو) انکار اور بدعملی کے نتیجہ سے ڈراؤں۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَا إِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ وَأَوْحَيْنَآ إِلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَإِسْمَاعِيْلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَأَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهَارُوْنَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ○ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا○ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا○ (سورۃ النساء پ ٦ ع ٢٣)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری جانب اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح پر اور ان نبیوں پر جو نوح کے بعد ہوئے بھیجی تھی، اور جس طرح ابراہیم علیہ السلام، اسمٰعیل علیہ السلام، اسحٰق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام اور اولاد یعقوب علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، ایوب علیہ السلام، یونس علیہ السلام، ہارون علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطا فرمائی، نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے یہ تمام رسول (خدا پرستی اور نیک عملی پر) خوش خبری دینے والے اور (انکار حق پر) ڈرانے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور

خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ (سورۃ الزخرف پ ۲۵)

اور جب عیسیٰ (خدا کی) نشانیاں لے کر آیا، کہا میں تمہارے پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور اس کے لئے آیا ہوں کہ بعض ان باتوں کو جن کے متعلق تمہارے درمیان اختلاف ہے صاف صاف بیان کر دوں پس اللہ کے متقی بندے بن جاؤ اور میری پیروی کرو (اس بات میں کہ) بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

يَآأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ○ فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ○ (سورہ نساء پ ٦ ع ٢٤)

(اے افراد نسل انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان (دلیل و حجت) آ گئی اور ہم نے تمہاری طرف واضح اور آشکارا روشنی بھیج دی پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انھیں عنقریب اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر دے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انھیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائیگا۔ ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔

قرآن نے ان آیات میں ہدایت وحی کو حکمت برہان (حجت و دلیل) اور نور مبین (آشکار روشنی) کہا ہے تاکہ یہ بخوبی واضح ہو جائے گا جس طرح محسوسات و مادیات کے لئے عقل کو روشنی اور دلیل راہ کہا جاتا ہے اسی طرح عقل کے دائرۂ حدود سے آگے کے لئے ہدایت وحی یہی حیثیت رکھتی اور یہی خدمات انجام دیتی ہے۔

ہدایت وحی کی ضرورت پر اب تک جو کچھ کہا گیا اگر اس کے علاوہ مزید اضافہ مطلوب ہو تو مبدء فیاض کے اس لطیف و حسین فیضان کے متعلق اس روشن پہلو سے بھی نظر کی جا سکتی ہے کہ جب ہم حواس کی قوتوں کا فکر عمیق سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت صاف نمایاں نظر آتی ہے کہ ناموس فطرت نے یہاں ایک قوت کے عملی نظام کو اس طرح سانچہ میں ڈھالا ہے کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی قوتِ حواس اس وقت تک اپنا صحیح عمل نہیں کر پاتی، جب تک خارج سے اس کی مددنہ کی جائے مثلاً قوت باصرہ دیکھنے کی قوت کا نام ہے اور تم اس سے اپنی زندگی میں برابر کام لیتے رہتے ہو اور اس بحث سے قطع نظر کہ جو بے بہر موجود ہے وہ آنکھ کے باریک پردوں پر اپنا عکس ڈال رہی ہے یا آنکھ کے پردوں میں جو روشنی ہے وہ اندر سے بشکل شعاع نکل کر موجود خارجی کو متاثر کر رہی ہے اور اس کو ہم دیکھنا کہتے ہیں تم نے کبھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ جب تم کسی قسم کی بھی روشنی میں ہوتے ہو تو اپنی قوت باصرہ کی استعداد کے مطابق جس شے کو دیکھنا چاہتے ہو دیکھتے ہو لیکن جوں ہی تاریکی کا شکار ہو جاتے ہو اور شب دیجور کے ساتھ ابر سیاہ کے پردے روشنی پر چھا جاتے ہیں اس وقت حلقۂ چشم میں قوت باصرہ کی

موجودگی کے باوجود تم یہ کہا کرتے ہو کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تو آخر بینا ہوتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہو؟ تمہارا جواب اس وقت یہ ہوتا ہے کہ قانون قدرت نے یہی مقرر کر دیا ہے کہ باطنی قوائے عمل اس وقت تک اپنا صحیح کام نہیں کرتے جب تک خارج سے اسی سلسلہ کی مدد نہ پہنچے۔ اس لئے قوت باصرہ کی باطنی قوت بھی محتاج ہے کہ روپے (چراغ) کی روشنی سے لے کر ماہتاب و آفتاب تک جس حیثیت کی بھی روشنی ہو اس کی مدد کرے تو وہ اپنا عملی مظاہرہ کر سکے گی اور یہی حال دوسرے حواس کا بھی ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے کہ خدائے واحد کا قانون قدرت اور ناموس فطرت اپنی وحدت کی جلوہ نمائی کا مظاہرہ کائنات مادی اور عالم روحانی میں یکساں طور پر کرتا رہتا ہے۔ تو بے تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ عقل حضرت انسان کے اندر کی وہ روشنی ہے جس کو ید قدرت نے انسانیت کے ارتقائی منزل پر گامزن ہو کر انسانیت کی مثل اعلیٰ اور مقصد عظمیٰ کو پانے کے لئے ودیعت کیا ہے مگر مسطورۂ بالا قانون یہاں بھی اسی طرح کار فرما ہے جیسا کہ قوائے حواس میں کار فرما نظر آتا ہے یعنی اگر عقل عالم محسوسات و مادیات کے دائرے میں اپنا عملی مظاہرہ کرنا چاہتی ہے تو یہ وہ محسوسات خارجی کی مدد کی ضرور محتاج رہتی ہے مثلاً اس کا یہ فریضہ ہے کہ جزئیات کے ذریعہ کلی کا استخراج کرے لیکن وہ ایسا جب ہی کر سکے گی کہ خارج میں اس سلسلہ کی جزئیات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے حقائق اصلیہ کو اس کے سامنے پیش کرے پس اگر عقل کی روشنی اور ان حقائق کے درمیان وہم، خیال اور ظن کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو عقل کی روشنی ہرگز اپنا صحیح کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جب وہ ماوراء محسوسات (روحانیات) کی جانب اپنی روشنی کو متوجہ کرتی ہے تو یہی اوہام ظنون، خیالات اور جذبات فاسدہ کے تاریک پردے اس کے اور عالم روحانیات کے درمیان عموماً حائل ہو جاتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر ان سے مغلوب ہو کر گم کردہ راہ ہو جاتی اور معرفت حق اور معرفت باطل کے درمیان فرق و امتیاز سے عاجز نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں خالق کائنات کی رحمت کاملہ اور ربوبیت تامہ اس کو خاسر و ناکام نہیں چھوڑتی اور خارج سے اس کی پوری مدد کرتی ہے اور یہی وہ خارج کی روشنی ہے جو نبی اور پیغمبر کے ذریعہ کائنات انسانی تک پہنچی اور دین و مذہب کی زبان میں وحی روشنی ہو کہی جاتی ہے چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے جگہ جگہ وحی کو نور (روشنی) سے تعبیر کیا ہے:

يَآأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ○

(اے افراد نسل انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برہان (دلیل وحجت) آگئی اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور آشکارا روشنی (وحی الٰہی بشکل قرآن) بھیج دی۔" (النساء)

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيْنٌ ○

اللہ کی جانب سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی آچکی اور ایسی کتاب آگئی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔ (مائدہ پ۶ع ۳)

يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّآ أَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهُ وَلَوْ كَرِهَ

الْكَافِرُوْنَ ۝

یہ لوگ (مشرکین، یہود، نصاریٰ) چاہتے ہیں اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں حالانکہ اللہ یہ روشنی پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں اگر چہ کافروں کو پسند نہ آئے۔ (توبہ پ۱۰ع۵)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِآيَاتِنَآ أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ

اور (دیکھو واقعہ یہ ہے کہ) ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ ؑ کو بھیجا تھا کہ اپنی کو تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے۔ (سورہ ابراہیم پ ۱۳ ع ۱)

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ أَمْرِنَا ط مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (شوریٰ پ ۲۵ ع ۵)

اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے "امر" میں سے "روح امر" کی وحی بھیجی حالانکہ اس سے قبل تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب؟ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ایمان؟ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ان کو اس کے ذریعہ راہ دکھاتے ہیں اور اے پیغمبر! بلاشبہ تو (لوگوں) کو سیدھی راہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔"

پھر اس مسئلہ کی اہمیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی فکر و نظر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم اس عالم ہست و بود میں روز و شب کے مشاہدات و تجربات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ یہاں ہر شے کی کیفیت و کمیت یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ایک ترازو یا پیمانہ ضرور ہے اور یہ کہ ہر ایک پیمانہ اور ایک ترازو اپنے اندر ایک خاص صلاحیت رکھتا اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہی اشیاء کے ناپ تول میں کام دے سکتا ہے مثلاً موتی اور جواہرات کے تولنے کے لئے ایک خاص ترازو (کانٹا) ہے، اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اس میں شکر روئی، غلہ جیسی چیزوں کو تولیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے یہ نہیں بلکہ دوسری قسم کا ترازو کام دے گا یا مثلاً کپڑا، زمین وغیرہ جیسی اشیاء کی پیمائش کے لئے ہم ایک خاص قسم کا پیمانہ (گز) استعمال کرتے ہیں پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس سے حرارت و برودت کی بھی پیمائش کر لیں تو اس کے لئے یہ نہیں بلکہ دوسرا پیمانہ تھرمامیٹر (THERMA METER) کام میں لانا ہوگا، اور اسی طرح ہوا کے دباؤ اور سطح کی اونچائی معلوم کرنے کے لئے بیرومیٹر (BARO METER) اور زلزلوں اور بھونچالوں کی حالت دریافت کرنے کے لیے سیس میٹر (SEISO METER) اور آواز کی مقدار و قوت کی پیمائش کے لئے فونو میٹر (PHONO METER) جدا جدا قسم کے پیمانے استعمال کرنے ہوں گے کیونکہ ان کی اپنی صلاحیت و استعداد کار یہی فطری تقاضا ہے کہ اگر اس کے خلاف ان کا استعمال کیا جائے گا یا تو قطعاً بیکار ثابت ہوں گے اور یا صحیح حقیقت نہ بتلا سکیں گے حالانکہ ان سب کا ایک ہی کام ہے یعنی ناپ تول اور ایک ہی نام ہے ترازو اور پیمانہ مگر ہر شے کی حقیقت اور اس کی کیفیت و کمیت کے پیش نظر چونکہ ان سب کی صلاحیت کار کی حدود متعین ہیں لہٰذا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کار آمد ثابت نہیں۔

قانون قدرت کی کارفرمائی کو رہنما بنا کر اگر ہم اسی نقطۂ نظر سے آگے قدم بڑھائیں اور خالص مادیات سے گزر کر معنویات کی حدود پر جا پہنچیں تو یہاں بھی وہی کرشمۂ قدرت نظر آتا ہے یعنی انسان کی انفرادی و اجتماعی حیات کے لئے رحمت کردگار نے جو پیمانے مقرر کیے ہیں اور جن کو وجدان حواس اور عقل کہا جاتا ہے ان میں بھی جدا جدا صلاحیتوں کے اعتبار سے حدود منقسم ہیں مثلاً پیمانۂ وجدان" انسان کی صرف اسی کیفیت و حالت سے متعلق ہے جو قدرت کے ہاتھوں نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس میں ودیعت کر دی ہے اور حواس کا پیمانہ ان ہی اشیاء سے تعلق رکھتا ہے جو دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے میں آسکتی ہیں اور پیمانہ عقل ان دونوں سے آگے عالم مشاہدات و محسوسات کے حقائق اور ان کی کیفیات کے جانچنے، ان کے درمیان امتیاز پیدا کرنے، ان سے نتائج اخذ کرنے اور ان پر احکام صادر کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

پس اگر ہم چاہیں کہ وجدان سے حواس اور حواس سے عقل کا کام لیں تو خود عقل ہی کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہوگا کیونکہ یہ قانون فطرت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کے مرادف ہے جس کے اقدام پر ناکامی کے ماسوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

لیکن عقلِ انسانی اس کے آگے نہ جاننے کے باوجود پھر جاننے کی جو جستجو رکھتی اور اپنی ترقی کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھتی، نیز تمام خارجی دلائل سے بڑھ کر انسان کے اندر کی قوی ترجحت و برہان وجدان ان ہر دو عالم سے بھی بلند تر عالم کے وجود کا جو پتہ دیتی ہے اس کے پیش نظر ہم وسعت نظر کا قدم اور آگے بڑھاتے اور مسطورۂ بالا عالم معنویات سے لطیف تر معنوی علم کا کھوج لگانا چاہتے اور اس کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ جہاں حسن، صداقت اور محبت[1] (ذات حق کی صفات ربوبیت، عدالت اور رحمت) اپنی جلوہ آرائیوں سے اس کائنات کو بھی منور کر رہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر پیمانہ عقل بھی کوتاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی رفعت پرواز وہاں تک رسائی نہیں کر پاتی، خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسانوں کے درمیان عقل کا اس درجہ تفاوت موجود ہے کہ ایک شخص کی عقل اس کو نہ صرف ممکن الوقوع سمجھتی ہے بلکہ اس کو وجود پذیر کر دکھاتی ہے بلکہ تفاوت عقلی کی بوالعجبیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل ایک وقت جس بات پر ناممکن کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے دوسرے وقت میں اسی بات کو ممکن سمجھنے لگتی ہے تو جب پیمانہ عقل کا عالم محسوسات میں یہ حال ہے تو عالم غیب تک اس کی رسائی معلوم؟ اور پھر جس پیمانہ کے توازن کو غیر متوازن بنانے کے لئے وہم و خیال اور جذبات کا سیل رواں موجیں مارتا رہتا ہو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خارج سے مدد و یاری کے بغیر عقل معرفت الٰہی اور علوم غیب تک رسائی حاصل کر سکتی ہے؟

پس انسان کی بیچارگی و درماندگی کے اس مقام پر بھی رحمت پروردگار اپنے فیضان سے اس کو محروم نہیں رکھتی اور معنوی و روحانی حقائق کی معرفت کے لئے ایک مقدس ہستی (پیغمبر) کے ذریعہ اس کو عقل سے بھی رفیع و لطیف پیمانہ ہدایت وحی عطا کر دیتی ہے تاکہ انسان سعادت و شقاوت میں امتیاز کرنے کے بعد حیات سرمدی اور

۱: آج کل علماء جدید میں یہ بحث جاری ہے کہ سائنس نے اپنی حدود کو اس طرح محدود رکھا کہ اس کے دائرہ میں حسن، صداقت اور محبت کی کوئی قدر و قیمت نظر نہیں آتی اور اس لیے وہ خدا کی ہستی کی معرفت ضروری نہیں سمجھتی مگر یہ سائنس کا کمال نہیں ہے بلکہ نقص ہے جو آج نہیں تو کل ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

نجات ابدی کو پاسکے۔

قرآن عزیز نے وحی الٰہی کو یہی حیثیت دیتے ہوئے سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ

اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور اتارا "میزان" (ترازو) کو یعنی دین حق کو جو حق و باطل کے لئے ترازو اور پیمانہ ہے۔ (شوریٰ پ ۲۵ ع ۲)

چنانچہ شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) موضح القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریری فرماتے ہیں

"ترازو فرمایا دین حق کو جس میں بات پوری ہے نہ کم نہ زیادہ"

صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل

"ہدایت وحی" یا نبوت و رسالت کی حقیقت و اہمیت پر گذشتہ سطور میں کوتاہ قلمی کے باوجود جو کچھ سپرد قرطاس کیا گیا اس کی تکمیل کیلئے اس سوال کو بھی حل کرنا از بس ضروری ہے کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ حامل وحی ہے اور خدا کا پیغمبر اور ایلچی تو اس کے دعوئے صدق و کذب کی معرفت کا کونسا طریقہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ علم الکلام کے ماہرین (متکلمین) نے اس معرفت کے لئے بہت سے دلائل و براہین پیش کیے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اس پر معرکۃ الآراء بحثیں کی ہیں تاہم وہ اپنے طرز استدلال میں اصطلاحی فلسفیانہ اسلوب رکھتی ہیں جسم کو ہم مذہبیات و روحانیات میں خاص اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اس راہ میں وہی اسلوب بیان مفید دلنشین اور جاذب قلوب ہو سکتا ہے جس کی بنیاد و نہاد وجدانی طرز استدلال پر رکھی گئی ہو اور عقلیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصطلاحی فلسفہ و منطق کی قیود میں اس کو پابہ زنجیر نہ کر دیا گیا ہو اور یہ اس لئے کہ معرفت الٰہی اور معرفت علوم غیبیہ کے لئے دلیل "وجدان" سے زیادہ دوسری کوئی دلیل برہان مؤثر نہیں ہے اسی حکمت بالغہ کے پیش نظر قرآن عزیز کے تمام عقلی استدلالات ---- جن پر غور کرنے کے لئے "قرآن" عقل و فکر اور تدبر کو مخاطب بناتا ہے ---- کی بنیاد بھی "وجدان" پر قائم کی گئی ہے البتہ یہ قرآن حکیم کا اعجاز بلاغت ہے کہ ان وجدانی دلائل کو اگر کوئی فلسفی دقیق فلسفیانہ طریق استدلال کے سانچہ میں ڈھال کر زیر بحث لانا چاہے تو یہ وجدان پر مبنی استدلالات اسی اہمیت و قوت کیساتھ اپنی صداقت اور ثمرہ و نتیجہ کو اس رنگ میں بھی تسلیم کرا لیتے ہیں۔

غرض "وجدان" اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تم مدعی نبوت کی زندگی کو صداقت کی کسوٹی پر خوب کسو اور اگر آج وہ ہستی تمہارے سامنے نہیں ہے تو تعصب اور نسلی و جماعتی حسد سے پاک اور بے لوث ہو کر بے لاگ تاریخی حقائق سے دریافت کرو، پس اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اس کی قبل از دعویٰ نبوت زندگی کا ہر شعبۂ حیات صداقت و حقانیت کا مظہر ہے اور ہر ایک شعبۂ زندگی بے داغ صداقت کا پیکر اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اس کا وجود ہر قسم کی بداخلاقیوں، گناہوں اور آلودگیوں سے پاک اور معصوم ہے اور اخلاقی بلندیوں کا مخزن اور ان ہی

کیفیات و حالت کے ساتھ اس نے جانے بوجھے لوگوں میں زندگی کا بڑا حصہ گذارا ہے تو پھر اس کے دعوئے صداقت میں شک و شبہ کرنا عقل سلیم کے خلاف ہوگا کیونکہ عقل بآسانی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اپنی مدت حیات کے طویل عرصہ میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی کبھی ایک لمحہ کیلئے انسانی دنیا پر جھوٹ نہ بولا ہو، آخر دماغی و قلبی انقلابات کی وہ کونسی تاریخ ہے جس کی بنا پر ایسی باہوش و حواس ہستی کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خالق کائنات خدائے برحق پر کذب بیانی اور افترا پردازی کیلئے یک بیک آمادہ ہو جائے، چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

قُلْ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ط اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (سورۂ یونس پ ۱۱ ع ۲)

اور تم کہو اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو بیشک بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا۔

صاحب وحی کی صداقت کی یہ ایسی بہترین کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ۶ھ میں پادشاہان دنیا کے نام اسلام کی دعوت و پیغام کے سلسلہ میں والا نامے بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت (رومن امپائر) کے پادشاہ ہرکلیوس (ہرقل) کے پاس حضرت دحیہ کلبیؓ نامہ مبارک لے کر پہنچے تب اس نے بھی جب آپ ﷺ کی صداقت کو پرکھنا چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو معیار صداقت ٹھیرایا اور صورت حال یہ پیش آئی کہ کہ اس نے سرکاری حکام سے دریافت کیا یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس سے اس ہستی کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں؟ اتفاق سے ابوسفیانؓ (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ مقیم تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہرکلیوس نے رئیس التجارۃ (ابوسفیان) سے نبی اکرم ﷺ کے متعلق چند سوالات کیے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ وہ تمہارے اندر ہی پلا بڑھا رہا سہا ہے تو کیا تم نے اس کی زندگی کے اس طویل دور میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا ہے؟" ابوسفیانؓ نے جواب دیا: "کبھی نہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قوم میں "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے" یہ سن کر ہرکلیوس نے یہ کہا:

وسألتك هل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال فذكرت ان لا فقد اعرف انه لم يكن ليذر الكذب على الناس و يكذب على الله۔ (بخاری ج ۱)

میں نے تجھ سے یہ بھی دریافت کیا: کیا کبھی اس کے اس دعویٰ سے قبل تم نے اس کو جھوٹا پایا ہے؟" تو نے کہا "کبھی نہیں" تب میں نے یقین کر لیا کہ جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ بول سکتی۔

جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی"۔ دیکھئے یہ جملہ اس سلسلہ میں وجدان انسانی کا کس درجہ صحیح ترجمان ہے کہ ہر کلیوس نے بھی تمام عقلی و نقلی دلائل سے الگ ہو کر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جس کو وجدان کے خالق (خدائے برتر) نے اپنے پیغمبر سے (صداقت دعویٰ کیلئے) پیش کرائی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان آیات کی تفسیر اسی حقیقت کی روشنی میں اس طرح کی ہے:

پھر آیت (۱۶) میں صداقت نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے...... فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں، یعنی چالیس برس تک جو عمر کہ عمر انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لئے طیار ہو جاؤں اور جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لئے طیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علماء اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا، پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ فاطر السموٰت والارض (آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا) پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افتراء کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر مفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورت حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیئے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا، جو صادق تھا اس کا کلمۂ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۵۰)

بہر حال "صاحب وحی" کے دعوئے صداقت کی یہ وجدانی دلیل عقل سلیم اور فکر مستقیم کی نگاہ میں علم الیقین پیدا کرنے کے لئے کافی و وافی ہے تاہم بقیہ شرائط یعنی صداقت تعلیم نزول وحی کا ادعاء اور مخالفین کے مقابلہ میں

تحدی (چیلنج) اور تحدی کا ایفاء مدعی نبوت و رسالت کے لئے یہ تمام امور بھی از بس ضروری ہیں اور اپنی جگہ تفصیل طلب اور قابل لحاظ ہیں اس لئے کہ ان شرائط کے پیش نظر ہی نبی اور مصلح کے درمیان امتیاز، نبی اور ساحر و شعبدہ باز کے مابین فرق بین اور نبی اور متنبی میں تضاد قائم کیا جاسکتا ہے۔[1]

بعثت

غرض خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا یہ حال تھا کہ ایک جانب خلوتہائے راز میں معرفت الٰہی کے لئے استغراق، صراط مستقیم کی جستجو، نوع انسانی کے اصلاح حال کی تڑپ اور طلب تھی اور دوسری جانب افراد قوم و ملک کے ساتھ راست گفتاری، صداقت شعاری، حسن معاملت اور اصابت فکر جیسے اخلاق کریمانہ و صفات حمیدہ سے متصف معاشرتی زندگی کا مظاہرہ تھا اور ان امتیازات کی وجہ سے ہر فرد کی نگاہ میں آپ ﷺ کی وہ قدر و منزلت تھی کہ باتفاق رائے الصادق الامین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور کل جو دشمنی ان کو محمد رسول اللہ ﷺ سے دعوئے نبوت کی بناء پر ہوئی وہ آج محمد بن عبد اللہ کے ساتھ قطعاً نہیں تھی اور سب ہی ان کی تقدیس و تطہیر کے قائل تھے۔

یہی حالات و واقعات تھے جبکہ عمر مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی رمضان کا مہینہ تھا اور آپ ﷺ غار حراء میں مشغول عبادت تھے کہ اچانک آپ کے سامنے جبرئیل علیہ السلام فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ثقلین کی رشد و ہدایت کے لئے چن لیا اور رسالت و پیغمبری کے منصب کبریٰ پر فائز کیا۔

یہ واقعہ چونکہ نوع انسانی کی تاریخ میں حیرت زا انقلاب کا باعث ثابت ہوا اور اس نے ذات اقدس ﷺ کو معراج رفعت کی اس حد پر پہنچا دیا جہاں عالم ادیان و ملل کے تمام اصلاحات و انقلابات اس ہستی کا فیض رحمت نظر آتے ہیں اس لئے تاریخ و حدیث کے روشن صفحات نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو بسند صحیح اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ فن حدیث و تاریخ اسلام کے امام بخاریؒ نے اپنی مشہور و مقبول کتاب الجامع الصحیح میں صدیقہ عائشہؓ کی سند سے اس واقعہ کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:

> نبی اکرم ﷺ پر شروع میں سچی خوابوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی خواب آپ ﷺ نہیں دیکھتے تھے مگر وہ اپنی تعبیر میں اس درجہ روشن اور صحیح ثابت ہوتا تھا جیسا کہ طلوع صبح کے لئے سپیدۂ صبح کا ظہور ہوتا ہے پھر آپ ﷺ کو خلوت محبوب ہوگئی اور حراء میں مشغول عبادت رہنے لگے۔ گاہے گاہے آپ ﷺ اہل و عیال کے پاس بھی تشریف لے آتے تھے حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کے لئے کچھ توشہ تیار کرتیں اور آپ ﷺ اس کو لیکر پھر غار میں واپس تشریف لے جاتے اسی طرح حرا میں مشغول استغراق و عبادت تھے کہ اچانک ایک روز آپ ﷺ پر خدا کا فرشتہ نمودار ہوا اور

[1] یہ مباحث علم کلام میں قابل مراجعت ہیں لیکن قصص القرآن کی تمام جلدوں کے مطالعہ سے یہ کل مبحث تسلی بخش تفصیلات کے ساتھ مل جائیں گے۔

کہنے لگا اقراء پڑھئے نبی امی نے کہا ما انا بقاری میں پڑھنا نہیں جانتا پیغمبر ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ جب میں نے فرشتہ سے یہ کہا تو اس نے مجھ کو گرفت میں لے لیا۔ جن کی شدت سے مجھ کو تکلیف محسوس ہونے لگی اور پھر چھوڑ کر مجھ سے دوبارہ کہا پڑھیے اور میں نے وہی جواب پھر دیا میں پڑھنا نہیں جانتا تب اس نے پھر وہی عمل کیا، اور گرفت چھوڑ کر تیسری مرتبہ پھر پہلا جملہ دہرایا اور میں نے بھی وہی سابق جواب دیا غرض تین مرتبہ یہی گفتگو اور یہی عمل ہوتے رہنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرشتہ نے (سورۂ اقراء کی) یہ چند آیتیں تلاوت کیں،

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو خون بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے قلم (تحریر) کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ ناواقف تھا"۔[۱]

غرض نبی اکرم ﷺ نے ان آیات کو دہرایا اور یہ آپ ﷺ کے ذہن نشین ہو گئیں اس کے بعد جب حراء سے فارغ ہوئے تو یہ حالت کہ قلب (شدت وحی سے) کانپ رہا تھا، آپ ﷺ کو سکون ہو تو خدیجہؓ کو تمام واقعہ سنایا اور پھر فرمایا: خشیت علی نفسی "مجھے جان کا خوف ہے"۔[۲] (حضرت) خدیجہ نے سن کر عرض کیا "قسم بخدا! خدا آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری، بیچاروں کی چارہ گری فرماتے اور مفلس کیلئے ذریعۂ معاش مہیا کرتے ہیں اور حق رسی کی کڑی سے کڑی مصیبت میں مددگار بنتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرت خدیجہؓ نبی اکرم ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ زمانۂ جاہلیت کے ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سچی عیسائیت کو قبول کر لیا تھا۔ عبرانی زبان سے واقف اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے اور بہت ضعیف العمر اور نابینا تھے (حضرت) خدیجہؓ نے ورقہ سے کہا: برادر من آپ اپنے بھتیجے کا واقعہ تو سنیے ورقہ نے دریافت حال کیا، تب نبی اکرم ﷺ نے گذرا ہو واقعہ سنایا، ورقہ نے سنا تو کہا ھذا النا موس الذی کان ینزل علیٰ موسیٰ یہ وہ فرشتہ (جبرئیل علیہ السلام) ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی الٰہی لے کر آیا تھا کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھ کو تیرے وطن (مکہ) سے نکالے گی۔" آپ ﷺ نے دریافت کیا: کیا مری قوم مجھ کو وطن سے بے وطن کرے گی ورقہ نے کہا: "بیشک ایسا ہوگا اور جس پیغام کے لئے خدا نے آپ ﷺ کو پیغمبر بنایا ہے اس خدمت پر جو بھی مامور ہوا اس

۱: حضرت شاہ عبدالقادر (رحمۃ اللہ) اس آیت کی تفسیر میں بہت ہی لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں، موضح القرآن میں لکھتے ہیں: اول جبرائیل علیہ السلام وحی لائے تو یہی پانچ آیتیں، حضرت محمد ﷺ نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا اسلئے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی (یعنی بغیر وسائل بھی وہی طور پر) وہی دے گا۔

۲: یعنی مجھے یہ خوف ہے کہ شاید میں وحی کے بار کو برداشت نہ کر سکوں۔

کیسا تھ یہی صورت پیش آئی ہے پس اگر وہ وقت میری زندگی میں آیا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیری حمایت کروں گا" مگر ورقہ کو یہ وقت نہیں آیا اس سے قبل ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

(بخاری باب کیف کان بدء الوحی علی رسول اللہ ﷺ)

حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی

صدیقہ عائشہؓ کی حدیث میں نزول وحی کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ پر جو فوری تاثر ہوا اس کو خود زبان مبارک سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے انی خشیت علی نفسی اور پھر اس کے متصل ہی حضرت خدیجہؓ کے تسکین دہ الفاظ منقول ہیں تو یہ واقعہ کا ایسا پہلو ہے جس کی فطری صداقت اور غیر مصنوعی سادگی خود بخود دل میں اتر جاتی ہے اور واقعہ کا نقشہ اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ ایک صادق وامین ہستی اپنی پاک اور بے لوث زندگی کے ساتھ ایک غار میں محو استغراق ہے اس کے قلب میں خدائے برتر کے لئے عشق سے سرشار جذبۂ عبودیت موجزن ہے، وہ شرک اور گناہوں کی آلودگیوں سے نفور و بیزار گوشۂ تنہائی کو پسند کر کے پہاڑ کے ایک غار میں سرگرم عبادت ہے یہ سلسلہ اگرچہ عرصہ سے جاری ہے مگر اچانک ایک روز خدا کا فرشتہ (جبرئیل) جو ہمیشہ سے خدا کے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا رہا ہے، اس پر ظاہر ہوتا ہے اور وحی الٰہی کی پیغام رسانی کرتے ہوئے اس کو نبوت و رسالت کی بشارت دیتا ہے یہ ہستی چونکہ اس سے قبل اس منصب جلیل کی حقیقت سے ناآشنا تھی اس لئے اس حیرت زا خبر اور وحی الٰہی کی عظیم ترین روحانی قوت کے زبردست اثر نے جو فوری انقلاب ذات اقدس ﷺ میں پیدا کیا اس کی وجہ سے تشویش اور گھبراہٹ کا رونما ہونا ایک فطری بات تھی "خشیت علی نفسی کی مراد یہ نہیں تھی کہ جان کا خوف آپ ﷺ کو پریشان کیے ہوئے تھا، ایک عربی نژاد، قریشی الاصل اور شخصی شجاعت کے مالک سے اس قسم کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس بار عظیم کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں چنانچہ اس تاثر کو اس مقدس انسان کی رفیقۂ حیات خدیجۃ الکبریٰؓ نے محسوس کرتے ہوئے اس کے اخلاق کریمانہ اور اوصاف حمیدہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسی ہستی ناکام زندگی کے لئے نہیں ہوتی اور خدا کبھی آپ ﷺ کو رسوا نہیں کرے گا اور پھر اس مقدس پیغمبر کو ورقہ کے پاس لے گئیں تا کہ ایک ایسے شخص سے جو عرصہ سے خدا کی وحی اور خدا کی کتاب کا ذکر کرتا رہتا ہے اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں۔

اس صاف اور سادہ بات کو دیکھئے اور پھر بعض مستشرقین یورپ کی اس مضحکہ خیز نکتہ چینی پر نظر ڈالئے جو تعصب اور کوتاہ نظری کی عینک لگا کر کی گئی ہے:

> اگر پیغمبر اسلام پر حراء میں وحی الٰہی کا نزول اور فرشتہ کا ظہور ہوا ہوتا تو پھر آپ ﷺ وحی الٰہی سے فیضیاب ہو کر اور منصب رسالت کی بشارت سن کر یہ کیوں فرماتے انی خشیت علی نفسی اور خدیجہ کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کیا آپ ﷺ کو خدا پر بھروسہ نہیں تھا۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا، حقیقت حال کیا تھی اور اس کو رنگ و روغن دیکر کیا بنا دیا؟ یہاں نہ خدا پر عدم اعتماد کی کوئی جھلک ہے اور نہ فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول پر ریب و شک کا معاملہ ہے بلکہ اس حقیقت کے اعتراف ہی کی وجہ سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کا ایک فطری تاثر ہے جو آپ ﷺ کی صداقت کا مزید

ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اگر اس کے برعکس کہیں آپ اس واقعہ کو اس طمطراق کے ساتھ پیش فرماتے کہ گویا ذات اقدس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جانی بوجھی بات ہے تب البتہ اس کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس شخص نے (دعوئے نبوت کے لیے) پہلے سے ایک منصوبہ قائم کر رکھا تھا، اور حراء کی خلوتیں بھی اسی مقصد کے لئے تھیں چنانچہ اب موقع دیکھ کر اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔ بہر حال اس مسئلہ پر ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے علماء اسلام نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے مثلاً: مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین بن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ثم قال "لقد خشيت على نفسي" وذلك لانه شاهد امراً لم يعهده قبل ذلك ولا كان في خلده۔

آپ ﷺ نے پھر فرمایا "لقد خشیت علی نفسی" یہ اس لئے فرمایا کہ آپ نے ایک اسی حقیقت کا آج مشاہدہ کیا کہ اس سے قبل اس سے واقف نہیں تھے اور نہ کبھی آپ ﷺ کے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ ایسا کچھ پیش آئے گا۔

اور حکیم الامتہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی لطیف توجیہ کا حاصل یہ ہے

پھر آپ ﷺ پر غار حراء میں حق (وحی) کا نزول ہوا جب فرشتہ اور آپ ﷺ کے درمیان سلسلۂ کلام ختم ہو گیا تو آپ ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کو ہم اپنی زبان میں تشویش و اضطراب سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کا پیش آنا فطری تھا اس لئے کہ جب نزول وحی کی وجہ سے آپ ﷺ کے بشری قویٰ پر ملکوتی صفات نے اثر کیا تو دو متضاد قوتوں کے درمیان تصادم اور پھر ملکوتی قوت کے غلبہ کی وجہ سے آپ ﷺ کے اندر تشویش پیدا ہو جانا یقینی تھا یہی وجہ ہے کہ ابتداء نزول وحی کے بعد کچھ مدت تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا کیونکہ انسان بشریت اور ملکیت دو جہات کے درمیان محصور ہے پس جس ہستی کی بشریت پر ملکوتی صفات غالب آکر اس کو ظلمتوں سے نور کی جانب لے جاتی ہیں تو جس قوت کے ساتھ یہ غلبہ اپنا اثر کرتا ہے انسان اپنے اندر اسی شدت کے ساتھ بشریت و ملکیت کے درمیان تصادم اور تزاحم محسوس کرتا ہے اور شدت تصادم کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ملکوتی قوت و استعداد کو اس درجہ کامل و مکمل کر دے جو منصب نبوت و رسالت کے لئے ضروری حتی کہ اس کی قوت بشری (قوت بشری و جوانی) قوت ملکوتی کے ہاتھ پوری طرح تابع اور منقاد ہو جاتی ہے اور اب وہ ہستی جس کو فیضان نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے مطمئن اور تصادم کی کشمکش سے بالاتر ہو کہ اس منصب جلیل (نبوت و رسالت) کی خدمت کے قابل ہو جاتی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۵۳)

بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق

نبوت اور "بشریت" کے درمیان اس درجہ نازک رشتہ ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم سے قبل پیروان مذاہب و ادیان نے اس راہ میں بھی اعتدال کو ترک کر کے افراط اور تفریط کو اسوہ بنا لیا تھا اور اس بارہ میں ان کو

سخت ٹھوکر لگی تھی چنانچہ بعض پیروان مذہب نے یہ دیکھ کر کہ نبی اور رسول باوجود اس امر کے کہ وہ انسان اور بشر کی شکل و صورت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی افراد انسانی سے جدا ایسی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حاصل نہیں ہوتیں۔ اس لئے دراصل وہ بشر نہیں بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے جس نے انسانوں کو نجات کے لئے جامۂ بشریت اختیار کر لیا ہے۔[1] اس کے برعکس دوسری جماعت نے یہ کہا کہ نبوت و رسالت کوئی منصب نہیں ہے کہ خدا کی جانب سے عطیۂ مناصب کی طرح دیا جاتا ہو بلکہ اخلاق کریمانہ اور صفات حمیدہ کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو ہر ایک انسان اپنی روحانی جدوجہد سے حاصل کر لے سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عطاء بخشش ہر شے کے لئے اسی کی جانب (خدا کی جانب) سے ہے لیکن کسی شے کا بطور منصب عطا ہونے کی حدود میں محدود رہنا اور روحانی جدوجہد سے ہر شخص کے حاصل کر لینے کیلئے اس کا دروازہ کھلا رہنا دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ نبوت بھی اور درجات روحانیت کی ہی طرح ہے اور عطاء منصب کی شکل میں خاص امتیاز نہیں رکھتی۔

قرآن حکیم نے اس افراط و تفریط کو ختم کرنے کیلئے نبوت و رسالت کی حقیقت کو بہت عمدہ طریقوں سے آشکارا کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لئے جو مختلف درجات ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اس کا اعلیٰ درجہ ہدایت وحی کا ہے اور یہ انسان کی روحانیت اور مقصد حیات کی کامرانی کا کفیل و ضامن ہے اور جبکہ ہدایت کا یہ سلسلہ انسانی راہنمائی کیلئے ہے تو عقل سلیم کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ درجہ انسان ہی کو بخشا جائے لیکن کیا ہر شخص کو جدا جدا بخش دیا جائے نہیں ایسا ہونا چاہیے اسلئے کہ یہاں درجات عقل مختلف ہیں اور درجات استعداد میں بھی تنوع موجود ہے اس لئے از بس ضروری ہے کہ کسی خاص ہستی کو اس کیلئے چن لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہیے یہ کہ جو عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجاہدات اور ریاضات کے ذریعہ نفس پر قابو پائے یا یہ کہ خدائے تعالیٰ جس کو یہ درجہ عطا فرمائے اسی کی صلاحیتوں اور اس کی استعدادات کی تخلیق ہی اس طرح کر دے کہ صدق و امانت اس کا مایہ خمیر بنا ہوا ہو اور خارجی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہ ہو۔ یہ جدا امر ہے کہ خدائے برتر کے سامنے اظہار عبودیت اور تقرب الی اللہ کے لامتناہی فیض سے فیضیاب ہونے کیلئے اس سلسلہ کو بھی کلیۃً ترک نہ کرے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس فیصلہ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ یہاں دوسری شکل عمل میں آنی چاہیے اس لئے کہ جس طرح خدائے برتر کے مقررہ قانون قدرت نے ہدایت وحی سے پہلے کے مختلف درجات ہدایت کو انسان کے مجاہدہ ریاضت پر موقوف نہیں رکھا اور اس بخشش و فیض کو حسب حال عطیۂ الٰہی کی حیثیت میں رکھا ہے یعنی وجدان حواس اور عقل ان سب درجات ہدایات کا جب یہی حال ہے کہ وہ جدوجہد سے نہیں بلکہ عطیہ الٰہی سے ملتے ہیں تو ہدایت وحی بھی جس کو بخشا جائے وہ بطور منصب و عطیہ کے ہی عطا ہو، البتہ یہ از بس ضروری ہے کہ جس کو بھی بخشا جائے اس کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادات ہر طرح اس منصب کی اہل ہوں اور ایسی ہستی کو عطا نہ ہو کہ اس کی صلاحیت و استعداد عطا کرنے والے کی بے سلیقگی پر چشمک زن ہو۔

ا: اوتار اور ابن اللہ کا عقیدہ دراصل ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔

غرض نبی اور رسول اس ہستی کو کہتے ہیں جو لوازم بشریت کے ساتھ اپنے تقدس و طہارت اور اخلاق حسنہ و اوصاف حمیدہ کے اس بلند مقام پر فائز ہو اور اس کے صفات صدق و امانت اس درجہ مسلم ہوں کہ اس کو بشر معصوم کہہ سکیں وہ نہ خدا ہوتا ہے اور نہ ابن خدا بلکہ خدا کی جانب سے ہدایت وحی کا حامل مخلوق خدا کے لئے خدا کا ایلچی اور ان کی ہر قسم کی رشد و ہدایت کا کفیل ہو چونکہ وہ بشر ہے اس لئے افراد نسل انسانی سے تعلق رکھتا ہے، اور چونکہ ہر قسم کی آلودگیوں اور گناہوں سے پاک اور معصوم ہے اس لئے اس کو اللہ سبحانہ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہے پس نبوت و رسالت کا بشریت کے ساتھ یہی وہ تعلق ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بری اور حقیقت حال کے لئے آئینہ دار ہے اور اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے خود زبان وحی ترجمان سے ظاہر فرمایا ہے انما انا قاسم واللہ یعطی "خدا دینے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں۔" یعنی ایک جانب خدا سے وحی ہدایت" حاصل کرتا ہوں اور دوسری جانب خدا کے بندوں تک اس کو پہنچا دیتا ہوں یہی میرا فریضہ رسالت و نبوت ہے اور اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اس سلسلہ کے غلط کار لوگوں کی ہدایت کے لئے اس طرح بیان کیا ہے:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○

کہہ دیجئے، پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے، میں نہیں ہوں مگر انسان اور خدا کا ایلچی (رسول)۔

قُلْ لَّآ أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لئے گناہوں کی پاداش عمل سے) خبردار کرنے والا اور نیک عمل پر بشارت دینے والا ہوں۔

قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ○ وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ

(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھ کو (ہدایت انسانی کے لیے) کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا اور اس نے مجھ کو بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں۔

فَأْتِيَاهُ فَقُوْلَآ إِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ○

تم (موسیٰ و ہارون) اس (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کردے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آگئے ان پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○

یہ تمام رسول (خدا پرستی و نیک عملی کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکار حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں اور (خدا) (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○

اے نبی! بلا شبہ ہم نے تجھ کو بھیجا ہے (حق پر) گواہی دینے والا اور نیکی کے انجام پر) بشارت دینے والا اور (بدی کے انجام سے) ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی راہ کی طرف اس کے حکم سے اور بھیجا روشن چراغ بنا کر۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ أَحَدًا ○ إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَإِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ○ لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوْا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ

وہ (خدا) غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب (کے معاملات) پر کسی کو خبر دار نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبر بنا کر چن لے، پس بلا شبہ وہ (خدا) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان چلاتا ہے (یعنی اس کو اس بات سے محفوظ رکھتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی خبر میں شیطان یا اس کا نفس کوئی ملاوٹ کر سکے اور اس کو شبہ پڑ جائے کہ یہ خدا کی وحی ہے یا کچھ اور) تاکہ خدا یہ ظاہر کردے کہ انھوں نے (رسولوں نے) بلا شبہ اپنے پروردگار کے پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچادے۔

ان آیات کی تفسیر میں حضرت شاہ عبد القادر (نور اللہ مرقدہ) یہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”یعنی رسول کو خبر دیتا ہے غیب کی پھر چوکیدار (فرشتے) رکھتا ہے اس کے ساتھ کہ اس میں شیطان دخل نہ کرنے پاوے اور اپنا (رسول کا) نفس غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو عصمت ہے اوروں کو نہیں اور ان کا معلوم بے شک ہے اوروں کے معلوم میں شبہ ہے۔ ۱۲منہ

”نبی“ اور ”رسول“ سے متعلق مسطورۂ بالا افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ مشرکین عرب ایک نئی گمراہی میں مبتلا تھے وہ کہتے تھے کہ اول تو ”پیغمبر“ کا وجود ہی ہمارے لئے اچنبھے کی بات ہے، اور اگر یہ اچنبھا ہونا ہی تھا تو اس کے لئے ہماری طرح کا ایک انسان ہی کیوں چنا گیا، کیوں ایک فرشتہ نہ بھیجا گیا اور اگر انسان ہی بھیجنا تھا تو یا تو مکہ اور طائف کی کسی متمول سرمایہ دار ہستی کو پیغمبر بنایا جاتا ورنہ اس کو ہی غیب سے خزانے اور بے نظیر باغات عطا کیے جاتے تب ہم سمجھتے کہ بیشک یہ خدا کا فرستادہ ہے:

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَآ أُنْزِلَ

إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ○ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا

اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں، یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ آسمان سے فرشتہ اترتا اور وہ خدا کے پیغام سے خبردار کرتا یا ایسا کیوں نہ ہوا کہ (ہماری آنکھوں دیکھتے) اس پر آسمان سے خزانہ اتر آتا یا قدرتی باغ ہوتا کہ وہ (ہر وقت مرضی کے مطابق) اس سے (پھل) کھاتا۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّآ إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ ط وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ط أَتَصْبِرُونَ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ○

اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (یعنی پیغمبری کے لئے بشریت منافی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لئے انسان ہی کو پیغمبر ہونا چاہیے) اور ہم نے (انسانوں میں سے انسان ہی کو پیغمبر بنا کر) ایک دوسرے کی آزمائش کا سامان کر دیا کہ آیا تم صبر و استقامت کا ثبوت دیتے ہو یا نہیں اور تیرا پروردگار بلاشبہ (انسانوں کے کردار کا) دیکھنے والا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ط وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ○ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُونَ ○

اور وہ کہتے ہیں اس پر (محمد ﷺ پر) کیوں فرشتہ نہیں اتارا گیا اور اگر ہم فرشتہ اتارتے تو البتہ (نتائج اعمال کا) فیصلہ کر دیا جاتا اور پھر وہ مہلت نہ دیئے جاتے اور اگر ہم اس کو فرشتہ کہہ دیتے تو بھی (انسانوں کی ہدایت کیلئے) اس کو بصورت انسان ہی ظاہر کرتے اور (اسی طرح) ہم پھر ان لوگوں کو اس شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب مبتلا ہیں۔

اس جگہ ان کی گمراہی کو دو دلائل سے واضح کیا ہے ایک یہ کہ ایمان واعتقاد کی زندگی سر تا سر غیب سے متعلق ہے پس اگر انسان کو اسی عالم میں عالم غیب کے معاملات کا مشاہدہ کرا دیا جائے اور پھر بھی وہ انکار پر جمارہے تو خدا کا قانون امہال (مہلت کا قانون) نافذ نہیں ہوگا بلکہ نتائج اعمال کا فوراً ہی ظہور ہو کر رہے گا اور یہ ان کے لئے بھی مضر ہے اور خدا کی حکمت رحمت و ربوبیت کے بھی خلاف ہے دوسری دلیل یہ کہ انسانی دنیا میں اگر فرشتہ کے ذریعہ ہدایت وحی کو بھیجا جائے تو انسان کس طرح اس سے مانوس ہو سکتے ہیں، پھر اگر اسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجیں تو شبہ کرنے والوں کا شبہ اسی طرح قائم رہے گا۔ اس لئے عقل و نقل دونوں کا فیصلہ یہی ہے کہ ہدایت کے لئے انسان ہی کو مبعوث ہونا چاہیے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُّؤْمِنُوٓا إِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى إِلَّآ أَنْ قَالُوٓا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا

رَسُوْلًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○

اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آ پہنچی تو ان کو ایمان لانے سے کسی بات نے نہیں روکا مگر اس نے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا خدا کسی بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجے گا اے پیغمبر! کہہ دیجیے اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتوں کی آبادی ہوتی اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان کے لئے آسمان سے فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔

وَ مَآ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوْٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خَالِدِيْنَ ○

اور اے پیغمبر! ہم نے تجھ سے پہلے بھی جن پر وحی نازل کی ہے وہ انسانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے پس (معترضین) اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کر لو اور نہ ہم نے ان کو بے جان (دھڑ) بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ (خدا کی طرح) ہمیشہ رہنے والے تھے۔

بہر حال ان آیات میں قرآن عزیز نے علمی اور تاریخی دونوں قسم کے دلائل سے یہ صاف کر دیا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کے لئے انسان کا نبی اور ہادی ہونا فطری بات ہے اور اس لئے اقوام ماضیہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ کی جانب بھی توجہ کی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق سرداری، سرمایہ داری اور جتھ بندی سے کچھ نہیں ہے اور اس کے لئے جن فطری اعلیٰ ملکات و استعدادات کی ضرورت ہے ان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہے کہ کون اس منصب کا اہل ہے:

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○ أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (زخرف پ ۲۵، ع ۳)

اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن کیوں ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی سردار پر نازل نہیں ہوا (تو) کیا تیرے پروردگار کی رحمت کو یہ تقسیم کرنے والے ہیں نہیں بلکہ ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی دنیوی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے ہی بعض انسانوں کو بعض پر بلندی درجات عطا کی ہے تاکہ بعض بعض کے مسخر رہیں (یعنی بعض مقتدی ہوں اور بعض مقتدی، بعض پیغمبر ہوں اور بعض امتی) اور تیرے پروردگار کی رحمت (نبوت) اس (دولت و ثروت) سے (کہیں زیادہ) بہتر ہے۔ جو وہ خزانہ کیے ہوئے ہیں۔

وَإِذَا جَآءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ أُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ط اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ط (انعام پ ۸ ع ۱۵)

اور جب ان کے پاس خدا کی جانب سے کوئی آیت آتی ہے تو یہ (مشرکین) کہتے ہیں ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم کو بھی وہی چیز (وحی) نہ دی جائے جو خدا کے رسولوں کو دی گئی (لیکن ایسا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ) اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے منصب رسالت کو کس کے سپرد کرے۔

اور یہ بات تو بہت واضح اور صاف ہے کہ جس شخص کو کوئی منصب عطا کیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر طرح اس کیلئے جوہر قابل اور اہل ہونا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک جوہر قابل کو وہ منصب ملے کیونکہ معطی کی مصلحت ہی خوب فیصلہ کر سکتی ہے کہ کس کو ملے اور کس کو نہ ملے چہ جائیکہ جو ہر قابل بھی نہ ہو۔ اسلئے ضروری ہوا کہ جو نبی اور رسول ہو وہ ہر حیثیت سے انسان کامل اور گناہوں سے معصوم ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اخلاق حمیدہ اور روحانی مجاہدات کے ذریعہ تقدیس کا درجہ حاصل کر سکا ہو وہ منصب نبوت پر بھی ضرور فائز ہو۔

بہر حال نبوت منصب ہے ڈگری نہیں ہے اور اس لئے جن کو دیا بھی جاتا ہے ان کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ تم پر فضل خداوندی ہے ورنہ اگر وہ تم سے اس کو سلب کر لینا چاہے تو تمہاری طاقت بلکہ کائنات کی طاقت سے باہر ہے کہ پھر یہ تم کو مل سکے:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَيْنَا وَكِيْلًا ۝ إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ إِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝

اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو تجھ پر ہم نے وحی کی ہے اس کو چھین لیں اور پھر تجھ کو کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو ہم پر زور ڈال سکے، لیکن (یہ جو سلسلۂ وحی جاری ہے تو) اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تیرے پروردگار کی رحمت سے ہے اور یقین کر کہ تجھ پر تیرے پروردگار کا بڑا ہی فضل ہے۔

نبی اور مصلح

مسطورۂ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چونکہ نبی اور رسول کو براہ راست خدائے برتر سے شرف مکالمت حاصل ہوتا ہے یا خدا کا معصوم فرشتہ خدا کی وحی لا کر سناتا ہے اس لئے اس کا ذریعہ "علم"، "علم الیقین" کا وہ درجہ رکھتا ہے جس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اور اس کے علاوہ تمام ذرائع علم یقین کے اس درجہ سے نیچے ہیں بلکہ ان کی افادیت "ظن" سے آگے نہیں بڑھتی اس لئے اگر ایک مرد صالح اپنی قوم یا نوع انسانی کی اصلاح حال کے لئے کوئی قدم اٹھائے تو مقدس سے مقدس تر ہونے کے باوجود اس کے اپنے طریقۂ اصلاح میں غلطی کا وقوع اور امکان دونوں موجود رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ایسی فاش غلطی کر گذرتا ہے کہ اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لئے ایک نکوکار مصلح یہ کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ اصلاح حال کیلئے جو کچھ اپنی جانب سے کہتا ہے غلطی سے پاک ہے مگر ایک نبی اور رسول کیلئے از بس ضروری ہے کہ وہ یہ بھی اعلان کرے کہ میں خدا کی جانب سے اصلاح حال کیلئے خدا کا پیغام رساں ہوں اور یہ بھی دعویٰ کرے کہ وہ جو تعلیم و اصلاح پیش کر رہا ہے خدا کا فرمودہ ہے اور اس لئے ہر قسم کی غلطی اور لغزش

سے پاک اور محفوظ ہے، وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے یا اندر سے جو آواز آتی ہے اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ صاف صاف یہ کہے گا کہ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں میں تو صرف ایلچی اور پیغامبر ہوں یہ جو کچھ بھی ہے خدا کا فرمان اور اس کی وحی ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا ہے وہ کہتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ خدا نے ان کو اپنی ہدایت وحی کے لیے چن لیا ہے اور وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان پر وحی کیا جاتا ہے اس کو حرف بہ حرف امت تک پہنچائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قَالَ يَاقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلَالَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(نوح علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم! مجھ کو گمراہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ میں تو تمام کائنات کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں تم تک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی باتوں میں سے وہ بات جانتا ہوں جن سے تم بے خبر ہو۔

اور حضرت ہود علیہ السلام او قوم کے درمیان مکالمہ میں حضرت ہود علیہ السلام نے یہ اعلان فرمایا:

قَالَ يَاقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِيْنٌ ○

(ہود علیہ السلام نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں، میں اپنے پرودگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور پیغام الٰہی اور خیر خواہی میں) صاحب امانت ہوں۔

اور صالح علیہ السلام نے یہ فرمایا:

وَقَالَ يَاقَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النَّاصِحِيْنَ ○

(صالح علیہ السلام نے) کہا اے قوم! بلاشبہ میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچادیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہی کرنے والوں کو ناپسند کرتے ہو۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے یہ ارشاد فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيْمَ ط إِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ إِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ يَاأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا ○ يَاأَبَتِ إِنِّيْ قَدْ جَاءَنِيْ

مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيٓ أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ○ (سورۂ مریم، پ ۱۶، ع ۳)

اور یاد کرو کتاب (قرآن) میں ابراہیم کا حال بلاشبہ تھا وہ بہت ہی صادق اور نبی جب اس نے اپنے باپ سے کہا اے باپ! ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھ کو کسی (نقصان) سے بے پرواہ کرتی ہے (یعنی بت پرستی کیوں کرتا ہے؟) اے باپ! بلاشبہ مجھ کو علم (وحی) سے وہ حصہ ملا ہے جو تجھ کو حاصل نہیں ہے پس میری پیروی کر میں تجھ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔

اور لوط ؑ نے اپنی قوم سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا:

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ○ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ○
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ○

جب کہا ان سے ان کے بھائی (لوط) نے کیا تم پرہیز گاری اختیار نہیں کرتے بلاشبہ تمہارے لئے خدا کا بھیجا ہوا ہوں (اور اس پیغامبر میں) صاحب امانت ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت یعقوب و یوسف ؑ کے ایک طویل حیرت زا واقعہ کے ضمن میں یعقوب ؑ کا وہ مقولہ بھی منقول ہے جس میں انھوں نے اپنے بیٹے یوسف ؑ کو وحی الٰہی کے ذریعہ بشارت دی ہے کہ جس طرح خدا نے تیرے باپ دادا، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب ؑ کو پیغمبری عطا فرمائی اسی طرح تجھ کو بھی اس منصب جلیل سے سرفراز کرے گا:

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى آلِ يَعْقُوبَ كَمَآ أَتَمَّهَا عَلٰٓى أَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ط إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو چن لے گا اور تجھ کو تعبیر رویا کا علم بخشے گا اور تجھ پر اپنی نعمت (نبوت) کی تکمیل کرے گا اور اولاد یعقوب پر (جو اس کے اہل ہوں گے) جیسا اس نے اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم، اسحٰق پر اس (نبوت) کو پورا کیا بیشک تیرا پروردگار جاننے والا حکمت والا ہے۔

اور پھر حضرت یوسف ؑ کی تبلیغ و دعوت اس طرح قرآن میں مذکور ہے:

يَاصَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهٖٓ إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَآؤُكُمْ مَّآ أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ط ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○

اے میرے قید کے رفیقو! کیا بہت سے آقا اور خداوند بہتر ہیں یا یکتا خدا کی ذات جو ہر شے پر غالب ہے تم اس کے سوا جس کو پوجتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ

دادوں نے گھڑ لئے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری اور حکم تو خدا کے سوا کسی کا نافذ نہیں اس نے یہی حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو دین کی سیدھی راہ یہی ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اصحاب ایکہ کے سامنے یہ اعلان کیا:

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ○ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ○ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ○

اصحاب ایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب ان سے شعیب علیہ السلام نے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے بلا شبہ میں تمہارے لئے (خدا کی جانب سے) صاحب امانت پیغمبر ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دربار میں بے دھڑک یہ اعلان فرمایا:

وَقَالَ مُوْسٰى يَافِرْعَوْنُ إِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ حَقِيْقٌ عَلٰٓى أَنْ لَّآ أَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ ط قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِنْ رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ ○

اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے فرعون! بلا شبہ میں جہانوں کے پروردگار کا پیغمبر ہوں، میرے لئے یہی لائق ہے کہ میں خدا کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے "دلیل" لے کر آیا ہوں پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) بھیج دے (جن کو صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا)

اور حضرت داؤد و سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو دعوت اسلام کے لئے جو نامۂ مبارک تحریر فرمایا تھا اس کا اسلوب بیان یہ ہے:

إِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ أَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○

یہ سلیمان علیہ السلام کی جانب سے ہے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے رحیم ہے بات یہ ہے کہ مجھ پر اپنی بلندی و برتری کا اظہار نہ کر (کیونکہ میں بادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر ہوں) اور میرے پاس خدا کی فرمانبردار بندی بن کر حاضر ہو۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل ایک علاقہ میں خدا کے چند نبی دعوت و تبلیغ اسلام کے لئے مامور کیے گئے تھے انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا:

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّآ إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ○ وَمَا عَلَيْنَآ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ○

انھوں نے کہا ہمارا پروردگار (خوب) جانتا ہے کہ بلا شبہ ہم تمہاری جانب اس کے بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارے اوپر اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ امر حق کا صاف اور کھلا پیغام پہنچا دیں۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ کے سوا کوئی راہ مستقیم نہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں خدا کا فرمودہ ہے۔

قَالَ إِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ط آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ○

(عیسیٰ علیہ السلام نے) کہا بلا شبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو "کتاب" عطا کی ہے اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے۔

وَإِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَابَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ

جب کہا عیسیٰ بن مریم نے اے بنی اسرائیل! بلا شبہ میں تمہاری جانب خدا کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں (رسول ہوں)

اور خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں تو جگہ جگہ یہ حقیقت بہت نمایاں نظر آتی ہے:

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ○ وَدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○

اے نبی! بلا شبہ ہم نے تجھ کو (حق کے لیے) گواہ اور (نیک عمل کے لیے) بشارت دینے والا اور (بد عملی کے نتائج سے) ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے اس کی جانب بلانے والا اور (ہدایت و صراط مستقیم کے لیے) روشن چراغ بنایا ہے۔

قُلْ يَآأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ فَآمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمَاتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○

(اے محمد ﷺ) کہہ دیجیے اے لوگو! بیشک میں تم سب کی جانب اللہ کا بھیجا ہوا ہوں اسی کے لئے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی، کوئی خدا نہیں ہے مگر صرف وہی یکتا ذات (وہی) زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو خود اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان لاتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ۔

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران، پ ۳ ع ۲)

بلا شبہ اللہ کے نزدیک (ہمیشہ سے) دین (حق) اسلام ہی ہے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

جو شخص اسلام کے ماسوا کو دین بنانا چاہے تو خدا کے یہاں وہ مقبول نہیں ہے۔

غرض پیغمبر اور نبی کیلئے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح اور تعلیم حق پر خود بھی ایمان لائے اور

کائنات کے سامنے بھی یہ اعلان کرے کہ یہ پیغام ہدایت اور یہ تعلیم حق میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہے اور اسی نے مجھ کو اپنا ایلچی بنا کر اس کی دعوت کیلئے بھیجا ہے یہ جو کچھ ہے سب خدا کا اپنا ہے میں تو صرف اسکی جانب پکارنے والا ہوں اور اس میں شک و شبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کی لغزش و خطا سے پاک علم یقین اور وحی الٰہی ہے جسکے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہے لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ اور وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ لیکن مصلح غیر نبی کو یہ مجاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت اصلاح کے بارہ میں یہ دعویٰ کرے کیونکہ اس کی یہ دعوت اصلاح یا کسی پیغمبر اور نبی کی ہدایت وحی کی پیروی میں ہو گی تب تو اس کی حیثیت ایک یاد دہانی کرنے والے کی ہے اور یا ہدایت وحی کے اتباع کے ساتھ اس کے اپنے اجتہاد اور ضمیر کی آواز کا بھی دخل ہو گا تو اس کے اس حصۂ اصلاح کا لغزش خطا بلکہ بعض اوقات غلط روی سے بھی محفوظ رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے۔

کیفیت وحی

وحی سے متعلق جو حقائق سپرد قلم ہو چکے ہیں ان میں ایک یہ اضافہ بھی قابل توجہ ہے: عربی میں وحی کے معنی مخفی اشارہ کے ہیں گویا یہ فطرت الٰہی کی وہ سرگوشی ہے جو ہر ایک مخلوق پر اس کی راہ عمل کھولتی ہے چنانچہ قرآن نے شہد کی مکھی کے نظام بیت کے متعلق فطری ہدایت کو لفظ وحی سے ہی تعبیر کیا ہے:

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ ○

اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اسی غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لئے چھتے بنائے۔

اور مذہب و دین کی اصطلاح میں اس الہام کو کہتے ہیں جو خدائے برتر کی جانب سے نبی اور پیغمبر پر اس طرح القاء یا فرشتہ کے ذریعہ نازل کیا جاتا ہے کہ اس مقدس ہستی کو اس کے منجانب اللہ ہونے کا روز روشن سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہے اور کسی قسم کے بھی شک و شبہ اور تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی لئے وہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ خدا کی وحی اور اس کا بخشا ہوا علم یقین ہے نزول وحی کی یہ صورت کس طرح پیش آتی ہے اور کون سے وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ نبی معصوم کو خدا کی وحی کا علم ہوتا ہے؟

قرآن عزیز اس کے متعلق یہ کہتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ ○

اور کسی انسان کے لئے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (اس دنیا میں بالمواجہ) گفتگو کرے مگر یا وحی (کے القاء) کے ذریعہ یا پس پردہ یا بھیج دے فرشتہ کو پس وہ اس کی (خدا کی) اجازت سے اس وحی کو لا اتارے جو اس

کی (خدا کی) مرضی ہو بلا شبہ وہ (خدا) بلند و حکمت والا ہے۔

غرض وحی ایک خاص ذریعۂ علم کا نام ہے جو خدا کی جانب سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے لئے مخصوص ہے اور اس کا تعلق براہ راست عالم قدس اور عالم غیب سے ہے اسی بنا پر اگرچہ انبیاء و رسل کو اس کی منفعت اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل آفتاب عالمتاب سے زیادہ بدیہی ہوتا ہے لیکن وہ اس کی حقیقی کیفیت کو دوسروں پر تشبیہ و تمثیل ہی کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بعض صحابہؓ نے حضرت اقدس ﷺ سے نزول وحی کی کیفیت کے متعلق سوالات کیے تو آپ ﷺ نے یہ جوابات ارشاد فرمائے

واحیاناً یاتینی کصلصلة الجرس۔

کبھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا گھنٹہ کی مسلسل گونج ہے

دوی کدوی النحل

(کبھی) جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے اس طرح کی گونج محسوس کرتا ہوں

واحیاناً یتمثل لی الملك رجلا فاعی ما یقول

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر مجھ کو خدا کی وحی سناتا ہے اور میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں۔

ان جوابات میں کیفیت وحی کو اگرچہ قریب الفہم بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی کیفیت کو خدا اور خدا کے پیغمبر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں پا سکتا اور پیغمبر اس حقیقت کا اذعان اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر غیر متبدل یقین تو رکھتا ہے لیکن غیر نبی پر حقیقی کیفیت کو واضح کرنے سے معذور ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لئے کہ یہ صورت حال تو دنیا کی بن دیکھی اشیاء کے بارہ میں بھی صبح سے شام تک ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں مثلاً جس شخص نے سیب کو نہیں دیکھا اور نہیں چکھا اس کے سامنے دیکھنے اور چکھ لینے والا اگرچہ سیب کی حقیقت کا بہتر سے بہتر نقشہ بھی پیش کر دے اور اس کے رنگ، مزہ، خوشبو، لطافت وغیرہ کی تعبیر بحد کمال بھی پہنچا دے تب بھی وہ شخص سیب کو آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھ لینے والے کے مقابلہ میں کسی طرح اس کی حقیقی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا وہ بلا شبہ سیب کے متعلق صحیح علم تو حاصل کر لے سکتا ہے لیکن حقیقی ذوق کو ہرگز نہیں پا سکتا، اسی طرح نبی کی تعلیم و تلقین سے ہم وحی کے متعلق ایک اجمالی علم ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقی کیفیت کو نہیں پا سکتے۔

نبی اکرم ﷺ نے قرآن میں مسطور ہر سہ اقسام وحی میں سے پہلی قسم الا وحیا کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: وھو اشده علی فیفصم عنی وقد وعیت و ما قال اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت سخت گزرتی ہے پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی نے جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب مجھے محفوظ ہوتا ہے یعنی جب فرشتہ بشکل انسان تمثل اختیار کر کے وحی الٰہی لاتا ہے من وراء حجاب براہ راست خدائے برتر سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو یہ دونوں صورتیں آپ پر آسان ہوتی ہیں مگر ”القاء وحی“ کی پہلی شکل سخت گذرتی ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علماء حق یہ ارشاد فرماتے ہیں:

خالق کائنات نے انسان کو لوازم بشریت کی قیود و شروط کے ساتھ اس درجہ پابند بنا دیا ہے کہ انبیاء ورسل جیسی مقدس اور معصوم ہستیوں کو بھی اپنی تطہیر و تقدیس کے باوجود ان اثرات سے متأثر ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس لئے جب ان پر خدا کی وحی کا نزول ہوتا اور ایسی حالت میں ان پر عالم قدس کے تمام اثرات چھا جاتے اور انوار و تجلیات کی آغوش میں وہ حضرت حق سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو اس حالت میں اُن پر دو قسم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے، ایک یہ کہ اس کے بشری خواص کو مغلوب کر کے اس کی روحانی کیفیات کو عالم قدس کی جانب اس درجہ بلند اور رفیع کیا جائے کہ وہ حضرت حق کی وحی کے اثرات قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے اور چونکہ جذب وانجذاب کی اس خاص حالت اور عالم آب و گل سے عالم قدس کی جانب اس مخصوص رفعت میں بشری خصوصیات اور روحانی مؤثرات کے درمیان سخت قسم کا تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس لئے اس تصادم اور تزاحم سے نبی پر ابتداء ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جب یہ تصادم ختم ہو کر یہ عالم قدس کے تمام پاک اور لطیف اثرات اس ہستی پر چھا جاتے ہیں اور وہ ان میں محو اور مستغرق ہو کر لذت وحی کو پا جاتی ہے تو پھر یہ اذیت و تکلیف یکلخت جاتی رہتی ہے اور اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور یہ سب کچھ چند دقیقوں میں گذرتا ہے۔

یہی وہ صورت وحی ہے جس کی کیفیات کو ذات اقدس ﷺ نے صلصلۃ الجرس اور دوی النحل کی تمثیلات میں سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے تمثیلات میں اس پہلو کے اختیار کرنے کی وجہ بھی مسطورۂ بالا حقیقت ہے اس لئے کہ اس صورت خاص میں جب بشری حواس و دراکات پر عالم قدس کے روحانی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اول حواس و ادراکات میں اضطراب و بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور حاسہ سمع کہ جس کا تعلق سماعت وحی سے ہے وہ شروع میں ایک خاص قسم کی گونج محسوس کرتا ہے جو اس عالم پست سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی اور اس کے بعد وہ وحی الٰہی کی اصل کیفیت سے لذت اندوز ہوتا اور اس کو علم یقین اور اذعان حق کے ساتھ لیتا ہے کیونکہ عالم قدس کے قوی مؤثرات اس پر غالب آکر وحی الٰہی کے حصول کا ہر طرح اہل بنا دیتے ہیں مگر دوسروں پر اس حقیقت کے تمام و کمال سمجھانے میں ان علامات واثرات کے اظہار سے آگے نہیں جاتا جن کو ابھی صلصلۃ الجرس اور دوی النحل کی تعبیرات میں سن چکے ہو وحی الٰہی کی اس نوع کے علاوہ دوسری ہر دو انواع یعنی وراء حجاب کلام الٰہی کی سماعت یا فرشتہ کے ذریعہ وحی کے نزول میں صورت حال برعکس ہوتی ہے اور اس وقت نبی کے بشری خواص کو عالم قدس کی جانب رفعت دینے اور عالم خاک گل سے عالم نور کی جانب جذب انجذاب سے متأثر کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی بلکہ عالم قدس کی تمام کیفیات خود ہبوط و نزول کرتی اور نبی کی روحانیت کو متأثر بناتی ہیں اور یا فرشتہ بحکم حضرت حق پانے ملکوتی جسد کو جامۂ انسانیت کے ساتھ متمثل کر لیتا اور عالم قدس کے اثرات اور بشری خواص میں امتزاج پیدا کر کے نبی کے حضور حاضر ہوتا اور وحی الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور اس لئے ان دونوں صورتوں میں نبی اور رسول کو پہلی قسم کے تصادم سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی

چونکہ یورپ کے دور علمی کی بنیاد خالص مادیات پر قائم ہے اور روحانی علوم اور ماوراء مادیات کے ناقابل

انکار حقائق کے لئے وہ کوئی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے اس لئے بعض مستشرقین نے جب وحی الٰہی کی پہلی قسم کے متعلق نبی اکرم ﷺ کے وہ اقوال سنے جن کا ذکرابھی ہو چکا ہے ور وہ حالات پڑھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزول وحی کی اس خاص صورت میں آپ ﷺ کرب اضطراب محسوس فرماتے اور سردی کے ایام میں آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ آجاتا اور آپ ﷺ پر بیخودی کے سے آثار نظر آنے لگتے تو انھوں نے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ یہ نزول وحی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ (العیاذ باللہ) آپ ﷺ کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔

یہ مستشرقین پُرزور الفاظ میں آپ ﷺ کی صداقت وامانت کو تسلیم کرتے ہیں آپ ﷺ کی تعلیمات حق کو سراہتے اور کائنات انسانی کے لئے آپ ﷺ کی تعلیمات کو تعلیم کامل مانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے دعویٰ الہام ووحی الٰہی کا انکار کرتے اور کیفیت وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ۔

درحقیقت یہ حضرات یا تو ازراہ تعصب ناقابل انکار تعلیم حق کے تسلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس سے تعلیم حق (اسلام) پر کاری ضرب لگ سکے اور تعصب کے الزام سے بھی بچ جائیں اور یا پھر اس علمی حقیقت سے بے بہرہ ہیں جس کو تفصیل کیساتھ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ نزول وحی کی یہ کیفیت مرض نہیں تھا بلکہ اپنے اثرات اور محرکات کی بناء پر ایک فطری صورت حال تھی جس کا پیش آنا ازبس ضروری تھا اور دراصل یہ کیفیت دماغ، حواس اور اعضائے انسانی کو مفلوج نہیں بناتی تھی جیسا کہ ہسٹریا وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس تمام مادی قویٰ میں روحانی کوائف کی ایسی برقی رو دوڑا دیتی ہے جس سے چند لمحات کے بعد اپنے اندر ایسی زبردست اور مافوق المادہ قوت پیدا ہو جاتی تھی جس کے ذریعہ اس ہستی (نبی) میں عالم قدس سے پوری طرح وابستہ ہو کر خدا کی وحی اور اس کے کلام کو سننے اور قلب و دماغ میں بخوبی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رونما ہو جائے چنانچہ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا:

فيفصم عنى و قد و عيت ما قال

شدت وکرب کی یہ کیفیت جلد ہی مجھ سے زائل ہو جاتی ہے اور میں وحی الٰہی کو تمام و کمال محفوظ کر لیتا ہوں۔

کیا ہسٹریا کے دوروں کا کوئی مریض ایسا پیش کیا جاسکتا ہے جس پر ایک جانب مرض کا مسلسل حملہ ہو رہا ہو اور دوسری جانب وہ علمی و عملی صلاحیتوں، معاشی و معاوی حکمتوں اور دینی و دنیوی رفعتوں کے لئے ایس کامل و مکمل دستور و آئین اور اعمال وافکار پیش کر رہا ہو کائنات جس کا جواب نہ رکھتی ہو اور دوست ود شمن دونوں اس کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے ہوں؟ کیا دماغی فتور جو کہ ہسٹریا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور دماغی رفعت و بلندی جس کے ثمرات حیرت زا اور عملی دنیا میں وقیع سے وقیع تر ہوں دونوں یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتے اور بلاشبہ نہیں ہو سکتے تو حقیقت حال کو نظر انداز کرتے ہوئے وحی الٰہی سے متعلق مستشرقین کا یہ دعویٰ کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے صاحب عقل و بصیرت اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں؟

نزول وحی کا پہلا دور

نبی اکرم ﷺ پر سب سے پہلے سورۂ علق کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون بستہ سے پڑھو! اور تیرا پروردگار جو سب سے زیادہ برگزیدہ ہے وہ ہستی ہے جس نے سکھایا لکھنا، سکھایا انسان کو وہ سب کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت انسان جو خدا کی سب سے بہتر اور سلسلۂ کائنات کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اور اسی وجہ سے وہ کائنات ہست و بود میں "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر سر فراز کیا گیا ہے اس کی خلقی کمزوریوں کا یہ حال ہے کہ اس کی نمود کی ابتداء آب نجس اور خون بستہ سے ہوئی ہے لیکن قدرت حق نے جب اس کو مقام رفیع بخشنے کا ارادہ کیا اور "اسفل سافلین" کے لائق مخلوق کو "درجات علیا" پر فائز کرنا چاہا تو اس کو وہ صفت اعلیٰ عطا فرمائی جو صفات الٰہ میں مبدء الصفات ہے یعنی اس کو صفت علم کا مظہر بنایا اس کو قلم کے ذریعہ لکھنا سکھایا اور علم و عرفان کا مہبط و محور ٹھہرایا پھر اس جانب بھی اشارہ کیا کہ یہ سلسلۂ اسباب و مسببات حصول علم کے تین ہی طریقے ہیں ذہنی لسانی، رسمی اور علم ذہنی الفاظ اور رسوم و نقوش کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور علم لسانی علم ذہنی کا محتاج ہے مگر رسوم و نقوش کتابت سے بے نیاز اور علم رسمی، رسم الخط اور نقوش کا بھی محتاج ہے پس اگر "علم رسمی" کا کسی جگہ مذکور ہو تو لسانی اور ذہنی علوم کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے سے بلند ہر دو علوم کے لئے بہترین معبر ہے اور ظاہر ہے کہ علم رسمی "قلم" کا محتاج ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے علم بالقلم کہہ کر لطیف پیرایۂ بیان میں اس پوری حقیقت کو واضح کر دیا اس کی مزید تشریح عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ سے کر دی۔ اور اس معجزانہ اسلوب کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک جانب علم اور نبوت کے درمیان کیا علاقہ ہے اس کا اظہار ہو جائے اور دوسری جانب انسان کو اپنے مقصد حیات کا صحیح علم ہو جائے۔

نزول وحی کا دوسرا دور

غار حراء میں منصب نبوت سے سر فرازی کے وقت سورۂ علق کی یہ چند آیت نازل ہو کر وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ حراء میں فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول سے فوری طور پر نبوت و رسالت کے جو خصائص و اثرات ذات اقدس ﷺ پر وارد ہوئے ہیں وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور صلاحیت و استعداد نبوت و رسالت کی تکمیل ہو جائے تاکہ آئندہ سلسلۂ وحی کے قوی مؤثرات و محرکات پیغمبر ﷺ کے بشری خواص کے لئے اجنبی نہ رہیں، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے نزول وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "فترت وحی" کہتے ہیں۔ لیکن ذات اقدس ﷺ کو حراء میں پیش آمدہ کیفیت و صورت حال سے جو فطری تشویش پیدا ہوتی تھی جب اس نے سکون طمانیت کی شکل اختیار کر لی تو نزول وحی کی روحانی کیفیات نے اس درجہ لطف اندوز کیا کہ آپ ﷺ اس فترت کو برداشت نہ کر سکے اور لطیف و عمیق جذبات نے اس حد تک

اضطراب وبے چینی کی شکل اختیار کرلی کہ گاہ گاہ ناموس اکبر (جبرئیل امین) ظاہر ہوکر آپ ﷺ کو صبر وتسکین کی دعوت دیتے اور یقین دلاتے تھے کہ اپنی تمام لطافتوں اور حسن وکمال کے ساتھ نبوت ورسالت کا یہ سلسلہ آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور فترت کا یہ دور محض عارضی ہے اس لئے آپ اندوہگین نہ ہوں تب آپ تسکین پاتے اور وقت موعد کے منتظر رہتے کہ کچھ عرصہ بعد[1] نزول وحی کا دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے اول سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ○ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ○

اے کملی پوش اٹھ (اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے) ڈرا اور اپنے پروردگار کی عظمت وجلال کو بیان کر اور لباس کو پاک کر اور بتوں سے جدا رہ اور زیادہ حاصل کرنے کی نیت سے حسن سلوک نہ کر اور اپنے پروردگار کے معاملہ میں (اذیت ومصیبت پر) صبر اختیار کر۔

ان آیات نے گویا انسانی مقصد حیات کی تکمیل کردی کیونکہ سورۂ علق میں کہا گیا تھا کہ انسانیت کبریٰ کیلئے صحیح علم شرط ہے یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ علم صحیح کی رفعت وبلندی کے اعتراف کے باوجود انسانیت کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے کہ علم صحیح کے ساتھ عمل صحیح بھی موجود ہو اس لئے کہ اگر علم صحیح ہے اور عمل صحیح مفقود تو اس کی افادیت معطل اور بیکار ہے اور اگر عمل ہے اور علم صحیح ندارد تو وہ عمل موجب زیان ونقصان ہے۔ رشد وہدایت اور صراط مستقیم کے لئے دونوں ہی کا وجود ضروری ہے اور تب ہی انسان انسانیت کبریٰ حاصل کر سکتا ہے۔

غرض جس طرح سورۂ علق کی آیات نے علم نافع کی جانب اشارات کیے اسی طرح سورۂ مدثر نے "عمل نافع" کی اساسی تفاصیل ظاہر کی ہیں۔ خدا کی ہستی اور اس کی ربوبیت کاملہ کا عملی اعتراف باطنی طہارت وپاکیزگی کا کمال ظاہری طہارت وپاکی کا لزوم بے غرض اور بے لوث اخلاق حمیدہ کی اساس "احسان" پر استقامت اور قبول حق اور نیک عملی کے نتائج پر صبر ان آیات کا حاصل ہیں اور یہی وہ بنیادی امور ہیں جن میں علم حق اور عمل صحیح کی تمام کائنات سموی گئی ہے۔

نیز ذات اقدس ﷺ کے لئے سورۂ علق اور سورۂ مدثر کا یہ خطاب اور پیغام حق اشارہ ہے اس جانب کہ یہ نظام عمل منصب رسالت کے لئے تکمیل نفس اور دعوت رشد وہدایت کے لئے مرتبہ اولین کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی مستقبل قریب میں بعثت عامہ کا باعث ثابت ہوگا۔

اعلان دعوت وارشاد کی پہلی منزل

کلام الٰہی کے اس حکم کے بعد جو کہ تبلیغ ودعوت حق کا پیغام تھا دعوت ارشاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور

---

[1] فترۃ کا زمانہ کس قدر رہا ہے اس سلسلہ میں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات پائی جاتی ہیں اور محدثین کا رجحان چھ ماہ کی جانب زیادہ ہے۔

اب ذات حق نے سورۂ شعراء کی آیات نازل فرما کر نبی اکرم ﷺ کو یہ فیصلہ سنایا کہ سب سے پہلے اہل قرابت اور رشتہ داروں کو دعوت حق دیجئے تا کہ دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے اور یوں بھی قریش اور بنی ہاشم کے قبول حق کا اثر تمام عرب قبائل پر پڑنا لازم ہے اس لئے کہ وہ سب قبائل کے سرخیل اور سرگروہ ہیں اور ساکنان حرم ہونے کی وجہ سے تمام عرب پر ان کا دینی ور دنیوی اثر ہے سورۂ شعراء میں ہے

وَ أَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ ○ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ○ الَّذِيْ يَرَاكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ○ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْنَ ○ إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی ناتے والوں کو (گمراہی سے) ڈرا اور جو مسلمان تیرے پیرو ہیں ان کیلئے اپنے بازوؤں کو پست رکھ (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آ) اگر وہ نافرمانی کریں تب تو ان سے کہہ دے میں تمہارے ان اعمال (بد) سے بری ہوں اور غالب رحم کرنے والی ذات پر بھروسہ کر جو تجھ کو اس وقت بھی دیکھتی ہے جب تو اس کی بارگاہ میں کھڑا ہوتا ہے اور اس وقت بھی جبکہ تو سجدہ کرنے والوں میں مل کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

گویا یہ "تکمیل و عمل" اور منصب رشد و ہدایت کے فیضان کے بعد دوسرا درجہ تھا، جس میں اعلان حق اور دعوت اسلام کی عملی صورت اختیار کرنے کے لئے تحریک کی گئی چنانچہ صحیح روایات شاہد ہیں کہ آپ ﷺ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس زمانہ کے طریق اعلان کے مطابق یاصباحا "یاصباحا" "یاصباحا" کہہ کر خانوادۂ قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو ایک مثال دے کر سمجھایا کہ بلاشبہ میں خدا کا پیغمبر اور رسول اور صراط مستقیم کے لئے ہادی برحق اور ارشاد فرمایا:

"لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکر جرار جمع ہے اور تم پر حملے کے لئے آمادہ تو کیا تم مجھ کو صادق سمجھو گے او مصدق؟ لوگوں نے کہا: ہم نے تجھ کو "الصادق الامین" پایا ہے تو جو کچھ کہے گا حق اور صداقت پر مبنی ہوگا۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا! تو لوگو! میں تم کو خدائے وحد کی جانب بلاتا ہوں اور اصنام پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں تم اس دن سے ڈرو، جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے۔" (تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸)

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ حیران رہ گئے اور باپ دادا کے دین بت پرستی کے خلاف آواز سن کر برافروختہ ہونے لگے گویا سب میں ایک آگ سی دوڑ گئی اور سب سے زیادہ آپ ﷺ کے حقیقی چچا ابو لہب کو طیش آیا اور غضبناک ہو کر کہنے لگا:

تبا لك سائر اليوم اما دعوتنا الا لهٰذا

تو ہمیشہ ہلاکت و رسوائی کا منہ دیکھے کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا۔"[1]

۱: سورۂ لہب کا نزول ابو لہب کی اسی گستاخانہ جرأت کے انجام بد کا اظہار کرتا ہے۔

عجب منظر ہے کہ چند گھڑیاں پہلے جس محمد بن عبداللہ کی صداقت وامانت اور خصائل حمیدہ سے ساری قوم متاثرہ کر اس کی عظمت و عزت کرتی اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی تھی وہی آج اس اعلان پر کہ میں محمد رسول اللہ ہوں یکلخت بیگانہ نفور اور خون کی پیاسی بن گئی۔

دعوت وارشاد کی دوسری منزل

سیرت کی کتابوں میں پڑھ آئے ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے خاندان اور برادری کے لوگوں کو راہ حق دکھانے اور ان کی ایمانی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر قریش کے چند اصحاب کے سوائے کسی نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہ کہا اور عداوت و بغض کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ تب وہ دعوت و ارشاد نے ترقی کے تیسرے زینہ پر قدم رکھا اور ذات حق کی جانب سے حکم ہوا: اے داعی حق! خاندان اور برادری کے انکار وجود سے متاثر و غمگین نہ ہو اور اپنی مفوضہ خدمت پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کیونکہ سعادت و شقاوت تمہارے قبضہ میں نہیں ہے تمہارا کام تو صرف ابلاغ (پہنچانا) ہے البتہ اب خاندان کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مکہ اور اطراف مکہ کے قبائل واقوام کو بھی یہ پیغام حق سناؤ اور دعوت وارشاد کا تحفہ ان کے سامنے بھی رکھو تاکہ جو سعید روحیں پیغام حق کیلئے مضطرب اور بے چین ہیں وہ اس پر لبیک کہہ کر تسکین پائیں اور روح تشنہ کو آب وحیات سے سیراب کریں۔

وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا

اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توراۃ کی طرح) نازل کیا، برکت والی اور جو کتاب اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس لئے نازل کی تاکہ تم ام القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا

اور اسی طرح ہم نے تم پر قرآن نازل کیا زبان عربی میں تاکہ (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ، شہر مکہ کے باشندوں کو اور ان کو جو اس کے آس پاس ہیں۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے تبلیغ حق کو مکہ کی تحدید سے آزاد کر کے اطراف مکہ کے لئے عام کر دیا اور طائف، حنین اور یثرب (مدینہ) تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا بلکہ مہاجرین کے ذریعہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصحمہ تک کو کلمۂ حق سنایا۔

بعثت عامہ

اس کے بعد دعوت وارشاد کی وہ تیسری منزل پیش آئی جو بعثت محمدی کا نصب العین اور مقصد وحید، اور تمام انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ کے مقابلہ میں ذات اقدس محمد ﷺ کی بعثت کے لئے طغرائے امتیاز تھی یعنی خدائے برتر

نے آپ ﷺ کی بعثت عام قرار دیا اور حکم ہوا کہ آپ نہ صرف قریش کے لئے نہ صرف ام القری (مکہ) اور اطراف مکہ کے لئے نہ صرف عرب کے لئے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ کی بعثت تمام کائنات انسانی کے لئے ہوئی ہے اور آپ عرب و عجم اور اسود و احمر سب کے لئے پیغامبر اور خدا کے ایلچی ہیں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○
(السبا، پ ۲۲ ع ۹)

اور ہم نے تم کو کائنات انسانی کے لئے پیغام دیکر بھیجا ہے (اعمال نیک پر) خوش خبری سنانے اور (اعمال بد پر) لوگوں کو ڈرانے کے لئے اور اکثر (جاہل) لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔"

تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا ○ (فرقان پ ۱۸ ع ۱۶)

پاک اور برتر ہے وہ ذات جس نے حق و باطل کے درمیان تمیز دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے (محمد ﷺ) پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجام بد سے) ڈرائے۔

دعوت اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر

نبی اکرم ﷺ سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اس لیے فطری طریق کار کے پیش نظر سب سے اول قوم عرب ہی ان کی دعوت و ارشاد کا مخاطب قرار پائی تاکہ جو قوم کل چوپایوں کی گلہ بان تھی نور نبوت سے مستنیر ہو کر کائنات انسانی کہ گلہ بان بن جائے اور خدائے برتر کے سب سے بزرگتر پیغمبر رسول ﷺ کے سایۂ رحمت میں تربیت پاکر کائنات ہدایت کے لئے خیر امت کا لقب پائے تو اب دیکھنا یہ ہے کہ عرب جیسی سرکش، جاہل تمدن و حضارۃ سے یکسر محروم اور اخلاقی و ملی جذبات و احساسات سے قطعاً منحرف قوم پر اسلام کی دعوت نے فوری طور پر کیا اثر کیا تاکہ ہم بآسانی یہ اندازہ کر سکیں کہ جس مذہب کے بنیادی اصول و عقائد اور افکار و اعمال نے ایسی قوم کے تمام شعبہ ہائے حیات میں حیرت زا اور عظیم الشان انقلاب پیدا کر کے اس کو روحانی دنیا کا انسان بنا دیا اس مذہب کی صداقت کے لئے تنہا یہ ایک کارنامہ ہی روشن دلیل بن سکتا ہے۔

مشرکین مکہ کی پیہم مخالفت، ایذارسانی اور ہولناک طریقہائے عذاب نے جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کو افریقہ کے مشہور ملک حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کر دیا اور وہ عیسائی حکمراں اصحمہ کی حکومت میں پناہ گزین ہو گئے تو سرداران قریش اس کو بھی برداشت نہ کر سکے اور اصحمہ کے دربار میں مشاہیر کا ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اسلئے ان کے حوالہ کر دے کہ یہ بددین ہو کر اور باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہاں رہ کر بھی حکمراں کے دین کے مخالف ہیں۔

اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سن کر مسلمانوں کو جواب دہی کے لئے دربار میں طلب اور اسلام کے متعلق دریافت حال کیا تب حضرت جعفرؓ نے اسلام سے متعلق تقریر فرمائی اور اس کی مقدس تعلیم کا مختصر اور جامع نقشہ کھینچ کر اصحمہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا یہی وہ تقریری ہے جو دراصل عرب کے دور جاہلیت اور قبول اسلام کے دور کی انقلابی کیفیت کا مجمل مگر بہترین خاکہ ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

"بادشاہ! ہم پر ایک طویل تاریک زمانہ گذرا ہے، اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شعار تھا، مردار خواری، زناکاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح و شام کا ہمارا مشغلہ، ہمسایوں کے حقوق سے بیگانہ، رحم و انصاف سے ہم نا آشنا اور حق و باطل کے امتیاز سے ہم ناواقف، غرض ہماری زندگی سر تا سر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتواں کو ہضم کر لینے کو اپنے لئے فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمت خدا کا کرشمہ دیکھئے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف، جس کی صداقت، امانت و عصمت پر دوست و دشمن دونوں گواہ، جس کی قوم نے اس کو محمد الامین کا لقب دیا، وہ یا اور اس نے ہم خدا کی توحید کا سبق دیا خدائے واحد کی جانب بلایا اس نے بتلایا کہ خدا کا کوئی سہیم و شریک نہیں، وہ شرک سے پاک ہے بت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لئے قابل ترک ہے اور صرف خدائے واحد ہی کی عبادت حق عبدیت ہے۔ اس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک سکھایا، قتل و غارت کی رسم بد کو مٹایا، زناکاری کو حرام اور فحش کہہ کر اس ننگ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی، نکاح میں محارم اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مال یتیم کھانے کو حرام فرمایا، نماز اور خیرات و صدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعر مذلت سے نکال کر انسانیت کبریٰ کے مرتبہ پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے یہ ہے ہمارا وہ قصور جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہم کو ان کے حوالے کر دے۔

(سیرت ابن ہشام جلد اول و تاریخ ابن کثیر ج ۳)

حضرت جعفرؓ نے اسلام کے صاف اور سادہ مگر روشن اصول کو جب اصحمہ کے سامنے جراءتِ حق کے ساتھ پیش کیا تو حبشہ کے حکمراں نے مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال کر وفد کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا اور پھر حضرت جعفرؓ نے خوش الحانی کے ساتھ سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں تو نجاشی حبشہ بیحد متاثر ہوا اور آبدیدہ ہو کر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آیا اور حضرت جعفرؓ کے دست حق پرست پر مشرف باسلام ہو گیا۔

یہ ہے دعوت اسلام کا مختصر خاکہ جس نے دنیا کے شب رنگ اور تاریک ترین خطہ انسانی کو ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں مثل آفتاب تابناک اور روشن ترین بنا دیا۔ اس خاکہ میں میں اعتقادات، اخلاق اور اعمال حسنہ کا وہ تمام عطر موجود ہے جس کو قرآن عزیز نے مختلف سورتوں میں حسب حال اور مناسب مقام پر بکثرت بیان کیا ہے بلکہ پورا قرآن انہی روشن حقائق کا ہادی و مرشد ہے۔

قرآن اور تجدید دعوت

نبی اکرم ﷺ کی بعثت جبکہ بعثت عام ہے تو از بس ضروری ہوا کہ کائنات انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے خدا کا جو پیغام آپ ﷺ کے ذریعہ آئے وہ آخری پیغام اور کامل و مکمل پیغام ہو اور فطرت کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ عقل سلیم اور فطرت مستقیم تمام کائنات انسانی کے لئے اس کو ابدی اور سرمدی پیغام یقین کرے اسی پیغام الٰہی کا نام "القرآن" یا "الکتاب" ہے۔

قرآن کی تعلیم اور اس کی دعوت واصلاح کی حقیقت معلوم کرنے سے قبل چند لمحات کے لئے مذاہب عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

قرآن کے نزول سے قبل کائنات انسانی پر چار مذہبی تصور حاوی اور فکر و نظر ذہنی پر اثر انداز تھے: ہندو مت، مجوسی، یہودی اور مسیحی۔

ہندو مت تصور الٰہی کے متعلق خواص اور عوام کیلئے دو جدا جدا تخیلات رکھتا تھا خواص کیلئے وحدۃ الوجود[1] اور عوام کیلئے اصنام پرستی، وحدۃ الوجود کا تصور اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کسی طرح اس راہ سے ممکن نہ تھا اسلئے کہ اگر ایک جانب وہ ہر وجود کو خدا یا خدا کا جزء مانتا ہے تو دوسری جانب خدا کیلئے کوئی محدود عدد متعین تخیل بتانے سے عاجز تھا یہی وجہ ہے کہ ہندو مت کے تمام اسکولوں (مذاہب) میں اصنام پرستی ہی کو مذہبی امتیاز رہا اور وہ توحید خالص کو مقبول خواص و عوام نہ بنا سکا۔ چنانچہ ویدک دھرم، بدھ مت، جین مت وغیرہ بلکہ جدید اصلاحی اسکول (مذہب) آریہ سماج سب کے سب توحید خالص کے تصور سے خالی ہیں۔

مجوسی مذہب کا اعتقادی تصور تو صاف صاف ثنویت کی بنیادوں پر قائم ہے یعنی وہ خدا کے تصور تخیل کو خیر و شر کی جدا جدا دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ نور اور خیر کا خدا یزداں اور ظلمت و شر کا اہرمن ہے اور اس طرح خدائے خیر اور خدائے شر دو خدا کائنات ہست و بود پر متصرف اور باہم متقابل ہیں۔

یہودی مذہب اگرچہ خدا کے تصور میں مدعی توحید رہا ہے لیکن موجودہ تورات کے اوراق شاہد ہیں کہ اس کی نگاہ میں خدا کی ہستی تجسم سے پاک نہیں ہے اسی لئے تورات کا تخیلی خدا کہیں حضرت یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑتا نظر آتا ہے اور یعقوب علیہ السلام اس کو پچھاڑ دیتا ہے اور کہیں اس کی انتڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے چیختا نظر آتا ہے کبھی وہ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنا لیتا ہے تو کبھی مصر سے خروج کے وقت بادل اور آگ کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی راہنمائی کرتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی آنکھیں دکھنے آجاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اس تصور کا آخری مظاہرہ حضرت عزیر (عزرا) علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرنے پر منتہی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مسیحی تصور بھی تجسم و تشبہ کے چکر میں آکر حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان لیتا اور اسطرح مشرکانہ عقیدہ اوتار کا تخیل اپنا لیتا ہے اور اقانیم ثلثہ (تثلیث) اور مریم پرستی میں حقیقی خدا پرستی کو گم کر بیٹھتا ہے۔ خدا کی ہستی سے متعلق یہ وہ تصورات تھے جن میں دنیا کے بڑے بنیادی مذاہب نزول قرآن کے وقت مبتلا

[1] یہاں وہ وحدت الوجود مراد ہے جو یوگیانہ تصور کا نچوڑ ہے۔

نظر آتے ہیں۔

ان سب مذاہب میں توحید حقیقی سے غفلت نے رسالت یعنی دعوت حق کے داعی کی شخصیت کے متعلق بھی غلط تصورات پیدا کر دیے تھے چنانچہ ہندوستان کے مذہبی تصور میں تو رسالت و نبوت اپنے صحیح معنی میں نظر ہی نہیں آتی اور وہ نبی و رسول کے مفہوم سے ہی یکسر نا آشنا نظر آتا ہے اور مجوسی، یہودی اور مسیحی مذاہب کے معتقدات میں اگر یہ تصور پایا بھی جاتا ہے تو افراط و تفریط کی شکل میں کبھی ابن اللہ ہو کر اور کبھی بداخلاق و بداعمال انسان کا پیکر بن کر جیسا کہ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کا ان کے ساتھ اختلاط کا واقعہ مذکور ہے (العیاذ باللّٰہ من هذه الخرافات و الا فتراء ات)۔

گویا ان کے نزدیک یا تو رسول اور داعی حق کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اور یا پھر خدا خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا بن کر سامنے آتی ہے اور اس لئے جس طرح وہ حقیقی توحید سے بیگانہ نظر آتے ہیں اسی طرح رسالت و نبوت کے صحیح تصور سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔

اسی طرح عالم آخرت کے متعلق بھی ان مذاہب کے تصور کی دنیا افراط و تفریط سے خالی نہیں تھی، بعض مذاہب میں تو کائنات انسانی مختلف چولوں کے چکر میں گرفتار نظر آتی اور آواگون (تناسخ) کے ناقص فلسفیانہ نقطہ نگاہ کا رہین منت بنی ہوئی ہے اور ایک حد پر پہنچ کر "برہم" یعنی خدا میں جذب ہو جانا نجات کا آخری نقطہ متعین کیا جاتا ہے نیز خیر و شر کی جزا و سزا کے بارہ میں ایک قادر مطلق خدا نہیں بلکہ ایک جبری قانون میں جکڑی ہوئی مجبور ہستی کا تصور پیش کرتا ہے اور بعض اگر چہ تناسخ کے غلط عقیدہ سے جدا یوم معاد اور یوم حساب کے تصور سے آشنا بھی ہیں لیکن ان کے نزدیک بھی عالم آخرت کا معاملہ اعمال صالحہ و سیۂ یا افعال و کردار کے حق و باطل کی جزا و سزا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ نسلی امتیازات اور جماعتی فرقہ بندی اور یا پھر کفارہ کے ساتھ مربوط ہے۔

ان چار بنیادی مذاہب عالم کے علاوہ مشرکین اور فلاسفہ کی بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو نہ خدا کی ہستی کی قائل ہیں اور نہ عالم آخرت کی اور خدا کی ہستی پر اور اگر ایمان بھی رکھتی تھیں تو سیکڑوں ہزاروں بلکہ بے تعداد بتوں کی باطل پرستی کے ساتھ ملوث و مجروح۔

غرض یہ تھے مذاہب عالم کے وہ ذہنی تصورات اور فکری معتقدات جن پر کائنات انسانی کی روحانی اور سرمدی سعادت کا مدار سمجھا جاتا تھا اور جو بلا شبہ اپنے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے کائنات انسانی کو مشعل ہدایت دکھا کر انسانیت کبریٰ کے درجہ تک پہنچانے اور انسانوں کا خدا کے ساتھ حقیقی معبود و عبد ہونے کا رشتہ قائم کر کے دین و دنیا کی خیر و فلاح تک پہنچانے میں قطعی تہی دامن تھے۔

انہی حالات میں "اسلام" کی دعوت و تبلیغ یا "تعلیم حق" نے رونمائی کی اور کائنات انسانی کے ہر شعبۂ حیات میں گونا گوں انقلاب پیدا کر کے نیا عالم پیدا کر دیا اور آفتاب ہدایت کی روشنی سے منور بنا کر اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔

توحید

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے کلام (قرآن) کے ذریعہ سب سے پہلے اسی عقیدۂ توحید پر روشنی ڈالی اور توحید خالص کی حقیقت واضح کر کے تمام کائنات انسانی کو اس کی جانب دعوت دی۔

قرآن عزیز کی دعوت توحید کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو اپنی ذات و صفات میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور وراء الوراء ہے نہ اس کا کوئی سہیم و شریک ہے اور نہ اس کا ہمتا و ہمسر اس کیلئے ابنیت کا عقیدہ ہو یا اوتار کا صنم پرستی ہو یا ثنیت و تثلیث یہ سب باطل ہیں وہ یکتا و بے ہمتا ہے، باپ، بیٹا اور اس قسم کی نسبتوں سے پاک ہے پرستش کے قابل وہ خود ہے نہ کہ اس کے مظاہر اور اس کی مخلوقات وہ جس طرح تجسم و تشبہ سے بالاتر ہے اسی طرح اس کا نہ کوئی مقابل ہے اور نہ کوئی حریفانہ سہیم:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ

اللہ اس ہستی کا نام ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود اور خدا نہیں ہے اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی نہ خدا ہے نہ معبود وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور زندگی کا بخشنے والا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا

پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ط اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○

اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

اور خدا تمہارا ایک ہی خدا ہے۔

یہ اور اسی مضمون کی بے شمار آیات ہیں جو قرآن عزیز میں توحید خالص کی داعی اور منادی ہیں لیکن سورۂ اخلاص یا سورۂ توحید میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ توحید سے متعلق موجودہ مذاہب کے ناقص اور غلط تصورات کو باطل کرتے ہوئے توحید خالص کی تعلیم دی گئی ہے۔

وہ خود اپنی نظیر ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ ○

(اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے اللہ یکتا ذات ہے اللہ بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ اس کا کوئی ہمسر اور سہیم و شریک ہے۔

ایک مرتبہ توحید سے متعلق مذاہب عالم کی تعلیم پر نظر کیجیے اور پھر ان چند مختصر آیات کو غور و فکر کے ساتھ

ملاحظہ فرمایئے تو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ پہلی دو آیات میں توحید خالص کا صحیح اور حق تصور پیش کر دیا گیا ہے قرآن کہتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی کا نام ہے جو یکتا و بے ہمتا ہے ساری کائنات اس کی محتاج ہے اور وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور بے نیاز ہے وہ صمد ہے یعنی مجموعۂ کمالات صمدیت کا حصہ ہے اور بس۔

اس کے بعد وہ نصاریٰ اور یہود سے مخاطب ہو کر شمع ہدایت دکھاتا ہے کہ اللہ اس ہستی کو کہتے ہیں جو باپ اور بیٹے جیسی فانی نسبتوں سے بالاتر ہے وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا تعالى اللّٰهُ عُلُوًّا كَبِيرًا اور اسی طرح ہندو دھرم سے کہتا ہے کہ ایسی لازوال ہستی کی مقدس شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ کسی انسان یا حیوان کے جسم میں محدود ہو کر اوتار کہلائے یا اس معبود مطلق کے ساتھ چھوٹے معبودوں کا سلسلہ قائم کر کے کسی مخلوق کو کا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ اور وہ اس کا مقابل حریف تسلیم کرتے ہیں یا روح (جیو) اور مادہ (پرکرتی) کو خدا کے ساتھ ازلی و ابدی (قدیم و غیر مخلوق) کہہ کر ان چیزوں کو خدا ساتھ ازلی و ابدی (قدیم و غیر مخلوق کہ کر ان چیزوں کو خدا کا کفو اور ہمسر بتلاتے ہیں، اور کہتا ہے وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ خدا اس ہستی کا نام ہے جس کا نہ کوئی ہمسر اور حریف ہے اور نہ اس کی طرح انادی (قدیم) و رغیر مخلوق ہے۔

غرض قرآن عزیز نے خدا کی ذات واحد سے متعلق ان تمام نسبتوں کا قطعی انکار کر کے جو توحید خالص کے کسی طرح بھی معارض ہوتی تھیں اس کو یکتا اور بے ہمتا ظاہر کیا ہے اور اس طرح شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کا قلع قمع کر دیا ہے اور شرک فی الالوہیۃ اور شرک فی الربوبیۃ کے خلاف توحید اور صرف توحید کو ہی اسلام کا بنیادی تصور قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے توحید کے تمام اطراف و جوانب کو نقص و خام کاری سے پاک کر کے حقیقی توحید کے تصور کی جانب راہنمائی کی اور ہر قسم کے تجسم سے وراء الوراء بتلا کر توحید کامل کی جانب دعوت دی اسی طرح اس نے توحید کے اس فلسفیانہ عقیدہ کو بھی باطل ثابت کیا جو اس باب میں تفریط کی حد تک بڑھ کر صفت الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے خالق ہے بغیر خلق کے بصیر ہے بغیر رویت کے، سمیع ہے بغیر سمع وغیرہ وغیرہ۔ اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ خدا ایسی ہستی کا نام ہے جس کے لئے "تعطل" لازم ہے جیسا کہ پہلی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ کسی نہ کسی رنگ میں خدا کیلئے تجسم ضروری ہے۔

قرآن نے کہا کہ پہلی کیفیت اگر افراط پر مبنی تھی تو یہ تفریط پر قائم ہے اس لئے کہ ایک ذات کے لئے متعدد صفات کمال کا ہونا ذات کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہے اس لئے بلا شبہ وہ سمیع و بصیر ہے سنتا ہے اور دیکھتا ہے لاریب وہ قدرت کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفت رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اس کی صفت سمع و بصر صفت رحم و کرم وغیرہ صفات کا انسانی صفات سمع و بصر سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات میں بے ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ

اس (خدا) کی کوئی مثال نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ سنتاہے دیکھتاہے۔

غور فرمایئے کہ کس معجزانہ تعبیر کے ساتھ ایک ہی آیت اور ایک ہی جملہ میں اس کی صفات کمالیہ کا اعتراف بھی مذکور ہے اور یہ بھی وضاحت موجود کہ خدا کی ان صفات کو انسانی صفات کی طرح نہ سمجھو بلکہ اس کی ذات کی طرح اس کی صفات بھی لیس کمثلہ شیئ کے عنوان سے معنون اور انسانی صفات کی حقائق کے مقابلہ میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدائے برتر کی توحید جب ہی حقیقی توحید کہلا سکتی ہے کہ اس میں نہ تجسم کا عقیدہ شامل حال ہو اور نہ تعطل کا کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں بلکہ عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اپنی ذات میں بھی بے ہمتا و یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی اور وہ ہر طرح کے شرک و کفو سے پاک اور برتر ہے۔

رسالت

توحید حقیقی کے ثبوت کے بعد قرآن نے رسالت کے بنیادی عقیدہ کی اصلاح بھی ضروری سمجھی اور اس نے بتلایا کہ کسی تعلیم کے حسن و قبح میں معلم کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلم بد عمل انسان ہو یا بری تعلیم کا معلم نیکوکار، اور جبکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدا ہر ایک انسان کے ساتھ براہ راست ہم کلام نہیں ہوتا از بس ضروری تھا کہ کائنات انسانی کی ہدایت کیلئے ایک انسان ہی کو معلم بنایا جائے اور وہی خدا کی جانب سے رسالت اور پیغامبری کا فرض انجام دے۔

پس بشری اوصاف سے متصف یہ انسان نہ خدا ہوگا اور نہ خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار بلکہ بشر انسان ہی رہے گا نیز خدا کے پیغامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اس کو خدا کی درگاہ سے وابستہ کیے ہوئے ہے اس کے پیش نظر اس کی ہستی کا نہ انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کو دوسرے انسانوں کے مساوی کہا جا سکتا ہے اس لئے قرآن نے جگہ جگہ مسیح ابن مریم اور عزیر علیہم السلام کے متعلق اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر ایک انسان تمہاری طرح کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی اور بازاروں میں چلتا پھرتا خرید و فروخت کرتا اور گھر میں اہل و عیال کے ساتھ معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ وہ خدا کا فرستادہ رسول نہیں ہے اور کس طرح یہ جائز ہے کہ ایک صادق و امین ہستی کے اس دعویٰ کو تم محض قیاس کی بناء پر جھٹلا دو کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔

قرآن نے ان حقائق کو جن صاف اور واضح تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے گذشتہ صفحات میں آپ ان کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔

پس جس کتاب میں نبوت و رسالت سے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو وہ کبھی اپنی مذہبی تعلیمات کی صداقت کی مکمل تصویر نہیں پیش کر سکتی، یہی وہ عقیدہ ہے جس کی حقیقت میں ایمان بالرسل ایمان بالکتب ایمان بالملائکۃ" سب بنیادی عقائد سمٹ کر جذب ہو جاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جبکہ ہدایت انسانی کے لئے خدائے تعالیٰ اپنی پیغامبری کیلئے ایک انسان اور بشر کو ہی چن لیتا

ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے رشد وہدایت کا یہ سلسلہ قائم ہے۔

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ

کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ہماری جانب سے نذیر (پیغامبر) نہ گذرا ہو۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ○

اور ہر قوم کے لئے ہادی آئے ہیں۔

مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

ان میں سے بعض کے واقعات کا ہم نے قرآن میں تذکرہ کر دیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا۔

اور یہ یقین لانا بھی ضروری ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور اس کی تعلیم ایک تو بلاشبہ تمام پیغمبران خدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور اس لئے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبی ورسول کا بھی انکار کر دیا گیا تو گویا اس نے پوری دعوت قرآنی کا انکار کر دیا پس یہ ایمان ضروری ہوا:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ

ہم خدا کے پیغمبروں میں پیغمبر ہونے کے لحاظ سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے (کہ ایک کو مان لیں اور دوسرے کو انکار کر دیں)

لہٰذا جب تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ازبس ضروری ہوا تو ان پر نازل شدہ تمام کتب سماویہ پر بھی ایمان لانا جزء ایمان ہوگا ورنہ تو ایک جانب سے ایمان لا کر دوسری جانب سے اس پیغمبری کی صداقت کا انکار لازم آئے گا اور جب رسالت اور رسالت کے ساتھ کتب سماویہ پر ایمان حقیقت ثابتہ بن جائے تو ملائکۃ اللہ پر اس لئے ایمان لانا ضروری ہوگا کہ خدا کے ان پیغمبروں نے یہ صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا کی جانب سے اپر یہ وحی خدا کا فرشتہ لے کر آتا ہے تو اب یا ہم اس پیغمبر کی صداقت کا انکار کر دیں اور یا پھر بن دیکھے فرشتہ پر اس لئے ایمان لے آئیں کہ بتلانے والی ہستی اپنے کردار واعمال میں ہر طرح صادق وامین اور امراض دماغی قلبی جنون و سحر سے ہر طرح پاک ہے اور ضروری نہیں ہے کہ جس شے کو آنکھوں نے دیکھا ہو اور کانوں نے نہ سنا ہو وہ حقیقت میں بھی غیر موجود ہو کیونکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی شے کے عدم علم سے اس شے کا عدم لازم نہیں آتا یعنی یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے وہ واقع میں بھی موجود نہ ہو۔

یوم آخرت

نبی اکرم ﷺ نے خدا کے آخری اور مکمل پیغام قرآن کے ذریعہ تیسری بنیادی اصلاح یوم آخرت سے متعلق فرمائی۔

مذاہب عالم اس سلسلہ میں بھی راہ مستقیم سے روگرداں اور افراط و تفریط کے بحر ظلمات میں پھنسے ہوئے تھے وہ یا تو آواگون[1] (تناسخ) کے چکر میں یوم آخرت کے اس تصور سے قطعاً بیگانہ ہو چکے تھے اور قیامت (پرلے) کا تعلق انسانی اعمال کی جزاء و سزا اور یوم الحساب سے غیر متعلق سمجھ چکے تھے اور یا پھر اس دن نجات کا مدار اور جزاء و سزا کا معیار اعمال و کردار کی جگہ نسل و خاندان اور سوسائٹی کی معاشرتی گروہ بندی پر سمجھ بیٹھے تھے اور کفارہ کو عقیدہ بنا کر حساب و محاسبۂ اعمال سے مطمئن ہو چکے تھے اور مشرکین اور بعض فلاسفہ نے تو یوم آخرت کے وجود ہی کا انکار کر دیا تھا اور ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ آج کا مردہ انسان کل کس طرح زندگی اختیار کر لے گا اور سیکڑوں اور ہزاروں برس کی بوسیدہ ہڈیاں یوم حساب میں کس طرح جسم بن کر اپنی

۱: اس موقع پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے متعلق اگرچہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تناسخ (آواگون) کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہے کہ ایک انسان کی موجودہ زندگی سابق میں کیے ہوئے اعمال کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ورنہ کائنات میں یہ تنوع ہرگز نہ ہوتا کہ کوئی انسان ہے تو کوئی حیوان اور کوئی نباتات و جمادات، نیز انسانوں میں کوئی عالم ہے تو کوئی جاہل اور کوئی صحتیاب ہے تو کوئی مریض اور کوئی امیر کبیر ہے تو کوئی مفلس و محتاج وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدہ کا مقصد یہ ہوا کہ بغیر عمل و کردار کے اگر عالم میں یہ تغیرات موجود ہیں تو یہ تو یہ خدا کی صفت عدل کے منافی ہے لیکن اس عقیدہ کی خام کاری اور بطلان کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اگر روح اپنے اعمال کی وجہ سے مختلف جون بدل کر ان تغیرات عالم کا باعث ہے جو مجموعۂ کائنات کے حسن کا باعث ہیں اور جس کی بدولت یہ پورا کارخانہ مکمل نظام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کیلئے فطری اور نیچرل طور پر گنہگار، بدکار اور بداعمال ہونا از بس ضروری ہے تاکہ مجموعۂ کائنات کا یہ حسن نہ صرف یہ کہ پیدا ہو بلکہ قائم رہے جس کا تغیرات اور تنوعات پر مبنی ہونا از بس ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجئے کہ جون بدل کر آواگون کی زندگی اگر اعمال کی جزا و سزا سے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ کہ حضرت انسان کیلئے نیکوکار بننے کی جگہ زیادہ سے زیادہ بدکار ہونا چاہئے تاکہ آئندہ نظام عمل میں یہ تنوع باقی رہے جس کا باقی رہنا عقل و فطرت کے مطابق ہے ورنہ تو حیوانات، نباتات، جمادات کے فقدان سے انسانی دنیا کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

تناسخ کے ناقص فلسفیانہ عقیدہ پر یقین رکھنے والوں نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا ہے کہ ایک چیز اپنی انفرادیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قبیح اور بری معلوم ہو لیکن مجموعۂ کائنات کے پیش نظر اسکا وجود بھی اپنے اندر ضرور حسن رکھتا ہے مثلاً تل (خال) اپنے رنگ و روپ میں کیسا ہی سیاہ فام کیوں نہ ہو لیکن محبوب کے رخسار پر نہ خود حسین بن جاتا ہے بلکہ حسن محبوب کو دوبالا کر دیتا ہے اور حافظ شیرازیؒ جیسے صوفی کو "خالِ محبوب" پر سمرقند و بخارا بخش دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح عالم و کائنات میں انفرادی طور پر کسی کا مریض ہونا، اپاہج و معذور ہونا، ناقص الخلقت ہونا وغیرہ گو قبیح اور قابل افسوس نظر آتے ہوں۔ مگر مجموعۂ کائنات کے حسن کیلئے فطری (نیچرل) ہیں اور اس تنوع پر ہی دنیا کے نظام کا بقاء ہے اور خالق کائنات کے کمالاتِ آفرینش کا آئینہ دار۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

روح کے لئے لباس بن سکیں گی۔

قرآن نے نازل ہو کر دنیاءانسانی کو بتایا کہ اس صاف اور واضح بات کے سمجھنے میں آخر تم پر کیوں وحشت طاری ہوتی ہے اور کیوں تمہاری عقل اس کو نہیں تسلیم کرتی کہ جس خالق کائنات اور بدیع السموت والارض نے نمونہ اور نقشہ کے بغیر یہ عجیب وغریب عالم آفرینش کر دیا وہ بلا شبہ اس پر قادر ہے کہ ماضی میں مخلوق اور حال میں مردہ و بوسیدہ ہستی کو مستقبل میں دوبارہ وجود عطا فرمادے اور اس کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ وہی ہیئت جسمانی عطا اور سابق روح کو اس میں واپس کر دے۔

یا تو صاف کہو کہ اس کائنات کو کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا نہیں کیا جس کو خدا (اللہ) کہتے ہیں اور اگر یہ مانتے ہو تو یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے کہ جو ابتدائی آفرینش کر سکے وہ اس آفرینش کو دہرا نہ سکے۔

وَيَقُوْلُ الْإِنْسَانُ اَءِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ۝ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝

اور انسان کہتا ہے کہ بھلا جب میں مر گیا تو کیا میں (قبر سے) زندہ نکالا جاؤں گا کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے پہلے اسے پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ط قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ أَنْشَأَهَآ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝

اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کی حقیقت کو بھول گیا کہتا ہے کہ ہڈیاں جب گل کر خاک ہو گئی ہوں تو کون ہے جو ان کو زندہ کر کے کھڑا کر دے (اے محمد ﷺ) کہہ دیجئے کہ جس نے ان ہڈیوں کو اول بار پیدا کیا تھا وہی ان کو زندہ کرے گا اور وہ سب کا پیدا کرنا جانتا ہے۔

یہ مشرکین مکہ تھے جو خدا اور خالقیت خدا کے تو قائل تھے مگر دوسری زندگی کے منکر و کافر اور جاحد تھے پھر اس نے ان کو بھی مخاطب کیا جو کہتے تھے کہ آخرت کا تصور اس لئے فضول ہے کہ یہ کائنات کسی کی مخلوق ہی نہیں۔ مادہ اور اس کی حرکت یونہی ازل سے ابد تک کائنات کا روپ و رنگ اختیار کیے ہوئے ہے اور حرکت و کشش دو قوتیں اس نظام عالم کے ہر قسم کے تنوعات کے کفیل ہیں قرآن نے کہا یہ گمراہ کن تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ کہ عقل اور سائنس کے خلاف یہ سمجھ لیا گیا کہ ذرات مادہ (اجزاء اثیریہ) میں شعور و ارادہ نہ ہونے کے باوجود (حرکت، قوت استعداد اور کشش کے ذریعہ خود بخود ایسی اشیاء وجود پذیر ہو سکتی ہیں جن کا مواد (میٹریل) ان ذرات میں موجود نہیں یعنی مادہ میں بالقوۃ بھی نہ شعور ہے اور نہ ارادہ، نہ جذبات ہیں نہ احساسات، نہ ادراکات ہیں اور نہ عقل و تمیز ورنہ تو جسم کو بالقوۃ ان صفات کا حامل کہنا بجا ہوتا، لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ جسم کو نہ شعوری کہہ سکتے ہیں نہ جذباتی، نہ ذی ادراک کہا جا سکتا ہے اور نہ ذی عقل و صاحب تمیز پس دلیل وجدان جو فطری دلائل میں سب سے زیادہ مضبوط ورنیچر دلیل ہے وہ اس حقیقت کو تسلیم کراتی ہے کہ جبکہ تمام موجودات عالم میں انسان موجودات عالم کی ارتقائی ہستی اور اشرف الموجودات ہے اور

اس میں جذبات، حسیات، ادراکات، شعور اور عقل جیسے لطیف اوصاف موجود نظر آتے ہیں حالانکہ بلاشبہ مادہ کی قوت واستعداد میں یہ معدوم تھے تو اس میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سے بلند ضرور ایک ایسی ہستی موجود ہے جو قدرت وارادہ کی علی الاطلاق مالک اور تمام موجودات کی خالق ہے اور اس میں بھی کوئی ریب و شک نہیں کہ انسان ایسی ذی عقل وذی شعور اور صاحب ارادہ و ہستی کی تخلیق محض بے فائدہ نہیں ہے اور اس کی زندگی کے اعمال اور کردار بے وجہ اور مہمل نہیں ہیں اور جبکہ ہم اس دنیا میں انسانوں کے اعمال و کردار کی جزاء و کا مظاہرہ نہیں دیکھتے تو وجدان ہی ہمارے لئے رہنمائی کرتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور مقرر ہے جب کائنات انسانی اپنے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا نتیجہ و ثمرہ پائیگی اور اسی کو یوم القامیہ، یوم الآخرۃ اور یوم الحساب کہتے ہیں چونکہ یہ دن اپنی پائیداری اور قیام کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اسلئے یوم القیمہ کہلاتا ہے اور چونکہ دنیائے موجودہ کے بعد ہے اسلئے یوم الآخرہ ہے اور چونکہ جزاء و سزا اور اعمال کے محاسبہ پر مشتمر ہوگا اسلئے یوم الحساب ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ ط قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ (پ ۲۲ ع ۷)

اور منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم کو تو کبھی نہیں آئے گی۔ اے محمد! ﷺ کہہ دیجئے ہاں ہاں مجھ کو اپنے پروردگار کی قسم جو عالم الغیب ہے قیامت تو تم کو ضرور پیش آکر رہے گی۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝

کیاانسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل اور بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

أَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلٰٓى أَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى ۝ (پ ۲۹، ع ۱۸)

کیاخدااس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کردے؟

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۝ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ ۝

گواہ ہے انجیر وزیتون (کے باغات سے سرسبز وشاداب وہ مقام بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی) اور گواہ ہے طور سیناء (جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفرازی نصیب ہوئی اور گواہ ہے یہ بلد امین (مکہ جہاں محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی) کہ بلاشبہ ہم نے انسانوں کو بہتر سے بہتر قوام سے بنایا پھر اس کو نشیبوں کے سب سے نیچے مقام پر دھکیل دیا مگر وہ انسان جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لئے بے منت واحسان اجر وثواب ہے۔ تو اب وہ کیا بات ہے جو تجھ کو دین (قیامت) کے جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے کیا اللہ

حاکموں میں سب سے بہتر حاکم نہیں ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کہتا ہے کہ آخرت کے انکار پر منطقی دلائل قائم کرنے اور سفسطہ اور غلط روش کو اختیار کر کے ادھر ادھر بھٹکنے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ انسان کی سب سے قریب اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل وجدان خود بخود اس جانب راہنمائی کرتی ہے کہ یہ نظام عالم جس طرح حیرت زا اور محیر العقول نظام فطرت سے منظم اور قوانین فطرت کے ہاتھوں میں مسخر ہے ہو نہیں سکتا کہ یہ خود رو نظام ہو اور جبکہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے تو اس نے خیر و شر کے ثمرات و نتائج کے لئے بھی ضرور کوئی وقت مقرر کیا ہے ورنہ یہ کامل و مکمل نظام ثمرہ اور نتیجہ کے پیش نظر ایک مہمل شے ماننی پڑے گی پس نتیجہ اور ثمرہ کا وہ دن ہی یوم آخرت کے نام سے موسوم ہے جو نہ تناسخ کے چکر سے وابستہ ہے اور نہ ازلیت و ابدیت عالم کا حامل بلکہ جس طرح عالم کی ہر شے کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام اسی طرح خود اس پورے عالم کا بھی ایک آغاز اور انجام از بس ضروری ہے۔

پس مومن اور مسلم وہی ہے جو توحید خالص رسالت کے صحیح تصور اور یوم آخرت پر یقین کامل کے سر رشتہ کے ساتھ پیوستہ ہو اور یہی وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو دین کے حقیقی تصور یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر اور ایمان بالآخرہ سب ہی پر حاوی ہیں اور یہی وہ دین کامل ہے جس کی تشریح قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح کی ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

رسول محمد ﷺ ایمان رکھتے ہیں اس شے پر جو اس پر ان کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے (یعنی قرآن) اور ہر ایک (ایماندار) ایمان رکھتا ہے خدا پر فرشتوں پر سماوی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (وہ کہتے ہیں خدایا) ہم تیرے پیغمبروں کے درمیان کسی ایک کو بھی پیغمبر تسلیم کرنے کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تیرا حکم سنا اور اس کی پیروی کی اے پروردگار ہم تجھ سے مغفرت کے خواہاں ہیں اور ہم کو آخر کار تیری ہی جانب لوٹنا ہے۔

مابعد الطبیعاتی عقائد و افکار سے متعلق قرآن حکیم کی یہی وہ اصلاحی اور انقلابی تعلیمات تھیں جن کو نبی اکرم ﷺ نے اول عرب کے سامنے روشناس کیا اور پھر تمام کائنات انسانی تک پہنچا کر مذاہب کی دنیا ہی بدل ڈالی اور اسلام کی اس دعوت توحید نے مذاہب عالم میں ہل چل پیدا کر دی اور کسی نہ کسی رنگ میں ان کو توحید حقیقی کے اس ارتقائی نقطہ کی جانب جھکنا پڑا اور اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رشتہ معبودیت و عبودیت ہی کو صحیح نقطہ نظر پر استوار اور عقائد اور مابعد الطبیعاتی افکار کے رخ روشن کو آشکار کر دیا، بلکہ اس نے ایمان اور عمل صالح کو دین کی بنیاد بنا کر اخلاق معاشرت، معاش، غرض مذہب اور اجتماعی سیاست سب ہی کو اصلاح و انقلاب کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کی صحیح راہنمائی کا

حق ادا کر دیا۔

یہ بحث چونکہ طویل الذیل ہے اور آیت کی تفسیر کے ضمن میں شرح و بسط کی محتاج اس لئے یہ مقام اس کی وسعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اسراء (معراج)

"اسراء" کے معنی شب میں لے جانے کے ہیں، نبی اکرم ﷺ کا وہ بے نظیر شرف و مجد اور حیرت زا واقعہ جس میں خدائے برتر نے اپنے رسول کو مسجد حرام (مکہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور وہاں سے ملاء اعلیٰ تک بجسد عنصری اپنی نشانیاں دکھانے کیلئے سیر کرائی" چونکہ شب کے ایک حصہ میں پیش آیا تھا اسلئے اسراء کہلاتا ہے۔

معراج عروج سے مشتق ہے جس کے معنی چڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں اور اسی لئے معراج زینہ کو بھی کہتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے چونکہ اس شب میں ملاء اعلیٰ کے منازل ارتقاء طے فرماتے ہوئے سبع سماوات، سدرۃ المنتہیٰ اور اس سے بھی بلند ہو کر آیات اللہ کا مشاہدہ فرمایا اور ان واقعات کے ذکر میں زبان وحی ترجمان نے عرج بی کا جملہ استعمال فرمایا اس لئے اس باجبروت اور پر عظمت واقعہ کو معراج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس لئے دو مختلف تعبیروں اور واقعات کی تفصیلات میں جزوی اختلاف کے پیش نظر تطبیق روایات کی خاطر اس واقعہ کے تعدد کا قائل ہونا تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ہرگز صحیح نہیں ہے اور مشہور محقق، جلیل القدر محدث مفسر اور مؤرخ حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ ارشاد بلا شبہ درست اور حقیقت حال کیلئے کاشف ہے فرماتے ہیں:

> ان تمام روایتوں کو جمع کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ واقعۂ معراج صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے اور روایتوں کو جمع کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہو گئی کہ واقعہ صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے اور راویوں کی عبارات کے بعض حصص کا ایک دوسرے سے کچھ مختلف اور تفصیلات میں کم و بیش ہونا وحدت واقعہ پر اثر انداز نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے انسان خطا کاری سے محفوظ نہیں ہیں۔
>
> سو ان روایات کے جزوی اختلافات کو دیکھ کر جن علماء نے تعدد واقعہ کا مسلک اختیار کیا اور ہر ایک مختلف روایت کو جدا جدا واقعہ بنا دیا اور اس طرح یہ دعویٰ کر دیا کہ معراج کا واقعہ متعدد بار پیش آیا ہے۔ انھوں نے بعید از قیاس بات کہہ ڈالی اور قطعاً غلط راہ روی اختیار کر لی اور حقیقت حال سے دور پڑ گئے ..... یہ مسلک اسلئے بھی صحیح نہیں ہے کہ نہ سلف صالحین سے تعدد واقعہ منقول ہے اور نہ تاریخی دلائل اس کے موید ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو خود نبی اکرم ﷺ ضرور بصراحت اس سے مطلع فرماتے اور راویان روایت بلا شبہ اس کو روایت کرتے۔ (ترجمہ عبارت تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲ مطبوعہ مصر (جدید))

تحقیق تاریخ و سنہ

یہ عدیم النظیر واقعہ کب پیش آیا؟ اس کے تعین میں اگرچہ متعدد اقوال مذکور ہیں لیکن ان دو باتوں پر سب کا اتفاق نظر آتا ہے ایک یہ کہ واقعہ معراج قبل از ہجرت پیش آیا، اور دوسری بات یہ کہ حضرت خدیجۃ

الکبریٰؓ کی وفات کے بعد وقوع میں آیا اور جبکہ واقعہ ہجرت باتفاق ۱۳؁ نبوت کو پیش آیا اور بخاری میں مذکور حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہجرت سے تین سال قبل اور ایک دوسری روایت کے پیش نظر نماز پنجگانہ کی فرضیت سے قبل ہو چکا تھا۔[1] تو اب واقعہ کو ہجرت سے قبل کے ان تین برسوں کے اندر ہی ہونا چاہیے۔

نیز کتب تاریخ و سیرت دونوں شاہد ہیں کہ معراج اور ہجرت کے درمیان کوئی اہم واقعہ موجود نہیں ہے اور بنظر تحقیق ان ہر دو کے درمیان نہایت گہرا رشتہ اور ربط و علاقہ پایا جاتا ہے تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے بہت قریب زمانہ میں پیش آیا ہے اور درحقیقت یہ واقعہ ہجرت ہی کی پرجلال و پرعظمت تمہید تھی۔

غالباً ابن سعد نے طبقات میں اور امام بخاری نے اپنی الصحیح الجامع میں اس لئے واقعہ معراج اور ہجرت کو کسی تیسرے واقعہ کی مداخلت کے بغیر آگے پیچھے بیان کیا ہے اور جو حضرات بخاری کے ابواب و تراجم کی باہمی ترتیب کی دقیقہ سنجی سے واقف اور ان کے تفقہ کی بالغ نظری سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کا رجحان یہ ہے کہ ان ہر دو واقعات کے درمیان زمانہ اور تعلق دونوں اعتبار سے انتہائی قربت ہے۔

تو اب یہ کہنا آسان ہے کہ جو ارباب سیر و تاریخ یہ فرماتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال یا ڈیڑھ سال قبل پیش آیا ان کا ارشاد پایہ تحقیق رکھتا ہے۔

پھر مہینہ اور تاریخ کے تعین میں بھی متعدد اقوال موجود ہیں مگر راجح قول یہ ہیکہ مہینہ رجب کا تھا اور تاریخ ۲۷ تھی چنانچہ ابن عبد البر امام نووی اور عبد الغنی مقدسی (رحمہم اللہ) جیسے مشہور اور جلیل القدر محدثین کا رجحان اسی جانب ہے کہ رجب تھا اور آخر الذکر فرماتے ہیں کہ ۲۷ تھی اور دعویٰ کرتے ہیں کہ امت مرحومہ میں ہمیشہ سے عملاً اسی پر اتفاق بھی رہا ہے۔

قرآن عزیز اور واقعہ معراج

قرآن عزیز میں اسراء یا معراج کا واقعہ دو سورتوں بنی اسرائیل اور النجم میں مذکور ہے سورۂ بنی اسرائیل میں مکہ (مسجد حرام) سے بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) تک سیر کا تذکرہ ہے اور سورۂ النجم میں ملاء اعلیٰ کی سیر و عروج کا بھی ذکر موجود ہے اور اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی صرف ابتدائی آیات ہی میں یہ واقعہ مذکور ہے مگر حقیقت حال یہ ہے کہ پوری سورۃ اسی عظیم الشان واقعہ سے متعلق ہے اور سورۃ کی تمام آیات اسی کا تکملہ ہیں اور اس دعویٰ کے لئے ایک صاف اور واضح دلیل خود اسی سورۃ میں یہ موجود ہے کہ وسط سورہ میں آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ میں اسی واقعہ معراج کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس سے قبل حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات دعوت و تبلیغ اسی سلسلہ میں بطور شواہد و نظائر پیش کیے گئے ہیں کہ منکرین نے ہمیشہ اسی طرح خدا کی صداقتوں کو جھٹلایا ہے جس طرح آج واقعہ معراج کو جھٹلا رہے ہیں۔

---

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۱۷۹۔

احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت

مشہور محدث زرقانی کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ پینتالیس صحابہؓ سے منقول ہے اور پھر ان کے نام بھی شمار کرائے ہیں[1] ان صحابہ میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی اور یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ چونکہ انصار صحابہ مکہ میں موجود نہیں تھے۔ اسلئے ان کی روایات صرف شنیدہ ہیں اس لئے کہ ایسے اہم واقعہ کو جس کا اسلام کی ترقی کے ساتھ بہت گہرا تعلق اور ہجرت کے واقعہ کے ساتھ خصوصی ربط ہے صحابہؓ نے براہ راست نبی اکرم ﷺ سے ہی دریافت حال کیا ہوگا اور اگر مہاجرین سے بھی سنا ہوگا تو پھر ذات اقدس سے تصدیق ضرور کی ہوگی چنانچہ شداد بن اوسؓ کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

قُلْنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ كَيْفَ أُسرى بِكَ

ہم نے (صحابہ نے) عرض کیا اے خدا کے رسول! آپ کو معراج کس طرح ہوئی؟

لفظ قُلْنَا یہ ثابت کر رہا ہے کہ بلا شبہ معراج سے متعلق صحابہؓ کے عام مجمع میں نبی اکرم ﷺ سے استفسار کیا جاتا تھا جن میں مہاجرین وانصار سب ہی شریک ہوتے تھے اور مالک بن صعصعہؓ جو انصاری صحابی ہیں ان کی روایت معراج میں ہے:

ان النبى صلى اللّٰه عليه وسلم حدثهم

نبی اکرم ﷺ نے ان سے (صحابہؓ سے) یہ واقعہ بیان فرمایا۔

واقعہ کی نوعیت

چونکہ یہ واقعہ اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ طویل بھی تھا اس لئے بر بناء بشریت واقعہ کے اصل تفصیلی حالات میں اتحاد واتفاق اور بحد تواتر روایات منقول ہونے کے باوجود متعدد روایات کی فروعی تفصیلات میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ معمولی توجہ سے رفع کیا جا سکتا ہے اور بلا شبہ ان جزوی اختلافات سے اصل واقعہ کی حقیقت پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا خصوصاً جبکہ قرآن عزیز نے ان عجیب اور حیرت زا واقعات کو نص قطعی سے واضح کر دیا ہے جن کے متعلق ملحدین اپنے الحاد زندقہ کے ذریعہ باطل تاویلات پیش کر کے اس واقعہ کی معجزانہ حیثیت کا انکار کرتے ہیں۔

واقعہ معراج واسراء اور قرآن عزیز

سورۂ بنی اسرائیل میں واقعہ اسراء بیت المقدس تک کی سیر سے وابستہ ہے:

سُبْحَانَ الَّذِيْٓ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِيْ بَارَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○

پاک ہے اس ذات کے لے جس نے اپنے بندے کو (یعنی پیغمبر اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی

[1]: جلد ۲ ص ۱۶۔

تک کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے سیر کرائی اور اس لئے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اسے دکھائیں بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے۔ اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو ہم نے دکھایا سو لوگوں کی آزمائش کے لئے (دکھلایا)۔

اور سورۂ النجم میں ملاءِ اعلیٰ تک عروج کا ذکر بھی موجود ہے:

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى ○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ○ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ○ ذُوْ مِرَّةٍ ط فَاسْتَوٰى ○ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلٰى ○ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ○ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى ○ فَأَوْحٰٓى إِلٰى عَبْدِهٖ مَآ أَوْحٰى ○ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأٰى ○ أَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ○ وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرٰى ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى ○ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ○ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○ لَقَدْ رَأٰى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○

شاہد ہے ستارہ جبکہ غروب ہو، تمہارا رفیق گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ نہیں ہے مگر حکم جو اس کو بھیجا گیا ہے اس کو بتلایا ہے سخت قوتوں والے زور آور (فرشتہ) نے (کہ یہ خدا کی وحی ہے) جو سیدھا بیٹھا اور تھا وہ آسمان کے اونچے کنارہ پر پھر وہ قریب ہوا پس جھک آیا پھر رہ گیا (دونوں کے درمیان) وہ کمان بلکہ اس سے بھی نزدیک کا فرق پس خدا نے اپنے بندہ محمد ﷺ پر وحی نازل فرمائی جو بھی وحی بھیجی اس (بندہ) نے جو دیکھا (اس کے) دل نے جھوٹ نہیں کہا (یعنی آنکھ کی دیکھی بات کو جھٹلایا نہیں بلکہ تصدیق کی) تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو اس نے خود دیکھا ہے (یعنی واقعہ پر جھگڑتے ہو) اور اس (بندہ) نے خدا کو دیکھا ایک (خاص) نزول کے ساتھ جبکہ وہ بندہ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک موجود تھا جس کے پاس آرام سے رہنے کی بہشت (جنت الماویٰ) ہے اس وقت سدرہ بیری کا درخت پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا اس روایات کے وقت نہ نگاہ بہکی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی بلاشبہ اس (بندہ) نے (اس حالت میں) اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔

سورہ اسرائیل اور واقعہ معراج

یہاں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ النجم کی تفسیر کا موقع نہیں صرف اشارات ہی پر اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر ایک جانب یہ آیات اپنے مکمل تفسیری حق کا مطالبہ کرتی ہیں تو دوسری جانب کتاب اپنے سیاق و سباق کے پیش نظر اختصار کی طالب ہے بہرحال حسب ضرورت دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قدر گذارش ہے کہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت میں واقعہ اسراء کے متعلق جو کچھ کہا گیا اس کی اگر تحلیل کی جائے تو بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک قرآن کو تعلق ہے اس کا فیصلہ یہی ہے کہ واقعہ اسراء بحالت بیداری بجسد

عنصری پیش آیا ہے اور اس مطلب سے ہٹ کر جب اسکو روحانی یا منامی رؤیا کہا جاتا ہے تو تاویلات باردہ کے بغیر دعوئی پر دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔

بنی اسرائیل میں اس واقعہ کی ابتداء خدائے برتر کی قدوسیت اور سبحانیت کے بعد لفظ اسریٰ سے ہوئی ہے یہ لفظ س، ر، ی، سرٰی یسری سے ماخوذ ہے لغت میں جس کے معنی رات میں چلنے کے آتے ہیں۔

سری، یسری، سریً و سریةً الخ سار لیلاً (منجد)

سرای، یسری، سریۃً میں سرای کے معنی ہیں وہ رات میں چلا۔

اور اسریٰ کے معنی بھی شب میں لے چلا آتے ہیں چنانچہ کتب لغت میں ہے:

اسریٰ، اسراءً، سار لیلاً (منجد)

اسریٰ کے معنی ہیں رات میں چلا

یہی معنی اقرب الموارد، قاموس، لسان العرب اور تمام کتب لغت میں بصراحت مذکور ہیں اور اسی لفظ اسریٰ کو جب متعدی بنانا چاہتے ہیں یعنی راتوں لیجانا ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو "ب تعدیہ" بڑھادیتے ہیں۔ اس موقع کے علاوہ قرآن عزیز میں جہاں جہاں اسراء اور اس کے مشتقات آئے ہیں ان تمام مقامات میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ سورۂ ہود میں لوط علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

قَالُوْا يَالُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ

فرشتوں نے کہا: لوط علیہ السلام ! ہم تو تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں۔ یہ تجھ تک ہرگز نہیں پہنچ پائیں گے پس تو اپنے لوگوں کو کچھ رات گئے (یہاں سے) لے نکل۔

یہ آیت فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ سورۂ دخان میں بھی موجود ہے اور سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَآ إِلَى مُوْسٰٓى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْ

اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا۔

اور سورۂ شعراء میں ہے:

وَأَوْحَيْنَآ إِلَى مُوْسٰٓى أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِيْٓ إِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لیکر نکل جا۔ تمہارا تعاقب ضرور کیا جائیگا۔

اور یہی آیت سورۂ دخان میں بھی مذکور ہے۔

ان تمام آیات میں لفظ اسراء کا جس طرح اطلاق کیا گیا ہے اس سے دو حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے ایک یہ کہ اسراء اس سیر اور اس چلنے کو کہتے ہیں جو رات میں پیش آئے اسلئے دن یا شام کے چلنے پر اسراء کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ سری یا اسراء ان تمام آیات میں روح مع جسد پر اطلاق ہوا ہے یعنی لوط اور موسیٰ اور ان کے متبعین جن کیلئے یہ حکم ہو رہا ہے کہ وہ دشمنوں سے بچ کر راتوں ان بستیوں (مصر اور سدوم) سے نکل جائیں، ان کا رات کے حصہ میں نکل جانا نہ خواب کی شکل میں تھا اور نہ روحانی طور پر اور نہ رویاء کشفی کے طریقہ پر بلکہ عالم بیداری میں روح مع جسد کے تھا۔

پس جبکہ قرآن کے ان تمام اطلاقات میں اسراء کے یہ معنی بغیر کسی تاویل کے قابل تسلیم ہیں تو بنی اسرائیل کی آیت سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی کو روح مع جسد تسلیم کرنے میں کیوں پس و پیش ہو اور کس لئے اس واقعہ کو فقط روحانی، منامی، یا بین النوم والیقظہ کشفی طریقہ کے ساتھ مخصوص کیا جائے؟ جبکہ اس آیت میں ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اس اسراء کو قرآن کے عام اطلاقات سے جدا معنی پر دلالت یا اشارہ کرتا ہو۔

رہا یہ مسئلہ کہ بنی اسرائیل کی آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ کے لفظ رؤیا سے فائدہ اٹھا کر یہ کہنا کہ چونکہ رویا عالم خواب پر بولا جاتا ہے، اس لئے اسراء کا واقعہ منامی یا روحانی تھا بدیں وجہ صحیح نہیں ہے کہ عربی بول چال میں جس طرح "رویا" کا اطلاق خواب کی حالت پر ہوتا ہے اسی طرح وہ اس رویت پر بھی بولا جاتا ہے جس کا مشاہدہ آنکھ بحالت بیداری کرتی ہے چنانچہ عربی کے نہایت مستند اور مشہور لغت لسان العرب میں یہ تصریح موجود ہے

وقد جاء رؤیا فی الیقظة

اور بلاشبہ رؤیا بیداری میں عینی مشاہدہ کے لئے بھی آتا ہے۔

اور صاحب لسان نے جاہلی شاعر راعی کے اس شعر کو اس معنی کے لئے سند ٹھہرایا ہے:

فکبر للرؤیا و هش فؤادهٗ
و بشر نفسًا كان نفسا یلومها

اس نے تکبیر کہی اور اس کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا اور اس نے نفس کو پہلے ملامت کر رکھا تھا خوشخبری دی اس منظر کو دیکھ کر جس کا اس نے عینی مشاہدہ کیا۔

اسی طرح متنبی کے اس مصرعہ کو بھی سند قرار دیا ہے:۔

و رؤیاك احلی فی العیون من الغمض

اور تیرا دیدار (میری) آنکھوں میں نیند سے بھی زیادہ لذیذ ہے۔

ان مستند اقوال عرب کے بعد رویا کو صرف خواب کی حالت کے ساتھ مخصوص کر دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اب جبکہ "اسری بعبدہ" میں "اسراء" کے متبادر معنی سیر روح مع جسد کے ہیں اور "رؤیا" کا اطلاق دونوں قسم کی رؤیت پر ہوتا رہا ہے تو اس مقام پر "اسراء" کا قرینہ اس کا متقاضی ہے کہ یہاں "بحالت بیداری عینی مشاہدہ" کے معنی ہی متعین ہونے چاہئیں اور دوسرے معنی قیاسی اور تاویلی حیثیت سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔

بعض معاصر علماء نے ''اسراء'' کو روحانی قرار دیتے ہوئے لسان العرب کے پیش کردہ سندات کو اول تو مستند ہی تسلیم نہیں کیا اور بفرض تسلیم کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان ہر دو شاعروں راعی اور متنبّی کے شعر و مصرعہ سے رویا کے معنی خواب میں رویت ہی کے نکلتے ہیں نہ کہ رؤیا بصری کے مگر تعجب یہ ہے کہ دونوں باتیں محض دعویٰ پر ہی ختم ہو گئی ہیں اور دعویٰ کیلئے زحمت دلیل کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ تسلیم کر لیجئے کہ لغت عرب کے لئے متنبّی مستند نہیں ہے مگر مشہور جاہلی شاعر کس لئے غیر مستند قرار پایا جبکہ کلام عرب کی سند کیلئے جاہلی شعراء سے یادہ کوئی سند مقبول نہیں گئی، نیز راعی نے جبکہ جملہ فکبر کو للرویا کے ساتھ وابستہ کیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ رویا کہ وجہ سے اس نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور ظاہر ہے کہ نعرہ تکبیر خواب میں بلند نہیں ہوا تھا بلکہ عالم بیداری کا واقعہ تھا اسی طرح متنبّی کے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ شب وصل میں تیرے دیدار کے مقابلہ میں نیند ہیچ ہے اگر چہ یہ صحیح ہے کہ نیند خود بہت شیریں ہے مگر دیدارِ محبوب کے مقابلہ میں اس کی شیرینی بھی بے حقیقت ہے۔

اس لغوی حقیقت کے آشکارا ہو جانے کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ ارشاد جو صحیح بخاری میں مذکور ہے رؤیا عین اریھا رسول اللہ ﷺ سونے پر سہاگہ ہے کیونکہ وہ لغت عرب کے امام بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی اور انکے مقابلہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کا یہ ارشاد پیش کرنا قطعاً مرجوح ہے کہ وہ اسراء کو رؤیا بمعنی خواب مراد لیتے ہیں۔

مرجوح اسلئے ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت امیر معاویہؓ سے جو روایات اس سلسلہ میں منقول ہیں وہ بلحاظ صحت روایت وہ درجہ نہیں رکھتیں جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت کو حاصل ہے بلکہ محدثین کے نزدیک بچند وجوہ ان کی صحت غیر مستند ہے مثلاً حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت کتب حدیث کی بجائے فقط سیرت کی روایت ہے اور پھر محمد بن اسحٰقؒ اسکے متعلق یہ کہتے ہیں حدثنی بعض ال ابی بکر مجھ سے یہ روایت ابو بکرؓ کے خاندان کے ایک فرد نے بیان کی ہے'' اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ درمیان کا ایک راوی مجہول ہے جسکے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کس درجہ کا راوی ہے نیز اس روایت کے طریق میں بھی باہم اختلاف ہے اسلئے کہ بعض روایت میں ہے ما فقدت جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے رسول اللہ ﷺ کا جسد اطہر گم نہیں پایا حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ حریم نبوی میں ہجرت کے بعد داخل ہوئی ہیں اور واقعۂ معراج ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے تو حضرت عائشہؓ کا فقدت میں نے گم نہیں پایا فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

اس لئے بلا شبہ اس روایت میں جرح و نقص ہے۔

اسی طرح حضرت معاویہؓ کی روایت بھی سیرت میں منقول روایت ہے جس کو محمد بن اسحٰق نے یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس سے روایت کیا ہے اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ یعقوب نے حضرت معاویہؓ کا زمانہ نہیں پایا اس لئے یعقوب اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ضرور کوئی راوی متروک ہے جس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں ہے پس یہ روایت بھی مجروح و منقطع ہے اور بروایت ابن اسحٰق حضرت معاویہؓ کا یہ قول قال کانت رؤیا من اللہ صادقة حضرت معاویہؓ نے کہا: معراج اللہ تعالیٰ کی جانب سے سچا خواب تھا کسی طرح

بھی صحت کو نہیں پہنچتا۔

اب ایک مرتبہ پھر احادیث معراج پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ایک جانب بخاری، مسلم اور صحاح کی وہ روایات ہیں جو متن وسند کے لحاظ سے مسلم اور صحت کے اعلیٰ معیار پر قائم سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی تفصیلات واقعۂ معراج کو بجسد عنصری ظاہر کرتی ہیں اور اسی لئے جمہور صحابہؓ اسی مسلک کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور دوسری جانب محمدؒ بن اسحٰق کی سیرت میں منقول اور حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کی جانب منسوب وہ روایات ہیں جن کی صحت تک مجروح ہے اس لئے بات صرف یہی نہیں ہے کہ جو شخص سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں رویا بمعنی خواب لیتا ہے اس کا قول درست نہیں ہے بلکہ بلحاظ سند یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ رؤیا منامی کے قائل ہیں کیونکہ جن جلیل القدر محدثین ومفسرین نے اس قول کو ان بزرگوں کی جانب منسوب کیا ہے اس کا مدار محمد بن اسحٰق کی ہی یہ ہر دو روایات ہیں اور ان دونوں کی صحت کا حال ابھی روشن ہو چکا۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے بعض روایات میں واقعہ کی ابتداء اس طرح مذکور ہے بینا انا نائم یا بین النائم و الیقظان یعنی نبی اکرم ﷺ بحالت خواب تھے یا بیداری اور خواب کی درمیانی حالت میں تھے کہ خدا کا قاصد جبرئیل آیا نیز بخاری کی شریک والی روایت کے ختم پر ہے استیقظ وھو فی المسجد الحرام اور آپ ﷺ جاگ اٹھے جبکہ آپ ﷺ مسجد حرام میں تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ گذرا خواب میں گذرا۔

مگر یہ اس لئے صحیح نہیں کہ پہلے دو جملوں کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ جب معراج یا اسراء کا واقعہ پیش آنے والا تھا تو اس وقت آپ ﷺ سو رہے تھے لیکن واقعہ بحالت بیداری میں پیش آیا جیسا کہ باقی تمام روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور بقول قرطبیؒ دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ راوی اس بیداری کا ذکر کر رہا ہے جو علی الصباح نماز فجر کے لئے ہوئی یعنی اگرچہ آپ ﷺ ابتداء شب میں ام ہانی کے مکان میں سوئے تھے مگر کچھ حصہ شب میں جب معراج کا واقعہ پیش آیا اور آپ ﷺ اس سے فارغ ہو کر کرۂ ارضی پر واپس تشریف لائے تو باقی رات مسجد حرام میں سو کر گذاری اور جب آپ ﷺ صبح کو بیدار ہوئے ہیں تو لوگوں نے مسجد حرام میں آپ ﷺ کو پایا۔

علاوہ ازیں شریک کی روایت میں تعبیر ادا کی فاش غلطیاں ہو گئی ہیں جن پر محدثین نے تنبیہ فرمائی ہے مثلاً ان کی روایت کہتی ہے کہ معراج کا واقعہ بعثت سے بھی قبل پیش آیا انه جاءہ ثلثة نفر قبل ان یوحی الیه وھو نائم فی المسجد الحرام آپ ﷺ کے پاس تین فرشتے بعثت اور نزول وحی سے قبل اس حالت میں آئے کہ آپ ﷺ مسجد حرام میں سو رہے تھے چنانچہ امام نووی، خطابی، ابن حزم، عبد الحق، قاضی عیاض (رحمہم اللہ) نے شریک کی روایت پر سخت تعاقب کیا ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں:

> شریک نے اس روایت میں بہت سی غلطیاں کی ہیں جن کا علماء نے انکار کیا ہے اور مسلم نے بھی یہ الفاظ کہہ کر شریک کے اوہام پر تنبیہ کی ہے "شریک نے روایت میں مقدم ومؤخر کر دیا ہے اور کم و بیش کر دیا ہے اوہام میں سے ایک وہم یہ ہے کہ شریک کی روایت میں ہے: معراج کا واقعہ نزول وحی سے قبل پیش آیا ہے حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اور اس قول کا کوئی راوی بھی موافق نہیں ہے۔ حافظ عبد الحق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الجمع بین الصحیحین میں اس شریک والی روایت کو نقل کر کے کہا ہے کہ شریک نے اس میں بہت سی غیر معروف (نا قابل قبول) باتیں بڑھادی ہیں اور غیر معروف

الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا کیونکہ اسرا کی حدیث کو حفاظ حدیث کی ایسی جماعت نے نقل کیا ہے جو بلند پایہ اور ہر قسم کی جرح سے محفوظ اور مشہور ائمہ حدیث ہیں مثلاً ابن شہاب زہری، ثابت بنانی، قتادہ، عن انس اور ان میں سے کوئی ایک حافظ حدیث بھی ان اجزاء کو بیان نہیں کرتا جن کو شریک نے بیان کیا ہے اور شریک محدثین کے نزدیک حافظ حدیث نہیں ہے

بہر حال فتح الباری میں معراج اور اسرای کے متعلق اتحاد و تغایر کی بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ یہی فیصلہ فرماتے ہیں کہ معراج بحالت بیداری اور روح مع الجسد ہوئی ہے:

فمنهم من ذهب الى ان الاسراء والمعراج وقعافى ليلة واحدة فى اليقظة بجسد النبى ﷺ وروحه بعد المبعث والى هذا ذهب الجمهور من علماء المحدثين والفقهاء المتكلمين وتواردت عليه ظواهر اخبار الصحيحة ولا ينبغى العدول عن ذلك اذ ليس فى العقل ما يحيله حتىٰ يحتاج الىٰ تاويله۔

(فتح الباری جلد ۷ ص ۱۵۶ مطبوعہ البہیۃ المصریہ)

پس ان علماء میں سے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ بلا شبہ واقعات اسراء و معراج دونوں ایک ہی رات میں بحالت بیداری جسم اور روح کے ساتھ بعثت کے بعد پیش آئے۔ تمام محدثین، فقہاء اور متکلمین کا یہی مذہب ہے اور صحیح احادیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اور اس سے تجاوز کرنا یعنی اس کا انکار کرنا نامناسب ہے اس لئے کہ ایسا ہونا عقل کے نزدیک محال نہیں ہے کہ تاویل کرنے کی احتیاج ہو۔

اور قاضی عیاض شفاء میں یہی تحریر فرماتے ہیں:

وذهب معظم السلف والمسلمين الى ان الاسراء بالجسد فى اليقظة و هو الحق و هذا قول ابن عباس و جابر و انس و حذيفة و ابى هريرة و مالك بن صعصعة و ابى حبة البدرى و ابن مسعود و ضحاك و سعيد بن جبير و قتادة و ابن المسيب و ابن شهاب و ابن زيد والحسن و ابراهيم و مسروق و مجاهد و عكرمة وابن جريج و هو دليل قول عائشة وهو قول الطبرانى وابن حنبل و جماعة المسلمين و هو قول اكثر المتأخرين من الفقهاء والمحدثين والمتكلمين والمفسرين۔

جلیل القدر سلف صالحین اور بزرگ ترین مسلمان اس جانب ہیں کہ اسراء بجسد عنصری بیداری میں پیش آیا اور یہی مذہب حق ہے اور یہی ابن عباس، جابر حذیفہ عمر، ابوہریرہ، مالک بن صعصعہ، ابو حبہ بدری، ابن مسعودؓ اور ضحاک، سعید ابن جبیر، قتادہ، ابن مسیب، ابن شہاب، ابن زید، حسن، ابراہیم نخعی، مسروق، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج رحمہم اللہ کا قول ہے اور یہی دلیل ہے، حضرت عائشہؓ کے قول کی اور یہی طبرانی کا قول ہے اور ابن حنبلؒ کا اور مسلمانوں کی جماعت عظیم کا اور یہی قول ہے متاخرین میں سے اکثر فقہاء محدثین، متکلمین اور مفسرین کا۔

اور خفاجی نسیم الریاض میں قاضی عیاض کی اس عبارت وهو دليل قول عائشه کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ بات بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ عائشہ صدیقہؓ کی جانب جو قول منسوب ہے وہ اس کے قطعاً

خلاف ہے لیکن قاضی عیاضؒ کا یہ دعویٰ ہے کہ جلیل القدر صحابہؓ کی یہ نقول اس امر کی دلیل ہیں کہ عائشہؓ کی جانب منسوب قول صحیح نہیں ہے اور وہ بھی جمہور ہی کے ساتھ ہیں۔

الحاصل قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ بغیر کسی تاویل کے بصراحت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسراء اور معراج کا واقعہ بجسد عنصری اور بحالت بیداری پیش آیا ہے اور ان دلائل کو بطور فہرست اس طرح شمار کرایا جاسکتا ہے:

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت اسریٰ بعبدہ میں اسراء کے متبادر معنی وہی ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت لوط سے متعلق آیات میں ہیں یعنی بحالت بیداری اور بجسد عنصری رات میں لے چلنا۔

(۲) آیت وما جعلنا الرؤیا التی اریناک میں رؤیا بمعنی عینی مشاہدہ ہے نہ کہ خواب یا روحانی رویت اور لغت عرب میں رؤیا کے یہ معنی مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔

(۳) آیت الا فتنة للناس میں قرآن نے اس واقعہ کو اقرار وانکار کی شکل میں ایمان و کفر کے لئے معیار قرار دیا ہے اور اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدہ یا خواب پر بھی مشرکین و منکرین کا انکار وضحو و ممکن اور ثابت ہے لیکن اس جگہ تبادر یہی ظاہر کرتا ہے کہ واقعہ کی عظمت وفخامت کے پیش نظر منکرین کا انکار اس لئے شدید تر ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو عینی مشاہدہ کی طرح بیان فرمایا ہے۔

(۴) سورۂ النجم کی آیت ما زاغ البصر وما طغی میں رؤیت جبرئیل نہیں بلکہ واقعہ اسراء کا مشاہدہ عینی مراد ہے اور سورۃ کی آیت ما زاغ البصر وما طغی میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا قلب نے ہو بہو اس کی تصدیق کی اور واقعہ سے متعلق نہ رؤیت عینی نے کجی اختیار کی اور نہ رؤیت قلبی نے اس حقیقت کا انکار کیا بلکہ دونوں کی مطابقت نے اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

(۵) صحیح حدیث میں ہے کہ جب مشرکین نے اس واقعہ کے انکار پر یہ حجت قائم کی کہ اگر یہ صحیح ہے تو نبی اکرم ﷺ بیت المقدس کی موجودہ جزئی تفصیلات بتائیں کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ نہ انھوں نے بیت المقدس کو کبھی دیکھا ہے اور نہ بغیر دیکھے جزئی تفصیلات بنائی جاسکتی ہیں تب نبی اکرم ﷺ کے سامنے سے بیت المقدس کے درمیانی حجابات منجانب اللہ اٹھادیے گئے اور آپ ﷺ نے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہوئے مشرکین کے سوالات کے صحیح جوابات مرحمت فرمائے جن میں مسجد کی بعض تعمیری تفصیلات تک زیر بحث آئیں۔ یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مشرکین یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ ﷺ اسراء کو بحالت بیداری اور بجسد عنصری ہونا بیان فرمارہے ہیں اور نبی اکرم ﷺ نے ان کے خیال کی تردید نہیں فرمائی بلکہ اس کی تائید کے لئے معجزانہ تصدیق کا مظاہرہ فرماکر ان کو لاجواب بنادیا۔

(۶) ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بسند صحیح منقول ہے کہ قرآن میں مذکور رؤیا سے مراد رؤیا عین ہے نہ کہ خواب یا روحانی مشاہدہ

(۷) آیۃ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ میں یہ

مذکور ہے کہ واقعہ اسراءاور جہنم کے اندر سینڈھ کے درخت کا موجود ہونااور آگ میں نہ جلنا یہ دونوں واقعے اقرار و انکار کی صورت میں ایمان و کفر کے لے آزمائش ہیں پس جبکہ جہنمیوں کی غذا کیلئے ایک مادی خار دار درخت کا موجود ہونا سرسبز وشاداب رہنااور آگ سے نہ جلنا مشرکین کے انکار کا باعث ہوا بلاشبہ اسراء کے واقعہ میں بھی آزمائش کا پہلو یہی ہے کہ نبی اکرم نے کس طرح زمان و مکان کی قیود کو توڑ کر بجسد عنصری و بحالت بیداری وہ سیر کرلی جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل اور النجم میں اور صحیح احادیث میں ہے اور یقیناً مشرکین نے اس کا انکار کیا جس کے رد میں قرآن نے اس کو کہہ کر اس قدر اہمیت دی ورنہ تو انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدات اور خواب کے واقعات کا انکار تو ان کیلئے ایک عام بات تھی۔

(۸) اسراء کا واقعہ جب پیش آیا تو صحیح نبی کریم نے جن صحابہ کی محفل میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا وہ سب باتفاق یہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ بجسد عنصری بحالت بیداری پیش آیا مثلاً عمرؓ، حضرت انسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ اور اس کے برعکس ذیل کے قائلین میں حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے اسماء گرامی ہیں جن کا اسلام یا حرم نبوی سے تعلق اس واقعہ سے برسوں بعد مدینہ کی زندگی پاک سے وابستہ ہے اس لئے واقعہ کے ایام میں موجود اصحاب کا قول راجح ہے۔

(۹) حضرت عائشہ اور حضرت امیر معاویہؓ کا جو مسلک جمہور کے خلاف منقول ہے وہ بلحاظ درجہ روایت و صحت سند نہ صرف مرجوح ہے بلکہ مجروح ہے۔ اس لئے اول تو ان بزرگوں کی جانب اس قول کا انتساب ہی درست نہیں اور بالفرض صحیح بھی ہو تو جمہور کے مسلک کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے مرجوح ہے۔ وذلك تسع آيات بينات۔

والنجم اور واقعۂ معراج

واقعۂ معراج کی تفصیلات اگرچہ مستند، مشہور اور مقبول روایات واحادیث سے ثابت و منصوص ہیں لیکن خود قرآن عزیز (والنجم) میں بھی نص صریح بعض وہ تفصیلات مذکور ہیں جن کو بنی اسرائیل کے اجمال کی تفسیر کہنا چاہیے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند آیات کی تفسیر بھی بیان کر دی جائے:۔

والنجم اذا هوى O ما ضل صاحبكم وما غوى O نجم ستارہ کو کہتے ہیں والنجم کہہ کر کبھی خاص ستارہ ثریا پر بھی اطلاق کرتے ہیں اور ہوی کے معنی سقوط وغروب کے ہیں اور "والنجم" میں واؤ قسم کے لئے ہے جس سے استعمالات قرآنی میں اکثر مضمون مابعد کی اہمیت کے پیش نظر استشہاد مقصود ہوتا ہے ضل ضلالت سے ہے گمراہ ہونے اور بہک جانے کو کہتے ہیں اور غوی غوایت سے جس کے معنی بے راہ روی اور بچل جانے کے ہیں۔

پس ہر دو آیات کا مطلب یہ ہوا کہ شب دیجور کا یہ ستارے یا ثریا اس امر کی شہادت ہیں کہ جس طرح نظام شمسی میں ثریا بلکہ تمام ستارے طلوع سے غروب تک ایسے محکم اور مضبوط نظام فطرت میں منسلک ہیں کہ مقررہ وقت و معین رفتار کے ساتھ بغیر جھٹکے بچلے ہوئے جاری و ساری ہیں، ٹھیک اسی طرح روحانی نظام شمسی کے تمام ستارے (انبیاء علیہم السلام) بھی نبوت و رسالت کے مقررہ اصول و معین راہ پر جای و ساری

رہے ہیں اور کبھی خدا کے معین کردہ نظام نبوت سے نہ بھٹکے اور نہ بے راہ ہوئے تو پھر یقین کرو کہ اس نظام روحانیت (نبوت) کا آفتاب عالمتاب یعنی تمہارا رفیق محمد ﷺ بھی نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ ایسا ہونے پر سارا نظام نبوت ہی درہم برہم ہو کر رہ جاتا اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا یا یوں کہہ لیجئے کہ تمہارے سامنے جس شب کا ذکر ہو رہا ہے اس شب دیجور میں ثریا جیسے روشن ستارہ کا طلوع ہو کر غروب ہو جانا اس پورے نظام شمسی کے تغیر و فنا کی بولتی تصویر ہے پس اگر تمہارا رفیق محمد ﷺ کسی ایسے واقعہ کا اظہار کرتا ہے جو عام قانون قدرت کے پیش نظر عجیب و غریب معلوم ہوتا اور اس نظام شمسی کے ایک خاص دور انقلاب اور حیرت زا تغیر کا پتہ دیتا ہے تو تم کو یقین کرنا چاہئے کہ ایک واقعہ بلا شبہ عالم وجود میں آیا اور تمہارا رفیق اس معاملہ میں نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا بلکہ جو کچھ دیکھا اور جو کچھ نقل کیا وہ سب حرف بحرف حق مبنی بر حقیقت ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى "نطق" گویائی اور "ہوی" خواہش نفس اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى "وحی" وہ یقینی الہام جو خدا کی جانب سے نبی پر نازل ہوتا ہے اور جس کے خدا کی جانب سے ہونے میں کسی قسم کا شک و تردد نہیں ہوتا یعنی رسالت اور یہ بھی واضح رہے کہ تمہارے رفیق کی صدق مقالی کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کی باتیں کبھی بھی اپنی خواہش نفس سے نہیں کہتا بلکہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ خدا کی وحی سے ہوتا ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ○ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ○ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ○ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ○ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ○ عَلَّمَهٗ تعلیم، سکھانا، شَدِيْدُ الْقُوٰى زبردست روحانی طاقتوں والا، مِرَّةٍ زور آور، فَاسْتَوٰى، استواء، سیدھا ہو بیٹھا، بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (آسمان کا) اونچا کنارہ "دَنٰی" دنو، قریب ہونا، فَتَدَلّٰى تدلی، جھک آنا، قَابَ قَوْسَيْنِ دو کمان کی مقدار اَدْنٰی قریب یا کم۔

صاحب وحی محمد ﷺ اور وحی نازل کرنے والے (خدا) کے باہم رشتہ وحی کا اظہار کرنے کے بعد ضرورت تھی کہ ان دونوں کے درمیان جو وحی کے لئے رابطہ ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام کچھ اس کے متعلق بھی کہا جائے کیونکہ مشرکین مکہ اس کی شخصیت اور اس کے فرض کی تفصیلات سے قطعاً آشنا تھے اور یوں بھی وحی کی عظمت، صاحب وحی کی جلالت اور وحی نازل کرنیوالی ہستی کے جلال و جبروت کا تقاضا تھا کہ رابطہ وحی کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف کو بھی بیان کیا جائے اس لئے ارشاد ہوا اس پر محمد ﷺ پر جو وحی لاتا ہے وہ زبردست روحانی و جسمانی طاقتوں کا پیکر ہے وہ پیغمبر خدا ﷺ کو اپنی حقیقی ہیئت و صورت میں صاف نمایاں نظر آیا اور آپ ﷺ نے اس کو آسمان کے بلند کنارے پر دیکھا پھر وہ قریب ہو گیا، پس (پیغمبر خدا ﷺ کی جانب جھک آیا پھر ہو گیا اتنا قریب جیسا کہ دو کمان کی مسافت یا اس سے بھی قریب تر۔

فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ○ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ○ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ○ "فواد" قلب "رای" رویت بصر تمارونہ "ممارۃ" بمعنی مقابلہ کرنا، جھگڑا کرنا۔

جب صاحب وحی محمد ﷺ اور وحی کے لانے والے (جبرئیل علیہ السلام) کے درمیان صورت حال یہ پیش آئی تو اس کے بعد موحی (وحی کرنے والے خدا) نے اپنے بندے پر جو کچھ چاہا وہ براہ راست وحی فرمائی یعنی جب اس

مقام رفیع پر بلا کر جہاں کسی مخلوق کا گذر نہ ہوا اور نہ ہوگا، مخاطب کو کیا بتلایا جائے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کے درمیان کیا کچھ وحی کی سرگوشیاں ہوئیں، کیونکہ کسی کو وہ رفعت جب نصیب ہی نہیں تو وہ ان حقائق کو سمجھ ہی کیا سکتا ہے لہٰذا اسی قدر کافی ہے کہ یہ یقین کرلو کہ خدا نے جو چاہا اپنے بندہ (محمد ﷺ سے بات چیت کی اور یہ کہ اس کی آنکھ نے اس شب میں جن اسرار الٰہی کو دیکھا قلب نے اس کو جھوٹا نہیں کہا بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں چشم و قلب دونوں کے درمیان مطابقت و تصدیق کا ہی سلسلہ قائم رہا تو پھر اے مخاطبین جو کچھ اس محمد ﷺ نے دیکھا ہے کیا تم اس کے متعلق جھگڑتے ہو؟

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرٰى ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ○ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى ○ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ○

نَزْلَةً أُخْرٰى ایک قسم کا نزول یا دوسری مرتبہ سِدْرَہ بیری کا درخت سدرۃ المنتہیٰ ملاء اعلیٰ کا ایک مقام رفیع جَنَّةُ الْمَأْوٰى نیکوں کے قیام کی جنت یَغْشٰی عشیان، ڈھانپ لینا۔

حالانکہ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں اسلئے کہ اس نے وحی کرنے والے (خد) کو ایک خاص کیفیت نزول کے ساتھ دیکھا ہے اور اس وقت دیکھا جب وہ محمد ﷺ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھا جس کے قریب جنت الماویٰ ہے اور اس وقت اس سدرہ کو ڈھانپنے والی شے (یعنی فرشتوں) نے ڈھانپ رکھا تھا۔[1] یا یہ کہیے کہ اس نے جبرئیل کو دوسری مرتبہ (اصلی ہیئت میں) دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے قریب الخ پس نہ مشاہدۂ جلوۂ حق کوئی جھگڑنے کی بات ہے اور نہ رویت جبرئیل کہ جس کو اس سے قبل بھی اس نے دیکھا ہے اور چشم حق ہیں اور قلب حق آگاہ کے لئے ان میں سے ایک بات بھی قابل نزاع نہیں۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ○ لَقَدْ رَأٰى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○

"زاغ"، کجی۔ طغٰی، طغیان، سرکشی، خلاف حق رحجان۔

بہر حال اس کے مشاہدۂ حق پر کوئی جھگڑے اور انکار کرے یا تسلیم کرے اور حق جانے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے لیلۃ الاسراء میں جو کچھ بھی مشاہدات کیے اور آنکھوں سے جو کچھ بھی دیکھا اس چشم حق بین نے حقیقت حال کے خلاف نہ کسی قسم کی کجی اختیار کی اور نہ وہ راہ سے بے راہ ہوئی اور بلا شائبہ شک و شبہ اس نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔

واقعہ کی تفصیلات

وہ نشان کیا تھے جن کو اس جگہ لَقَدْ رَأٰى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى کہا: اور بنی اسرائیل میں لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا فرمایا اور اسی سورۃ میں دوسرے مقام پر وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ کہہ کر ان کی اہمیت کو روشناس کرایا تو بخاری و مسلم میں منقول صحیح، مشہور اور مقبول روایات کا مجموعی بیان یہ ہے:

[1] مشکلات القرآن ص ۳۴۰ تا ۳۶۰۔

نبی اکرم نے ایک صبح کو ارشاد فرمایا: گذشتہ شب میرے خدا نے مجھ کو اپنے خاص مجد و شرف سے نوازا جس کی تفصیل یہ ہے کہ شب گذشتہ جبکہ میں سو رہا تھا رات کے ایک حصہ میں جبرئیل آئے اور مجھ کو بیدار کیا ابھی پوری طرح جاگ بھی نہ پایا تھا کہ حرم کعبہ میں اٹھالائے اور تھوڑی دیر لیٹا تھا کہ پوری طرح بیدار کر کے اول میرا سینہ چاک کیا اور (ملاء اعلیٰ کے ساتھ مناسبت تام پیدا کرنے کے لئے عالم دنیا کی کدورتوں کو) دھویا اور ایمان و حکمت سے بھر دیا۔ اس کے بعد حرم کے دروازہ پر لایا گیا اور وہاں جبرئیل نے میری سواری کے لئے خچر سے کچھ چھوٹا جانور براق پیش کیا جو سپید رنگ کا تھا جب میں اس پر سوا ہو کر روانہ ہوا تو اس کی سبک رفتاری کا یہ عالم تھا کہ حد نگاہ اور حد رفتار یکساں نظر آتی تھی کہ اچانک بیت المقدس جا پہنچے، یہاں جبرئیل کے اشارہ پر براق کو مسجد کے دروازہ کے اس حصہ سے باندھ دیا جس سے انبیاء بنی اسرائیل مسجد اقصیٰ کی حاضری پر اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے (اور جو اس وقت تک بطور یادگار قائم تھا) پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعات پڑھیں اب یہاں سے ملاء اعلیٰ کی تیاری شروع ہوئی تو اول جبرئیل نے میرے سامنے دو پیالے پیش کیے ان میں سے ایک شراب (خمر) سے لبریز تھا اور دوسرا دودھ (لبن) سے میں نے دودھ کا پیالہ قبول کیا اور شراب کا پیالہ مسترد کر دیا، جبرئیل نے یہ دیکھ کر کہا: آپ نے دودھ کا پیالہ قبول کر کے دین فطرت کو اختیار کیا (یعنی خدا کی جانب سے جو میں نے آپ کو یہ دو پیالے پیش کیے تو در اصل یہ تمثیل تھی دین فطرت اور دین نہز یغ کی مگر آپ نے اس حقیقت کو پہچان لیا اور دودھ کا پیالہ کو قبول فرما کر جو دین فطرت کی تمثیل تھا دین فطرت کو قبول فرمالیا) اس کے بعد ملاء اعلیٰ کا سفر شروع ہوا اور جبرئیل کی ہمرکابی میں براق نے آسمان کی جانب پرواز کی جب ہم پہلے آسمان (سماء دنیا) تک پہنچ گئے جبرئیل نے نگہبان فرشتوں سے دروازہ کھولنے کو کہا نگہبان فرشتہ نے دریافت کیا، کون ہے؟ جبرئیل نے کہا: میں جبرئیل ہوں فرشتہ نے دریافت کیا تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیل نے جواب دیا: محمد فرشتہ نے کہا: کیا خدا کے مدعو ہو کر آئے ہیں؟ جبرئیل نے کہا: بے شک، فرشتہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: ایسی ہستی کا آنا مبارک ہو جب ہم اندر داخل ہوئے تو حضرت آدم سے ملاقات ہوئی جبرئیل نے میری جانب مخاطب ہو کر کہا یہ آپ کے والد (اور نسل انسانی کے مورث اعلیٰ) آدم ہیں آپ ان کو سلام کیجئے میں نے ان کو سلام کیا اور انھوں نے جواب سلام دیتے ہوئے فرمایا مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح خوش آمدید، برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی اس کے بعد دوسرے آسمان تک پہنچے اور پہلے آسمان کی طرح سوال و جواب ہو کر دروازہ میں داخل ہوئے تو وہاں یحییٰ و عیسیٰ سے ملاقات ہوئی جبرئیل نے ان کا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ سلام پر پیش قدمی فرمایئے میں نے سلام کیا اور ان دونوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی پھر تیسرے آسمان تک پہنچ کر یہی مرحلہ پیش آیا اور جب میں آسمان ثالث میں داخل ہوا تو حضرت یوسف سے ملاقات ہوئی جبرئیل نے تقدیم سلام کے لئے کہا اور میرے سلام کرنے پر یوسف نے بھی جواب سلام کے بعد یہی کلمہ خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی بعد ازاں چوتھے آسمان پر اس سوال و جواب کے ساتھ حضرت ادریس سے ملاقات ہوئی اور پانچویں آسمان پر حضرت ہارون

سے اور چھٹے آسمان پر موسیٰ سے اسی طرح ملاقات ہوئی لیکن جب میں وہاں سے روانہ ہونے لگا تو حضرت موسیٰ پر رقت طاری ہوگئی میں نے سبب دریافت کی تو فرمایا: مجھے یہ رشک ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے ایسی ہستی کو جو میرے بعد مبعوث ہوئی یہ شرف بخش دیا کہ اس کی امت میری امت کے مقابلہ میں چند در چند زیادہ جنت سے فیضیاب ہوگی۔ اس کے بعد سابق سوالات وجوابات کا مرحلہ طے ہوکر جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو حضرت ابراہیم سے ملاقات ہوئی جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور جس میں ہر روز ستر ہزار نئے فرشتے (عبادت کے لیے) داخل ہوتے ہیں انھوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا مبارک اے میرے برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی یہاں سے پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا (تمہاری بول چال میں یہ ایک انتہا کی بیری کا درخت ہے) جس کا پھل (بیر) ہجر کی ٹھلیا کی برابر ہے اور جس کے پتے ہاتھی کے کان کی طرح چوڑے ہیں۔[1] اس پر ملائکۃ اللہ جگنو کی طرح بے تعداد چمک رہے تھے اور خدا کی خاص تجلی نے اس کو حیرت زا طور پر روشن و پر کیف بنا دیا تھا۔

اسی سفر میں میں نے چار نہروں کا بھی معائنہ کیا ان میں سے دو ظاہر نظر آتی تھیں اور دو باطن میں بہہ رہی تھیں یعنی دو نہریں جن کا نام نیل اور فرات[2] ہے آسمان آسمان و دنیا پر نظر پڑیں اور دو نہریں جنت کے اوپر موجود پائیں اور ان مشاہدات کے بعد محمد کو شراب (خمر) دودھ اور شہد کے پیالے پیش کیے گئے اور میں نے دودھ کو قبول کر لیا اس پر جبرئیل نے مجھے بشارت سنائی کہ آپ نے دین فطرت کو قبول کر لیا (یعنی جو ہر قسم کی کدورتوں سے پاک اور شفاف ہے عمل میں شیریں اور خوشگوار اور نتیجہ میں حد درجہ مفید اور احسن ہے)

پھر خدائے تعالیٰ کا خطاب ہوا کہ تم پر شبانہ روز پچاس نمازیں فرض قرار دی گئیں جب میں ان اسرار الٰہی کے مشاہدات سے فارغ ہوکر نیچے اترنے لگا تو درمیان میں موسیٰ سے ملاقات ہوئی انھوں نے دریافت کیا: معراج کا کیا تحفہ لائے؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں۔ انھوں نے فرمایا: تمہاری امت اس بار گراں کو برداشت نہ کر سکے گی اس لئے واپس جایئے اور تخفیف کی التجا کیجیے کیونکہ میں تم سے قبل اپنی امت کو آزما چکا ہوں چنانچہ میں درگاہ الٰہی میں رجوع ہوا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے تخفیف ہوگئی، موسیٰ تک لوٹ کر آیا تو انھوں نے پھر اصرار

۱: سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق مختلف روایات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر ہے اور اسکی شاخیں ساتویں آسمان سے بھی نکل گئی ہیں اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں زمین پر اترتی اور زمین سے اوپر چڑھ کر وہاں تک پہنچتی ہیں گویا نزول و عروج کا مقام اتصال ہے۔ اس مقام سے آگے نبی اکرم کے علاوہ نہ جبرئیل اور دوسرے ملائکۃ اللہ کا گذر ہوا اور نہ کسی نبی مرسل کا۔

محدثین کہتے ہیں کہ یہ مقام اس درخت کی شکل میں دراصل ''ایمان وحکمۃ'' کی حقیقت کو مُشکّل ومُصوّر ظاہر کرتا ہے، اسلئے کہ ایمان نیتِ صالح اور عمل صالح کا جامع ہے۔ پس یہ درخت پھل کے ذائقہ اپنی خوشبو اور اپنے سایہ ہر سہ صفات کے لحاظ سے حقیقت ایمان کا مظہر ہے یعنی اس درخت کے پھل کا لذیذ ذائقہ نیتِ صالح کا عمدہ مظہر ہے اور عمدہ خوشبو قولِ صالح اور راحت بخش سایہ عمل صالح کا مظہر ہے اور اسی لیئے نبی اکرم نے ایمان کی تشبیہ شجر کے ساتھ دی ہے۔ ارشادِ مبارک ہے: الایمان بضع و سبعون شعبة الحدیث۔

۲: یا تو یہ مراد ہے کہ جس وقت آپ نے جنت میں دو نہریں دیکھیں تو آپ نے اسی وقت جب دنیا کی جانب نگاہ کی تو وہاں سامنے نیل اور فرات بہتی ہوئی نظر آئیں اور یا یہ ملاءِ اعلیٰ کی نہروں کے اسی طرح نام ہیں جس طرح دنیا کے دو دریا نیل اور فرات ہیں۔

کیا کہ اب بھی زیادہ ہیں اور کم کراؤ اور میں اسی طرح چند مرتبہ آتا جاتا رہا حتیٰ کی صرف پانچ نمازیں رہ گئیں مگر موسیٰ علیہ السلام مطمئن نہیں ہوئے اور فرمایا میں بنی اسرائیل کا کافی تجربہ اور ان کی اصلاح کر چکا ہوں اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ آپ کی امت یہ بھی برداشت نہ کر سکے گی۔ اس لئے تخفیف کے لئے مزید عرض کیجیے تب میں نے کہا کہ اب عرض کرتے شرم آتی ہے میں اب راضی برضا اور اس کے فیصلہ کے سامنے سر نیاز جھکاتا ہوں جب میں یہ کہہ کر چلنے لگا تو ندا آئی ہم نے اپنا فرض نافذ کر دیا اور اپنے بندوں کے لئے تخفیف کر دی یعنی مشیت الٰہی قبل ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ امت محمد پر بصورت اداء اگرچہ پانچ نمازیں فرض رہیں گی مگر ان کا اجر و ثواب پچاس ہی کی برابر ہوگا اور یہ تخفیف ہمارا افضل و کرم ہے۔

ان ہی روایات میں ہے کہ میں نے جنت و جہنم کا بھی مشاہدہ کیا اور پھر مشاہدہ کی تفصیلات بھی منقول ہیں۔

معراج میں رؤیت باری

کیا معراج میں نبی اکرم ﷺ نے ذات احدیت کے جمال جہاں آراء کا بے حجاب مشاہدہ کیا؟ صحیح روایات میں اس مسئلہ کے متعلق جو تعبیرات مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ ضرور کیا تاہم نبی اکرم ﷺ اس مشاہدہ کی کیفیت کے حقیقی اظہار سے اس لئے قاصر ہیں کہ دنیوی تعبیرات میں کوئی تعبیر ایسی موجود نہیں کہ بلند سے بلند ترین مخلوق اس کے ذریعہ جمال جہاں آراء کی کیفیت و حقیقت کو بیان کر سکے اس لئے آپ ﷺ نفس واقعہ کا اقرار فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں منقول ہے رأیتہ نوراً میں نے اس کو نور دیکھا اور مشاہدہ کے باوجود جمال جہاں آراء کی ناقابل بیان کیفیت کا پھر ان الفاظ میں اظہار بھی فرماتے جاتے ہیں نوراانّی اراہ۔ اس نور بحت کا حقیقی مشاہدہ کہاں ہو سکتا تھا۔

پس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مقابلہ میں حضرت عائشہؓ کی جانب سے رؤیت باری کی نفی میں آیت قرآنی کا یہ استدلال لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کا یعنی دیکھنے والوں کی پوری حقیقت کا ادراک کیے ہوئے ہے۔" اس لئے مرجوح ہے کہ آیت میں موجودہ دنیا کی مادی اور محدود بصارت کے مشاہدہ کا انکار ہے جو لاریب حق ہے لیکن ملاءاعلیٰ کا وہ مقام معراج جہاں زمان و مکان اور حدود قیود سے آزاد اسرار الٰہی کے مشاہدات کیلئے کسی کو نوازا گیا ہو تو اس کے مشاہدہ حقیقت کا یہ آیت کسی طرح انکار نہیں کرتی۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ سے آج تک محققین علماء کی ایک کثیر جماعت سلفاً عن خلف سورۂ النجم کی آیت فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ○ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ○ کی تفسیر میں صحیح احادیث کی استمداد سے یہ ثابت کرتی رہی ہے کہ ان مقامات میں رؤیت سے رؤیت باری مراد ہے چنانچہ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ نے سورۂ والنجم کی دقیق و لطیف اور بے بہا تفسیر میں اس حقیقت کو باحسن وجوہ بیان فرمایا ہے۔[1]

1: تفسیر کا یہ حصہ فتح الملہم شرح مسلم جلد اول لعلامہ شبیر احمد عثانی اور مشکلات القرآن لحضرۃ الشاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہ دونوں میں منقول ہے اور اپنی جگہ قابل مراجعت ہے۔

ہجرت

ہجرت لفظ ہجر سے ماخوذ ہے جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں اللہ کے لئے ترک وطن کر دینا ہجرت کہلاتا ہے۔

ہجرت حبش

اللہ کے دین پر استقامت اور کلمۂ حق کی حفاظت کی خاطر فدا کاران اسلام کو ترک وطن کی پہلی آزمائش اس وقت پیش آئی جبکہ کفار مکہ او مشرکین قریش نے ہر قسم کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کے لئے ان کے محبوب وطن (مکہ) میں دین حق پر قائم رہتے ہوئے لمحات زندگی کو ناممکن بنا دیا اور اب ترک وطن کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہ چھوڑا پس مٹھی بھر مسلمانوں پر مشرکین کے ناقابل برداشت مظالم اور مسلمانوں کے حیرت زا صبر و استقلال نے دنیاء تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا جو ''ہجرت حبش'' کے عنوان سے معنون ہے۔

حبشہ کا موجودہ فرمانروا اصحمہ[1] عیسائی تھا اور دین مسیحی کا عالم بھی اس لئے نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ سر دست حبشہ کو ہجرت کر جائیں توقع ہے کہ اصحمہ کی حکومت ان کا خیر مقدم کرے گی اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر دین حق پر قائم و مستقیم رہ سکیں گے۔

ہجرت کے اس دور کی نمایاں شخصیت حضرت عثمانؓ کی رفیقۂ حیات رسول اللہ ﷺ کی لخت جگر حضرت رقیہؓ ہیں نبی اکرم ﷺ نے اس مقدس جوڑے کو رخصت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ لوط اور ابراہیم علیہم السلام کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت کر رہا ہے۔[2] پھر آہستہ آہستہ یہ تعداد اسی تک پہنچ گئی ان مہاجرین میں نبی اکرم ﷺ کے عم زاد بھائی حضرت جعفرؓ بھی تھے یہی وہ مرد حق کوش ہیں جنہوں نے قریش کے وفد کی مہاجرین سے متعلق زہر چکانی اور مطالبۂ مراجعت کے سلسلہ میں نجاشی حبشہ کے دربار میں اسلام پر بے نظیر تقریر فرمائی اور جس کا ذکر صفحات گذشتہ میں ہو چکا ہے۔

ہجرت مدینہ کے اسباب

۱۱ نبوت موسم حج کے موقع پر الحراء اور منیٰ کے درمیان مقام عقبہ میں یثرب (مدینہ) کے چند لوگوں نے شب کی تنہائی میں نبی اکرم ﷺ کا پیغام حق سنا اور اسلام قبول کر لیا یہ چھ یا آٹھ اشخاص تھے۔ دوسرے سال چند سابق اشخاص اور بعض دوسرے حضرات نے جو تعداد میں بارہ تھے حاضر خدمت ہو کر اسلام پر تبادلۂ خیالات کیا اور

۱: حبشہ کے بادشاہ کا لقب ''نجاشی'' تھا جو ''نجوسی'' کا معرب ہے نجوسی حبشی زبان میں حکمراں کو کہتے ہیں۔

۲: مستدرک، حاکم جلد ۴ صفحہ ۴۰۔

مشرف باسلام ہوگئے ان کے اسماء گرامی بروایت محمد بن اسحق یہ ہیں: ابوامامہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ، بن عاسر، معاذ بن حرث ذکوان بن عبد قیس خالد بن مخلد، عبادہ بن صامت، عباس بن عبادہ، ابوالہیثم، عدیم بن ساعدہ۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۱۴۹)

حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ ہم نے عقبہ اولیٰ میں حسب ذیل شرائط کے ساتھ اسلام پر بیعت کی تھی:

۱) خدائے واحد کے ماسوا کسی کی پرستش نہیں کریں گے۔
۲) چوری نہیں کریں گے۔
۳) زنا نہیں کریں گے۔
۴) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔
۵) کسی پر جھوٹی تہمتیں نہیں لگائیں گے اور نہ اسکی کی غیبت کریں گے۔
۶) اور کسی بھی اچھی بات میں آپ کی (نبی اکرم) کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

بیعت کے بعد نبی اکرم نے ارشاد فرمایا اگر تم نے ان شرائط کو پورا کیا تو تمہارے لئے جنت کی بشارت ہے اور اگر تم ان برائیوں میں سے کسی کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے چاہے بخش دے اور چاہے جرم پر سزا دے۔

اس واقعہ نے مدینہ کے ہر گھر میں اسلام کا چرچا کر دیا اور آہستہ آہستہ ہر ایک خاندان میں آفتاب اسلام کی ضیاء باری ہونے لگی اور نتیجہ نکلا کہ اوس و خزرج کی تمام شاخوں میں سے ۱۳ سنہ نبوت کو تہتر مرد اور دو عورتیں اسی مقام عقبہ پر موسم حج میں شب کی تاریکی کے اندر آفتاب نبوت کی درخشانی سے فیضیاب ہونے جا پہنچے نبی اکرم بھی اپنے چچا عباسؓ کو ہمراہ لیکر وہاں پہنچ گئے اور ان کے سامنے اسلام پر ایک مؤثر وعظ فرمایا جس سے ان کے قلوب نور ایمان سے جگمگا اٹھے۔ اس کے بعد انصار اور نبی اکرم کے درمیان اس امر پر گفتگو ہوئی کہ اگر ذات اقدس مدینہ میں نزول اجلال فرمائیں تو اشاعت اسلام کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچے اور ہم کو بھی فیضیاب ہونے کا بخوبی موقع میسر آئے اور اس سلسلہ میں جانبین سے محبت و مودت کے قول و قرار بھی ہوئے جن کی تفاصیل کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان ہی حضرات میں سے نبی اکرم نے بارہ اشخاص منتخب فرما کر دعوت و تعلیم اسلام کیلئے اپنا نقیب مقرر فرمایا۔

یثرب (مدینہ) میں اسلام کی اشاعت نے جب اس طرح روز افزوں ترقی اختیار کر لی تو اب وحی الٰہی نے نبی اکرم کی زبانی جاں نثاران اسلام کو اجازت دی کہ وہ مشرکین مکہ کی ہولناک ایذار سانی سے محفوظ ہو جانے کے لئے مدینہ ہجرت کر جائیں اور خدا کے لئے ترک وطن اختیار کریں چنانچہ آہستہ آہستہ مسلمانوں نے مدینہ ہجرت شروع کر دی مشرکین مکہ نے یہ دیکھ کر مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کیلئے مظالم میں اور اضافہ کر دیا اور انسداد ہجرت کیلئے ممکن ذرائع کو اختیار کیا مگر فداکاران اسلام کا جذبۂ ہجرت فروتر نہ ہوا بلکہ وہ کثرت کے ساتھ مال، جان آبرو اور اولاد کی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اللہ کی راہ میں وطن عزیز کو خیر باد کہتے

رہے اور اکثر ایسا ہوا کہ جب اہل مکہ نے ان کے اموال اور اہل و عیال کو ساتھ لے جانے سے روک دیا تو ان مردان خدا نے صبر آزما زندگی کے ساتھ ہجرت حق کی خاطر ان کو بھی وہیں چھوڑا اور تنہا خدا کے بھروسہ پر مدینہ روانہ ہوگئے۔

ہجرت نبوی ﷺ

اب مکہ میں مشاہیر مسلمانوں میں سے صرف ابو بکر اور علیؓ ہی باقی رہ گئے تھے۔[1] اور ایک قلیل تعداد باقی مسلمانوں کی تھی تب قریش نے سوچا کہ محمد ﷺ کو قتل کر کے اسلام کو مٹا دینے کا اس سے بہتر دوسرا کوئی موقع نہیں آئے گا۔

دار الندوہ

چنانچہ تمام سرداران قریش قصی بن کلاب کے قائم کردہ گورنمنٹ ہاؤس "دار الندوہ" میں جمع ہوئے اور سرور عالم ﷺ کے قتل سے متعلق سازش مجلس مشاورت قائم کی اس مجلس میں عتبہ، شیبہ، ابو سفیان، طعیمہ بن عدی جبیر بن مطعم، حارث بن عامر، نضر بن حارث، ابوالبختری، رفعہ بن اسود، حکیم بن حزام، ابو جہل، منبہ بن الحاج، امیہ بن خلف جیسے صنادید قریش شریک مشورہ تھے۔ مشورہ شروع ہونے والا ہی تھا کہ ایک شیطان شیخ نجدی دار الندوہ کے دروازہ پر آموجود ہوا اور شرکت مجلس کا خواستگار بنا، قریش مکہ نے ہم مشرب پا کر بخوشی اجازت دی اور اب مشورہ شروع ہوا، مختلف اہل الرائے نے مختلف رائیں دیں لیکن شیخ نجدی نے ہر ایک رائے کو غلط قرار دیا آخر ایک شخص نے کہا: تمام قبائل میں سے ایک ایک جوان لیجیے اور ان سے کہیے کہ وہ بیک وقت محمد ﷺ پر حملہ کر کے قتل کر دیں اس سے کام بھی بن جائے گا اور بنو عبد مناف کسی سے قصاص لینے کی جراءت بھی نہ کر سکیں گے اور صرف خون بہا پر معاملہ طے ہو جائے گا۔ شیخ نجدی نے اس رائے کو بہت سراہا اور یہی رائے طے پا گئی۔ ادھر جبرئیل علیہ السلام نے وحی الٰہی کے ذریعہ ذات اقدس ﷺ کے سامنے اس پوری داستان کو کہہ سنایا اور عرض کیا کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ آپ آج کی شب اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا کر خود مدینہ کو ہجرت کر جایئے چنانچہ وحی الٰہی کے مطابق آپ ﷺ قریش کے نوجوانوں کی حراست کے باوجود سورۂ یٰسین کی چند آیات فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ○ پڑھتے ہوئے اور "شاهت الوجوه" فرما کر مٹھی بھر خاک ان کے سروں پر ڈالتے ہوئے صاف بچ نکل گئے اور حضرت ابو بکرؓ کے مکان پر جا کر اور وحی الٰہی کا مژدہ رفاقت سنا کر ان کو ہمراہ لئے مدینہ کو روانہ ہوگئے۔

ہجرت کا یہ واقعہ ربیع الاول ۱۳ نبوت دو شنبہ کے روز پیش آیا، یہ واقعہ اپنے خصوصی حالات اور معجزانہ اثرات کے ساتھ بہت مشہور اور صحیح احادیث و روایات میں مذکور ہے اور صدیق اکبرؓ کی سفر ہجرت میں رفاقت کی عظمت و جلالت کیلئے رہتی دنیا تک قرآن عزیز اس طرح ناطق ہے:

ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (پ۱۰ع۱۲)

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۱۷۵۔

دوسرا تھا دو کا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے کہ یہ اپنے رفیق (ابو بکرؓ) سے کہہ رہا تھا ابو بکر غم نہ کھا بلا شبہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر ابو بکرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے لا تحزن فرمایا لا تخف نہیں فرمایا۔ یہ اس لئے کہ خوف اور حزن کے لغوی فروق میں سے ایک دقیق فرق یہ بھی ہے کہ عموماً خوف اپنی مضرت کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے بخلاف حزن کے کہ وہ اس رنج کو کہتے ہیں جو اکثر دوسرے کی مصیبت کی وجہ سے خود کو پیش آتا ہے گویا قرآن عزیز نص صریح ناطق ہے اس حقیقت کے لئے کہ ابو بکرؓ کو اپنی جان اور اپنی ذات کا خوف نہیں تھا بلکہ ذات اقدس ﷺ کی گرفتاری اور مشرکین کے ہاتھوں ظلم رسانی کا حزن و ملال جانکاہی پر آمادہ کیے ہوئے تھا پس حضور ﷺ قدسی صفات نے ابو بکرؓ کی اس حالت کا اندازہ لگایا تو لا تخف کی جگہ لا تحزن ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی ان اللہ معنا فرما کر ابو بکرؓ کی رفاقت کی مقبولیت پر بھی مہر تصدیق ثبت فرما دی۔ دنیا اپنے بغض و عناد اور زندقہ والحاد سے جو چاہے کہے لیکن رسول اکرم ﷺ اور ابو بکرؓ کی معیت حقہ کے لئے قرآن جملہ کے اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا کی ناطقیت کے بقاء و دوام کو ساری کائنات بھی مل کر مٹانا چاہے تو نہیں مٹا سکتی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔

قرآن عزیز اور ہجرت مدینہ

واقعہ، معراج میں گذر چکا ہے کہ در حقیقت اسراء تمہید تھی ہجرت کے عظیم الشان واقعہ کی یعنی واقعہ اسراء کے عجائبات اس امر کی تمہید تھے کہ اب آپ ﷺ کی تبلیغی زندگی کا دور ایک دوسرا رخ اختیار کرنے والا ہے جو کامرانیوں اور کامیابیوں سے بھرپور ہے اس لئے از بس ضروری ہے کہ پہلے آپ قبلتین اور ملاء اعلیٰ کے اسرار و غوامض سے آگاہ کر دیا جائے کہ مکی زندگی جب مدنی حیات میں منقلب ہو تو اس سے قبل نبوت رسالت کے کمالات غایت قصویٰ تک پہنچ چکے ہوں اور آپ کا منصب ہدایت اس مقام رفیع تک جا پہنچا ہو، جہاں خدا کی بلند سے بلند ترین مخلوق کا بھی گذر نہ ہوا ہو تا کہ آپ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا کے شرف کا حاصل کر سکیں۔

پس سورۂ بنی اسرائیل از ابتداء تا انتہاء ہجرت مدینہ کے ہی اسرار و لطائف سے معمور ہے چنانچہ ابتدائی آیات میں اسراء کا بیان ہے اور پھر ذکر آ گیا ہے رشد و ہدایت کے اصول کا اور درمیان میں امم سابقہ اور ان کے ہداۃ انبیاء و رسل کے واقعات تبلیغی کا تذکرہ شواہد و نظائر بن کر سامنے آ جاتا ہے اور اس ضمن میں معراج کے حکم و اسرار کا بھی ذکر ہوتا جاتا ہے اور اس کے بعد رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ ...... الآیة سے مکہ سے خروج اور مدینہ کی ہجرت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور یہ ذکر آخر سورۃ تک جاری رہتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت قتادہؒ نے مسطورۂ ذیل ہر دو آیات کے سلسلہ مضامین کو ہجرت مدینہ سے ہی وابستہ قرار دیا ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلَافَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ (اسریٰ- ع ۸)

اور قریب تھا کہ وہ (مشرکین) البتہ تجھ کو عاجز کر دیتے سرزمین (مکہ) سے تاکہ تجھ کو اس سے نکال دیں اور ایسی حالت میں ان کی ہلاکت بہت قلیل عرصہ میں سامنے آجاتی۔

یہ مشرکین کے حق میں سخت قسم کی تہدید و تخویف ہے کہ جب بھی تمہارے مظالم کی بدولت نبی اکرم ﷺ کو ہجرت مدینہ پیش آئے گی تمہاری اجتماعی زندگی کی ہلاکت قریب سے قریب تر ہو جائے گویا ہجرت مدینہ اسلام کی روز افزوں ترقی اور معاندین اسلام کی موت و ہلاکت کے لئے تقدیر مبرم ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيْرًا ○ (پ ۱۵-ع ۹)

اور کہیے! اے میرے پروردگار مجھ کو داخل کر (مدینہ) میں اچھا داخلہ اور نکال مجھ کو (مکہ) سے عزت کے ساتھ اور میرے لئے اپنی جانب سے زبردست نصرت و مدد عطا کر۔

اسی طرح سورۂ انفال میں بعض واقعات کے ضمن میں ہجرت مدینہ کا تذکرہ موجود ہے:

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ أَوْ يَقْتُلُوْكَ أَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ○

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب منکرین تیرے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ تجھ کو قید کر لیں یا مار ڈالیں یا (مکہ سے نکال دیں اور اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے خدا (اس کے خلاف تدبیر کر چکا تھا اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں سب سے بہتر مدبر ہے۔ (پ ۹-۱۸)

اور اسی طرح سورۂ توبہ میں صدیق اکبرؓ کی عظمت و جلالت قدر کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ہجرت مدینہ کا ذکر اس طرح موجود ہے:

إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ط وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اس کی اللہ تعالیٰ نے اس وقت مدد فرمائی جب اس کو منکرین نے (مکہ سے) نکالا جبکہ وہ دونوں (محمد ﷺ) اور ابو بکرؓ غار میں (حراء میں روپوش) تھے جب وہ (رسول اپنے رفیق (ابو بکرؓ سے) کہہ رہا تھا تو غم نہ کھا بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے پس اللہ نے اس پر اپنا سکینہ (طمانیت) اتار اور اس کو ایسے لشکر کے ذریعہ قوت پہنچائی کہ تم اس کو نہیں دیکھ رہے تھے اور (اس طرح) خدا نے کافروں کا کلمہ پست کر دیا اور اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہے اور بلاشبہ اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ (پ ۱۰-ع ۱۲)

اسلام میں ''ہجرت'' ایک اہم فریضہ ہے کون نہیں جانتا کہ انسان کے لیے وطن، مال اور اہل و عیال کس درجہ عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان ہی متاع گرانمایہ پر اپنی دنیوی عیش و راحت اور بقاء حیات کا مدار سمجھتا ہے لیکن اس کی انسانیت اور انسانیت کا ارتقاء ان تمام مقاصد حیات سے بھی ایک بلند اور رفیع مقصد زندگی کا طالب ہے اور وہ خالق کائنات اور رب العالمین کی معرفت ہے جس کی ربوبیت نے اس کو یہ جامۂ ہستی عطا کیا اسی معرفت کا نام دین اور ملت ہے انسان جب اس مقصد حقیقی کو پالیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں اس درجہ وسعت اور رفعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ان تمام رنگینیوں اور نیز رنگیوں کا دامن وسیع بھی اس کو تنگ نظر آتا اور وہ اس تنگ دامنی سے عاجز ہو کر آخر کار حایت روحانی کی آغوش میں ہی تسکین پاتا ہے اور جب اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس حیات باقی دین حق کی خاطر وہ دنیا کی تمام متاع گرانمایہ تن، من، دھن، حتیٰ کہ اہل و عیال کو بھی تج دیتا ہے اور اس دربے بہا کو آنچ تک نہیں آنے دیتا جس کا نام ایمان ہے اسی حقیقت حال کو اسلام کی مقدس اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے۔

اسی بناء پر ہجرت ایک صادق الایمان اور مخلص مسلمان کے منافق اور کافر ہستی کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کیلئے بہترین کسوٹی اور معیار ہے نیز فضاء روحانی کا ٹمپریچر معلوم کرنے کے لئے جہاد اور ہجرت ہی ایسے دو مقیاس الحرارت ہیں جن سے مومنوں کے ایمان کی حرارت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن عزیز نے ''ہجرت'' کی اہمیت پر جگہ جگہ توجہ دلائی ہے اور اس کو ایمان واسلام کی کسوٹی قرار دیا ہے جس کے لئے یہ مقامات خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں:

$\frac{٢١٨}{٢}$، $\frac{١٩٤}{٣}$، $\frac{٧٤}{٨}$، $\frac{٢٠}{٩}$، $\frac{١١١}{١٦}$، $\frac{٥٨}{٢٣}$، $\frac{١٠٠}{٤}$، $\frac{٤١}{١٦}$، $\frac{٩٧}{٤}$

ابتداء اسلام میں مکہ دارالکفر اور دارالحرب تھا اس لئے وہاں سے مدینہ کو ہجرت کر جانا اسلام کے اہم ترین فرائض میں سے تھا تاکہ مسلمان مدینہ میں امن و عافیت کے ساتھ احکام اسلام کی پیروی کر سکیں اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اسلام کے مقصد عظمیٰ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یا دوسرے الفاظ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی صحیح خدمت انجام دے سکیں مگر جب ۸ ہجری میں فتح مبین نے مکہ کی اس حالت کو بدل کر دارالاسلام بنادیا تو اب ہجرت کا یہ خاص فرض ختم ہو گیا اور زبان وحی ترجمان نے لا ھجرۃ بعد الفتح [1] فرما کر اس حقیقت کا اعلان کر دیا البتہ اب بھی مرکز توحید کے ساتھ والہانہ عشق و محبت کے جذبہ میں مکہ اور مدینہ ہجرت کر کے جانا اجر و ثواب کا ضرور استحقاق پیدا کرتا ہے۔

اور اگر کسی مقام اور کسی ملک میں بھی مسلمانوں کے لئے حیات ایمانی کے پیش نظر وہی صورت حال پیدا ہو جائے جو اسلام کے ابتدائی دور (مکی دور) میں تھی تو اس وقت مسلمانوں کے لئے وہی احکام عائد ہو جائیں

---

[1] فتح مکہ کے بعد مدینہ کی ہجرت فرض نہیں رہی۔

گے جو مکی دور کے متعلق قرآن وحدیث اوران سے مستنبط فقہ اسلامی میں پائے جاتے ہیں اور اصولی طور پر اس وقت صرف دو ہی اسلامی مطالبے سامنے آجائیں گے یا جہاد فی سبیل اللہ[1] کے ذریعہ اس حالت کا انقلاب اور یا پھر ہجرت اور کسی طرح بھی یہ جائز نہیں ہوگا کہ حالت راہنہ (موجودہ حالت) پر قناعت کر کے مطمئن زندگی بسر کی جائے۔

مکہ جب دارالکفر اور دارالحرب تھا تو اس وقت ہجرت مدینہ کو اسلام نے کس درجہ اہمیت دی اور مقصد رفیع کیلئے مسلمانوں سے کس درجہ قربانی اور ایثار نفس کا مطالبہ کیا آیات ذیل سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَأُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقَاتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (آل عمران پ ٤ ع ١١)

جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور میری راہ میں لڑے اور مارے گئے میں ضرور ان کے گناہ ان سے دور کردوں گا اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں، یہ بدلہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ ۝ (انفال پ ١٠)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا اللہ کے نزدیک بہت بلند رہنے والے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَآئِكَةُ ظَالِمِيْٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ط قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْأَرْضِ ط قَالُوْٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ط فَأُولٰٓئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ فَأُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝ (پ ٥ ع ١١)

بے شک جن کو فرشتوں نے ایسی حالت میں موت سے دوچار کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے ان سے (فرشتوں نے) پوچھا کہ تم کس حالت میں تھے انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور تھے فرشتوں نے کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے سو یہی ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری

1: البتہ جہاد فی سبیل اللہ کے طریق واسباب پر وقت کے تقاضے کے پیش نظر ہی عمل واجب ہوگا۔

جگہ ہے مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں اور بچے جو ہجرت کے لئے کوئی حیلہ نہیں کر سکتے اور نہ (ہجرت کیلئے) راہ پاتے ہیں تو یہ وہ ہیں کہ امید ہے اللہ تعالیٰ ان کو معاف کر دے اور اللہ بے شبہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

ختم نبوت

نبوت و رسالات کا یہ سلسلہ جو حضرت آدم سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰ تک پہنچا تھا رشد و ہدایت کے اسلوب و نہج کے لحاظ سے اس معنی میں یکسانیت رکھتا ہے کہ اس تمام سلسلہ میں نبوت و رسالت جغرافیائی حدود میں محدود رہی ہے اور اس لئے مختلف زبانوں میں ایک ہی وقت میں متعدد انبیاء علیہم السلام کی بعثت فرائض رسالت ادا کرتی رہی ہے حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ کے پیغام حق نے اگرچہ ایک گونہ وسعت اختیار کی اور بنی اسرائیل کی گم کردہ راہ بھیڑوں کے علاوہ بھی بعض حلقۂ انسانی اس دعوت کی مخاطب بنی تاہم انھوں نے عالمگیر دعوت و پیغام کا دعویٰ نہیں کیا اور انجیل شاہد ہے کہ خود ذات قدسی نے بصراحت کہہ دیا کہ ان کی بعثت کا تخاطب محدود ہے۔

لیکن یہ سلسلہ آخر تک اسی طرح محدود رہ سکتا تھا اور جو حلقۂ دعوت وارشاد آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا جارہا تھا وہ قانون قدرت کے عام اصول کے خلاف کس طرح ہمیشہ کے لئے محصور رہ سکتا تھا۔

البتہ انتظار تھا تو اس کا کہ وہ وقت قریب آجائے جبکہ دنیا کی وسیع پہنائیوں اور عالمگیر وسعتوں کے درمیان ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ نہ ایک کے مفاد و مضار دوسرے حصوں سے اوجھل ہو سکیں اور نہ بیگانہ و بے تعلق رہ سکیں بلکہ خدا کی یہ وسیع کائنات مادی اسباب کی ہمہ گیری کی بدولت ایک "کنبہ" بن جائے اور انسان کبیر (عالم) کے تمام جوارح (ممالک و امصار) ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جائیں کہ ایک کا نفع و ضر دوسروں کے نفع و ضر پر اثر انداز ہونے لگے بلکہ قانون فطرت اپنا مظاہرہ کرے اور مادی دنیا کی ہمہ گیر ہم آہنگی کے رونما ہونے سے قبل روحانی پیغام سعادت کو عالمگیر وسعت اور ہمہ گیر عظمت عطا فرمائے۔ چنانچہ عالم اسباب میں فطرت کے عام قانون کی طرح رشد و ہدایت کا جو آغاز پہلے انسان کے ذریعہ ہوا تھا اس کا انجام اس مقدس ہستی تک پہنچ کر کامل و مکمل ہو گیا جس کا نام محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا۔

مسئلہ کے اس پہلو کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں دو زندگیاں توام اور ہم رشتہ نظر آتی ہیں ایک مادی اور دوسری روحانی خدائے برتر کی ربوبیت کاملہ نے عالم کی ان ہر دو حیات کی راہ گذر کیلئے روشنی کا بھی انتظام کیا ہے تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر زندگی کی ٹھوکروں، لغزشوں اور تاریک راہوں سے محفوظ رہا جاسکے چنانچہ اسی مقصد کیلئے اس نے مادی دنیا کے لئے آگ کا درخت لگایا ○

○ چقماق میں آگ پیدا کی اور تیل کو ذریعہ بنا کر دیے کو روشنی بخشی

○ مگر اس روشنی کو آغاز بھی بخشا اور انجام بھی اور فطری اور

مصنوعی دونوں طریقوں سے اس کی ابتداء کو انتہا تک پہنچا کر کامل و مکمل کر دیا کہ اس کے بعد نہ روشنی کی طلب باقی رہے نہ انتظار۔

غرض جو روشنی صنعت کے ہاتھوں دیے کی شکل میں نمود پذیر ہوئی اور شمع کافوری لالٹین روشن گیس اور بجلی کے قمقموں کی شکل میں ترقی کرتی رہی اور جو روشنی براہ راست فطرت کے ہاتھوں چھوٹے سے ستارہ کی صورت میں چمکی اور بڑے بڑے روشن ستاروں اور بدر و قمر کی شکل میں روبہ ترقی نظر آتی رہی وہ آخر کار ایک ایسی روشنی پر جا کر رک گئی جس کے بعد کسی روشنی کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اور طلب و انتظار کی تمام فرصتیں اس روشنی پر جا کر ختم ہو گئیں دنیا نے جس کو آفتاب کہہ کر پکارا۔

اسی طرح اس کی رحمت عام اور ربوبیت کامل نے روحانی روشنی کا آغاز پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ کیا اور مادی دنیا کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ اس کو نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ جیسے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ روحانی ستارے اور قمر و بدر بنا کر وسعت عطا فرمائی اور آہستہ آہستہ ترقی دیکر اس درجہ پر پہنچا دیا کہ مناسب وقت آنے پر وہ روشنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رشد و ہدایت کی شکل میں آفتاب روحانیت بن کر سارے عالم پر چھا گئی۔

یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن عزیز نے سورۂ قمر میں مادی آفتاب کیلئے "سراج" کی تشبیہ دے کر اس کی عالمگیر درخشانی کا ذکر فرمایا تو سورۂ احزاب میں روحانی آفتاب محمد کو سِرَاجًا مُّنِيرًا کہہ کر دونوں آفتاب ہائے درخشاں کی ہم آہنگی کا اعلان فرمایا اور مادی و روحانی ہر دو فتاب عالمتاب کو سراج (چراغ) سے تشبیہ دے کر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ گو یہ روشنیاں اپنی ہمہ گیر وسعت کے لحاظ سے آفتاب کہلانے کی مستحق ہیں تاہم یہ بات کسی طرح فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ یہ انجام اصل کے اعتبار سے اسی آغاز کا کامل و مکمل نمونہ ہے جس کی ابتدائی نمود روحانی اور مادی دیئے (سراج) سے ہوئی اور روحانی وسعت و عظمت کے لحاظ سے بعض کو بعض پر اور ایک کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہوئی مگر اصل اور بنیاد کے پیش نظر سب کی نہاد ایک ہی روشنی وحی الٰہی سے وابستہ و پیوستہ ہے۔

الانبیاء اخوۃ من علات

امھاتھم شتی و دینھم واحد

ان ہر دو حقائق کے پیش نظر لانے کے بعد یہ حقیقت بھی لائق توجہ ہے کہ فطرت ہم کو روز و شب یہ تماشا دکھا رہی ہے کہ اس کارزار حیات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ زیر و بم، نشیب و فراز، عروج و زوال و کمال کے دائرہ میں محدود و محصور ہے یعنی جب کسی امر کے متعلق کہا جائے کہ یہ عروج و کمال کو پہنچ رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اب سے قبل اس میں جو کمی تھی وہ پوری ہو رہی ہے اور اسی طرح جب یہ سنا جاتا ہے کہ فلاں شے ابھی ابتدائی درجہ میں ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس کو ابھی بحد کمال پہنچنا ہے۔

غرض آغاز اور انجام، ابتداء اور انتہا ان ہی دو نقطوں سے کارزار ہستی کا دائرہ بنتا ہے اور یہی دونوں زوال و عروج، نقص و کمال اور نشیب و فراز کی پرکار بناتے ہیں۔ پس آدم علیہ السلام نبوت کا آغاز تھے اور محمد ﷺ اس کا

آخری انجام۔

پس جو شخص بھی دلیل یا وجدان کی ہدایت سے یہ تسلیم کرتا ہے کہ کائنات ہست و بود سب کچھ اسی کی مخلوق ہے تو گویا وہ یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ سب نہ ازلی ہیں نہ ابدی بلکہ ان کیلئے آغاز بھی اور اس لئے انسانی تخلیق کو بھی روپ اختیار کیا بہر حال پہلا انسان اپنے ساتھ ہی مادی و روحانی ہدایت لے کر آیا اور یہی وہ آغاز تھا جس کو ادیان سماوی نے نبوت آدم کے نام سے یاد کیا ہے اور جس کا سلسلہ برابر اس دنیا میں قائم رہا تا آنکہ محمد کا ظہور ہوا اور ذات قدسی صفات نے بعثتِ عام کا اعلان فرمایا۔

تو اب اس روحانی رشد و ہدایت یا پیغام الٰہی کے نشر و ارتقاء کیلئے اگر ذات اقدس محمد کے ساتھ ختم نبوت کو وابستہ نہ سمجھا جائے تب تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہی وقوع پذیر تسلیم کی جا سکتی ہے ایک یہ کہ سلسلہ نبوت و رسالت نبی اکرم پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس سے آگے ترقی و تکمیل کی راہ پر گامزن ہے یہاں تک کہ اس حد کمال تک پہنچ جائے جس کے بعد کسی تکمیل کی حاجت باقی نہ رہے دوسری صورت یہ کہ اس سلسلہ کے آغاز نے جو ترقی کی راہ اختیار کی ہے وہ تنزل کی جانب مائل ہو جائے اور یہ پیغام کسی طرح بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے تیسری شکل یہ ہے کہ جو سلسلہ ایک خاص حیثیت میں رو بہ ترقی ہے وہ جب حد تکمیل کو پہنچ جائے تو پھر کمال صورت زوال اختیار کر لے یا یوں کہہ دیجئے کہ حد کمال آغاز کی جانب لوٹ جائے اور تحصیل حاصل کا نمونہ پیش کر دے۔

لیکن آخری دو شکلیں غیر معقول بلکہ فطری تقاضہ کے خلاف ہیں پہلی صورت تو اس لئے کہ اس سے خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ اور صفت رحمت و قدرت کا نقص لازم آتا ہے کہ جس مقصد سے اس نے ایک آغاز کیا تھا اسی مرضی و مشیت کے باوجود اس کو درجہ تکمیل نہ دے سکا،

اور اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو گویا یہ مان لینا ہو گا کہ کائنات ہست و بود میں نقص، نشیب، زوال، اور ابتداء کے علاوہ کمال، فراز، عروج اور انتہاء کا وجود ہی نہیں ہے گویا دو کان فطرت میں عیب کے سوا ہنر کا کوئی سودا موجود ہی نہیں اسی طرح دوسری شکل اس لئے جب کہ تکمیل ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے بعد اس سلسلہ کی نہ ضرورت باقی رہے نہ طلب تو پھر رشد و ہدایت اور پیغام حق جیسی روشن شے کے پایہ تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد اس کو ابتداء سے پھر دہرانا بے معنی بات ہے اور تحصیل حاصل نہ عقل کا ہے نہ حکمت و دانائی کا چہ جائے کہ ایسے فعل کی نسبت اس ذات کی جانب ہو جس کیلئے کہا گیا ہے:

پس اگر مؤخر الذکر دونوں صورتیں غیر معقول اور ناقابل توجہ ہیں تو اب پہلی شکل ہی لائق غور رہ جاتی ہے مگر جب اس کی تحلیل کی جائے تو یہ سوال خود بخود سامنے آ جاتا ہے کہ جب کہ تاریخ ادیان و ملل نے بلکہ واقعات و حقائق نے یہ ثابت کر دیا اور روشن دلائل و براہین سے ثابت کر دیا کہ قرآن عزیز ایک ایسا روحانی قانون، دستور، آئین اور پیغام رشد و ہدایت ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے تمام سابقہ ادیان اور موجودہ مدعیان وحی والہام عاجز و درماندہ رہے ہیں اور ہیں تو پھر علم و عقل اور حکمت و دانش کا وہ کون سا تقاضا ہے جس کے پیش نظر،

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

کا انکار کیا جا سکے اور جو تکمیل کہ محمد ﷺ کے ذریعہ ہو چکی اس کو جھٹلا کر اور تاریخ ادیان کی صاف اور صادق شہادت کا منکر بن کر اس سلسلہ کی آخری کڑی نبی منتظر کے لئے چشم براہ ہوا جا سکے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن عزیز نے،

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ

کہہ کر روشن کیا ہے اور جس کی شہادت خود ذات قدسی صفات نے یہ کہہ کر دی ہے:

قال رسول اللّٰه ﷺ مثلی و مثل النّبیین کمثل رجل بنٰی داراً فاتمھا الا لبنة واحدة فجئت انا فاتممت تلك اللبنة۔ (مسلم)

میری اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے مکان بنایا اور اس کو مکمل کر لیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی پس میں قصر نبوت کی وہی اینٹ ہوں جس نے آ کر اس قصر کی تکمیل کر دی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کو مان لینے میں کیا حرج ہے کہ قصر نبوت کی تکمیل آپ ﷺ ہی کی ذات سے ہوئی لیکن پھر آپ ﷺ کے کمال نبوت کے مختلف اطوار و احوال میں سے یہ امتیازی شان بھی منصۂ شہود پر آئی کہ جو شخص بھی جدید نبی یا رسول بنے اس کا انتساب آپ ﷺ ہی کے فیض نبوت کے ساتھ وابستہ ہو یعنی آئندہ بھی نبی اور رسول آتے رہیں مگر وہ مستقل نہوں بلکہ آپ ﷺ کے ماتحت اور قرآن ہی کے زیر نگیں ہوں لیکن یہ کہنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ جو بات کہی گئی اس کو خواہ کسی خوبصورت سے خوبصورت عنوان سے کہیے سب کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کے بعد نبی اور رسول کی احتیاج باقی ہے اور اس کے بغیر دین الٰہی اور پیغام ربانی تشنہ تکمیل ہے ورنہ تو تکمیل نبوت کے بعد نبی اور رسول کی جگہ خاتم النّبیین کے صرف نائب اور جانشین ہونے چاہئیں تاکہ ان کے ذریعہ پیغام کامل اور ہدایت تام کی یاد دہانی ہوتی رہے اور یہی وہ نیابت و وراثت ہے جس کا حق خدمت علماء امت، ”علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل“ اور ”العلماء ورثة الانبیاء“ کے مصداق بن کر ادا کرتے چلے آئے ہیں اور تاقیام حشر کرتے رہیں گے۔

اس اہم مسئلہ کی وضاحت یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ کتاب کائنات کے وہ صفحات جن پر مذاہب و ملل کی تاریخ ثبت ہے شاہد ہیں کہ اقطاع عالم کے درمیان رسل و رسائل اور دیگر وسائل کے مفقود ہونے کی وجہ سے جبکہ فطرت نے رشد و ہدایت کے پیغام کو عرصۂ مدید تک جغرافیائی حدود میں محدود رکھا اور اس لیے، ایک ہی دور میں متعدد مقامات پر متعدد انبیاء و رسل کا ظہور ہوتا رہا اور پھر جب کائنات پر وہ زمانہ پر تو ڈالنے لگا جس کے قریبی عرصہ میں ساری کائنات کے باہم روابط نے ہم آہنگی اور تعارف کی بنیاد ڈال دی اور فطری تقاضہ کی بناء پر روحانی پیغام نے بھی بعثت خاص کی جگہ بعثت عام کی شکل اختیار کر لی اور ایک ایسا پیغام آ گیا جو تمام عالم کے لئے یکساں طور پر بہ یک وقت رشد و ہدایت کا آفتاب بن کر درخشاں ہے تو اس کے بعد یا تو یہ ہونا چاہیے کہ وہی پیغام رہتی دنیا تک کے لئے رشد و ہدایت کا پیغام بنے اور جس پیغمبر کی معرفت وہ پیغام آیا ہے اس کی

ذات اقدس کو اس پیغام کا مکمل و متمم مان کر خاتم الانبیاء والرسل کیا جائے ورنہ غور کیا جائے کہ محدود پیغام و دعوت حق کے بعد جب بعثت عام نے ساری کائنات کی راہنمائی کا فرض انجام دیدیا تو اس کے بعد ضرورت و طلب کا کون سا عنوان باقی رہا جس کا حاصل عروج سے انحطاط کی شکل میں ظاہر ہو اور یا بعثت عام کی تحصیل حاصل کی غیر معقولیت، معقولیت کی شکل اختیار کرے اور آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ کی بشارت کو بے حقیقت بنا دیا جائے۔

ذات قدس محمد ﷺ کی بعثت عام کے بعد ایسی حیثیت سے اس سلسلہ کا اجراء تحصیل حاصل اور غیر معقول اسلئے ہے کہ فطرت کے مادی اور روحانی تقاضہ کے خلاف اگر قدرت حق کو یہ منظور تھا کہ پیغام و دعوت اور نظام رشد و ہدایت تدریجی طور پر ترقی پذیر نہ ہو اور مادی دنیا کے محدود حالات سے بے نیاز ہو کر انجام پائے تو بلاشبہ آغاز ہی میں وحی الٰہی بعثت عام کی شکل اختیار کرتی اور پھر رہتی دنیا تک وہی بروئے کار ہوتی اور یا اس کا سلسلہ کسی تکمیل کا محتاج نہ ہو کر رہتی دنیا تک تجدید کی شکل میں جاری رہتا۔

مگر واقعات اور مشاہدات اسکے خلاف ہیں اور اول محدود پیغامات کا سلسلہ اور ان کے درمیان ترقی پذیر وسعت کا دائرہ اور پھر دعوت عام کی شکل میں اس ترقی کی انتہا یہ پوری تدریجی کیفیت صاف بتلا رہی ہے کہ فطرت الٰہی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دوسرے امور کی طرح رشد و ہدایت الٰہی کا یہ پیغام بھی آغاز کی نمود کے ساتھ آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا رہے تا آنکہ وہ وقت آجائے کہ یہ وسعت عالمگیر دعوت بن کر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور یہ سلسلہ اس حد پر پہنچ کر ختم ہو جائے اور آئندہ نبی و رسول کی جگہ نائبین رسول "علماء" تاقیام ساعت اس مکمل قانون دعوت کی روشنی میں تبلیغ حق کا فرض انجام دیتے رہیں تاکہ ایک جانب وحدت امت کا وہ نظام جو بعثت عام اور دعوت عام سے وابستہ ہو چکا ہے پارہ پارہ نہ ہو سکے اور دوسری جانب حیات عالم کے ساتھ ساتھ اس پیغام حق کا فرض بھی مسلسل ادا ہوتا رہا ہے اور اس طرح خدائے برتر کا یہ اعلان تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ جدید نبی منتظر اور رسول مطلوب کے نظریہ کی شکل میں بے روح ہو کر نہ رہ جائے۔

سطور بالا میں انبیاء علیہم السلام کے پیغام حق کی وحدت کا تذکرہ آچکا ہے مسئلہ ختم نبوت کے ساتھ اس کا بہت گہرا تعلق ہے اور اس سلسلہ کی دلیل روشن کے لئے تمہید و توطیہ بننے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم اس خاکدانِ ہستی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے کہ ہر کثرت کیلئے کوئی نقطہ وحدت ضرور ہے چنانچہ افراد کے لئے نوع انواع کیلئے جنس اجناس کیلئے جوہر، جواہر کیلئے وجود اور وجودات کیلئے وجود بحت (خالص) محور مرکز ہے اسی طرح اجسام کیلئے سطح سطحات کیلئے خط اور خطوط کیلئے نقطہ مرکز و مدار ہے نیز اعداد خواہ اپنی کثرت میں کسی حد تک کیوں نہ پہنچ جائیں ان کا محور و مرکز ہر حالت میں اکائی ہے۔

غرض جب بھی کسی کثرت کا تصور کیجئے اس کے ساتھ وحدت کا تصور لازم و ضروری ہے اور اگر وحدت کو پیش نظر لائیے تو وہ کسی نہ کسی کثرت کیلئے محور و مرکز ہونے کا ضرور پتہ دیتی ہے پس وحدت و کثرت کا یہی رابطہ

ہے جس نے حدودِ عام سے گذر کر ہست کے ساتھ تعلق پیدا کیا اور اس کو عالم ہست و بود کا نام دیا۔

تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر جب ہم سلسلہ نبوت و رسالت پر نظر ڈالتے ہیں اور سبع سماوات کی طرح سطح عالم پر مختلف ادوار میں ہزاروں سیار گان رشد و ہدایت کو ضوفشاں پاتے ہیں تب مسطورہ بالا حقیقت کی بنیاد پر فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اس کثرت کا بھی کوئی نقطۂ وحدت ضرور ہونا چاہیے جو کثرت کے لئے محور مرکز بن سکے اور جس طرح اکائی کے بعد کثرت کے لئے کوئی اور مبدء و منتہا نہیں ہے اسی طرح انبیاء و رسل کے سلسلۂ کثرت کیلئے بھی ایک ہی مبدء و منتہاء ہونا از بس ضروری ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو ختم نبوت کے نام سے موسوم ہے اور اسی کو قرآن حکیم نے اس جوہر حکمت کے ساتھ ادا کیا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

محمد (ﷺ) مردوں میں سے کسی کے صلبی باپ نہیں ہیں تاہم وہ خدا کے پیغمبر او آخر الانبیاء ہیں۔

نبوت "نبا" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "خبر دینا" ہے اور رسالت کے معنی "پیغام" ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں نبوت و رسالت خدا کی جانب سے ایک منصب ہے جو مخلوق کی رشد و ہدایت کیلئے کسی مخصوص انسان کو عطا ہوتا ہے اور اس کے لائے ہوئے پیغام کو وحی کہتے ہیں کیونکہ یہ پیغام در حقیقت پیغامبر کا اپنا کلام نہیں ہوتا بلکہ خدائے برتر کا فرمان ہوتا ہے جس میں خطاء و قصور یا سہو و نسیان کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔

لَا يَأْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ط تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ○

اس (وحی الٰہی) کے سامنے اور نہ اس کے پیچھے سے باطل کا گذر بھی نہیں ہوتا یہ تو اتارنا ہے حکمت والے ہر طرح قابل ستائش والے کی جاب سے (یعنی خدا کی جانب سے)

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب خدائے برحق کسی شخصیت کو نبوت و رسالت یعنی پیغام حق سے سرفراز کر دیتا ہے تو تمام انسانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک خدا کے فرمان وحی الٰہی کے سامنے بے چوں چرا سر تسلیم خم کر دیں۔ وہ شخصیت کی صداقت اور خدا کی جانب اس کے دعویٰ وحی کی حقانیت کا تو ہر حیثیت سے حق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کے دونوں دعووں کی تصدیق و تائید عقل کی راہ سے دلائل و براہین کے ساتھ ہو جائے اور کسوٹی پر اس کی صداقت بے لوث اور صاف روشن ہو جائے تب اس کے دیئے ہوئے پیغام خدا کو ماننے نہ ماننے میں وہ آزاد نہیں رہ سکتے اور بلا شبہ اس کے پیغام کو پیغام حق سمجھ کر قبول کر لینا اور اس کے سامنے سر نیاز جھکا دینا فرض اولین ہے ہاں چونکہ وہ پیغام کسی بڑے سے بڑے عاقل و فرزانہ انسان کا پیغام نہیں بلکہ پیغام الٰہی ہے اس لئے وہ خود یہ ضروری سمجھتا ہے کہ جو کچھ کہے عقل کی کنج وکاؤ سے خواہ کتنا ہی بالاتر ہو لیکن عقل کی نگاہ میں اور دلائل و براہین کی ترازو میں ناممکن اور محال نہ ہو کیونکہ فطرت اور عقل کے درمیان بیر نہیں ہے بلکہ عقل، فطرت کے قوانین کے سمجھنے اور سمجھ کو قبول کرنے کے لئے بہترین ذریعہ اور آلہ ہے اور وحی الٰہی در حقیقت فطرت کے روحانی قوانین کی ترجمان ہے۔

بہر حال کسی نبی یا رسول کے مبعوث ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا کی مخلوق جن وبشر اپنی روحانی سعادت اور اخلاق وکردار کی بلندی کے لئے اپنے عقل ودماغ کے اختراع کی بجائے پیغام حق کو راہنما بنائے تاکہ ذی عقل کائنات الٰہی اس راہ میں رقیبانہ تضاد وتصادم سے بے نیاز ہو کر انسانوں کے نہیں بلکہ انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا کے قوانین پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی وحدت، عالم گیر اخوت ومساوات کی قدروں کو حاصل کر سکیں اور ایک دوسرے کا حاکم ومحکوم اور آقا وغلام بننے کے بجائے سب ہی یکساں طور پر صرف اپنے پیدا کرنے والے ہی کے محکوم وغلام بن جائیں۔

دوسری جانب اس خاکدان عالم کا یہ حال ہے کہ اس کی ہر ایک شے نشوو ارتقاء کے قانون قدرت میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مادی اور روحانی قوانین ونوامیس کی خالق ایک ہی ذات ہے تو بلا شبہ دونوں کے نوامیس وقوانین میں ہم آہنگی اور وحدت کار فرما نظر آنی چاہیے ورنہ العیاذ باللہ وحدت واکائی کی جگہ دوئی کو محور مرکز ماننا پڑے گا جو فطرتاً ناممکن اور عقلاً محال ہے۔

تب از بس ضروری ہے کہ رشد وہدایت کے اس منصب نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی قانون ارتقاء سے اسی طرح جکڑا ہوا ہونا چاہیے جس طرح مادیات کا اور اس لئے تسلیم کرنا ہو گا کہ رشد وہدایت کا یہ سلسلہ ارتقائی بنیادوں پر اس طرح ترقی پذیر ہو کہ کائنات انسانی اپنے بقاء ووجود تک کسی وقت بھی اس راہ میں نشوو ارتقاء سے محروم نہ رہے۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب رشد وہدایت کے اس نظام کو جو منصب نبوت ورسالت کے نام سے معنون ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ قانون قدرت نے ایک جانب انسان کی مادی نشوو ارتقاء کا یہ سامان مہیا کیا کہ اس کی عقل ودانش اور اس کے شعور دماغی کو آہستہ آہستہ ترقی پذیر کرنا شروع کی اور دوسری جانب اسی معیار پر انسان کو روحانی واخلاقی تربیت کا ساز وسامان بھی انبیاء ورسل کے ذریعہ آہستہ آہستہ ترقی پذیر شکل میں عطا فرمایا اور آخر ایک وقت وہ بھی آیا کہ انسان عقل وشعور کی ابتدائی اور متوسط منازل سے گذر کر بلوغ وکمال کی اس حد پر پہنچ گئے جس کو ان کے لئے حد کمال کہا جا سکتا ہے اور جس معراج کمال پر پہنچ کر انسان "انسان کامل" کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہو جاتا ہے، تاہم حد بلوغ کی اس معراج ارتقاء پر پہنچ جانے پر بھی اس کی جلاء اور صیقل کیلئے رہتی دنیا تک نت نئے سامان ہوتے رہیں گے اور خالق کائنات کی ربوبیت کاملہ ان کے کمال کو نقص سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنی تربیت حق کا ہاتھ ان سے نہ اٹھائے گی۔

ٹھیک اسی طرح نبوت ورسالت کی شمع رشد وہدایت کا یہی حال رہا ہے کہ وہ ہزاروں ہزار سال تک اپنے ابتدائی اور متوسط منازل ارتقاء سے گذرتی رہی اور آخر کار، قت بھی آپہنچا کہ اس کی ترقی اور نشوار تقاء نے "کمال وتمام" کی شکل اختیار کر لی اور اس حد کمال پر پہنچ گئی جہاں اس ے ذریعہ کائنات ہست وبود کے سامنے ایسا قانون مکمل اور دستور کامل آگیا جو ہر طرح عقل وشعور انسانی کے حد بلوغ کے مناسب حال ہے اور جس کی راہنمائی اور روشنی عروج وکمال کی ضامن وکفیل ہے ساتھ ہی اس میں یہ لچک بھی موجود ہے کہ گویہ قانون رشد وہدایت اپنے بنیادی اصول کے لحاظ سے اٹل اور غیر متبدل ہے مگر عقل وشعور کے کمال وبلوغ کے تحفظ کے لئے جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ نے راہیں مسدود نہیں کیں بلک رہتی دنیا تک اس کی تربیت کے سامان مہیا کیے

ہیں اسی طرح اس منصب نبوت ورسالت کی تکمیل اور نقطہ ارتقاء کے حد کمال پر پہنچ جانے کے بعد اس کے عطا کردہ رشد و ہدایت کے تحفظ کی راہیں بھی بند نہیں کیں اور تا قیام قیامت اس کے جلاء و صیقل کے لئے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" کا سلسلہ قائم و دائم رکھا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو حدیث نبوی ﷺ نے خاتم النبیین کی تفسیر کو ایک روشن مثال کے ذریعہ سمجھایا اور "ختم نبوت" کی حقیقی روح کو مادی شکل میں پیش کر کے حرف آخر قرار دیا:

عن ابو ہریرۃ رضی اللّٰہ عنہ ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنیٰ بیتاً فاحسنہ واَجملہٗ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ و یعجبون لہ و یقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ و انا خاتم النّبیین۔

حضرت ابو ہریرہؓ آنحضرت ﷺ سے روایت فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اور مجھ سے پہلے نبیوں اور رسولوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اس کو بہت عمدہ آراستہ و پیراستہ کیا مگر اس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ تعمیر میں چھوڑ دی تو اب لوگ اس کو دیکھنے جوق درجوق آتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی کہتے جاتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ بھر دی گئی۔ (تا کہ تعمیر کی تکمیل ہو جاتی)۔

و فی بعض الفاظہ فکنت انا سددت موضع اللبنۃ و ختم لی البنیان و ختم لی الرسل۔ (کنز العمال عن ابن عساکر)

چنانچہ میں نے اسی جگہ کو پر کیا ہے اور میں وہی نبوت کی آخری اینٹ ہوں جس سے قصر مکمل ہو گیا اور میں ہی آخر الانبیاء ہوں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رب العلمین کی ربوبیت کاملہ نے کائنات ہست و بود میں قانون ارتقاء کو جس طرح نافذ فرمایا ہے اس کا تقاضایہ ہے کہ عقل و شعور انسانی کے حد بلوغ پر پہنچ جانے کے باوجود اس کی ترقی کا سلسلہ تا ابد جاری رہے اور اس میں ایسی پابندی یا روک نہ ہونی چاہیے جس سے اس کی صلاحیتوں کے نشو و ارتقاء کا سد باب ہو جائے اور دوسری جانب پیغام حق کا جو سلسلۂ نبوت و رسالت (بذریعہ وحی الٰہی) عالم کی رشد و ہدایت کے لئے عطا ہوا ہے وہ بھی حد کمال و تمام پر پہنچ جانے کے باجود فطرت کے قانون ارتقاء کے مطابق نہ کمال سے نقص کی جانب رجوع کرے کہ حقیقت ظل اور بروز کے پردہ میں مستور ہو کر رہ جائے اور نہ ربوبیت حق کے اس عطاء و نوال اور بخشش کا ہی سد باب ہو جائے جو رشد و ہدایت کے عنوان سے معنون اور عالم انسانی کی حقیقی راہنما ہے اس لئے طریقہ یہ رکھا گیا کہ جب انسان اپنے عقل و شعور میں حد بلوغ تک پہنچ گیا اس کے سامان پوری طرح مہیا ہو گئے تب نبوت و رسالت کو بھی بہ حد کمال و تمام پہنچ کر ختم کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت (نبوت و رسالت) کو پورا کر دیا۔

مگر رشد و ہدایت کو رہتی دنیا تک اس طرح باقی رکھا کہ آخری پیغمبر کے ذریعہ جو آخری پیغام کامل و مکمل بن کر آیا وہ اساس و بنیاد قرار پائے اور نت نئی مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ اس کا فیضان علم بھی درخشاں و تاباں رہے اور یہ خدمت علماء حق کے سپرد ہو یہی وہ حقیقت ہے جس کو کلام معجز نظام نے اس انداز میں بیان کیا ہے:

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس اختلاف کو اللہ اور اس کے پیغمبر محمد ﷺ کی جانب رجوع کرو۔

ظاہر ہے کہ اگر نبوت و رسالت محمد ﷺ پر پہنچ کر کامل نہ ہوتی اور اس کا سلسلہ کمال نبوت ہی کی شکل میں آگے بڑھتا رہتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ محمد ﷺ کی جانب یعنی ان کے ارشادات حق کی جانب رجوع کرو بلکہ خطاب یہ ہوتا کہ تم اللہ کی جانب اور جو نبی تم میں موجود ہو اس کی جانب رجوع کرو بلکہ خطاب یہ ہوتا کہ تم اللہ کی جانب اور جو نبی تم میں موجود ہو اس کی جانب رجوع کرو اس لئے نبوت و رسالت کو ظل و بروز کی اصطلاحوں کی آڑ میں باقی رکھنے کی کوشش کرنا قانون فطرت اور دین حق کے صریح خلاف اور باطل ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن حکیم نے کئی جگہ مختلف معجزانہ خطابت کو اختیار کیا ہے ایک جگہ ارشاد ہے:

وَأُوْحِيَ إِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط

اور میری جانب اس قرآن کی وحی کی گئی تا کہ اس کے ذریعہ میں تم کو (بری باتوں سے) ڈراؤں اور ان تمام لوگوں کو بھی جن کو (رہتی دنیا تک) یہ قرآن پہنچے۔

اور دوسری جگہ ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۂ انبیاء)

اور نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر

اور ایک جگہ ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق دے کر تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے اور اللہ اس کے لئے بطور گواہ کافی ہے۔

اور ایک جگہ ارشاد ہے:

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (محمد ﷺ) کی اور ان کی اطاعت کرو جو تم میں سے اولی الامر ہیں۔

اس آیت میں صاف طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب انسانی رشد و ہدایت کے لئے صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ

اللہ کی اور محمد ﷺ کی اطاعت کی جائے اور محمد ﷺ کے علاوہ اب کسی نبی و رسول کی اطاعت کا سوال نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا آخری طریقہ یہ ہے کہ تم میں سے جو صاحب امر ہوں (علماء مجتہدین و خلفاء حق) ان کی پیروی کرو۔

ان آیات بینات کے علاوہ قرآن حکیم نے جن آیات میں خدا کی کتابوں یا رسولوں پر ایمان لانے کی ہدایات کی ہے وہاں یہ کہ کر:

بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (پ ۱ ع ۱)

آمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِيْٓ أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (پ ۵ آیت ۱۷)

کہ محمد ﷺ اور ان سے پہلے نبیوں اور رسولوں اور قرآن اور اس سے قبل کی کتابوں پر ایمان لاؤ اس حقیقت کو نمایاں کیا اور ابھارا ہے کہ جہاں تک پیغمبر اور کتاب اللہ پر ایمان لانے کا تعلق ذات اقدس، قرآن حکیم اور اس سے قبل کے نبیوں، رسولوں اور کتابوں کا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ یہ سلسلہ آگے بشکل نبوت و رسالت اور وحی الٰہی نہیں چلے گا بلکہ محمد ﷺ کی رسالت ہی بہ حد کمال پہنچ کر قیامت تک بلا فصل باقی اور جاری رہے گی اور قرآن حکیم کامل و مکمل دستور ہدایت بن کر ہمیشہ اس کے لئے زندہ شہادت دے گا۔

حق تعالیٰ کی جانب سے "خاتم النّبیین" کا جو منصب جلیل ذات اقدس ﷺ کو عطا ہوا ہے عقل و نقل دونوں اعتبار سے ایک اور صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ محمد ﷺ آخر انبیاء و رسل ہیں اور نبوت و رسالت کا سلسلہ آپ پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔

تاج العروس میں ہے:

(و) الخاتم (من كل شيءٍ عاقبته و اخرته كخاتمته و الخاتم اخر القوم كالخاتم)

ومنه قوله تعالىٰ و خاتم النّبيين اى اخرهم ....الخ

(فصل الخاء من باب المیم)

تاج العروس کے علاوہ تمام معتبر اور مشہور عربی لغات ناطق ہیں کہ "خاتم" بفتح تاء ہو یا بہ کسرہ تاء "آخر شیٔ" اس کے حقیقی معنی ہیں اور جب کسی شخصیت کے لئے بولا جائے تو "آخر القوم" مراد ہوتے ہیں اس لئے آخر الانبیاء والرسل ہونا ذات اقدس ﷺ کی وہ خصوصیت ہے جس میں دوسرا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

یہ درست ہے کہ خاتم بمعنی "مہر" بھی حقیقی معنی ہیں اور یہی نہیں ان دونوں کے ماسوا اس لفظ کے چند اور معانی بھی حقیقی ہیں لیکن اطلاقات ہی اس کو ظاہر کر سکتے ہیں کہ ان ہر دو حقیقی میں سے کون سے معنی بر محل ہیں مثلاً جب آپ ہاتھ میں انگشتری پہنے ہوئے ہوں اور اس پر آپ کا نام کندہ ہو اس وقت اگر کہا جائے کہ خاتمک فی الملک تو اس وقت ختم بمعنی مہر حقیقی معنی ہوں گے لیکن اس لفظ خاتم کو اگر کسی انسان پر اطلاق کریں تو اس وقت خاتم بمعنی آخر حقیقی معنی ہوں گے اور خاتم القوم یا خاتم الانبیاء تب ہی صحیح ہو گا کہ آنے والا شخص قوم کا آخری فرد

یا نبیوں کا آخری نبی ہو اور اس حقیقی اطلاق کی موجودگی میں مجازی معنی سے مغائر و متضاد نہ ہوں بلکہ اس کے ساتھ پوری مطابقت رکھتے ہوں۔

تب یہ بات واضح اور صاف ہے کہ اگر کوئی شخص بلاغت قرآن اور اعجاز نظم قرآنی کے خلاف بلکہ عربیت کے عام اصول کے خلاف آیت کریمہ خاتم النّبیّین میں خاتم کے حقیقی معنی ترک کر کے بلحاظ اطلاق مجازی معنی ''مہر'' کے لیتا ہے تب بھی مجازی معنی اور مفہوم وہی صحیح اور لائق توجہ ہو سکتے ہیں جو حقیقی معنی ''آخر'' سے متبائن اور متخالف نہ ہوں اور ''نبیوں کی مہر'' کا یہ مطلب ہوگا کہ جس طرح کسی تحریری یا کسی شے کے ختم پر مہر اسلئے لگائی جاتی ہے کہ اس پر تحریر یا شے اختتام ہو گیا اور اب کسی بھی اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی، اسی طرح ذات اقدس ﷺ انبیاء و مرسلین کے سلسلہ کیلئے ''مہر'' ہیں کہ آپ کے بعد اب فہرست انبیاء و رسل میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہی اور رسل سلسلہ پر مہر لگ گئی اور جس طرح کاغذ یا لفافہ پر مہر ثبوت ہے اس امر کا کہ اب اسکے بعد کسی مضمون یا لفظ و جملہ کی توقع عبث ہے اسی طرح نبیوں کی مہر اس کیلئے کھلی دلیل ہے کہ اب کسی اضافہ کی توقع محال ہے پس ''مہر'' بہ اطلاق مجاز کے اس مفہوم کو چھوڑ کر اگر کسی خاص مزعومہ کی بناء پر یہ معنی مراد ہوں کہ ذات اقدس ﷺ نبیوں کیلئے مہر ہیں کہ جسطرح کوئی کاغذ یا تحریر جب ہی مستند ہوتی ہے کہ اس پر ذمہ دار شخصیت کی مہر ثبت ہو اس طرح کوئی نبی یا رسول نہیں بن سکتا جب تک آپ ﷺ اس کیلئے مہر تصدیق نہ بن جائیں۔ تو یہ مراد دو وجہ سے باطل ہے: اول اسلئے کہ یہ مفہوم حقیقی معنی ''آخر'' کے متضاد و متبائن ہے۔ دوم اسلئے کہ ہزاروں یا لاکھوں انبیاء علیہم السلام جو ذات اقدس ﷺ کے زمانہ بعثت سے قبل اس کائنات ارضی پر مبعوث ہو چکے اپنی اپنی امت کے زمانہ میں ان کی نبوت غیر مستند اور ناقابل قبول رہی اسلئے کہ ان کی نبوت کی تصدیق کنندہ ''مہر'' ان کی بعثت سے ہزاروں یا سیکڑوں برس کے بعد آئی جبکہ وہ اپنے اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہو چکے تو اب بے سود و بے فائدہ اور اگر یہ مراد ہے کہ آپ ﷺ کے بعد جو نبی آئیں گے ان کیلئے آپ ﷺ ''مہر'' ہیں تو یہ ترجیح بلا مرجح کیوں؟ کہ ہزاروں لاکھوں انبیاء و رسل کیلئے تو مہر نہ بنے اور بعد میں آنے والوں کیلئے ''مہر'' قرار پائے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ اگلوں اور پچھلوں سب ہی انبیاء و رسل کیلئے مہر تصدیق ہیں تب بھی اگلوں کیلئے مہر ہونا بے کار رہا کہ ان کے وقت نبوت گزر جانے کے بعد مہر تصدیق پہنچی۔

علاوہ ازیں یہ احتمالات خود ساختہ اور ظنی ہیں اور کسی ایک احتمال کے یقینی ہونے کی بھی قرآن میں صراحت موجود نہیں ہے تو پھر حقیقی اطلاق کو ترک اور حقیقی سے مطابق مجازی مفہوم سے روگردانی کے بعد ایسے احتمالات جو حقیقی مفہوم کا حق نہ ادا کرتے ہوں باطل نہیں تو اور کیا ہیں؟

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کا حکیمانہ طریق استدلال یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر جو بات کہنا چاہتا ہے اس کو متعدد جگہ مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی خود ہی تفسیر بن جاتی اور حقیقت حال روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے اس حقیقت کو مفسرین نے اس طرح ادا کیا ہے کہ: القران یفسر بعضه بعضا یعنی قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ کو خود تفسیر کر دیتا ہے چنانچہ یہی صورت حال یہاں بھی موجود ہے وہ یہ کہ قرآن حکیم اسلام کی خوبی بیان کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت میں پسند کر لیا۔ (پ ۶،ع ۵)

آیت کریمہ کو ایک مرتبہ خوب غور سے پھر پڑھئے اور دیکھئے کہ اس جگہ نہ "خاتم" ہے اور نہ "ختم" کہ اس کو معرض بحث میں لا کر خود ساختہ احتمالات پیدا کر لئے جائیں، بلکہ یہاں صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو دین اسلام وجود انسانی کے ساتھ ساتھ رشد وہدایت کا مرکز بنا ہوا ہے اس کو آج "کامل" اور اس نعمت دین کو تمام کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ "کامل" کا مقابل "ناقص" اور "تمام" کا متوازی ناتمام ادھورا" ہوتا ہے یعنی ایک چیز آہستہ آہستہ ترقی پذیر تھی اور رفتہ رفتہ اس حد پر پہنچ گئی جس کے بعد اب ترقی کا خاتمہ ہے اسلئے کہ وہ کامل و مکمل ہو کر سامنے آ گئی جس کے بعد ناقص یا ناتمام کے دہرانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

سواگر یہ صحیح ہے کہ اسلام، دور محمدی ﷺ پر پہنچ کر ہی کامل اور تمام ہوا ہے تو بلا شبہ آیت کریمہ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے یہی معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔ محمد ﷺ اسی دین کے پیغامبر ہیں جو کائنات انسان کی ابتدا سے ہی رشد وہدایت انسانی کا فرض انجام دے رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ ہے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ اور انسانیت کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ بھی روحانی مدارج ارتقاء طے کرتے ہوئے آج "کامل" اور "تمام" ہو گیا اور اب کسی جدید پیغام کی حاجت نہیں رہی اور جب جدید پیغام کی ضرورت نہیں ہے تو اب نئے پیغامبر کی بھی ضرورت خود بخود باقی نہیں رہی اور رہتی دنیا تک یہی کامل پیغام اور پیغامبر انسانی دنیا کے لئے کافی اور بس ہے: وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔

لہٰذا حقیقی اطلاق لیجئے یا مجازی "خاتم" کے معنی اور مفہوم میں "آخر" ہونے کا تصور غیر منفک اور لازم ہے اور اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔

آیت کریمہ کا شان نزول اگرچہ ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے ایک ٹھوس حقیقت کا اظہار کرتی ہے۔

اس آیت کے تین حصے ہیں ایک میں کہا گیا ہے کہ محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں اس لئے کہ آپ ﷺ کی اولاد ذکور حیات مستعار کو پورا کر چکی اور آپ ﷺ صلبی بیٹا نہیں رکھتے اور اسلام میں لے پالک "متبنّی" بے معنی رسم ہے اور اس سے دوسرے کا بیٹا گود لینے والے کا بیٹا نہیں بن جاتا اور اس کے احکام حاصل نہیں کر لیتا تو ایسی شکل میں زیدؓ کو محمد ﷺ کا بیٹا کہنا ہر طرح غلط ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ

محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں

مگر اس سے یہ احساس پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ جب آپ ﷺ مردوں میں سے کسی کے صلبی باپ نہیں ہیں تو امت کے ساتھ کس طرح آپ ﷺ کو شفقت پدری ہو سکتی ہے حالانکہ امم سابقہ و سالفہ میں انبیاء ورسل ؑ اپنی اپنی امتوں کے بیشتر صلبی باپ بھی رہے ہیں اور روحانی باپ بھی یہ احساس اسلئے نہیں ہونا چاہئے کہ اگرچہ آپ

کے وہ صلبی باپ نہیں ہیں تو نہ ہوں مگر روحانی باپ تو ہیں جیسا کہ ہمیشہ انبیاء ورسل اپنی اپنی امتوں کے روحانی باپ ہوتے ہیں بلکہ روحانی باپ کا رشتہ ورابطہ تو صلبی باپ سے بھی ہزار ہا درجہ بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ وہ مادی و روحانی دونوں تربیتوں کا کفیل و مربی ہے اس لئے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح آپ ﷺ بھی خدا کے رسول ہیں:

وَلٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ

پھر بات اسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ امت مرحومہ کے لئے اس سے بھی بلند و بالا یہ بشارت ہے کہ آپ ﷺ سے قبل جس قدر بھی روحانی باپ (انبیاء ورسل) گزرے ہیں علیٰ قدر مراتب ان میں امت کے لئے شفقت و رحمت کا جذبہ محدود رہا ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے گذر جانے کے بعد دوسرا روحانی باپ نبی یا رسول مبعوث ہو کر امت پر میری ہی طرح یا مجھ سے زیادہ شفقت و تربیت کا حق ادا کرنے والا ہے لیکن ذات قدس کی یہ شان رفیع ہے کہ آپ ﷺ صرف اللہ کے رسول ہی نہیں ہیں بلکہ آخر الانبیاء والرسل ہیں جن کے بعد کسی نبی اور رسول کی بعثت کی ضرورت نہیں رہی اسلئے کہ دین کامل ہو گیا اور خدا کی نعمت پوری ہو گئی، ایسی صورت میں تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اس کی شفقت و رحمت کا کیا ٹھکانا ہو گا جو مربی یہ سمجھتا ہو کہ اب اگلوں کی طرح اس کے بعد دوسرا کوئی مربی آنے والا نہیں ہے کہ امت پر اپنی رحمت نچھاور کرے، اب تو رہتی دنیا تک اس کی آغوش تربیت وا رہے گی اور اسی کی نبوت و رسالت کا غیر منقطع سلسلہ جاری رہے گا۔ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ۔

خلاصہ یہ کہ محمد ﷺ کی شان مبارک اسی خصوصی امتیاز کی حامل ہے کہ اس کی بعثت کے بعد کسی نبی یا رسول کی بعثت کی حاجت باقی نہیں رہی اور اس طرح یہ حقیقت بھی روشن ہو گئی کہ ذات اقدس ﷺ اس امر کے باعث نہیں ہیں کہ انھوں نے نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا بلکہ جب خدا تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اب یہ سلسلۂ نبوت و رسالت اس ارتقائی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ آخری پیغام بن کر کامل و تمام ہو جائے ذات اقدس ﷺ کو اس نے اس کیلئے چن لیا اور بلا شرکت غیرے ان کو یہ منصب عظمیٰ عطا فرمایا:

وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○

پھر کسی نادان کا یہ کہنا کہ اگر آپ ﷺ آخر الانبیاء والرسل ہیں تو یہ آپ ﷺ کی منقبت نہیں بلکہ نقص ہے کہ آپ ﷺ اس رحمت کے لئے سد باب ثابت ہوئے جو نبوت و رسالت کے عنوان سے جاری تھی۔

اس نادان کا یہ خیال اسی طرح فاسد ہے جس طرح اس شخص کا خیال جس نے ایک محفل میں شرکت کی اور دیکھا کہ جو معزز مہمان بھی آتا ہے اس کا پر جوش استقبال ہوتا ہے اور اس سے محفل کی رونق میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ ایک شخص ایسا بھی آ پہنچا جس کو سب نے حاصل محفل سمجھ کر نہ صرف پر جوش استقبال ہی کیا بلکہ تمام محفل کا سر تاج کہا اور اس کے بعد محفل اپنا کام کر کے ختم ہو گئی یوں یہ نادان بہت کڑھا اور پچھتانے لگا کہ کاش یہ حاصل محفل نہ بنتا اور محفل اسی طرح سجی سجائی رہتی اور مہمانوں کی آمد کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا۔

ٹھیک اسی طرح محمد ﷺ کے آخر الانبیاء والرسل ہونے پر یہ نادان اپنے فساد خیال کا اظہار کر رہا اور باطل تاویلات کے در پے ہو رہا ہے:

یُضِلُّ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ بِہٖ مَنْ یَّشَآءُ

قرآن عزیز نے اکثر مقامات پر نبی اور رسول کے ایک ہی معنی لئے ہیں جس کو اردو میں پیغمبر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن خاص خاص مقامات پر وہ نبی اور رسول میں فرق بھی کرتا ہے اس فرق کو علماء اسلام نے یوں ظاہر کیا ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص یعنی خدائے تعالیٰ جس شخصیت کو ہم کلامی کا شرف عطا فرماتے ہیں وہ نبی کہلاتا ہے کیونکہ لغت میں نبی خبر دینے والے کو کہتے ہیں گویا جو شخص خدا سے براہ راست لے کر بندگان خدا کو اس کے احکام کی خبر دے وہ نبی ہے قطع نظر اس امر کے کہ اس کو جدید کتاب یا جدید شریعت عطا کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو لیکن جب خدا نے ہم کلامی کے منصب کے ساتھ ساتھ اس شخصیت کو کتاب جدید یا شریعت جدیدہ بھی عطا کی ہو تو اس کو رسول کہتے ہیں چنانچہ اس مقام پر قرآن حکیم نے اسی فرق و امتیاز کو معجزانہ اسلوب کے ساتھ ظاہر کیا ہے وہ کہتا ہے صرف "نبی" ہی نہیں بلکہ "رسول" ہے اور خود قرآن اس کے لئے شہادت جاوید ہے اور جبکہ وہ پیغام الٰہی کے سلسلہ میں آخری پیغامبر ہیں تو اس جگہ یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ صرف مصطلحہ رسولوں کے ہی آخر نہیں ہیں بلکہ سر تا سر سلسلۂ نبوت کے لئے آخر ہیں تا کہ ظاہر ہو جائے کہ جب وہ خاتم الانبیاء ہیں تو خاتم الرسل بدرجۂ اولیٰ واتم ہیں کیونکہ جب عام ہی کا وجود مفقود ہے تو خاص کا وجود کس طرح کتم عدم سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔ اور اسی نمایاں حقیقت کو خود ذات اقدس ﷺ نے ایک طویل صحیح حدیث میں برہان قاطع کے طور پر ظاہر کیا ہے لَانَبِیَّ بَعْدِیْ میرے بعد اب کسی نبی کی بعثت نہیں ہے اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِیَّ بلا شبہ رسالت اور نبوت دونوں ختم ہو گئے پس میرے بعد نہ رسول ہے اور نہ نبی، خَتَمَ بِیَ الْاَنبیآءُ علیهم الصلوٰة والسلام مجھ پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا انا العاقب الذی لیس بعدهٗ نبی میرا نام عاقب[1] ہے جس کے بعد نبی کی بعثت نہیں ہے وَخَتَمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

(مسند احمد، ترمذی، مسلم، بخاری وغیرہ)

۱: عاقب: انجام کو پہنچانے والا

غزوات

غزوۂ بدر

غزوہ

ارباب سیر وحدیث نے یہ اصطلاح مقرر کرلی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں جس لشکر کے ساتھ نبی اکرم ﷺ نہ ہوں اسکو سریہ اور جس میں بنفس نفیس خود شرکت فرمائیں اس کو "غزوہ" کہتے ہیں۔

بدر

قرآن عزیز نے جن اہم غزوات کا تذکرہ کیا ہے ان میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت "غزوۂ بدر" کو حاصل ہے بدر دراصل ایک کنویں کا نام ہے جس کی نسبت سے یہ وادی بھی بدر ہی کہلاتی ہے یہ وادی مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے قریب سلطانی[1] راستہ واقع ہے اسی جگہ وہ اہم غزوہ پیش آیا جس نے دنیا کی تاریخ ادیان وملل ہی کا نہیں بلکہ ہر شعبہ حیات کا رخ پلٹ کر ظلم سے عدل کی جانب پھیر دیا۔

واقعہ

یہ واقعہ چونکہ ادیان وملل کی تاریخ انقلاب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اس لئے راویان حدیث وسیرت نے اس کے ہر ایک جزء کی تفصیل کو واضح طور پر بیان کیا ہے، تاکہ اس تاریخی واقعہ کا کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہے لیکن ہم اس مقام پر مختصر مگر جامع الفاظ میں اس کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں۔

ہجرت مدینہ مشرکین کے لئے کچھ اس درجہ برہمی اور اشتعال کا باعث ہوئی اور وہ پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو اپنی ناقابل برداشت ایذار سانی سے محفوظ دیکھ کر کچھ اس درجہ برافروختہ ہوئے کہ اب انھوں نے طے کر لیا کہ جس قیمت پر بھی ہو سکے مسلمانوں کو نیست ونابود کر دینا چاہیے چنانچہ اس کے لئے انھوں نے ہجرت سے متصل ہی معرکہائے جنگ کی ابتدا کر دی اور غزوۂ بواط اور عشیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے غزوات اسی سلسلہ میں پیش آئے مگر مشرکین مکہ کی آتش حسد کے لئے یہ کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہو جائے۔

اس ارادہ کی تکمیل کے لئے انھوں نے ضروری سمجھا کہ سامان حرب وضرب بافراط میسر آئے اور اس کے لئے بہترین طریقہ یہ سوچا کہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ایک قافلۂ تجارت شام کی منڈیوں میں جائے اور نفع کثیر

۱: حکومت عثمانی کے دور شباب میں مکہ سے مدینہ جانے کیلئے جو راہ مقرر ہوئی۔ وہ "سلطانی راہ" کہلاتی ہے۔

حاصل کرے اس سے سامان جنگ مہیا کیا جائے اور اس جذبہ نے جوش خروش کی یہ کیفیت پیدا کر دی کہ جب قافلہ تجارت کی تیاری شروع ہوئی تو مکہ کے ہر متنفس نے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس تجارت کے لئے پیش کیا حتیٰ کہ ایک بڑھیا (عجوز) نے بھی اپنی محنت کی معمولی پونجی اس خدمت کے لئے پیش کر دی اور تقریباً ستر قریشیوں پر مشتمل یہ قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں شام کو روانہ ہو گیا۔

مشہور محدث و مفسر ابن جریر طبری اپنی کتاب تاریخ الامم والملوک میں قریش کی اس کیفیت کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں۔

وقد كانت الحرب بينهم قبل ذلك فقتلت قتلى وقتل ابن الحضرمی فی ناس بنخلة واسرت اساریٰ من قريش وكانت تلك الواقعة هاجت الحرب بين رسول الله ﷺ وبين قريش وذلك قبل مخرج ابی سفيان و اصحابه الی الشام۔ (جلد ۲ ص ۲۶۷)

اور قافلہ کی روانگی سے قبل مسلمانوں اور قریش مکہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی اور ان لڑائیوں میں لوگ مارے جا چکے تھے اور (مشہور مشرک) ابن حضرمی مارا جا چکا تھا[1] اور قریش کے لوگ قیدی بھی بنائے جا چکے تھے اور یہ واقعہ قریش کے اور مسلمانوں کے درمیان جنگ کے مشتعل ہو جانے کا باعث بن گیا اور یہ سب کچھ ابوسفیان اور اس کے رفقاء کے شام کی جانب قافلہ تجارت کی شکل میں نکلنے سے قبل پیش آ چکا تھا۔

اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن کثیر (رحمہ اللہ) اپنی تاریخ البدایۃ والنہایہ میں تحریر فرماتے ہیں:

باب سرية عبد الله بن جحش التی كان سببا الغزوة بدر العظمیٰ و ذلكَ يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (ج ۲ ص ۲۶۷)

باب سریہ عبداللہ بن جحش (سریہ نخلہ) جو سبب بنا بدر کبریٰ کے غزوہ کا اور جس کے متعلق قرآن نے یہ کہا اور یہ دن ہے حق و باطل کے نکھر جانے کا وہ دن جبکہ (حق و باطل کی جنگ کے لیے) دو جماعتیں آپس میں ملیں اور اللہ ہر شے پر قادر ہے"۔

قریش کا تجارتی قافلہ جب نفع کثیر کر کے شام سے واپس ہو کر مکہ جا رہا تھا بدر سے قریب ہو کر گذرا تو نبی اکرم ﷺ کو علم ہوا آپ ﷺ نے فوراً اصحابؓ کو جمع کر کے مشورہ فرمایا، بعض حضرات نے بخوشی اس کے مقابلہ کے لئے آمادگی ظاہر کی اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ کسی اہم جنگ کا معاملہ نہیں ہے اس کے تعاقب پر آمادگی کا ثبوت نہیں دیا چنانچہ ابن کثیرؒ نے بروایت محمد بن اسحٰق اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وقال هذه عير قريش فيها اموالهم فاخرجوا اليها لعل الله يغنمكموها فانتدب الناس فخفف بعضهم و ثقل بعض و ذلك انهم لم يظنوا ان رسول الله يلقى حربا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ قریش کا قافلہ جا رہا ہے جس میں ان کے مال تجارت ہے اس کا تعاقب کرو، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے لئے مال غنیمت بنا دے پس لوگوں کو اس کے لئے پکارا گیا تو بعض نے اس کو پسند کیا اور بعض نے نکلنے میں گرانی محسوس کی اور یہ عدول حکمی کے پیش نظر نہیں بلکہ اس لئے تھی کہ وہ سمجھ

---

[1] ابن حضرمی اسی غزوہ میں مارا گیا۔

رہے تھے کہ رسول ﷺ کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں جا رہے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ لشکر جو قافلہ کے تعاقب میں نکلا سامان حرب سے بے پرواہ ہو کر مدینہ سے نکلا، مشہور روایت کے مطابق ان کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی جبکہ بحمد اللہ مدینہ کے اندر ہی مسلمانوں کی آبادی ہزار ہا بالغ نفوس پر مشتمل تھی اور چند تلواریں دو تین گھوڑے ساٹھ زرہ اور صرف ساٹھ اونٹ ان کا متاع جنگ تھا درآنحالیکہ مسلمانوں کے پاس بلکہ خود نکلنے والے مجاہدین کے پاس مدینہ میں بیش از بیش سامان جنگ اور اونٹ اور گھوڑے موجود تھے، غرض یہ لشکر جنگی لشکر نہیں تھا بلکہ فدا کارانِ توحید کا ایک مختصر سا قافلہ تھا جو قریش کے حرب و ضرب کے سرمایہ پر قابض ہو کر دشمن کے بے مایہ بنانے نکلا تھا۔

ابوسفیان کو مسلمانوں کے تعاقب کا حال معلوم ہو تو گھبرایا اور فوراً ضمضم نامی ایک شخص کو اجیر بنا کر مکہ روانہ کیا کہ وہ قریش کو اس معاملہ کی خبر دے اور مدد طلب کرے۔ سرداران[1] قریش آمادۂ جنگ ہو کر اپنے اپنے لشکر کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور اس کر وفر سے نکلے کہ تعداد میں ایک ہزار تھے نیزے اور تلواریں بے شمار تھیں سات سو زرہ، ستر گھوڑے اور بے تعداد اونٹ تھے وہ اونچی بنے نیزے اور تلواریں سجے ڈھالیں اور بکتر لگائے، نشہ غرور میں جھومتے ہوئے بدر کی جانب بڑھے۔

ادھر مسلمان آگے بڑھتے ہوئے جب وادیٔ صفراء کے قریب پہنچے تو نبی اکرم ﷺ نے بسبس بن عمرو اور عدی بن الزغباء کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قافلہ کا حال معلوم کر کے آئیں ابن اسحٰق[2] کہتے ہیں کہ یہ دونوں بدر پہنچے تو وہاں کنویں کے قریب قبیلہ جہینہ کا ایک شخص مجدی بن عمرو موجود تھا اور نزدیک ہی دو لڑکیاں آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔

ایک نے دوسری سے کہا کہ کل یا پرسوں یہاں قریشی قافلہ آنیوالا ہے میں اس میں کام کروں گی اور تیرا قرض اتار دوں گی اور پھر مجدی نے اس لڑکی کی تصدیق کی۔ بسبس نے یہ سنا تو وہ اور عدی اونٹوں کو پانی پلا کر، فوراً روانہ ہو گئے۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۵ و سیرت ابن ہشام جلد ا۔ روض الانف جلد ۲)

دوسری جانب ابوسفیان ڈرتا اور چھپتا قافلہ سے آگے بڑھ کر تجسس حال کے لئے بدر پہنچا، مجدی وہاں موجود تھا، ابوسفیان نے دریافت کیا تو نے کسی اجنبی کو تو یہاں نہیں دیکھا؟

مجدی نے کہا اور تو کوئی نئی بات نظر نہیں آئی البتہ تھوڑی دیر ہوئی کہ غیر متعارف دو آدمی ضرور یہاں آئے تھے اور اونٹوں کو پانی پلا کر واپس ہو گئے۔

ابوسفیان کنویں کے پاس گیا تو اونٹوں کی لید پڑی دیکھی اس نے لید کو کریدا تو کھجور کی گھٹلیاں نکلیں، ابوسفیان نے یہ دیکھ کر کہا بلا شبہ یہ اونٹ یثرب کے تھے اور تیزی کے ساتھ قافلہ تک پہنچا اور حالات سے باخبر کر کے قافلہ کا رخ ساحل کی جانب پھیر دیا اور بدر کو بائیں ہاتھ چھوڑتا ہوا مکہ کو چل دیا۔

(تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۵ و سیرت ابن ہشام جلد ا روض الانف جلد ۲)

۱: ابولہب کے علاوہ سب ہی تھے، ابولہب بیمار تھا۔ اسلئے اس نے اپنا قائم مقام دے دیا تھا۔
۲: مسلم ابوداؤد۔

اس مدت میں مسلمان وادیٔ صفراء سے گذر کر وادیٔ ذفران تک پہنچ چکے تھے یہاں اترے تو ایک جانب بسبس اور عدی سے یہ معلوم ہوا کہ عنقریب ابوسفیان کا قافلہ بدر پہنچنے والا ہے دوسری جانب یہ پتہ لگا کہ مکہ سے قریش ایک ہزار جمعیت لے کر کروفر کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے بدر کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

ابو سفیان نے جب ساحلی جانب اختیار کر لی اور اس کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر مسلمان میرے تعاقب کے لئے بدر کی جانب آئیں گے تو میں ان کی زد سے محفوظ رہوں گا۔ اس لئے اس نے مکہ کی جانب دوسرا قاصد روانہ کیا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے، میں مسلمانوں کی زد سے بچ کر جلدی مکہ پہنچ جانے والا ہوں قریش بدر کے قریب آچکے تھے کہ قاصد نے ابوسفیان کا پیغام سنایا مگر ابو جہل نے واپسی کے لئے سختی کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا کہ اب بدر ضرور پہنچنا ہے اور مسلمانوں کا قلع قمع کر کے اس کانٹے کو ہمیشہ کیلئے نکال دینا ہے۔

(تاریخ ابن کثیر جلد ۳ ص ۲۶۶)

بہر حال مسلمانوں کو جب وادی ذفران میں یہ دونوں خبریں لیں تو نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ سے دوبارہ مشورہ ضروری سمجھا کیوں کہ اب معاملہ کٹھن تھا مسلمان بے سر و سامان اور پھر تھوڑی تعداد میں تھے اور دشمن ہر طرح وقت کے ہتھیاروں سے مسلح، کثیر سامان جنگ کے مالک تھے اور تعداد میں تین گنے سے بھی زیادہ اور بقول ارباب سیرت انصار اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی معیت سفر کو صد ہزار باعث نازش و مباہات سمجھتے اور ہم کاب رہتے تھے لیکن عقبۂ ثانیہ کے وقت وہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ یہ معاہدہ کر چکے تھے کہ جب تک قریش یا غیر قریش اپنی جانب سے مدینہ پر حملہ آور نہ ہوں انصار مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے لئے مجبور نہیں ہوں گے۔[1]

مشورہ کے لیے یہ اہم وجوہ تھیں جن کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے صحابہ سے مشورہ فرمایا آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن سر پر ہے اور قافلہ قریب! اب بتاؤ کیا چاہتے ہو جنگ کر کے حق و باطل کا فیصلہ یا بغیر کانٹا لگے قافلے پر قبضہ؟

مسلمانوں نے جب یہ سنا تو بعض نے طبعی طور پر جنگ کی مخالفت کی اور اس بارے میں گرانی محسوس کی انھوں نے کہا: یارسول اللہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے تھے اس لئے بے سر و سامان ہیں ہم تو اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ قافلہ پر قبضہ کر کے واپس چلے جائیں، نبی اکرم ﷺ نے اس کمزور رائے کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، قافلہ کو چھوڑو، اب اس قوم کے متعلق رائے دو جو تمہارے مقابلہ کے لئے مکہ سے نکل آئی بعض لوگوں نے جب دوبارہ عذر کیا تو آپ ﷺ نے پھر پہلی بات لوٹا دی تب جلیل القدر صحابہ ابو بکر، عمر، علیؓ سمجھ گئے کہ مرضی مبارک حق و باطل کی جنگ سے وابستہ ہے اس لئے انھوں نے جذبۂ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم ہر طرح جنگ کے لئے تیار ہیں اور اسلام کی خاطر آپ ﷺ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو حاضر ہیں او حضرت مقدادؓ نے تو اس شد و مد کے ساتھ فداکارانہ جذبات کا اظہار کیا کہ صحابہؓ کو ان کی تقریر پر رشک ہونے لگا۔ مگر آپ ﷺ اب بھی نگاہ مبارک سے کسی بات کے طالب نظر آرہے تھے یہ

۱: سیرت و تاریخ کی کتابوں میں عموماً یہ قول مذکور ہے۔

دیکھ کر انصار میں سے حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم انصار کی جانب اشارہ ہے کہ ہم کچھ عرض کریں اور پھر انصار کی جانب سے پوری وفاداری اور فداکاری کا یقین دلاتے ہوئے نہایت مؤثر تقریر فرمائی۔

مہاجرین وانصار کی یہ تقاریر سن کر سرور عالم ﷺ کا چہرۂ مبارک مسرت سے تمتما اٹھا اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اب اللہ کے نام پر آگے بڑھو اور بشارت حاصل کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دو گروہ (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک کو تمہارے قبضہ میں دیدوں گا اور قافلہ نہیں بلکہ مشرکین کا لشکر تمہارے قبضہ میں دیدیا جائے گا اور خدا کا وعدہ بلاشبہ سچا ہے اور قسم بخدا میں جنگ سے قبل ابھی سے قوم کے سرداروں کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں[1] اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے بدر پہنچ کر زمین پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ اس جگہ فلاں قریشی مارا جائے گا اور یہاں فلاں قتل ہوگا۔"[2]

سلف سے خلف تک تمام مفسرین محدثین اور اصحاب سیر و تاریخ اس پر متفق ہیں کہ یہی وہ مشورہ ہے جس کے متعلق سورۂ انفال کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ ○ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُوْنَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ○ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ إِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ أَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِيْنَ ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○

("انفال" اللہ اور رسول کے لئے ہیں) اس لیے کہ تیرے پروردگار نے تجھ کو حق کے لئے تیرے گھر سے نکالا اور حالت یہ ہو گئی کہ مسلمانوں کا ایک فریق اس نکلنے پر گرانی کا اظہار کر رہا تھا اور وہ تجھ سے حق کے بارے میں حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد جھگڑا کر رہے تھے گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کے منہ میں ہنکائے جا رہے ہیں اور (یہ واقعہ اس وقت پیش آیا) جبکہ اللہ تم کو وعدہ دے رہا تھا کہ دونوں فریق (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے ایک فریق کہ تمہارے قبضہ میں دیدے گا اور تم یہ شبہ کرتے تھے کہ تم کو وہ گروہ ملے جس کے مقابلہ میں کانٹا بھی نہ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے وعدہ کے کلمات سے حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اور اس طرح حق کو حق کر دے اور باطل کو باطل اگر چہ مجرموں کو یہ بات پسند نہ آئے۔

اب مسلمان آگے بڑھے اور بدر کے قریب پہنچ کر مدینہ کی جانب والے رخ "عدوۃ الدنیا" پر خیمہ زن ہو

۱: بخاری و مسلم نسائی و عام کتب سیر و تاریخ۔
۲: زرقانی جلد ۱ ص ۴۸۰۔

گئے اور مشرکین مکہ آگے بڑھے تو بدر پہنچ کر مدینہ سے دور مکہ کی جانب والے رخ "عدوۃ القصویٰ" پر اترے اور محاذِ جنگ کا نقشہ اس طرح بند کر مسلمان اور مشرکین بالمقابل تھے اور ابوسفیان کا قافلہ اس وقت ساحل کی جانب نیچے نیچے مشرکین کے لشکر کی پشت پر سے گذر رہا تھا کہ جب وہ چاہیں تو مشرکین مکہ کی نصرت و مدد کے لیے بے روک ٹوک آسکتے اور کمک کا کام دے سکتے ہیں اور پھر یہ عجیب صورت حال تھی کہ مسلمانوں کا محاذ جنگ اس درجہ ریتیلا تھا کہ انسانوں اور چوپاؤں دونوں کے قدم ریت میں دھنسے جا رہے تھے اور چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر مشرکین کا محاذ جنگ ہموار اور پختہ فرش کی طرح تھا۔ غرض دشمن تعداد میں تین گنے سے زیادہ سامان جنگ میں پوری طرح مکمل، ذرائع رسل و رسائل میں ہر طرح مطمئن جائے وقوع نہایت عمدہ اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ قافلہ کی کمک متوقع تھی اور خود اپنی حالت یہ کہ تعداد میں بہت کم، اسلحہ جنگ برائے نام، سامان حرب نہ ہونے کے برابر، سواریوں کا شمار برائے بیت جائے وقوع حد درجہ خراب اور ان تمام ناساز گار حالات کے ساتھ کمک قطعاً غیر متوقع اور حد یہ کہ دشمن پانی پر قابض اور مسلمان اس سے محروم۔

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر مسلمان کو ان کی ذاتی رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو ان کی عقل و خرد بہ اسباب ظاہر اس کے سوا اور کیا فیصلہ کر سکتی تھی کہ وہ اس وقت کو ٹال دیں اور دشمن سے کسی ایسے دوسرے وقت کے لئے جنگ کا قول و قرار کریں کہ وہ دشمن کی طرح ہر حیثیت سے جنگ کے لئے تیار ہوں چنانچہ اسی بناء پر مسلمانوں نے وادیٔ ذفران میں شوریٰ کے وقت ابتداً یہی کہا بھی مگر وحی الٰہی کے ذریعہ چونکہ نبی اکرم ﷺ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خدا کا یہی وعدہ کہ تم کو "عیر اور نفیر" دونوں میں سے ایک پر مسلط کر دیا جائے گا، صرف اس شکل میں پورا ہونے والا ہے کہ مسلمان مشرکین کے لشکر (نفیر) کا مقابلہ کریں اور حق و باطل کے اس معرکہ میں مسلمان کامیاب ہوں مشرکین ناکام و خاسر، اس لئے مسلمانوں نے پیغمبر ﷺ کی مرضی پا کر ہمہ قسم کی بے سر و سامانی کے باوجود خود کو حق و باطل کی معرکہ آرائی کے لئے والہانہ و فداکارانہ جذبۂ پاک کے ساتھ پیش کر دیا۔

ایسی صورت حال کو قرآن عزیز نے اس معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ ظاہر کیا ہے:

إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ أَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَا مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ إِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (انفال)

اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو جو ہم نے فیصلہ کر دینے والے دن اپنے بندہ پر نازل کی تھی جبکہ لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو چاہیے کہ اس تقسیم پر (یعنی مال غنیمت کی مقرر تقسیم پر) کار بند ہو اور اللہ ہر شئے پر قدرت رکھتا ہے یہ وہ (بدر کا دن تھا کہ تم ادھر قریب کے ناکہ پر تھے ادھر دشمن دور کے ناکہ پر اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے گزر رہا تھا) اور اگر تم آپس میں

لڑائی کی بات ٹھہراتے تو ضرور جنگ کے وقت کے بارہ میں تم اختلاف کرتے کیونکہ تم چاہتے ہو کہ کسی حالت میں جنگ نہ ہو اور دشمن چاہتا ہے کہ ضرور جنگ ہو (یعنی تمہیں دشمنوں کی کثرت اور اپنی بے سروسامانی کا اندیشہ تھا اور قافلہ پر تسلط آسان نظر آرہا تھا اور دشمن اپنی کثرت اور ساز و سامان کے بل پر گھمنڈ کیے ہوئے تھا لیکن اللہ نے دونوں لشکروں کو بھڑا دیا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اسے کر دکھائے نیز اسلئے کہ جسے ہلاک ہونا ہے! تمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہنے والا ہے اتمام حجت کے بعد زندہ رہے اور بلا شبہ اللہ سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ إِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ أَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ أَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَآئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ○ بَلٰى إِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَأْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَآئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ط وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ○ (آل عمران)

اور اللہ تمہاری مدد کر چکا ہے بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور حالت میں تھے پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم شکر گزار ہو۔ (یہ جب ہوا) کہ تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کہ تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد کو آسمان سے اترنے والے تین ہزار فرشتے بھیجے، ہاں بلا شبہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور پھر ایسا ہو کہ دشمن اسی دم تم پر چڑھ آئے تو تمہارا پروردگار (بھی) پانچ ہزار نشان رکھنے والوں سے تمہاری مدد کرے گا اللہ نے صرف یہ اسلئے کیا کہ تمہارے لئے خوش خبری ہو اور اس کی وجہ سے تمہارا دل مطمئن ہو جائیں اور مدد نصر جو کچھ بھی ہے اللہ کی ہی طرف سے ہے اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے اور نیز اس لئے کہ منکرین حق کی جمعیت و طاقت کا ایک حصہ بیکار کر دے انھیں اس درجہ ذلیل و خوار کرے کہ وہ نامراد ہو کر الٹے پاؤں پھر جائیں۔

دعائے نصرت

غرض اس حالت میں دونوں فریق جنگ کے لیے صف آرا ہوئے تو اول آپ ﷺ نے مسلمانوں کی صفوف کو درست فرمایا اور پھر اس عریش (خس پوش جھونپڑی) کے نیچے جا کر جو آپ ﷺ کے لئے میدان جنگ میں بنا دی گئی تھی درگاہ الٰہی میں الحاح و تضرع کے ساتھ دعا شروع کر دی اور عرض کیا:

اللهم انجزلی ما وعدتنی اللهم ان تهلك هذه العصابةُ من اهل الاسلام لا تعبد فی الارض۔

خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ (نصرت) فرمایا اس کو پورا کر۔ خدایا! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہو گئے تو پھر خطۂ زمین پر کوئی تیرا عبادت گذار باقی نہیں رہے گا۔

صدیق اکبرؓ نے دیکھا تو قریب آئے اور عرض کیا: خدا کے رسول ! بس کیجیے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

غیبی نصرت وامداد

اور آخر یہی ہوا بھی کہ ہر قسم کے ناساز گار حالات اور اس درجہ کمزوری کے باوجود کہ کسی مسلمان کا اس معرکہ سے صحیح و سالم بچ کر نکل جانا خود ایک معجزہ ہوتا مسلمانوں کو غیبی نصرت وامداد نے بامراد اور کامیاب کیا، فتح اور نصرت نے قدم چومے، اور تاریخ عالم کا ایک بے نظیر اور حیرت زا انقلاب پیش کر دیا فتح اور مشرکین قریش کے تمام سردار اور مشہور نبرد آزما ہی قتل نہیں ہوئے بلکہ شرک و کفر کی اجتماعی طاقت ہی کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ غیبی نصرت کیا تھی؟ قرآن حکیم اس کا جواب متعدد آیات میں یہ دیتا ہے

۱) مسلمانوں کی نگاہ میں دشمنوں کی تعداد اصل تعداد سے کم نظر آئی تاکہ مسلمان مرعوب نہ ہوں او رمشرکین کی نگاہوں میں مسلمان مٹھی بھر معلوم ہوئے تاکہ وہ جنگ سے جی نہ چرائیں اور معرکہ حق و باطل ٹل نہ جائے (الی) اور ایک وقت میں دوگنے معلوم ہوئے تاکہ مسلمانوں سے مرعوب ہر کر رہ جائیں۔ ۔

۲) مسلمانوں کی دعاء پر اول انکی مدد ایک ہزار فرشتوں سے کی گئی اور پھر یہ تعداد بڑھا کر تین ہزار کر دی گئی۔ اور اگر دشمن تم پر یک لخت حملہ کر دے تو ہم تین ہزار کی بجائے پانچ ہزار فرشتوں سے مدد کریں گے ۔

۳) مسلمانوں پر عین معرکہ کے وقت اونگھ طاری کر دی جس کے چند منٹ بعد ان کی بیداری نے ان میں ایک نئی تازگی اور نئی روح پیدا کر دی۔ ۔

۴) آسمان سے پانی برسا کر مسلمانوں کے لئے ریتیلی زمین کو پختہ فرش کی طرح بنا دیا اور نشیب کی وجہ سے حوض نما گڑھے میں پانی مہیا کر دیا اور دشمنوں کی زمین کو کیچڑ کی طرح دلدل بنا ڈالا

نتیجہ جنگ

بہر حال معرکہ جنگ بپا ہوا اور دونوں جانب سے نبرد آزما ایک دوسرے کے مقابل ہو کر ھل من مبارز پکارنے اور داد شجاعت دینے لگے اور پھر یکا یک ہجومی جنگ شروع ہو گئی مسلمان اول تو جنگ مغلوبہ لڑے مگر

فراغت دعاء کے بعد جب میدان جنگ میں آکر نبی اکرم ﷺ نے شاہت الوجوہ "چہرے روسیاہ ہوں" پڑھتے ہوئے مٹھی بھر خاک اور کنکریاں دشمنوں کی جانب پھینکیں تو خدائے برحق کی معجزانہ قدرت نے ہوا کے ذریعہ اس کے ذرات تمام مشرکین کی آنکھوں تک پہنچا دیے اور وہ اس ناگہانی پریشانی سے مضطرب ہو کر آنکھیں ملنے لگے اور جنگ مغلوبہ "جنگ غالبہ" کی شکل میں بدل گئی۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ

(اے محمد ﷺ) اور تو نے جب (کنکریاں) پھینکیں تو درحقیقت تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں (کیونکہ انسانی ہاتھ ایک مٹھی میں اتنے بڑے لشکر کے ہر آدمی پر رمی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا نبی ﷺ کے ہاتھ پر خدا کا معجزہ ہوا۔)

اور دیر نہیں لگی کہ مشرکین کے بڑے بڑے آدمی مارے گئے اور دشمنوں کے پیر اکھڑ گئے وہ بھاگتے تھے مگر بھاگنے کا موقع نہ پاتے تھے چنانچہ ان کے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر گرفتار اور باقی نے راہ فرار اختیار کی۔

مسلمان اگرچہ خدا کی نصرت اور اس کے فضل سے کامیاب ہوئے اور فتح و کامرانی کے مالک بنے تاہم بائیس مجاہدین نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

جنگ بدر نے تاریخ عالم کا رخ بدل دیا

بدر کا معرکہ مؤرخین اور اصحاب سیر سے بھی اگرچہ اپنی تاریخی اہمیت کا اعتراف کراتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ معرکہ بدر ایک ہنگامی معرکہ نہیں تھا بلکہ اس نے قریش مکہ کی قوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کے لئے اعلاء کلمۃ اللہ کی راہیں کھول دیں لیکن وہ بھی اس حقیقت حال سے شاید بے خبر ہیں کہ معرکہ بدر صرف مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی آویزش حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا بلکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت دنیا ایک موڑ پر کھڑی تھی اور تاریخ عالم اشہب تیز گام اس موڑ پر حیران سرگرداں کھڑا تھا کہ کس جانب رخ کرے اسلئے بدر کا انقلاب عالمگیر انقلاب تھا۔

صفحۂ عالم پر اگر بدر کا معرکہ پیش نہ آتا اور مشرکین مکہ کی طاقت شکست و ریخت نہ ہوتی تو بلاشبہ نہ صرف حجاز نہ صرف عرب و عجم بلکہ کائنات ہستی کا ہر ایک بحر و بر ظلم، سرکشی اور باطل سے دوچار رہتا۔ آزادئ ضمیر فنا ہو جاتی جذبات حق مٹ کر رہ جاتے اور سب ظلم و جبر کے بل پر اپنے لئے آپ جگہ پیدا کر لیتے، اب جبکہ بدر کا معرکہ پیش آگیا اور مشرکین مکہ کی قوت ٹوٹ گئی تو دنیا نے موڑ سے آگے بڑھ کر وہ راہ اختیار کر لی آزادئ ضمیر، عدل و انصاف، حق پرستی اور نکوکاری کی راہ تھی جہاں ضعیفوں کی نصرت فرض اور بیچاروں کیلئے چارۂ کار مہیا تھا اس لئے خدا کا یہ عظیم الشان احسان کہ بدر میں حق کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں تھا بلکہ تمام کائنات انسانی پر احسان عظیم تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب فرمایا:

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے جنگ واٹرلو

کے تمام مؤرخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کی درمیانی شب میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا کیوں کہ اس صورت میں نپولین کو زمین خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار کرنا پڑتا۔ سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ویلنگٹن کو شکست ہو جاتی، واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا۔ لیکن اگر بدر میں نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت وسعادت کا نقشہ الٹ جاتا۔ اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی دعاء میں اشارہ کیا تھا۔ اللھم ان تھلك ھذہ العصابة فلا تعبد فی الارض خدایا! اگر خدام حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہیں رہے گا۔ (ترجمان القرآن، جلد ۲ ص ۵۶، ۵۷)

قرآن عزیز کی روشنی میں غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

غزوۂ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں خصوصاً اس مسئلہ میں تو سلف وخلف میں سے کسی کی بھی دورائے نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلہ پر حملہ مقصود تھا لیکن وادیٔ ذفران میں پہنچ کر قدرتی حادثہ نے ایک دوسرے مقابلہ سے دوچار کر دیا اور یہ مشرکین مکہ وہ یورش تھی جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ظہور میں آئی اور اب مسلمانوں کو "عیر ونفیر"[1] دو کے ساتھ واسطہ پڑ گیا اس لئے یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو بذریعہ وحی یہ بشارت سنائی گئی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے گا اور بعض مسلمانوں نے اگرچہ انسانی کمزوری کی بناء پر نفیر کے مقابلہ میں عیر کو ترجیح دینے کا خیال ظاہر کیا مگر نبی اکرم ﷺ کو وحی نے اطلاع کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ نفیر کے مقابلہ کو مقدر کر چکا ہے اور اس کا وعدہ اسی شکل میں پورا ہوگا اس لئے ذات اقدس ﷺ کا رجحان اسی جانب ہوا اور مشورہ کے بعد آخر وہی فیصلہ ہوا جو خدا اور خدا کی مرضی تھی۔

چنانچہ قرآن عزیز کی آیات

كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ (الانفال: ۸:۵)

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ
(الانفال: ۸:۴۲)

اسی حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں۔

مگر جمہور کے ان مسلمات کے خلاف مولانا شبلی (مرحوم مغفور) نے سیرۃ النبی جلد اول میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمان شروع ہی میں مدینہ سے صرف "نفر" کے لئے نکلے تھے اور خدا کے وعدہ "عیر ونفیر" کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے عیر ونفیر کے متعلق جو کچھ مشورہ کیا اور صحابہؓ نے جو کتب سیر میں مذکور زبردست تقاریر فرمائیں وہ سب وادیٔ ذفران میں نہیں بلکہ مدینہ ہی میں ہو چکا تھا۔

۱: عیر۔ تجارتی قافلہ اور نفیر دشمنوں کا لشکر۔

مولانائے مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے طویل بحث فرمائی ہے اور احادیث و سیر میں مذکور واقعات کی ترتیب کا اس لئے انکار کر دیا ہے کہ وہ اس ترتیب کو قرآن کی تصریحات کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ کہ بعض صحیح احادیث و روایات بھی ان کے خیال کی ہی تائید کرتی ہیں۔

چونکہ یہ مسئلہ علمی نظر و فکر سے تعلق رکھتا ہے اس لئے از بس ضروری ہے کہ قرآن عزیز ہی کی روشنی میں مناظرانہ اسلوب سے بچ کر خالص تحقیقی رنگ میں اس پر ”محاکمہ“ کیا جائے تاکہ اصل حقیقت واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کی تفصیلات دیتے ہوئے دو جگہ بصراحت اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ نفیر کا معاملہ مدینہ سے عیر کی خاطر نکلنے کے بعد اچانک سامنے آیا اور اس لئے بعض مسلمانوں نے نفیر کے مقابلہ کو ابتداء خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور گراں محسوس کیا۔

۱) پہلا مقام سورۂ انفال کی وہ چند آیات ہیں جو كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ سے شروع ہو کر وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ تک مسلسل چلی گئی ہیں جو تقریباً سات یا آٹھ آیات ہیں۔

قرآن عزیز نے ان آیات میں اس پورے واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے جو معرکۂ بدر میں از اول تا آخر پیش آیا یعنی مدینہ سے نکلنے پر مسلمانوں کے سامنے کیا کیا صورتیں پیش آئیں وہ سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کی گئی ہیں پس جس طرح كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ کے ساتھ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ کا تعلق ہے، اسی طرح وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اور اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ اور اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ - وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً وغیرہ واقعات کا بھی تعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مولانا شبلی مرحوم بھی جمہور کے ساتھ اس پر متفق ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا درگاہ الٰہی میں استغاثہ پیش کرنا، ملائکہ مدد کا آنا، مسلمانوں پر اونگھ طاری کر کے تازہ دم کر دینا، آسمان سے پانی کا برس کر مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہونا یہ کل معاملات اس آن ہی نہیں پیش آگئے تھے جس آن میں مسلمان مدینہ سے نکلے تھے بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ تھا جو ایک مدت کے اندر وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔

پس اگر بقول مولانائے مرحوم آیت كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ میں اس آن کے ماسوا جو مدینہ سے خروج کے ساتھ مربوط ہے اور کچھ مراد نہیں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ باقی وہ تمام واقعات جو اس آیت کے ساتھ مربوط کر کے بیان ہوئے ہیں گو کلام مستانف ہے کی حیثیت میں کیوں نہ ہوں“ وہ سب بھی ایک ہی آن سے متعلق اور ظاہر ہے کہ یہ قطعاً باطل اور خلاف واقعہ ہے اس لے اس آیت کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ قرآن عزیز عام بول چال اور محاورہ کے مطابق یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو ذرا اس واقعہ کی جانب بھی نظر کرنی چاہیے۔

”جب پروردگار نے تم کو ایک مرتبہ مدینہ سے باہر حق کی خاطر نکالا تھا اور تمہارے سامنے ایسی صورت حال پیش آگئی تھی کہ تم پر یہ گراں گذرنے لگا تھا کہ کیوں ہم مدینہ سے باہر نکلے کہ آخر ہمارے سامنے یہ صورت گراں بار آگئی اور یہ وہ وقت تھا جبکہ خدا نے تم سے ”عیر و نفیر“ میں سے

ایک کا وعدہ کیا وغیرہ وغیرہ۔"

یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین آیت وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِهُوْنَ کے **متعلق** عربیت کے قاعدہ سے یہ فرما رہے ہیں:

والجملة فی موضع الحال وهی حال مقدرة لان الکراهة وقعت بعد الخروج کما تراه ان شاء الله تعالیٰ و یعتبر ذٰلك ممتداً۔

(روح المعانی جلد ۹ ص ۲۵۱ و ابن کثیر و روح البیان والبحر المحیط وغیرہ)

اور یہ جملہ واقع ہو رہا ہے اور یہ حال مقدرہ ہے اس لئے کہ جس کراہت کا آیت میں ذکر ہو رہا ہے وہ مدینہ سے نکلنے کے بعد پیش آئی تھی جیسا کہ ان شاء اللہ ابھی تجھ کو معلوم ہو جائے گا یا یوں کہئے کہ یہ اس پوری حالت کا نقشہ بیان ہو رہا ہے جو مدینہ سے نکلنے کے وقت سے معرکۂ بدر کے ختم تک پیش آئی یعنی اخرجک میں اخراج سے زمانۂ ممتد مراد ہے آنی مراد نہیں ہے۔

تو اب صورت حال یہ بنی کہ جو شخص لَکٰرِهُوْنَ میں مذکور واقعۂ کراہت کو آنی قرار دیتا ہے اور اس پورے واقعہ کو مدینہ کے اندر ہونا ثابت کرتا ہے اس کے پاس تو صرف ایک ایسا تخمینی احتمال ہے جس کا ثبوت ان قرائن سے قطعاً نہیں ملتا جو مابعد آیات میں موجود ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ آیت اَخْرَجَكَ میں اخراج آنی نہیں ہے بلکہ وہ ممتد مدت مراد ہے جس میں یہ معرکہ پیش آیا تو بعد کی تمام آیات بلاشبہ اس کے دعوے کے لئے واضح قرینہ بنتی اور دعوے کی تصویب کرتی نظر آتی ہیں۔

۲) دوسرا مقام سورۂ انفال ہی کی وہ آیات ہیں جو مَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ سے شروع ہو کر وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ پر ختم ہوتی ہیں ان آیات میں قرآن حکیم نے اول مسلمانوں اور مشرکوں کے محاذ جنگ کے نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ مسلمانوں کا محاذ جنگ مدینہ سے قریب وادی میں تھا اور مشرکین مکہ ان کے بالمقابل جانب بعید کی وادی میں خیمہ زن تھے اور اس وقت ابوسفیان کا قافلہ مسلمانوں کی وادی سے نیچے نیچے سمندر کے کنارے اس طرح گذر رہا تھا کہ وہ مکی فوج کی پشت پر کہ اگر وہ چاہے تو مسلمانوں کی زد سے محفوظ ہو کے بے خوف اپنی فوج کی مدد کر سکتا ہے:

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لے اس درجہ ناسازگار تھی کہ اگر تقدیر الٰہی یہ فیصلہ نہ کر لیتی کہ بدر کا معرکہ ضرور پیش آئے گا اور اس کے انجام مسلمانوں کے حق میں ہو گا اور جنگ کے معاملہ کو مسلمانوں اور مشرکوں کے باہمی عہد و پیمان پر چھوڑ دیا جاتا ہو مسلمان آپس میں بھی مختلف المیعاد ہو جاتے، بعض کہتے کہ اس میدان میں حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے تو اچھا ہے اور بعض کہتے کہ ہم ان ناسازگار حالات میں ہرگز جنگ کی طاقت نہیں رکھتے اس لئے دوسرے وقت کے لے اس جنگ کو ٹال دینا چاہئے اور نفیر کی جگہ عیر کو قبضہ میں کر لینا چاہیے جیسا کہ پیش آیا اور بعض کو جنگ کا معاملہ سخت گراں گذرا، اور ہو سکتا تھا کہ سب ہی مسلمان یہ چاہتے کہ اس وقت معرکۂ جنگ بپا نہ ہو اور مشرکین اپنے ساز و سامان کے زعم پر یہ اصرار کرتے

کہ اسی وقت اور اسی جگہ معرکہ ہو جانا ازبس ضروری ہے اور یہ نقشہ سامنے آجاتا وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ مگر ہوا یہ کہ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا۔

ان آیات میں قابل غور بات یہ ہے کہ اگرچہ مشرکین مکہ کی فوج کشی کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا اور نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں سے مدینہ ہی میں وہ مشورہ فرمایا تھا جس کا ذکر تمام کتب حدیث و سیرت میں موجود ہے اور اسی مقام پر خدا نے اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ کا وعدہ فرما کر اپنے نبی کو وحی کے ذریعہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکہ حق و باطل کی ہے قافلہ پر تسلط کی نہیں ہے تو پھر عقل حیران ہے کہ ان تمام امور کے معلوم ہو جانے کے بعد مسلمان خود کو کس لے بے سر و سامان سمجھ رہے تھے اور کس وجہ سے بعض مجاہدین اسلام جنگ سے جی چرا رہے تھے جبکہ مدینہ میں مسلمانون کے پاس ہزاروں اونٹ موجود تھے گھوڑے بھی کم نہیں تھے سو پچاس گھوڑوں کا مہیا ہونا معمولی بات تھی، تلواروں او رنیزوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ جب ان کو دشمنوں کی عددی طاقت کا بھی صحیح اندازہ تھا تو آخر وہ کیا سبب تھا کہ مسلمان جن میں انصار بھی ہیں اور مہاجرین بھی صرف تین سو تیرہ ہی کی تعداد میں کیوں نکلے؟ اور نکلے بھی ہیں بے سر و سامانی کے ساتھ کہ نیزے اور تلواریں تک بھی ہر ایک کے پاس موجود نہیں چہ جائکہ باقی سامان حرب و ضرب مکمل ہوتا اور کیا بدر کے اس واقعہ کے علاوہ کسی بھی ایسے غزوہ یا سریہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس کے لئے مدینہ میں بیٹھ کر تیاری فرمائی ہو اور مسلمانوں میں دشمن کے مقابلہ کے لئے وہ ہراسانی اور گرانی پیدا ہوئی ہو جس کا ذکر قرآن ان جملوں میں کرتا نظر آتا ہے

وَإِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُوْنَ إِلَى الْمَوْتِ

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ

کیا ہمارے سامنے غزوۂ تبوک (غزوۂ عسرت) کا نقشہ موجود نہیں ہے کہ دشمن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے اور مشرکین مکہ جیسے غیر متمدن نہیں بلکہ متمدن عیسائی طاقت سے معاملہ ہے جو ہر قسم کے متمدن ساز و سامان جنگ سے مسلح ہے اور پھر نبی اکرم ﷺ مدینہ میں نہیں مدینہ کے قرب و جوار میں نہیں بلکہ خود دشمن کے گھر پر جا کر معرکۂ حق و باطل گرم کرنا چاہتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک مسلمان بھی ہراساں نہیں، گران خاطر نہیں بلکہ پروانہ وار نثار ہونے کو ایک دوسرے پر بازی لیجانے کے لے مدینے سے تبوک کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان در حقیقت اس بے سر و سامانی کے ساتھ لڑنے کے لئے نہیں بلکہ قافلہ پر قبضہ کرنے کے لئے نکلے تھے اور اس کیلئے یہ جمعیت اور یہ صورت حال کافی تھی لیکن بدر کے قریب پہنچ کر اچانک صورت حال تبدیل ہو گئی اور مسلمانوں کو دو باتوں کا ایک ساتھ علم ہوا: ابو جہل مکہ سے لشکر کشی کر کے آرہا ہے

اور ابو سفیان کا قافلہ بدر سے گذر کر مکہ جارہا ہے تب وہ سب کچھ پیش آیا جس کو تفصیل کے ساتھ سن آئے ہو اور یہی وہ حالت تھی جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا:

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعَادِ

بہر حال ان ہر دو مقامات کا تبادر کلام الٰہی کا سیاق و سباق اور آیات کے اندر موجود قرائن و دلائل کے سامنے مصنف سیرت النبی کا كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ کے اجمال سے بے دلیل ایک دعویٰ کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور آیت وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ میں 'و' حالیہ کے لیے بقاعدۂ عربیت ہر گز یہ ضروری نہیں کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ اس طرح ایک ہو کہ دونوں آن واحد سے وابستہ ہوں بلکہ زمانہ کا امتداد نہ صرف ممکن الوقوع بلکہ اکثر الوقوع ہوتا ہے نیز "حال مقدرہ" کی مثالیں کلام عرب میں بیشتر موجود ہیں اور حال مقدرہ کا حاصل یہ ہے کہ جو واقعہ کسی ایک بات کی بناء پر آئندہ قریبی زمانہ میں پیش آنے والا ہے اس کو بر سبیل تقدیر واو حالیہ کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ اسی آن پیش آیا ہے کیونکہ اس کو پیش آنا یقینی ہے اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ مدینہ سے خروج اس حالت میں ہوا کہ جب صورت حال نازک بن کر سامنے آئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ پر گراں گزرنے لگا کہ اے کاش! مدینہ سے کیوں نکلے جو اس صورت کے ساتھ دوچار ہونا پڑا۔

۳) یہ بھی واضح نہیں ہے کہ کاروان تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح بچ کر نکل گیا تھا کہ مسلمان اس کا تعاقب نہ کر سکیں اور اس کو قابو میں نہ لا سکیں چنانچہ آیت وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ اس پر صاف دلالت کر رہی ہے البتہ مسلمانوں کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ جو کچھ قافلہ کے متعلق معلوم ہوا تھا اس کے پیش نظر یہ خیال اب بھی تھا کہ ابو سفیان کا قافلہ بدر ہی کے راستہ سے گذرے گا اور اس لئے وہ وادیٔ ذفران میں مشورہ کے وقت کاروان تجارت کے طالب تھے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا کہ دونوں میں سے کسی ایک گروہ پر تم کو ضرور مسلط کر دیں گے در حقیقت حال کے پیش نظر ہی یہ بھی اپنے رسول کو بتلا دیا کہ عیر سے نہیں بلکہ نفیر سے تم کو واسطہ پڑے گا اور تم کامیاب ہو گے۔

اس صورت حال کو اگرچہ بعض اصحاب سیرت نے واضح نہیں کیا مگر محققین ارباب سیر نے اس حقیقت کو مستند روایات سے ثابت کیا ہے:

چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری اور شیخ بدر الدین عینیؒ نے عمدۃ القاری میں بسند اس واقعہ کو حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ و نحن باا لمدينة انی اخبرت عن عير ابی سفيان انها مقبلة فهل لكم ان تخرجوا و قبل هذه العير لعل الله يغنمنا ها فقلنا نعم فخرج و خرجنا فلما سرنا يوماً او يومين قال لنا ما ترون فی قتال القوم فانهم قد اخبروا بخروجكم

فقلنا لا واللہ ما لنا طاقة لقتال العدو ولكنا اردنا العير۔
(الحدیث، تفسیر ابن کثیر برحاشیہ فتح البیان۔ جلد ۴ ص ۲۶۱)

ہم مدینہ میں تھے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: مجھے ابھی معلوم ہوا کہ ابی سفیان کا کاروان تجارت شام سے آرہا ہے کیا تم تیار ہو کہ اس سے قبل اس کی راہ گھیر لو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس بہانہ ہم کو مال غنیمت عطا کردے ہم سب نے عرض کیا ہاں پس آپ ﷺ بھی نکلے اور ہم بھی نکلے ابھی ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہل مکہ فوج کشی کے ارادہ سے آرہے ہیں اب کیا ارادہ ہے؟ تب ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! قسم بخدا اس حالت میں ہم میں دشمن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے البتہ قافلہ پر حملہ کا ارادہ ضرور ہے۔

یہ اور اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں جن میں صراحت ہے کہ مسلمان وادیٔ ذفران میں کاروان تجارت پر حملہ آور ہونے کے متوقع تھے اور وجہ یہی تھی کہ ان کے جاسوسوں نے بدر میں اس کے آنے کی خبر کردی تھی۔

۴) آیت وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ میں جمہور کے نزدیک نبی اکرم ﷺ اسی جانب ہیں جس جانب خدا ہے اور جب بعض مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ کے رخ کو پہچان لیا تو پھر وہ بھی خدا اور خدا کے رسول ﷺ کی مرضی کے ساتھ ہوگئے اس لئے اس حقیقت کو ان جذباتی الفاظ سے بے حقیقت نہیں بنایا جاسکتا۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں دوسری طرف خدا ہے (جو چاہتا ہے) کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اب سوال یہ ہے کہ رسول ﷺ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔ (سیرۃ النبی، جلد ۱، ص ۲۳۱)

۵) واقعہ کی نوعیت دراصل وہ نہیں ہے جس کو بزعم خود مصنف سیرت النبی نے گڑھ کر بیان کردیا اور پھر اس پر سوالات قائم کردیے بلکہ نوعیت واقعہ وہ ہے جس کو ہم بصراحت و بدلائل ابھی بیان کر آئے ہیں اور جس کو تسلیم کرنے کے بعد شبہ اور اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

۶) لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۰ مسلمانوں میں جو لوگ صحیح و تندرست ہوتے ہوئے بھی گھروں میں بیٹھے رہے تو وہ ان کے برابر ہرگز نہیں ہوسکتے جو اپنی جان و مال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔

بیشک صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہوسکتے اور یہ صحیح ہے کہ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ پہلے آیت میں غیر اولی الضرر کا جملہ نہیں نازل ہوا تھا تو آیت سن کر حضرت عبد اللہ بن ام مکتومؓ خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور اپنے نابینا ہونے کا عذر کیا اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا غیر اولی الضرر۔

لیکن اس کے باوجود مصنف سیرت النبی کا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے:

"یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔"

یہ نتیجہ اخذ کرنا اس لے درست نہیں ہے کہ اس آیت کے شان نزول کے متعلق تین صحابیوں سے روایات منقول ہیں ان میں سے دو صحابہ زید بن ثابت اور براء بن عازب غزوۂ بدر سے جدا اس کا نزول بیان کرتے ہیں۔ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ بدر کے ساتھ اس کو وابستہ فرماتے ہیں لہٰذا اس اختلاف کو دیکھ کر مشہور اور محقق محدثین اور شارحین بخاری، ابن تین اور بدر الدین عینیؒ یہ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کا یہ عام قاعدہ ہے کہ اگر کسی آیت کا تاریخی اور حقیقی شان نزول ایک خاص واقعہ سے متعلق ہو لیکن اس آیت کے مفہوم و مصداق میں جس قدر واقعات جزئیات داخل ہو سکتی ہیں ان سب کے متعلق یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس آیت کا تاریخی شان نزول یہ واقعہ ہے۔ (فتح الباری، جلد ۸ ص ۲۱۱ مصری و عینی جلد ۸ ص ۵۲۲)

لہٰذا جبکہ تمام علماء تفسیر اس پر متفق ہیں کہ اس آیت کا تاریخی شان نزول بدر کا واقعہ ہے تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ ارشاد اسی عموم کے اعتبار سے ہے جبکہ بدر کے معرکہ میں بھی مسلمان دو حصوں میں منقسم تھے ایک شریک جنگ اور دوسرے مدینہ میں مقیم تو بلا شبہ فضیلت درجات میں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے بطریق تفسیر یہ فرمایا ہے لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ عن بدر و الخارجون الی بدر بطور واقعہ اس کو نقل نہیں کیا اور اسی لئے حضرت عبد اللہ بن مکتومؓ کا بھی ذکر نہیں فرمایا اور ترمذی میں اس قسم کی تفصیل اگر منقول ہے تو خود ترمذیؒ نے یہ کہہ کر اس تفصیل کو کمزور کر دیا ہے۔ هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه من حديث ابن عباس یہ حدیث اس تفصیلی طریقہ پر ابن عباسؓ سے بسند حسن غریب ثابت ہوئی یعنی اس ایک راوی کے علاوہ دوسرا کوئی طریق سند موجود نہیں ہے جس میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت میں حضرت عبد اللہ بن ام مکتومؓ کا واقعہ منقول ہو اور اسی لئے امام بخاریؒ نے تفصیل کو قابل ترک سمجھ کر فقط تفسیر کو ہی لیا ہے۔

پس اس آیت کو بھی اپنے دعوے کے لیے سند بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

۷) کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکے ہوئے نکلے اگر قریش صرف قافلہ تجارت کے بچانے کیلئے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لئے کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے الخ"

یہ بھی مصنف سیرت النبی کا ایک انوکھا استدلال ہے اس لئے کہ جن روایات میں یہ ہے کہ کفار قریش قافلۂ تجارت کے بچانے کے لے نکلے ان ہی میں یہ بھی بصراحت موجود ہے کہ جب ابو سفیان نے قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ہم مسلمانوں کی زد سے بچ گئے ہیں تم اب مکہ واپس چلے جاؤ تو ابو جہل نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اب تو ہم مسلمانوں کا قلع قمع کر کے ہی جائیں گے اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے کفار قریش کو بدر کی جانب اس نخوت کے ساتھ پیش قدمی کے لئے ابھارا جس کا ذکر قرآن حکیم اس آیت میں کر رہا ہے۔

اس کے بعد مولانائے مرحوم نے احادیث سے اپنے مقصد کی تائید چاہی ہے اور اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ تمام ذخیرۂ حدیث میں کعب بن مالک کی روایت کے علاوہ کہیں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت ﷺ بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت پر حملہ آوری کے لئے نکلے نیز کعب بن مالکؓ کی روایت مولانا کے نزدیک متعدد وجوہ سے قابل منقول ہے:

عن عبد اللّٰه بن كعب قال كعب لم اتخلف عن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فى غزوة غزاها الا غزوة تبوك غير انى كنت تخلفت فى غزوة بدر و لم يعاتب احد تخلف عنها انما خرج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يريد عير قريش حتى جمع اللّٰه بينه وبينهم على غير ميعاد۔

کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں میں رسول اکرم ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہیں تھا اور جو اس میں شریک نہیں ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں کیوں کہ آنحضرت ﷺ قریش کے قافلہ کے لئے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔

حضرت کعبؓ کی اس روایت کی تائید ذخیرۂ حدیث میں دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے چنانچہ گذشتہ صفحات میں ابوایوب انصاریؓ کی حدیثیں جس کو ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم سے تمام محدثین وارباب سیر نے نقل کیا ہے گذر چکی ہے اس میں صراحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اول مدینہ سے ابوسفیان کے قافلہ کے لئے نکلے اور جب ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کفار مکہ کا لشکر مقابلہ کے لئے آرہا ہے تب آپ ﷺ نے پھر مشورہ کیا اور اسی مشورہ میں بعض مسلمانوں نے جنگ کے حق میں گرانی کا اظہار کیا اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں کعبؓ کی روایت اس کو ظاہر نہیں کرتی کہ نبی اکرم ﷺ کا معرض بحث ہونا تو یہ دعویٰ خود محل نظر ہے جو حسب ترتیب لائق توجہ ہے:

۱) فرماتے ہیں کہ حضرت کعب چونکہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اس لئے ان کی روایت اس موقع پر مشاہدہ و واقعیت کی روایت نہیں۔

میدان استدلال میں یہ عجیب دلیل ہے اس لئے کہ جب مصنف سیرت النبی کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ سے شروع ہی میں کفار قریش سے جنگ کے ارادہ سے نکلے تھے اور مدینہ میں ہی مشورہ فرمایا تھا تو کعب بن مالکؓ خواہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوئے ہوں لیکن مدینہ میں بہر حال موجود تھے اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی اکرم ﷺ انصار و مہاجرین سے مشورہ فرمائیں اور موجودہ صحابہؓ شرکت نہ کریں۔ لہٰذا حضرت کعبؓ کی روایت کو مشاہدہ و واقعیت کی روایت تسلیم نہ کرنا قطعاً بے سند ہے البتہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جنگ کے متعلق مشورہ مدینہ سے باہر کسی وادی میں ہوا تھا تب یہ بیشک کہا جا سکتا ہے کہ کعبؓ اگر اس مشورہ کے متعلق کچھ فرمائیں تو وہ مشاہدہ و واقعیت کی روایت نہیں ہوگی کیونکہ وہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے۔

۲) اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی اہمیت کم ہو جائے تاکہ عدم شرکت سے ان کا وزن کم نہ ہو۔ الخ۔

مولانا کا ایک صحابی کے متعلق یہ سوء ظن بھی قطعاً بے سند اور بے دلیل ہے اسلئے کہ حضرت کعبؓ بدر کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہی اس کو اس پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی عدم شرکت کے لئے یہ معذرت پیش کریں کہ ان کو یہ سعادت اس لئے نصیب نہ ہو سکی کہ جب مسلمان مدینہ سے نکلے تھے تو چوں کہ کاروان تجارت کے لئے نکلے تھے اس لئے سب کی شرکت ضروری نہیں تھی تاہم جو نکلے ان کو وہ بے نظیر شرف ہاتھ آ گیا جس سے ہم جیسے محروم رہ گئے۔

کعب بن مالکؓ کی اس روایت میں ایک اور باریک نکتہ مستور ہے جو مولانا کے دعوے کو یکسر پادر ہوا بنا دیتا ہے وہ یہ کہ حضرت کعبؓ اس جانب بھی توجہ دلا رہے ہیں کہ اگر بدر کا معرکہ غزوۂ تبوک کی طرح مدینہ کے اندر ہی طے شدہ ہوتا اور نبی اکرم ﷺ مدینہ سے اس ہی غرض کے لئے نکلتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس قدر اہم اور عظیم الشان غزوہ کے لئے نفیر عام نہ ہوتا اور جو لوگ جی چرا کر یہاں بیٹھ رہتے واپسی پر ان سے باز پرس نہ کی جاتی جبکہ غزوۂ تبوک میں انہی کعبؓ اور ان کے دو رفقاء سے عدم شرکت پر اس قدر سخت باز پرس ہوئی تھی کہ ذات اقدس ﷺ نے ان کے مقاطعہ کا حکم صادر فرما دیا تھا اور جب تک ان کی توبہ کے قبول پر وحی الٰہی کا نزول نہیں ہوا تقریباً پچاس دن مقاطعہ کا سلسلہ جاری رہا اس لئے یہ یقین کرنا چاہیے کہ غزوہ تبوک میں مجھ پر ناراضی کا اظہار اور مقاطعہ کا اعلان اور بدر میں ان امور کا فقدان بلاشبہ اس لئے تھا کہ معرکۂ بدر ارادی نہیں تھا بلکہ حسب اتفاق بالکل اچانک پیش آ گیا اور درحقیقت نبی اکرم ﷺ اور مسلمان مدینہ سے عیر کے ہی لئے نکلے تھے غرض حضرت کعبؓ غزوۂ بدر کی حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے عذر عدم شرکت کی معقولیت کو ظاہر کرنا اور واقعہ کی نوعیت کو واشگاف کرنا چاہتے ہیں۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ مصنف سیرت النبی ﷺ تو یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن ناطق کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ سے ہی کفار قریش کے مقابلہ میں نکلے اور ان کے بقول احادیث بھی یہی صراحت کر رہی ہیں لیکن کعبؓ بن مالک پر ساری عمر یہ حقیقت آشکارا نہ ہو سکی ہاں یہ حقیقت جدا ہے کہ مولانا کے نزدیک کعبؓ بن مالک اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کیلئے جان بوجھ کر کذب بیانی تک پر آمادہ ہو گئے مگر میں تو اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔

۳) مولانا کے نزدیک بخاری میں مذکور کعب بن مالک کی روایت حضرت انسؓ کی اس روایت کے خلاف ہے جو مسلم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے:۔

عن انس ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکر فاعرض عنہ ثم تکلم عمر فاعرض عنہ فقام سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول اللّٰہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضھا البحر لاخضناھا .... (مسلم)

حضرت انسؓ سے مروی ہے آنحضرت ﷺ کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے مشورہ طلب کیا، حضرت ابوبکر بولے تو آپ ﷺ نے توجہ نہ فرمائی۔ پھر حضرت عمرؓ بولے آپ ﷺ نے ان کی

طرف بھی توجہ نہ کی پھر سعد بن عبادہؓ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ ﷺ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے، خدا کی قسم اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے۔ الخ۔

یعنی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال ہوا تو اسی وقت آپ ﷺ نے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی، اور ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا ہے اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپ ﷺ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی۔

مگر مولانا کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس روایت میں راوی نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے وہ یہ کہ اس نے انصار مقررین میں سعدؓ بن عبادہؓ کا نام لیا ہے حالانکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اور تمام ذخیرۂ حدیث میں اس تقریر کو حضرت مقدادؓ کی جانب منسوب کیا گیا ہے اور یہی صحیح اور درست ہے البتہ سعد بن عبادہؓ نے اسی قسم کی تقریر حدیبیہ کے موقع پر کی تھی جس کا ذکر رویات میں بکثرت موجود ہے تو ثابت ہوا کہ اس روایت نے واقعہ کو خلط ملط کر دیا ہے پس حدیث انسؓ کے ابتدائی جملوں میں بھی یا تو ابہام واجمال ہے اور یا راوی کے وہم کی وجہ سے مدینہ کے ابتدائی مشورہ اور وادئ ذفران کے مشہور تاریخی مشورہ کے درمیان خلط ہو گیا ہے، چنانچہ مشہور محدث اور بخاری کے شارح حافظ ابن حجرؒ بھی روایت انسؓ کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں۔

ووقع فی مسلم ان سعد بن عبادة هوالذی قال ذلك وكذا اخرجه ابن ابی شيبة من مرسل عن عكرمة و فيه نظر لان سعد بن عبادة لم يشهد بدراً ويمكن الجمع بان النبی صلی اللہ عليه وسلم استشارهم فی غزوة بدر مرتين، الاولیٰ وهو بالمدينة اول ما بلغه خبر العير مع ابی سفيان و ذلك مبين فی رواية مسلم ووقع عند الطبرانی ان سعد بن عبادة قال ذلك بالحديبية و هذا اولیٰ بالصواب۔

اور مسلم میں ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے وہ تقریر کی جو مقدادؓ کی جانب منسوب ہے اور ابن ابی شیبہؒ نے بھی مصنف میں اسی طرح عکرمہ کے مرسل کے ذریعہ نقل کیا ہے اور س پر اعتراض واقع ہوتا ہے اسلئے کہ سعد بن عبادہؓ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے ہاں حدیث مسلم کے اس مضمون کو دوسری صحیح حدیث کے ساتھ اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ دراصل بدر کے معاملہ میں دو مشورے ہوئے ہیں: ایک مدینہ کے اندر ہوا جب نبی اکرم ﷺ کو ابوسفیان کے قافلہ کا حال معلوم ہوا مسلم کی روایت میں شاید اس کا ذکر ہے اور دوسرا مشورہ راستہ میں وادی ذفران میں ہوا جیسا کہ فتح الباری میں بصراحت مذکور ہے طبرانی میں ہے کہ دراصل سعد بن عبادہؓ کی یہ تقریری حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی (اور راوی نے اس جگہ خلط ملط کر دیا ہے) اور یہی صحیح اور درست ہے)

غرض حضرت انسؓ کی حدیث سے بھی مولانا کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ انصار جب قافلہ کے لیے مدینہ سے نکل چکے تھے تو پھر اس اہمیت کے ساتھ وادئ ذفران میں ان کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی تھی تو یہ شبہ بھی نادرست ہے کیونکہ سابق میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ سے

نکلتے وقت بھی ابوسفیان کے قافلہ پر قابض ہونے کے لئے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا تھا وہ غالباً اس لئے کیا ہو گا کہ انصار بھی شریک ہونا چاہتے ہیں اور جب اچانک جنگ کا یہ معاملہ بہت ہی شدید پیش آگیا اور صورت حال انتہائی نازک ہوگئی تو انصار سے دریافت کرنا ازبس ضروری تھا کہ اس حالت میں بھی وہ مدینہ سے باہر معرکہ آرائی کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔

بہر حال بخاری، نسائی، ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں مذکور غزوہ بدر سے متعلق روایات کے خلاف مسلم کی روایت انسؓ کے آخری ٹکڑوں میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ سب اسی مشورہ سے متعلق ہے جو وادیٔ ذفران میں مدینہ سے باہر ہوا تھا اور تمام صحیح روایات کے خلاف یہ راوی کا وہم ہے کہ اس نے پہلے ٹکڑے کے ساتھ دوسرے ٹکڑوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ ابوسفیان کے قافلہ کے وقت ہی پیش آیا تھا۔

اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ اس روایت میں کفار قریش سے جنگ کا اشارہ تک بھی نہیں ہے کہ مولانا کے لیے دلیل ہو سکے بلکہ ابوسفیان کے قافلہ ہی کو مذکور ہے اس لئے مولانا کو پھر اس روایت کے ٹکڑوں کو بھی اپنے موافق بنانے میں تکلفات کرنے پڑتے ہیں۔

اسی طرح مولانائے مرحوم کا حضرت علیؓ کی اس روایت سے استناد بھی صحیح نہیں جس میں بدر کے واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

عن علی قال لما قدمنا المدينة اصبنا من اثمارها فاجتوينا و اصابنا بها وعك و كان النبی ﷺ يتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشركين قد اقبلوا سار رسول الله ﷺ الى بدر و بدر بئر فسبقنا على المشركين اليها.............(الحديث)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے اس لئے ہم (بیمار ہوگئے) آنحضرت ﷺ بدر کو پوچھا کرتے تھے جب ہم کو خبر ملی مشرکین آرہے ہیں تو رسول اللہ ﷺ بدر کو چلے بدر ایک کنویں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے آپہنچ گئے۔

یہ روایت طویل ہے مگر اس میں ابتدائی واقعات کو نظر انداز کر کے صرف معرکے کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے چنانچہ اس میں نہ مدینہ کے اندر مشورہ کا ذکر ہے نہ بعض مسلمانوں کی کراہت اور گرانی کا تذکرہ ہے اور نہ مہاجرو انصار کی ولولہ انگیز تقاریر مذکور ہیں حتیٰ کہ مسلمانوں کی تعداد اور بے سروسامانی تک کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے اور اس پر طرہ یہ کہ مدینہ کی آمد کے وقت مہاجریں کی ناموافق آب وہوا کے بعد ہی متصل بدر کے واقعہ کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے حالانکہ اس درمیان میں کتنے سرایا اور دوسرے اہم واقعات پیش آچکے تھے جو کتب احادیث میں بسند صحیح منقول ہیں۔

پس اگر حضرت علیؓ کی یہ روایت اس بات کیلئے سند ہو سکتی ہے کہ اس میں قافلہ کے لئے نکلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ مشرکین مکہ سے جنگ کا ہی ذکر ہے تو بلا شبہ یہ روایت اس شخص کے لئے ہی سند ہو سکتی ہے جو بدر کے معرکے سے متعلق ان تمام ابتدائی واقعات کا انکار کر دے جس کا اس روایت میں ذکر موجود نہیں حالانکہ قرآن اور دوسری روایات میں بصراحت وہ واقعات مذکور ہیں۔

روایت ودرایت کا مسلمہ اصول ہے کہ جب ایک ہی واقعہ سے متعلق مفصل و مجمل دونوں قسم کی روایات بسند صحیح موجود ہوں تو ہمیشہ مجمل کی تفصیل و تشریح مفصل ہی کے ذریعہ کی جائے گی اور اگر چہ بہت سے مقامات پر مولانا بھی اس کو تسلیم فرماتے ہیں مگر یہاں نہ معلوم کیوں نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔

تفصیل واجمال کی اس حقیقت کے پیش نظر ابن جریرؒ نے اپنی تاریخ میں امام احمدؒ نے مسند میں، ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں اور بیہقیؒ نے دلائل میں بدر کی مفصل و مجمل روایات کی ضمن میں اس روایت کو بھی نقل کر دیا ہے اور جن روایات میں قافلہ کا تذکرہ ہے اور جن میں نہیں ہے ان سب کو بیان کر کے ایک دوسرے کے متضاد نہیں سمجھا ہے۔

مصنف سیرۃ النبی قرآن اور احادیث سے استشہاد کے بعد واقعہ کے بعض پہلوؤں سے عقلی استشہاد کرنا چاہتے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔

۱) رسول اللہ ﷺ نے بدر سے قبل جس قدر سرایا بھی بھیجے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی انصار کو نہیں بھیجا پس اگر مدینہ میں ہی مشورہ نہ ہوا ہوتا تو کاروان تجارت کے مقابلہ میں بھی انصار نہ نکلتے حالانکہ وہ مہاجرین سے زیادہ تعداد میں نکلے یعنی کل فوج (۳۰۵) تھی جن میں (۷۰) مہاجرین تھے باقی سب انصار۔

لیکن یہ استشہاد بھی اس لئے درست نہیں ہے کہ کاروان تجارت کا یہ معاملہ چوں کہ زیادہ اہم نہیں تھا اور دشمن میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اس لئے نبی اکرم ﷺ نے یہ چاہا کہ اس سلسلہ میں جو مال غنیمت ہاتھ آئے اس میں انصار کا بھی حصہ ہو مگر عقبیٰ میں انصار کے معاہدہ کے پیش نظر ضرورت تھی اس بات کی کہ ان سے مشورہ لیا جائے کہ وہ نکلنا چاہتے ہیں یا نہیں چنانچہ کاروان تجارت کے سلسلہ میں مدینہ کے اندر ہی مشورہ کیا گیا تھا جس میں انصار نے بخوشی رفاقت کو منظور کیا تھا چنانچہ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں ابن اسحٰق نے بسند یہ روایت کی ہے:

لما سمع رسول اللّٰه بابی سفیان مقبلاً من الشام ندب المسلمین الیهم وقال هذه عیر قریش فیها اموالهم فاخرجوا الیها لعل اللّٰه ینفلکموها فانتدب الناس فخلف بعضهم وثقل بعض و ذلك انهم لم یظنوا ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لم یلقی حربًا۔ (ابن کثیر، جلد ۳، ص ۲۵۶)

نبی اکرم ﷺ نے جب ابوسفیان کی شام سے آمد کا حال سنا تو مسلمانوں کو کاروان ابوسفیان کیلئے پکارا اور فرمایا یہ قریش کا کاروان ہے اس میں ان کا مال تجارت ہے پس اس کے لیے نکلو، کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ مال غنیمت تمہارے ہاتھ لگا دے پس لوگ تیار ہو گئے بعض نے تو اس مقابلہ کو پسند کیا اور بعض کو نکلنا شاق گذرا کیونکہ ان کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ اس سفر میں جنگ سے دوچار ہوں گے۔

اس روایت کا جملہ لعل اللّٰه ینفلکموها اور لم یظنوا ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لم یلقی حرباً صاف پتہ دے رہے ہیں کہ انصار اس مرتبہ اس لئے مدینہ سے نکلے کہ جن کا اندیشہ نہیں تھا اور کثیر مال غنیمت کی توقع تھی اور اسی بناء پر نبی ﷺ نے اس مرتبہ ان کو ہمراہ لینے کا ارادہ فرمایا۔

۲) ابو سفیان کا کاروان تجارت جب شام سے روانہ ہو کر حدودِ مدینہ و شام سے نکل گیا اور مکہ کی راہ پر پڑ گیا تب نبی اکرم ﷺ کو جاسوسوں نے اطلاع دی، اس سے قبل اطلاع نہ ہو سکی لہٰذا مولانائے مرحوم کا یہ عقلی استدلال واقعہ کی اصل حقیقت کو نہیں بدل سکتا کہ مکہ سے شام کو جو قافلۂ تجارت جاتا تھا وہ مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا اس لئے شام سے آنے والے قافلہ کے لئے آپ ﷺ کو شام کی جانب بڑھنا چاہیے تھا نہ کہ مکہ کی جانب جہاں قریش کے اثرات زیادہ تھے۔

جب ارادۂ الٰہی یہی ہو چکا تھا کہ بدر میں معرکۂ حق و باطل اس طرح بپا ہو کہ بظاہر اسباب مسلمانوں کے سامنے اچانک بے سروسامانی کی حالت میں دشمن ساز و سامان کے ساتھ آدھمکے اور پھر خدا کی معجزانہ نصرت و یاری ظہور میں آئے تو پھر اس پر تعجب کیسا کہ مسلمانوں کو اس وقت تک قافلہ کا علم نہ ہو سکا جب تک کہ وہ مکہ کی راہ پر نہ پہنچ گیا۔

اس کے بعد مولانا جمہور کے مسلک کو پیش نظر رکھ کر پانچ دفعات میں اپنی جانب سے واقعہ بدر کے اسباب کی ایسی ترتیب دی ہے کہ جس پر مولانا کو آخر میں یہ کہنے کا موقع مل سکا:

"کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوش عداوت اور رسول اللہ ﷺ کی شان نبوت کے موافق ہے"۔ (سیرت النبی ج ا ص ۳۱۹)

مولانائے مرحوم بہترین ادیب ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی اچھے سے اچھے واقعہ کو بھی اگر مخالفانہ رنگ دینے کی کوشش کی جائے تو اس کو الفاظ کی تعبیرات میں بھیانک سے بھیانک رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے مسئلۂ طلاق نکاح بیوگان، تعدد ازدواج جیسے مسائل کے متعلق عیسائی پادریوں اور ہندو آریہ سماجیوں نے جن توہین آمیز اور مضحکہ خیز تعبیرات میں رنگ کر اپنے معتقدین کے سامنے پیش کیا ہے وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں مگر آج کی دنیا، تہذیب و تمدن میں جب انہی عیسائیوں اور ہندوؤں نے سیکڑوں اور ہزاروں سال کے تجربہ کے بعد یہ یقین کر لیا کہ سوسائٹی کا "معاشرتی نظام" رحمۃ للعلمین کے لائے ہوئے قانون کو اختیار کیے بغیر صحیح نہیں ہو سکتا تو آج وہ پارلیمنٹ کونسل اور اسمبلیوں کے ذریعہ ان ہی قوانین طلاق، نکاح بیوگان وغیرہ کو اپنی معاشرت میں شامل اور ان امور کے جواز کے لئے بہتر سے بہتر عقلی دلائل و ادبی، تعبیرات اختیار کر رہے ہیں۔

پس غزوہ، بدر کیوں پیش آیا؟ اس کے لئے جمہور نے باتفاق تاریخ و سیرت یہی کہا ہے کہ مسلمانوں کا مدینہ محفوظ رہ کر تبلیغ اسلام کرنا مشرکین کو کسی طرح برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھیں کہ اس اثناء میں "سریۂ عبداللہ بن جحش پیش آ گیا، جس میں ان کا مشہور سردار عمرو بن حضرمی قتل ہو گیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان جیسے بہادر سردار قید ہو گئے اس بناء پر کفار مکہ کو اشتعال آ جانا ایک فطری بات تھی چنانچہ مشہور محدث ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں اس سریہ کا عنوان ہی یہ قائم کر دیا ہے: باب سریہ عبد الله بن جحش التی کانت سببا لغزوة بدر العظمیٰ و ذلك یوم الفرقان یوم التقی الجمعان و الله علی کل شیء قدیر ابھی یہ اشتعال بڑھ ہی رہا تھا کہ ابو سفیان کے کاروان تجارت کا قصہ مزید پیش آ گیا جو دراصل کاروان تجارت نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے استیصال کا وہ "سرمایہ" تھا

جس کے گھمنڈ پر قریش یقین کیے بیٹھے کہ جوں ہی وہ مکہ بحفاظت تمام پہنچ جائے گا سمجھ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے خاتمہ کا سامان ہاتھ آ گیا۔

تو اب خود ہی انصاف کیجیے کہ اس میں کون سی بات ایسی ہے جو نبی اکرم ﷺ کی شان نبوت کے خلاف اور قریش کے جوش عداوت کے منافی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ[1] کی رہنمائی کے لئے یا اس کی تقلید میں اس واقعہ کے تمام نقشہ کو جمہور کے خلاف اس لئے پلٹنے کی سعی فرمائی ہے کہ وہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اس اعتراض سے مرعوب ہو گئے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا انتہائی معیوب بات ہے لہٰذا جو شخص نبوت کا مدعی ہو وہ کیسے ایسا فعل کر سکتا ہے حالانکہ یہ بات مرعوب ہونے کی نہیں تھی بلکہ ضرورت تھی اس امر کی کہ ان تاریخی اسباب و وسائل کو روشنی میں لایا جائے جن کے پیش نظر مشرکین مکہ کے کاروان تجارت کو روکنا اور ان پر قابض ہونا لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ جنگی نقطۂ نظر اور مسلمانوں کی جماعتی بقاء و حفاظت کے اعتبار سے از بس ضروری تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ مکہ کے قیام میں نبی اکرم ﷺ پر تیرہ سال مسلسل مشرکین مکہ نے جو مظالم کیے ان پر صبر وضبط کے بعد جب مدینہ کو ہجرت کر گئے تب بھی ان مشرکین نے مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اور جنگ وجدل اور سازشی مکر و فریب میں لگے رہے چنانچہ ابو داؤد میں ہے:

ان کفار قریش کتبوا الی ابن ابی و من کان یعبد معه الاوثان من الاوس والخزرج و رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یومئذ بالمدینة قبل وقعة بدر انکم آویتم صاحبنا و انا نقسم باللّٰه لتقاتلنه او لتخرجن او نسیرن الیکم باجمعینا حتی نقتل مقاتلتکم و نستبیح نساء کم ...... (ابو داؤد، کتاب الخراج والامارة والفیٔ)

نبی اکرم ﷺ مدینہ میں تشریف لے آئے تھے کہ بدر کے واقعہ سے بہت پہلے کفار قریش نے عبد اللہ بن ابی اور اس کے بت پرست ساتھیوں کو جو اوس اور خزرج میں باقی رہ گئے تھے یہ لکھا کہ تم نے ہمارے صاحب کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم ان سے لڑو یا ان کو نکال دو ورنہ تو ہم سب تم پر چڑھ آئیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کریں گے اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنالیں گے۔

پھر معاملہ دھمکیوں تک ہی نہیں رہا بلکہ کاروان تجارت کی آمد و رفت کے پردہ میں منافقین اور یہود مدینہ سے مسلمانوں کے استیصال کے لئے مختلف تدابیر پر خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری صرف یہی نہیں بلکہ اب کاروان تجارت کا مقصد محض تجارتی کاروبار تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ نفع کے حصول کو مسلمانوں کے مقابلہ کی تیاریوں پر صرف کرنا نصب العین بنالیا گیا۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ دشمن کو اپنے خلاف اور اپنے استیصال کے لئے سازش کرنے مقابلہ کی تیاریوں میں مشغول رہنے کاروان تجارت کے ذریعہ مدینہ میں مقیم دشمنوں کے ساتھ مشرکین مکہ کو

۱: آرنلڈ نے بھی غزوۂ بدر کے متعلق ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

معاندانہ خط و کتابت جاری رکھنے اور خود کاروانِ تجارت کے ذریعہ اپنے استیصال کے لیے سرمایہ فراہم کرنے دینے کیلئے آزاد چھوڑ دینا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا خاتمہ کرالینا یا ان تمام ذرائع کا سد باب کر کے فتنہ کا سر کچل دینے کی کوشش کرنا؟

لہٰذا مسلمانوں نے وہی کیا جو عقل تدبیر، سیاست اخلاق تمدن کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب اور ضروری تھا یہی وہ امور تھے جن کی جانب ارباب سیر و تاریخ نے بھی توجہ دلائی ہے، چنانچہ سب سے پہلے سریہ ''سریہ حمزہ'' کے متعلق (جو کہ مشرکین کے کاروان تجارت کے روکنے کے لئے نکلا تھا زرقانی شرح مواہب میں تحریر فرماتے ہیں

فخرجوا يعترضون عيرا لقريش جاء ت من الشام تريد مكة اى يعترضون لها ليمنعوها من مقصدها باستيلائهم .... (شرح مواهب، جلد۱، ص ۴۵۲)

''پس وہ نکلے کہ قریش کے کاروان تجارت کے درپے تھے جو شام سے مکہ جارہا تھا یعنی وہ یہ چاہتے تھے کہ جس مقصد کے لئے یہ کاروان تجارت آ جارہے ہیں ان پر غلبہ کر کے اس مقصد کو پورا نہ ہونے دیں۔

اور ابو سفیان کے جس کاروان تجارت کے واقعہ سے بدر کے معرکہ کا تعلق ہے اس کے متعلق تو تمام ارباب سیر و تاریخ متفق ہیں کہ قریش کے اندر مسلمانوں کے استیصال کا جوش و خروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب ابو سفیان کا کاروان تجارت مکہ سے چلا ہے تو کوئی قریشی اور قریشیہ باقی نہیں رہی تھی جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا کہ اس نے اپنا راس المال کاروان کے حوالہ نہ کر دیا ہو زرقانی میں ہے:

كان فيها خمسون الف دينار و كان لم يبق قرشي و لا قرشية له مثقال الا بعث به فى العير (جلد ۱، ص ۴۷۶)

کاروان تجارت کے ساتھ پچاس ہزار دینار سرخ تھے اور کوئی قرشی و قرشیہ کے کہ جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا ایسے نہیں تھے کہ جس نے قافلہ میں اپنا راس المال نہ لگایا ہو۔

ابو سفیان کا یہ کاروان صرف کاروان تجارت ہی نہ تھا بلکہ سامان حرب و ضرب کیلئے بنیاد کا اور تھا اس کا اندازہ ابو جہل کے اس قول سے بھی ہوتا ہے جو قافلہ کے گھر جانے پر اس نے قریشیوں کو مشتعل کرتے ہوئے کہا

النجاء النجاء على كل صعب و ذلول غيركم اموالكم ان اصابها محمد ﷺ لم تفلحوا بعدها ابداً ۔

نجات حاصل کرو، انتہائی مصیبت وذلت سے نجات حاصل کرو کاروان تجارت کارواں نہیں ہے تمہارے مال و دولت کا ذخیرہ ہے اگر محمد ﷺ اس پر قابض ہوگئے تو پھر تم ہمیشہ کیلئے ناکام و نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔

کیا ابو جہل کا یہ خطبہ محض کاروان تجارت کے لٹ جانے پر ہو سکتا تھا؟ ہر گز نہیں بلکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ تجارت کا کارواں نہیں ہے بلکہ سامان جنگ کی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی حفاظت کی خاطر آج مہیب جو جنگوں میں فیصلہ کن لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔

تو اب انصاف فرمایئے کہ اس قسم کے کاروان تجارت پر حملہ کر کے دشمن کی تجارت کا سد باب کرنا کونسا گناہ

تھا جس کے لئے ہم دوسروں کی ہرزہ سرائی سے مرعوب ہو کر حقایق کا انکار کرنے لگیں۔

مولانا کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ زر و مال کے حاجتمند انصار سے زیادہ مہاجرین تھے تو پھر نبی اکرم ﷺ کی اس رفاقت میں مہاجرین کے مقابلہ میں انصار کیوں زیادہ تعداد میں تھے سو ان احتمالات عقلی کا باب تو اس درجہ وسیع ہے کہ جس قدر جی چاہئے وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جایئے ورنہ بات صاف ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے رجحان طبع نے صورت ہی ایسی پیدا کر دی کہ انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ ہو گئی ورنہ شاید حالت برعکس ہوتی البتہ مولانا کی توجیہ کے خلاف یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے اگر مدینہ ہی میں جنگ کے لئے مشورہ ہوا تھا تو پھر مہاجرین جو انصار کے بغیر بھی اب تک مختلف غزوات و سرایا میں سر بکف میدان جنگ میں جاتے رہے تھے آج اس عظیم الشان غزوہ میں انصار کے مقابلہ میں کیوں پیچھے رہے۔

اس موقع پر بار بار حضرت سعد بن عبادہ کی تقریر کا حوالہ دینا بھی اسلئے غیر موزوں ہے جبکہ ہم محدثین سے یہ نقل کر چکے کہ مسلم کی حدیث میں حضرت سعد بن عبادہؓ کا نام راوی کا وہم ہے اور دراصل ان کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی نہ کہ معرکۂ بدر کے موقع پر

مولانائے مرحوم نے سیرۃ النبی میں طبری کے حوالہ سے اس روایت کو نقل کرتے ہوئے جس کو ہم گذشتہ صفحات میں نقل کر آئے ہیں اور جو یہ ثابت کرتی ہے کہ مدینہ میں ابوسفیان کے قافلہ سے متعلق جو مشورہ ہوا تھا اس میں بعض مسلمان اس لئے نکلتے ہوئے کسمساتے رہے کہ جنگ کا معاملہ نہیں ہے صرف قافلہ کا معاملہ ہے۔"

یہ تنقید فرمائی:

"لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآن کے خلاف ہیں قرآن مجید میں بالتصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ (جلد اص ۳۳)

مگر تنقید فرماتے ہوئے مولانا کو یہ بات فراموش ہو گئی کہ انھوں نے جمہور کے خلاف کوئی دلیل نہیں پیش فرمائی بلکہ جو دعویٰ تھا وہی دلیل بنا کر پیش کر دیا گیا اس لئے جمہور کا دعویٰ مع دلیل تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کی زیر بحث آیات مدینہ کے مشورہ سے متعلق ہی نہیں ہیں بلکہ وادیٔ ذفران کے مشورہ سے متعلق ہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مدلل خود قرآن سے ہی ثابت کیا جا چکا ہے اور اس روایت میں جس مشورہ کا ذکر ہے وہ قرآن میں مذکور نہیں ہے البتہ احادیث و روایات سیر میں بسند صحیح منقول ہے لہٰذا دونوں مواقع پر کسمسانے کی وجوہ جدا جدا تھیں اور قرآن نے اس پورے واقعہ کے ان ہی خاص اجزاء کو بیان کرنا مناسب سمجھا جو مسلمانوں کی بے سروسامانی اور دشمن کی قوت اور پھر مسلمانوں پر خدا کی نصرت کے نزول سے تعلق رکھتے ہیں۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ سے ایک میل پر پہنچے تو لشکر کا جائزہ لیا ابن عمرؓ اس زمانہ میں کمسن تھے لہٰذا ان کو واپس کر دیا۔[1]

مقابلہ کے لئے نہیں بلکہ کفار مکہ سے جنگ کے لئے ہی نکلے تھے ورنہ تو ایسے نوخیز لڑکے قافلہ کو لوٹنے میں

---

[1] اسد الغابہ میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔ جلد ۳ ص ۲۲۷۔

زیادہ مفید ثابت ہو سکتے تھے مگر یہ بھی مولانا کا محض قیاس ہی قیاس ہے اس لئے کہ قافلہ کے مقابلہ میں اگرچہ کسی بڑی جنگ کی توقع نہیں تھی، مگر بہر حال معمولی جنگ کا خطرہ تو موجود ہی تھا کیا ابو سفیان اور اس کے تیس چالیس بہادر قرشی، ایک ہزار اونٹ پر لدا ہوا سامان آسانی سے حوالہ کر دیتے یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

پس اگر معمولی جنگ کا خطرہ بھی تھا تو نو عمر لڑکوں کو واپس کر دینا اس کے لئے کس طرح دلیل بن سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ شروع کے میں قافلہ کے مقابلہ کو نہیں بلکہ کفار مکہ سے فیصلہ کن جنگ کے لئے نکلے تھے۔

اسی طرح استیعاب میں سعد بن خثیمہ کا جو واقعہ مذکور ہے اس سے بھی مولانا کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اگر باپ کی فرمائش پر بیٹے نے یہ گوارا نہ کی کہ اپنی بجائے باپ کو اس موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نکلنے دے تو اس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اگر مسلمان مدینہ سے قافلہ پر حملہ کے لئے نکلے تو اس یقین کے ساتھ نکلے تھے کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی چشم زخم نہیں پہنچے گا اور سب ہی صحیح سالم واپس آ جائیں گے یہ تو بد قسمتی سے عیسائی مستشرقین سے مرعوب ہو کر ہم نے بزعم خود یہ تصور کر لیا کہ قافلہ پر حملہ کے معنی گویا ڈاکوؤں کا قافلہ لوٹنے کے مترادف ہے۔

مسلمان تو جب بھی دشمنوں کے مقابلہ کو نکلے خواہ وہ براہ راست جنگ کے ارادے سے نکلے ہوں یا دشمن کو دوسرے معاملات میں زک دینے ہمیشہ جہاد اور شہادت ہی کے نقطۂ نظر سے نکلتے تھے اور مال غنیمت تو ان کے لئے خدا کا مزید فضل و احسان تھا کبھی بغیر جنگ ہی ہاتھ آ گیا اور کبھی خون میں نہانے کے بعد حاصل ہوا۔

اب ہم مصنف سیرۃ النبی کے غزوۂ بدر کے متعلق ان تمام وعادی و شبہات پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد جو جمہور کے خلاف ان کی جانب سے پیش کیے گئے ہیں صرف ایک سوال پر اس بحث کو ختم کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر معرکۂ بدر میں ابتداء ہی سے یہ بذریعہ وحی بتا دیا گیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکۂ حق و باطل کی ہے اور قافلہ پر حملہ کرنے یا بقول مولانا کے "قافلہ لوٹنے" کا تصور و تخیل گناہ عظیم اور شان اسلام کے خلاف ہے تو آخر جلیل القدر صحابہؓ نے ایسا تصور قائم ہی کیوں کیا اور اگر کیا بھی تھا تو قرآن نے احدی الطائفتین کا وعدہ کر کے اس گناہ عظیم کے تصور کی حوصلہ افزائی کیوں کی اور کیوں صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ خدائے تعالیٰ ایک لمحہ کے لئے بھی تم کو قافلہ پر قابو پانے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس کا تصور بھی گناہ عظیم ہے، البتہ اس کا وعدہ کرتا ہے کہ تم کو دشمنوں پر قابو دے گا اور تم کامیاب ہو گئے تو کیا پھر قرآن عزیز کا احدی الطائفتین کا اس طرح ذکر کرنا اس امر کی صاف شہادت نہیں ہے کہ معرکۂ بدر سے قبل ضرور چند اکابرین اسلام کی یہ مٹھی بھر جماعت قافلہ کے لئے نکلی تھی مگر اچانک جب کفار مکہ سے سابقہ پڑ گیا اور مسلمانوں نے بے سرو سامانی کو دیکھ کر قافلہ پر قبضہ چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اول یہ وعدہ دیا کہ ان دونوں "عیر و نفیر" میں سے ایک تم کو ضرور دیں گے اور نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی یہ اطلاع کر دی کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ وہ اب قافلہ کی بجائے معرکۂ حق و باطل میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کر کے ہمیشہ کے لئے تاریخ ظلم کا رخ عدل کی جانب پھیر دینے والا ہے۔

الحاصل قرآن و حدیث اور تاریخی حقائق کی روشنی میں معرکۂ حق و باطل ''غزوۂ بدر'' کے متعلق جمہور علماء اسلام کا مسلک ہی صحیح ہے اور بلاشبہ واقعات کی صحیح و مستند تفصیلات کسی طرح بھی شان نبوت کے خلاف نہیں اور نہ علم الاخلاق و علم الاجتماع اور حق و صدق پر مبنی سیاسیات مدن کے منافی ہیں۔ ھذا ھو الحق و الحق احق ان یتبع ۔

غزوۂ احد

احد

حد مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے یہ مدینہ منوہ سے جانب جنوب تقریباًدو میل (ایک فرسخ) پر واقع ہے۔

غزوۂ احد

یہی وہ مقام ہے جہاں شوال ۳ھ مطابق جنوری ۶۲۵ عیسوی میں مسلمانوں اور مشرکوں کے مقابلہ میں معرکۂ حق باطل گرم ہوا، اس لئے اس کا نام غزوۂ "احد" ہے۔

غزوۂ احد بھی بہت اہم غزوہ ہے اور اپنی تفصیلات و جزئیات کے اعتبار سے اپنے دامن میں عبرت و موعظت کا بے شمار ذخیرہ رکھتا ہے اس غزوہ کے تفصیلی حالات کتب حدیث و سیرت اور تفاسیر و قرآن حکیم میں مکمل طور پر مذکور ہیں۔[1]

ان حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ بدر میں جو زخم قریش کو لگ چکا تھا اس نے ناسور کی شکل اختیار کر لی تھی کیونکہ بدر کے واقعۂ ہائلہ سے قریش کا ہر گھر ماتم گسار اور عرب کے مشرک قبائل نوحہ خواں تھے ابو سفیان نے تو قسم کھالی تھی کہ جب تک بدر کا انتقام نہ لے لوں گا نہ غسل کروں گا، نہ تبدیل لباس، عکرمہ بن ابو جہل اور دوسرے نوجوانوں کی تقریریں اور عورتوں کی نوحہ خوانی قریشیوں اور قبائل عرب کو غیرت اور اشتعال دلا کر جنگ کے لئے آمادہ کر رہی تھیں اور اس طرح ابو سفیان کی سر کردگی میں تین ہزار نبرد آزما سورماؤں کا لشکر جرار مکہ سے مسلمانوں کو مٹانے کے لئے نکلا اور احد کے سامنے آکر خیمہ زن ہو گیا نبی اکرم ﷺ کو جب ابو سفیان کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو صحابہ نے یہ رائے دی کہ ہم کو باہر نکل کر جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مفید طریقہ یہ ہے کہ ہم مدینہ کے اندر ہی دشمن کا انتظار کریں اور جب وہ مدینہ پر حملہ آور ہو تو اس کا پر زور مقابلہ کریں ہمارے اس طرز عمل سے اول تو دشمن کو جرأت ہی نہ ہو گی کی مدینہ پر حملہ آور ہو اور اگر اس نے اقدام کیا تو بلا شبہ شکست فاش اٹھا کر راہ فرار اختیار کرے گا مگر ان صحابہ کو جو بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور بدر کی فضیلت کو اس وقت حاصل کرنا چاہتے تھے یہ رائے پسند نہیں آئی اور نوجوانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اکثریت کی رائے یہ قرار پائی کہ ہم کو دشمنوں کا مقابلہ میدان میں نکل کر ہی کرنا چاہیے نبی اکرم ﷺ نے جب اکثریت کا رجحان یہ پایا تو اس پر حکم صادر فرما کر حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے تو تجربہ کار اور اکابر صحابہ نے اپنے اصاغر کو ان کی رائے پر ملامت کی کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے رجحان کے خلاف کیوں اپنی آزادانہ رائے سے آپ ﷺ کو پریشان کیا چنانچہ جب آپ ﷺ باہر تشریف لائے تو ان نوجوانوں

[1] ہم نے زیادہ حصہ فتح الباری جلد نمبر ے سے لیا ہے اور باقی سیر حلبیہ اور زرقانی اور تاریخ کبیر سے۔

اور شمع اسلام کے پروانوں نے اپنی رائے پر اظہار ندامت کیا اور عرض کیا کہ آپ ﷺ مدینہ ہی کے اندر دشمن کا مقابلہ کریں یہی مناسب ہے۔

یہ سن کر حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ”نبی کی شان کے خلاف ہے کہ جب خدا کی راہ میں ہتھیار سج کر تیار ہو جائے تو پھر معرکۂ حق و باطل کے بغیر ہی ان کو اتار رے اب خدا کا نام لے کر میدان میں نکلو۔

نبی اکرم ﷺ جب مدینہ سے نکلے تو ایک ہزار کا لشکر جلو میں تھا اس لشکر میں تین سو منافقین عبداللہ بن ابی کی سرکردگی میں ہمرکاب تھے یہ مدینہ ہی میں مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر چکے تھے کہ مخلص مسلمانوں کو بزدل بنانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ اول مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ نکلیں گے اور راہ سے ہی ان سے کٹ کر مدینہ واپس آجائیں گے چنانچہ رأس المنافقین یہ بہانہ کر کے لشکر اسلام سے کٹ کر جدا ہو گیا اور مدینہ واپس آگیا کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ہم جیسے تجربہ کاروں کی بات نہ مان کر کھڑ نوجوانوں کی رائے کو ترجیح دی تو ہم کو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال۔

مگر منافقین کا مقصد پورا نہ ہوا اور ان فداکاران اسلام پر ان کی مراجعت کا مطلق کوئی اثر نہ پڑا اور ایسے جانباز اور جان نثار اسلام پر اثر ہی کیا پڑتا، جن کے بچوں کی جانبازی اور اسلام پر فداکاری کا جذبہ اور ولولہ یہ ہو کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ سے باہر جب لشکر اسلام کا جائزہ لیا اور صغیر السن لڑکوں کو واپسی کا حکم دیا تو رافع بن خدیج جو ابھی نوعمر ہی تھے یہ دیکھ کر پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے کہ دراز قد بن کر جنگ کے سپاہی رہ سکیں چنانچہ ان کی تدبیر کارگر ہو گئی۔ اسی طرح جب سمرہ بن جندب صغیر سن شمار کر لئے گئے رونے لگے اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اگر رافع شریک جنگ ہو سکتا ہے تو میں کیوں خارج کیا جا رہا ہوں جبکہ میں رافع کو کشتی میں پچھاڑ دیا کرتا ہوں آخر دونوں کی کشتی کرائی گئی اور سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور وہ مجاہدین میں شامل کر لئے گئے البتہ مسلمانوں کے دو قبیلے بنو سلمہ، بنو حارثہ میں کچھ بددلی سی ہو چلی تھی مگر فداکار مسلمانوں کے جوش و ولولہ کو دیکھ کر ان کی ہمت بھی بلند ہو گئی۔

غرض اس ولولہ اور جذبہ کے ساتھ مجاہدین کا لشکر احد پہنچا اور دونوں صفیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئیں۔

نبی اکرم ﷺ نے لشکر اسلام کو اس طرح صف آرا کیا کہ احد کو پس پشت لے لیا اور پچاس تیر اندازوں کو حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کی کمان میں پہاڑ کی ایک گھاٹی پر مقرر فرما دیا کہ فتح و شکست کسی حال میں بھی اپنی حرکت نہ کریں تاکہ پشت کی جانب سے دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔ اب جنگ شروع ہو گئی اور دونوں صفیں بالمقابل نبرد آزما ہو کر جوہر شجاعت دکھانے لگیں ابھی جنگ کو کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ مسلمانوں کا پلہ بھاری ہو گیا اور مشرکین مکہ کا لشکر درہم برہم ہو کر بھاگنے لگا نبرد آزما مسلمانوں نے جب مال غنیمت جمع کرنے کا ارادہ کیا تو تیر اندازوں سے صبر نہ ہو سکا اور وہ گھاٹی چھوڑ پر آمادہ ہو گئے کمان افسر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے ہر چند روکا اور فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو مگر انھوں نے یہ کہہ کر جگہ چھوڑ دی کہ آپ ﷺ کا حکم جنگ تک محدود تھا اب جبکہ جنگ ختم ہو گئی تو خلاف ورزی کیسی؟

حصول غنیمت کے شوق نے ادھر مسلمان تیر اندازوں سے جگہ خالی کرادی ادھر خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) اپنے جنگی دستہ کے ساتھ میدان خالی دیکھ کر گھاٹی کی جانب سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اب مسلمان گھبرائے اور اس اچانک حملہ سے ان کے پیر اکھڑ گئے اور اس طرح فتح و نصرت یک بیک شکست سے بدل گئی اگرچہ نبی اکرم ﷺ کے گرد و پیش ابو بکر، عمر، علی، طلحہ، زبیرؓ جیسے فداکار موجود تھے تاہم مسلمانوں کے فرار سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور ایک شقی ازلی نے نبی اکرم ﷺ کے پتھر کھینچ کر مارا جس سے آپ ﷺ کا ایک دندان مبارک شہید ہو گیا آپ ﷺ پتھر کے صدمہ سے قریب کی ایک گھاٹی میں گر گئے ابھی آپ ﷺ سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک مشرک نے پکار دیا ان محمد قدمات محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا اس آواز نے مسلمانوں میں اور زیادہ انتشار اور سخت بے چینی پیدا کر دی مگر مسلمان فوراً سنبھلے اور ثابت قدم صحابہ نے للکارا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اب ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے آؤ اور جنگ کا فیصلہ کر کے دم لو! اس صدائے حق نے مسلمانوں کے دل میں غیرت کا جذبہ پیدا کر دیا وہ سب پلٹ پڑے اور حملہ آور ہونے کی غرض سے سمٹ کر یکجا ہو گئے مگر نقشۂ جنگ بدل چکا تھا اور قریش اپنی کامیابی پر نازاں ہو کر میدان سے الگ ہو چکے مسلمانوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جلوۂ جہاں آراء پر نظر پڑتے ہی ان کے دل میں بھی سکون پیدا ہو گیا اور پروانہ وار آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے غار میں گر جانے سے خود سر میں گھس گیا اور زرہ کی کڑیوں کی زد میں چہرۂ مبارک اور بازؤوں پر بھی ہلکے زخم آ گئے تھے حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ نے خود کو سر سے نکالا اور زخموں کو دھویا اور بوریا جلا کر راکھ کو زخم کے اندر بھر دیا جس سے خون بند ہو گیا۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت

اس غزوہ میں ستر مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہوئے نبی اکرم ﷺ کے حقیقی چچا، دودھ شریک بھائی، بے تکلف دوست اور جاں نثار صحابی حضرت حمزہؓ کی شہادت اس واقعہ کا زبردست سانحہ ہے زبان وحی ترجمان نے ان کو سید الشہداء کا لقب عطا فرمایا۔

مشرکین مکہ نے اس جنگ میں درندوں اور خونخوار حیوانوں کی طرح مردہ نعشوں تک کے ناک کان کاٹ ڈالے اور پیٹ چاک کر کے دل و جگر کو نیزوں کی انی سے چھید چھید کر دل کا بخار نکالا، ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے تو سید الشہداء کا جگر چاک کر کے دانتوں سے چبا ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کو ایک حبشی غلام وحشی نے شہید کیا تھا جس کی خوشی میں نے اس کو پنا سونے کا ہار عطا کیا۔

ابو سفیان اپنی کامیابی کی مسرت میں کہہ رہا تھا اعلیٰ ھبل اعلیٰ ھبل ہبل کی جے ہو۔ ہبل کی جے ہو نبی اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تم اس کے جواب میں یہ پکارو۔

اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَل، اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَل

اللہ ہی سب سے بلند و بالا اور بزرگ ہے۔

ابو سفیان نے پھر طیش میں آکر کہا لنا العزی ولا عزی لکم ہماری مددگار عزیٰ دیوی ہے اور تمہارے پاس عزیٰ کا ہمسر نہیں ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا اے عمر! تم یہ جواب دو،

اللّٰہ مولانا ولا مولیٰ لکم

ہمارا والی مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور تمہارا کوئی بھی مددگار نہیں۔

بہرحال ابوسفیان یہ کہہ کر کہ آئندہ سال پھر بدر میں معرکہ آرائی ہوگی اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔

قرآن عزیز اور غزوۂ احد

مسلمانوں کا غزوۂ احد کے لئے تیار ہونا، منافقین کا لشکر اسلام سے جدا ہو کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی سعی کرنا، مسلمانوں کا اول خدا کی مدد سے کامیاب ہونا اور پھر اپنی غلط کاری اور محمد ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں شکست کھا جانا اور فتح کا شکست سے بدل جانا اور خدائے تعالیٰ کا مسلمانوں کی تسلی کرنا ان تمام امور کو قرآن عزیز نے آل عمران میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ محمد بن اسحٰق سے منقول ہے

انزل اللّٰہ فی شان احد ستین آیة من آل عمران (فتح الباری جلد ۷، ص ۲۷۸)

اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد کی شان میں آل عمران کی ساٹھ آیتیں نازل فرمائی ہیں۔

وروی ابن ابی حاتم من طریق المسور بن مخرمة قال قلت لعبد الرحمٰن بن عوف اخبرنی عن قصتکم یوم احد قال اقراء العشرین ومائة من آل عمران تجدھا، وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ الی قوله أَمَنَةً نُّعَاسًا

(فتح الباری جلد ۷، ص ۲۷۸)

اور ابن حاتم نے بطریق مسور بن مخرمہ روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے میں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے عرض کیا آپ غزوۂ احد کا اپنا قصہ بیان فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا! تم آل عمران کی ایک سو بیس آیات پڑھو تو تم کو سارا واقعہ معلوم ہو جائیگا یہ آیات یہاں سے شروع ہو کر وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ الی قوله أَمَنَةً نُّعَاسًا پر ختم ہوتی ہیں۔

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

اور (اے پیغمبر! قابل ذکر ہے وہ بات) جبکہ تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے (اور احد کے میدان میں) لڑائی کیلئے مورچوں میں مسلمانوں کو بٹھا رہے تھے اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے پھر جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور واپس لوٹ چلیں) حالانکہ اللہ مددگار تھا اور جو ایمان رکھنے والے ہیں ان کو چاہیے کہ ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ إِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ

فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ ○

اور دیکھو! نہ تو ہمت ہارو نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو! اگر تم نے (احد) میں زخم کھایا ہے تو دوسروں کو بھی ویسے ہی زخم (بدر میں) لگ چکے ہیں دراصل یہ (ہار جیت کے) اوقات ہیں جنہیں ہم انسانوں میں ادھر ادھر پھراتے رہتے ہیں علاوہ بریں یہ اسلئے تھا تاکہ اس بات کی آزمائش ہو جائے کون سچا ایمان رکھنے والا ہے کون نہیں اور اس لئے کہ تم میں سے ایک گروہ کو (ان وقائع اور ایام کے نتیجوں کا) شاہد حال بنادے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ ظلم کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

غزوہ احزاب (غزوۂ خندق)

غزوہ احزاب تمام غزوات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نرالا ہے اس لئے کہ اس غزوہ میں مسلمانو کو تمام کافر جماعتوں سے بیک وقت واسطہ پڑا اور قبائل عرب ،یہود اور ان کے حلیف سب کے سب جمع ہو کر مسلمانوں کونیست ونابود کرنے نکلے تھے اور مدینہ کے اندر بھی منافقین کا گروہ خفیہ ان کی مدد کر رہا تھا حزب کے معنی چونکہ گروہ کے ہیں اور احزاب اس کی جمع ہے اس لئے غزوۂ احزاب کہلایا اور جبکہ حضرت سلمانؓ کے مشورہ سے مسلمانوں نے پہلی خندق کھود کر مدینہ کو دشمن سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اختیار کی اس لیے اس کو غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔

یہ غزوہ شوال ۵ھ مطابق فروری ۶۲۷ء میں پیش آیا جبکہ ابو سفیان دس ہزار پر مشتمل لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کے لئے مکہ سے نکلا۔ اس واقعہ سے متعلق تاریخ وسیر کی کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری میں بھی بہت کافی تفصیلات ملتی ہیں اور اس کے بہت سے اہم اجزء پر روشنی پڑتی ہے۔

مختصر طور پر واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو دشمنوں کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو حسب دستور آپ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا حضرت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا! ہم اہل فارس کا دستور یہ ہے کہ ایسے موقع پر خندق کھود کر دشمن سے خود کو محفوظ کر لیتے اور اس کو مجبور بنادیتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے اس مشورہ کو قبول فرماکر خندق کھودنے کا حکم دیا کدال لے کر خود بھی بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ کائنات انسانی کی تاریخ میں آقا اور غلام، حاکم اور محکوم، افسر اور ماتحت، مخدوم اور خادم کے درمیان یہ پہلا منظر تھا، جو آنکھوں نے دیکھا اور کافروں نے سنا کہ دوجہان کا سردار ہاتھ میں کدال لئے تین دن کے فاقہ سے پیٹ پر پتھر باندھے مہاجرین وانصار کے ساتھ خندق کھودنے میں برابر کا شریک نظر آتا ہے بلکہ ایک سخت پتھر کے حائل ہو جانے پر جب صحابہ نے زور لگایا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور خدمت اقدس ﷺ میں اس واقعہ کو پیش کیا تو آپ ﷺ نے بسم اللہ کہہ کر کدال کی ایک ضرب سے انکو پارہ پارہ کردیا۔ (بخاری باب غزوۂ احزاب)

آپ کے ساتھ صحابہ بھی تین شبانہ روز بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے دین حق کی حمایت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر مصروف کار تھے۔

ایک جانب اگر لبثنا ثلثة ایام لا نذوق ذواقا کا مظاہرہ تھا تو دوسری جانب زبان وحی ترجمان پر یہ دعائیہ کلمہ جاری تھا۔ اللھم ان العیش عیش الآخرۃ فاغفر الانصار والمھاجرۃ خدایا عیش تو آخرت کا عیش ہے پس تو انصار و مہاجرین کو مغفرت سے نواز اور جب جاں نثاران توحید شمع نبوت سے یہ سنتے تو پروانوں کی طرح والہانہ جوش کے ساتھ یہ کہہ کہہ کر قربان ہونے لگتے۔

نحن الذین بایعوا محمداً

علی الجہاد ما بقینا ابداً

ہم وہ ہیں جنھوں نے زندگی بھر کے لئے محمد ﷺ کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر لی ہے۔

اور جب شمع نبوت کے پروانوں سے آپ ﷺ یہ والہانہ رجز سنتے ہیں تو مسرت و شادمانی کے ساتھ پھر ارشاد فرماتے ہیں۔

اللّٰھم لا خیر الا خیر الآخرۃ

فبارك فی الانصار والمہاجرۃ

خدایا خیر و نیکی تو آخرت ہی کی ہے پس انصار و مہاجرین کے درمیان اپنی برکت کا نزول فرما۔

(بخاری باب غزوۂ احزاب)

اور براء بن عازب فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق میں خدا کے رسول ﷺ کی حالت یہ تھی کہ خندق سے مٹی اٹھا کر ادھر ادھر منتقل کر رہے تھے اور جسد مبارک گرد آلود ہو رہا تھا اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

واللّٰہ لو لا اللّٰہُ ما اھتدینا

ولا تصدقنا و لا صلینا

فانزلنْ سکینۃً علیْنا

و ثبت الاقدام ان لا قینا

انِ الأُولٰی قد بغَوْا علینا

اذا ارادوا فتنۃ ابینا

قسم بخدا! اگر خدا کی ہدایت رہنمائی نہ کرتی تو نہ ہم کو ہدایت نصیب ہوتی اور نہ اور نہ صدقہ و نماز پس اے خدا! تو ہم پر طمانیت نازل فرما اور میدان جنگ میں ہم کو ثابت رکھ جن لوگوں نے ہم پر سرکشی کر کے چڑھائی کی جب انہوں نے فتنہ کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کر دیا (ان کو ناکام کر دیا) اور تنہا جوش کے ساتھ ''ابینا'' کو بلند آواز سے کہتے جاتے تھے۔

خندق کی کھدائی کا کام چند روز جاری رہا اور اس طرح دشمن سے حفاظت کا پوری طرح سامان ہو گیا لیکن جب محاصرہ کو بیس روز ہو گئے تو یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور مسلسل محاصرہ سے کچھ اکتانے اور مضطرب ہونے لگے اس وقت خدا کی نصرت نے نزول کیا اور مسلمانوں کی کامرانی کے اسباب مہیا ہو گئے ہوا یہ کہ کفار کے لشکر میں ایک شخص نعیم بن مسعود نخعی تھا یہ گو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن اس کے قلب میں صداقت اسلام گھر کر چکی تھی اسلئے اس نے اپنی ہوشیاری سے مشرکین مکہ اور یہود مدینہ کے درمیان بے اعتمادی پیدا کر دی اور جنگ کے معاملہ میں دونوں فریق میں ایسا اختلاف پیدا ہو گیا کہ ایک نے دوسرے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور ابھی مشرکین مکہ واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ قدرت کی جانب سے ہوائے تند کا ایسا طوفان اٹھا کہ جس نے آن کی آن میں دشمن کے

تمام لشکر کو زیروزبر کرڈالا خیمے اکھڑ کر گرنے لگے چوپائے بھڑک بھڑک کر بھاگنے لگے اور سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی اور دشمن نے محاصرہ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے فتنہ سے نجات دی۔

نبی اکرم ﷺ نے اسی موقع پر ارشاد فرمایانصرت بالصباح واهلكت العاد بالدبور اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھ کو پرواہوا کے ذریعہ فتح عطا کی گئی اور عاد پچھوا ہوا سے ہلاک کیے گئے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کو جب دشمن کی خبریں معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو تین مرتبہ آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ اس خدمت کو کون انجام دے گا اور تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن عوام نے پیش قدمی کر کے عرض کیا:اس خدمت کے لئے میں حاضر ہوں تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان لكل نبی حواریا وان حواری الزبير۔
ہر ایک نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرے حواری زبیر ہیں۔
اور اس موقع پر حضور اقدس ﷺ نے یہ دعا فرمائی:

اللهم منزل الكتاب سريع الحساب اهزم الاحزاب، اللهم اهزمهم و زلزلهم۔
اے کتاب (قرآن) کے نازل کرنے والے خدا!اے جلد حساب لینے والے تو مشرکین کی جماعتوں کو شکست دیدے الٰہی ان کو فرار کرا اور ان کو ڈگمگادے۔"

لا اله الا الله وحده اعز جنده و نصر عبده، و غلب الاحزاب وحده فلا شیء بعده۔
کوئی خدا نہیں اللہ کی ذات کے ماسوا جو یکتا و بے ہمتا ہے اس نے اپنے لشکر (مسلمانوں) کو عزت بخشی اور اپنے بندہ (محمد ﷺ) کی مدد کی اور یکتا ذات احزاب (سب جماعتوں) پر غالب ہے اور اس کے ماسوا فانی ہے۔

یہی وہ غزوہ ہے جس میں مشغولیت جہاد کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ اور صحابہؓ کی نماز عصر قضا ہو گئی اور آپ ﷺ نے مغرب کے وقت دونوں نمازوں کو ادا کیا۔ (بخاری باب الجہاد)

قرآن عزیز اور غزوۂ احزاب

حضرت عائشہ صدیقہ ؓ فرماتی ہیں: یہ آیت غزوۂ خندق ہی کے متعلق نازل ہوئی۔

إِذْ جَآءُوكُم مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ (احزاب ۲۱ پ ع ۲) (بخاری باب غزوۂ احزاب)

اور جب چڑھ آئے مشرکین) تم پر اوپر کی جانب سے اور نیچے کی جانب اور جب پھر گئیں (دہشت کی وجہ سے) آنکھیں اور پہنچے گئے دل گلوں تک (یعنی کلیجے منہ کو آگے)

قرآن حکیم میں اسی غزوہ کی نسبت سے اس سورۃ کا نام ہی احزاب ہو گیا اس سورت کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَأَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ○ الي وَكَانَ
اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ○

اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر اسوقت کی گئی جب تم پر (مشرکین کے) لشکر چڑھے تھے پس ہم نے ان پر ہوا کو اور ایسے لشکروں کو بھیج دیا جن کو تم نہیں دیکھ رہے تھے اور جو کام بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ ان کاموں کا دیکھنے والا ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا تک۔

واقعۂ حدیبیہ

حدیبیہ مکہ مکرمہ سے جدہ کی جانب ایک منزل پر واقع ہے اور آج کل شمیسیہ کے نام سے مشہور ہے حدیبیہ دراصل کنوئیں کا نام ہے یہی وہ مقام ہے جس کے ساتھ "فتح مبین" اور بیعت رضوان کی مقدس تاریخ وابستہ ہے۔

۰۶ھ ہجری مطابق فروری ۶۲۸ء ماہ ذی قعدہ روز شنبہ وہ وقت سعید تھا کہ سرور دو عالم ﷺ چودہ سو صحابہؓ کے جلو میں اداء عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے اور جب ذوالحلیفہ پہنچے تو قربانی کے جانوروں کے قلادہ ڈالا اور احرام باندھا اور بنی خزاعہ کے ایک شخص کو جاسوس بنا کر بھیجا وہ قریش کے حالات کا اندازہ لگا کر خبر دے۔

حضور اقدس ﷺ جب غدیر اشطاط پہنچے تو جاسوس نے آ کر خبر دی کہ قریش کو آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع ہو چکی ہے اور وہ قبائل کو جمع کر کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں ان کا ارادہ ہے کہ آپ کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا تو صدیق اکبرؓ نے عرض کیا:

"خدا کے رسول ﷺ! ہم تو بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں جنگ یا قتل و قتال ہمارا مقصد نہیں ہے لہٰذا ہم بیت اللہ کی زیارت کو اپنا مقصد سمجھتے ہوئے ضرور آگے بڑھتے رہیں گے اور جو جماعت خواہ مخواہ سد راہ ہو گی اس سے مجبوراً لڑنا پڑے گا۔"

مشورہ کے بعد ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: امضوا علی اسم اللہ اب خدا کا نام لے کر بڑھے چلو۔
(بخاری باب غزوۃ الحدیبیہ)

زائرین بیت اللہ خدا کے عشق میں چور اور بیت اللہ کی زیارت میں مسرور مکہ کی جانب قدم بڑھائے چل رہے تھے کہ خدا کے رسول ﷺ نے فرمایا! خالد بن ولید فوج کا دستہ لئے غمیم میں گھات لگائے تمہارا منتظر ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس جانب کا واکاٹ کر داہنی جانب چلیں اور اچانک بے خبری میں اس کے مقابل پہنچ جائیں، جب مسلمان اچانک خالد بن ولید کے دستہ فوج کے سامنے آ گئے تو اپنی گھات کو ناکام دیکھ کر خالد گھبرا گئے دستہ فوج کو لے تیزی کے ساتھ مشرکین مکہ کے پاس پہنچے اور ان کو مسلمانوں کی آمد سے مطلع کیا۔

نبی اکرم ﷺ جب اس ٹیلہ پر پہنچے کہ اس کے بعد وادی میں اتر کر مکہ پہنچ جانا تھا تو اچانک آپ ﷺ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی صحابہؓ نے یہ دیکھ کر اس کو چلنے دیئے بھڑکایا اور کوشش کی کہ کسی طرح وہ اٹھ کھڑی ہو مگر وہ نہ اٹھی لوگ جب بار بار "حل حل"[1] کہہ کر تھک گئے تو کہنے لگے خلات القصواء قصواء نافرمان ہو گئی۔

---

[1] اونٹنی کو اٹھانے کیلئے بولتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے یہ سنا تو فرمایاماخلات القصواء و ما ذاك لها بخلق ولكن حبسها حابس الفيل ہر گز نافرمان نہیں ہوئی اور نہ یہ اس کی عادت ہے بلکہ اس کو اس خدا نے روک دیا تھا جس نے ہاتھی والوں کو روک دیا تھا یعنی قریش مکہ کی بیہودگی اور جنگی ذہنیت کی وجہ سے چونکہ جنگ کی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اسلئے خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم اس وقت تک آگے نہ بڑھیں جب تک کہ کعبہ کی حرمت کا عہد نہ کر لیں۔

چنانچہ ارشاد کے بعد ذات اقدس ﷺ نے فرمایاوالذی نفسی بیده لا یسئلونی خطة یعظمون فیها حرمات الله الا اعطیتهم ایاها۔اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ مجھ سے جو بھی ایسی بات چاہیں گے کہ اس میں حرمات اللہ کی عظمت ان کے پیش نظر ہو تو میں ضرور اس کو پورا کروں گا۔

حضور اقدس ﷺ جب یہ اعلان فرما چکے تو اب جو قصواء کو کھڑا ہونے کے لئے ڈپٹا وہ فوراً کھڑی ہو گئی اور چل پڑی اور حدیبیہ کے میدان میں جا پہنچی۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۷-۱۶۸)

جب زائرین بیت اللہ کا مقدس قافلہ حدیبیہ میں فروکش ہو گیا تو صلاح یہ قرار پائی کہ حضرت عثمانؓ کو مکہ بھیجا جائے تا کہ وہ مشرکین مکہ پر یہ واضح کریں کہ ہمارا ارادہ بجز زیارت بیت اللہ کے اور کچھ نہیں لہٰذا تم کو روکنا مناسب نہیں ہے۔

حضرت عثمانؓ جب مکہ میں داخل ہوئے اور ابوسفیان وغیرہ سے مل کر گفتگو کی تو انھوں نے ایک نہ سنی اور کہنے لگے کہ تم اگر چاہتے ہو کہ تنہا طواف بیت اللہ کر لو تو کر لو ورنہ ہم محمد ﷺ اور ان کے دوسرے رفقاء کو ہر گز مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا: یہ تو میں ہر گز نہیں کر سکتا کہ خدا کے رسول ﷺ کے بغیر طواف اور عمرہ کو ادا کر لوں قریش نے جب حضرت عثمانؓ کا یہ اصرار دیکھا تو ان کو واپس جانے سے روک لیا۔

بیعت رضوان

یہ خبر مسلمانوں تک اس طرح پہنچی کہ عثمانؓ قتل کر دیے گئے مسلمانوں کیلئے یہ خبر ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس سے ہر شخص مضطرب اور بے قابو ہوا جا رہا تھا نبی اکرم ﷺ نے اسی وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی کہ مر جائیں گے۔ مگر ہم میں سے کوئی ایک بھی راہ فرار اختیار نہیں کرے گا نبی اکرم ﷺ جب مسلمانوں سے بیعت لے چکے تو ان میں حیرت زا والہانہ جوش و خروش پیدا ہو گیا جس کی خبر شدہ شدہ مکہ بھی پہنچ گئی مشرکین مکہ بہت گھبرائے اور خوف زدہ ہو کر مسلمانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ قتل عثمانؓ کی خبر غلط ہے اور حضرت عثمانؓ صحیح و سلامت واپس تشریف لے آئے۔

چونکہ جہاد کی یہ بیعت بہت ہی نازک اور اہم موقع پر لی گئی اور مسلمانوں نے پورے ولولہ اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اس بیعت کو کیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس فداکاری کی قدر و منزلت فرمائی اور سورۂ فتح میں اپنی رضا اور خوشنودی کا پروانہ مرحمت فرما کر ان کے اس کارنامہ کو زندۂ جاوید بنا دیا اور اسی حقیقت کے پیش نظر اسلامی تاریخ میں اس کا نام "بیعت رضوان" قرار پایا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝

بلا شبہ اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر اس درخت کے نیچے بیعت کرنے لگے اور جان لیا اللہ نے جو ان کے جی میں تھا پس اتارا ان پر اطمینان و سکون اور انعام میں دیا ان کو ایک فتح قریب۔[1]

مسلمانوں کے فداکارانہ جوش اور والہانہ جذبہ نے مشرکین مکہ پر ایسا اثر کیا کہ اب وہ خود صلح پر آمادہ ہو گئے اور پیش قدمی کر کے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نبی اکرم ﷺ سے شرائط صلح طے کرے تا کہ یہ قضیہ ختم ہو جائے مگر یہ شرط بہر صورت رہے گی کہ مسلمان اس سال نہیں بلکہ آئندہ سال عمرہ کر پائیں گے۔

(البدایہ والنہایہ، جلد ۴ ص ۱۶۷۔۱۶۸)

معاہدۂ صلح

سہیل بن عمرو جب مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچا تو حضور اقدس ﷺ نے صلح کے نقطۂ خیال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور طویل گفت و شنید کے بعد حسب ذیل دفعات پر دونوں جانب سے معاہدہ کی تصدیق و توثیق عمل میں آ گئی۔

۱) اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں۔

۲) آئندہ سال مسلمان مکہ میں بغرض عمرہ اس طرح داخل ہوں گے کہ معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے علاوہ کوئی جنگی ہتھیار نہیں ہو گا اور تلواریں نیام کے اندر ہی رہیں گے اور صرف تین دن قیام کریں گے اور جب تک وہ رہیں گے ہم مکہ چھوڑ کر پہاڑیوں پر چلے جائیں گے۔

۳) معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن و عافیت کے ساتھ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

۴) اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہو کر بھی مدینہ چلا جائے گا تو اس کو مکہ واپس کرنا ہو گا اور اگر مدینہ سے کوئی شخص مکہ بھاگ آئے گا اور ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔

۵) تمام قبائل آزاد ہیں کہ ہر دو فریق میں سے جو جس کا حلیف بننا پسند کرے اسکا حلیف بن جائے۔

۶) یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہے گا اور کوئی فریق اس مدت کے اندر اس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۸،۱۶۹)

معاہدہ کی تحریر کے وقت نام مبارک کے ساتھ رسول اللہ لکھنے پر سہیل نے اعتراض کیا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہے تو یہ واقعہ اور حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ہم کو چونکہ صلح مقصود ہے اس لئے تم اگر یہ پسند نہیں کرتے تو مجھ کو اصرار نہیں اور یہ فرما کر آپ ﷺ نے کاتب معاہدہ حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ اس جملہ کو محو کر دیں، حضرت علیؓ سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ اس جملہ کو اپنے ہاتھ سے مٹائیں

ا: حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں "واثابھم فتحا قریبا" میں فتح قریب سے مراد "فتح خیبر" ہے جو حدیبیہ کے بعد پیش آیا اور مسلمانوں کو جس میں بہت مال غنیمت ہاتھ آیا اور یہی صحیح قول ہے۔ جلد ۷ ص ۳۵۵۔

جسکی نسبت نے ساری کائنات میں انقلاب پیدا کر کے ظلمت کو نور سے شرک کو ایمان سے اور جہل کو علم سے بدل ڈالا نبی اکرم ﷺ نے جب یہ محسوس کیا تو مقام تحریر کو معلوم کر کے دست مبارک سے اس جملہ کو محو کر دیا۔ (تاریخ طبری جلد ۳ ص ۸۰)

معاہدہ جب مکمل ہو گیا تو مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں ہمارا پہلو کمزور رہا اور صورت حال یہ ہو گئی کہ گویا ہم نے دب کر صلح کی ہے حتی کہ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی سر بلندی کے جذبہ نے مجبور کیا کہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کریں یا رسول اللہ! کیا یہ حدیبیہ کا واقعہ "فتح" ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہاں! قسم بخدا بلا شبہ یہ "فتح" ہے۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۵)

یہ واقعہ جو اپنی دفعات معاہدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بظاہر شکست اور ذلت کا باعث نظر آتا تھا "فتح مبین" کیسے تھا؟ تو اس کا جواب جلیل القدر محدثین کی زبانی سنئے امام حدیث و سیرت زہری (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں۔

> اسلام میں جو عظیم الشان فتوحات شمار کی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی "فتح عظیم" صلح حدیبیہ ہے اس لئے کہ اس سے قبل برابر کفار و مشرکین سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا اور جب یہ "صلح" عمل میں آ گئی تو اس کی وجہ سے ہر دو فریق کو امن و اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا اور تبادلہ خیالات کی آزادی نصیب ہوئی نتیجہ یہ نکلا جو شخص بھی اسلام کو اپنی عقل صحیح سے جانچتا اور اس کی حقیقت پر غور کرتا اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا تھا کہ وہ فوراً اسلام قبول کر لے چنانچہ ان دو سال میں (جب تک معاہدہ پر عمل رہا اور مشرکین نے اپنی جانب سے اس کی خلاف ورزی نہیں کی) لوگ اس قدر مسلمان ہوئے کہ اس سے قبل کی پوری مدت میں اسی قدر یا اس سے بھی کم مسلمان ہوئے تھے۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۵)

اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

> "اس مقام پر "فتح مبین" سے مراد واقعۂ حدیبیہ ہے صلح حدیبیہ نے در حقیقت "فتح مبین"، فتح مکہ کے لئے راہ کھول دی، یہ اس لئے کہ جب جنگ کا خطرہ درمیان سے جاتا رہا اور امن و اطمینان کی صورت پیدا ہو گئی تو مکہ اور مدینہ کے درمیان سلسلۂ آمد و رفت بے خوف خطر ہونے لگا اور حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ جیسے شجیع اور مدبر حضرات کا قبول اسلام اسی صلح کا کارنامہ ہے اور یہی اسباب ترقی آہستہ آہستہ فتح مکہ کا باعث بنے۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۵)

اور ابن ہشامؒ، امام زہریؒ کی توجیہ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "زہری کے قول کی تائید اس حقیقت حال سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ واقعہ حدیبیہ میں جب نبی اکرم ﷺ نکلے ہیں تو چودہ سو مسلمان جلو میں تھے اور دو سال بعد جب فتح مکہ کے لئے نکلے ہیں تو دس ہزار کی تعداد تھی۔ (فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۵)

الفتح الاعظم

رمضان المبارک ۸ھ میں فتح مکہ کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔اس واقعہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ میں یہ طے پا گیا تھا کہ قبائل عرب اس کے لے آزاد ہوں گے کہ نبی اکرم ﷺ اور قریش میں سے جس کے بھی حلیف بنناچاہیں بن جائیں جب معاہدہ پردونوں جانب سے دستخط ہوگئے تو فوراعرب کے قبیلہ خزاعہ نے اعلان کیا کہ ہم مسلمانوں کے حلیف ہونا پسند کرتے ہیں اور قبیلہ بنو بکر نے کہا کہ ہم قریش کے حلیف بننا چاہتے ہیں اور دونوں قبائل اس طرح الگ الگ دو جماعتوں کے حلیف ہوگئے۔

تقریباً ڈیڑھ سال تو معاہدہ پر ہر دو جانب سے پوری طرح عمل ہوتا رہا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد ایک نیاواقعہ پیش آیا وہ یہ کہ بنی خزاعہ اور بنی بکر کے درمیان عرصہ سے جنگ وپیکار کا سلسلہ جاری رہ چکا تھا جو اس درمیانی مدت میں اگرچہ بند رہا مگر اچانک کسی بات پر پھر جنگ چھڑ گئی اور بنو بکر ایک شب کو مقام ذنیرہ[1] میں بنو خزاعہ پر جا پڑے قریش کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے شب کا وقت ہے اور مسلمان یہاں سے بہت دور ہیں آج موقع ہے کہ بنی خزاعہ کو پیغمبر اسلام ﷺ کے حلیف ہونے کا مزہ چکھایا جائے چنانچہ انھوں بھی بنی بکر کا ساتھ دیتے ہوئے بنی خزاعہ کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔

عمرو بن سالم نے جب یہ حال دیکھا تو ایک وفد لے کر دربارِ قدسی میں استغاثہ کیا، اور بنی خزاعہ کی دردناک حالت کو پیش کرتے ہوئے طالبِ امداد ہوا، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

والله لامنعكم ما امنع نفسى منه

قسم بخدا میں جس چیز کو اپنی ذات سے روکوں گا تم کو بھی اس سے ضرور محفوظ رکھوں گا۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۴ صفحہ ۲۷۸)

ادھر قریش کو جب یہ علم ہوا تو وہ ڈرے، اپنی حرکتِ بیجا پر نادم ہوئے اور انہوں نے ابو سفیان کو مامور کیا کہ وہ مدینہ جائے اور مسلمانوں کے اشتعال کو دور کرنے کی تدبیر کرے کہ قریش چاہتے ہیں کہ سابق معاہدہ کی مدت میں مزید اضافہ اور از سرِ نو معاہدہ کی توثیق ہو جائے۔ ابو سفیان مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل ہوا جو نبی اکرم ﷺ کی رفیقۂ حیات تھیں۔ ابو سفیان نے جونہی ارادہ کیا کہ نبی اکرم ﷺ کے بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ جائے، سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فوراً اس کو سمیٹ دیا اور کہنے لگیں: "باپ! یہ خدا کے نبی ﷺ کا بچھونا ہے" ابو سفیان نے کہا کہ "پھر کیا ہوا اگر میں تیرا باپ ہوں"

ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "یہ صحیح ہے مگر تو مشرک ہے اور یہ پیغمبر خدا کا پاک بستر"۔

ابو سفیان اگرچہ اس وقت بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا، مگر اس حیرت زاد واقعہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور

۱: مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔

وہ سمجھا کہ حقیقتِ حال کیا ہے؟۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۴ صفحہ ۲۸۷)

غرض وہ دربارِ اقدس ﷺ میں حاضر ہوا، اور عرض و معروض کرنے لگا، آپ نے دریافت فرمایا: یہ تجدید و توثیق کی کیا حاجت ہے، کیا کوئی نیا واقعہ پیش آگیا ہے؟ ابوسفیان نے عرض کیا: "نہیں کوئی نئی بات نہیں ہے"۔

تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

"تو مطمئن رہو کہ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں"۔

ابوسفیان اس جواب کو سن کر مطمئن نہ ہوا، اس لیے کہ وہ حقیقتِ حال کو چھپا کر جھوٹ بول چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح نبی اکرم ﷺ کو دھوکا دے کر اپنا مقصد پورا کرلے لیکن اس صاف اور سچے جواب نے اوس ڈال دی اور اس کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ تب اس نے صدیق اکبر، فاروق اعظم، علی حیدر (رضی اللہ عنہم) کی خدمت میں حاضر ہو کر جدا جدا گفتگو کی اور چاہا کہ معاملہ قریش کے حسب مراد طے ہو جائے لیکن اس کی مراد بر نہ آسکی اور بے نیل و مرام مکہ واپس ہو گیا۔

نبی اکرم ﷺ نے صدیق اکبرؓ کو صورت حال سے آگاہ فرمایا، حضرت صدیقؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہمارے اور قریش کے درمیان تو معاہدہ ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تھا مگر قریش نے خود نقض عہد کر دیا ہے"۔

اب جہاد کی تیاری شروع ہوئی، مگر عام طور پر یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کس جانب ارادہ ہے آپ ﷺ نے اطراف مدینہ میں نفیر عام کرا دیا کہ جو شخص بھی اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ رمضان تک مدینہ پہنچ جائے آپ ﷺ پوری کوشش فرما رہے تھے کسی طرح ہماری تیاری کا حال قریش کو نہ معلوم ہو جائے کیونکہ آپ ﷺ کی دلی خواہش یہ تھی کہ مکہ میں جنگ بپا نہ ہونے پائے اور قریش مرعوب ہو کر منقاد و مطیع ہو جائیں کہ اسی اثناء میں ایک حادثہ پیش آگیا۔

حاطب بن بلتعہ کا واقعہ

حاطب بن بلتعہؓ ایک بدری صحابی تھے ان کے اہل و عیال مکہ ہی میں تھے کہ یہ صورت حال پیش آگئی انھوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس واقعہ کا حال بہر حال مشرکین کو معلوم ہو ہی جائے گا سو اگر میں بھی قریش مکہ کو اس کی اطلاع کر دوں تو ہمارا (مسلمانوں کا) کوئی نقصان بھی نہیں ہو گا اور میں ان کی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل و عیال کو ان کی مضرت سے بھی محفوظ رکھ سکوں گا مشرکین مکہ کے نام ایک مکتوب لکھ دیا نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی الٰہی یہ معلوم ہو گیا اور آپ ﷺ نے حضرت علیؓ، مقدادؓ، زبیرؓ کو مامور فرمایا کہ روضۃ خاخ جاؤ، وہاں ناقہ سوار عورت ملے گی وہ جاسوس ہے اس کے پاس ایک خط ہے وہ اس سے چھین لو یہ حضرات روضۃ خاخ پہنچے تو عورت کو موجود پایا انھوں نے خط کا مطالبہ کیا عورت نے انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے مگر جب انھوں نے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو مجبور ہو کر اس نے سر کے بالوں میں سے ایک پرچہ نکال کر دیا۔

یہ پرچہ جب نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ حضرت حاطب کا خط تھا نبی اکرم ﷺ نے ان کی جانب مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا: حاطب! یہ کیا؟ حاطب نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! عجلت نہ فرمائیں یہ خط میں نے اسلئے لکھاہے کہ میں جانتا ہوں کہ مدینہ میں مقیم سب مہاجرین کا مکہ کے قریشیوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا رشتہ اور تعلق ہے ایک میں ہی ایسا ہوں جس کا ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے تو میں نے یہ صرف اس یقین پر کیا ہے کہ مسلمانوں کو تو اس بات سے کوئی نقصان نہیں ہو گا اور میں اس طرح قریش کی ہمدردی حاصل کر کے اپنے اہل وعیال کو محفوظ کر سکوں گا یارسول اللہ ﷺ! بخدا میں نے ہرگز، ہرگز یہ کام ارتداد اور کفر پر رضا کی نیت سے نہیں کیا میں اب بھی اسلام کا شیدائی اور فدائی ہوں۔

نبی اکرم ﷺ نے یہ سب سن کر ارشاد فرمایا" حاطب نے تمہارے سامنے سچ سچ بات کہہ دی"۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اڑادوں" نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حاطب بدر کے مجاہد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے شرکاء بدر کے لئے ارشاد فرمایا ہے: اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم حاطب کے واقعہ پر ہی قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ (الی) فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ[1] بہر حال رمضان کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ ذات اقدس ﷺ دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوئے آپ جب قدید اور عسفان کے درمیان کے ۔ تک پہنچے تو دیکھا کہ مسلمانوں پر روزہ کی سختی حد سے تجاوز ہوتی جارہی ہے تب آپ ﷺ نے پانی طلب فرمایا اور مجمع کے سامنے نوش فرمایا۔ (بخاری، باب الغزوات)

تاکہ صحابہؓ دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ مسافرت اور پھر جہاد کے موقع پر افطار کی اجازت ہے اور قرآن کی دی ہوئی رخصت کا یہی مطلب ہے۔

اسی سفر میں ذات اقدس ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوئے آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اہل وعیال کو مدینہ بھیج دو، اور تم ہمارے ساتھ رہو۔

اسلامی لشکر جب مکہ کے قریب پہنچا تو ابو سفیان چھپ کر لشکر کا صحیح اندازہ کر رہے تھے کہ اچانک مسلمانوں نے گرفتار کر کے خدمت اقدس میں پیش کیا آپ ﷺ نے ابوسفیان پر نگاہ کرم ڈالتے ہوئے معاف کر دیا، اور قید سے آزاد کر دیا، ابو سفیان نے رحمتہ للعالمین ﷺ کا یہ خلق دیکھا تو فوراً مشرف باسلام ہو گئے اسی طرح عبد اللہ بن ابی امیہ بھی اسلام کے والہ وشید ابن کر حاضر خدمت ہوئے آپ ﷺ نے ان حضرات کے قبول اسلام پر بہت مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو بھی مکہ واپس نہ جانے دو اور سامنے کی پہاڑی پر لیجاؤ تاکہ وہ مسلمانوں کی طاقت وشوکت کا اندازہ کر سکے۔

ابوسفیان اور حضرت عباسؓ پہاڑی پر کھڑے ہوئے اسلامی لشکر کا نظارہ کر رہے تھے اور مہاجرین وانصار قبائل کے جدا جدا لشکر اپنے پرچم لہراتے ہوئے سامنے سے گذرے تھے اور ابوسفیان ان کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہو

---

[1] بخاری۔ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

رہے تھے کہ انصاری قبیلہ کا ایک لشکر پاس سے گذرا اس لشکر کا پرچم حضرت سعد بن عبادہؓ کے ہاتھ میں تھا انھوں نے ابو سفیان کو دیکھا تو جوش میں کہنے لگے الیوم یوم الملحمه الیوم تستحل الکعبة (آج کا دن جنگ کا دن ہے، آج کعبہ میں بھی جنگ حلال ہے) ابو سفیان کی نسلی عصبیت بھڑک گئی اور کہنے لگا: یا عباس حبذا یوم الذمار (اے عباس جنگ کا دن مبارک ہو)

جب سب لشکر اسی طرح گذر گئے تو آخر میں چھوٹی سی جماعت کے جلو میں سرور دو عالم ﷺ سامنے سے گذرے، حضرت زبیرؓ کے ہاتھ میں پرچم تھا اور وہ آگے چل رہے تھے ابو سفیان کی نگاہ جب نبی اکرم ﷺ پر پڑی تو اس نے خدمت اقدس ﷺ میں سعد اور اپنے درمیان مکالمہ کا حال سنایا۔ یہ سن کر ذات اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: سعد نے جھوٹ بولا ھذا یوم یعظم الله فیه الکعبة و یوم تکسی فیه الکعبة (آج کا دن وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں کعبہ کی عظمت کو بالا کرے گا اور آج کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا اور یہ فرما کر حضرت سعدؓ کو برطرف کر کے پرچم اور لشکر کی سیادت حضرت سعدؓ کے بیٹے کو عطا کر دی۔

اب نبی اکرم ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو حکم فرمایا کہ تم مکہ کے زیریں حصہ کی جانب سے داخل ہونا اور کسی کو قتل نہ کرنا ہاں اگر کوئی خود اقدام کرے تو دفاع کی اجازت ہے اور بنفس نفیس مکہ کے بلند حصہ سے داخل ہوئے حضرت خالدؓ سے بعض قبائل کے افراد نے مزاحمت کی اس لئے ان کے ہاتھوں چند مقتول ہو گئے لیکن نبی اکرم ﷺ بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہوئے۔ (بخاری۔ جلد ۲)

جب مرالظہران میں حضرت عباسؓ نے ابو سفیان کو قبول اسلام کے لئے خدمت اقدس میں پیش کیا تھا تو یہ بھی عرض کیا تھا: یارسول اللہ ﷺ! ابو سفیان میں فخر کا مادہ ہے اس لئے اگر اس کو کوئی امتیازی حیثیت نصیب ہو جائے بہتر ہو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا من دخل دار ابی سفیان فھو آمن جو شخص ابو سفیان کے مکان میں داخل ہو جائے گا اس کو امن ہے۔

غرض جب آپ باعزت واجلال مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت یہ اعلان کرا دیا

۱) جو مکان بند کرا کے بیٹھ جائے اس کو امن ہے۔

۲) جو ابو سفیان کے مکان میں پناہ لے اس کو امن ہے۔

۳) جو مسجد حرام میں پناہ لے اس کو امن ہے۔

البتہ اس امن عام اور عفو عظیم سے چند ایسی ہستیوں کو مستثنیٰ فرما دیا جنھوں نے اسلام کے خلاف بہت زہر چکانی کی تھی اور مسلمانوں کی ایذارسانی میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا مگر ان میں سے اکثر اس وقت چھپ گئے یا فرار ہو گئے اور آہستہ آہستہ عفو عام سے مستفیض ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔

نبی اکرم ﷺ مکہ اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ ﷺ کا علم سپید رنگ کا تھا اور آپ ﷺ پرچم کا عقاب نامی سیاہ رنگ تھا سر پر مغفر اوڑھے ہوئے اور اس پر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے سورہ انا فتحنا پڑھتے ہوئے آیات کو بلند آواز سے دہراتے جاتے تھے اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ درگاہ الٰہی میں خشوع و خضوع کے ساتھ ناقہ پر اس درجہ جھکے ہوئے تھے کہ چہرہ مبارک ناقہ کی پیٹھ کو مس کر رہا تھا۔

بت شکنی

جب نبی اکرم ﷺ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ کعبہ سے تمام بت نکال کر پھینک دیے جائیں اور دیواروں پر جو تصاویر منقوش ہیں وہ مٹادی جائیں چنانچہ جب تین سو ساٹھ بتوں کے سرنگوں ہونے کا وقت آیا تو دو مورتیاں حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی اس حالت میں سامنے آئیں کہ ان کے ہاتھوں میں بانسوں کے تیر تھے، آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا خدا ان مشرکوں کو مارے یہ خوب جانتے تھے کہ یہ دونوں مقدس ہستیاں اس ناپاک بات سے مقدس اور پاک تھیں۔

نبی اکرم ﷺ نے کعبہ کا طواف کیا اور پھر بتوں کے سامنے کھڑے ہو کر لکڑی سے ان کو چرکا دیتے جاتے تھے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (حق آپہنچا اور باطل اڑ گیا۔ اور باطل نہ کسی شے کو پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے (یعنی باطل تو خود فنا ہونے کے لئے ہے)۔

رحمتہ للعالمین کی شان

کعبہ جب بتوں کی نجاست و تلویث سے پاک کر دیا گیا تو نبی اکرم ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے اور اس کے گوشوں میں گھومتے ہوئے بلند آواز سے تکبیرات کہتے رہے اور نماز نفل ادا کی باہر تشریف لائے تو مصلیٰ ابراہیمی پر جا کر نماز ادا کی جب آپ ﷺ اور صحابہؓ وضوء فرمارہے تھے تو مشرکین انگشت بدنداں و حیران تھے کہ بایں فتح و کامرانی نہ جشن ہے نہ کبر و نخوت کا اظہار، بلکہ درگاہ الٰہی میں اظہار عبودیت کے لئے ہر ایک مجاہد بیتاب نظر آتا ہے بلاشبہ یہ "بادشاہت" نہیں ہے بلکہ دوسرا ہی کوئی عالم ہے۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص۔ ۳۰)

آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت علیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ ہمارے لئے دو خدمتیں "حجابتہ اور سقایۃ" جمع فرما دیجیے اور کعبہ کی کنجی ہمارے حوالہ کر دیجیے[1] لیکن نبی اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کے متعدد بار عرض کرنے کا کوئی جواب نہیں دیا اور بار بار یہی فرمایا: "عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟" جب عثمانؓ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے کعبہ کی کلید ان کے حوالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا هاك مفتاحك يا عثمان اليوم يوم بر و وفاء عثمان لو یہ اپنی کنجی، آج کا دن بھلائی اور وفاء عہد کا دن ہے۔"[2]

اب لوگ منتظر تھے کہ دیکھئے جن مشرکین نے برسوں تک آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذاء دی، مصائب میں مبتلا کیا آج ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے؟

آپ ﷺ نے تمام قریشی قیدیوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب سب خدمت اقدس میں پیش ہوئے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: "اے قریشی گروہ! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ کس طرح پیش آؤں؟" انھوں نے جواب دیا "ہم آپ سے خیر کی امید رکھتے ہیں۔"

۱: سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانے کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد تھی، اب وہ کلید برداری کا شرف بھی جمع کرنا چاہتے تھے۔

۲: یہ وہی عثمانؓ بن طلحہ ہیں جنہوں نے کلید کعبہ طلب کرنے پر نبی اکرم ﷺ کو نہیں دی تھی لیکن رحمت عالمیاں کی درگاہ میں انتقام بے حقیقت شے تھی۔ اسلئے آپ ﷺ نے ان ہی کے خاندان میں یہ سعادت باقی رہنے دی، یہی خاندان آج تک کعبہ کا مجاور اور شیبی کے لقب سے مشہور ہے کیونکہ حضرت عثمانؓ بن طلحہ بنو شیبہ میں تھے۔

آپ ﷺ نے یہ سن کر زبان وحی ترجمان سے یہ ارشاد فرمایااذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤتم سب آزاد ہو) یہ سننا تھا کہ نہ صرف قریش بلکہ ہر ایک صاحب بصیرت کے سامنے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ بادشاہ اور پیغمبر کی زندگی کا امتیازی نشان کیا ہے؟ پیغمبرانہ زندگی نہ ذاتی عداوت و کدورت کو کوئی وقعت دیتی ہے اور نہ اس کا غیظ و غضب ہواء نفس کے تابع ہوتا ہے ایک نبی کو اگر صبر آزما حد تک ایذاء و تکلیف دی جائے اور پھر موذی شخص رحم کا طالب ہو تو وہ بلا شبہ "عفوو کرم" ہی پائے گا اور مکارم اخلاق کے ہر پہلو کا مظاہرہ دیکھے گا چنانچہ اس درمیان میں جب ایک شخص لرزتا کانپتا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے شیریں گفتاری کے ساتھ ارشاد فرمایا: هون عليك فاني لست بملك انما انا ابن امراءة من قريش كانت تاكل القديد گھبراؤ نہیں میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا ہی بیٹا ہوں۔

اسی عفوو کرم کا یہ نتیجہ نکلا کہ زعماء قریش جوق در جوق حاضر خدمت ہوتے اور دولت اسلام سے مشرف ہو کر سعادت کبریٰ سے محظوظ ہوتے تھے چنانچہ حضرت معاویہؓ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے والد ابو قحافہؓ جیسے حضرات اسی دن مسلمان ہوئے۔

خطبہ

نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر ایک اہم خطبہ بھی دیا جو اسلام کے بہت سے احکام کی اساس و بنیاد ہے، اس خطبے کے چند اعلانات یہ ہیں:۔

۱) مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔
۲) معاملات اور قضایا میں مدعی کے ذمہ گواہوں کا پیش کرنا اور گواہوں کی عدم موجودگی میں مدعی علیہ کے ذمہ حلف اٹھانا ہے۔
۳) کسی عورت کو تین دن کا سفر بغیر ذی رحم محرم کے درست نہیں ہے۔
۴) صبح اور عصر کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہے اور عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن روزہ جائز نہیں ہے۔
۵) اے گروہ قریش! بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے نخوت جاہلیت اور باپ دادا کے نام و نسب پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے، آگاہ رہو کہ تم انسانی دنیا آدم علیہ السلام کی اولاد ہے اور آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے:۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْٓا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ○

فتح مکہ اور قرآن عزیز

سورۃ فتح، حدید، نصر ان تینوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے متعلق اشارات فرماتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الفتح میں ہے۔

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۞

اور خدا تجھ کو مدد دے گا زبردست مدد

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ فتح مکہ کی جانب اشارہ ہے۔

اور سورۂ حدید میں ہے:

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولٰٓئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى

تم میں برابر نہیں ہیں وہ کہ جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے اور جہاد کیا ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے جو کہ خرچ کریں فتح مکہ کے بعد اور جہاد کریں اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا۔

اور سورۂ نصر میں ہے:

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۞ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا ۞

جب آ جائے اللہ کی فتح (مکہ) اور تم دیکھو لوگوں کو وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں۔

یہاں باجماع امت "الفتح" سے مراد فتح مکہ ہے۔

حافظ بن حجرؒ امام شعبیؒ سے نقل فرماتے ہیں: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا میں "فتح مبین" صلح حدیبیہ کی جانب اشارہ ہے اور فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا میں فتح قریب" سے بھی حدیبیہ کے ہی ثمرات ونتائج مراد ہیں اور سورہ نصر کی آیت إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ میں نصر وفتح سے باتفاق مکہ مراد ہے۔" (فتح الباری۔ جلد ۸ ص ۳۵۵)

اور اس نقل کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"ان آیات کے مفہوم ومراد میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ سے متعلق جو مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور موجب اشکال بنتے ہیں شعبیؒ کی اس تقریر سے تمام اقوال میں مطابقت بھی ہو جاتی ہے اور اشکال بھی دور ہو جاتا ہے۔
(فتح الباری۔ جلد ۸ ص ۳۵۵)

سورۂ الفتح، النصر اور الحدید کی مسطورۂ بالا آیات کا مصداق فتح مکہ ہے صلح حدیبیہ؟ اس بارہ میں مختلف اقوال وروایات اور امام شعبیؒ کی توجیہ اور اس پر حافظ حدیث ابن حجرؒ کی تائید وتصدیق کے مطالعہ کے بعد بھی ہم یہ کہنے کی جراءت کر سکتے ہیں کہ سورۂ فتح میں فتح مبین نصر عزیز اور فتح قریب کا ذکر اور پھر سورۂ حدید میں انفاق وجہاد فی سبیل اللہ کو الفتح کے قبل اور بعد کے ساتھ تقسیم درجات وفضائل کا تذکرہ اور پھر سورۂ نصر کی ایک آیت نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ میں "نصر وفتح" کا اجتماعی ذکر صاف صاف اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ان مقامات میں ایسے واقعہ کا تذکرہ ہے جس کی ابتداء جہاد وقتال سے شروع ہو کر ایک ایسی فتح ونصرت پر نتیجہ خیز ہوئی ہو جس کے بعد سرزمین حجاز ہمیشہ کے لئے شرک وبت پرستی کی تلویث سے پاک ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ شرف بلا شبہ فتح مکہ ہی حاصل ہے البتہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ صلح حدیبیہ کے وقت سورۂ الفتح کا نزول اور إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا کا اسلوب بیان یہ بھی واضح کرتا ہے کہ صلح حدیبیہ چونکہ اپنے اسباب و

عواقب اور نتائج و ثمرات کے لحاظ سے فتح مکہ کا پیش خیمہ اور اس کے لئے تمہید ثابت ہوئی اس لئے وہ بھی فتح مبین کہلانے کی مستحق ہے یعنی جو واقعہ فتح قریب نصر عزیز اور الفتح و نصر کا باعث ہو وہ یقیناً ''فتح مبین'' کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

غزوہ حنین

فتح عظیم کے بعد مشرکین عرب کی شوکت وصولت کا قریب قریب خاتمہ ہو گیا اور اب عرب قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے یہ دیکھ کر دو قبائل کی حمیت جاہلیت بھڑک اٹھی اور وہ اسلام کی ترقی کو برداشت نہ کر سکے، ہوازن اور ثقیف دونوں قبائل کے سرداروں کا اجتماع ہوا اور انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ محمد ﷺ اپنی قوم (قریش) کو مغلوب کر کے مطمئن ہو گئے ہیں لہٰذا اب ہماری باری ہے پس کیوں نہ ہم ہی پیش قدمی کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں اور ان کا قلع قمع کر کے رکھ دیں، دونوں نے یہ منصوبہ باندھا اور مالک بن عوف نضری کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے آتش حسد کو مسلمانوں کے خون سے بجھانے کی کوشش کی مالک نے بہت سے قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر تیاری شروع کر دی۔

نبی اکرم ﷺ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو صحابہؓ کو جمع فرمایا اور بعد مشاورت، مدافعت کے لئے آمادہ ہو کر حنین کو روانہ ہو گئے اس وقت لشکر اسلامی میں بارہ ہزار جاں نثار موجود تھے ان میں سے دس ہزار مہاجرین وانصار اور مدنی جاں نثار تھے اور دو ہزار وہ تھے جو فتح مکہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے اور اسی وہ مشرکین (طلقاء) تھے جو اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود رحمتہ للعلمین کے مظاہرے دیکھ کر خود اپنی خواہش سے مسلمانوں کے رفیق جنگ بن گئے تھے۔

۱۰ار[1] شوال ۸ھ ہجری مطابق فروری ۶۳۰ء کو ذات اقدس ﷺ کے جلو میں مجاہدین اسلام کا لشکر حنین جا پہنچا، آپ نے دشمن کے مقابلہ میں جب اسلامی فوج کو صف آرا ہونے کا حکم دیا تو مہاجرین کا پرچم حضرت علیؓ کو مرحمت فرمایا اور انصار میں سے بنی خزرج کا پرچم خباب بن منذر کو بخشا اور اوس کا اسید بن حضیر کو عنایت فرمایا۔

اور اسی طرح مختلف قبائل کے سرداروں کو ان کی فوج کا پرچم عطا فرمایا۔

نبی اکرم ﷺ بھی بنفس نفیس ہتھیار سجے دو زرہ ملبوس کیے خود سر پر رکھے اپنے مشہور خچر پر سوار اسلامی فوج کی کمان کر رہے تھے۔

ابھی جنگ نے قتل و قتال کی صورت نہیں دیکھی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے لشکر کی اکثریت اور فوج کی فراوانی اس درجہ اثر کر گئی بعض مسلمانوں کی زبان سے انشاء اللہ کہے بغیر ہی اپنی قوت کے گھمنڈ پر یہ نکل گیا کہ ہماری قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

مسلمان خدائے واحد کا پرستار مسلمان اور خدائے قدوس پر بھروسہ کی بجائے اپنی عددی اکثریت پر گھمنڈ کرے، یہ اس کی بھول ہے اس لئے خدا کو مسلمانوں کا یہ فخر پسند نہیں آیا اور اس لئے ان پر یہ تازیانۂ عبرت لگا

---

[1] فتح الباری۔ جلد ۸۔

کہ جب جنگ کا افتتاح ہوا اور مسلمانوں کے لشکر نے پیش قدمی کی تو اچانک دشمن کی ان ٹولیوں نے گوریلا جنگ لڑنے کیلئے پہاڑ کی مختلف گھائیوں میں گھات لگائے بیٹھی تھی چہار جانب سے اسلامی لشکر پر بارش کی طرح تیر باری شروع کردی۔

اسلامی لشکر اس بے محابا تیر باری کا متوقع نہ تھا اس لئے ان کی صفوں میں تزلزل پیدا ہوگیا اور تھوڑی سی دیر میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور نبی اکرم ﷺ اور مشہور مہاجرین وانصار صحابہؓ کے علاوہ تمام بدوی قبائل اور مدنی لشکر کی اکثریت نے راہ فرار اختیار کی۔

نبی اکرم ﷺ اس حالت میں بھی یہ رجز پڑھتے اور شجاعانہ مظاہرہ فرماتے جاتے تھے انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب غرض اسی وقت نبی اکرم ﷺ کے اشارہ پر حضرت عباسؓ نے بلند آواز سے مفرور مسلمانوں کو للکارا "یامعشر الانصار" "یااصحاب بیعۃ الرضوان"۔

حضرت عباسؓ کی صدائے حق گونجی ہی تھی کہ ایک ایک مسلمان اپنی حالت پر متاسف ہوکر پلٹ پڑا اور منٹوں میں تمام جاں نثار نبی اکرم ﷺ کے گرد جمع ہوکر داد شجاعت دینے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ شکست مبدل بہ فتح ونصرت ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم نے ہزیمت کو "نصر عزیز" سے بدل دیا۔

مشرکین کی جماعت میں ایک مشہور ذی رائے درید بن صمہ نامی تھا اس نے مالک کے اس طرز عمل کی سخت مخالفت کی تھی کہ میدان میں عورتوں بچوں اور مال ودولت کے خزانوں کو ساتھ لے جائے مگر مالک نے اس کی رائے پر عمل نہ کیا اور سب کو ساتھ لے کر آیا تھا چنانچہ یہ سب مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور مشرکین کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

بہت سے مشرکین اور ان کے قبائل پر اگرچہ اسلام کی صداقت روشن ہوچکی تھی مگر پھر بھی وہ اپنے خیال میں مادی شوکت کو ہی مدار صداقت تسلیم کرتے تھے چنانچہ مسلمانوں پر خدائے تعالیٰ کے اس فضل وکرم کو جب انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھ لیا تو اب وہ بھی برضا ورغبت حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔

غزوۂ حنین اور قرآن حکیم

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کے اپنی کثرت پر عجب وغرور اور اس کے انجام میں ابتداءً شکست اور پھر خدا کے فضل سے فتح ونصرت کا حال قرآن حکیم نے سورۂ توبہ میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح کیا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكَافِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

بلاشبہ اللہ بہت میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا ہے اور حنین کے دن (بھی) جب تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی پوری وسعت پر بھی تم پر تنگ ہو گئی اور آخر کار ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے پھر اللہ نے اپنے رسول اپر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آئی تھیں اور ان لوگوں کو عذاب دیا جنھوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کی جزا یہی ہے اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا اپنی رحمت سے لوٹ آئے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔

غزوۂ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا

تبوک شام کا ایک مشہور شہر ہے، ۹ھ ہجری میں سردار دو عالم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ قیصر روم ہرقل ایک عظیم الشان لشکر مسلمانوں پر چڑھائی کے لئے تیار کر رہا ہے اور کئی لاکھ نبرد آزما والینٹیر اب تک بھرتی ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے یہ وقت بہت ہی کٹھن تھا سر زمین حجاز میں قحط پڑا ہوا تھا زمین پیداوار سے خالی، نہریں اور تالاب خشک اور گرمی نہایت شدت کی پڑ رہی تھی اور تمام آدمی عسرت کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔

اس کے باوجود موسم بہار تھا، باغوں میں کھجوریں پک رہی تھیں، کھجور کے پتوں سے سائبان تیار کئے جا رہے تھے اور عرب کے دستور کے مطابق لوگ باغوں میں خیمہ زن موسم کی بہار لوٹنا چاہتے تھے کہ اچانک یہ خبر آئی۔

سخت آزمائش کا وقت تھا سیکڑوں میل کی راہ بادِ سموم اور تپتے ہوئے ریت سے واسطہ، مگر فدا کاران اسلام عیش دنیا اور مصائب موسم سے بے خوف ہو کر پروانہ وار اسلام پر نثار ہونے کے لئے مدینہ میں جمع ہو رہے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو عام طریقہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیتے کہ کہاں کا قصد تا کہ دشمن صحیح حالات نہ پا سکے لیکن غزوۂ تبوک میں چونکہ سخت موسم تھا حجاز میں قحط سالی ناسازگاری حالات اور دشمن کی زبردست قوت کا مقابلہ کرنا تھا، اس لئے اس کڑی آزمائش میں ذات اقدس ﷺ نے تمام قبائل عرب میں اصل حقیقت کا اعلان کرا دیا تا کہ جو شخص بھی اس وادیٔ پر خار میں قدم رکھے سمجھ کر رکھے۔

مالی استعانت

مسطورہ بالا نازک حالات کے پیش نظر یہ پہلا غزوہ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے مجاہدین کی مالی استعانت کے لئے ترغیب دی اور جلیل القدر جاں نثاران اسلام کو اپنی مالی فداکاری کا ثبوت دینے کے لئے موقع بہم پہنچایا، چنانچہ حضرت عثمانؓ نے دس ہزار دینار سرخ، تین سو اونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کئے اور ذات اقدس ﷺ نے ان کے اس جذبہ اخلاص پر یہ دعا فرمائی

اللهم ارض عثمان فانی راض عنه

خدایا تو عثمان سے راضی ہو اس لئے کہ میں اس سے راضی ہوں۔

حضرت عمرؓ نے اپنا نصف مال پیش کر دیا حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے سو اوقیہ، اور حضرت عاصم بن عدی نے ساٹھ وسق کھجوریں پیش کیں اور حضرت عباس و حضرت طلحہؓ نے زر کثیر پیش کیا اور عورتوں نے بھی اپنے حوصلہ سے زیادہ زیورات پیش کئے حتیٰ کہ حضرت ابو بکرؓ نے تو اپنا کل مال ہی اسلام پر قربان کر دیا۔ صدیق اکبر جب اپنا مال لیکر حاضر خدمت ہوئے تو نبی اکرم ﷺ نے دریافت کیا: ابو بکرؓ تم اپنے اہل و عیال کے لئے بھی کچھ چھوڑ کر آئے ہو؟ ابو بکرؓ نے عرض کیا" ہاں یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام چھوڑ آیا ہوں۔"

غرض عظیم الشان تیاریوں کے بعد جب مسلمانوں کا لشکر جرار اعلاء کلمۃ اللہ کے فداکارانہ ولولہ اور جوش کے ساتھ تبوک کی طرف بڑھا تو ہرقل کو بھی جاسوسوں نے خبر کر دی۔ ہرقل یا تو کروفر کے ساتھ جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھا اور یا یہ خبر سنتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا اور "رومی" مسلمانوں کے عدیم النظیر جذبۂ ایثار فداکاری سے متاثر و خائف ہو کر تبوک میں مسلمانوں کے پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہو گئے اور نبی اکرم ﷺ راہ کے چند عیسائی امراء کو امن کا پروانہ دیتے اور معاہدات کرتے ہوئے کامرانی کے ساتھ واپس آ گئے۔

عذر خواہی

جب آپ مدینہ جلوہ افروز ہوئے تو منافقین نے اس عظیم الشان آزمائش میں عدم شرکت کے لئے جھوٹے اعذار تراش کر خدمت اقدس میں عذر خواہی کی اور ذات قدس ﷺ نے اسلام کے جماعتی نظام کی مصالح کے پیش نظر ان سے در گذر فرمایا۔

مگر عذر خواہ جماعتوں میں تین اشخاص مخلصینِ اسلام میں سے بھی تھے اور وہ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع جیسی ہستیاں تھیں۔ انھوں نے منافقین کی طرح حاضر ہو کر کذب بیانی سے کام نہیں لیا اور صاف صاف عرض کر دیا کہ اے خسرو دین و دنیا! میں چاہتا تو منافقین کی طرح کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے آپ کے مواخذہ سے بچ جاتا لیکن اگر کسی دنیادار سے ایسا معاملہ پیش آتا تو کر بھی لیتا مگر خدا کے نبی ﷺ کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ سچ بات یہ ہے کہ میں محض اپنی کاہلی کی وجہ سے "محروم الجہاد" رہا ہر دن یہ خیال کرتا رہا کہ آج اپنے باغوں کے لطف سے اور سیر ہو لوں کل ضرور روانہ ہو جاؤں گا اور لشکر اسلام کو ایک دو منزل ہی پر جا پکڑوں گا، آخر کار اس کاہلی کا نتیجہ محرومی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اب جو حکم ہو اس کے لئے سر تسلیم خم ہے یہی ہلال اور مرارہ نے کہا اور اس طرح تینوں مجرموں کی طرح حکم رسول ﷺ سننے کے لئے گوش بر آواز ہو گئے۔

معاشرتی مقاطعہ

یہ تینوں حضرات اسلام کے فدائی، اخلاص کے پیکر اور عاشقان رسول ﷺ تھے اس لئے ان کا معاملہ منافقین کا سا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نظام جماعت کی خلاف ورزی کر گذریں اور جہاد جیسے عظیم ترین رکن ملت کو محض کاہلی اور سستی پر قربان کر دیں اور پھر ان کو معمولی معذرت پر معاف کر دیا جائے اس لئے ضرورت تھی کہ س معاملہ میں ایسا فیصلہ دیا جائے کہ آئندہ کسی مخلص مسلمان کو ایسی غلط کاری اور نظام کی خلاف ورزی کی جرائت نہ

ہو سکے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اما هذا فقد صدق فقم حتى يقضي الله فيك۔

"تم نے سچ سچ بات کہہ دی اب جاؤ اور خدا کے فیصلہ کا انتظار کرو"۔

تینوں اس حکم کے بعد گھر واپس آگئے اور نبی اکرم ﷺ نے تمام صحابہؓ کو حکم فرمادیا کہ ان تینوں سے کلام و سلام سب ترک کر دیا جائے چنانچہ تمام مسلمانوں نے ان کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔

ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال

کعب خود فرماتے ہیں کہ اس واقعہ نے ہم تینوں پر جو کچھ اثر کیا اس کا اندازہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا میرے دونوں رفیقوں پر تو اس درجہ اثر پڑا کہ انھوں نے باہر نکلنا ہی ترک کر دیا۔ مگر میں سخت جان تھا برابر نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی میں حاضر ہوتا رہا۔

جب میں مسجد میں حاضر ہوتا تو نبی اکرم ﷺ کو سلام کرتا اور دیکھتا رہتا کہ لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں مگر بد قسمتی اور محرومی کے سوا کچھ نہ پاتا۔ البتہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو آپ میری جانب دیکھتے رہتے اور جب میں فارغ ہو کر آپ ﷺ کی جانب متوجہ ہوتا تو میری جانب سے رخ مبارک پھیر لیتے۔

لیکن اس تمام واقعہ میں مسلمانوں کی اسلام دوستی اور امر رسول پر امتثال و والہانہ استقامت کا یہ حال تھا کہ جب جب میں لوگوں کی اس سختی سے اکتا گیا تو ایک روز اپنے سب سے محبوب عزیز اور چچازاد بھائی ابو قتادہ کے پاس گیا اس ابو قتادہ کے پاس جو اس سے قبل مجھ پر جان چھڑکتا تھا اور میرا عاشق و جاں نثار تھا میں نے اس کو سلام کیا مگر قسم خدا کہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس حالت کو دیکھ کر تڑپ گیا اور ابو قتادہ سے کہا: ابو قتادہ! میں خدا کی قسم دیکر تجھ سے دریافت کرتا ہوں کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں اور میں عاشق خدا اور رسول ہوں؟ ابو قتادہ پھر بھی خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دو مرتبہ پھر اس بات کو دہرایا مگر اس نے سکوت ہی اختیار کیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ آخر جب تیسری مرتبہ کہا تو صرف یہ کہہ کر چپ ہو گیا اللہ ورسولہ اعلم خدا اور رسول ہی خوب جانتا ہے۔

یہ سن کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں کہ اللہ اکبر! یہ انقلاب اور صرف یہیں تک معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ چالیس دن گذرنے پر رسول اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ ان تینوں کی رفیقہ حیات کو بھی چاہیے کہ شوہروں سے مقاطعہ کر کے الگ ہو جائیں چنانچہ ان اللہ کی بندیوں نے ہمارے ساتھ قلبی تعلق کے باوجود حکم رسول کو مقدم سمجھا اور اپنے میکے چلی گئیں البتہ ہلال بن امیہ کی رفیقۂ زندگی نے دربارِ رسالت میں جاکر عرض کیا: یارسول اللہ! ہلال بہت بوڑھے ہیں ان کی خدمت گذار صرف میں ہوں۔ دوسرا کوئی نہیں اگر وہ میری خدمت سے محروم ہو گئے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے اب کیا حکم ہے؟ تب آپ ﷺ نے فرمایا خدمت کرتی رہو، باقی تعلقات کو سردست منقطع کردو۔

یہ سنکر اس نے سر تسلیم خم کر دیا اور اس کے باوجود کہ شوہر اور بیوی یا عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان دوسرا کوئی موجود نہیں ہوتا تب بھی کیا مجال کہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی نے امر رسول سے انحراف کرنے کی جرائت کی ہو۔ اللہ اللہ! یہ ہے سچی شان انقیاد اور اطاعت خدا رسول۔

عشق رسول ﷺ اور صداقت اسلام کا حیرت انگیز معیار

کعب بن مالک کا چالیس دن سے مسلسل معاشرتی مقاطعہ ہے غیروں کا تو ذکر ہی کیا قریبی عزیز و رشتہ حتی کہ رفیقہ زندگی بھی اسلام اور رسول ﷺ کے حکم پر پروانہ وار نثار ہوتے ہوئے "کعب" کا مقاطعہ کئے ہوئے ہیں گویا اس طرح کعبؓ پر خدا کی زمین تنگ ہو گئی ہے وہ اس مایوسی اور حیرانی کی حالت میں مدینہ کے بازار سے گذر رہے ہیں کہ اچانک شام کا ایک نبطی پکارتا ہوا نظر آیا "من یدل علی کعب بن مالک" مجھ کو کوئی کعب بن مالک تک پہنچادے۔

لوگوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ کعب وہ جا رہے ہیں نبطی آگے بڑھا اور کعب کی راہ روک کر ان کی خدمت میں ایک خط وپیش کیا کعب نے پڑھا تو شاہ غسان کا خط تھا اس میں لکھا تھا۔

اما بعد! فانه قد بلغنی ان صاحبك قد جفاك ولم یجعلك الله یدارھوان ولا مضیعة فالحق بنا نواسك (فتح الباری، ج ۸ ص ۹۷)

امابعد! مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھی محمد ﷺ نے تم پر بڑا ظلم کر رکھا ہے خدا نے تم جیسی ہستی کو اس ذلت اور ضیاع کیلئے نہیں بنایا پس تم فوراً یہاں چلے آؤ ہم تمہاری خاطر خواہ عزت کریں گے۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں خط پڑھتے ہی مجھ کو سخت رنج و ملال ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ یہ آزمائش و بلا پہلی آزمائش سے بھی زیادہ کٹھن ہے میں اور شاہ غسان کو میرے متعلق یہ گمان کہ اس امتحان سے گھبرا کر اسکے پاس بھاگ جاؤں اور خدا اور خدا کے رسول سے منہ موڑلوں آہ یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے بہر حال شاہ غسان کی اس ذلیل حرکت پر مجھے ایسا غصہ آیا کہ ایک تنور کے سامنے پہنچا اور اس کے خط کو اس میں جھونک کر نبطی سے کہا! یہ ہے تیرے بادشاہ کے خط کا جواب اور میں خدمت اقدس میں حاضر ہو کر بے چینی کے ساتھ عرض رسا ہوا: شاہ ہر دوسرا! آخر یہ اعراض کیوں اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اب مشرکین تک مجھے پھسلانے کی جرأت کرنے لگے۔ (ایضاً ص ۹۸)

غرض اسی طرح پچاس راتیں گذر گئیں اور ہماری محرومی کی گرہ نہ کھلی اور ارشاد خداوندی کے بموجب خدا کی زمین وسیع ہونے کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی اور اپنی جان وبال نظر آنے لگی کہ یک بیک صبح کی نماز کے بعد سلع کی چوٹی پر سے ایک پکارنے والے نے پکارا "اے کعب بشارت ہو" میں تو انقلاب حال کا منتظر ہی تھا، فوراً سمجھ گیا کہ درگاہ الٰہی میں توبہ قبول ہو گئی۔ اب کیا تھا مسرت و خوشی سے پھولا نہ سمایا اور وہیں سجدہ میں گر گیا۔

اب جوق درجوق لوگ آرہے ہیں اور قبول توبہ کا مژدہ سنا رہے ہیں اور کل تک جو اجنبی نظر آتے تھے اس وقت جاں نثار اور محب بن کر اظہار مسرت کر رہے ہیں اور رفیقہ کی جانب سے بھی مبارک باد پیش کی جا رہی ہے

سب سے پہلے جس شخص نے مجھ کو قبول توبہ کی مفصل بشارت سنائی وہ ایک سوار میں نے انتہا خوشی میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا اتار کر اس کو دیدیئے خدا کی شان کہ میرے پاس اور کپڑے بھی نہیں تھے اس لئے مستعار مانگ کر پہنے اور بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا راہ میں بھی لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مجھ پر مبارکبادیوں اور بشارتوں کے پھول برسائے جارہے تھے، دربار رسالت پہنچا تو آنحضرت آگے بڑھے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد پیش کی، اسی مسرت کے ساتھ میں جلوہ جہاں آرا کا طالب ہوا تو دیکھا کہ چہرۂ مبارک مسرت و شادمانی سے برق کی طرح چمک رہا ہے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: ابشر بخیر یوم مر علیك منذ ولدتك امك اس مبارک دن میں بشارت حاصل کر تیری ولادت سے آج تک جس سے بہتر کوئی دن نہیں آیا" میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ قبول توبہ آپ کی جانب سے ہے۔

آپ نے یہ جواب مرحمت فرمایا اور رخ انور قمر کی طرح روشن نظر آنے لگا میں نے مسرت کے لہجہ میں عرض کیا: اے خدا کے رسول!"میری قبول توبہ کا ایک جزیہ بھی ہو جائے کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں تصدق کر دوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا بہتر یہ ہے کہ کچھ حصہ اپنے لئے رکھ لو میں نے عرض کیا بہتر ہے خیبر کا جو حصہ میرے پاس ہے اس کو روکے لیتا ہوں۔ میں نے یہ بھی عرض کیا یارسول اللہ! یہ سچائی کا صدقہ ہے کہ آج اس نعمت بیکراں سے مالا مال ہوں اس لئے عہد کرتا ہوں کہ عمر بھر صدق مقال کے ماسوا میرا شعار کچھ نہ ہوگا۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں میرے اس معاملہ میں رنج و غم کے ہر دو رفقاء کا بھی مسرت و بہجت سے یہی حال ہوا اور ہماری قبول توبہ پر جو آیات نازل ہوئی تھیں نبی اکرم نے ہمارے سامنے ان کی تلاوت فرمائی۔

قبول توبہ اور سورۂ توبہ

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ط إِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ط حَتّٰى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا أَنْ لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّآ إِلَيْهِ ط ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ط إِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ ○

بے شک اللہ اپنی رحمت سے نبی پر متوجہ ہو گیا اور مہاجرین اور انصار پر بھی جنھوں نے بڑی تنگی اور بے سروسامانی کی حالت میں اس کے پیچھے قدم اٹھایا اور اس وقت اٹھایا کہ قریب تھا ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جائیں پھر وہ اپنی رحمت سے ان سب پر متوجہ ہو گیا بلاشبہ وہ شفقت رکھنے والا، رحمت کرنے والا ہے، اور ان تین شخصوں پر بھی (اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہوا) جو معلق حالت میں چھوڑ دیے گئے تھے حتی کہ

نوبت یہ آگئی کہ)زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان سے تنگ آگئے تھے اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اسی کے دامن میں پس اللہ ان پر اپنی رحمت کے ساتھ لوٹ آیا تا کہ وہ رجوع کریں بلاشبہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے بڑا ہی رحمت والا۔

قرآن عزیز اور غزوۂ تبوک

قرآن عزیز نے صرف اسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ غزوۂ تبوک کی اہمیت کے پیش نظر اس کی بہت سی تفصیلات بیان کیں اور اس سلسلہ میں پند و موعظت کے ذریعہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کا سامان مہیا کیا ہے چنانچہ اس سورہ میں چھٹے رکوع سے لیکر آخر سورہ تک اسی غزوہ اور غزوہ سے متعلق حالات و مواعظ کا تذکرہ ہے۔

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا مَا لَكُمْ إِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ط (الي) وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ

اہم غزوات اور نتائج وبصائر

بدر الکبریٰ

۱) عقائد اسلامی و افکار ملی کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ فتح و شکست کا مدار عددی اکثریت و اقلیت پر نہیں ہے بلکہ صرف عنایت خداوندی اور اس کے فضل و کرم پر ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ

۲) جو جماعت احساس فرض کے ساتھ عدل و نصف کے لئے میدان میں نکلتی ہے کبھی ناکام نہیں ہوتی اور انجام اسی کے ہاتھ رہتا اور خدا کی نصرت کا پیغام اسی کو نصیب ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ

۳) اگر قلب میں اخلاص او صداقت حق کا جذبہ موجود، اور خدا اور سول پاک ﷺ کے حکم وارشاد کے سامنے گردن خم ہے تو بہ اسباب دنیوی بشری تقاضے کے پیش نظر اپنی جانب سے خوف وہراس قابل ملامت نہیں ہے اور خدائے برتر ضرور اس کو ثبات واستقامت عطا فرماتا ہے۔

۴) صبر و استقامت ایسے میٹھے پھل ہیں جن کی شیرینی دنیا و دین دونوں ہی میں لذت و سکون اور رفعت و سعادت سے ہمکنار کرتی ہے چنانچہ غزوہ بدر الکبریٰ اس حقیقت کے لئے زندہ جاوید شہادت ہے۔

۵) باطل سے برسر پیکار حامل حق جماعت بہ اسباب دنیوی جس قدر زیادہ بے یار و مددگار ہوتی ہے خدا کی نصرت و حمایت اسی قدر زیادہ معجزانہ کرشمے دکھا کر حمایت حق کا ساتھ دیتی اور باطل کو ناکام بنا کر حق کو شادکام کرتی ہے چنانچہ بدر میں بررحمت کا نزول ملائکہ اللہ کا درود نظر مسلم میں دشمن کی کثیر تعداد کا مشاہدہ قلیل اور مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں کی تعداد قلیل کا مشاہدہ کثیر یہ سب معجزانہ امور اسی قانون الٰہی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

احد

۱) "جہاد" مخلص و منافقین کی معرفت کے لئے بے نظیر کسوٹی ہے چنانچہ غزوۂ احد اور غزوہ تبوک میں یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے چنانچہ احد کے موقع پر راس المنافقین عبد اللہ بن ابی اپنی جماعت کے ساتھ لشکر اسلامی سے یہ کہہ کر جدا ہو گیا کہ محمد ﷺ نے چونکہ ہمارا مشورہ نہیں مانا اس لئے ہم کیوں میدان جہاد میں جا کر ہلاکت میں پڑیں اور غزوۂ تبوک میں یہ کہہ کر لوگوں کو فداکاری و جاں نثاری سے روکتا رہا لا تنفروا فی الحر گرمی کی شدت میں جنگ کی آگ کے اندر نہ کودو" اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا نار جهنم اشد حرا جہنم کی آگ کی شدت دنیا کی شدت سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

۲) امیر "خلیفہ" اور اس کے نائبین کا فرض ہے کہ اہم امور میں مسلمانوں سے مشورہ کرے، اور باتفاق رائے یا بکثرت رائے جو فیصلہ ہو اسی کو اپنا عزم بنائے۔

نبی اکرم ﷺ پر نزول وحی ہوتا تھا اس لئے آپ ﷺ اگر صحابہؓ سے مشورہ بھی نہ فرماتے تو کوئی قباحت نہ تھی تاہم "اسوۂ حسنہ" کو شعار بنانے کے لئے آپ ﷺ اہم امور میں برابر مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے چنانچہ غزوۂ احد میں بھی مشورہ فرمایا اور اس مشورہ کی یہ خصوصیت ہے کہ خود ذات اقدس ﷺ اور معمر و تجربہ کار صحابہ کہ جن کی قوت و اصابت رائے پر آپ ﷺ کو اعتماد تھا" کی رائے یہ تھی کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہیے مگر اکثریت کے لحاظ سے ان صحابہؓ کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ سے باہر میدان میں نکل کر جنگ کرنی چاہیے تو آپ ﷺ نے اکثریت کے فیصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عملی اسوۂ حسنہ کو اپنے مسطورۂ ذیل ارشاد مبارک سے محکم و مضبوط بنا دیا۔

حضرت علی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا ماالعزم یارسول اللہ! اے خدا کے رسول! (قرآن میں مذکور فاذا عزمت میں "عزم" سے کیا مراد ہے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مشاورۃ اھل الرأی ثم اتباعھم "اہل الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) ان کی دی ہوئی رائے عمل پیرا ہونے کا نام "عزم" ہے۔

(تفسیر ابن کثیر و در منثور بسند صحیح تفسیر آیت فاذا عزمت فتوکل علی اللہ)

۳) تمام معاملات میں عموماً اور جہاد و میدان جنگ میں خصوصاً "ضبط و نظم" اہم امور میں سے ہے اگر کسی جماعت میں اس کا فقدان ہے تو وہ جماعت حامل حق و صداقت ہی کیوں نہ وہ کامیابی و کامرانی کا سہرا اس کے سر نہیں ہو سکتا اور جس درجہ اس بنیادی حقیقت کار میں کمی ہو گی اسی قدر اس جماعت میں اضمحلال اور ضعف غالب ہو گا۔

غور کیجیے کہ غزوۂ احد میں مشرکین کے مقابلہ میں تیر بار مسلم جماعت کے نظم و ضبط کی خلاف ورزی نے کس طرح مسلمانوں کی فتح و نصرت کو اچانک شکست کے ساتھ بدل دیا پیغمبر خدا ہادئ اعظم ﷺ شریک جنگ ہیں مسلمان مشرکین پر غالب اور مشرکین ہزیمت سے دوچار ہو رہے ہیں کہ مال غنیمت کے شوق میں اپنے سردار کے منع کرنے کے باوجود جب تیر بار جماعت نے گھاٹی چھوڑ دی تو یک بیک فتح شکست سے بدل گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ سردار دو عالم ﷺ کو بھی چشم زخم پہنچا اور دندان مبارک تک شہید ہو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ۔

۴) یہ ضروری نہیں ہے کہ جب کبھی حق و باطل میں معرکہ آرائی ہو تو حق ضرور جیت جائے اور ابتدائے کار میں بھی اس کو کبھی شکست نہ ہو اگر ایسا ضروری ہو تو حق و باطل کی آزمائش و امتحان کی کوئی سبیل باقی نہ رہے اور قبول حق و باطل اختیاری نہ رہے اضطراری بن جائے یہی حقیقت ہے جس کو ابو سفیان کے اس جواب پر "الحرب سجال" جنگ ان دو ڈولوں کی طرح ہے جو ایک رسی میں اس طرح بندھے ہوں کہ کبھی ایک نیچے پانی میں چلا جاتا ہے اور دوسرا ابھر آتا ہے اور کبھی پہلا ابھر آتا ہے۔

رومہ کے شہنشاہ ہرقل (ہرکلس) نے کہا تھا کہ تیرا یہ قول سچ ہے کہ کبھی تم کو فتح ہو جاتی ہے اور کبھی اس مدعی رسالت محمد ﷺ کو کبھی تم شکست کا منہ دیکھتے ہو اور کبھی وہ تو اے سفیان! نبی ورسول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جنگ کے موقعہ پر کبھی بھی اس کو شکست نہ ہو۔ ہاں البتہ یہ ازبس ضروری ہے کہ اس معرکہ آرائی کا آخری انجام حق کی فتح اور باطل کی شکست پر جا کر ختم ہو جائے گا"۔

۵) میدان جہاد میں ضعیف اعضاء کا جدا رہنا ہی مفید اور کامیابی کے لیئے ازبس ضروری ہے۔ اسی لیئے جن غزوات میں منافقین نے مسلمانوں میں ضعف پیدا کرنے کیلئے شرکت جنگ سے پہلو تہی کی یا میدان میں نکل کر واپس ہو گئے تو ان کی یہ ناپاک حرکت مسلمانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچا سکی، بلکہ اس کے برعکس مخلص فداکاروں اور جاں نثاروں کی چھوٹی سے چھوٹی تعداد نے بھی وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ باطل کا قلع قمع ہو کر رہ گیا۔

غزوۂ احزاب

۱) کائنات انسانی پر خدا کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ذاتِ اقدس محمد ﷺ کے ذریعہ "اخوت و مساوات" کا وہ عظیم الشان علمی و عملی نقشہ پیش کیا کہ جس کی مثال عالم انسانی کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔

غزوہ خندق میں سرور دو عالم ﷺ نے اپنے جاں نثار رفقاء کے ساتھ بھوک سے پیٹ پر پتھر خندق کھودنے اور ٹوکری میں بھر کر اس کی مٹی منتقل کرنے میں جس طرح برابر کا حصہ لیا وہ اگر ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیوی بادشاہ شہنشاہ اور ہادئ اعظم و نبی رسول کے درمیان کس قدر عظیم فرق ہے اسی طرح یہ بھی روشن کر دیتا ہے کہ اسلام کے مقدس جھنڈے کے نیچے خدمت حق کے لئے خلیفہ و امام اور ہادئ برحق تک بھی کس طرح ایک سپاہی کے دوش بدوش ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں برابر کا شریک سہیم بن جاتا ہے۔

۲) کفار کی تمام جماعتوں کے متفقہ حملہ کے وقت حضرت سلیمان فارسی کا مشورہ دینا کہ ایسے نازک وقت میں اہل فارس کا یہی دستور ہے اور نبی اکرم ﷺ کا ان کے دیئے ہوئے مشورہ کو قبول فرمانا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں وقت کے ترقی یافتہ وسائل دنیوی کو امر حق کی حمایت کے لئے اختیار کرنا اور اپنانا اسلام سے انحراف نہیں بلکہ بہترین اسلامی خدمت ہے بشرطیکہ وہ اسباب و وسائل اسلامی اصولوں و احکام سے متصادم نہ ہوں۔

۳) "جہاد" اسلام کا اس درجہ عظیم الشان رکن اور اس کی بقاء حفاظت کے لئے ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس اداءِ فرض و مشغولیت میں نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ کا نماز جیسا اہم فریضہ قضا ہو گیا اور آپ ﷺ نے اور صحابہ نے عصر کی نماز مغرب کے وقت ادا فرمائی۔

اور کیسا اہم سے اہم فریضہ ہے اس حقیقت سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد جیسے عظیم الشان فداکارانہ اور جاں نثارانہ عمل کے وقت بھی جبکہ انسان میدان جہاد میں جان ہتھیلی پر لئے مشغول جنگ ہوتا ہے عبادت الٰہی سے غافل نہیں رکھا گیا اور ایسے وقت میں نص قرآنی نے "صلوۃ خوف" کی طرح ڈال کر نماز کی اہمیت و جلالت قدر پر

مہر تصدیق ثبت کر دی۔

۴) جنگ میں ایسے طریقے اختیار کرنا صحیح ہیں جن میں کذب اور خلف وعد جیسے قبیح امور کا دخل نہ ہوتے ہوئے دشمن کو بغیر جنگ ہی کے جنگ ہی کے نقصان و ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑ جائے یا وہ یہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ اسلامی لشکر کا رخ کس جانب ہے اور اس طرح حقیقت حال مستور ہو کر دھوکے میں پڑ جائے چنانچہ غزوات اسلامی میں یہ دونوں پہلو عملی لباس میں صاف نظر آتے ہیں اور یہی مفہوم ہے اور یہ مفہوم ہے ارشاد نبوی الحرب خدعة کا۔

صلح حدیبیہ

۴) اجتماعی مصالح اسلامیہ اگر متقاضی ہوں تو خلیفہ اور امیر المومنین کو اختیار ہے کہ وہ کفار مشرکین سے ایسی صلح کر لے جو اگرچہ بظاہر حال شکست خوردہ نظر آتی ہو مگر دقت نظر اور فکر عمیق کا یہ فتویٰ ہو کہ ثمرہ اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ مسلمانوں کے حق میں فتح مبین اور ظفر و نصر کا سبب ثابت ہو گی۔ جیسا کہ حدیبیہ کے صلح نامہ کی دفعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

۶) بسا اوقات ہماری ظاہر بین نظریں ایک معاملہ کو موجب توہین سمجھتی اور اس کو کراہت سے دیکھتی ہیں لیکن وہ خدا کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کے میں بہتر اور موجب عزت بننے والی ہوتی ہے اسی طرح بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس شئے کو ہماری نظریں خیر اور موجب فلاح سمجھتی ہیں وہ ثمرہ اور نتیجہ کے اعتبار سے باعث شر اور موجب ذلت و رسوائی ہو جاتی ہے اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ہر معاملہ میں اسوۂ حسنہ بنائے اور اپنی عقل و خرد پر اعتماد کر کے ان کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ ہو جائے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

۳) معاہدات اقوام وامم میں اسلام کی امتیازی شان یہ ہے کہ "نقض عہد کو "غدر" سمجھے اور یقین کرے کہ عہد کی خلاف ورزی کرنے والا نہ دنیا میں صاحب عزت ہو سکتا ہے اور نہ عالم آخرت میں اس کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے بلکہ روز قیامت اس کے ہاتھوں میں غداری کا جھنڈا ہو گا تاکہ کائنات انسانی کے سامنے اس کے غدر کا مظاہرہ ہو سکے۔

اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝

۴) جو لوگ قلت تعداد اور فقدان اسباب ظاہری کے باوجود خدا کے رسول کے ہاتھ پر فداکاری اور جاں نثاری کے لئے حدیبیہ میں بیعت کر رہے تھے خدا نے ان کے اس ایثار و عقیدت حق کو جزاءِ عظیم یہ عطا فرمائی کہ قرآن حکیم میں بصراحت ان کو اپنی خوشنودی کی سند بخشی اور اسی مبارک سند کی بنا پر وہ بیعت "بیعت رضوان" کے نام سے رہتی دنیا تک موسوم ہوئی پس یہ واقعہ برہان قاطع ہے اس امر

کے لئے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ

۵) اگر آزادی ضمیر نصیب ہو اور تعصب راہ میں حائل نہ ہو تو اسلام ایسا دین فطرت ہے کہ خود بخود کائنات انسانی کو اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا ہے چنانچہ "صلح حدیبیہ" نے اس لئے "فتح مبین" کا لقب پایا کہ جب مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعہ جنگ کا التوا ہو گیا تو مشرکین کو امن واطمینان کے ساتھ مسلمانوں میں میل جول کا موقع ملا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دعوت اسلام کے وقت سے حدیبیہ کے وقت تک فدا کاران اسلام کی جو تعداد تھی تقریباً اٹھارہ یا بائیس مہینوں کے اندر اندر اس سے زیادہ شمع اسلام کے پروانے نظر آنے لگے ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ مشرکین نے دیکھا کہ قوم مسلم اپنے اخلاق و اعمال اور کردار و گفتار بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں صادق و عادل حق پسند و حق آگاہ ہے اور اس کی جماعتی و انفرادی حیات کا پایہ وقت کی تمام اقوام و ملل سے بلند تر ہے۔

فتح مکہ

۱) مسلمان جب کسی غیر مسلم طاقت سے معاہدہ کر لیں تو جس مدت کے لئے معاہدہ ہوا ہے ان کا اسلامی فرض ہے کہ اس مدت کو اپنی جانب سے پورا کریں اور نقض عہد نہ کریں البتہ اگر معاہد طاقت کی جانب سے خلاف ورزی ہو تو پھر مسلمان بری الذمہ ہیں بلکہ بعض حالات میں نقض عہد کرنے والی طاقت کا استیصال از بس ضروری ہے جیسا کہ فتح مکہ کے اسباب سے ظاہر ہوتا ہے۔

۲) فتح مکہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عنوۃ (بہ زور طاقت) فتح ہونے کے باوجود خون ریزی سے محفوظ رہا اور نبی اکرم ﷺ نے حرم کعبہ کے احترام و عظمت کے پیش نظر خالد بن ولیدؓ کو ہدایت دیتے ہوئے ابتداء ہی میں ارشاد فرما دیا تھا کہ داخلہ حرم کے وقت ہرگز کسی پر تلوار نہ اٹھائی جائے الا یہ کہ مشرکین میں سے کوئی از خود اقدام کرے اور اس لئے حضرت سعد بن عبادہؓ کے ذریعہ عاجز کے خلاف "الیوم یوم المرحمہ" فرما کر اس حقیقت حال کو خوب روشن کر دیا۔

۳) دنیوی شہنشاہ اور نبی الرحمۃ کے درمیان اگر فرق و امتیاز معلوم کرنا ہو تو فتح مکہ اس کے لئے روشن برہان ہے تاریخ سے دریافت کرو کہ جب کوئی بادشاہ یا شہنشاہ کسی ملک کو فتح کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا تھا یہی کہ مفتوح قوم پر مظالم کرے قتل و غارت کر کے ان کو غلام بنائے یا تلوار کے گھاٹ اتارے لیکن جب نبی الرحمۃ کو اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا اور فتح مکہ کی صورت میں مشرکین و کفار پر یہ ید قدرت حاصل ہوا تو اس مقدس ہستی نے کیا کیا؟ صرف یہ کہ ان کو جمع کیا اور اعلان کر دیا

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا انتم الطلقاء

آج تم پر گذشتہ بداعمالیوں اور سفاکیوں پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

ایک شخص عمر بھر نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود جب فتح مکہ کے وقت کانپتا خوف کھاتا اور لرزتا ہوا حاضر خدمت ہوتا ہے تو اس وقت بھی نبی الرحمۃ کی زبان اقدس اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے جس سے

آپ ﷺ کی شان پیغمبری نمایاں نظر آتی ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں:

خوف نہ کرو! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں بلکہ تمہاری طرح خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔

۴) کافر د مشرک گروہ اگر اسلامی طاقت کا حلیف بننا چاہے تو بہ تقاضائے مسلم مفاد اس کو حلیف بنایا جا سکتا ہے بلکہ بعض حالات میں حلیف بنانا ازبس ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حلیف کے مال اور اس کی جان و آبرو سب کو اپنے مال جان اور آبرو کی طرح سمجھے اور اسی قسم کا معاملہ کرے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

حنین

۱) ایک لمحہ کے لئے بھی کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ فتح و شکست کا مدار "کثرت تعداد" پر سمجھے بلکہ اس کا بیقین راسخ ہر حالت میں خدا کی نصرت کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیے چنانچہ بدر میں اعتماد علی اللہ نے ذلت کو عزت و کثرت کے ساتھ بدل دیا اور حنین میں اپنی کثرت تعداد پر اعتماد نے کثرت و شوکت کو مبدل بہ ہزیمت بنادیا۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

اگر اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کا تقاضا ہو تو ایک غیر مسلم طاقت کے مقابلہ میں دوسری غیر مسلم طاقت یا غیر مسلم جماعت کا تعاون واشتراک حاصل کرنا بلا شبہ درست اور مشروع ہے اسی لئے حنین میں نبی اکرم ﷺ نے "طلقاء" کو شریک جنگ رکھا اور جنگ میں استعانت من المشرکین کے مسئلہ میں بلحاظ دلائل اگرچہ قبول و عدم قبول دونوں قسم کے اقوال موجود ہیں لیکن قرآن و حدیث کی روشنی میں جمہور کا مسلک جواز و قبول ہی کا ہے چنانچہ محدثین و فقہاء امت نے کتاب الجہاد میں اس کی تصریح کردی ہے۔ (فتح الباری، کتاب الام امام شافعی، مبسوط السرخسی، الصحائح)

تبوک

۱) مفاد اسلامی کے پیش نظر جب خلیفہ المومنین نفیر عام (جہاد عام) کا اعلان کردے تو ادائے فرض کے مقابلہ میں ہر قسم کی مشکلات ہیچ ہو جانی چاہئیں اور اسباب و وسائل کی پریشانیاں ہرگز راہ میں حائل نہ رہنی چاہئیں، غزوۂ تبوک ہم کو اسی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

۲) جہاد اور نفیر عام کے موقع پر مالی اعانت بھی جہاد ہی کا اہم شعبہ ہے اور

گر زر طلبی سخن دریغ است
گر جاں طلبی مضائقہ نیست

کے خلاف عزم و عمل اور خلوص و صداقت کی روشن دلیل ہے، اس لئے جلیل القدر صحابہؓ نے غزوۂ تبوک میں مالی اعانت کی اپیل پر ایک دوسرے سے مسابقت کی اور ابو بکر صدیقؓ نے کل مال راہ خدا میں دے کر صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام گھر میں باقی چھوڑا۔

۳) جماعتی زندگی میں جن لوگوں کے متعلق شروع سے ہی یہ معلوم ہو کہ جماعت میں ان کی شرکت ازراہ خلوص نہیں بلکہ ازراہ نفاق ہے وہ اگر جہاد جیسے فداکارانہ عمل سے پہلوتہی کرنے کے لئے کوئی بہانہ کر کے میدان جہاد سے جی چرائیں تو ان سے درگزر کی جاسکتی ہے کہ ان کی عدم شرکت مفید ہی ہے نہ کہ مضرت رساں لیکن مخلص وایثار پیشہ فرد جماعت اگر ایسے نازک موقع پر کوتاہی کر جائے جیسا کہ غزوہ تبوک کا اہم معاملہ تھا تو یہ کوتاہی ناقابل معافی جرم ہے تا قتیکہ ماضی پر ندامت اور مستقبل میں ایسی شنیع حرکت سے پرہیز کے عزم کے ساتھ درگاہ الٰہی میں عجز و نیاز سے تائب نہ ہو جائے۔''

۴) اسلامی احکام کی کھلی خلاف ورزی پر مسلمانوں کا کسی فرد مسلم یا جماعت مسلمہ کے خلاف سوشل اور معاشرتی مقاطعہ درست ہے بلکہ بعض اہم اور نازک حالات کے پیش نظر کبھی واجب اور ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ایک جانب مسلمانوں میں ضبط و نظم کا صحیح جذبہ پیدا ہو جائے اور دوسری جانب مخلص و منافق کے درمیان بیّن تفاوت نظر آنے لگے۔

تبنّی

رسوم جاہلیت میں سے ایک رسم تبنّی (گود لے کر بیٹا بنانا) بھی ہے یہ رسم مشرکین عرب و عجم میں یکساں رائج تھی اس رسم قبیح کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی کہ بچہ اپنے حقیقی ماں باپ کے انتساب سے کٹ کر ایک اجنبی کے لئے صلبی بیٹے کی طرح ہو جاتا اور اس کے خاندان کے تمام محارم اس کے محارم بنجاتے ہیں نیز اس اجنبی کے حقیقی ورثاء کو محروم وراثت بنا کر خود اس کی تمام جائداد کا مالک بن جاتا ہے یا اپنی موت پر اپنے حقیقی ورثاء کو محروم رکھ کر اجنبی کو اپنا وارث بناتا ہے اس لئے بلاشبہ "رسم" نسبتی انتساب اور معاشرتی نظام دونوں لحاظ سے مذموم و قبیح اور خلاف فطرت ہے۔

اسلام جو کہ انسان کے ہر شعبۂ حیات کو مکروہ جراثیم سے پاک کرنے اور ان میں انقلاب و اصلاح کی روح پھونک کر نظام کائنات کو بہتر و خوب تر بنانے آیا ہے اس نے اس رسم بد کے انسداد پر بھی توجہ کی اور ایک خاص واقعہ کو سامنے رکھ کر ارادہ کیا کہ معاشرت میں گندھی ہوئی اس رسم پر ایسی ضرب کاری لگائے کہ مسلمانوں میں سے ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ ہو جائے اور غیر مسلم بھی اس کی معقولیت پر سر تسلیم خم کرنے کیلئے مجبور ہو جائیں۔

انسداد تبنّی کے لئے خدائے برتر نے جس واقعہ کو منتخب فرمایا اس کی روداد حضرت زید بن حارثہؓ کی زندگی سے وابستہ ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ

حضرت زیدؓ کا تعارف اسد الغابہ میں ابن اثیر جزری نے اس طرح کرایا ہے: زید بن حارثہ شراحیل رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام (مولیٰ) ہیں اور بہت ہی محبوب صحابی ہیں، یہ عرب کے معزز قبیلہ بنی کلب کے ایک فرد تھے مگر بچپن ہی میں ایک حادثہ کی وجہ سے غلام بنا لئے گئے صورت یہ پیش آئی کہ ان کی والدہ ان کو ساتھ لئے اپنے خاندان بنی معمن میں جارہی تھیں راہ میں قبیلہ بنی قین نے ان کو لوٹ لیا اور زید کو بھی لے گئے اور عکاظ کے بازار میں لاکر فروخت کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ کے برادرزادہ حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی کے لئے خرید لیا۔ یہ ابھی آٹھ سال ہی کے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کو نبی اکرم ﷺ کی رفیقۂ حیات ہونے کا شرف حاصل ہو گیا اور انھوں نے زید کو حضور اقدس کی خدمت میں ہبہ کر دیا نبی اکرم ﷺ نے ان کو آزاد کر کے اپنا بیٹا بنا لیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ہم اس دن سے زید کو ابن محمد ﷺ کہنے لگے اور اس وقت تک کہتے رہے کہ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ

مسلمانو! تم لے پالکوں کو ان کے باپ دادا کی نسبت ہی سے پکارا کرو۔

نبی اکرم ﷺ نے زید اور اپنے چچا حضرت حمزہؓ کے درمیان بھائی چارہ کرادیا اور وہ دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح رہنے لگے ادھر زید کی گم شدگی نے ان کے والد حارثہ کو غم سے نڈھال کردیا تھا حسن اتفاق کہ بنی کلب کے چند آدمی حج کی نیت سے مکہ آئے تو زید کو دیکھا اور پہچان لیا۔ زید نے بھی ان کو پہچانا اور اپنے قبیلہ کو اپنی موجودگی کا پیغام دیا، حارثہ اور ان کا بھائی کعب دونوں نے جب یہ سنا تو فوراً بھاگے ہوئے مکہ آئے اور دربار قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ اب زید کو ہمارے حوالہ کردیجئے اور زر فدیہ لے لیجئے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس سے بہتر یہ بات ہے کہ زید آجائے اور اس کے سامنے دونوں صورتیں پیش کردی جائیں وہ تمہارے ساتھ جانا قبول کرتا ہے یا میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے اور جو اس کی مرضی ہو اس پر ہم بھی راضی ہو جائیں۔

حارثہ بخوشی اس پر رضامند ہو گئے کیونکہ وہ یقین رکھتے کہ بیٹا بہر حال باپ کو ہی ترجیح دے گا، چنانچہ زید بلائے گئے ذات اقدس ﷺ نے دریافت فرمایا ان کو پہچانتے ہو؟ زید نے کہا کیوں نہیں یہ میرے والد ہیں اور یہ چچا ہیں!

آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لینے آئے ہیں اب تم مختار ہو، ان کے ساتھ چلے جاؤ یا میرے پاس رہو، زید نے عرض کیا! میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا میرے باپ چچا جو کچھ بھی ہیں آپ ﷺ ہی ہیں، حارثہ نے یہ سنا تو رنج و تکلیف کے ساتھ کہا: زید کس قدر افسوس ہے تجھ پر کہ غلامی کو آزادی پر باپ دادا اور خاندان پر اجنبی کو ترجیح دے رہا ہے۔ زید نے کہا اس ہستی کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اس کے بعد میں دنیا و مافیہا کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں۔

تب نبی اکرم ﷺ نے حارثہ اور حاضرین کو بتلایا کہ میں نے زید کو آزاد کردیا ہے اب وہ میرا غلام نہیں بلکہ بیٹا ہے حارثہ نے یہ سنا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور باپ اور چچا دونوں مطمئن واپس گئے[1] اور گاہے گاہے آکر دیکھ جاتے آنکھیں ٹھنڈی کر جایا کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید کی مزید قدر افزائی کے لئے ان کا نکاح اپنی دودھ پلائی (حاضنہ) ام ایمن کے ساتھ کردیا جن کے بطن سے حضرت اسامہ پیدا ہوئے اور اس کے بعد ارادہ کیا کہ ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کے کردیں یہ ہاشمی خاندان کی بیٹی اور آپ کی پھوپھی امیہ بنت عبد المطلب کی لخت جگر تھیں، اس لئے زینب اور زینب کے بھائی اس عقد پر راضی نہیں تھے تب وحی الٰہی نے نازل ہو کر یہ حکم دیا کہ جس بات کا حکم اللہ اور اس کا رسول دے پھر اس کی خلاف ورزی کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۞

[1] جلد ۲ ص ۳۲۴، ۳۲۵۔

جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کو ان کے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے بلاشبہ وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

وحی الٰہی کے نزول پر حضرت زینبؓ اور ان کے بھائیوں نے آپ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح آپ نے خاندان سے ہی عملی طور پر فخر بالا نساب کی جڑیں کاٹ دی تاکہ آپ ﷺ کا عمل اسوۂ حسنہ بنے۔

حضرت زید کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ قرآن میں ان کا نام بصراحت مذکور ہے یہ شرف کسی صحابی رسول ﷺ کو نصیب نہیں ہوا۔

انسداد تبنّی

حضرت زید اور حضرت زینت اگرچہ حبالۂ عقد میں منسلک ہو گئے تھے لیکن حضرت زینب کا یہ فطری رحجان مٹ نہ سکا کہ وہ قریشی ہاشمی ہیں اور ان کا شوہر آزاد شدہ غلام، اسی طرح حضرت زید کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ بہر حال عرب کے معزز قبیلہ کے فرد اور نبی اکرم ﷺ کے منہ بولے بیٹے ہیں اور زینبؓ پر ان کو قوم ہونے کا شرف حاصل ہے چنانچہ ان دو متضاد ذہنیتوں نے ان کے آپس میں محبت کا رشتہ قائم نہ ہونے دیا اور آخر کار زید اس پر آمادہ ہو گئے کہ حضرت زینب کو طلاق دیدیں، حضرت زید نے متعدد بار اس ارادہ کا حضور اقدس ﷺ سے تذکرہ کیا۔ مگر آپ ﷺ نے یہ سمجھ کر کہ شاید دیرپا مدت ازدیاد محبت کا باعث ہو جائے زید کو طلاق دینے سے روکا۔

حضرت زید اور حضرت زینب کی ناچاقی نے اب صورت حال بدل دی اور وحی الٰہی نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وقت آ گیا ہے کہ اب ''تبنّی کی رسم بد'' کا خاتمہ کر دیا جائے اور جس طرح آپ ﷺ نے فخر بالا نساب کے پہلو کو اپنے خاندان ہی میں سب سے پہلے شکست دی اسی طرح اس کی ابتداء بھی خود ذات اقدس ﷺ کے ہی عمل سے ہو اور یہ اس طرح کہ زید جب طلاق دیدیں تو پھر زینبؓ کا عقد آپ ﷺ سے ہو جائے کیونکہ اس سے ایک طرف زینبؓ اور ان کے خاندان کو جو صدمہ پہنچے اس کا اندمال ہو سکے اور دوسری جانب تبنّی کی رسم بد کا انسداد ہو جائے۔

نبی اکرم ﷺ کو جب وحی الٰہی نے یہ نقشہ بتلایا تو بر بناء بشریت آپ ﷺ کے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ زید اگر زینبؓ کو طلاق نہ دے تو اچھا ہے تاکہ زینبؓ کی خاندان کو بھی توہین محسوس نہ ہو اور میں بھی منافقین اور مشرکین کے اس طعن و تشنیع سے محفوظ رہوں کہ وہ یہ کہیں گے محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بیوی بنالیا، حالانکہ دوسروں کے لئے بیٹے کی بیوی کو حرام بتاتے ہیں''۔ چنانچہ آپ برابر زید کو طلاق سے باز رکھتے رہے مگر جب کسی طرح باہم موافقت نہ ہو سکی تب زید نے زینب کو طلاق دے ہی دی اور عدت گزرنے پر خدا کا حکم ہوا کہ اب زینبؓ کو آپ ﷺ اپنی بیوی بنائیں تاکہ آئندہ منہ بولے بیٹے کی رسم کا خاتمہ ہو اور مسلمانوں کی معاشرت میں یہ تنگی نہ پیدا ہو سکے کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی کے نکاح کو صلبی بیٹے کی بیوی کی طرح حرام سمجھا جائے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی وحی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ خدا جو فیصلہ کر چکا ہے وہ تو

ظاہر ہو کر ہی رہے گا اور تمہارے بشری خوف سے وہ ٹلنے والا نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حکم الٰہی کے مقابلہ میں سماج انسانی کا خوف ہیچ در ہیچ ہے۔

قرآن عزیز نے انسداد تبنّی کے معاملہ کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا ایک ذہنی و علمی انقلاب اور دوسرا عملی چنانچہ ذہنی اصلاح وانقلاب کے لئے حسب ذیل آیات نازل فرمائیں۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ اللّٰٓئِيْ تُظَاهِرُوْنَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَآءَكُمْ أَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ ط وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ○ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَإِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ

اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی) بیٹا نہیں بنادیا یہ قول تمہارے اپنے منہ کی بات ہے اور اللہ سچ بات کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے تم ان منہ بولے بیٹوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارا کرو یہی اللہ کے نزدیک انصاف کا طریقہ ہے اور اگر تم کو ان کے باپ دادوں کا نام معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

چنانچہ صحابہؓ تصریح کرتے ہیں کہ ہم نے اسی وقت حضرت زید کو ابن محمد ﷺ کہنا چھوڑ دیا اور زید بن حارثہ کہنے لگے۔

اور انسداد تبنّی کے عملی پہلو کو روشن کرنے کے لئے ان آیات کا نزول ہوا:

وَإِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ ط فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ أَزْوَاجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ط وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ○

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب تم اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے اور تم نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے رکھ (اور طلاق نہ دے) اور اللہ سے ڈر اور صورت حال یہ تھی کہ تم اپنے جی میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں (کے طعن و تشنیع) سے ڈرتے تھے اور اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس سے خوف کیا جائے سو جب زید اپنی حاجت پوری کر چکا (اور اس نے طلاق دے دی) تو ہم نے اس (زینبؓ) کا نکاح تجھ سے کر دیا تاکہ (آئندہ) مسلمانوں پر یہ تنگی نہ رہے کہ وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیویوں سے نکاح نہ کر سکیں جب ان کے منہ بولے بیٹے اپنی حاجت پوری کر لیں (یعنی طلاق دے دیں) اور اللہ کا یہ حکم اٹل ہے۔

قرآن عزیز کی ان آیات کا مفہوم اپنے متعلقہ مسئلہ کے ساتھ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش تک نہیں اور نہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی ہی ہے کہ جو معاملہ کے رخ کو کسی دوسری جانب پھیرنے کا موجب ہو مگر حیرت اور حیرت سے زیادہ رنج و ملال ہے ان راویان روایت پر جنھوں نے روایت کی کسوٹی پر کسے بغیر ہی یہود بنی اسرائیل کی اسلام دشمنی اور رسول دشمنی میں گڑھی ہوئی خرافی داستان کو ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں درج کر دیا اور یہ قطعاً محسوس نہ کیا کہ جب کہ ان بے سر و پا روایات کا نہ قرآن کی آیات سے جوڑ لگتا ہے اور نہ ذخیرۂ حدیث میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اس کی جانب اشارہ کرتی ہے تو پھر ہمارے لئے کس طرح یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ایسی روایات کو بیان یا نقل کر کے ایک جانب دشمنان اسلام کے لئے غلط اور پر از بہتان نکتہ چینی کا سامان مہیا کریں اور دوسری طرف بے علم مسلمانوں کے دینی و ذہنی انتشار کا باعث بنیں۔

خرافی داستان

اگر یہ خرافی داستان کتب تفسیر میں نقل نہ ہوتی اور اس کے مفسد کا اثر موافق و مخالف دونوں جانب نہ پڑا ہوتا تو ایک لمحہ کے لئے بھی قلم اس کے لئے آمادہ نہ ہوتا کہ اس ہرزہ سرائی کو روایت کہہ کر پیش کرے مگر اصل حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد محض اس لئے اس داستان کو سپرد قلم کیا جارہا ہے کہ جب کبھی اس پر نگاہ پڑے تو فوراً ذہن میں آجائے کہ یہ ایک خرافی داستان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لئیے دشمنان اسلام کو اس کی سند لینا محض تعصب اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے نہ کہ حقیقت حال کی طلب و جستجو کے پیش نظر۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ حضرت زینبؓ کے یہاں تشریف لے گئے، اتفاق سے حضرت زید موجود نہیں تھے حضرت زینبؓ پر اچانک نظر پڑی تو وہ بہت حسین نظر آئیں آپ ﷺ فوراً ہی یہ پڑھتے ہوئے سبحان مقلب القلوب پاک ہے وہ ذات جو دلوں کو پھیر دینے پر قابو رکھتی ہے۔

واپس ہوگئے جب زید آئے تو زینب نے ان سے پورا واقعہ کہہ سنایا۔ زید یہ سن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں حضور ﷺ نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو کہنے لگے اور کوئی وجہ نہیں ہے وہ خود کو بہت بلند مرتبہ سمجھتی اور مجھ کو زبان سے ایذا پہنچاتی ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ کے قلب میں (العیاذ باللہ) اگرچہ یہ آیا کہ زید طلاق دیدے، مگر زبان سے منع کیا کہ خدا سے ڈر اور ایسا نہ کر تب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ پر عتاب فرمایا اور کہا کہ تیرے دل میں جو بات تھی اس کو تو نے چھپایا مگر اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر کے رہے گا۔ (اعاذ نا اللّٰہ من ہذہ الخرفات)

اس روایت کو ابن ابی حاتم اور طبری نے قتادہ اور ابن عباسؓ کی نسبت کے ساتھ روایت کیا ہے مگر قاضی عیاض نے شفاء میں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ابن کثیر، ابن حبان، سید محمود آلوسی نے اپنی تفاسیر اور خفاجی نے نسیم الریاض میں اس کو روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار اور نا قابل قبول ثابت کیا ہے اور ان دونوں بزرگوں کی جانب اس روایت کے انتساب کو باطل اور غلط قرار دیا ہے فتح الباری میں ہے۔

وو ردت اثار اخریٰ اخرجها ابن ابی حاتم و الطبری و نقلها کثیر من المفسرین لا ینبغی التشاغل بها و الذی اوردته منها هو المعتمد۔ (جلد ٥ کتاب التفسیر صفحه ٤٢٥)

اس سلسلہ میں اور بھی آثار بیان کئے جاتے ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور بہت سے مفسرین نے اس کو نقل کر دیا ہے یہ آثار ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی جانب کوئی توجہ بھی دی جائے اور قابل اعتماد آثار وہی ہیں جن کو ہم نے اس جگہ بیان کر دیا ہے۔

اور سید محمود آلوسی اس داستان کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

و للقصاص فی هذه القصة کلام لا ینبغی ان یجعل فی حیز القبول۔ (جلد ٤ ص ٤٩٨)

اور داستان سراؤں کے پاس اس واقعہ کے متعلق بھی گڑھی ہوئی باتیں ہیں جو ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو قبولیت کا درجہ دیا جائے۔

اور ابن کثیر نے تو اس داستان کو اپنی تفسیر میں نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا اور اس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا یہ محققانہ فیصلہ صادر فرمادیا:

ذکر ابن ابی حاتم و ابن جریر ههنا اثاراً عن بعض السلف رضی الله عنهم احببنا ان نضرب عنها صفحاً بعدم صحتها فلا توردها۔ (جلد ۲ ص ۱۳۳)

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض سلفؒ کی جانب منسوب چند آثار کو ذکر کیا ہے ہم نے یہ پسند کیا کہ ان کی جانب مطلق التفات نہ کریں اس لئے کہ وہ قطعاً صحیح نہیں ہیں اور اسلئے ہم انکا اس جگہ ذکر نہیں کریں گے۔

اور پھر یہ تمام اہل تحقیق ان آثار کو نقل کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں بسند صحیح ثابت ہیں اور جو آیات کی وہی تفسیر کرتے ہیں جس کو سطور بالا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔

حضرت زین العابدینؒ فرماتے ہیں کہ زید کے طلاق دینے سے قبل اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرم ﷺ کو یہ بتلادیا تھا کہ انسداد تبنّی کے سلسلہ میں خدا کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ حضرت زینبؓ کو زید طلاق دے گا اور تم کو اس سے نکاح کرنا ہوگا یہ بات تھی جس کو نبی اکرم ﷺ بر بنائے بشریت دشمنوں کے طعن سے بچنے کی خاطر کہ "کہیں گے کہ محمد ﷺ نے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا" اپنے دل میں چھپائے رکھا اور آپ ﷺ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح زید زینبؓ کو طلاق نہ دے اسی طرح قرآن نے تخفی فی نفسك کہا ہے اور زید کا طلاق دینا اور پھر زینب کا حرم نبوی میں داخل ہونا اس حقیقت کا اعلان ہے جس کو ما الله مبدیه و تخشی الناس و الله احق ان تخشه میں کہا گیا ہے۔ (نسیم الریاض جلد ۴ ص ۲۹۹)

اور عمر بن فائد نے بھی امام زہریؒ سے یہی تفسیر نقل کی ہے اور اسی پر تمام محدثین و مفسرین کا اعتماد ہے اور یہی صحیح ہے۔

لیکن یہ صورت حال کیوں اختیار کی گئی اور معاملہ کو اس خاص رنگ میں کیوں رکھا گیا جو قرآن عزیز کی ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے حافظ ابن حجرؒ اس کے متعلق یہ حقیقت واضح فرماتے ہیں۔

حاصل کلام

والحاصل ان الذی کان یخفیه النبی هو اخبار اللّٰه ایاه انها ستصیر زوجته الذی کان تحمله علی اخفاء ذلك خشیة قول الناس تزوج امراءة ابنه واراد اللّٰه ابطال ماکان اهل الجاهلیة علیه من احکام التبنی بامر ابلغ فی ابطال منه وهو تزوج امرائة الذی یدعی ابنا و وقع ذلك من امام المسلمین لیکون ادعیٰ لقبولهم و انما وقع الخبط فی تاویل متعلق الخشیة۔ واللّٰه اعلم۔ (جلد ۸ ص ۴۲۵)

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ صرف اس بات کا پوشیدہ رکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسداد تبنیٰ کے سلسلہ میں یہ خبر دی ہے کہ زینب تمہارے نکاح میں آئے گی اور نبی اکرم ﷺ نے اسلئے اس بات کو پوشیدہ رکھا کہ آپ لوگوں کے اس طعن سے بچنا چاہتے تھے کہ محمد (ﷺ) نے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی اور اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کر چکا تھا کہ لے پالک کے جو احکام زمانۂ جاہلیت میں نافذ تھے ان کو باطل کر دے اور اس کے لئے اس طریقہ سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا کہ عملاً کسی منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی کرائی جائے اور اس کے لئے ذات اقدس کو اس لئے چنا گیا کہ آپ امام المسلمین ہیں پس آپ کا عمل مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اتباع اور قبولیت کا داعی ہوگا اور مسلمان اچھی طرح اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ جائیں گے (لہٰذا صورت حال یہ اختیار کی گئی کہ پہلے زینبؓ کی آپ ﷺ کی منہ بولے بیٹے زید سے شادی ہو اور پھر وہ طلاق دے اور بحکم خداوندی پھر وہ آپ کے نکاح میں آئیں یہ ہے وہ اصل بات کہ جو اسلئے خبط میں پڑ گئی کہ تاویل کرنے والوں نے یہ قیاس آرائیاں کر ڈالیں کہ آیت میں خشیۃ کا متعلق کیا ہے۔

غرض اسرائیلی داستانوں میں سے یہ بھی ایک خرافی داستان تھی جس کا پردہ فاش ہونا ازبس ضروری تھا ورنہ تو یہ روایت خرد وعقل کے نزدیک یوں بھی ناقابل اعتماد اور لغو ہے کہ زینب جبکہ نبی اکرم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور بچپن سے جوانی تک مسلسل آپ کے سامنے رہیں اور شادی کے بعد بھی آپ سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو اس واقعہ کے دن کون سی خاص بات تھی کہ زینب آپ کی نگاہ میں اجنبی بن کر نظر آنے لگیں اور آپ نے اخلاق کریمانہ کے خلاف دل وزبان کی مطابقت بھی چھوڑ دی۔

اگر قرآن کی آیت کا یہ مطلب لے لیا جائے تو کیا پھر ایک لمحہ کے لئے بھی قرآن کو یہ حق ہے کہ ذات اقدس ﷺ کو ایک نبی رسول اولعزم پیغمبر کی حیثیت میں پیش کر سکے۔ سُبۡحٰنَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِیۡمٌ ۔

بصائر

(باوجود اس امر کے کہ پیغمبر ورسول اس حقیقت سے آشنا ہوتے اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ اٹل اور ناقابل رد ہوتا ہے تاہم اگر کوئی امر ایسا ہو جس میں ان کی ذات وقت کے خود ساختہ اخلاقی پہلو کی بنا پر مورد طعن و تشنیع بنتی ہو تو بہ تقاضائے بشریت وہ اس کی زد سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور متوقع رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مقصد خیر کے لئے اس صورت حال کو رونما کرنا چاہتا ہے کاش کہ وہ کسی ایسی صورت میں نمودار ہو کہ

ان کی ذات اس طعن و تشنیع سے بچ جائے لیکن جبکہ خدا کی مصلحت اسی خاص صورت حالات میں مضمر ہوتی ہے تو وقت آنے پر نبی ورسول ﷺ اپنی خواہشات ذاتی کو پس پشت ڈال کر خدا کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے قرآن عزیز نے زیر بحث واقعہ میں اسی حقیقت کو معجزانہ انداز میں ادا کیا ہے۔

۴) قرآن عزیز کی تفسیر خصوصاً واقعات پر مبنی آیات کی تفسیر میں اجمال اس تفصیل سے بدرجہا بہتر ہے جو محض عقلی احتمالات کے پیش نظر آیات کے حقیقی مفہوم کو بھی بدل ڈالے اور لفظی تعبیرات کے اجمال سے غلط اور باطل عمارت تیار کر لے بلاشبہ ایسی تفصیل تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے اور اسی لئے ہر مفسر کا فرض ہے کہ اس سے اپنا دامن بچائے۔

قرآنی حقائق سے آگاہ محققین مفسرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تفسیر قرآن میں لفظی تعبیرات سے حقیقت کی جستجو کئے بغیر عقلی احتمالات بیان کر کے متضاد اقوال پیدا کر دینا تفسیر قرآن کی محمود خدمت نہیں ہے بلکہ قلوب میں تردد و اضطراب پیدا کر دینے کا موجب ہے۔

تفسیر قرآن کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اول قرآن عزیز کی تفسیر خود قرآن سے ہے کی جائے القرآن یفسر بعضہ بعضا اور ساتھ ہی صحیح و مستند احادیث رسول سے اس کے اجمال کی شرح کر تا جائے اور پھر اگر مزید تشریحات صحیح آثار صحابہؓ سے حاصل ہو سکیں تو ان سے بھی استفادہ کیا جائے اور ان تمام تحقیقات کے بعد ایک مضبوط و مدلل اور محقق قول فیصل نقل کرتا جائے اور احتمالات کی کشائش سے اضطراب اقوال کا شکار نہ بنے۔ اور اگر لطائف و حکم اور نکات پر قلم اٹھائے تو ان میں بھی یہ پیش نظر رہے کہ آیت کی حقیقی روح سے جدا نہ ہو جائے بلکہ اس کے اندر محدود رہے نیز دور از کار لفظی اور تخمینی احتمالات کی راہنمائی میں بعید تاویلات سے اپنا دامن محفوظ رکھے اور غیر مستند روایات و احادیث و آثار اور اسرائیلیات سے ہرگز ہرگز احتمال کے طور پر بھی استشہاد و استناد نہ کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ حسب موقعہ ان کی تردید اور ان کا ابطال کرتا جائے تاکہ ارباب مطالعہ کو قرآنی ہدایات سے حصول سعادت اور اخذ بصیرت و موعظت کے لئے آسانی ہو۔

بنو نضیر

یہ واقعہ ۴ھ ہجری میں پیش آیا۔ جو قبائل یہود یمن سے بھاگ کر حجاز (مدینہ) میں اُ لبسے تھے ان میں سے یہ بھی مشہور قبیلہ ہے نبی اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف فرما ہوئے تو آپ ﷺ نے مدینہ اور اطراف مدینہ کے یہود سے عہد و پیمان کر کے "صلح وعہد" کی طرح ڈالی یہ انصار میں سے بنی خزرج کے حلیف بھی تھے۔

یہود نے اگرچہ ظاہراً اس صلح وعہد پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن ان کے روایتی حسد و بغض اور تاریخی منافقت نے اس عہد پر ان کو تادیر قائم نہیں رہنے دیا اور انھوں نے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اندرونی اور بیرونی سازشوں کا جال بچھانا شروع کر دیا اسی اثناء میں بنو نضیر کے ذمہ دار افراد نے ایک روز یہ سازش کی کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جاکر عرض کریں کہ ہم کو ایک معاملہ میں آپ ﷺ سے مشورہ کرنا ہے اور جب آپ ﷺ تشریف لے آئیں تو دیوار کے قریب ان کو بٹھایا جائے، اور جب وہ گفتگو میں مصروف ہو جائیں تو اوپر سے ایک بھاری پتھر آپ ﷺ پر گرا کر آپ ﷺ کا خاتمہ کر دیا جائے۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ مدعو ہو کر تشریف لائے ابھی آپ ﷺ دیوار کے قریب بیٹھے ہی تھے کہ وحی الٰہی نے حقیقت حال سے مطلع کیا اور آپ ﷺ فوراً خاموشی کے ساتھ واپس تشریف لے گئے اور وہاں جاکر محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ وہ بنو نضیر تک یہ پیغام پہنچا دیں کہ چونکہ تم نے غداری کی اور نقض عہد کیا ہے اس لئے تم کو حکم دیا جاتا ہے حجاز مقدس کی سر زمین سے جلد جلاوطن ہو جاؤ، منافقین نے یہ سنا تو جمع ہو کر بنو نضیر کے پاس پہنچے اور کہنے لگے تم محمد ﷺ کے فرمان ہر گز تسلیم نہ کرو اور یہاں سے ہر گز جلاوطن نہ ہو ہم ہر طرح تمہارے شریک کار ہیں۔

بنو نضیر نے یہ پشت پناہی دیکھی تو حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حالات کا انتظار کرنے لگے تب نبی اکرم ﷺ نے جہاد کی تیاری کی اور حضرت عبد اللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا امیر بنا کر بنو نضیر کی گڑھی (چھوٹا قلعہ) پر حملہ آوری کے نکلے حضرت علیؓ کے ہاتھ میں اسلامی پرچم اور صحابہ جلو میں تھے۔

بنو نضیر نے یہ دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے اور یقین کر لیا کہ اب مسلمان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے چنانچہ نبی اکرم ﷺ چھ شبانہ روز ان کا محاصرہ کئے رہے اور پھر حکم دیا کہ ان کے ان درختوں کو کاٹ ڈالو جو ان کے پھل مہیا کرتے ہیں اور ان کا وجود ان کی رسو رسانی کے لئے تقویت کا باعث ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر بنی نضیر کے دلوں میں رعب اور خوف طاری ہو گیا اور ان کی منافقین کی جانب سے مایوسی اور رسوائی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے درخواست کی کہ ہم کو جلاوطن ہونے کا موقع دیا جائے لہٰذا ان کو اجازت دی گئی کہ سامان حرب کے علاوہ جس قدر سامان بھی وہ اونٹوں پر لاد کر لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔

اجازت نامہ حاصل ہونے کے بعد یہ منظر بھی قابل دید تھا کہ کل کے باغی سرکش اور فتنہ جو غدار آج اپنے

ہاتھوں مکانات کو برباد کر کے اس وطن کو خیر باد کہہ رہے تھے جس جگہ محفوظ و مامون رہنے کے لئے نبی اکرم ﷺ نے خود بنفس نفیس ایک عہد نامہ کے ذریعہ ان کو دعوت دی تھی۔

بنو نضیر نے اپنے مکانات کو اس لئے برباد کر دیا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے بعد مسلمان ان کے گھروں میں آباد ہوں۔

بہر حال بنو نضیر جلاوطن ہو کر جب چلے تو ان میں سے بعض اکابر قوم مثلاً یحیٰی بن اخطب اور ابی الحقیق تو خیبر میں مقیم ہو گئے اور اکثر شام کے نواح میں جا بسے اور دو سردار یامین بن عمرو اور ابو سعد مشرف باسلام ہو کر مدینہ ہی رہ گئے۔

قرآن عزیز اور بنو نضیر

اسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآن عزیز کی سورۂ حشر نازل ہوئی ہے اور اس میں بنو نضیر کی غداری، منافقین کی فتنہ پردازی مسلمانوں پر خدا کا احسان و کرم اور جنگ کے موقعہ پر سبز درختوں کے کاٹنے کا حکم اور ایسی صورت میں جبکہ جنگ نہ پیش آئی ہو مال غنیمت کا مصرف اور فیٔ کا حکم ان تمام امور کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

بصیرت

۱) منافق کا نفاق ایک خود فریبی ہوتی ہے جو انجام کے لحاظ سے نہ خود اپنے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور نہ منافقین پر اعتماد کرنے والا ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی اور اپنے حلیفوں کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کا سامان مہیا کر دیتا اور ابدی خسران کا سبب بن جاتا ہے چنانچہ منافقین مدینہ یہود بنی نضیر بنی قریضہ اور بنی قینقاع کے حالات و واقعات تاریخی اس کے لئے زندۂ جاوید شہادت ہیں۔

۲) جس قوم میں شر و فساد اور مکر و فریب "اخلاق" کا درجہ لے لیتے ہیں ان کے قویٰ جسمانی و روحانی سے صلاح و خیر کی تمام استعداد فنا ہو جاتی ہے اور وہ نہ دنیا میں کسی عزت و شوکت کی مالک رہتی ہے اور نہ آخرت میں اس کے لئے کوئی حصۂ خیر باقی رہتا ہے چنانچہ سامیّ (سیمیٹک) اقوام میں سے اگر اسکی قوم میں اس کو نمایاں دیکھنا ہو تو یہود کو دیکھ لینا کافی ہے۔

۳) عام طریقے پر جنگ میں سبز درختوں اور ہری کھیتیوں کو کاٹنا اور برباد کرنا اصلاحات جنگ کے منافی اور ممنوع ہے لیکن جب یہ اشیاء زمانۂ جنگ میں دشمن کی مزید تقویت کا باعث ہو کر فساد و شر کے بقا میں معاون ہوں تو ایسی حالت عام حکم سے مستثنیٰ ہیں جیسا کہ بنو نضیر کے واقعہ میں نص قرآنی ناطق ہے۔

واقعہ افک

شعبان ۵ ہجری مطابق دسمبر ۶۲۶ء میں بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے غزوۂ بنی المصطلق پیش آیا منافقین کا یہ دستور بن گیا تھا کہ جس غزوہ کے اسباب ظاہری سے غالب گمان فتح کا ہوتا، اس میں مال غنیمت کے لالچ سے ضرور ساتھ ہو جاتے چنانچہ اس غزوہ میں بھی منافقین کا گروہ مع اپنے سردار عبداللہ بن ابی کے موجود تھا واپسی پر ایک معمولی حادثہ پیش آگیا اور عبداللہ ابی اور اس کے منافق گروہ نے اس پر افتراء اور بہتان کی ایک عمارت تیار کرلی مگر قرآن عزیز نے جلد ہی اس افتراء کی حقیقت آشکار کردی اور مفتریوں کو ذلیل ورسوا ہو جانا پڑا۔

بخاری میں اس واقعہ کی جو تفصیلات مذکور ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کامیابی کے ساتھ غزوۂ بنی المصطلق سے واپس ہوئے تو مدینہ کے قریب ایک منزل پر پڑاؤ تھا کہ آخر شب میں کوچ کا اعلان ہوا۔

حضرت عائشہؓ اعلان سن کر رفع حاجت کے لئے . ت کے ساتھ قیام گاہ سے دور چلی گئیں فارغ ہونے کے بعد واپس ہوئیں تو گلے میں جو ہار پہنے ہوئے تھیں وہ سینہ پر نہ پایا، وہ یہ سمجھ کر ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہو گا جہاں رفع حاجت کے لئے گئی تھیں۔ اس کو تلاش کرنے کے لئے واپس گئیں اسی اثناء میں جو جماعت ان کے ہودج کو اونٹ پر سوار کراتی تھی اس نے ہودج اٹھا کر اونٹ پر کس دیا اور چونکہ اس زمانے میں کم خوری کی وجہ سے عورتیں عموماً فربہ اندام نہیں ہوتی تھیں اور اس لئے وہ بھی بہت لاغر تھیں، لہذا ہودج پر مامور جماعت نے ان کو عدم موجودگی کا مطلق احساس نہیں کیا اور اونٹ پر ہودج رکھ کر روانہ ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ جب ہار کو تلاش کرتی ہوئی واپس ہوئی تو قافلہ جاچکا تھا اور اب ہار بھی ہودج کے قریب ہی مل گیا، وہ سخت پریشان ہوئیں پھر سوچا کہ جونہی مسلمانوں کو یہ محسوس ہو گا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو فوراً نبی اکرم ﷺ اسی جگہ سواری بھیج دیں گے اس لئے مناسب یہ ہے کہ قافلہ کا پیادہ پا پیچھا کرنے کی بجائے اسی جگہ انتظار کیا جائے۔ رات آخر تھی سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا کہ ان کی آنکھ لگ گئی۔

ادھر صفوان بن معطل سہمی اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ سے بہت پیچھے رہ کر نگرانی کرتے ہوئے اور جو چیز بھی قافلہ کی رہ جائے اس کو لیتے ہوئے آئیں پیچھے سے چلتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے قریب آئے تو ان کو پہچان لیا کیونکہ آیت حجاب سے پہلے وہ ان کو دیکھ چکے تھے۔

انھوں نے دیکھتے ہی فوراً بلند آواز سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا حضرت عائشہ آواز سن کر بیدار ہو گئیں صفوان نے ایک لفظ کہے بغیر اونٹ کو بٹھادیا اور وہ خاموشی کے ساتھ اونٹ پر ہودج میں سوار ہو گئیں اور صفوان

مہار پکڑے ہوئے روانہ ہوئے اور دوپہر کے قریب لشکر میں جا پہنچیں۔

جب یہ خبر عبداللہ بن ابی کو معلوم ہوئی تو اس نے اور اس کی جماعت نے موقعہ کو غنیمت جانا اور تیزی کے ساتھ افتراء اور بہتان کو لشکر میں پھیلا دیا مگر مسلمانوں نے کسی طرح اس کو باور نہیں کیا البتہ صرف تین مسلمان (دو مرد اور ایک عورت) حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش اپنی سادہ لوحی سے منافقین کے جال میں پھنس گئے۔

خدا کے کرم و فضل دیکھئے کہ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی (قرآن عزیز) کے ذریعہ منافقین کی خباثت کو آشکارا کر دیا اور حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی اور عفت مآبی پر مہر تصدیق ثبت کر کے بہتان لگانے والوں پر کوڑوں کی سزا (حد قذف) جاری کرنے کا حکم دیا اور اسطرح کذاب اور مفتری کیفر کردار کو پہنچے۔

اس واقعہ پر بعض مستشرقین اور یورپین مورخین طبع کا ثبوت دیا ہے اور خوب آب و نمک لگا کر اس کو بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر اسلام اور داعیٔ اسلام ﷺ سے متعلق ان کے قلبی عناد کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہر حال قرآن عزیز نے اس واقعہ پر مسلمانوں کو صاف طور سے یہ بتلا دیا کہ یہ کذب و افتراء پر مبنی داستان سن کر تم نے خود ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ محض جھوٹ اور بہتان ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ط لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ط لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ لَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَا إِفْكٌ مُّبِيْنٌ ○ لَوْلَا جَآءُوْا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَأُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ ○ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ أَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ إِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ○ وَلَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَا يَكُوْنُ لَنَآ أَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ أَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ أَبَدًا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيَاتِ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَأَنَّ اللّٰهَ

رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (نور: ۱۱-۲۰)

جن لوگوں نے بہتان کا یہ طوفان اٹھایا ہے وہ تم ہی میں سے ایک جماعت (منافقین کی جماعت) ہیں (اے پیغمبر!) تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یعنی خدا کی مصلحت کے راز نے اس میں تمہاری بہتری کا انجام پوشیدہ رکھا ہے ان میں سے ہر ایک آدمی کیلئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے گناہ کمایا ہے اور جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کے واسطے بہت بڑا عذاب ہے جب تم نے اس بہتان کو سنا تھا کیوں نہ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک خیال قائم کر لیا اور کیوں یہ نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان کا طوفان ہے وہ (طوفان اٹھانے والے اپنے بہتان پر) کیوں چار گواہ نہ لائے پس جب وہ گواہ پیش نہ کر سکے تو یہی لوگ اللہ کے ہاں سر تا سر جھوٹے ہیں اور اگر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت دنیا اور آخرت دونوں میں تم پر نہ ہوتی تو پڑ جاتی اس جھوٹا چرچا کرنے میں تم پر کوئی بڑی آفت جبکہ تم اس (بہتان کو اپنی زبانوں پر جاری کرنے لگے اور ایسی بات منہ سے نکالنے لگے جس کی تم کو خبر تک نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھتے ہو حالانکہ (بہتان اور افتراء) اللہ کے نزدیک بہت بڑی بات ہے اور جب تم نے اس کو سنا تھا تو کیوں نہ کہا ہمارے لئے زیبا نہیں کہ ایسی جھوٹی بات منہ سے نکالیں "اللہ کیلئے پاکی ہے" یہ تو بہت بڑا بہتان ہے اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کام پھر کبھی نہ کر بیٹھنا اگر تم واقعی سچے ایمان والے ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے پتہ کی باتیں واضح کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا حکمت والا ہے جو لوگ چاہتے ہیں کہ بدکاری کا چرچا ہو ایمان والوں میں ان چاہنے والوں کیلئے دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بلاشبہ اللہ (حقیقت حال کا جاننے والا ہے اور تم جاننے والے نہیں ہو اور اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تم پر اور یہ بات نہ ہوتی کہ وہ نرمی کرنے والا ہے اور مہربان تو کیا کچھ نہ ہو جاتا۔

سورۂ نور کی ان آیات نے عائشہ صدیقہؓ کی طہارت و پاکدامنی کا ہی صرف اعلان نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کی کہ ان کو ایک لمحہ کا انتظار کئے بغیر اس قسم کے افتراء پردازوں کے افتراء پر صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ یہ محض افتراء اور بہتان ہے۔

یہ آیات اس بناء پر "آیات برأۃ" بھی کہلاتی ہیں کہ ان میں حضرت عائشہؓ کی برأۃ کا اعلان ہے اور منافقین اور معاندین کی ذلت و خذلان کا اظہار۔

موعظت:

اس واقعہ نے قرآن عزیز میں جن مواعظ و بصائر کا سامان مہیا کیا ہے ان میں سے یہ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

۱) فاسق و فاجر یا بد باطن انسانوں کی دی ہوئی خبر خصوصاً جبکہ وہ باعصمت و عفت اور صاحب تقویٰ و خیر افراد کے خلاف ہو ہرگز قابل توجہ نہیں اور اس کے لئے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہ محض افتراء تا وقتیکہ خبر دینے والا اس پر روشن دلیل و حجت قائم نہ کر دے۔

۲) بے گناہ پر الزام اور تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے اور چونکہ اس گناہ کا مرتکب حق العباد میں سے ایک اہم حق کا

ہتک کرتا ہے اس لئے نہ صرف اخلاق کی نگاہ میں بلکہ اجتماعی قانون کی نظر میں بھی حد درجہ مجرم ہے قرآن عزیز کی نصوص نے اس لئے حد قذف (بے گناہ پر تہمت لگانے کی سزا) کے لئے اسی کوڑے تجویز کئے ہیں تاکہ آئندہ کسی کو بھی یہ جرأت نہ ہو سکے کہ وہ ایک پاکباز انسان پر بہتان لگائے یا بغیر شہادت کے اس کی تشہیر کرے۔

۳) یہ واقعہ گو آغاز کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کے لئے بہت سخت ایذاء کا باعث ہوا اور اہل بیت کو اس نے بیحد پریشان خاطر بنایا لیکن انجام کے پیش نظر اہل بیت رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ سر تا سر خیر ثابت ہو اکیونکہ اسے ایک جانب منافقوں کی منافقت کا راز فاش ہو گیا اور دوسری جانب صدیقہ عائشہؓ اور اہل بیت رسول کی عظمت شان کا بے نظیر مظاہرہ عمل میں آگیا کہ قرآن کی دس آیات نے ان کی براءۃ کے لئے نازل ہو کر ان کی عصمت و عظمت دونوں پر عدیم النظیر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

۴) بعض مرتبہ اشرار اور خبیث النفس انسانوں کی ہفوات اس درجہ آب و رنگ رکھتی ہیں کہ سادہ لوح مسلمان اور نکوکار انسان بھی مغالطے اور دھوکے میں آجاتے ہیں اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ سنی سنائی بات پر اس وقت تک ہرگز ہرگز یقین نہ کرے جب تک کہ اسلامی اصول شہادت کے مطابق شنیدہ خبر کی تصدیق نہ ہو جائے۔

قال رسول اللہ ﷺ ایاکم و الظن فان بعض الظن اثم

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سوءِ ظن سے بچو اس لئے کہ بعض بدگمانیاں گناہ کا مرتکب بنا دیتی ہیں"۔

۵) حقوق العباد میں خدائے برتر نے جو حدود و قصاص اور تعزیرات مقرر فرما دیئے ہیں جرائم کے ارتکاب پر ان میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے اور قانون اسلامی کی نگاہ میں اس حیثیت سے تمام جرم یکساں قابل گرفت ہیں اس لئے واقعہ افک میں منافق مفتریوں کے ساتھ تین مسلمان (مرد عورت) حسان، حضرت مسطح، اور حضرت حمنہ بنت جحش کو بھی جھوٹی تہمت لگانے کے الزام میں کوڑے کھانے پڑے۔

نبأ فاسق[1]

غزوۂ بنی المصطلق[2] میں جب مسلمان فتح یاب ہوگئے اور صحابہؓ کے مشورہ کی بناء پر نبی اکرم ﷺ نے سردار قبیلہ کی بیٹی حضرت جویریہؓ سے نکاح کرلیا تو نبی اکرم ﷺ کے رشتۂ مصاہرت کیوجہ سے تمام صحابہؓ نے اسیران جنگ کو رہا کر دیا اور مسلمانوں کے اس حسن سلوک و اخلاق کریمانہ اور اسلامی محاسن سے متاثر ہو کر تمام قبیلہ مشرف با سلام ہو گیا تب نبی اکرم ﷺ نے ولید بن عقبہ کو اس لئے ان کے پاس بھیجا کہ وہ قبیلہ کے دولت مندوں سے "زکوٰۃ" وصول کر کے ان ہی کے فقراء و مساکین پر تقسیم کردیں۔

اہل قبیلہ کو جب ولید کی اس آمد کا علم ہو تو وہ عامل اسلام کے استقبال کے لئے تیاریاں کرنے لگے اور ایک معزز ترین ہستی کے استقبال کی طرح ساز و سامان کے ساتھ میدان میں نکلے۔

زمانۂ جاہلیت میں اس قبیلہ کے اور ولید کے درمیان کچھ ناچاقی رہ چکی تھی اور پرانی عداوت کا رشتہ چلا آتا تھا اس لئے استقبال کے اس اہتمام کو ولید نے دوسری نظر سے دیکھا اور سمجھا اور اپنی غلط رائے پر جمود کر کے اہل قبیلہ سے معاملہ کئے بغیر ہی مدینہ واپس آگئے اور دربار قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ بنی المصطلق تو مرتد ہوگئے اور انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور وہ تو سرکشی پر آمادہ ہیں۔

نبی اکرم ﷺ یہ سن کر بنی المصطلق کے طرز عمل سے رنجیدہ ہوئے اور مسلمان تو برافروختہ ہوگئے اور جہاد کی تیاریاں ہونے لگیں تاکہ مرتدین کا مقابلہ کیا جائے حتی کہ وہ اسلام پر واپس آجائیں یا کیفر کردار کو پہنچ جائیں۔

ادھر بنی المصطلق کو ولید کے اس عجیب طرز عمل نے حیرت میں ڈال دیا اور جب ان کو معلوم ہوا کہ ولید نے کسی بیجا جسارت کے ساتھ ان کے متعلق دربار نبوی میں غلط بیانی کی ہے تو وہ بے حد پریشان ہوئے کیونکہ ان کے تو وہم و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان جیسے پختہ کار اور ثابت قدم مسلمانوں پر اس قسم کی تہمت بھی لگائی جاسکتی ہے چنانچہ انھوں نے فوراً خدمت اقدس ﷺ میں ایک موقر وفد بھیجا جس نے حاضر ہو کر کل ماجرا کہہ سنایا۔

ایک جانب اپنے عامل (ولید) کا وہ بیان اور دوسری جانب حدیث العہد مسلم جماعت کا یہ بیان اس لئے نبی اکرم ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی اور وحی الٰہی کا انتظار کیا۔

آخر وحی الٰہی نے رہنمائی کی اور قرآن عزیز (سورۂ حجرات) کی ان آیات نے نازل ہو کر نہ صرف زیر بحث معاملہ کی حقیقت ہی واضح کر دی بلکہ اس سلسلہ میں ایک مستقل قانون یا معیار تحقیق عطا فرمادیا:

يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْآ إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوْآ أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا ؟ بِجَهَالَةٍ

1. فاسق کی دی ہوئی خبر۔
2. یہ غزوہ ۵ھ میں پیش آیا۔

فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ وَاعْلَمُوْٓا أَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط أُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ○ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی (غلط کار) خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ نادانی کی وجہ سے کسی قوم پر (جہاد کے نام سے) حملہ آور ہو جاؤ اور پھر کل کو (اصل حال معلوم ہونے کے بعد) اپنے کئے پر پچھتانے لگے، اور جان لو تم میں اللہ کا رسول موجود ہے اگر وہ تمہاری بات اکثر معاملات میں مان لیا کرے تو تم اپنی غلط روی کی وجہ سے) مصیبت میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے اپنے فضل سے) تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں میں اس کو زینت بخشی ہے اور تمہارے دلوں میں کفر اور گناہ اور نافرمانی کے لئے نفرت پیدا کر دی ہے اور (در حقیقت) یہی لوگ ہیں اللہ کے فضل اور احسان کی وجہ سے راہ یاب اور اللہ جاننے والا ہے حکمتوں والا ہے۔

موعظت

۱) خبروں کے بیان کرنے میں عام طور پر سنجیدہ اور مہذب جماعت بھی اس کو معیوب نہیں سمجھتی کہ جو خبر بھی ان کے کانوں تک پہنچے وہ اس کو بے تکلف نقل کرتے رہیں اور حقیقت حال کی جستجو کی زحمت قطعاً گوارا نہ کریں خواہ اس خبر سے کسی نا کردہ گناہ افترا کیا جارہا ہو یا اسکی فرد و جماعت کو مضرت پہنچ رہی ہو۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے پر زور الفاظ میں یہ تنبیہ فرمائی ہے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ و سلم قال کفی بالمرء اثماً ان یحدث بکل مَا سَمِعَ۔ (ابو داؤد)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: انسان کے لئے یہ گناہ کافی ہے کہ ہر شنیدہ بات کو نقل کرتا رہے، یعنی یہ بھی گناہ کی بات ہے کہ سنی سنائی جھوٹی بات کی تشہیر کرے۔

۲) جب کوئی ایسی خبر سنی جائے جو بلحاظ مفادیات مضرت خبر دینے والے پر یا دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہو تو اسلامی آداب اجتماعی کا تقاضہ ہے کہ پہلے اس کی تحقیق ہونی چاہیے اور جب وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تب اس سے متعلق نتائج و ثمرات کی جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

"خبر" سے متعلق یہ حکم اخلاقی حیثیت رکھتا ہے اور معاشرتی زندگی میں روز مرہ واجب العمل ہے لیکن محاکم شرعیہ میں جب کوئی معاملہ جائے اور خبر "شہادت" کی حیثیت اختیار کر لے تو اسکے قبول و عدم قبول میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے مزید شرائط ہیں جو فقہ اسلامی کے "باب الشہادۃ" میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

مسجد ضرار

منافقین کو یہ توجرأت ہوتی نہ تھی کہ اعلانیہ اسلام کی مخالفت کر کے اس کو نقصان پہنچائیں، البتہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی در پردہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے ان کو ضعف وانحطاط کی راہ پر لگادیں، چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے جہاں اور بہت سی فتنہ سامانیاں بپاکر رکھی تھیں ان میں سے ایک واقعہ جب ۹ ہجری میں بھی رونما ہوا۔

نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوا کہ تبوک کے میدان میں جو کہ مدینہ سے چودہ منزل پر براہ دمشق واقع تھا ہرقل شاہ اروم نے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے لشکر جرار جمع کر لیا ہے اور اس کا مقدمۃ الجیش آگے بڑھ کر بلقاء تک آپہنچا ہے آپ ﷺ نے عرب میں قحط اور گرمی کی شدت کے باوجود جہاد کیلئے منادی کردی اور مسلمان جوق در جوق شوق جہاد میں مدینہ میں جمع ہونے لگے۔

نبی اکرم ﷺ ابھی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ منافقین نے اس سے فائدہ اٹھا کر سوچا کہ مسجد قباء کے مقابلہ میں جو ہجرت کے بعد سب سے پہلی مسجد تھی اس حیلہ سے ایک مسجد تیار کریں کہ جو لوگ ضعف یا اور کسی عذر کی وجہ سے مسجد نبوی میں نہ جاسکیں تو یہاں نماز پڑھ لیا کریں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کو ورغلانے کا بھی موقعہ ہاتھ آئے گا اور ایک قسم کی تفریق بھی پیدا ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر سب نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم نے ضعیف و ناتواں اور معذوروں کے لئے قریب ہی ایک مسجد بنائی ہے اب ہماری خواہش ہے کہ حضور ﷺ وہاں چل کر ایک مرتبہ اس میں نماز پڑھ دیں تو وہ عند اللہ مقبول ہو جائے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس وقت تو میں اہم غزوہ کے لئے جارہا ہوں واپسی پر دیکھا جائے گا۔

مگر آپ ﷺ جب بخیر و کامرانی مراجعت فرما ہوئے تو وحی الٰہی کے ذریعہ اس مسجد کی تعمیر کے حقیقی سبب سے آگاہ ہو چکے تھے چنانچہ واپس تشریف لا کر سب سے پہلے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اس مسجد کو آگ لگا کر خاک سیاہ کردیں۔

چونکہ حقیقۃً اس مسجد کی بنیاد "تقویٰ" اور "وجہ اللہ" کی جگہ "تفریق بین المسلمین" پر رکھی گئی تھی اس لئے بلا شبہ وہ اسی کی مستحق تھی اور اس کو "مسجد" کہنا حقیقت کے خلاف تھا۔ اس لئے قرآن عزیز نے بظاہر مسجد بباطن بیت الشر کی تعمیر کے متعلق حقیقت حال کو روشن کرتے ہوئے بتلادیا کہ یہ مسجد تقویٰ نہیں بلکہ مسجد ضرار کہلانے کی مستحق ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ
حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ط وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّا الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ يَشْهَدُ

إِنَّهُمْ لَكَاذِبُوْنَ ○ لَا تَقُمْ فِيْهِ أَبَدًا ط لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○

اور منافقوں میں سے) وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اسی غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ نقصان پہنچائیں کفر کریں مومنوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کے لئے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں (اے پیغمبر) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا اس بات کی کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں وہی مسجد حق دار ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک وصاف رہیں اور اللہ بھی پاک وصاف رہنے والوں کو ہی پسند کرتا ہے۔

۱) منافقت ایک ایسا مرض ہے جو انسان کی تمام خصائل حمیدہ اور اخلاق حسنہ کو تباہ و برباد کر کے اس کی انسانیت کو حیوانیت سے بدل دیتا ہے اور اس کے افکار و اعمال میں مطابقت باہمی نہ رہنے سے اس کی زندگی کو اسفل السافلین میں گرا دیتا ہے۔

۲) ایک ہی "عمل" عامل کی نیت کے فرق سے "پاک" بھی ہو سکتا ہے اور "ناپاک" بھی "طیب" بن سکتا ہے اور خبیث بھی، تعمیر مسجد ایک عمل خیر ہے اور باعث اجر و ثواب! مگر جبکہ لوجہ اللہ ہو اور عبادت الٰہی کا حقیقی مقصد پیش نظر رہے۔

إِنَّمَا[1] يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَاٰتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللّٰهَ

اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز ادا کی اور زکوٰۃ دی اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرا۔

اور یہی عمل خیر "عمل شر" اور لائق نفرت بن جاتا ہے جبکہ اس کا مقصد کار شیطان ہو یعنی تفریق بین المسلمین یا نماز کی آڑ میں اسلام کے خلاف کمین گاہ اور جاسوسی کا مرکز بنانا ہو اسی لئے یہ عمل خیر کافروں کے ہاتھ سے انجام پانا غیر مقبول اور مردود ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ أَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ

مشرکوں کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں حالانکہ وہ اپنی جانوں پر کفر کی گواہی دیتے ہیں۔

---

[1] تعمیر مساجد اللہ میں مساجد کی آبادی اور اس کی تعمیر دونوں کا مفہوم شامل ہے۔

وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ○

آخر وہ وقت بھی آپہنچا جس کے تصور کے لئے نہ صرف مسلمان بلکہ دنیائے انسانیت بھی تیار نہ تھی یہ وقت کائنات انسانیت کے لئے مصیبت عظمیٰ اور داہیۂ کبریٰ ثابت ہوا۔ چار دانگ عالم پر حیرت طاری تھی کہ وہ کس طرح غیر متوقع طور پر ہادیٔ اکبر، مصلح اعظم کے فیض صحبت سے محروم ہو گئے! آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، قلب اس کے باور کرنے کو تیار نہ تھا اور قلب جو کچھ چاہتا تھا آنکھیں اس نظارہ کو واپس نہ لا سکتی تھیں دل پاش پاش تھے، جگر شق ہو رہے تھے چشم گریاں اشک کے سیلاب بہا رہی تھی کیونکہ آج روحانیت کے آفتاب عالمتاب کے اور کائنات انسانی کے درمیان موت کا لکۂ ابر حائل ہو چکا تھا۔

اگر دنیا کا کرۂ آفتاب در حقیقت کبھی غروب نہیں ہوتا اور رہتی دنیا تک غروب نہیں ہو گا بلکہ دیکھنے والوں کے اور اس کے درمیان پردۂ شب حائل ہو جاتا ہے تو کس کی مجال اور کس کی جرأت ہے کہ وہ آفتاب رسالت کے متعلق غروب ہونے کا دعویٰ کر سکے کیونکہ یہاں تو پردۂ شب کو بھی حائل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

الدین السمحة البیضاء لیلها و نهارها سواء۔

دین اسلام آسان و روشن دین ہے جس کے رات اور دن دونوں یکساں طور پر روشن ہیں۔

یعنی یہاں شب تاریک کا گذر رہی نہیں ہے البتہ موت کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ کا پیغام بن کر اس آفتاب رسالت کے اور ہمارے درمیان لکہ ابر بن کر حائل ہو گئی۔

اس لئے اس مصیبت کبریٰ میں بھی مسلمانوں کے زخمی قلوب کے لئے مرہم اور کشتگان فراق رسول اکرم ﷺ کے لئے بہترین اکسیر و تریاق موجود تھا اور وہ یہ یقین اور اذعان ہے جس کو قرآن عزیز نے یہ کہہ کر پہلے ہی "قلب مسلم" کو عطا کر دیا

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ○ ، كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ ، وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط أَفَائِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى أَعْقَابِكُمْ ط ،

"یعنی "موت" اس حقیقت کا نام ہے جو نبی مرسل بلکہ خاتم المرسلین کو بھی پیش آکر رہے گی اور بقائے حقیقی تو ذات احدیت کا ہی بلا شرکت غیرے طغرائے امتیاز ہے۔

"اللہ اللہ!" وہ کیسا عجب ہی سماں تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ نے اللهم الرفيق الاعلى فرماتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد فرما دی تو تمام صحابہ رنج و غم اور صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متحیر اور مصیبت زدہ ہو رہے تھے

کہ ان کے ہوش وحواس تک بجا نہ تھے اسی عالم میں حضرت عمرؓ نے فرط غم سے تلور سونت کر یہ نعرہ لگایا کہ جو محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے گا تو اسی تلوار سے اس کی گردن اڑادوں گا۔

اسی اضطراب انگیز عالم میں خدا کا ایک بندہ صدیق اکبر آتا ہوا نظر آتا ہے سب سے پہلے وہ حجرۂ عائشہؓ میں پہنچتا اور دل بریاں و چشم پرنم کیساتھ سرور دو عالم کی جبین نور کو بوسہ دیتا اور فراق رسول سے کرب وبے چینی کا اظہار کرتا ہے اور اس فرض عشق سے فارغ ہو کر جب باہر آتا ہے تو صحابہؓ کی اس حالت کا جائزہ لے کر کہ جس میں جاہلیت واسلام دونوں ادوار کی بے نظیر شخصیت عمر بن الخطاب بھی شامل ہے تو آگے بڑھ کر کہتا ہے: اے خطاب کے بیٹے بیٹھ جا۔ حضرت عمر وہیں بیٹھ جاتے اور انتہائی حزن وغم سے حضرت ابو بکر کا منہ تکنے لگتے ہیں۔

صدیق اکبرؓ اب منبر نبوی ﷺ پر کھڑے ہو کر صدائے حق بلند کرتے ہوئے صحابہؓ کے مجمع کو یوں خطاب کرتے ہیں۔

”لوگو! جو شخص محمد ﷺ کی پرستش پیش کرتا تھا ”ان محمدا قدمات“ کہ محمد ﷺ نے ذائقہ موت چکھ لیا اور جو خدائے واحد کا پرستار ہے تو بلا شبہ ان اللہ حی لایموت اللہ تعالیٰ زندۂ جاوید ہے اور موت سے پاک اور بری اس کو موت نہیں ہے۔

ابو بکر صدیقؓ کی یہ صدائے حق جب فضا میں گونجی تو سب سے اول حضرت عمرؓ اور ان کے بعد تمام صحابہ پر سکون واطمینان طاری ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ بلا شبہ سردار دو عالم ﷺ اپنا فرض رسالت پورا کر کے ”رفیق الاعلیٰ“ سے جا ملے اور اب اسلام مکمل ہو چکا اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ رسول پاک ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور زندۂ جاوید معجزہ کلام اللہ قرآن کو پیشوا بنا کر خدمت اسلام کا فرض انجام دیں۔

حضرت عمر بن الخطاب کی کیفیت تو یہ ہوئی کہ فرمانے لگے قسم بخدا صدیق اکبر نے یہ صدائے حق بلند کرتے ہوئے جب یہ آیت تلاوت کی وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا ابھی اس آیت کا نزول ہو رہا ہے اور عشق رسول ﷺ نے فراق رسول سے جو مبہوت کر دی تھا قرآن اور تعلیم رسول ﷺ کی روشنی میں جو کچھ رفیق محترم نے کہا وہ یک بیک مثل آفتاب میرے سامنے آ گیا۔

تمام کتب احادیث وسیر کی روایات متفق ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات ماہ ربیع الاول روز دوشنبہ کو ہوئی البتہ کس تاریخ کو ہوئی؟ اس بارے میں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔

واقدی اور ابن سعد صاحب طبقات الکبریٰ کی روایات ۱۲ ربیع الاول ظاہر کرتی ہیں اور یہی قول مشہور ومعروف ہے اور بیہقی اور ابن کثیر میں منقول بعض روایات میں ہے کہ ۲ ربیع الاول اور بعض ۱۰، ۴، اور یکم ربیع الاول بھی منقول ہے۔ (تاریخ ابن کثیر جلد ۵ ص ۲۵۵)

ابو القاسم سہیلی اپنی مشہور کتاب روض الانف میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ۱۱ھ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن بالاتفاق متعین ہونے کے بعد حسابی اعتبار سے وفات کی تاریخ کسی طرح ۱۲ (بارہ) ربیع الاول نہیں ہو سکتی البتہ ۲ یا ۱۳ یا ۱۴ یا ۱۵ ربیع الاول میں سے کوئی تاریخ ہو سکتی ہے اور یہ اس لئے کہ جمہور کا اس پر اجماع ہے کہ رسول اکرم

ﷺ نے حجتہ الوداع میں حج (وقوف عرفہ) جمعہ کے دن کیا ہے پس جبکہ ۹ ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا تو خواہ بعد کے تمام مہینے صرف انتیس دن کے مان لیجئے یا صرف تیس دن کے یا بعض انتیس کے اور بعض تیس کے کسی صورت میں بھی دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول نہیں ہوتی اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

البتہ ابن جریر طبری نے ابن کلبی اور ابو مخنف کی روایت سے ۲ ربیع الاول نقل کی ہے تو یہ اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ محرم، صفر، ربیع الاول تینوں مہینے انتیس کے تسلیم کر لئے جائیں ورنہ تو قیاس صحیح سے قریب تر روایت خوارزمی کی ہے جسمیں تاریخ وفات یکم ربیع الاول منقول ہے کیونکہ یہ تاریخ تینوں میں انتیس اور تیس دن کے فرق سے بھی صحیح ہو جاتی ہے۔

ابن کثیر نے سہیلی کے اعتراض کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ علماء نے اس کے جوابات دیئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ تسکین بخش نہیں ہیں البتہ جواب کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ "اختلاف مطالع" کا اعتبار کیا جائے یعنی یہ تسلیم کیا جائے کہ مکہ اور مدینہ میں رویتِ ہلال مختلف رہی ہو کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اہل مدینہ نے ذی الحجہ کا چاند جمعہ کے دن دیکھا اور مکہ میں جمعرات کو رویت ہوئی تو پھر اگر باقی تینوں مہینوں کو تیس تیس کا ہی تسلیم کر لیا جائے تب یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلا شبہ دوشنبہ کو ۱۲ ربیع الاول تھی۔

تو کیا مدینہ میں ذی الحجہ کا چاند جمعہ کو دیکھا گیا! اس کی تصدیق و تائید حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ حجتہ الوداع کے لئے جب مدینہ سے نکلے تو ذی قعد کے ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے اور حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب مدینہ سے نکلنے لگے تو ظہر کی چار رکعات پڑھ کر نکلے اور ذوالحلیفہ پہنچ کر عصر کی دو رکعات پڑھیں پس ان دونوں مستند روایات سے واضح ہوا کہ آپ کی روانگی نہ جمعرات کو ہوئی اور نہ جمعہ کو بلکہ سنیچر کے دن ہوئی لہذا اس صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اہل مدینہ نے جمعہ کے دن ذی الحجہ کا چاند دیکھا۔

پس یہی ایک شکل بنتی ہے جس سے تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول سے متعلق مشہور روایت تسلیم کی جا سکتی ہے۔

(تاریخ ابن کثیر جلد ۵)

عبرت موعظت

۱) قرآن عزیز سورۂ فاتحہ میں ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ o صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور دوسری جگہ سورۂ نساء میں أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی تفسیر اس طرح مذکور ہے فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا یہی وہ رفقا ہیں جن کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے اللھم الرفیق الاعلی کہہ کر وقت آخر اشارہ فرمایا۔

سہیلی کہتے ہیں کہ چونکہ اہل جنت، جنت میں مختلف القلوب نہیں ہوں گے بلکہ ایک انسان کے قلب واحد کی طرح ہوں گے اس لئے الرفقاء العلیا" نہیں فرمایا "الرفیق الاعلی" فرمایا تا کہ اہل جنت کی "وحدت قلبی" کی جانب اشارہ ہو جائے۔

۲) "موت" خدائے برتر کا وہ اٹل فیصلہ ہے جس سے نبی و رسل اور خاتم الانبیاء والرسل بھی مستثنیٰ نہیں ہیں

اور بقاء وحیات سرمدی وابدی صرف ذات حق کے لئے ہی مخصوص ہے۔

۳) صدیق اکبر کی عظمت شان و جلالت مرتبہ کا اس ایک واقعہ سے بھی واضح اعلان ہو جاتا ہے کہ وفات النبی کے قریبی وقت میں نزاکت حالات نے صحابہؓ کی عقل وخرد پر جو اثر ڈالا اگر خدانخواستہ وہ دیرپا ہو جاتا تو اسلام اپنی حقیقت سے خالی ہو کر رہ جاتا (عیاذاً باللہ) مگر یہ سعادت ابو بکر کے ہی حصہ میں تھی کہ مسلمانوں کی اس ڈگمگاتی کشتی کو قرآن کی روشنی میں پار لگا دیا۔ اور "اسلام" کو ایک عظیم الشان فتنہ سے بچالیا۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

بحمد اللہ تم